مضمون	صفحہ نمبر
آغاز	003-002
شاہ کلید	004
پیش لفظ	006-005
عرضِ مرتب	010-007
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے	013-011
جناب رسول اللہ ﷺ کا فرمان	016-014
فتنہ میں ذریعہ نجات	018-017
قرآن حکیم اور ہماری زندگی	022-019
سورۃ الفاتحہ	042-023
سورۃ البقرۃ حصہ - 1	140-043
سورۃ البقرۃ حصہ - 2	316-141
سورۃ البقرۃ حصہ - 3	384-317
سورۃ البقرۃ حصہ - 4	700-385
سورۃ البقرۃ حصہ - 5	816-701

جملہ حقوق محفوظ ہیں
(مرتب کی تحریری اجازت کے بغیر یہ کتاب شائع نہیں کی جاسکتی)

نام کتاب: الفرقان [سورۃ البقرہ]
مرتب: شیخ عمر فاروق
تاریخ اشاعت: شوال المکرّم ۱۴۲۷ھ - نومبر 2006ء
مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ لاہور فون: 7351007
مقام اشاعت: جامعة تدبر القرآن
15-بی وحدت کالونی لاہور فون: 7585960

وقف للہ تعالیٰ

انتساب

ہر اس انسان کے نام

جو راہِ ہدایت کا مسافر بھی ہے

اور متلاشی بھی!

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:۶۹)

''اور جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے البتہ ضرور بالضرور انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے۔''

شاہ کلید

میں قدیم جدید فلسفہ، سائنس، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں، مگر جب آنکھیں کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا، علم کی جڑ اب ہاتھ میں آئی ہے، کانٹ، ھیگل، نٹشے، مارکس اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں، بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں الجھتے رہے، جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں، پھر بھی حل نہ کر سکے، ان کو اس کتاب نے ایک ایک دو دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا، اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے، میری اصل محسن بس یہی ایک کتاب ہے اس نے مجھے بدل کے رکھ دیا ہے، حیوان سے انسان بنا دیا، تاریکیوں سے نکال کر روشنی پر لے آئی ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا کہ زندگی کے جس معاملہ کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے کہ گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے، انگریزی میں اس کنجی کو ''Master Key'' کہتے ہیں جس سے ہر قفل کھل جائے، سو میرے لئے یہ قرآن ''شاہ کلید'' ہے، مسائلِ حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں وہ کھل جاتا ہے جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے اس کا شکر ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

بسم اللہ الرحم الرحیم

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انتہائی مہربان ہے۔اس نے بندوں کی کامیاب زندگی کے لیے اور امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار جلیل القدر پیغمبر مبعوث فرمائے اور بہت سے صحیفے اور کتابیں نازل فرمائیں۔ان میں سب سے آخری پیغمبر سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لائے۔ان پر نازل ہونے والی آخری کتاب قرآن مجید ہے۔

ہمارے اس جدید دور میں بھی یہی کتاب انسانی زندگی کے لیے ہدایت اور رہنمائی کا سرچشمہ ہے اور یہی کتابِ انقلاب ہے جس نے سرزمین عرب میں ایک شاندار انقلاب برپا کرنے میں سیدنا محمد ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی قدم قدم پر رہنمائی کی۔سیدنا رسول مقبول ﷺ پر کفار کے اعتراضات کے جوابات اس کتاب نے دیے، کفار کے حملوں کے موقع پر مسلمانوں کی مدافعت اس کتاب نے کی اور غم واندوہ کے موقع پر سیدنا محمد ﷺ کی ڈھارس بھی اسی کتاب نے بندھائی۔

اللہ تعالیٰ کے الفاظ اور کلام کی تاثیر کفار پر بھی ہوئی۔اس کتاب کو کوئی مانے یا نہ مانے لیکن وہ یہ اعتراف ضرور کرے گا کہ ادبی تاثیر اور دلوں کو پگھلانے کے معاملے میں یہ کلام بے مثال ہے۔مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کی بار بار تلاوت کریں۔سمجھنے اور عمل کرنے کا درجہ تو آگے آتا ہے پہلے درجے میں صرف قرأت کرنے پر ہی ایک ایک حرف پر دس دس نیکیوں کی خوشخبری سنائی۔اس کو سمجھنے اور سمجھانے کے بارے میں تو سیدنا محمد ﷺ نے یہاں تک فرمادیا ہے کہ خَیْرُکُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَ عَلَّمَہٗ ''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے۔''

یہی وہ خوشخبری ہے جس سے مسلمانوں میں قرآن مجید سیکھنے اور سکھانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔یہی جذبہ ناظرہ وہ حفظ قرآن کے مدارس قائم کرنے کی تحریک پیدا کرتا ہے اور یہی جذبہ دروسِ قرآن کی محافل سجانے کا باعث بنتا ہے۔اللہ کے کئی بندے اسی جذبے کے تحت اپنے قلم سے بھی قرآن کی خدمت کررہے ہیں۔

برادر محترم شیخ عمر فاروق کے قلم کو یہی جذبہ مصروفِ جہاد رکھتا ہے۔انہوں نے دو چار سال قبل اپنے قلم کے

ذریعے درسِ قرآن کا سلسلہ ہفت روزہ ''ایشیا'' میں شروع کیا تھا۔ اس سلسلے کا پہلا پارہ خوبصورت طباعت کے بعد آپ تک پہنچ چکا ہے اور اب سورۃ البقرہ کی تکمیل پر اسے کتابی صورت میں چھپوا رہے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اس پر اجرِ عظیم سے نوازے۔ آمین! ہفت روزہ ''ایشیا'' کے لیے جہاں یہ کالم خیر و برکت کا باعث ہے وہیں قارئین ایشیا کے لیے علم و عرفان میں اضافے اور کتاب اللہ کی آسان پیرائے میں تفہیم کا بھی بہترین سامان اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

شیخ عمر فاروق صاحب نے کوشش کی ہے کہ عربی نہ جاننے والے قاری حضرات کے ذہنوں میں قرآن کے الفاظ کی بناوٹ اور اس کی لفظی معانی کی سمجھ پیدا ہو اور قرآن کا مفہوم اور پیغام بھی ذہن نشین ہو جائے۔ اس کے لیے انہوں نے الفاظ کے مادے، اور صیغے بڑے اہتمام سے دیے ہیں اور پورے مضمون کا پیغام سمجھانے کے لیے انہوں نے پہلے خود بہت سی قدیم اور جدید تفاسیر کا مطالعہ کیا ہے اور پھر حسب ضرورت اپنے دروس میں مختلف تفسیروں کے اقتباسات دیے ہیں۔ قدیم تفاسیر کے علاوہ جدید تفاسیر اور بالخصوص مولانا سید عبدالماجد دریابادیؒ کی 'تفسیر ماجدی'، سید رشید رضا مصریؒ کی 'تفسیر المنار' اور سید قطب شہید کی 'فی ظلال القرآن' قابل ذکر ہیں۔

اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کام میں انہوں نے کتنی محنت کی ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ عوام کو قرآن سکھانے اور سمجھانے کے لیے ان کا جذبہ حد درجہ قابل ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا جذبہ قبول فرمائے، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ان دروس سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے اور یہ دروس موصوف کے لیے صدقہ جاریہ بن جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ شائقین علوم قرآن کے لیے یہ سلسلہ از حد مفید ثابت ہوگا۔

شیخ صاحب کو اللہ نے علم و عمل کے میدان میں اپنی خصوصی نعمت سے نوازا ہے۔ ان کے مضامین مختلف موضوعات پر ''ایشیا'' میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تحریر میں سلاست بھی ہے اور ثقاہت بھی۔ زیر نظر کاوش تو اتنا عظیم کارنامہ ہے کہ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ شیخ صاحب کو پورے قرآن مجید کا ترجمہ پایہ تکمیل تک پہنچانے کی سعادت و ہمت اور مہلت عطا فرمائے۔

مترجم نرم دم گفت گو، گرم دم جستجو کی عملی تصویر ہیں۔ تواضع اور انکسار ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس جدوجہد اور طویل عرصہ سے بیمار و معذور رہنے والی صاحبزادی جو ۱۱ جنوری ۲۰۰۴ء کو وفات پا گئیں کو ان کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔ میں تو ان کے لیے اس تحریری دعا کے علاوہ بھی دعا گو رہتا ہوں۔

خاکسار

حافظ محمد ادریس (منصورہ) لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتب

ربّ کریم کی بے پایاں عنایات نے اِنسانوں کو ہمیشہ اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ ایک طرف انہیں نورِ بصیرت سے ہمکنار کیا تو دوسری طرف وحی الٰہی سے اُن کی دستگیری بھی فرمائی، ان کی ہدایت کے لئے انھی میں سے نیک سیرت انسانوں کو منتخب فرمایا اور انہیں اپنی ہدایت سے بہرہ ور کیا۔ یہ پاکباز انسان انبیاء کہلائے، علیہم السلام، اِن نفوسِ قدسیہ کی زندگیاں دوسروں کے لئے نمونہ ٹھہریں کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو اپنی زندگیوں میں جاری وساری کیا۔ دنیا کے مختلف خطّوں اور علاقوں میں کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور رسول آئے اور اُن سب نے بلاکم وکاست حق کا پیغام انسانیت تک پہنچایا، سب سے آخر میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب قرآن حکیم عطا فرمائی اور آپ کی حیات طیبہ کو قرآن حکیم کی جیتی جاگتی تصویر بنادیا: ''کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن'' اور قرآن حکیم کی حفاظت کا ذمہ بھی خود لے لیا۔ ''اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ''۔

قرآن حکیم کی حفاظت کئی طرح سے ہورہی ہے:

ا) اسے حِفظ کرنے کیے لئے اللہ تعالیٰ نے سینوں میں فَراخی پیدا فرمادی، اس عظیم الشان، ضخیم کتاب کو چھ سات برس کا بچہ اپنے سینہ میں ضبط کرلیتا ہے اور ماہ رمضان میں درجنوں نمازیوں کی امامت کرتے ہوئے اسے سنا ڈالتا ہے اور یہ سلسلہ تواتر سے صدیوں پر محیط ہے، اس وقت دنیا کے ہر ملک، اس کے ہر شہر، ہر بستی اور ہر گاؤں میں سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں حفاظ موجود ہیں اور شب وروز ہزاروں بچے حفظ کررہے ہیں، یہ شرف صرف اور صرف قرآن حکیم کو حاصل ہے اس کے علاوہ دنیا میں کوئی بھی کتاب اس فضیلت سے بہرہ ور نہیں ہے۔

ب) اِس کے معنی ومطالب کو ذہن نشین کرانے کے لئے اہل حق میں سے علماء کرام کو اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی جنہوں نے اِس خدمت میں اپنی زندگیاں وقف کرڈالیں، متقدِّمِین اور متاخّرِیْن میں سے متعدد اہلِ

علم وفضل کا قرآن حکیم سے قلبی لگاؤ رہا اور انہوں نے تفسیری خدمات کو بہ دل و جان سرانجام دیا، چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱- علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ (متوفی ۳۱۰ھ).....ان کی ''تفسیر طبری'' کے نام سے مشہور ہے۔اور بڑے سائز کی تیس جلدوں میں ہے۔

۲- حافظ عمادُ الدّین ابوالفِدا ابن کثیر دمشقی شافعیؒ (متوفی ۷۷۴ھ) کی تفسیر ''ابن کثیر'' کے نام سے معروف ہے یہ پانچ ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳- علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح القرطبی (متوفی ۶۷۱ھ) کی تفسیر ''تفسیر اَلقُرطبی'' کے نام سے معروف ہے اور دس ضخیم جلدوں میں ہے۔

۴- اِمام فخرالدّین رازیؒ (متوفی ۶۰۶ھ) ان کی تفسیر ''تفسیر کبیر'' کے نام سے مشہور ہے اور آٹھ بڑی جلدوں میں ہے۔

۵- علامہ ابوحیّان غرناطی اندلسی (متوفی ۷۵۴ھ) ان کی تفسیر **"البحر المحیط"** کے نام سے موسوم ہے۔

۶- علاّمہ محمود آفندی الآلوسی (متوفی ۱۲۷۰ھ).....ان کی تفسیر ''روح المعانی'' کے نام سے جانی جاتی ہے اور تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔

۷- احمد مصطفیٰ المراغی.....ان کی تفسیر ''المراغی'' کے نام سے مشہور ہے اور دس ضخیم جلدوں میں ہے۔

۸- ابی بکر جابر الجزائری.....ان کی تفسیر ''ایسر التفاسیر'' کے نام سے معروف ہے اور چار ضخیم جلدوں میں ہے۔

۹- محمد جمال الدّین القاسمی.....ان کی تفسیر ''القاسمی'' کے نام سے معروف ہے اور دس ضخیم جلدوں میں ہے۔

۱۰- سید قطب شہیدؒ.....ان کی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کے نام سے مشہور ہے اور آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے۔

۱۱- مولانا ابوالوفا ثناءاللہ امرتسری.....ان کی تفسیر ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' کے نام سے مشہور ہے۔

۱۲- محمد الامین بن محمد المختار الشّنقیطی.....ان کی تفسیر کا نام ''اَضْوَاءُ البَیَان فِیْ ایضاح القُرْآن'' ہے اور یہ آٹھ جلدوں میں ہے۔

۱۳- محمد علی الصابونی۔ان کی تفسیر ''صفوۃ التفاسیر'' کے نام سے معروف ہے ۳ جلدوں میں ہے۔

یہ سب عربی تفاسیر ہیں اور اب چند اردو تفاسیر کے نام:

۱۴- سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' ہے، یہ چھ جلدوں میں ہے۔

۱۵- مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کے نام سے معروف ہے، یہ نو جلدوں میں ہے۔

۱۶- مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر ''معارف القرآن'' ہے، یہ آٹھ جلدوں میں ہے۔

۱۷- مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' ہے، یہ دوجلدیں ہیں اور صرف سترہ پارے ہیں۔

۱۸- مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ کی تفسیر ''تیسیر القرآن'' ہے یہ چار جلدوں میں ہے۔

۱۹- ڈاکٹر محمد لقمان السلفی کی تفسیر ''تیسیرُ الرحمٰن'' ہے، یہ دوجلدوں میں ہے۔

۲۰- حافظ صلاح الدّین یوسفؔ کی تفسیر ''احسنُ البیان'' کے نام سے معروف ہے۔

۲۱- مولانا عبدالماجد دریابادی کی کاوش ''تفسیر ماجدی'' کے نام سے مشہور ہے، یہ دوجلدوں میں ہے۔

۲۲- مولانا عبدالحی فاروقیؔ کی تفسیر ''درس قرآن'' ہے، یہ چھ جلدوں میں ہے۔

۲۳- مولانا محمد حنیف ندوی، کی تفسیر ''سراج البیان'' کے نام سے معروف ہے، یہ پانچ جلدوں میں ہے۔

مندرجہ بالا جن مفسرین کے آخر (بریکٹ) میں سنِ وفات درج نہیں ہے انہوں نے یہ تفاسیر تقریباً گزشتہ صدی (۱۴۰۰) ھجری میں لکھی ہیں البتہ ہمارے محترم الشیخ صلاح الدین یوسف اور ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی المحترم نے چند سال قبل تکمیل فرمائی ہے۔ان سب حضرات نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق تفسیری موتی بکھیرے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور انہیں اجرِ عظیم سے نوازے اور مجھے یومِ جزا اُن کی صف کے پیچھے کھڑا کردے! آمین۔

تفسیر طبری (ابن جریر) تفسیر ابن کثیر، تفسیر رازی البحر المحیط اور روح المعانی کے علاوہ عاجز کی چھوٹی سی لائبریری میں مندرجہ بالا تمام تفاسیر موجود ہیں اور ''الفرقان'' مرتب کرتے وقت میں ان کا خوشہ چین رہا ہوں، ان میں جہاں جہاں بھی کوئی اچھا نکتہ ملا ہے وہ حوالے کے ساتھ الفرقان میں درج کردیا ہے۔

عربی لغت کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل کتب پیشِ نظر رہی ہیں:

۱- المفردات فی غریبِ القرآن.....اَبی القاسم الحُسین بن محمد المعروف بالرّاغب الاصفہانی (۵۰۴ھ)

۲- کلماتُ القرآن.....الشیخ حسنین بن مخلوف

۳- انوار القرآن.....مولوی عبدالرحمٰن صاحب

۴- القامُوس الوحید.....مولانا وحیدالزّماں قاسمی کیرانوی

۵- مُترادِفات القرآن.....مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

۶- المعجم الوسیط.....لجنۃ العلماء

۷- مصباح اللغات.....مولانا عبدالحفیظ بلیاوی

اس کے علاوہ قرآن حکیم کے قدیم وجدید متعدد ترجمے سامنے رہے۔

الفرقان کو چھاپ کر مادی نفع حاصل کرنے کا ادنیٰ سا خیال بھی ذہن میں نہیں ہے، بس فکر ہے تو یہی کہ امتِ

مسلمہ قرآن جیسی گوہر نایاب کتاب کو مقصد حیات بنا کر اپنی عظمتِ رفتہ کو پھر سے پالے۔ اِس سے قبل الفرقان (الجزء الاوّل) مع ضمیمہ (قرآنی مضامین) کا خوبصورت ایڈیشن سال (۱۴۲۳ھ) میں چھپ کر تحفۃً تقسیم ہو چکا ہے، اس کے بعد سورۃ البقرہ مکمل شائع کر کے تقسیم کی گئی۔ اسے بہن بھائیوں نے بڑا پسند کیا اور کئی دینی مدارس اور متعدد مقامات پر اِس کے مطابق دروس القرآن کا سلسلہ جاری کیا گیا ہے، اور لوگوں کو خاصا فائدہ پہنچا ہے، الحمدللہ! اب سورۃ البقرہ کو نظر ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

جو بہن بھائی اِس کی اشاعت میں حصہ لے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے جذبے کو قبول فرمائے۔ اور ہم سب کو خلوص کی نعمت سے بہرہ ور فرما کر جنت الفردوس میں اکٹھا کر دے: آمین۔

اس سورہ کی نظر ثانی اور مسودوں کی پروف ریڈنگ کو بہتر سے بہتر بنانے کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے، میں برادرم جناب ارشاد الرحمٰن صاحب نائب مدیر ہفت روزہ ایشیا کا ممنون ہوں کہ انہوں نے یہ کام کیا، تاہم انسان کمزور واقع ہوا ہے اس تمام تر کوشش کے باوجود غلطیوں کا امکان ہے، بہن بھائیوں سے التماس ہے کہ دوران مطالعہ اگر کوئی غلطی پائیں تو عاجز کو مطلع کریں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے۔

خاکسار
شیخ عمر فاروق
B/15 وحدت کالونی، لاہور۔
فون: 7585960

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

شک وریب سے پاک

الٓمّٓ(۱) ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْهِ(۲)[البقرہ۲]

''الم،اس کتاب (قرآن مجید) میں کچھ شک نہیں۔''

اندھیروں سے روشنی کی طرف

الٓرٰ، کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ، بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ(ابراہیم۱۴:۱)

''الرٰ،(اے رسول ﷺ) قرآن مجید ایک کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے،تاکہ آپ انسانوں کو گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہدایت کی روشنی میں لائیں،اس اللہ کے راستے پر جو بڑا زبردست غلبے والا اور بذات خود تعریف کیا گیا ہے''۔

نزول قرآن کی ابتدا کا مہینا

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانُ(البقرۃ۲:۸۵)

رمضان کا مہینہ وہ (باعظمت مہینہ ہے) جس میں قرآن مجید کا نزول ہوا وہ (قرآن مجید) جو عالم انسانیت کے لئے سرمایہ ہدایت ہے اور جس میں (اللہ تعالیٰ کے نظام ہدایت کی) کھلی اور روشن دلیلیں ہیں اور جو حق وباطل کا فرق الگ الگ کر دینے والا ہے۔

ابتدا کس رات سے ہوئی؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ (القدر۹۷:۱)''ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا۔''

یہ دنیا کے تمام خزانوں سے بہتر ہے

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ، فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا، هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (یونس۱۰:۵۸)

''(اے رسول ﷺ) کہہ دیجئے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (یہ کتاب نازل ہوئی ہے) تو اس پر انہیں خوش ہونا چاہیے کیونکہ یہ (روحانی عظمتوں کا گنجینہ لازوال) ان تمام مادی وسائل سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں''۔

قرآن سہل اور آسان ہے

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر۵۴:۲۲)

''اور یقیناً یقیناً ہم نے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا پھر کیا ہے کوئی نصیحت ماننے والا؟''

توجہ اور غور سے سنو

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الاعراف۷:۲۰۴)

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہا کرو تا کہ تم پر رحم ہو (تم پر رحمت الٰہی نازل ہو اور فہم قرآن سے بہرہ ور ہو جاؤ)''۔

قرآن فہمی کے لئے رحمٰن کی مدد تلاش کیجئے

اَلرَّحْمٰنُ (۱) عَلَّمَ الْقُرْآنَ (۲) خَلَقَ الْاِنْسَانَ (۳) عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۴) [الرحمٰن۵۵]

''رحمٰن (وہی ہے) جس نے قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا اور اظہار مدعا کی صلاحیت بخشی''۔

قرآن پر تدبر کیجئے

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص۳۸:۲۹)

''جو کتاب ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے، بڑی بابرکت ہے تا کہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور تا کہ اہل عقل و بصیرت سبق حاصل کریں''۔

قرآن پڑھنے سے قبل تعوذ

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (النحل۱۶:۹۸)

''اور جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو''۔

ٹھہر ٹھہر کے پڑھیے

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا (المزمل۷۳:۴)

''اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کے پڑھا کیجئے (کہ مفہوم دل میں سما جائے)''

جسم ولباس پاکیزہ کر لیجیے

لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ۵۶:۷۹)

''اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں''۔

قرآنی احکام فرض ہیں

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ (القصص۲۸:۸۵)

''(اے نبی ﷺ) بلاشبہ جس (اللہ) نے آپ پر قرآن (عمل اور تبلیغ کے لئے) فرض کیا ہے یقیناً وہ آپ کو ایک اعلیٰ جگہ (جنت الفردوس) میں لوٹا دے گا''۔

قرآن کا راستہ سب سے سیدھا ہے

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل۱۷:۹)

''بلاشبہ یہ قرآن تو وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا ہے''۔

قرآن کو چھوڑنے والے

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (الفرقان۲۵:۳۰)

''اور روز جزا وسزا رسول ﷺ کہیں گے کہ اے میرے رب! میری قوم (کے یہ لوگ ہیں جنہوں) نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا''۔

بوقت فجر تلاوت قرآن کی فضیلت

وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ، اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (بنی اسرائیل۱۷:۷۸)

''اور (بوقت) فجر قرآن (کا بھی التزام کیا کرو) کیونکہ فجر کے وقت قرآن پڑھنا مشہود ہے (اس وقت فرشتے اعمال قلمبند کرتے ہیں)''۔

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے

بہترین شخص

وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:

"خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ" (رواہ بخاری)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سب سے بہتر بندہ وہ ہے جو قرآن کا علم حاصل کرے اور پھر دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔''

قابل رشک آدمی

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:

"لَا حَسَدَ اِلَّا فِیْ اِثْنَيْنِ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَقُوْمُ بِهٖ آنَاءَ الْلَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ، وَرَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَهُوَ يُنْفِقُهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ" (رواہ البخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''صرف دو آدمی قابل رشک ہیں.....ایک وہ جس کو اللہ نے قرآن کی نعمت عطا فرمائی پھر وہ صبح وشام اس کے پڑھنے پڑھانے میں لگا رہتا ہے اور دوسرا وہ شخص ہے جسے اللہ نے مال ودولت سے نوازا اور وہ بھی صبح وشام اسے اللہ کی راہ میں لٹاتا رہتا ہے (غربا ومساکین کی خدمت کرتا ہے)۔''

قوموں کا عروج وزوال

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:

"اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ" (رواہ مسلم)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآن مجید) کی بدولت بہت سے لوگوں کو بلند فرمائے گا اور بہت سے لوگوں کو نیچے

گرائے گا (اس پر عمل کرنے والے سرفراز ہوں گے جبکہ اس سے منہ موڑنے والے نامراد ہوں گے)۔''

قلوب کا صیقل ہونا

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:

''اِنَّ ھٰذِہِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ کَمَا یَصْدَأُ الْحَدِیْدُ، اِذَا اَصَابَہُ الْمَاءُ، قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَا جِلَاءُھَا؟ قَالَ کَثْرَۃُ ذِکْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَۃُ الْقُرْآنِ'' (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بنی آدم کے قلوب پر اس طرح زنگ آجاتا ہے جس طرح پانی لگنے سے لوہے پر زنگ آجاتا ہے، عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! دلوں کے اس زنگ کو دور کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا..... موت کو زیادہ یاد کرنا (کہ اس سے دل نرم ہوجاتے ہیں) اور قرآن مجید کی (سمجھ کر) تلاوت کرنا (کہ اس سے بندہ رموز حیات سے آگاہ ہوکر عمل کی طرف راغب ہوتا ہے)''

کاتب وقاریِ قرآن کا مقام

عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ:

''اَلْمَاھِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَۃِ الْکِرَامِ الْبَرَرَۃِ، وَالَّذِیْ یَقْرَءُ الْقُرآنَ وَیَتَتَعْتَعُ فِیْہِ وَھُوَ عَلَیْہِ شَاقٌ لَہٗ اَجْرَانِ'' (بخاری، مسلم)

ام المومنین بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے قرآن میں مہارت حاصل کرلی ہو (اور اس کی قرأت کے علاوہ مفہوم ومطالب کو بھی جانتا ہو) وہ معزز وفادار اور فرمانبردار فرشتوں کے ساتھ ہوگا (محترم ومعزز بن جائیگا) اور جو بندہ تلاوت کے دوران اٹکتا ہو تو اس کو دو اجر ملیں گے (ایک تلاوت کا دوسرا مشقت اور زحمت کا)

قرآن حکیم میں مشغولیت

عَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:

''یَقُوْلُ الرَّبُّ تَبٰرَکَ وَ تَعَالٰی مَنْ شَغَلَہُ الْقُرآنُ عَنْ ذِکْرِی وَمَسْأَلَتِیْ، اَعْطَیْتُہُ اَفْضَلَ مَا اُعْطِی السَّائِلِیْنَ، وَفَضْلُ کَلَامِ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلٰی سَائِرِ الْکَلَامِ کَفَضْلِ اللّٰہِ عَلٰی خَلْقِہٖ'' (ترمذی، دارمی)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''جس شخص کو میرے ذکر اور سوال (دعا) کرنے سے قرآن نے مشغول رکھا میں اس کو اس سے افضل عطا کروں

گا جو سائلوں (اور دعا کرنے والوں) کو عطا کرتا ہوں اور دوسرے اور کلاموں کے مقابلوں میں اللہ کے کلام کو ایسی عظمت وفضیلت حاصل ہے جیسی اپنی مخلوق کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔''

قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کا انعام

عَنْ مُعَاذِ الْجُهَنِيِّ، قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

"مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيْهِ أُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ضَوْءُهُ اَحْسَنُ مِنْ ضَوءِ الشَّمْسِ فِي بُيُوْتِ الدُّنْيَا لَو كَانَتْ فِيْكُمْ، فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِي عَمِلَ بِهٰذَا؟" (رواہ احمد۔ابوداؤد)

حضرت معاذ جُہنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے قرآن پڑھا اور اس میں جو کچھ ہے اس پر عمل کیا، قیامت کے روز اس کے ماں باپ کو ایک ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ حسین ہوگی جبکہ وہ روشنی دنیا کے گھروں میں ہو اور آفتاب آسمانوں سے ہمارے پاس ہی اتر آئے.....اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پھر تمہارا کیا گمان ہے جس نے خود (قرآن پڑھا) اور اس پر عمل کیا ہو؟ (اسکی جزا اور انعام کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟)''

قرآن کی دیکھ بھال

عَنْ أَبِي مُوسٰى رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ:

"تَعَاهَدُوْا هٰذَا الْقُرْآنَ، فَوَ الَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَهُوَ أَشَدُّ تَفَلُّتًا مِنَ الْإِبِلِ فِيْ عُقُلِهَا" (متفق علیہ)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''قرآن حکیم کی نگرانی کرو (سمجھ کر روزانہ تلاوت کیا کرو) اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے کہ اس کا سینوں سے نکل جانا بندھے ہوئے اونٹ کے نکل بھاگنے سے زیادہ آسان ہے۔''

خوش الحانی

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ:

"مَا أَذِنَ اللّٰهُ لِشَيءٍ مَا أَذِنَ لِنَبِيٍّ حَسَنِ الصَّوتِ يَتغَنَّى بِالْقُرْآنِ يَجْهَرُ بِهِ" (متفق علیہ)۔

حضرت ابوھریرہ ﷺ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

اللہ تعالیٰ کو کوئی آواز اتنی پسند نہیں جتنی کہ نبی ﷺ کی اچھی آواز کہ جو خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں (اس طرح نبی ﷺ) کی اتباع میں جو شخص بھی تلاوت کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ومستجاب ہے۔

فتنہ میں ذریعہ نجات

ترمذی کی ایک حدیث ہے جس میں حارثؓ اعور فرماتے ہیں:

مَرَرْتُ فِی الْمَسْجِدِ فَاِذَ النَّاسُ یَخُوْضُوْنَ فِی الْاَحَادِیْثِ

فَدَخَلْتُ عَلٰی عَلِیٍّؓ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ اَوَ قَدْ فَعَلُوْها؟

میں مسجد میں داخل ہوا۔ تو دیکھا کچھ لوگ بعض مسائل میں جھگڑا کر رہے ہیں۔

تو میں حضرت علیؓ کے پاس گیا اور انھیں اس بات کی خبر دی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: کیا یہ باتیں ہونے لگیں؟

قُلْتُ نَعَمْ (میں نے کہا: جی ہاں۔)

قَالَ اَمَا اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَلَا اِنَّهَا سَتَکُوْنُ فِتْنَةٌ

حضرت علیؓ نے فرمایا: ''یاد رکھو میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: خبردار رہو، عنقریب ایک بڑا فتنہ سر اٹھائے گا۔''

قُلْتُ فَمَا الْمَخْرَجُ فِیْهَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ (میں نے عرض کیا ''اس فتنے میں ذریعہ نجات کیا ہوگا''؟)

قَالَ: ''کِتَابُ اللّٰهِ'' (آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب'')

فِیْهِ نَبَاءُ مَا قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ هُوَالْفَصْلُ لَیْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَکَهٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ وَمَنِ ابْتَغَی الْهُدٰی فِیْ غَیْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ

(اس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے حالات ہیں۔ تم سے بعد میں ہونے والی باتوں کی خبر ہے اور تمہارے آپس کے معاملات کا فیصلہ ہے۔ اور یہ ایک دوٹوک بات ہے۔ ہنسی دل لگی کی باتیں نہیں ہیں جو سرکش اسے چھوڑ دے گا اللہ اس کی کمر توڑ دے گا اور جو اسے چھوڑ کر کسی اور بات میں ہدایت تلاش کرے گا اللہ اسے گمراہ کر دے گا۔)

وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ (اوراللہ کی مضبوط رسی یہی ہے۔)

وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ (اور یہی حکمتوں سے بھری ہوئی یاددہانی ہے۔)

وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ (اور یہی بالکل سیدھی راہ ہے۔)

وَهُوَالَّذِیْ لَا تَزِيْغُ بِهِ الْاَهْوَاءُ (اوراس کے ہوتے ہوئے خواہشیں گمراہ نہیں کرتی ہیں۔)

وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْاَلْسِنَةُ (اور نہ اس سے زبانیں لڑکھڑاتی ہیں۔)

وَلَا تَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ (اوراہل علم کا دل کبھی اس سے سیر نہیں ہوتا۔)

وَلَا يَخلُقُ عَلٰى كَثْرَةِ الرَّدِّ (اور یہ بار بار دہرانے سے پرانا محسوس نہیں ہوتا)

وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ (اوراس کی عجیب باتیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔)

وَهُوَالَّذِیْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ اِذَا سَمِعَتْهُ حَتّٰى قَالُوْا (یہ وہی ہے جسے سنتے ہی جن پکار اٹھے تھے)

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِیْ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ

(بلاشبہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے لہٰذا ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔)

مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ (جس نے اس کی سند پر کہا، سچ کہا۔)

مَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ (جس نے اس پر عمل کیا اجر پائے گا۔)

وَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ (جس نے اس کی بنیاد پر فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا۔)

وَمَنْ دَعَآ اِلَيْهِ هَدٰى اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

(جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کی۔)

خُذْهَا اِلَيْكَ يَا اَعْوَرُ (اے اعور! ان باتوں کو گرہ میں باندھ لو۔)

ان مبارک الفاظ میں بڑی نصیحت ہے خصوصاً مندرجہ ذیل باتوں پر غور کیجیے:

۱- فتنے کے زمانے میں قرآن ہی ذریعہ نجات ہے۔

۲- یہی ہمارے سارے قضیوں اور جھگڑوں کا فیصل ہے۔

۳- اس کو چھوڑ دینا دنیا کی بہت بڑی سرکشی ہے اور اس کے بعد انسان اللہ تعالیٰ کی مدد اور حمایت سے محروم اور اس کے غضب کا شکار ہو جاتا ہے۔

۴- قرآن پر ایمان رکھنے والوں کو قرآن سے منہ موڑنے کے بعد سوائے گمراہی کے کچھ نصیب نہ ہوگا۔

قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی

قرآنِ حکیم کتابِ ہدایت ہے، یہ رب العالمین کا پیغام انسان کے نام ہے اس نے اسے جبریل امین کے ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر نازل فرمایا۔ کیوں اتارا؟ ارشاد ہوتا ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ. (صٓ:۲۹)

''یہ ایک بڑی بابرکت کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل وفکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔''

عربی زبان میں کتاب کو پڑھنے کے لئے قرأت کا لفظ آتا ہے جس سے اسم فاعل قاری عربی میں پڑھنے والے کو کہتے ہیں جب کہ تدبّر اس طرح پڑھنے کو کہتے ہیں کہ کتاب کے الفاظ اور عبارت پر غور وفکر کیا جائے، معنی اور مطالب کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اس کے احکام وہدایات کو حرزِ جان بنانے کی سعی وجستجو کی جائے اس لئے اس آیۂ مبارکہ میں ہے کہ عقلمند اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں کہ قلب وروح کو جلا بخشنے اور فرد واجتماع کو سنوارنے کے لئے جو تصورات اس میں مذکور ہیں، ان کو عمل میں لاتے ہیں اور ان کی روشنی میں اپنے لئے نظامِ حیات وضع کرتے ہیں۔ اسی سے زندگی میں انقلاب آتا ہے، وہ عزت ورفعت سے ہمکنار ہوتی ہے کیا خوب شاعر مشرق نے کہا ہے ؎

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست؟
زیر گردوں سر تمکین تو چیست؟

آں کتاب زندۂ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم

کیا تو جانتا ہے کہ تیرا آئین کیا ہے۔آسمان کے نیچے تیری شان وشوکت کا راز کیا ہے۔وہ کتابِ زندہ قرآنِ حکیم ہے یقیناً اس میں درج حکمت کی باتیں ہمیشہ رہنے والی اور قدیم ہیں۔(اور حکمت کبھی پرانی نہیں ہوتی)۔

قرآنِ حکیم سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تلاوت کے وقت دل ودماغ کو حاضر کیا جائے، اور سمع وبصر کو کام میں لایا جائے، اور یہ خیال کیجئے کہ آپ کوئی معمولی کتاب نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ خالق کائنات کا کلام ہے جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آپ تک پہنچایا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ. (قٓ:۳۷)

''بے شک اس میں درس عبرت ہے اس کے لئے جس کے پاس قلب (سلیم) ہو یا جو کان لگا کر بات سنے اور دل سے حاضر ہو (قرآن کے بیان کردہ واقعات پر غور وفکر کر سکے)۔''

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''لفظ قلب اپنے حقیقی یعنی دل زندہ کے معنی میں ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے قلب (دل) کو احساس کرنے، عبرت حاصل کرنے اور سوچنے سمجھنے کے لئے بنایا ہے، جب تک آدمی کا دل یہ کام کرتا ہے، اس وقت تک اس کا دل زندہ ہے اور جب تک دل زندہ ہے (یعنی اس میں سوچ بچار کی صلاحیت ہے) اس وقت تک آدمی بھی زندہ ہے۔اس لئے کہ آدمی کی حقیقی زندگی اس کے دل کی زندگی ہی سے ہے، اگر دل یہ خصوصیات کھو بیٹھا تو پھر آدمی بھی مردہ ہے اگرچہ اس کی رگوں میں کتنا ہی خون دوڑتا پھرتا ہو۔

''اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْد'' یعنی اگر دل پوری طرح بیدار نہ ہو تو کم از کم اتنی بات تو انسان کے اندر ہو کہ کوئی معقول آدمی اس کو کوئی بات سنائے تو وہ اس کو توجہ سے سنے، یہ توجہ بھی انسان کے لئے بڑی خیر وبرکت کا باعث ہے، اس سے بھی بسا اوقات دل کی غفلت دور اور اس کی عبرت پذیری کی صلاحیت زندہ ہو جاتی ہے، لیکن جو شخص ایسا بدقسمت ہو کہ نہ اس کا دل ہی بیدار ہو اور نہ وہ کسی معقول آدمی کی بات سننے ہی کے لئے اپنے کان کھولنے پر آمادہ ہو تو ایسے آدمی کے اندر کوئی معقول بات کدھر سے راہ پائے گی (تدبر قرآن جلد ششم)

نصیحت حاصل کرنے اور اس سے فیض یاب ہونے کے لئے دل سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور بات کو توجہ سے سننے کی عادت کے علاوہ شہید کا لفظ بول کر مزید چوکس کیا جا رہا ہے کہ وہ محض جسم وجان کے ساتھ ہی نہیں بلکہ دل ودماغ کے ساتھ حاضر رہے، مثلاً غور کیجئے کہ وہی نماز قیمتی بنتی ہے جو حضور قلب سے خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کی جائے۔اسی طرح وہی تلاوت سودمند ثابت ہوتی ہے جو تدبر اور پورے شعور سے کی جائے اور اس کے احکام کو دل وجان سے تسلیم کیا جائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ (۲۷) قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ (۲۸) [الزمر]

''یقیناً ہم نے لوگوں کے (سمجھانے) لئے قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں تا کہ وہ نصیحت پکڑیں (اور اپنی زندگیوں کو سنوار لیں) یہ قرآن (فصیح) عربی زبان میں ہے جس میں کوئی عیب (اور اختلاف) نہیں ہے تا کہ وہ ڈر جائیں (اور آخرت کے برے انجام سے بچ جائیں)۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شعور سے نوازا ہے اور شرفِ انسانیت کا تقاضا ہے کہ اس کو بروئے کار لایا جائے، قرآنِ حکیم سے وہی لوگ فیض یاب ہو سکتے ہیں جو اس پر تدبر اور تفکر کرتے ہیں، رب کریم کا اعلان ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا. (محمد۔۲۴)

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں۔''

ظاہری بصارت کے ساتھ ساتھ جب تک داخلی بصیرت سے کام نہ لیا جائے انسان کبھی کسی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ قرآنِ حکیم نے یہ بات واشگاف الفاظ میں بتلائی کہ حقیقی اندھا پن، دل کا اندھا پن ہے۔ جو لوگ ظاہری آنکھیں رکھتے ہوئے بھی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، وہ بصارت رکھتے ہوئے بھی اندھے ہیں کیونکہ انہوں نے بصیرت سے کام نہ لیا اور وہ دل کے اندھے ہو گئے۔

ارشاد ہوتا ہے!

فَاِنَّهَا لَاتَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ. (الحج:۴۶)

''حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

قرآنِ حکیم کتابِ عظیم ہے، اسی کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہمارے اسلاف قدر و منزلت اور عروج و سربلندی سے ہمکنار ہوئے تھے۔ آج امت مسلمہ اس دولت بے بہا اور متاع گراں مایہ سے غافل ہو چکی ہے۔ اسے محض برکت کے طور پر محفلوں اور مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے۔ مگر اس کی قیمتی اور لازوال تعلیمات کا اثر کہیں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ یہ مسلمان کے لئے زندگی گزارنے کا آئین (دستورِ حیات) ہے۔ مگر آج مسلمان کیلئے ہر طرف سے ذلت و خواری ہے۔

شاعر مشرق اس پر اس طرح آنسو بہاتا ہے ؎

ملّتے را رفت چوں آئین ز دست
مثل خاک اجزائے او ازہم شکست

ہستی مسلم ز آئین است و بس
باطن دین نبیؐ این است و بس

برگِ گل شد چوں ز آئیں بستہ شد
گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد

نغمہ از ضبط صدا پیدا ستے
ضبط چوں رفت از صدا غوغا ستے

(ہائے افسوس) جب آئین ملت کے ہاتھ سے چلا گیا تو مٹی کی طرح اس کے اجزا بھی بکھر گئے، مسلمان کی ہستی صرف آئین پر ہی ہے اور بس۔ نبی ﷺ کے دین کا باطن یہی ہے اور بس، جب پھول کی پتیاں آئین سے وابستہ ہو جاتی ہیں، تو گلدستہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں (کیا یہ حقیقت نہیں ہے) کہ آواز کو ضابطے میں لانے سے نغمہ پیدا ہوتا ہے اور جب نظم و ضبط ختم ہو جاتا ہے تو وہ محض بے ہنگم شور و غل ہوتا ہے۔

قرآن آج پھر امت مسلمہ کو پکار رہا ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (آل عمران۔۱۳۹)

''اور تم دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔''

(شیخ عمر فاروق)

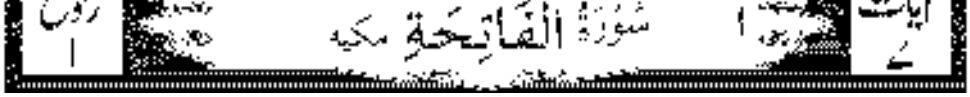
﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾

''میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کی شیطان مردود سے بچنے کیلئے۔''

عَاذَ يَعُوْذُ (پناہ طلب کرنا، حفاظت میں آنا) اَعُوْذُ (میں پناہ میں آتا ہوں) بِاللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کی) مِنْ (سے) الشَّيْطٰنِ (شَطَنٌ۔ سے ہے، گمراہ کرنا، بھٹکانا، شَيْطٰنٌ کا مطلب ہے بھٹکانے والا) الرَّجِيْم رَجَمٌ سے ہے، (پتھر مارنا، دھتکارنا) الرَّجِيْم (پتھر مارا ہوا، سنگ زدہ، دھتکارا ہوا، اللہ تعالی کی نافرمانی کے سبب بارگاہ الٰہی سے دھتکار دیا گیا)۔

قرآن حکیم کی تلاوت کی ابتداء تَعَوُّذْ (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ) سے کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ (النحل:۹۸) ''جب بھی آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کریں۔''

شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے اور اس سے بچاؤ کی تدبیر یہی ہے کہ بندہ اپنے معبود حقیقی، اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجائے، پھر اسے کوئی بھی کوئی نقصان اور گزند نہیں پہنچا سکتا وگرنہ شیطان تو ہر وقت اپنے لاؤ لشکر سمیت (جو انسانوں اور جنوں پر مشتمل ہے) نیک لوگوں کی گمراہی کے درپے ہے اور ہر نیکی کی راہ میں رکاوٹ ڈالتا ہے اور قرآن حکیم کو سمجھنے میں تو خصوصی رکاوٹ ڈالتا ہے تاکہ لوگ احکام الٰہی کی تفہیم سے قاصر رہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ(۱)	''اللہ کے نام سے جو رحمٰن ورحیم ہے۔''

اِسْم (نام) ب (ساتھ) اللّٰه (کائنات کے خالق و مالک کا اسم ذاتی ہے) بِسْمِ اللّٰهِ (اللہ کے نام کے ساتھ، اس تمام کائنات اور اس کی ہر ہر چیز کا خالق و مالک صرف اور صرف اللہ ہے اور تنہا وہی اس کا مالک اور معبود حقیقی ہے)۔

اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ط وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ○ (طٰہٰ۲۰:۹۸)

''تمہارا معبود برحق تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔''

وہ تنہا اس کائنات کا خالق و مالک ہے اور اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء۲۱:۲۲) (اگر ارض وسماء میں اللہ کے سوا کوئی اور بھی اِلٰہ ہوتے تو اس کا نظام درہم برہم ہو جاتا)

وہ ہمارے ہر ہر عمل سے آگاہ ہے، اور روز جزا اس کے حضور جواب دہ ہونا ہوگا:

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَ اتَّقُوْا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ م بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (الحشر۵۹:۱۸)

(ہر انسان کو دیکھنا چاہئے کہ اس نے کل (روز قیامت) کیلئے کیا سامان کیا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ یقیناً اس سے پوری طرح باخبر ہے۔)

وہ زندہ ہے اور کائنات کا نظام سنبھال رہا ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (البقرہ۲:۲۵۵)

(اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور نظام کائنات قائم رکھے ہوئے ہے)۔

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ق كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ط (القصص۲۸:۸۸)

(اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اس کی ذات کے علاوہ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے)

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِیۡهِنَّ ؕ وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِیۡحَهُمۡ ؕ (بنی اسرائیل ۱۷:۴۴)

''ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں بلکہ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔''

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف ترین مخلوق اور اپنا نائب بنا کر زمین پر بھیجا، اس کیلئے لازم ہے کہ اس کے دین کو پوری طرح زمین پر نافذ کرے۔

اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡهِ ؕ (الشوریٰ ۴۲:۱۳)

یہ کہ دین کو قائم رکھو (میرا نظام زمین پر نافذ کرو) اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

الرَّحۡمٰن عربی زبان کے فَعۡلَان کے وزن پر آیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے اس میں جوش و خروش پایا جاتا ہے یعنی اس کی رحمت ہمیشہ ٹھاٹھیں مارتی رہتی ہے۔ الرَّحِیۡم فَعِیۡل کے وزن پر ہے جس کے معنی جاری وساری کے ہیں یہ بھی اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے جس کا مطلب ہے کہ اس کی رحمت کبھی منقطع نہیں ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات لامحدود ہیں۔ اُسے اللہ تعالیٰ کہہ کر پکارو یا اس کے صفاتی ناموں سے پکارو، ہر طرح سے اس کی رحمت اپنے دامن میں چنو گے: قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ اَوِادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَیًّامَّا تَدۡعُوۡا فَلَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ۚ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۱۰) ''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرما دیجئے کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن، جس نام سے بھی پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں۔''

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق وہ بھی ہے جسے شیطان کہتے ہیں، وہ آگ سے پیدا کیا گیا ہے اس کا اصل نام عزازیل ہے، جب فرشتوں اور آدم علیہ السلام میں مقابلہ ہوا اور حضرت آدمؑ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ سب کے سب آدمؑ کے آگے جھک جائیں۔ چنانچہ ان سب نے انہیں سجدہ (تعظیمی) کیا مگر شیطان (ابلیس) نے سجدہ کرنے سے انکار

آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آدم کو مٹی سے، اس لیے میں اس سے بہتر ہوں، آگ مٹی کے آگے کیسے جھک سکتی ہے؟ شیطان کو اسی تکبر کی بنا پر ہمیشہ کے لیے مردود قرار دے دیا گیا اور قیامت تک کے لیے اس پر لعنت بھیجی گئی، اس نے قیامت تک زندہ رہنے کی اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگ لی جو اسے دے دی گئی یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی کہ اس طرح انسان کا امتحان لیا جائے۔''

اب شیطان نے اپنی اس ذلت کا بدلہ لینے کی ٹھان لی، کسی نہ کسی طریقے سے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی حوا کو جنت سے نکلوا دیا اور اس نے اس بات کا اعلان کر دیا کہ میں قیامت تک آدم کی اولاد کو صحیح راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا رہوں گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان ہمارا مستقل دشمن ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اس طرح اللہ کے حضور دعا کیا کریں: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ''میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان مردود سے (بچنے کے لیے)۔''

۲) جو اس دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاتا ہے، شیطان (یا اس کے ساتھی) اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے اور ان شیطانوں کا وار انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس دعا سے غافل ہو جاتے ہیں۔

۳) شیطان (ابلیس) جنوں میں سے تھا، اس نے انسانوں اور جنوں میں سے بہت سے ساتھی بنا لیے ہیں، اس لیے ان سب سے بچنے کے لیے یہ دعا سکھلائی گئی ہے:

رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ○ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ○

(مومنون ۲۳:۹۷، ۹۸) ''اے میرے رب! میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس بات سے بھی اے میرے رب! تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس حاضر آئیں۔''

۴) قرآن مجید کی تلاوت کے آداب میں یہ بات شامل ہے کہ تلاوت کی ابتدا تعوّذ سے کی جائے تاکہ اللہ تعالیٰ قوی وقدیر ہمیں اپنی پناہ میں چھپا لے، اس نیک کام میں شیطان کو بہکانے اور پھسلانے کا موقع نہ ملے، آیات کی غلط تاویل سے، معنوں کی حقیقت بدل جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں ہر قسم کی گمراہیوں سے محفوظ رکھے۔ آمین!

۵) حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی کام شروع فرماتے تو اس سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ لیا کرتے تھے۔

میری نیت میں پورا پورا خلوص ہے، میرا مقصد اعلیٰ ہے، میں صرف اللہ کا بندہ ہوں اور شرک سے پوری طرح بیزار ہوں۔ (درس قرآن، جلد اول)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲)	''ہر حمد اور ہر شکر اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

اَلْحَمْدُ، حَمِدَ يَحْمَدُ ، حَمْدًا۔ تعریف اور شکر دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ تعریف اللہ تعالیٰ کے کمالات پر اور شکر اس کے انعامات واحسانات پر۔ اَلْحَمْدُ میں اَل کلمہ اِسْتِغراق ہے یعنی ہر طرح کی حمد وثنا، تمام شکر اور تمام تعریفیں صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، اگر کسی چیز میں کوئی خوبی ہے تو وہ عطائی ہے۔ اس کی اپنی نہیں ہے، یہ کائنات اور اس کی ہر چیز اللہ تعالیٰ نے بنائی اور سجائی ہے اور اس نے ان میں کمال و جمال کا وصف بھرا ہے، حاکم اگر عادل ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ نے اس کے اندر صفت عدل رکھ دی ہے، طبیب اگر حاذق ہے تو اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اللہ نے اسے یہ کمال عطا فرمایا ہے، آفتاب میں حرارت ہے اور ماہتاب میں ٹھنڈک ہے تو یہ اسی کی قدرت کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ پھولوں میں خوشنمائی و رعنائی اور پھلوں میں مٹھاس اور مزے ہیں تو اسی کی کاریگری کے نشان ہیں اس لئے تعریف وستائش کے لائق صرف اسی کی ذات بابرکات ہے۔

اگرچہ الحمدللّٰہ میں اللہ تعالیٰ کی تعریف اور شکر کا بیان ہے لیکن اس میں ایک معجزانہ انداز سے مخلوق پرستی کی بنیاد ختم کر دی گئی ہے اور دلنشیں اور فطری طرز پر توحید کی تعلیم دی گئی ہے۔

سیدنا ابراھیم علیہ السلام اسحاقؑ اور اسماعیلؑ کی پیدائش پر اللہ تعالیٰ کا شکر اس طرح ادا فرماتے ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ (ابراھیم ۱۴:۳۹)

''شکر ہے اللہ کے لئے جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔''

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ ○ (الحجر۱۵:۹۸)

''لہٰذا آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجئے اور اپنی جبین نیاز اس کے آگے جھکا دیجئے''۔

کائنات کی ہر چیز، ہر شجر اور ہر حجر، ہر ذرہ اور ہر پتہ رب تعالیٰ کے حمد و شکر میں مصروف ہے، انسان کو تو اس نے اشرف المخلوقات بنایا اور اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے، کیا اسے غفلت زیب دیتی ہے؟

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ ط (بنی اسرائیل ۱۷:۴۴)

''کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں''۔

انسان کو زمین پر خالق کائنات نے اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے اس کے لیے تو لازم ہے کہ نیابت کا حق ادا کرتے ہوئے اس کی زمین پر اسکے دین (نظام حیات) کو پوری طرح نافذ کرے:

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ ط (الشوریٰ ۴۲:۱۳) ''اور دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو'' (کیونکہ یہ روز روشن کی طرح واضح ہے لَیْلُھَا کَنَھَارِھَا اس کی راتیں بھی دن کی طرح روشن ہیں)

جب لوگ ایمان کی مضبوطی کے ساتھ اقامتِ دین میں اپنی بھرپور صلاحیتیں صرف کر ڈالتے ہیں اور اسلام کی نعمت لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں ابدی نعمتوں سے سرفراز فرمائے گا اور پھر ان کی زبانوں پر یہ کلمات ہوں گے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا قف وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ ج (الاعراف ۷:۴۳)

''شکر ہر قسم کا اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں یہ (جنت کی) راہ دکھائی اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم خود ہدایت نہ پا سکتے''۔

اَلرَّبُّ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اس کے مفہوم میں بہت وسعت ہے وہ ہر چیز کو پیدا کرنے اور پالنے والا، اس کا نگران اور مالک حقیقی ہے۔ حدِ کمال تک پہنچانے والا، ہدایت کا سروسامان عطا کرنے والا اور اعمال کا بدلہ دینے والا اور معبود حقیقی ہے:

رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی ○ (طٰہٰ ۲۰:۵۰)

''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت بخشی اور پھر راہ دکھائی (شہد کی مکھی ہمیشہ پھولوں کا رس چوسے گی گندگی پر نہ بیٹھے گی)''۔

يَعْرِشُوْنَ ○ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا، يَّخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (النحل ۱۶:۶۹،۶۸)

''آپ کے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی (اسے سجھایا) کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور (انگور وغیرہ) کی بیلوں پر اپنا گھر (چھتا) بنا، پھر ہر قسم کے پھل سے رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کردہ راہوں پر چلتی رہ، ان مکھیوں کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا مشروب (شہد) نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے، بے شک غور وفکر کرنے والوں کے لیے اس میں یقیناً نشانی ہے''۔

شہد کی مکھیوں کا نظام اتنا مربوط اور منظم ہے کہ جس کا مطالعہ کر کے انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے اور غور وتدبر کرنے والوں کو اس میں رب کی ربوبیت کا واضح نشان ملتا ہے۔ فرمایا کہ وہ رَبُّ الْعَالَمِیْن، عَالَمْ کی جمع عالمیْن ہے، تمام جہانوں کا رب ہے رب المسلمین نہیں رب الناس ہے۔ تمام انسانوں کا رب، نہ کہ کسی ایک قوم کا۔

انسان، جن، فرشتے، چرند، پرند کا اپنا اپنا جہان ہے وہ سب کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتا ہے، ایک ہاتھی سے لے کر ایک چیونٹی تک بلکہ ایسے جراثیم جو ظاہری آنکھ سے دیکھے نہیں جا سکتے، ان کی دیکھ بھال، ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا سروسامان مہیا کرنا اسی رب وحدہ لا شریک لہ کی شان ہے۔

انسان کو تو اس نے نہ صرف علم وعقل سے شرف عطا کیا بلکہ وحی الٰہی کی روشنی عطا کر کے جینے کا پاکیزہ اور مصفّٰی سلیقہ اور قرینہ بھی عطا کر دیا، جس سے اس کے لیے دنیا میں عزت وسرفرازی اور آخرت میں ابدی فلاح وکامرانی کا راستہ ہموار فرما دیا ہے۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ (الذّٰریت ۵۱:۲۱)

''اور خود تمہارے اپنے اندر بھی (اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں) پھر کیا تم غور سے نہیں دیکھتے؟''

دنیا میں سب سے پیچیدہ مشینری اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا یہ انسانی جسم ہے جس پر آج تک نہ معلوم کتنی تحقیق ہو چکی ہے اور روز بروز ہو رہی ہے اور جسم کے ہر حصے کے ماہرین میدان میں آ رہے ہیں لیکن ابھی تک بعض بیماریوں میں ڈاکٹر حضرات بھی عاجز اور بے بس نظر آتے ہیں۔

۱) مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں: ''اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی پہچان کرائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ حمد وثنا در حقیقت اللہ ہی کے لیے ہے اگر کوئی حاکم انصاف کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے صفت عدل اس کے اندر رکھ دی ہے، کسی کے ہاتھ میں اگر شفا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اسے یہ کمال عطا کر دیا ہے، کوئی حسین اور خوبصورت ہے یا کسی کی عادت پاکیزہ ہے تو اس کے لیے بھی صفت وستائش کی اصل حق دار اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، کیونکہ یہ اسی کا عطیہ ہے۔''

۲) اس آیہ مبارکہ سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ اسلام کا رب کسی مخصوص نسل کسی مخصوص قوم یا قبیلہ کا رب نہیں، اسلام سے قبل جتنے مذاہب موجود تھے، وہ اس وسیع تصور سے واقف نہ تھے ہر قوم رب کو صرف اپنا خدا سمجھتی تھی، گویا رب کی حیثیت محض قومی رب کی رہ گئی تھی، بنی اسرائیل جیسی توحید پرست قوم بھی اسے صرف اپنا رب سمجھتی تھی، بلکہ ہندوؤں میں تو ہر شخص نے اپنے لیے الگ الگ خدا بنا رکھے تھے۔ مگر قرآن نے ان تمام غلط عقیدوں کو مٹا دیا اور بتایا کہ اس کائنات کے ہر ذرہ اور ہر چیز کا رب ایک ہی ہے اور اس کا اسم ذات اللہ ہے۔

۳) وہ 'اللہ' رب العالمین ہے یعنی تمام جہانوں کا پروردگار ہے کوئی بھی صنف موجودات اس کی ہمہ گیر نظام ربوبیت وتربیت سے آزاد ومستثنیٰ نہیں، اس سے ہمدردی وغمخواری کا وسیع تصور پیدا ہوتا ہے، تمام انسانوں سے شفقت ومحبت کے جذبات ابھرتے ہیں، کالے اور گورے کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔

۴) بحر وبر اور مشرق ومغرب کے کسی کونے میں چلے جائیں رب العالمین کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی جہاں کہیں اسے پکاریں، فوراً اس صدا کا جواب ملتا ہے:

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ۲:۱۸۶)

''اور جب میرے بندے آپ (ﷺ) سے میرے متعلق پوچھیں تو (کہیے) یقیناً میں قریب ہوں، جب دعا کرنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں دعا قبول کرتا ہوں۔''

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ (۳-۵)	ہے، اے (اللہ!) ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔''

﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کی تشریح گزشتہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ جزاوسزا کے دن کا مالک ہے۔

مَالِكِ : مَلَكَ يَمْلِكُ باب ضَرَبَ يَضْرِبُ سے اسم فاعل مَالِكٌ ہے، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے جس کے معنی ہیں کائنات کے نظم ونسق، انتظام وانصرام کا مالک، موت وحیات کا مالک، دنیا اور اس کی ہر چیز اسی کی ملکیت ہے وہ کسی کو دنیا میں کہیں بھی حکمرانی کا اختیار دیتا ہے تو جب چاہے چھین بھی سکتا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ، بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (آل عمران ۳:۲۶)

''آپ کہہ دیجئے ''اے اللہ ملک کے مالک! جسے تو چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کرتا ہے، سب بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، بلا شبہ تو ہر چیز پر قادر ہے''۔ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ○ (القیامۃ ۷۵:۴۰) ''کیا اللہ تعالیٰ اس امر پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کردے۔''

اس عارضی دنیا میں حکمرانی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جو حکمران لوگوں پر ظلم وستم روا رکھتے ہیں اور اپنی سطوت وشوکت کا لوہا منواتے ہیں کل روز جزاوسزا بے بسی کی تصویر بنے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ (المؤمن ۴۰:۱۷) آج حکومت کس کی ہے۔ سب کی زبانیں گنگ ہو جائیں گی کسی کو لب کشائی کی ہمت نہ ہوگی تو رب ذوالجلال کی طرف سے جواب ملے گا۔

لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○ (المومن ۴۰:۱۶) ''اللہ اکیلے کی جو سب پر غالب ہے۔''

جب کائنات پر مالک اللہ ہے، یہ ملک (عَالَمُ) بھی اسی کا ہے اور لوگوں کا حقیقی بادشاہ بھی وہی ہے تو انسان کو اس کی ہی عبادت کا دم بھرنا چاہئے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ○ مَلِكِ النَّاسِ ○ اِلٰهِ النَّاسِ ○ (الناس ۱۱۴:۱-۳)

حقیقی ہے (لہٰذا زندگی میں اسی کے احکام کی پیروی کی جائے گی)۔"

یَوْمِ الدِّیْنِ: "یوم جزا وسزا" "اَلدِّیْنِ" قرآن حکیم میں پانچ معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱- **توحید:** قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ○ (الزمر۳۹:۱۱)

"آپ کہہ دیجئے: مجھے تو یہ حکم ہوا ہے کہ میں خالصتاً اسی کی حاکمیت تسلیم کرتے ہوئے اس کی عبادت کروں۔"

۲- **یوم الحساب:** جزا وسزا کا دن، جیسا کہ فرمایا: مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○ (الفاتحہ۱:۴)

"مالک ہے یوم جزا وسزا کا۔"

۳- **دین اسلام:** اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (اٰل عمران۳:۱۹)

"اللہ تعالیٰ کے ہاں دین صرف اسلام ہے۔"

۴- **حکم:** اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ (النور۲۴:۲)

"زانی عورت ہو یا مرد، ان میں سے ہر ایک کو سو درے لگاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے حکم کے معاملہ میں تمہیں ان دونوں میں سے کسی پر ترس نہ آنا چاہئے۔"

۵- **قانون (Law):** مَا كَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ط (یوسف۱۲:۷۶)

"یوسف مصر کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو اپنے ہاں رکھ نہیں سکتے الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔"

﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾

اے (اللہ!) ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

اِیَّا، کلمہ تخصیص، كَ ضمیر واحد مذکر مخاطب اور مفعول ہے، عَبَدَ یَعْبُدُ سے نَعْبُدُ فعل مضارع جمع متکلم، اِسْتَعَانَ یَسْتَعِیْنَ (باب اِسْتِفْعَال) نَسْتَعِیْنُ فعل مضارع جمع متکلم۔

نَعْبُدُ اور نَسْتَعِیْنُ افعال ہیں اور اِیَّاكَ مفعول کی تقدیم حصر (خاص کرنا) کا فائدہ دیتی ہے، یعنی عبادت اور استعانت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، عبادت کو استعانت پر تقدیم اس لئے ہے کہ عبادت کے ساتھ بندہ اپنے مالک سے استعانت (مدد بھی) چاہتا ہے نیز جب تک اس کی مدد

اَلْعُبُوْدِیَۃُ کے معنیٰ کسی کے سامنے ذلت وانکساری ظاہر کرنا ہے مگر اَلْعِبَادَۃُ کا لفظ انتہائی ذلت و انکساری کرنے پر بولا جاتا ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ معنوی اعتبار سے العبادۃ کا لفظ العبودیۃ سے زیادہ بلیغ ہے لہذا عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہوسکتی ہے جو بے حدوحساب صاحبِ افضال وانعام ہواور ایسی ذات صرف اور صرف ذات الٰہی ہے۔اسی لئے فرمایا:

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۳)

''آپ کے رب نے فیصلہ کردیا ہے کہ تم اس کے سوااور کسی کی عبادت نہ کرو''۔

عبادت سے مراد صرف صوم وصلوۃ ہی کی ادائیگی نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر معاملہ میں اور ہر شعبہ حیات میں اسی کی اطاعت اور بندگی ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ط اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ ط (یوسف ۱۲:۴۰) ''اللہ کے سوا یہاں کسی کی فرماں روائی نہیں اس لئے اس نے یہی حکم دیا کہ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔''

اور جو لوگ اختیار واقتدار رکھتے ہوئے احکام الٰہی کو نافذ کرنے میں پہلوتہی کرتے ہیں قرآن ان کے بارے میں فیصلہ دیتا ہے جو کہ تین مختلف مقامات پر قرآن میں وارد ہے فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ○ ..... ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ ..... ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (المائدہ ۵:۴۴، ۴۵، ۴۷)

''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں تو وہی لوگ کافر ہیں.....وہ سب ظالم اور.....وہ سب نافرمان ہیں''۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں: اَلرَّحْمٰنُ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے رحمٰن ہونے کی صورت میں اس نے ہماری ہر حاجت کو پورا کرنے کا سامان کردیا، زمین وآسمان پیدا کئے، سورج، چاند اور ستارے بنائے، دریا اور سمندر بہائے، جنگل پھیلائے اور پہاڑ کھڑے کیے، نباتات، جمادات اور حیوانات پیدا کیے، اپنی رحمت کا سایہ والدین کے دل میں ڈالا کہ وہ اولاد سے بے غرض اور دلی محبت کرتے ہیں،

کی کوئی تمیز نہیں۔

۲) اَلرَّحِیۡمُ بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، ہمارے نیک اعمال اور افعال کا اجر زیادہ سے زیادہ دیتا ہے، وہ اس دنیا کے بعد بھی ہمیں اپنی رحمت میں ڈھانپ لے گا اور جنت کا وارث بنائے گا، وہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے بڑے بڑے نتائج پیدا کرتا ہے معمولی معمولی نیکیوں کے اجر زیادہ سے زیادہ دے گا۔ (درس قرآن، جلد اول)

۳) مَالِکُ بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، یَوۡمِ الدِّیۡنِ، یوم جزا و سزا، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ وہ اس دنیا کا بھی مالک ہے، مگر اس عارضی و فانی دنیا میں اس نے کچھ اختیارات انسانوں کو عطا کر رکھے ہیں جسے روز قیامت سلب کر لیا جائے گا اور وَالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ ○ (الانفطار ۸۲:۱۹) ''اور اس روز اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہوگا۔'' یہ دنیا امتحان گاہ ہے اور قیامت کے روز ہر انسان کا نتیجہ اسے سنایا جائے گا وہ نیکوں کو جزا اور بروں کو سزا دے گا، اور کسی پر رائی برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا، یہ آیہ مبارکہ انسانوں میں خوف اور ادب پیدا کرتی ہے، کہ وہ روزِ جزا و سزا کے مالک کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتے رہیں اور کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے خالق و مالک کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے۔

۴) نسل انسانی پر قرآن کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے خالق کائنات اور بندوں کے درمیان جتنے پردے حائل تھے ہٹا دیے اور یہ بتا دیا کہ ہر شخص اسے براہ راست پکار سکتا ہے، نہ عبادت کے لیے کسی وسیلے کی ضرورت ہے نہ استعانت کے لیے کسی شفیع کی حاجت، جب اور جہاں بھی کوئی اسے پکارے وہ پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے۔

۵) عبادت صرف صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار زندگی کے ہر معاملہ اور ہر مرحلے میں رب کائنات کی اطاعت اور بندگی کا دم بھرتے ہیں گویا کہ اس کے غلام ہیں اور ہمہ وقت اس کے احکام پر چلنے کے لیے تیار ہیں..... خواہ وہ سیاست ہو یا تجارت، معیشت ہو یا معاش، انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی۔

۶) ''اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ'' میں نکتے کی بات یہ ہے کہ عاجز بندے اپنے رب کے حضور فریاد کرتے ہیں کہ ''اے اللہ ہم تیری بندگی کا حق ادا نہیں کر سکتے جب تک تیری مدد شامل حال نہ ہو۔''

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ (۶)	''(اے اللہ) ہمیں صراط مستقیم پر چلا۔''

اِهْدِنَا: هَدٰی يَهْدِی سے فعل امر اِهْدِ، ہدایت عطا فرما، نَا ضمیر جمع متکلم ہمیں، اَلصِّرَاطَ، اَلطَّرِيْقَ راستہ۔ اَلْمُسْتَقِيْم۔ لَا اِعْوِجَاجَ فِيْهِ وَهُوَ الْاِسْلَامُ، ایسا راستہ جس میں کسی قسم کی کوئی کجی نہ ہو اور وہ اسلام کا راستہ ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ عاجز بندے اپنے خالق و مالک کے حضور فریاد کرتے ہیں کہ اے مولا! ہمارے دلوں میں سیدھے راستے پر چلنے کا داعیہ پیدا فرما، اس پر تیری رہنمائی و رہبری مطلوب ہے اور پھر اس پر استقامت و دوام عطا فرما اور وہ دین اسلام ہی کا راستہ ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰنِیْ رَبِّیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ دِيْنًا قِيَماً مِّلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (الانعام ۶:۱۶۱) ''کہہ دیجئے کہ بلاشبہ میرے رب نے مجھے سیدھی راہ دکھلا دی ہے، یہی وہ مستحکم دین ہے جو ابراھیم کا دستور العمل تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔''

علم ہندسہ میں جب دو نقطوں کو آپس میں ملا دیا جائے تو وہ خط مستقیم کہلاتا ہے، اس کے علاوہ خطوط ٹیڑھے اور اور منحنی کئی ہوتے ہیں، اسلام صراط مستقیم، ایک ہی سیدھا اور اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ راستہ ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اس پر چل کر ہی انسان گوہر مقصود کو پا سکتا ہے، اس کے سوا تمام راہیں بھٹکانے والی ہیں، فرمایا: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوْا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ (الانعام ۶:۱۵۳) ''اور یہ کہ یہی میری سیدھی راہ ہے (اسلام کی راہ) لہٰذا اسی پر چلتے جاؤ اور دوسری راہوں کے پیچھے نہ چلو (کہ وہ شیطانی راہیں ہیں) اور وہ تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی (اور تم راہ حق سے دور جا پڑو گے)۔''

تمام انبیاء کرام نے آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم النبیّن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک لوگوں کو اسی راہ پر چلنے کی دعوت دی۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (الانبیاء ۲۱:۷۳)

''(ان انبیاء) کو ہم نے (اپنی اپنی قوم کا) امام بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی (اسلام کی

وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۙ (الشوریٰ۴۲:۵۲)

''اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) بلاشبہ آپ صراط مستقیم (اسلام) کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی صفت ھادی (ہدایت دینے والا) بھی ہے۔ اس نے اپنی مہربانی سے ہمیں ہدایت سے ہمکنار فرمایا، اَلْھِدَایَۃَ کے معنی بھی لطف وکرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں اسی سے لفظ ھدیہ ہے جس کے معنی اس تحفہ کے ہیں جو بغیر معاوضہ کے کسی کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے چار پہلوؤں سے ہدایت فرمائی ہے:

(۱)..... عقلی وجبلی ہدایت: اس ہدایت میں ہر انسان بلکہ ہر جاندار کو حسب ضرورت حصہ ملا ہے۔

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی ۝ (طٰہٰ:۵۰)

''(موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا) ہمارا رب تو وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کی رہنمائی کی (پیدا کرنے کے بعد اس کی فطرت پر اسے ڈال دیا)۔''

اللہ تعالیٰ کی اس کرشمہ سازی پر غور کیجئے کہ انسان زمین پر مکان بنا رہا ہے تو چڑیا درخت یا دیوار پر گھونسلہ بنا رہی ہے، بچے کو دودھ پینا بتلا دیا تو مچھلی کو تیرنا سکھلا دیا۔

(۲)..... ہدایت بذریعہ انبیا کرامؑ اور وحی الٰہی: اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار اور زمانوں میں ملکوں اور بستیوں میں لوگوں کی ہدایت کے لیے انبیاء ورسل کو نورِ ہدایت دے کر بھیجا جن سے زندگی گزارنے کے اصول ہاتھ آئے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (الانبیا۲۱:۲۵) اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا، اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے ''کہ میرے سوا کوئی اِلٰہ نہیں لہٰذا صرف میری ہی عبادت کرو''۔

(۳)..... ہدایت کے طلبگار کی رہنمائی: جو شخص روشنی اور ہدایت کا طلبگار ہوتا ہے اور اس کیلئے جستجو اور تڑپ رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کیلئے راہ ہدایت آشکارا ہو جاتی ہے۔

وَالَّذِیْنَ جٰھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ط (العنکبوت۲۹:۶۹) اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد (کوشش اور جستجو) کرتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنی راہیں (دین کی سوجھ بوجھ اور طور طریقے) ضرور بضرور دکھلا دیتے ہیں۔

(۴)..... اخروی ہدایت: ہدایت سے بالآخر حقیقی منزل مقصود یعنی جنت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

''وہ (اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی) رہنمائی کرے گا اور ان کا حال درست فرمادے گا اور انہیں جنت میں داخل کرے گا جس کا انہیں تعارف کرایا ہے۔''

اس انعام کے ملنے پر اہل جنت کی زبانیں شکر وسپاس سے لبریز ہوں گی۔

وَقَالُوا الْحَمدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ ۚ (الاعراف ۷:۴۳)

''اور وہ کہیں گے تمام حمد وستائش اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں (جنت) راہ دکھائی اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم خود ہدایت نہ پاسکتے تھے۔''

ایک انسان کسی دوسرے انسان کو صرف دعوت الی الخیر کے ذریعہ روشنی بہم پہنچا سکتا ہے، ہدایت دل میں اتارنا صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت ہے، انبیاء کرام بھی لوگوں کو راہ حق کی رہنمائی کرتے رہے ہیں، ایسا بھی ہوا کہ ان کے گھر کے افراد اور عزیز واقارب کو راہ ہدایت سے محرومی رہی اور دور کے لوگ راہ پا گئے۔ سیدنا نوح علیہ السلام کے بیٹے نے والد کی دعوتِ حق کو آخر دم تک قبول کرنے سے انکار کیا اور اپنی قوم کے ساتھ غرق ہونا منظور کرلیا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ابولہب اور ابوجہل نہ صرف ہدایت سے محروم رہے بلکہ وہ آپ ﷺ اور مسلمانوں کو ایذا دینے میں بھی پیش پیش تھے، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ (القصص ۲۸:۵۶) ''(اے نبیؐ) جسے آپ چاہیں اسے ہدایت نہیں دے سکتے، اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے۔''

ہٹ دھرم، ضدی، سرکش اور حق بات کا صریحاً انکار کرنے والے ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔

قرآن میں کہیں وَاللّٰهُ لَایَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ اور کہیں اَلْفَاسِقِیْنَ ، اَلظّٰلِمِیْنَ ، اَلْخَائِنِیْنَ وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ حق بات سے منکرین، روگردانی کرنے والوں، ظالموں اور خائنوں کو راہ ہدایت سے ہمکنار نہیں کرتا، ہاں ان میں سے جو تائب ہوکر ہدایت کی طرف قدم بڑھاتا ہے وہ ہدایت سے بہرہ ور ہوجاتا ہے۔

وَیَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ ○ (الشوریٰ ۴۲:۱۳)

''وہ (اللہ) اپنی طرف سے اسی کو راہ دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرلے۔''

مسلمانو! تمہارے لئے ہدایت کا ابدی اور یقینی راستہ یہ ہے کہ تم کتاب ہدایت قرآن حکیم کو غور سے

سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہوگا، جب تم دل کی گہرائی سے اھدنا الصراط المستقیم ○ کہو گے تو وہ رب کریم تمہیں راہ حق پر استقامت عطا فرمائے گا اور تمہاری دنیا و آخرت سنور جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

آیہ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) ہم نے اللہ کو اپنا رب، مالک اور مہربان تسلیم کر کے اس کے ساتھ اقرار کیا کہ ہم صرف اسی کی اطاعت اور بندگی کریں گے اور اسی سے ہر وقت مدد مانگیں گے، اب ہماری یہ آرزو ہے کہ ہمارا مالک ہماری رہنمائی کرے اور ہم بھولے سے بھی کوئی ایسی غلطی نہ کر بیٹھیں جو اس کی ناراضی کا سبب ہو، اس کے لیے ہمیں ایسی راہ کی ضرورت ہے۔ جس پر چل کر ہم اس کی خوشنودی حاصل کر سکیں اور جو ہمیں بالکل سیدھا اس تک پہنچا دے۔ (درس قرآن)

۲) ہمیں حکم ہے کہ ہم نماز کی ہر رکعت میں اس دعا کو عاجزی سے دہرائیں اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان انسان کا ازلی اور ابدی دشمن ہے وہ انسانوں کو اور خاص طور پر نیک انسانوں کو نت نئی چالوں سے گمراہ کرتا رہتا ہے پھر انسان کے اندر اس کا نفسِ اَمّارہ بھی بڑا سرکش ہے جو اسے برائیوں کی دعوت دیتا رہتا ہے، ہم اپنے خالق و مالک سے کہ جس کی قوت و طاقت سب پر حاوی ہے، التجا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں صراط مستقیم پر گامزن رکھے تا کہ ہم زندگی کی پاکیزہ اور سچی راہ سے کہیں بھٹک نہ جائیں۔

۳) یہ دعا ہم جمع کے صیغے میں 'اِھْدِنَا' اے اللہ! ہم سب کو ہدایت سے نواز، اس لیے کرتے ہیں کہ ہر شخص کا ذاتی تعلق پوری امت سے قائم رہے، یعنی اظہار کرتے ہیں کہ ہماری عبادت اور استعانت اجتماعی ہے، صرف اپنے ہی لیے نہیں، بلکہ پوری امت مسلمہ کے لیے ہدایت و استقامت کے طلبگار رہتے ہیں۔

۴) ہدایت پر ہوتے ہوئے بھی ہدایت مانگنا، گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمیں ہدایت پر استقامت صرف اور صرف ربِ کریم کی رحمت ہی سے مل سکتی ہے۔

۵) یہ دعا کس قدر جامع اور مکمل ہے ''اے اللہ! ہمیں سیدھے راستہ پر چلا'' کونسا ایسا وقت ہے جب انسان کو صحیح راہ اور درست طریقہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کھانا، پینا، لکھنا، پڑھنا، چلنا پھرنا، خرید و فروخت، حکومت و سلطنت کے کام، عدالت اور مقدمات کے فیصلے، شادی بیاہ کے

کو صحیح رہنمائی درکار نہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا ہر نماز میں مقرر فرما دی ہے تا کہ صبح و شام اور رات دن ہر وقت انسان زندگی کے معاملات میں اللہ سے رہنمائی اور توفیق عمل طلب کرتا رہے۔

۶) ہر مذہب نے اپنے ماننے والے کو دعا کی تلقین کی ہے۔ کوئی اللہ سے روٹی مانگتا ہے، کسی کو مال و دولت کی آرزو ہے، کسی کو طاقت و اقتدار کی خواہش ہوتی ہے اور کسی کو عزت و شوکت کی تمنا ہوتی ہے، مگر ایک سچے مسلمان کی دلی خواہش اور چاہت ہوتی ہے تو صرف اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے ہر میدان میں اسے صحیح اور درست راہ پر چلائے جو اسے ابدی راحت سے ہمکنار کر دے۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○ (۷)	''(اے اللہ!) ان لوگوں کی راہ پر چلا جن پر تو نے فضل فرمایا نہ ان کی جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ گمراہوں کی۔''

اَنْعَمْتَ (اَنْعَمَ يُنْعِمُ اِنعَام) باب اِفْعَال، انعام کرنا، نعمتوں سے نوازنا۔ **اَلْمَغْضُوْبِ** (غَضِبَ يَغْضَبُ، غَضَبًا) سے اسم مفعول المغضوب اور غَيْر کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہے۔ غضب کیے گئے، مغضوب **عَلَيْهِمْ** وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کو جاننے کے بعد اس سے انکار کیا اور جن کے پاس دین و شریعت آئی لیکن انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی اور اسے قبول نہ کیا۔ **ضَلَّ يَضِلُّ** سے اسم فاعل **اَلضَّالِّيْنَ**، گمراہ ہونا، غلو کرنا اور راہ راست سے ہٹ جانا، یہ وہ لوگ ہیں جو دین میں غلو کے باعث راہ حق سے بھٹک گئے۔ غیر کبھی سوائے اور کبھی نہیں کے معنی دیتا ہے۔

اس سے قبل ''**اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ**'' میں اللہ تعالیٰ سے راہ راست پر چلنے کی توفیق و استقامت کی طلب و آرزو کی گئی۔ کہ اسی پر چل کر بندے فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکتے ہیں، اگلی آیات میں صراط مستقیم کی مزید توضیح و تشریح ہے، عاجز بندوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ان سے پہلے وہ کون سے ابرار و صالحین تھے جو اس

اوران لوگوں کی پگڈنڈی پر چلنا ان کے لئے آسان ہو جائے۔ وہ ان لوگوں کی سیرت اپنے لئے حرز جاں بنالیں اور جس ایمان ویقین، صبر وثبات، پامردی اور بہادری اور استقلال واستقامت سے زندگی کی منازل انہوں نے طے کیں وہ بھی انہیں کی عطا کردہ روشنی سے فیض یاب ہوں، نمونہ بہترین رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

قرآن حکیم اس مُنعَمْ علیھم گروہ کا ذکر اس آیت مبارکہ میں کرتا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (النساء۴:۶۹) ''اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ اور رفیق ہونے کے لحاظ سے یہ لوگ کتنے اچھے ہیں۔''

امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیہ مبارکہ سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جن لوگوں کو یہ مرتبہ نصیب ہوا، اس کی تہہ میں اصل بات محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے۔ (تفسیر طبری) ان انعام یافتہ لوگوں یعنی انبیاء کرام کی سیرتوں کا مطالعہ اور خصوصاً خاتم النبین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ زندگیوں کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

مَغْضُوْب عَلَيْهِمْ سے مراد وہ گروہ ہے جنہوں نے انبیاء کرام کے پیغامِ حق کو نہ صرف غرور وسرکشی سے ٹھکرا دیا بلکہ ان نفوس قدسیہ پر ظلم وزیادتیاں بھی کیں، اس طرح وہ غضب الٰہی کا شکار ہوئے۔ گزشتہ امتوں میں اس کی واضح مثال یہود کی ہے ان کا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ (البقرۃ۲:۶۱) ''(اور انجام کار) ان پر ذلت اور بدحالی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ (سرکشی سے) اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور (پاکباز انسانوں) انبیا کرام کو ناحق قتل کرنے لگے تھے اور اس کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرتے اور سرکشی میں (حدودِ شریعت) سے آگے نکل جاتے تھے۔''

ضالین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے انبیاء کرام کی لائی ہوئی روشن شریعت اور ان کی شفاف اور

میں بدل ڈالا۔ گزشتہ امتوں میں اس کی واضح مثال نصاریٰ (عیسائیوں) کی ہے، ان کا ذکر اس طرح آتا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝ (المائدہ۵:۷۷) آپؐ ان سے کہیے ''اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے پیچھے نہ چلو جو پہلے ہی گمراہ ہیں اور بہت لوگوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور صراط مستقیم سے بہک چکے ہیں۔''

اس آیت میں نصاریٰ کا غلو بتایا جا رہا ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت اور بشریت کے مقام سے اٹھا کر الوہیت کے مقام پر کھڑا کر دیا اور ان کے پیشرو یہود بھی اسی گمراہی میں مبتلا رہے اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتے رہے ہیں۔

ان دونوں راہوں کے برخلاف اسلام معتدل، شفاف، سیدھا اور مضبوط طریق زندگی ہے، وہ انبیائے کرام کی شان عبدیت قائم رکھتے ہوئے ان کی دل و جان سے محبت و تعظیم کرنا سکھاتا ہے اور ان کے اتباع و اطاعت کو عین اللہ تعالیٰ کی رضامندی قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ (ال عمران۳:۳۱)

''(اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا (مزید انعام یہ فرمائے گا) کہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔''

اے اللہ ہمیں ایمان و اسلام پر استقامت نصیب فرما! آمین

آیہ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) اس سے پہلی آیت میں ہم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ وہ ہمیں سیدھی راہ دکھائے، اب سیدھی راہ کی مزید تشریح اس آیت میں کی گئی ہے، مکمل تعلیم اور ہدایت کی ساری کی ساری باتیں قرآن مجید میں آ گئی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان ہدایتوں کے عملی نمونے بھی انسانوں میں کثرت سے بھیج دیے تاکہ ان کی پاکیزہ زندگی سامنے رکھ کر صراط مستقیم پر چلنا ہمارے لیے اور زیادہ آسان ہو جائے۔ چنانچہ ہمیں دعا بتلائی کہ وہ ہمیں ایسے لوگوں کے نقش قدم پر چلائے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعامات نازل

انبیائے کرام، اللہ کے وہ نیک بندے ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنے باقی بندوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے چن لیتا ہے، یہ نبوت وہبی ہوتی ہے کسبی نہیں ہوتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش کا نتیجہ ہوتی ہے، زور وزر اور قوتِ بازو یا کثرتِ عبادت وریاضت کا کمال نہیں ہوتی۔

صدّیقین وہ لوگ ہوتے ہیں جو انبیاء کی دعوت حق پر فوراً لبیک کہتے ہیں جیسا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مردوں میں سب سے پہلے ایمان لائے۔

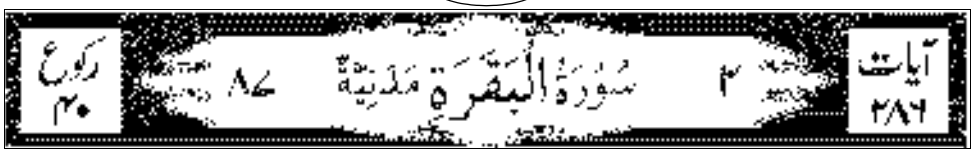
شھداء وہ لوگ ہوتے ہیں جو راہِ حق میں اپنی جان اور اپنا مال سب کچھ لٹا دیتے ہیں جیسا کہ سید الشہداء جناب حمزہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جام شہادت نوش کیا۔

صالحین وہ لوگ ہوتے ہیں جو نیکی پر ثابت قدم رہتے ہیں خواہ اس راہ میں کتنے مصائب اور کتنی مشقتیں ہی کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں جیسا کہ قرآن حکیم میں سورہ یوسف میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی پاکیزہ زندگی کا تذکرہ آیا ہے۔

۲) سورۃ الفاتحہ کے آخر میں ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان لوگوں سے بچائے جن پر اس کا غضب ہوا۔ غضب کن لوگوں پر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو فراموش کر ڈالتے ہیں اور خواہشات نفس کی پیروی میں مبتلا ہو جاتے ہیں پھر ہم یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ضالین (گمراہ) لوگوں سے بھی محفوظ رکھے۔ ضالین وہ طبقہ ہے جو علم حقیقی سے فائدہ نہیں اٹھاتا، بلکہ اپنی خواہش سے بات کو کچھ سے کچھ بنا ڈالتا ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہود پر اللہ کا غضب نازل ہوا کہ انہوں نے انبیائے کرام کی (نعوذ باللہ) توہین ورسوائی کی اور نصاریٰ گمراہ ہوئے تو شرک میں مبتلا ہو گئے اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کو اتنا بڑھایا چڑھایا کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی ذات میں انہیں شامل کر دیا۔

اسلام ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ بتاتا ہے کہ انبیائے کرام سے دل وجان سے محبت کرو ان کا اتباع اور پیروی بھی کرو مگر انہیں مقام عبدیت پر رکھو۔

-----●-----



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ○ (۱) ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ ج صلے	''الف، لام، میم، یہ (قرآن مجید) وہ کتاب ہے جس (کے کلام الٰہی ہونے) میں قطعی کوئی شک وشبہ نہیں ہے''

الٓمّٓ: الف، لام، میم حروف مقطعات ہیں یعنی انہیں الگ الگ ساکن پڑھا جاتا ہے، یہ قرآن حکیم کی ۲۹ رسورتوں کی ابتدا میں آئے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ حروفِ مقطعات قرآن مجید کی بعض سورتوں کے آغاز میں آئے ہیں، جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اس دور کے اسالیبِ بیان میں اس طرح کے حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا، خطیب اور شعراء دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں ان میں اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں، اس استعمالِ عام کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی چیستان نہ تھے جن کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو۔ بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ یہ بے معنی حروف کیسے ہیں؟'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

میرے نزدیک یہ ہے کہ اہل عرب کو بتایا جا رہا ہے کہ قرآن مجید جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا جا رہا ہے یہ کوئی اجنبی کتاب نہیں ہے کہ تمہاری سوچ سمجھ سے باہر ہو یہ محض عربی زبان کے حروف تہجی (Alphabetic) پر مشتمل ہے جنہیں تم روزمرہ استعمال کرتے ہو! یہ رب العالمین کا کلام ہے جو اپنی شان فصاحت و بلاغت، الفاظ کے جلال و جمال، عبارت کے مفہوم و مطالب اور طرز بیان میں بے مثال اور بے مثل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ عرب جنہیں اپنی قادر الکلامی اور شاعری پر بڑا ناز تھا قرآن حکیم کے سامنے ان کی

زبانیں گنگ ہوگئیں۔

ذٰلِکَ اسم اشارہ مذکر بعید کے لیے ہے مگر ترجمہ ''یہ'' کیا گیا ہے۔ بعض اوقات اشارہ بعید کا ترجمہ اشارہ قریب میں اور اشارہ قریب کا ترجمہ اشارہ بعید میں کیا جائے تو اس سے عزت و عظمت کا اظہار ہوتا ہے جیسا کہ فارسی زبان میں ''آں'' اشارہ بعید کے لیے ہے کسی قریبی شخص کی عزت مقصود ہو تو آپ کہہ دیتے ہیں ''آنجناب'' نے کیا فرمایا ہے۔

اَلْکِتٰبُ ، کَتَبَ یَکْتُبُ کِتَابًا، اَلْکِتٰبُ کے اصل معنیٰ کھال کے دو ٹکڑوں کو ملا کر سی دینے کے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ کَتَبْتُ السَّقَاءَ، میں نے مشکیزہ کو سی دیا، عُرف میں اس کے معنی حروف کو تحریر کے ذریعہ باہم ملا دینے کے ہیں۔ (مفردات القرآن)

قرآن حکیم نے اپنا تعارف اَلْکِتَابُ سے کرایا ہے کِتَابُ سے پہلے ال کا اضافہ معرفہ کی علامت ہے یعنی یہ وہ مربوط و مرتّب کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل امین نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر اتارا اور آپؐ نے اسے حفظ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرامؓ کی کثیر جماعت نے نہ صرف حفظ کیا بلکہ آپؐ نے اسے موجودہ ترتیب کے مطابق صحابہؓ کو لکھوا بھی دیا، قرآن مجید کو رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں ضبط کرانے، زبان مبارک پر جاری کرنے، مفہوم و معنیٰ سمجھانے، جمع کرانے اور ہمیشہ ہمیشہ تک حفاظت کرنے کی ذمہ داری رب العالمین نے خود لی ہے، فرمایا:

لَاتُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖؕ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗؕ (القیامۃ ۷۵:۱۶تا۱۹)

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) اس وحی کو جلدی یاد کر لینے کے لیے اپنی زبان کو (تیزی سے) حرکت نہ دیجئے، اس کو دل میں جمع کرنا اور زبان سے پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے، پھر جب ہم پڑھنا سکھا چکیں تو پھر اسی طرح پڑھا کریں، پھر اس کا مطلب سمجھانا بھی ہمارے ذمہ ہے۔''

ایک اور جگہ اس طرح فرمایا: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (الحجر ۱۵:۹) ''یہ ذکر (قرآن) یقیناً ہم ہی نے اتارا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کے (ہمیشہ ہمیشہ کے لیے) محافظ ہیں۔''

اللہ کی رحمت کی کرشمہ سازیاں دیکھئے کہ ایک ننھا سا بچہ جس کی عمر سات آٹھ برس سے اوپر نہیں ہوتی اس کتاب عظیم کو اپنے سینے میں ضبط کر لیتا ہے اور یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم

سے تواتر کے ساتھ چلی آ رہی ہے کہ لوگ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک دوسرے سے حفظ کرتے آئے ہیں، آج دنیا میں ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں حفاظ موجود ہیں، حفاظت کتاب کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ اگر لیل و نہار کی گردش اور طلوع آفتاب کا فرق ملحوظ خاطر رہے تو چوبیس گھنٹوں میں کوئی لمحہ بھی ایسا نہ آئے گا کہ دنیا میں کہیں نماز نہ ہو رہی ہو اور اس میں قرآن نہ پڑھا جا رہا ہو۔ پھر شرقاً غرباً لاکھوں کی تعداد میں مکاتب و مدارس ہیں جہاں اس کتاب روشن اور نور ہدایت کی تعلیم ہو رہی ہے۔

انسائیکلو پیڈیا بریٹیکا میں غیر مسلموں کی شہادت قرآن کے متعلق اس طرح موجود ہے: وہ کتاب ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ (The most widely-read book in the world) کیا قرآن کے علاوہ کسی اور آسمانی یا مذہبی کتاب کی کوئی ایسی شہادت مل سکتی ہے؟ (اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ)

لَا رَيْبَ فِيْهِ، لَا کلمہ نفی جنس کے لیے ہے، رَيْبَ مصدر ہے (رَابَ يَرِيْبُ رَيْبًا) جس کے معنی قلق النفس (نفس کا اضطراب) اور شک کے ہیں۔

غور کیجئے ''لَا فِيْهِ رَيْبٌ '' کی بجائے ''لَا رَيْبَ فِيْهِ'' کہہ کر شک و شبہ کی قطعی نفی کر دی گئی ہے، اگر کوئی اس کو نہ سمجھ پاتا ہو تو قصور اس کے دماغ کا ہے نہ کہ کتاب کا اس لیے کہ وہ آسان، سلیس، قابل فہم اور روشن ہے، آفتاب پوری تابانی سے چمک رہا ہو پھر بھی اگر کوئی اسے دیکھ نہ پائے تو قصور آفتاب کا نہیں اس کی آنکھوں کا ہے۔ قرآن اپنی صداقت کا اہل عرب کو یوں چیلنج کرتا ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرہ ۲:۲۳)

''اور اگر تمھیں اس (کلام) میں شک ہو جو ہم نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا ہے تو تم بھی اس جیسی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے سب مددگاروں کو بلا لو، اگر تم سچے ہو (تو یہ کام ضرور کر دکھاؤ)۔''

نزولِ قرآن کو چودہ صدیاں اور کچھ سال اوپر بیت چکے ہیں، قرآن کی یہ صداقت اپنی جگہ مسلم ہے اور تا قیامت مسلم رہے گی، ان شاء اللہ۔

آیہ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) قرآن مجید اپنا پہلا تعارف ''الکتاب'' کی حیثیت سے کرواتا ہے کہ وہ ضبطِ تحریر میں آیا ہوا، ایک کتابی شکل میں مرتب، صحیفہ آسمانی ہے جسے اللہ تعالیٰ کے حکم سے لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر اتارا گیا اور وہاں سے جبریل امین وقتاً فوقتاً اسے لے کر خاتم النبیین محمد ﷺ کے قلب اطہر پر نازل کرتے رہے اور تیئس برس کی مدت میں اس کی تکمیل ہوئی۔

۲) یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی بے مثال کتاب ہے جو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہے۔ سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اس کا ایک سیدھا سادہ مطلب تو یہ ہے کہ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے' مگر ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں شک کی کوئی بات نہیں ہے، دنیا میں جتنی کتابیں امور مابعد الطبیعات اور حقائق ماوراءِ ادراک سے بحث کرتی ہیں وہ سب قیاس وگمان پر مبنی ہیں اس لیے خود ان کے مصنف بھی اپنے بیانات کے بارے میں شک سے پاک نہیں ہو سکتے خواہ وہ کتنے ہی یقین کا اظہار کریں، لیکن یہ (قرآن) ایسی کتاب ہے جو سراسر علمِ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کا مصنف وہ ہے جو تمام حقیقتوں کا علم رکھتا ہے اس لیے فی الواقع اس میں شک کے لیے کوئی جگہ نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ انسان اپنی نادانی کی بناء پر اس کے بیانات میں شک کریں۔'' (تفہیم القرآن، ج:اول)

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲)	''(یہ قرآن) اہل تقویٰ کے لیے سرمایۂ ہدایت ہے۔''

هَدٰی یَهْدِیْ، هُدًی وَ هَدْیًا وَهِدَایَةً رہنمائی کرنا، ہدایت دینا جیسا کہ هَدَی اللّٰهُ اِلَی الْاِیْمَانِ اللہ نے اس کی ایمان کی طرف رہنمائی فرمائی۔ ہدایت پر سورۃ الفاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی آیت مبارکہ پر گفتگو ہو چکی ہے۔ مُتَّقِیْنَ (وق ی) مادہ ہے۔ اِتَّقٰی یَتَّقِیْ اِتِّقَاءً باب اِفْتِعَالَ سے اسم فاعل مُتَّقِیْ اور اس کی جمع مُتَّقِیْن ہے اور اسی لفظ سے تقویٰ ہے جس کے معنیٰ ظاہر وباطن

میں، کھلے اور چھپے اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی نافرمانی سے بچنا ہے، مُتَّقِیْنَ، تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ ہیں اور اس سے پہلے لام مکسور (زیر والا) لایا گیا ہے جس کا معنیٰ کبھی 'لیئے' کے ہوتے ہیں اور کبھی وہ انتفاع (فائدہ) کا مفہوم دیتا ہے، لِلْمُتَّقِیْنَ میں گویا کہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس کتاب سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو پرہیزگاری کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

''اَلتَّقْوٰی'' اس کے اصل معنیٰ نفس کو ہر اس چیز سے بچانے اور محفوظ رکھنے کے ہیں جس سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اور کبھی خوف اور تقویٰ ایک دوسرے کے معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں تقویٰ نفس کو ہر اس چیز سے بچانے اور محفوظ رکھنے کا نام ہے جو گناہ کا باعث ہو اور اس کا حصول اس طرح ہے کہ کوئی شخص نہ صرف شریعت کی منع کردہ باتوں سے رک جائے بلکہ اس میں درجہ کمال حاصل کرنے کے لیے بعض مباحات (جائز) اشیا کو بھی چھوڑ دے وہ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث مبارک کو پیش کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''بے شک حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، اور ان دونوں کے درمیان کچھ ایسے مشتبہ امور ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے، پس جو شخص ان مشتبہ چیزوں سے بچا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لیا اور جو شخص ان مشتبہ چیزوں میں پڑ گیا وہ تو حرام ہی میں پڑ گیا۔ اس چرواہے کی مانند (جو اپنے مال مویشی) کسی کی چراگاہ کے آس پاس چراتا ہے (یہ جگہ اگرچہ اس کے لیے جائز ہے مگر خطرناک ہے) قریب ہے کہ وہ اس کے اندر چرا ہی لے (وہ نہ بھی چاہے تو بھی اس کے مویشی پھلانگ کر اندر چلے جائیں گے) آگاہ رہو کہ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہے (ممنوعہ علاقہ) اور اللہ (مالک الملک) کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں (کہ ان سے بچ کر ہی تقویٰ حاصل کر سکتے ہو)'' [صحیح بخاری، صحیح مسلم]

قرآن حکیم نے ابرار و صالحین کی صفت یہ بتلائی ہے کہ وہ برائی کی جگہوں کے قریب پھٹکنا تو درکنار وہاں نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا ○ (الفرقان ۲۵:۷۲) ''اور جب ان کا کسی لغو کام پر گزر ہو تو وقار (شان بے نیازی) سے گزر جاتے ہیں۔''

آسان اور سادہ الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقویٰ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر

کام اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہو، متقین وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ہمہ وقت خائف رہتے ہوئے گناہوں کو چھوڑ دیتے ہیں اور شریعت کے مطابق صاف ستھری زندگی گزارتے ہیں۔

تقویٰ کو صحابیِ رسولؐ ابوھریرہؓ کی زبانی سمجھئے۔ آپ سے ایک شخص نے سوال کیا، مَا التَّقْوٰی ؟ تقویٰ کیا ہے آپؓ نے پوچھا هَلْ وَجَدْتَ طَرِيقًا ذَا شَوْكٍ ؟ کبھی خاردار راستے سے گزرے ہو؟ قَالَ نَعَمْ عرض کیا ہاں، پوچھا فَكَيْفَ صَنَعْتَ ؟ پھر کیا کیا، قَالَ اِذَا رَأَيْتُ الشَّوْكَ عَدَلْتُ عَنْهُ ، اَوْ جَاوَزْتُهُ اَوْ قَصَّرْتُ عَنْهُ عرض کیا جب کانٹے دیکھے تو ان سے ادھر، ادھر، بچتے بچاتے نکل گیا۔ فرمایا: ذَالِكَ التَّقْوٰی، یہی تو تقویٰ ہے۔ (فتح القدیر)

''اِتَّقُوْا'' قرآن حکیم میں مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۱- ڈر اور خوف:- يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ (النساء۴:۱) ''لوگو! اپنے رب سے ڈرتے رہو۔''

۲- عبادت کرنا:- وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ○ (النحل۱۶:۵۲)

''اور اسی کی عبادت دائمی ہے پھر کیا تم اللہ کے علاوہ دوسروں کی عبادت کرتے ہو۔''

۳- نافرمانی سے بچنا:- وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (البقرہ۲:۱۸۹)

''اور تم گھروں میں ان کے دروازوں ہی سے آیا کرو اور اللہ کی نافرمانی سے بچو۔''

۴- توحید:- وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ (النساء۴:۱۳۱)

''تم سے پہلے اہل کتاب کو ہم نے تاکیدی حکم دیا تھا اور تمہارے لیے بھی یہ حکم ہے کہ اللہ کو ایک مانو۔''

۵- اخلاص:- وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج۲۲:۳۲)

''اور جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ بات دلوں کے اخلاص سے متعلق ہے۔''

قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام عبادات و اعمال کی غرض و غایت تقویٰ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (البقرہ۲:۲۱) ''اے لوگو اپنے رب کی، جس نے تم کو اور تمہارے پہلوں کو پیدا کیا عبادت کرو تا کہ تم تقویٰ پاؤ۔''

اور اللہ تعالیٰ کے یہاں متقین ہی پسندیدہ لوگ ہیں۔ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○ (اٰلِ عمران۳:۷۶)

''تو اللہ بے شک اہل تقوی کو پسند فرماتا ہے۔''

اور آخری انجام بھی انہی لوگوں کا بہتر ہے۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (الاعراف ۷:۱۲۸) ''اور آخری (بہتر) انجام تقویٰ والوں کے لیے ہے۔''

معلوم ہوا کہ قرآن کا علم حاصل کرنے والوں کو تقویٰ کی صفت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی توفیق بھی طلب کرنا چاہیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے آیا یہ کتاب ہدایت صرف پرہیزگاروں کے لیے ہے اور گنہگار اس سے فیض یاب نہیں ہو سکتے ہیں؟ کیوں نہیں! اللہ، رب العالمین ہے تو اس کی کتاب هُدًى لِّلنَّاسِ (الِ عمران ۳:۴) ''تمام لوگوں کے لیے ہدایت'' ہے اور اس نے اپنے نبی (ﷺ) کو كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا ۳۴:۲۸) (نسل انسانی) کی طرف بھیجا اور فرمایا: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ○ (الانبیاء ۲۱:۱۰۷) ''اور ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔'' اور اس امت کی ذمہ داری بھی دنیا والوں کی رہبری ہے اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (الِ عمران ۳:۱۱۰) بات سمجھنے کی یہ ہے کہ ڈاکٹر مریض کو دوائی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے فائدہ تب ہی ہوگا جب وہ پرہیز کرے گا، قیمتی سے قیمتی دوائی بھی کوئی فائدہ نہیں دیتی جب تک پرہیز نہ کیا جائے۔

قرآن یقیناً سب انسانوں کے لیے ہدایت ہے مگر اس سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جو برائی سے بچنا چاہتے ہیں، جن میں کسی سچائی کو حاصل کرنے کی طلب اور تڑپ ہے اور جنہیں انسانیت کے بلند مقام پر پہنچنے کی تمنا اور آرزو ہے، ظاہر ہے آفتاب کی روشنی اسے فائدہ دیتی ہے جو آنکھیں کھول کر رکھے اور شہد کا مزا اسے ملتا ہے جو چکھنے کی قوت سے آشنا ہو۔

آیہ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) قرآن حکیم کے بارے میں ایک جگہ هُدًى للناس آیا ہے کہ یہ نسل انسانی کے لیے ہدایت ہے اور یہاں هُدًى للمتقين آیا ہے کہ یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس کی ہدایت تو عام ہے مگر اس ہدایت سے وہی بہرہ ور ہو سکتے ہیں جو پرہیزگاری کی راہ اختیار کرتے ہیں مثلاً فلاں شاہراہ تو سب کے لیے عام ہے مگر منزل پر وہی پہنچ سکتے ہیں جو عزم اور ارادے کے ساتھ اس پر چل پڑیں۔

۲) سید مودودیؒ لکھتے ہیں: ''یہ کتاب ہے تو سراسر ہدایت وراہنمائی، مگر اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی میں چند صفات پائی جاتی ہوں۔ ان میں سب سے اولین صفت یہ ہے کہ آدمی ''پرہیزگار'' ہو، برائی اور بھلائی میں تمیز کرتا ہو برائی سے بچنا چاہتا ہو، بھلائی کا طالب ہو اور اس پر عمل کرنے کا خواہشمند ہو، رہے وہ لوگ جو دنیا میں جانوروں کی طرح جیتے ہیں، جنہیں کبھی یہ فکر لاحق نہ ہوتی ہو کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں بس جدھر دنیا چل رہی ہو یا جدھر خواہش نفس دھکیل دے یا جدھر قدم اٹھ جائیں اس طرف چل پڑتے ہوں تو ایسے لوگوں کے لیے قرآن میں کوئی رہنمائی نہیں ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ (۳)	(متقین تو) وہ ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

اَلاِیۡمَانُ کا مادہ (Root word) امن ہے جس کا معنی اطمینان اور سکون کی حالت ہے اس کی ضد خوف و ہراس ہے۔ یُؤۡمِنُوۡنَ مضارع جمع مذکر غائب ہے وہ سب ایمان لاتے ہیں۔ اٰمَنَ یُؤۡمِنُ اِیۡمَانًا۔ امن دینا، تصدیق کرنا، اعتماد و بھروسہ کرنا، تابع فرمان و مطیع ہونا اور اسم فاعل مُؤۡمِنٌ ہے امن دینے والا، تصدیق کرنے والا۔ (مصباح اللغات) حدیث شریف میں آتا ہے اَلۡمُؤۡمِنُ مَنۡ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی اَمۡوَالِهِمۡ وَ اَنۡفُسِهِمۡ ''مومن تو وہ ہے کہ جس سے لوگ جان و مال کا امن اور تحفظ پاتے ہیں''۔

اَلۡاِیۡمَانُ، تصدیق کرنا، ماننا اور اصطلاحی معنیٰ میں ''اِقۡرَارٌ م بِاللِّسَانِ وَتَصۡدِیۡقٌ م بِالۡقَلۡبِ وَعَمَلٌ بِالۡجَوَارِح'' یعنی اسلام کے عقیدے کو نہ صرف زبان کے اقرار سے بلکہ دل کے یقین سے قبول کرنا اور اعضاء سے اس پر عمل کرنا، اس کا پتہ ان پانچ بنیادی باتوں سے ہوتا ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیہ مبارکہ میں ہے:

لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ (البقرہ۲: ۱۷۷) ''نیکی یہی نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر، روز قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے''۔

لغوی طور پر ایمان اور اسلام کے معنی جدا جدا ہیں۔ ایمان تصدیقِ قلب اور اسلام اطاعت و فرمانبرداری کو کہتے ہیں لیکن فی الحقیقت ایمان اور اسلام کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

مندرجہ بالا آیہ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی تمام باتوں کا تعلق دل سے ہے، جب دل میں ایمان کا بیج بویا جاتا ہے اور وہ پھوٹتا ہے تو پھل پھول کر اعمال صالحہ سے سرسبز و شاداب تناور درخت بن جاتا ہے اور اس کا فیضان ہر لحہ جاری و ساری رہتا ہے۔ جس کا قرآن اس طرح ذکر کرتا ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا (ابراھیم۱۴: ۲۵) ''(آپ غور کیجئے) کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ (توحید) کی کیسی عمدہ مثال بیان کی ہے جیسے وہ ایک پاکیزہ درخت ہے جس کی جڑ (زمین میں خوب) جمی ہوئی اور شاخیں آسمان میں ہوں وہ اپنے رب کے حکم سے ہر آن پھل دے رہا ہے''۔

اسلام کی تعریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے بیان فرمائی: اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ ، وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔ ''اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو اگر وہاں جانے کی تمھیں استطاعت ہو''

آپ نے غور کیا کہ اسلام میں زبان سے تصدیق کے علاوہ ارکان اسلام کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی بھی لازمی ہے معلوم ہوا کامیابی کے لیے ایمان اور اسلام دونوں کا ہونا لازمی امر ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ، غَابَ يَغِيْبُ غَيْبًا، كُلَّ مَا غَابَ عَنْكَ۔ اس سے وہ باتیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم سے دی اور عقل و حواس خمسہ کے ذریعے ان کا علم نہیں ہوسکتا تھا مثلاً ذاتِ حق کا علم، ملائکہ، جنت، دوزخ، عرش، کرسی وغیرہ کا علم۔

ایمان کے متعلق مزید یہ جان لیجئے کہ صرف اور صرف وہی ایمان قابل قبول ہوگا جو قرآن و سنت کے

مطابق ہوگا۔ ایمان کی کیفیت نفسی شک، ریب، قلق، تردد و تذبذب کی بالکل ضد ہے اس کے برعکس ایمان سے دماغ کو سکون، دل کو اطمینان، روح کو تسلی اور فکر کو یکسوئی نصیب ہوتی ہے۔ آیئے قرآن حکیم کی چند آیات سے ایمان کی حقیقت معلوم کریں۔

(۱) **اطمینان قلب:** اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ (الرعد۱۳:۲۸)
ایمان والوں کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔

(۲) **شرک سے مبرا ایمان:** اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ (الانعام۶:۸۲) ''جو لوگ ایمان لائے پھر ایمان کو ظلم (یعنی شرک) سے آلودہ نہیں کیا، انہی کے لیے امن و سلامتی ہے۔''

(۳) **ایمان اور عمل صالح:** اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ (مریم۱۹:۶۰) ''(جنہوں نے غفلت کی زندگی کے بعد) توبہ کر لی، ایمان لے آئے اور اچھے عمل کیے تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔''

(۴) **ایمان اور مصائب:** اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○ (العنکبوت۲۹:۲) ''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگر انہوں نے ''ہم ایمان لائے'' کہہ دیا تو انہیں چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی آزمائش نہ ہوگی؟۔''

(۵) **صحابہؓ ایسا ایمان مقبول ہے:** وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ (البقرہ ۲:۱۳) ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لائے یہ لوگ (یعنی صحابہ کرامؓ)۔''
[اور ایسا ہی ایمان قابل قبول ہے کہ انہوں نے اسلام کی خاطر اپنا جان مال سب کچھ قربان کر دیا]

(۶) **شکر اور ایمان:** مَا یَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ (النساء۴:۱۴۷) ''اگر تم لوگ اللہ کا شکر ادا کرو اور خلوص نیت سے ایمان لے آؤ تو اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں عذاب دے۔''

(۷) **ایمان اور کامیابی:** وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (ال عمران ۳:۱۳۹) ''(مسلمانو!) تم نہ سستی دکھانا اور نہ ہی غمزدہ ہونا اور اگر فی الواقع تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔''

(۸) **ایمان اور بھائی چارہ:** اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ ۚ (الحجرات۴۹:۱۰) مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں (تمام روئے زمین کے اہل ایمان رشتہ اخوت میں منسلک ہیں) لہٰذا (اگر

کبھی کوئی جھگڑا ہو جائے) تو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو (کہ ان کی صف میں کہیں رخنہ نہ پیدا ہو)۔

(۹) **ابدی کامیابی اہل ایمان کی ہے**: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ (المومنون ۲۳:۱) ''یقیناً اہل ایمان ہی کامیاب ہوئے۔''

آیہ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) امور غیبیہ میں وہ باتیں ہیں جن کا ادراک عقل وحواس سے ممکن نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود، وحی الٰہی، جنت، دوزخ، ملائکہ، عذاب قبر اور حشر وغیرہ ان سب باتوں پر یقین رکھنا جزو ایمان ہے اور ان کا انکار کفر وضلالت ہے۔

۲) ایمان لانے کے بعد دل اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت سے لبریز شرک وبدعت سے خالی، عمل صالح کے لیے کمر بستہ اور مصائب ومشکلات جھیلنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

۳) ایمان اور عمل صالح کا چولی دامن کا ساتعلق ہے، بغیر ایمان کے اعمال صالحہ پروان نہیں چڑھتے ہیں اور بغیر اعمال صالحہ کے ایمان مضبوط نہیں ہوتا۔

۴) ایمان لانے کے بعد زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے، اس میں بغاوت کی جگہ اطاعت کا جذبہ ابھرتا ہے، خیانت کی جگہ دیانتداری راہ پاتی ہے شقاوت اور سنگ دلی کی جگہ احسان ومروت کے جذبات پرورش پاتے ہیں گویا کہ بندہ مومن سراپا پیکر اخلاق بن جاتا ہے۔

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ	''(اور متقی وہ ہیں) جو (پورے آداب کے ساتھ) نماز قائم کرتے ہیں۔''

يُقِيْمُوْنَ کا مادہ (ق وم) ہے اَقَامَ يُقِيْمُ ، اِقَامة باب اِفعال يُقِيْمُوْنَ فعل مضارع جمع مذکر غائب: سیدھا کرتے ہیں، قائم کرتے ہیں۔ اِقَامَةُ الصَّلٰوةِ کے معنی، تعدیل ارکان، پابندی وقت، خضوع وخشوع،

حضور قلب اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق نماز ادا کرنا ہے، قرآن حکیم میں جہاں کہیں صلوٰۃ (نماز) کا ذکر آیا ہے اس کے لیے اقامۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اقامت صلوۃ اور ادائے صلوٰۃ میں فرق ہے، اقامت صلوٰۃ میں صرف نماز ادا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اس کا پورا پورا حق ادا کرنا بھی ہے اور نماز کا نظام قائم کرنا بھی ہے۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

"ای یُدِیْمُوْنَ فِعْلَهَا وَ یُحَافِظُوْنَ عَلَیْهَا"

کہ وہ نماز پر دوام اور (اس کے ارکان کی) حفاظت کرتے ہیں۔ (مفردات القرآن)

اَلصَّلٰوۃ کے لغوی معنی دعا کے ہیں، اصطلاح شریعت میں اس طرح نماز ادا کرنا جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمائی جیسا کہ آپؐ نے فرمایا: صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ "تم نماز اس طرح پڑھو جیسا کہ مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔"

اِقامتِ صلوٰۃ پر قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ میں ان امور پر مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے:

(۱) **نماز بہترین ذکر ہے**: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ○ (طٰہٰ ۲۰:۱۴) "بلاشبہ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی اِلٰہ نہیں لہٰذا میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو"۔

اللہ تعالیٰ کی یاد کا ثمرہ یہ ہے: فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (البقرہ ۲:۱۵۲) "تو (اے بندو!) تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔"

سبحان اللہ! جس کو رب کریم یاد کرے کبھی وہ شخص ضائع و برباد ہو سکتا ہے؟ وہ دنیا میں بھی اس کے سایہ رحمت میں رہتا ہے اور آخرت میں بھی اس کی جنت کا حقدار ٹھہرتا ہے۔

(۲) **طہارت جسمانی**: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَ اَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ ط (المائدۃ ۵:۶) "اے ایمان والو! جب نماز کے لیے اٹھو تو پہلے اپنے چہرے اور کہنیوں تک ہاتھوں کو دھو ڈالو، اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو"۔

(۳) **طہارت روحانی**: وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ط اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ

(العنکبوت۲۹:۴۵)''اور نماز قائم کیجئے نماز یقیناً بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے(جب تم اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی خشیت سے نماز قائم کرو گے تو اس کے اثرات یقیناً مرتب ہوں گے)''۔

(۴) **اوقات معیّنہ**:اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا○ (النساء۴:۱۰۳)

''بلاشبہ مومنوں پر نماز اس کے مقررہ اوقات پر فرض کی گئی ہے''۔

(۵) **نماز پر دوام**: اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَائِمُوْنَ○ (المعارج۷۰:۲۳)

''جو ہمیشہ اپنی نماز پر قائم ہیں(باقاعدگی کے ساتھ پانچوں نمازیں ادا کرتے ہیں)''۔

(۶) **نمازوں کی حفاظت**: وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ○ (المعارج۷۰:۳۴)

''اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں(اپنی نمازوں کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیتے)''۔

(۷) **خشوع و خضوع**:اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خٰشِعُوْنَ○ (المومنون۲۳:۲)

''جو اپنی نماز میں عاجزی(خشوع وخضوع)اختیار کرتے ہیں''۔

یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بندہ اپنے اندر احسان کی کیفیت پیدا کرلے وہ اس طرح کہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَمْ تَکُن تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ " کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو(اس کی صفات کو ذہن میں رکھ کر اس ذات کا تصور کرو)اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو خیال کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔حدیث مبارکہ میں آتا ہے اِنَّ الْمُصَلِّیْ یُنَاجِیْ رَبَّہٗ''یقیناً نمازی اپنے رب تعالیٰ سے مناجات کرتا ہے''،اسے ہر لفظ اور ہر جملہ پورے شعور اور فہم کے ساتھ ادا کرنا چاہیے،یقیناً ایسی نماز میں اسے سرور اور سکون نصیب ہوگا اور عاجزی کی کیفیت پیدا ہوگی۔

(۸) **باجماعت نماز ادا کرنا**: وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ○ (البقرہ۲:۴۳)

''اور تم رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو(اجتماعی طور پر نماز ادا کیا کرو)''۔

احادیث مبارکہ میں اجتماعی نماز کی فضیلت وثواب بہت زیادہ آیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''باجماعت نماز پڑھنا اکیلے نماز پڑھنے کے مقابلے میں ستائیس درجے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔''(بخاری،مسلم)

(۹) **تجارت بھی غافل نہیں کرتی**: اہل ایمان کو تجارت بھی نماز سے غافل نہیں کرتی ''رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ (النور۲۴:۳۷)''(اللہ کے بندے

ایسے بھی ہیں) جنہیں اللہ کے ذکر اور اقامتِ صلوٰۃ سے نہ تجارت غافل کرتی ہے اور نہ خرید وفروخت''۔

جونہی ان ابرار وصالحین کے کانوں میں مؤذن کی صدائے دلنواز پہنچتی ہے وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر اپنے رب کے حضور اپنی جبین نیاز جھکانے کے لیے چلے آتے ہیں۔

(۱۰) **اھل خانہ کو نماز کا حکم:** بندۂ مسلم نہ صرف خود نماز پڑھتا ہے بلکہ اپنے اہل وعیال کو بھی اس کا پابند بنانے کی سعی وجستجو کرتا ہے:

وَأْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا (طٰہٰ ۲۰:۱۳۲)

''اور آپ اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس پر ڈٹ جائیے''۔

(۱۱) **نماز چھوڑنے پر زبردست تنبیہ:** وَاَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا، کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (الروم ۳۰:۳۱) ''اور نماز قائم کرو اور ان مشرکوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنا دین الگ کر لیا اور گروہوں میں بٹ گئے، ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہے''۔

اِقامتِ صلوٰۃ سے روگردانی اور دین میں فرقہ بندی مشرکین کی خصوصیات ہیں جن سے بچنا لازم ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندے اور کفر کے درمیان نماز چھوڑ دینے ہی کا فاصلہ ہے۔ (صحیح مسلم)

آیہ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اقامتِ صلوۃ کے مفہوم میں پابندیِ وقت، تعدیلِ ارکان، خشوع وخضوع، حضورِ قلب، نمازوں میں دوام، جماعت کا التزام اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق نماز ادا کرنے ایسے امور شامل ہیں۔

۲) ایمان لانے کے بعد فوری اطاعت کا پتہ اقامتِ صلوۃ سے ہوتا ہے ایمان لانے پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرتے کہ مؤذن کی صدائے دلنواز کان میں پڑتی ہے اور اسی وقت فیصلہ ہو جاتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والا اطاعت کے لیے تیار ہے یا نہیں؟

۳) اقامت صلوٰۃ سے مسلمانوں کے اندر معاشرتی نظم وضبط کا شعور ابھرتا ہے، اوقات کی پابندی کا احساس پیدا ہوتا ہے، امیر وغریب اور بلند وپست کی تفریق ختم ہو جاتی ہے اور مسلمان بھائی بھائی بن کر سیسہ

پلائی ہوئی دیوار کی مثال قائم کرتے ہیں۔

۴) اِقامتِ صلوۃ سے زندگی کا رخ متعین ہوتا ہے کہ بندہ اپنے آقا کا غلام ہے اور وہ نماز کا حکم بجالانے کی طرح ہر معاملے میں اس کا مطیع وفرمانبردار بندہ بن کر رہے گا۔

وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳)	''اور (متقین وہ ہیں) جو ہماری عطا وبخشش میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔''

مِمَّا (مِنْ ۔ مَا) مِنْ (سے) حرف جَرّ، مَا (جو) ما موصولہ، عربی گرامر میں اصولِ اِدْغام (ایک حرف کو دوسرے حرف میں شامل کرنا) کی رو سے مِمَّا ہوا۔ رَزَقْنٰهُمْ (رزق) رَزَقَ یَرْزُقُ، رِزْقًا، دینا، رَزَقْنَا، ہم نے رزق دیا، مادی اور معنوی نعمتوں سے نوازا۔ رَزَقْنَا میں جمع متکلم کا صیغہ آیا ہے، اللہ تعالیٰ واحد ہے اور واحد متکلم کا صیغہ آنا چاہیے تھا۔ اس طرح کہ رَزَقْتُ ''میں نے رزق عطا کیا۔'' دراصل عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ عزت وتکریم مقصود ہو تو واحد کے لیے جمع کا صیغہ لے آتے ہیں۔ هُمْ ضمیر (Pronoun) جمع مذکر کے لیے استعمال ہوئی ''وہ سب لوگ''۔

رزق کا لفظ عربی زبان میں بڑے وسیع معنی رکھتا ہے اس میں ہر قسم کی نعمتیں خواہ وہ ظاہری و مادی ہوں مثلاً مال واولاد یا معنوی وروحانی ہوں مثلاً علم وحکمت سب شامل ہیں اور ہر نعمت جتنی بھی اور جس قسم کی بھی انسان کو ملتی ہے۔ سب اللہ تعالیٰ ہی کے فیض کا ثمرہ ہوتی ہے، انسان کی اپنی کوئی چیز بھی نہیں ہوتی اور متقین وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا ہر ہر عمل رضائے الٰہی کے لیے ہوتا ہے، وہ نہ صرف اپنا مال بلکہ اپنی جان اور دل و دماغ کی تمام صلاحیتیں اپنے مولا و مالک کے لیے صرف کرتے ہیں۔

يُنْفِقُوْنَ (ن ف ق) اَنْفَقَ يُنْفِقُ ، اِنْفاق بابِ اِفْعال فعل مضارع جمع مذکر غائب، وہ خرچ کرتے ہیں، وہ صرف کرتے ہیں۔ دراصل نَفَقَ کے معنی سوراخ کے ہیں گویا کہ رب کریم کا فرمان ہے کہ جو ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے سوراخ کرتے ہیں یعنی وہ ہماری عطا کردہ نعمتوں کو روک کر نہیں رکھتے بلکہ اسے

اللہ کی رضا کے لیے اس کی راہ میں صرف کرتے رہتے ہیں۔

انفاق فی سبیل اللّٰہ اسلامی تعلیمات کا ایک اہم باب ہے، قرآن وحدیث میں اس کے متعلق بکثرت فضائل وترغیبات آئی ہیں، آیئے چند قرآنی آیات پر نظر ڈالیں:

(۱) رزق حلال میں سے خرچ کرو:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ (البقرہ۲:۲۶۷)

''اے ایمان والو! رزقِ حلال میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو''۔

اس آیہ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ حق حلال سے کمایا ہوا رزق ہی قبول ہوتا ہے۔

(۲) اپنی پسندیدہ چیز خرچ کرو:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (اٰلِ عمران۳:۹۲)

''تم اس وقت تک نیکی نہیں پا سکتے جب تک اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جو تمھیں خود محبوب ہو''۔

(۳) خرچ کہاں کیا جائے؟:

قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (البقرہ ۲:۲۱۵) ''ان سے کہیے جو بھی مال تم خرچ کرو وہ والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے۔''

(۴) ظاہر اور چھپا کر خرچ کرو:

وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً (الرعد۱۳:۲۲)

''(دارِ آخرت کن کے لیے ہے) جنہوں نے (رضائے الٰہی) کے لیے خرچ کیا خفیہ اور علانیہ''۔

کبھی دوسروں کو ترغیب دلانے کے لیے علانیہ دے ڈالا اور کبھی خفیہ کہ اس ہاتھ سے دیا تو دوسرے ہاتھ کو خبر تک نہ ہوئی، البتہ ہر حال میں اِخلاص پیشِ نظر رہا۔

(۵) صدقہ و خیرات کے بعد دل آزاری نہ کرو:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى، كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ۲:۲۶۴)

''اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر ضائع مت کرو جیسے کہ وہ شخص (ضائع

کرتا ہے) جو اپنا مال لوگوں کو دکھلانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔''

اس آیۂ مبارکہ میں اہل ایمان کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ وہ اپنے صدقات کو ضائع نہ کریں کہ جن لوگوں سے انہوں نے احسان و مروت کا سلوک کیا اب انہیں کسی طرح بھی طعن و تشنیع کا نشانہ نہ بنائیں۔ یہ تو گویا اس شخص کا طرز عمل ہے جو ایمان سے خالی ہے اور ریاکاری سے خرچ کرتا ہے اور اجر و ثواب سے محروم ہے۔

(۶) خوبصورت گفتگو ایسے صدقہ سے بہتر ہے:

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا اَذًى (البقرہ۲:۲۶۳)

''اچھی بات کہنا اور درگزر کر دینا ایسے صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد ایذا دی جائے''۔

(۷) خرچ میں راہ اعتدال:

وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان:۶۷)

''اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ اِسراف کرتے ہیں اور نہ بخل بلکہ ان کا خرچ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال کا ہوتا ہے۔''

ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اِسراف اور ضرورت سے کم خرچ کرنا بُخل ہے، یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کرنا اسراف اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ نہ کرنا بخل جبکہ اللہ تعالیٰ کے احکام و اطاعت کے مطابق خرچ اعتدال (قواماً) کی راہ ہے اور یہی اسلام کی پاکیزہ راہ ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ لکھتے ہیں: رزق سے مراد صرف مال و دولت ہی نہیں، بلکہ ہر وہ نعمت ہے جو جسم و روح کی پرورش میں مددگار ثابت ہو، اگر اللہ نے کسی کو علم و ہنر دیا ہے تو دوسروں کو سکھلائے، جوانی اور صحت دی ہے تو اسے جہاد میں یا ضعیفوں کی مدد کرنے میں خرچ کرے اور مال و دولت ہے تو اسے فقراء، یتیموں اور مسکینوں وغیرہ پر خرچ کرے اور اس خرچ کی کم از کم حد فرض صدقہ یعنی زکوٰۃ ادا کرنا ہے اور بلند تر درجہ یہ ہے کہ جو کچھ ضرورت سے زائد ہو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ:۲۱۹) ''آپ (ﷺ) سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں، ان سے کہیے کہ جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو (وہ سب اللہ کی

راہ میں خرچ کردو)۔"

۲) اس رزق کو خرچ کرنے سے خواہ وہ علم ہو یا مال، معاشرتی زندگی سرسبز و شاداب ہوتی ہے، لوگوں کی فقیری و محتاجی دور ہوتی ہے، جہالت اور ناخواندگی کا مداوا ہوتا ہے، اعتدال اور توازن ہی کسی معاشرے کو صحت و سلامتی سے ہمکنار کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۴)	"اور (متقین تو وہ ہیں) جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔"

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾

(متقین تو وہ لوگ ہیں) جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ کی طرف نازل کیا گیا۔

اَلَّذِيْنَ (جو لوگ) اسم موصول (Relative Pronoun) يُؤْمِنُوْنَ (وہ سب ایمان لاتے ہیں) فعل مضارع جمع مذکر غائب اٰمَنَ يُؤْمِنُ اِيْمَانًا اسم فاعل مُؤْمِنٌ ایمان لانے والا ایمان نہ صرف زبان سے اقرار بلکہ دل سے تصدیق کرنا اور عمل کے لیے تیار ہو جانا ہے۔ "اَلْاِيْمَانُ اِقْرَارٌ بِالْلِّسَانِ و تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ وَعَمَلٌ بِالْجَوَارِحِ" بِمَا (بِ – مَا) بِ حرف جار اور ما موصولہ، ساتھ اس کے جو اُنْزِلَ اِلَيْكَ، اَنْزَلَ يُنْزِلُ اِنْزَالًا (باب افعال) اُنْزِلَ فعل ماضی مجہول (Passive voice) اتارا گیا۔ اِلَيْكَ (اِلی – ک) اِلی طرف، ک ضمیر مخاطب آپؐ پر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہونے والی وحی متلو (قرآن حکیم) اور وحی غیر متلو (احادیث صحیحہ) پر ایمان لاتے ہیں۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ۵۳: ۳،۴) "وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، جو کہتے ہیں ان پر نازل کردہ وحی ہوتی ہے"۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (اٰلِ عمران ۳:۱۶۴)

''بلاشبہ اللہ نے مومنوں پر بہت احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان پر اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ فرماتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے''۔

حکمت سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک سنت کی تعلیم ہے۔

﴿وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ﴾

اور ان کتابوں پر بھی (ایمان لاتے ہیں) جو آپ سے پہلے نازل ہوئیں۔

سابقہ کتب سماویہ پر ایمان رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ سچائی بہرحال سچائی ہے، وہ کتابیں جو رب کائنات کی طرف سے نازل ہوئیں یقیناً سچی تھیں اور وہ پیغمبر اور رسول بھی سچے تھے جن پر وہ کتب نازل ہوئیں، اگر ایک صداقت کو تسلیم کر لیا ہے تو ویسی ہی صداقت کو تسلیم کرنے میں کونسی چیز مانع ہے؟ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی کبریائی کا اعلان فرمایا تو تسلیم اور اگر ابراھیم، اسحاق، یعقوب، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام نے اسی رب کی عظمت کا اعلان فرمایا تو یہ بھی درست۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ، لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ، و نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (اٰلِ عمران ۳:۸۴)

''آپ (ﷺ) ان سے کہہ دیجئے ہم اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی (قرآن) اور اس پر بھی جو حضرت ابراھیم، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب اور اس کی اولاد پر نازل ہوئی اور ان (کتابوں) پر بھی جو حضرت موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (خالق ومالک) کے تابع فرمان ہیں۔''

ہمارا ایمان تو سب کتب سماویہ اور انبیاء علیہم السلام پر ہے، چونکہ سردارِ انبیا، خاتم النبین محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے ہیں اس لیے انہی کا اتباع تا قیامت نسل انسانی کے لیے ضروری، لازمی اور کافی وشافی ہے، کیونکہ ان کی آمد سے سابقہ تمام شریعتیں منسوخ ہوگئیں۔

مِنْ قَبْلِکَ سے یہ نکتہ بھی سامنے آ گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیّن ہیں، قرآن نے جہاں ایمان کا ذکر کیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل ہونے والی وحی اور پہلے انبیاء کا ذکر فرمایا ہے، بعد میں آنے والی کسی وحی یا نبی کا کہیں قطعاً ذکر نہیں ہے۔ قرآن حکیم کے کئی مقامات پر من قبل اور من قبلک کی قید لگی ہوئی ہے، کہیں مِنْ بَعْد کا اشارہ تک نہیں۔ (معارف القرآن) اس کا مطلب یہ ہوا کہ قیامت تک جو بھی نبوت کا دعویٰ کرے گا وہ باطل ہوگا اور ایسا شخص حدیث کے مطابق کذّاب، وضّاع اور دجّال ہوگا۔

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔

ب (ساتھ) آخِرۃ، آخر کی تانیث اور آخِرتٌ سے مراد دارِ آخرت یُوْقِنُوْنَ مضارع جمع مذکر غائب اَیْقَنَ، یُوْقِنُ، اِیْقَانًا باب افعال ہے۔ اسی سے لفظ یقین (faith) ہے اور یہ کسی بات پر راسخ اور پختہ اعتماد کا نام ہے، آیت میں آخرت کو پہلے لانا اور اس کے بعد ھُمْ، ضمیر جمع مذکر اور یُوْقِنُوْنَ آخر میں لانے سے، یقین آخرت کی اہمیت کو بڑھا دیا گیا ہے۔

رب کریم نے انسان کو زندگی کا یہ شرف و کمال اور جلال و جمال بیکار اور بے مقصد نہیں عطا کیا بلکہ اس کے لیے حساب و کتاب اور جزا و سزا کا دن بھی رکھا ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (المومنون ۲۳:۱۱۵)

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا کر دیا اور تم ہمارے ہاں نہ لوٹو گے؟''

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

ان آیات میں یہ متقین کی آخری صفت ہے، یہ صفت دنیا کو آخرت سے، آغاز کو انجام سے اور عمل کو جزا سے مربوط کر دیتی ہے، اس سے انسان میں یہ شعور اجاگر ہوتا ہے کہ وہ پیدا کر کے بیکار نہیں چھوڑ دیا گیا ہے، نہ اس کی تخلیق فضول اور بے مقصد ہے اور نہ اس کی زندگی بے نتیجہ! اللہ تعالیٰ کا کامل اور مطلق انصاف اس کی واپسی کا منتظر ہے (کہ اسے اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے) یہ اس لیے کہ (راہ حق پر چلتے ہوئے) اس کے دل کو سکون و اطمینان حاصل ہو، وہ عمل صالح کی طرف متوجہ ہو اور سفر زندگی کے خاتمہ پر اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی رحمت کا متوقع اور طلبگار رہو۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) صداقت ہمیشہ صداقت ہی رہتی ہے تمام انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام حق لے کر تشریف لائے اس لیے ہمارا ایمان سابقہ تمام کتب سماوی اور تمام انبیاء علیہم السلام پر ہے۔

۲) وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ''جو آپ صلی اللہ علیہ وآسلہ وسلم سے پہلے نازل کیا گیا۔'' اس میں یہ نکتہ بھی آ گیا کہ آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں کیونکہ آپ ﷺ کے بعد کے کسی نبی کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

۳) آخرت پر یقین اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ موجودہ نظام کائنات ابدی نہیں ہے، بلکہ ایک وقت آنے والا ہے جب یہ سب کچھ فنا ہو جائے گا، یوم آخرت میں اللہ تعالیٰ نیکوں کو جزا اور بروں کو سزا دے گا۔

۴) اس بات کا بھی پتہ چل گیا کہ یہ دنیا سراسر امتحان گاہ ہے اور انسان اس دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں، بلکہ اپنے تمام اعمال کے لیے رب کائنات کے سامنے جواب دہ ہے۔

اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵)	''تو یقیناً یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔''

اُولٰئِکَ، اسم اشارہ بعید جمع مذکر (وہ سب those)، اشارہ ہے اہل تقوی (متقین) کی طرف جن کے اوصاف اس سے پہلے کی آیات میں بیان ہوئے ہیں۔ غیب پر ایمان لانا، نماز قائم کرنا، اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے میں سے خرچ کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نازل ہوا (وحی) اس پر ایمان لانا، آپؐ سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئیں ان کو ماننا اور آخرت پر یقین رکھ کر وہاں کام آنے والے نیک اعمال کرنا۔

﴿هُدًی﴾ مصدر (هَدَی یَهْدِی، هِدَایَةً) ہدایت دینا ہدایت، لفظ الهدی قرآن حکیم میں کئی معنوں میں آتا ہے۔

(۱) **بیان:** یعنی عَلٰی بَیَانِ رَبِّھِمْ (اپنے رب کے بیان کے مطابق) جب کہ ارشاد ہوا:
اُولٰئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ (البقرہ۲:۵)
''تو یقیناً یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔''
(۲) بمعنی دین اسلام:- اِنَّکَ لَعَلٰی ھُدًی مُّسْتَقِیْمٍ (الحج۲۲:۶۷)
''بلاشبہ آپ صراط مستقیم (اسلام) پر ہیں''۔
(۳) **ایمان:** وَیَزِیْدُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اھْتَدَوْا ھُدًی (مریم۱۹:۷۶)
''اور جو لوگ ہدایت پر چلتے ہیں اللہ انہیں مزید ہدایت عطا کرتا ہے (ایمان میں اضافہ فرماتا ہے)''۔
(۴) **الدّاع:** (ایمان کی طرف دعوت دینے والا) اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ (الرعد۱۳:۷) ''آپ صرف ایک ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما (اللہ کی طرف دعوت دینے والا) موجود رہا''۔
(۵) **رسل وکتب:** فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرہ۲:۳۸) ''(اے آدم تم اور تمہاری اولاد زمین پر اترو) پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت (رسول اور کتب) آئیں (جو یقیناً آئیں گی) پھر جو کوئی میری ہدایت کا اتباع کرے گا تو ایسے لوگوں کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔
(۶) **معرفت** (جان پہچان): وَعَلٰمٰتٍ وَّبِالنَّجْمِ ھُمْ یَھْتَدُوْنَ (النحل۱۶:۱۶)
''اور (اللہ نے) کچھ نشانیاں بنائیں اور لوگ ستاروں سے راستہ (کی جان پہچان) کر لیتے ہیں''۔
(۷) **رھنمائی:** اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (الفاتحہ۱:۶)
''(اے اللہ!) ہماری صراط مستقیم پر رہنمائی فرما''۔
(۸) **القرآن:** فَقَدْ جَآءَ کُمْ بَیِّنَۃٌ مِنْ رَّبِّکُمْ وَھُدًی وَّ رَحْمَۃٌ (الانعام۶:۱۵۷) ''تو یقیناً تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل ہدایت اور رحمت آ چکی ہے (یعنی قرآن)''۔
(۹) **احکام:** اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی (البقرہ۲:۱۵۹) ''بے شک جو لوگ ہمارے نازل کردہ واضح دلائل اور احکام چھپاتے ہیں (وہ رحمت الٰہی سے دور ہیں)''
(۱۰) **توحید:** ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ (الصّف۶۱:۹) ''وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت (توحید) اور سچا دین دے کر

بھیجا تا کہ اسے سب ادیان پر غالب کر دے اگر چہ مشرکوں کو کتنا ہی نا گوار ہو"۔

(۱۱) **اِلھام**: رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ ۲۰:۵۰)

"ہمارا رب تو وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی رہنمائی کی (الھام کے ذریعہ)"۔

دیکھئے کہ پرندہ ہوا میں اڑ رہا ہے اور مچھلی پانی میں تیر رہی ہے۔

(۱۲) **رجوع کرنا**: وَاكْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ، اِنَّا هُدْنَآ اِلَیْكَ (الاعراف ۷:۱۵۶) "(اے ہمارے پروردگار!) ہمارے لیے اس دنیا میں بھی نیکی لکھ دے اور آخرت میں بھی ہم نے تیری طرف رجوع کر لیا ہے"۔

(۱۳) **راستہ**: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام ۶:۹۰)

"یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی آپ انہی کے راستہ پر چلئے"۔

﴿الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (فلاح پانے والے) (ف ل ح) اَفْلَحَ یُفْلِحُ (فلاح پانا) (باب افعال) سے اسم فاعل مُفْلِحٌ (مفرد) مُفْلِحُوْنَ (جمع) کامیاب ہونا، فلاح پانا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں: "مفلحون (دنیا و آخرت دونوں میں) دنیا کی فلاح تو یہ ہے کہ انہیں راہ ہدایت نصیب ہو گئی اور انفرادی و اجتماعی شخصی و قومی ہر حیثیت سے جامع ترین اور بہترین دستورِ حیات منازلِ زندگی طے کرنے کا ہاتھ آ گیا اور آخرت کی فلاح یہ کہ وہاں پورا پورا صلہ مل کر رہے گا۔ (تفسیر ماجدی)

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) اس آیہ مبارکہ سے قبل متقین کی صفات بیان ہوئیں..... ایمان بالغیب، نماز کو قائم کرنا، انفاق فی سبیل اللہ، آپ ﷺ پر جو کتاب نازل کی گئی یعنی قرآن اور سابقہ کتب سماوی اور آخرت پر یقین کے بعد انہی اہل تقویٰ کو کامیابی کی نوید سنائی گئی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کامیابی کے لیے صرف مندرجہ بالا صفات ہی کافی ہیں، قرآن حکیم میں تقویٰ کی صفات کا جا بجا ذکر آیا ہے جنہیں پورا کرنا ضروری ہے۔

۲) ہدایت اور انسانی شرف لازم و ملزوم ہیں یعنی ہدایت کے بغیر حصول شرف ناممکن ہے اور یہ عزّ و شرف صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ دینِ اسلام پر عمل سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ(٦)	''بلا شبہ جن لوگوں نے (دعوت ایمان قبول کرنے سے) انکار کیا، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کے لیے ایک ہی بات ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

اِنَّ (Verily) حرف تاکید ہے جملہ کے شروع میں لاتے ہیں تو اس سے کلام میں زور (force) پیدا ہوتا ہے۔ اَلَّذِیۡنَ۔ واحد اَلَّذِیۡ۔ اسم موصول، وہ جو (Those, who) کَفَرُوۡا (ک ف ر) کَفَرَ یَکۡفُرُ ، کُفۡرًا، باب نَصَرَ یَنۡصُرُ فعل ماضی جمع مذکر غائب (ان سب نے کفر کیا، حق بات کو چھپایا)۔ کفر لغت میں کسی چیز کو ڈھانکنے یا چھپانے کو کہتے ہیں:

''سَتَرُالشَّیۡءِ وَ تَغَطِّیۡہِ'' رات کو بھی مجازا کافر کہا جاتا ہے کہ وہ روشنی کو چھپاتی ہے جیسا کہ عربی محاورہ ہے۔

''فِیۡ لَیۡلَۃٍ کَفَرَ النُّجُوۡمَ غَمَامُھَا'' یعنی وہ رات کہ ستاروں کو اس کے بادلوں نے چھپالیا۔

اسی طرح کسان کو بھی کافر کہا جاتا ہے کہ وہ بیج کو زمین میں چھپاتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

کَمَثَلِ غَیۡثٍ أَعۡجَبَ الۡکُفَّارَ نَبَاتُہُ (الحدید۵۷:۲۰)

''جیسے بارش کی مثال ہے کہ اس کی نباتات نے کاشت کاروں کو خوش کر دیا''۔

اصطلاح میں کفر یا کفرانِ نعمت کے معنی نعمت کی ناشکری کر کے اسے چھپانے کے ہیں گویا شکر کے مقابلے میں کفر ہے۔ جیسا کہ رب العزت کا ارشاد ہے: وَاشۡکُرُوۡا لِیۡ وَلَا تَکۡفُرُوۡنِ (البقرہ۲:۱۵۲) ''اور میرا شکر ادا کرتے رہو اور کفران نعمت نہ کرو''۔

قرآن حکیم میں کفر مندرجہ ذیل معنوں میں آیا ہے:

1- اللہ تعالیٰ کی توحید سے انکار:

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (البقرہ۲:۶)

''بلا شبہ جن لوگوں نے (دعوتِ ایمان قبول کرنے سے) انکار کیا، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں (ان کے لیے ایک ہی بات ہے) وہ ایمان نہیں لائیں گے''۔

2- كُفْرُ الجُحُوْدِ (علم کے باوجود انکار کرنا):

فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (البقرہ۲:۸۹)

''پھر جب وہ تشریف لے آئے جسے وہ پہچان چکے تھے (جس کی صداقت کے ان کو ثبوت مل چکے تھے) تو اس سے منکر ہو گئے''۔

یہود جب کفارِ مدینہ سے (جنگ وغیرہ میں) پٹ جاتے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے کہ نبی آخر الزمان کو جلد بھیج کہ ہم ان کے ساتھ مل کر کفار پر فتح حاصل کریں اور جب وہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور انہوں نے تورات میں مذکورہ نشانیوں کی مدد سے انہیں اچھی طرح جان پہچان لیا۔ تو محض ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر انکار کر دیا اور اس لیے بھی کہ اپنی سیادت وقیادت میں فرق نہ پڑنے پائے۔

3- كُفْرُ النِعْمَةِ (کسی نعمت پر کفر):

هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِيَبْلُوَنِیْۤ ءَ اَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ (النمل۲۷:۴۰)

''(سلیمان علیہ السلام نعمتیں ملنے کے بعد فرماتے ہیں) یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفر (ناشکری)''

4- اَلْبَراءَةُ (بری ہونا):

ثُمَّ يَوْمَ القِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَ يَلعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (العنکبوت۲۹:۲۵)

''پھر قیامت کے روز (اصنام پرست) ایک دوسرے کا انکار (برأت) کریں گے اور ایک دوسرے پر لعنت کریں گے''۔

شیطان (ابلیس) روز قیامت پکار اٹھے گا: اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَا اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ (ابراھیم۱۴:۲۲)

''اس سے پہلے جو تم مجھے اللہ کا شریک بناتے رہے ہو میں اس سے (برأت) کا اعلان کرتا ہوں''۔

یعنی میرے کہنے پر تم لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے جو شریک بنا رکھے تھے وہ تمام تر فریب ہی تھا اور آج میں ان سب باتوں سے بری ہوتا ہوں۔

سَوَاءٌ اسم مصدر بمعنیٰ اَلْاِسْتِوَاء، (برابر) ءَ اَنْذَرْتَهُمْ (ءَ-اَنْذَرْتَ-هُمْ) کیا آپ انہیں

ڈرائیں، ءَ کلمہ استفہام (کیا) اَنْذَرَ یُنْذِرُ، اِنْذَارًا باب افعال (آگاہ کرنا، ڈرانا) ھُم ضمیر وہ سب لوگ۔ اَمْ ۔حرف عطف ہمزہ استفہام کے بعد تسویہ اور برابری کے مفہوم کے لیے آتا ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا، حق بات کو سمجھتے ہوئے بھی اس پر پردہ ڈال دیا، سچائی سے منہ موڑا اور اپنے پندار اور غرور میں رہے، ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر اور یکساں ہے۔ یہ پورا جملہ، جملہ معترضہ ہے جو ''اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' کی حالت بیان کرتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ تکبر اور غرور سب سے بڑا بت ہے جو راہِ حق کو قبول کرنے میں آڑے آتا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) ''جنہوں نے کفر کیا، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔'' یہ خبر فیصلے کی صورت میں نہیں، بلکہ ان لوگوں کے مسلسل انکار اور مخالفت کے نتیجے کا اظہار اور اعلان ہے، اسلام کہتا ہے کہ ہر شخص کی فطرت سلیم ہوتی ہے مگر نفس امارہ کی انگیخت، غلط تعلیم وتربیت اور بری صحبت کی وجہ سے انسانی فطرت مجروح ہو جاتی ہے، برائی کے اثرات سے دل زنگ آلود ہو جاتے ہیں اور حق بات کو قبول کرنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔

۲) غرور اور تکبر، جہالت اور نادانی راہِ حق قبول کرنے میں رکاوٹ بنتے ہیں، مگر جونہی عجز اور خاکساری پیدا ہو جائے تو سچائی قبول کرنے کی صلاحیت بڑھنے لگتی ہے، جن لوگوں کی فطرت سلیم تھی انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر فوراً لبیک کہا اور بعد میں جنہوں نے عجز وخاکساری اختیار کی انہیں بھی یہ روشنی ملی اور وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَ عَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ(۷)	''(دعوت حق سے روگردانی کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے اور ان پر عذاب الٰہی کی بڑی مار ہے۔''

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾

(دعوت حق سے روگردانی کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی۔

خَتَمَ (خَتَمَ يَخْتِمُ خَتْمًا) مہر لگا دینا (To Seal) خَتَمَ ماضی واحد مذکر غائب خَاتِمٌ اور خَتْمٌ مہر (Seal, Stamp) کو کہتے ہیں۔ قُلُوبِهِمْ، قَلْب کی جمع قُلُوب (دل) (heart) قَلْبُ الشَّيءِ کے معنی کسی چیز کو پھیرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے کے ہیں جیسا کہ قَلْبُ الثَّوْبِ (کپڑے کو الٹنا)۔

قرآن حکیم میں ہے:

وَ اِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ (العنکبوت ۲۹:۲۱) ''اور تم اسی (رب کائنات) کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

الانقلاب کے معنی پھر جانا، لوٹنا، ارشاد ہوتا ہے: اِنَّا اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ (الشعراء ۲۶:۵۰) ''بے شک ہم اپنے رب کے حضور حاضر ہونے یا پلٹنے والے ہیں''۔ (مفردات القرآن)

اردو زبان میں انقلاب کا لفظ تغیر و تبدل، گردش، نیرنگ زمانہ، پرانے سیاسی یا معاشی نظام کی جگہ نئے نظام کا نفاذ ہے جسے انگریزی میں (Revolution) کہتے۔

بعض نے کہا ہے کہ انسان کے دل کو بھی قلب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کثرت سے الٹتا پلٹتا رہتا ہے اور قلب کا لفظ بول کر اوصاف قلبی مراد لیے جاتے ہیں جیسے علم، شجاعت، روح وغیرہ گویا کہ قلب سے مراد عقل و شعور ہے نہ کہ وہ مضغہ (ٹکڑا) گوشت و پوست جو سینے کے اندر ہے۔ (مفردات القرآن)

جب کوئی شخص حق بات قبول کرنے سے مسلسل اور پیہم روگردانی کرتا ہے اور کسی دلیل سے بھی سچائی کی طرف نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اس شخص کی نفسانی کیفیت و ہیئت کچھ ایسی بن جاتی ہے کہ

گناہوں کو اچھا سمجھنا اس کی عادت بن جاتی ہے۔ گویا اس طرح اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے، قرآن حکیم اس قسم کے افراد کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ، وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ، وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (الاعراف ۷:۱۷۹)

''ان کے دل تو ہیں مگر ان سے (حق) کو سمجھتے نہیں اور بصارت تو ہے مگر بصیرت سے محروم اور کان تو ہیں لیکن (حق کو) ان سے سنتے نہیں۔ ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے (They are worse than cattle) اور یہی لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں''۔

﴿وَعَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی۔

سَمْعٌ سے مراد سماعت ہے یعنی وہ آیات الٰہی پر غور و تدبر اور فکر و شعور سے کام نہیں لیتے۔ قرآن اس کا ذکر دوسری جگہ اس طرح کرتا ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد ۴۷:۲۴)

''کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان لوگوں کے دلوں پر قفل ہیں''۔

﴿وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑ گیا) ہے۔

لفظ غِشَاوَةٌ اسم کے طور استعمال ہوا ہے، معنی پردہ، اَبْصَار، بَصَرٌ کی جمع ہے، آنکھ، غِشَاوَةٌ (غَشِيَ، يَغْشَى، غَشْيًا، غَشًى، غَشْيَانًا، غِشاوةٌ) ڈھانپ لینا، پردہ ڈالنا یعنی ان کی آنکھیں ایمانی آیات کو نہیں دیکھ سکتیں گویا جو آنکھیں سچائی کو نہ پرکھ سکیں وہ حقیقت میں اندھی ہیں یا ان پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

حق و صداقت کو پرکھنے اور جانچنے کے لیے آنکھیں دیکھتی ہیں، کان سنتے ہیں اور دل اس پر غور و فکر کر کے اسے اپنے اندر جگہ دیتا ہے، قرآن حکیم دل کے اندھے پن کو اس طرح بیان کرتا ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (الحج ۲۲:۴۶)

''بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، اندھے تو وہ دل ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں''۔

ایک شخص اگر دنیا میں نابینا ہے مگر دولت ایمان سے بہرہ ور ہے تو حقیقت میں وہ کامیاب ہے اور روز

جزاوہ روشن آنکھوں سے اٹھایا جائے گا۔اس کے برعکس ایک بینائی رکھنے والا شخص اگر دولت ایمان سے تہی دست ہے تو روز قیامت وہ نابینا اٹھایا جائیگا اور وہ پکار اٹھے گا:

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْ اَعْمٰی وَ قَدْ کُنْتُ بَصِیْراً ، قَالَ کَذٰلِکَ اَتَتْکَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا ، وَ کَذٰلِکَ الْیَومَ تُنْسٰی (طٰہٰ ۲۰:۱۲۵،۱۲۶)''اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا حالانکہ میں تو آنکھوں والا تھا، اللہ فرمائے گا، جیسے ہماری آیات تیرے پاس آئیں تو تو نے بھلا دیا آج تو بھی بھلایا جائے گا''۔

﴿وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ ''اوران کے لیے عذاب عظیم ہے۔''

عذابٌ کا مادہ (Root word) عَذُبٌ میٹھا (Sweet) ہے۔مَاءٌ عَذُبٌ (شیریں اور عمدہ پانی) درد، بھوک پیاس کی وجہ سے جو چیز زندگی کی لذت کو چھین لے اسے عذاب کہتے ہیں۔

العذاب ''اَلْاَلَمُ یَزِیْلُ عَذُوْبَةَ الحَیَاةِ و لَذَّتَها'' ایسا رنج والم جو زندگی کی راحتوں اور لذتوں سے دور لے جائے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) حق بات سے مسلسل اور پیہم انکار کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پہلو میں دل موجود ہوئے ہیں، مگر فہم وشعور سے محروم ہوتے ہیں اور قوت سماعت ہوتی ہے مگر حق وصداقت سننے کے لیے تیار نہیں ہوتی ہے، اس طرح قوت بصارت ہوتی ہے، مگر قوت بصیرت جاتی رہتی ہے۔

۲) سید مودودیؒ لکھتے ہیں: ''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے مہر لگا دی تھی، اس لیے انہوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے ان بنیادی امور کو رد کر دیا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور اپنے لیے قرآن کے پیش کردہ راستے کے خلاف دوسرا راستہ پسند کر لیا۔ تو اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی، اس مہر لگنے کی کیفیت کا تجربہ ہر اس شخص کو ہوگا جسے کبھی تبلیغ کا اتفاق ہوا ہو، جب کوئی شخص آپ کے پیش کردہ طریقے کو جانچنے کے بعد ایک دفعہ رد کر دیتا ہے تو اس کا ذہن کچھ اس طرح مخالف سمت چل پڑتا ہے کہ پھر آپ کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، آپ کی دعوت کے لیے

اس کے کان بہرے اور آپ کے طریقے کی خوبیوں کے لیے اس کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں اور صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ فی الواقع اس کے دل پر مہر لگی ہوئی ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (۸)	''اور بعض لوگ ایسے (بھی) ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں مگر (حقیقت یہ ہے کہ) وہ مومن نہیں ہیں۔''

وَ (اور) مِنْ حروف جر (Preposition) میں سے ہے جو اپنے بعد والے اسم کو زیر دیتا ہے، کبھی اس کا معنیٰ 'سے' (From) ہوتا ہے جیسا کہ سِرْتُ مِنَ الْبَصَرَةِ اِلَى الْكُوْفَةِ (میں بصرہ سے کوفہ تک چلا) اور کبھی یہ 'بعض' (Some) کا معنی دیتا ہے جیسا کہ اَخَذْتُ مِنَ الدَّرَاهِمَ (میں نے بعض درہم لیے) النّاس (لوگ) اِنسانٌ کی جمع ہے وَمِنَ النَّاسِ (اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں) مَنْ جو (اسم موصول۔ Relative Pronoun) يَقُوْلُ۔ فعل مضارع معروف واحد مذکر غائب (قَالَ – يَقُوْلُ – قَوْلًا) اٰمَنَّا۔ ہم ایمان لائے (اٰمَنَ يُؤْمِنُ ، اِيْمَانًا) بِ۔ حرف جار، اس کا معنی ساتھ، پر۔ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ہم ایمان لائے اللہ تعالیٰ کی ذات پر، یاد رکھیے مَا کے بعد ب آجائے تو مَا ہمیشہ نافیہ (نفی کرنے والا) ہوتا ہے اور اس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ کا مطلب یہ ہوا (کہ وہ بالکل مومن نہیں ہیں)۔

اس آیہ مبارکہ سے پہلے قرآن حکیم نے دو گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک مومن، فرمانبردار، مخلص اور اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے لٹا دینے والے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لانے والے خواتین میں سے بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، بچوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور غلاموں میں سے حضرت زید رضی اللہ عنہ تھے۔ اس کے علاوہ دیگر صحابہ کرامؓ جنہیں قرآن حکیم نے السَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن، کے نام سے یاد کیا ہے گویا کہ یہ مفلحون (فلاح

پانے والوں) کا گروہ ہے۔

دوسرے وہ جو نافرمان، منکر و باغی اور کھل کر اسلام کا انکار کرنے والے کافر کہلائے (Disbelievers) اور وہ مسلمانوں کو ہر قسم کی ایذا رسانی کے لیے ہمہ وقت سرگرم رہے جیسا کہ ابولہب، ابوجہل، امیہ بن خلف، عتبہ، شیبہ وغیرہ، ان کا انجام ناکامی اور نامرادی ہوا۔

ذکر کی گئی آیہ مبارکہ میں تیسری قسم کے گروہ کا بیان ہے، اگرچہ یہ لوگ بھی کافر و منکر ہوتے ہیں تاہم زبان پر دعویٰ اسلام کا رکھتے ہیں لیکن ان کے دل کفر سے بھرے ہوتے ہیں، شریعت کی اصطلاح میں انہیں منافق (hypocrites) کہتے ہیں اور ان کے اس اعتقادی رویہ کو نفاق (hypocrasy) کہتے ہیں یہ ریاکار، مکار لوگ آستین کے سانپ ہوتے ہیں جن کا ڈسنا کفار سے بھی سخت ہوتا ہے یہ معاشرے کو زبردست نقصان پہنچاتے ہیں، اگر کفار کے لیے عذاب عظیم بتلایا گیا تو ان کے لیے عذاب الیم یعنی دردناک عذاب سنایا گیا ہے اور کہیں ارشاد ہوا: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء۴:۱۴۵) ''بلا شبہ یہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔''

(جہنم کا سب سے نچلا طبقہ ھاویہ ہے، وہاں بدترین عذاب ہوگا)

یہ اس لیے کہ انہوں نے کبھی بھی سچے اور کھرے دل سے اسلام قبول نہیں کیا، اگر ظاہری طور پر اعلان کیا بھی تو شاید اس لیے کہ مسلمانوں سے مال غنیمت کا کچھ حصہ مل جائے اور جب کبھی جہاد کا وقت آیا تو انہوں نے حیلے بہانے تراش کر جان چھڑالی، منافقین کا گروہ مدینہ منورہ میں سامنے آیا اور ان کا رئیس عبداللہ بن ابی تھا، یہ ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے تھے، یہ اگرچہ مسلمانوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے یہاں تک کہ نمازیں بھی ریاکاری سے ادا کرتے تاہم ان کے سینوں میں حسد و بغض کی آگ بھڑکتی رہتی اور کفار مکہ سے مل کر ان کے خلاف لگائی بجھائی بھی کرتے۔ قرآن اس حالت کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے:

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى، يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ، مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (النساء۴:۱۴۲،۱۴۳) ''اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ڈھیلے ڈھالے اور لوگوں کی ریاکاری کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں، یہ (کفر اور ایمان کے درمیان) لٹک رہے ہیں، نہ اِدھر کے ہیں اور نہ اُدھر کے''۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بڑے شدومد سے اعلان بھی کیا کرتے تھے۔

اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (المنفقون ۶۳:۱)

''جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ یقیناً آپ رسول اللہ ہیں''۔

عربی زبان میں اِنَّ اور ل منصوب (زبر والا) زور بیان کے لیے آتا ہے۔ گویا کہ اس جملہ میں زبردست زور (Force) ہے، قرآن حکیم ان کی اس کذب اور دروغ گوئی کو اُسی زور سے بیان کرتا ہے:

وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (المنفقون ۶۳:۱)

''اور اللہ یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں''۔

کفار ہوں یا منافقین، مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ (جب انہیں قوت حاصل ہو) وہ ان سے جنگ کریں تا کہ کلمۃ الحق سربلند ہو۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ (التحریم ۶۶:۹)

''اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔''

پاکستان کو معرض وجود میں آئے چوون برس سے اوپر کا عرصہ بیت چکا ہے، ہر آنے والی حکومت ظاہری طور پر اسلام کا نام لیتی رہی مگر عملاً کسی نے بھی اسلامی قانون کا نفاذ نہ کیا۔ کیا یہ کھلی منافقت نہیں ہے؟ اس درد کے درماں کا کون بیڑا اٹھائے گا۔

آج کے درس کے آخر میں نفاق اور ریاکاری سے بچنے کے لیے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا لکھتا ہوں:

اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِیْ مِنَ الرِّیَاءِ وَ لِسَانِیْ مِنَ الْکَذِبِ وَ عَیْنِیْ مِنَ الْخِیَانَةِ فَاِنَّکَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرِ

''اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے، میرے عمل کو ریا سے، میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت سے پاک فرما دے، بلاشبہ آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے راز سے تو خوب واقف ہے''۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) جب تک زبان اور دل میں مطابقت نہ ہو اس وقت تک ایمان کامل نہیں ہوتا۔

۲) زبان پر دعویٰ اسلام کرنا، مگر دل میں کفر کو قائم رکھنا، نفاق کہلاتا ہے اور جو شخص یہ وطیرہ اختیار کرے وہ منافق کہلاتا ہے۔

۳) لفظ منافق نفق سے نکلا ہے، اس کے لفظی معنی ہیں سرنگ لگانا، جیسے جنگلی جانور زمین کے اندر سرنگیں بناتے ہیں تاکہ وقت آنے پر ان میں چھپ سکیں اور خفیہ راستوں سے بھاگ کر نکل سکیں، اس اعتبار سے منافق اس بدبخت انسان کو کہا جاتا ہے جو بظاہر اسلام قبول کرے، لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں خفیہ چالیں چلے اور دشمنی کے لیے موقع کا منتظر رہے۔

۴) منافقین کا گروہ مدینہ منورہ میں پیدا ہوا، ان کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ ان لوگوں نے بظاہر اسلام قبول کر لیا تھا اور مسلمانوں کے ساتھ دکھلاوے کی نمازیں بھی پڑھ لیتے تھے، مگر دل سے مسلمانوں کے خلاف تھے اور قریش مکہ کو ان کے خلاف اکساتے رہتے تھے۔ ان کے بارے میں مندرجہ بالا آیہ مبارکہ میں بتلایا جا رہا ہے کہ یہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔

۵) آج بھی مسلمان حکومتوں میں منافقین کا ٹولہ موجود ہے جو بظاہر اسلام کا دم بھرتے ہیں مگر درحقیقت ان کا گٹھ جوڑ ہنود و یہود کے ساتھ ہوتا ہے، قرآن حکیم نے ان کے ساتھ بھی جہاد کو ضروری قرار دیا ہے۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۹) فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (۱۰)	''(وہ اپنے خیال) میں دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو اور اہل ایمان کو حالانکہ (فی الواقع) وہ دھوکہ کسی کو بھی نہیں دیتے بجز اپنی ذات کے اور اس کا بھی انہیں احساس تک نہیں ہوتا، ان کے دلوں میں (نفاق) کا مرض ہے، سو اللہ نے بڑھا دیا ان کا مرض اور ان کے لیے عذاب دردناک (ہونا) ہے اس لیے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔''

﴿یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾

وہ (اپنے خیال میں) دھوکہ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کو۔

یُخٰدِعُوْنَ (خَدْعٌ) دھوکہ دینا خَادَعَ یُخَادِعُ، مُخَادَعَةٌ باب مُفَاعَلَةٌ ہے (ایک دوسرے کو دھوکہ دینا) مگر یہاں یَخْدَعُوْنَ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (یعنی وہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں) اور باب مفاعلہ یہاں پر زور اور تاکید کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

ان منافقین کی اسلام اور مسلمانوں سے مخالفت اور حسد اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ اپنے زعم باطل میں اور منافقانہ روش کے ساتھ (کہ زبان سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں جبکہ دل کفر اور نفاق سے بھرے ہوئے ہیں) اللہ تعالیٰ کو اور اہل ایمان کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

﴿وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ﴾

حالانکہ (فی الواقع) وہ دھوکہ کسی کو نہیں خود کو دیتے ہیں۔

مَا نافیہ ہے خَدَعَ یَخْدَعُ، خَدْعًا دھوکہ دینا اِلَّا کلمۂ استثنا (Except) ہے (بجز، سوائے) اَنْفُس، نَفْسٌ کی جمع ہے هُمْ ضمیر متصل، وہ سب۔ وہ نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنی ذات کو۔

ان کا یہ خیال کہ وہ دھوکہ دے رہے ہیں۔ محض فریب نفس ہے جس کا نقصان (نعوذ باللہ) بھلا اللہ تعالیٰ کو کیا پہنچ سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ مومنوں کو بھی ان کے شر سے محفوظ کر لیتا ہے، اس کا نقصان تو خود انہیں دنیا اور آخرت میں پہنچنے والا ہے۔

''وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ'' اِذَا عَاقِبَةُ خَدَاعِهِمْ تَعُوْدُ عَلَیْهِمْ لَا عَلَی اللّٰهِ وَلَا عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَلَا عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ''وہ نہیں دھوکہ دیتے بجز اپنے نفسوں کو اس لیے کہ ان کے دھوکے کا انجام اور وبال انہی پر لوٹتا ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور مومنوں پر۔ (ایسر التفاسیر)

﴿وَمَا یَشْعُرُوْنَ﴾ ما نافیہ ہے۔ شَعَرَ یَشْعُرُ ، شُعُوْرًا، مضارع جمع مذکر غائب (لیکن وہ اس واضح حقیقت کا) شعور نہیں رکھتے ہیں، یَشْعُرُوْنَ کا مادہ (Root Word) شَعْرٌ ہے جس کا معنی بال (Hair) کے ہیں۔ اسی سے لفظ شُعُوْرٌ یعنی کسی باریک اور مخفی چیز کا ادراک (Understanding) ہے۔

مطلب یہ ہے کہ منافقین کو اپنے طرزِ عمل سے جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ واضح ہے لیکن ان کی عقل میں ایسا فتور آچکا ہے کہ انہیں اپنے نقصان اور خسارے کا ادراک اور احساس تک نہیں ہو رہا۔

﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ ان کے دلوں میں (نفاق) کی بیماری ہے۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ، فِی (میں) حروف جارہ میں سے جو بعد کے اسم کو زیر دیتے ہیں، قلب کی جمع قلوب (دل) هم ضمیر متصل (وہ۔ ان کے) مَرَضٌ بیماری، دراصل مرض انسان کے مزاجِ خصوصی کا اعتدال وتوازن کی حد سے نکل جانا ہے۔ ''اَلْمَرَضُ اَلْخُرُوْجُ عَنِ الْاِعْتِدَالِ'' (مفردات القرآن)

مرض دو قسم کا ہوتا ہے۔

۱- جسمانی مرض:- جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ (الفتح ۴۸:۱۷)

''(کوئی اندھا یا لنگڑا) یا بیمار (اگر جہاد میں شامل نہ ہو) تو اس پر کوئی گناہ نہیں''۔

۲- اخلاقی مرض:- مرض کا لفظ اخلاق کے بگڑنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے:

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔

اور اس سے جہالت، بزدلی، بخل، نفاق وغیرہ اخلاق رذیلہ مراد ہیں (مفردات القرآن)

﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ پس اللہ نے ان کے مرض میں اضافہ کر دیا۔

ان کا مرض کیسے بڑھا؟ جوں جوں اسلام اور مسلمانوں کی شوکت وقوت بڑھتی گئی تو ان منافقین کی کڑھن اور جلن بڑھتی گئی یا پھر یوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جوں جوں وحی الٰہی کا نزول ہوتا رہا تو ان کے غیظ وغضب میں اضافہ ہوتا گیا۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ''ان کے دلوں میں روگ ہے'' ان کی فطرت میں خرابی ہے! وہ اس بات کے مستحق ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے مرض کو جس میں وہ مبتلا ہیں، اور بڑھا دے! فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ''تو اللہ نے ان کے روگ کو اور بڑھا دیا''..... بیماری میں مزید بیماری پیدا ہوتی ہے، کج روی شروع میں تھوڑی

ہوتی ہے، پھر ہر قدم پر اس کا زاویہ بڑھتا جاتا ہے اور انسان حق سے دور اور دور تر ہوتا چلا جاتا ہے! یہ اللہ کی سنت ہے۔(فی ظلال القرآن)

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴾

اور ان کے لیے عذاب دردناک (ہونا) ہے اس لیے کہ وہ جھوٹ کہتے ہیں۔

وَ۔اور لَهُمْ ۔ان کے لیے عَذَابٌ عذاب ہے۔ اَلِيْمٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر ہے۔بہت زیادہ اور مسلسل اذیت دینے والی سزا، بِمَا (بِ–مَا) ب کے معنی ساتھ اور یہاں سبب اور وجہ کے معنی دے رہا ہے۔ يَكْذِبُوْنَ (ک ذ ب) كَذَبَ يَكْذِبُ (فعل مضارع جمع مذکر غائب) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے، جھوٹ بولنا منافقین کی نشانیوں میں سے بڑی علامت ہے۔''اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ''جب وہ بات کرتا ہے، تو جھوٹ بولتا ہے۔(بخاری ومسلم)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) منافق اپنے اس فریب نفس میں مبتلا ہیں کہ وہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں کو (زبان سے اسلام کا اقرار کر کے) دھوکہ اور فریب دے رہے ہیں، یہ تو محض اپنے دل کو خوش کرنے کی باتیں ہیں، بھلا اللہ تعالیٰ کو کون دھوکہ دے سکتا ہے؟ اور وہ علیم وقدیر مسلمانوں کو بھی ان کے دجل وفریب سے محفوظ رکھتا ہے۔

۲) مرض کا اطلاق روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی بیماریوں پر ہوتا ہے۔مثلاً بخار، نزلہ، سر درد اور پیٹ درد وغیرہ جسمانی بیماریاں ہیں تو کفر، نفاق، حسد، بغض وغیرہ روحانی بیماریاں ہیں، جسمانی امراض کا علاج تو آسان ہوتا ہے، جبکہ روحانی امراض بسا اوقات لاعلاج ہو جاتے ہیں، اس لیے فرمایا کہ مسلمانوں کی شوکت وعظمت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کے روگ کو اور بڑھا دیا تا کہ ان کی سزا میں اضافہ کر دیا جائے، جس طرح مسلسل جسمانی بیماری سے کمزوری اور نقاہت بڑھ جاتی ہے اسی طرح پیہم روحانی بیماریوں کا نتیجہ دردناک عذاب میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِىۡ الۡاَرۡضِ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ(۱۱) اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَلٰـكِنۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ(۱۲)	''اور جب ان (منافقین) سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، آگاہ رہو یہی لوگ حقیقتاً مفسد ہیں مگر (اس بات کا) شعور نہیں رکھتے ہیں۔''

﴿وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِىۡ الۡاَرۡضِ﴾

اور جب ان (منافقین) سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔

اِذَا ظرف زمان (Shows time) جب، مثلاً اِذَا جَاءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ (النصر۱۱۰:۱) ''جب اللہ کی مدد اور فتح آ پہنچی۔'' اِذَا زُلۡزِلَتِ الاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا (الزلزال۹۹:۱) ''جب زمین پوری شدت سے ہلا دی جائے گی'' (بوقت قیامت)۔

کبھی اِذَا ماضی کے شروع میں آتا ہے تو مستقبل کا معنی دیتا ہے جیسا کہ اِذَا اجۡتَهَدۡتَّ نَجَحۡتَ اگر آپ محنت کریں گے تو کامیاب ہو جائیں گے۔ کبھی برائے مفاجئت (اچانک) کا معنی دیتا ہے جیسا کہ خَرَجۡتُ فَاِذَا زَيۡدٌ بِالۡبَابِ، ''میں نکلا تو اچانک زید کو دروازے پر پایا۔''

قرآن حکیم میں ہے: بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَى الۡبَاطِلِ فَيَدۡمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (الانبیاء۲۱:۱۸) ''بلکہ ہم باطل پر حق کی ضرب لگاتے ہیں تو حق باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے''۔

قِيۡلَ (قَالَ، يَقُوۡلُ، قَوۡلًا) اور قیل ماضی مجہول (Passive voice) کہا جاتا ہے، اس کا فاعل اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ اور مومنین بھی ہو سکتے ہیں۔ (تفسیر کبیر)

لَا تُفۡسِدُوۡا، تم فساد نہ کرو اَفۡسَدَ يُفۡسِدُ، اِفۡسَاد باب افعال، تُفۡسِدُوۡا اصل میں تُفۡسِدُوۡنَ تھا لائے نہی کی وجہ سے ن گر گیا۔

اَلۡفَسَادُ خُرُوۡجُ الشَّیۡءِ عَنِ الۡاِعۡتِدَالِ، قَلِيۡلًا كَانَ الۡخُرُوۡجُ عَنۡهُ اَوۡ كَثِيۡرًا وَيُضَادُّهُ الصَّلَاحُ وَ

يُسْتَعْمَلُ ذٰلِكَ فِي النَّفْسِ وَالبَدَنِ وَالاَشْيَاءِ الخَارِجَةِ عَنِ الاِسْتِقَامَةِ (مفردات القرآن)

''اس کے معنی کسی چیز کے حداعتدال سے تجاوز کر جانے کے ہیں خواہ وہ کم ہو یا زیادہ ہو اور یہ صلاح کی ضد ہے اور نفس، بدن اور ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا جو حالت استقامت سے نکل چکی ہو۔''

الارض (Earth) نیچے کا حصہ جس میں انسان چلتا پھرتا ہے اور اوپر کا حصہ سماء (Sky) ہے ارض آسمان کے بمقابل ایک جِرم (ج کی زیر کے ساتھ) ہے اور اس کی جمع اجرام ہے۔

یعنی اَجرام فلکی (Heavenly Bodies)، سورج، چاند، ستارے، سیارے، زمین اور آسمان وغیرہ

ارض کی جمع اَرَاضِی ہے، قرآن حکیم میں صرف ارض استعمال ہوا ہے۔ (مفردات القرآن)

﴿قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾

وہ کہتے ہیں کہ ہم تو درحقیقت اصلاح کرنے والے ہیں۔

قَالُوْا، فعل ماضی جمع مذکر غائب **قَالَ يَقُوْلُ، قَوْلًا، اِنَّمَا**. کلمہ حصر (اپنی گفتگو کو مقید کرنا) حقیقت تو بس یہی ہے۔ **مُصْلِحُوْنَ اَصْلَحَ يُصْلِحُ، اِصْلَاحًا** باب افعال **مُصلح** سے **مُصلِحُون** جمع اسم فاعل (Reformers) اصلاح کرنے والے۔

زمین میں فساد کرنے والے سے مراد منافقین کی خفیہ سازشیں تھیں، وہ مسلمانوں سے ملتے تو ظاہراً ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے اور کفار سے ملتے تو مسلمانوں کے خلاف بھرپور زہر اگلتے اور انہیں ان کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے، ظاہر میں تو وہ اپنے آپ کو مصلح کہتے لیکن فی الحقیقت ان کی تمام تگ و دو فساد پر مبنی تھی۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''ہر زمانے میں ایسے لوگ بہت ہوتے ہیں جو بدترین فساد انگیزی کے مرتکب ہوتے ہیں، مگر ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ مصلح ہیں وہ یہ دعویٰ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے پاس جو پیمانے ہوتے ہیں ان میں اختلال رونما ہو جاتا ہے۔ جب نفس انسانی میں اخلاص اور یکسوئی کی میزان مختل ہو جاتی ہے تو سارے پیمانے اور تمام قدریں فساد اور اختلال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جن کے باطن اور جن کی نیتیں اللہ کے لیے خالص نہیں ہوتیں، انہیں اپنے اعمال کے فاسد ہونے کا مشکل ہی سے شعور ہو سکتا ہے، ان کے دل میں خیر و شر اور صلاح و فساد کی میزان ان کی ذاتی خواہشات کے تحت جھولتی اور اونچی نیچی ہوتی رہتی ہے، اس کا ضابطہ ربانی سے کوئی

واسطہ اور تعلق نہیں ہوتا، اسی لیے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے حتمی بیان اور صحیح فیصلہ آ گیا۔''
(فی ظلال القرآن)

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ﴾

''آگاہ رہو وہی مفسد ہیں، مگر وہ شعور نہیں رکھتے۔''

اَلَآ کلمہ تنبیہ خبردار، انھم (ان .هم) ان بے شک زور کلام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ هُم ضمیر جمع مذکر۔ وہ سب، هُم دوبارہ لا کر مزید تاکید اور زور (Stress) پیدا ہوا یعنی اس کے فسادی ہونے میں قطعی کوئی شک وشبہ نہ رہا۔ لٰكِنْ .کلمہ استدراکِ کلام (گزشتہ کلام کی تصحیح) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لا یشعرون. شَعَرَ يَشْعُرُ باب نَصَرَ يَنْصُرُ. لا یشعرون، عَدِيْمُ الشُّعُوْرِ، فَاقِدُ الشُّعُوْرِ، یعنی بے حس اور اثر پذیری سے خالی، کوئی قوم یا افراد اگر کسی حماقت کو دانشمندی، گناہ کو نیکی، فساد کو اصلاح اور برائی کو اچھائی خیال کرنے لگے تو وہ عقل وشعور سے فارغ اور دانش وبینش سے عاری ہو جاتے ہیں، اس وقت معراج انسانیت کو چھوڑ کر قعر مذلت میں جا گرتے ہیں اور اس سے برا اور کون سا ٹھکانہ ہوسکتا ہے۔ فرمان الٰہی کے مطابق اُولٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ اور یہی لوگ بدترین مخلوق ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں فہم وشعور کی دولت سے نوازے۔ آمین!

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) فساد فی الارض بہت بڑا ظلم ہے جس سے معاشرتی زندگی تہہ وبالا ہو جاتی ہے، منافقین ادھر مسلمانوں سے میل ملاپ رکھتے، ادھر قریش مکہ کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہتے، ان کی اس دورخا پالیسی سے فساد اور جنگ کے شعلے بھڑکتے۔ اس چوری اور سینہ زوری، کے مرتکب ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو مصلحین (اصلاح کرنے والے) کہتے تھے، مگر قرآن ایسے لوگوں کو مفسدین (فساد پھیلانے والے) کے نام سے یاد کرتا ہے۔

۲) آج بھی امت مسلمہ میں خاص طور پر حکمران طبقے میں ایسا ٹولہ موجود ہے جو زبان سے تو ملک وملت کے لیے اپنی وفاداریاں ثابت کرتا رہتا ہے مگر حقیقت میں ان کی وفاداریاں یہود ونصاریٰ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ، اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۱۳)	''اور جب ان (منافقین) سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایمان لاؤ جیسے سب (صحابہ کرامؓ) ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں ''کیا ہم بھی اس طرح ایمان لائیں جس طرح یہ بے وقوف ایمان لائے ہیں'' یاد رکھو وہی بے وقوف ہیں مگر انہیں (اپنی جہالت وحماقت) کا علم نہیں۔''

وَ۔اور۔واؤ عاطفہ ہے،اِذَا کلمہ شرط۔جب،قِيْلَ (ق ول)قَالَ يَقُوْلُ سے ماضی مجہول قِيْلَ (کہا گیا)اِذَا کی وجہ سے اس میں فعل مضارع کے معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ اٰمِنُوْا (ا م ن)اٰمَنَ يُؤْمِنُ اِيْماناً سے فعل امر اٰمِنْ (تو ایمان لا) اور جمع مذکر حاضر اٰمِنُوا (تم سب ایمان لاؤ) كَمَا کلمہ تشبیہ (جیسا کہ) النّاس جمع ہے،اس کا واحد اِنسانٌ ہے۔ال سے اسم معرفہ ہو گیا (Proper Noun)اس سے مراد خاص لوگ یعنی وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور جنہوں نے اپنا تن،من،دھن سب کچھ راہ حق میں قربان کر دیا جیسا کہ ابوبکر صدیق،عمر فاروق،عثمان غنی علی مرتضٰی،بلال حبشی،صہیب رومی،عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنھم وغیرہ انہیں ابرار وصالحین کو رب کائنات کی طرف سے یہ خوشخبری دی گئی تھی۔رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ''اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے''۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں رضا مندی کی سند اس لیے ملی کہ وہ اپنے مولا و مالک کی رضا کے لیے ہر دکھ اور ہر تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ،ایمان لائے تو انہیں لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں ڈال دیا گیا،لڑکے ان کو مکہ کی پہاڑیوں میں گھسیٹتے پھرے لیکن ان کی قوتِ ایمان میں کسی قسم کا ضعف نہ آیا۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ ام انمار کے غلام تھے وہ اسلام لائے تو ام انمار نے لوہا گرم کر کے ان کے سر پر رکھا،ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی پشت کو دیکھا تو کہا کہ آج تک ایسی پشت میری نظر سے نہیں گزری۔حضرت خبابؓ نے جواب دیا کہ کفار نے انگاروں پر لٹا کر مجھ کو گھسیٹا تھا۔

حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں، ایک دن کفار نے ان کو دھوپ میں لٹا دیا تھا، اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا تو فرمایا ''صبر کرو صبر، تمہارا ٹھکانہ جنت میں ہے، لیکن ابوجہل کو اس پر بھی تسکین نہ ہوئی اور اس نے برچھی مار کر انہیں شہید کر دیا اور اسلام میں سب سے پہلے شرف شہادت اس نیک بخت مومنہ صادقہ کو ملا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن جب اسلام لائیں اور حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو اس قدر مارا کہ تمام بدن لہولہان ہو گیا لیکن انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو کچھ کرنا ہو کر و میں تو اسلام لا چکی۔ (اسوہ صحابہؓ)

قرآن حکیم انہیں ''السابقُوْن'' کے نام سے یاد کرتا ہے اور ان کے ایمان کو مثالی قرار دیتا ہے، اور انہی کے لیے دنیا و آخرت کی فوز و فلاح ہے: والسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْن، اُولٰئِکَ المُقَرَّبُوْن (الواقعہ ۵۶: ۱۰، ۱۱) ''اور (ایمان) میں سبقت کرنے والے تو بہر حال سبقت کرنے والے ہیں، یہی لوگ مقرب ہیں''۔

انہوں نے مال و علائق کی ہر قربانی اس جوش و مسرت کے ساتھ کی، گویا دنیا جہاں کی خوشیاں اور راحتیں ان کے لیے فراہم ہو گئی ہیں اور جان کی قربانیوں کا وقت آیا، تو اس طرح خوش خوش گردنیں کٹوا دیں گویا زندگی کی سب سے بڑی خوشی زندگی میں نہیں بلکہ موت میں تھی..... بدر اور احد کے شہیدوں کے حالات پڑھو، ایمان لانے کے بعد جو کچھ بھی ان کے حصے میں آیا وہ بجز رات دن کی کاوشوں اور مصیبتوں کے اور کیا تھا؟ اور پھر قبل اس کے کہ اسلام کے فتح و اقبال کی کامرانیوں میں شریک ہونے کا موقع ملتا دشمنوں کی تیغ و سناں سے چُور میدان جنگ میں دم توڑ رہے تھے لیکن پھر بھی غور کرو ان کے دل کی شادمانیوں کا کیا حال تھا؟ اس اطمینان و سکون کے ساتھ عیش و نشاط کے بستروں پر کسی نے جان نہ دی ہو گی۔ جس طرح انہوں نے میدان جنگ کی ریتلی زمین پر لوٹ لوٹ کر دی، جنگ احد میں سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے دیکھا، زخمیوں میں پڑے سانس توڑ رہے ہیں، پوچھا کوئی وصیت کرنی ہو تو کر دو، کہا ''اللہ کے رسول کو میرا اسلام پہنچا دینا اور قوم سے کہنا، ان کی راہ میں جانیں نثار کرتے رہیں''۔ عمارہ بن زیاد زخموں سے چُور جانکنی کی حالت میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرہانے پہنچ گئے، فرمایا کوئی آرزو ہو تو کہہ دو، عمارہ نے اپنا زخمی جسم گھسیٹ کر اور زیادہ قریب کر دیا اور اپنا سر آپ کے قدموں پر رکھ دیا۔ اگر کوئی آرزو ہو سکتی ہے تو صرف یہی ہے۔ عورتوں تک کا یہ حال تھا کہ بیک وقت انہیں ان کے شوہر، بھائی اور باپ کے شہید ہو جانے کی خبر پہنچائی جاتی تھی اور وہ کہتی تھیں، یہ تو ہوا، مگر بتلاؤ اللہ کے رسول کا کیا حال ہے۔ پھر آپ کا جمالِ جہاں آرا نظر آتا تو

بے اختیار خوش ہو کر پکار اٹھتیں کُلُّ مصیبةٍ بَعْدَک جَلَلٌ تو اگر سلامت ہے تو پھر دنیا کی ساری مصیبتیں ہمارے لیے شہد و شکر کا گھونٹ ہو گئیں۔ (ترجمان القرآن)

یہ تھے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے ایمانی جذبات و احساسات اور منافقین کو توجہ دلائی گئی کہ دنیا و آخرت میں کامیابی کے لیے صرف اور صرف صحابہؓ کی طرح ایمان لانا لازمی اور ضروری ہے مگر ان کی شکست ہمتی اور بزدلی بھلا خالص مسلمانوں کے عزم و عزیمت تک کہاں پہنچ سکتی تھی کہنے لگے:

﴿اَنُؤْمِنُ كَمَا اٰمَنَ السُّفَهَآءُ، اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ﴾

''کیا ہم بھی اس طرح ایمان لائیں جس طرح یہ بے وقوف ایمان لائے ہیں'' یاد رکھو وہی بے وقوف ہیں مگر انہیں (اپنی جہالت و حماقت) کا علم نہیں۔''

أَ نُؤْمِنُ (کیا ہم ایمان لائیں) أ کلمہ استفہام، نُؤْمِنُ مضارع جمع متکلم السفهاء، سَفِيْهٌ کی جمع، وہ کم عقل جسے اپنے نفع و نقصان کی تمیز نہ ہو (نعوذ باللہ) منافقین مومنوں کو کم عقل اور بے وقوف اس لیے بنائے جا رہے ہیں کہ وہ اپنے جان و مال بے دریغ راہ حق میں لٹائے جا رہے ہیں، قرآن حکیم نے جواب میں انہیں احمق اور بے وقوف قرار دیا ہے کہ جنہیں نہ تو ایمان کی حقیقت معلوم ہے اور نہ ہی دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی دائمی اور ابدی زندگی کا ہی شعور ہے۔

آیہ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) ایمان سب سے بڑی حقیقت، سب سے قیمتی متاع، دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لیے سب سے بڑا سرمایہ اور سب سے بڑی دولت ہے جس کے مقابلے میں دنیا اور اس کا تمام ساز و سامان ہیچ ہے۔

۲) ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لائے ''الناس'' یہ خاص لوگ ہیں اس سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم ہیں۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں: ''اس میں لفظ 'الناس' سے مراد باتفاق مفسرین صحابہ کرامؓ ہیں، کیونکہ وہی حضرات ہیں جو نزول قرآن کے وقت ایمان لائے تھے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہی ایمان معتبر ہے جو صحابہؓ کی طرح ہو جس کیفیت کے ساتھ ان کا ایمان ہے اسی طرح کا ایمان دوسروں کا ہو گا تو ایمان کہا جائے گا ورنہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کا ایمان ایک کسوٹی ہے جس پر باقی

ساری امت کے ایمان کو پرکھا جائے گا، جو اس کسوٹی پر صحیح نہ ہو اس کو شرعاً ایمان اور ایسا کرنے والے کو مومن نہ کہا جائے گا، اس کے خلاف کوئی عقیدہ اور عمل خواہ ظاہر میں کتنا ہی اچھا نظر آئے اور کتنی ہی نیک نیتی سے کیا جائے اللہ کے نزدیک ایمان معتبر نہیں، ان لوگوں نے صحابہ کرامؓ کو سفہاء یعنی بیوقوف کہا اور یہی ہر زمانے کے گمراہوں کا طریقہ رہا ہے جو ان کو صحیح راہ بتلائے اس کو بیوقوف جاہل قرار دیتے ہیں، مگر قرآن کریم نے بتلا دیا کہ درحقیقت وہ خود ہی بیوقوف ہیں کہ ایسی کھلی نشانیوں پر ایمان نہیں رکھتے۔'' (معارف القرآن، جلد اول)

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا، وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (۱۴) اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۵)	''جب وہ (منافقین) اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب اپنے شیطانوں (ہم خیال رؤسا) میں تنہا ہوتے ہیں تو انہیں کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہم (مومنوں) سے مذاق کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود انہی کے ساتھ تمسخر ہو رہا ہے کہ اللہ (کے قانونِ جزا) نے رسی ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے اور وہ سرکشی (کے طوفان) میں بہکے چلے جا رہے ہیں۔''

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا، وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ﴾

اور جب وہ (منافقین) اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں (ہم خیال رؤسا) میں تنہا ہوتے ہیں تو انہیں کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہم

(مومنوں) سے مذاق کرتے تھے۔

واوٗ عاطفہ، اِذَا حرف شرط (جب) لَقُوْا (لَقٰی ، یَلْقِیُ ، لِقاءً) اصل میں لَقَیُوا تھا، عربی زبان میں ثقالت (زبان میں رکاوٹ اور بوجھ) کو دور کیا جاتا ہے، چنانچہ لَقَیُوا میں ''ی'' گرادینے سے لَقُوْا رہ گیا، اللِقا۔ المصادفۃ آمنا سامنا ہونا، الذین اسم موصول (Relative Pronoun) اٰمَنَ یُؤْمِنُ ایمانًا (بابِ افعال) اٰمَنُوا وہ سب ایمان لائے، خَلَوْا (خ ل و) مادہ ہے خَلَا یَخْلُوْ خَلْوَۃً (وہ الگ ہوتے ہیں، وہ تنہا ہوتے ہیں) خَلَا کا صلہ جب اِلی کے ساتھ آتا ہے تو اس کا معنیٰ الگ تھلگ ہونا، تنہا ہونا۔

شیاطینھِمْ ، شیاطین، اس کا مفرد شیطٰن اور اس کا مادہ (Root Word) شطَن ہے جس کا معنی ہر خیر اور سچائی سے بُعد اور دوری کے ہیں۔ اَلشَّیْطَانُ کُلُّ بَعِیْدٍ عَنِ الخَیْرِ ، قَرِیْبٌ مِنَ الشَّرِّ یُفْسِدُ وَلَا یُصْلِحُ مِنْ اِنسَانٍ اَوْ جَانٍ وَالمُرَادُ بِھِم ھُنَا رُؤَسَاؤُھُمْ فِی الشَّرِّ وَالفَسَادِ ''شیطان وہ ہے جو بھلائی سے دور، برائی کے قریب ہو اور جسے فساد سے لگاؤ اور اصلاح سے نفور ہو، خواہ وہ انسان ہو یا جن اور آیت مذکورہ میں شیاطین سے مراد ان کے بڑے بڑے سردار ہیں جو شر اور فساد میں آگے آگے ہیں۔'' (ایسر التفاسیر)

شیاطینھم ''اَصْحَابُھُمْ اُوْلُوا التَّمَرُّدِ وَالعَنَادِ ، وَالشَّیْطَانُ یَکُوْنُ مِنَ الْاِنْسِ وَالجِنِّ'' شیاطین سے مراد منافقین کے سرکش اور مغرور ساتھی ہیں اور شیطٰن انسان بھی ہوسکتا ہے اور جن بھی۔ (تفسیر القاسمی) جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ مَا فَعَلُوْہُ فَذَرْھُمْ وَمَا یَفْتَرُوْنَ (الانعام ۶:۱۱۲) ''اور (اے پیغمبرؐ) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے (جب اس کی دعوت کا ظہور ہوا) انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو دشمن ٹھہرایا جو آپس میں ایک دوسرے کو دکھاوے کی خوشنما باتیں سکھاتے، تاکہ لوگوں کو فریب دیں اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا، تو (یقیناً ایسا کرسکتا تھا کہ) وہ دشمنی نہ کرتے (مگر اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ یہاں روشنی کے ساتھ تاریکی اور حق کے ساتھ باطل بھی اپنی نمود رکھے) پس (ان کی مخالفت سے دل گرفتہ نہ ہو، اور) انہیں ان کی افترا پردازیوں میں چھوڑ دو۔''

(ترجمہ از: ترجمان القرآن)

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اِنّا (اِنّ–نَا) اِنّ – بے شک، نا– ہم، ثقالت کی وجہ سے ایک نون حذف کر دیا گیا، مُستَھزِءُوْن (ھَزْوٌ) اِستَھْزَأَ یَستَھْزِئُ – اِستِھْزَاءً باب استفعال۔ امام بیضاوی لکھتے ہیں: کہ ''اِستِھْزَاءٌ کی اصل ھَزْوٌ ہے جس کے معنی خفت کے ہیں گویا کہ استھزا کی اصل غرض دوسروں کی تحقیر ہے۔ اَیْ اِنَّا مَعَکُمْ عَلٰی عَقیدَتِکُمْ وَ عَمَلِکُمْ اِنَّمَا نَسْتَھْزِءُ بالمُسْلِمِیْنَ وَدِیْنِھِم ''(منافقین کا اپنے سرداروں سے کہنا تھا) ہم عقیدہ اور عملی لحاظ سے تمہارے ساتھ ہیں مسلمانوں اور ان کے دین کے ساتھ تو ہم مذاق کرتے ہیں۔'' (نعوذ باللہ)

﴿اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مذاق کا وبال ان ہی پر پڑ رہا ہے۔ جزاءُ الْاِستِھزاءِ باسْمِهِ کَمَا جَزَاءُ السَّیِّئَةِ سَیِّئَةٌ ۔اِستھزا کی جزا اِستھزا ہے۔ جیسے برائی کی جزا برائی ہے۔

﴿وَیَمُدُّهُمْ﴾ مَدَّ یَمُدُّ مَدّا (کھینچنا۔ ڈھیل دینا) اَلزِّیَادَةُ فی الشَّیءِ مُتَّصِلَةٌ بِهٖ یُقَالُ مَدَّ الْبَحْرُ زَادَ وَارْتَفَعَ مَاءُہٗ کسی چیز کی زیادتی کو کہتے ہیں جیسے مَدَّالبَحْرُ کے معنی سمندر کا پانی زیادہ اور بلند ہوا۔ (تفسیر المنار) یہاں اس سے مراد مہلت دینا یعنی اللہ تعالیٰ انہیں مہلت عطا کرتا ہے اور اپنے غضب اور بدلہ میں دیر کرتا ہے کہ وہ بے حد حلیم اور بردبار ہے۔

﴿طُغْیانِهِمْ﴾ (طغٰی یَطْغِیْ طُغْیَانًا) مُجَاوَزَةُ الحَدِّ فِیْ الْعِصْیَانِ، مَأخُوْذٌ مِّنْ طُغْیَانِ المَاءِ نافرمانی اور سرکشی (اور کفر ونفاق) میں حد سے گزر جانے کو طغیان کہتے ہیں اور یہ پانی کی طغیانی سے ماخوذ ہے (المنار) جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّا لَمَّا طَغَی الْمَاءُ حَمَلْنَاکُمْ فِی الجَارِیَةِ (الحاقۃ ۶۹:۱۱) ''جب پانی کا طوفان حد سے بڑھا تو ہم نے تمہیں کشتی میں سوار کیا''۔

﴿یَعْمَهُوْنَ﴾ (عَمَهَ یَعْمَهُ عَمَهٌ) عَمَهَ کے معنی حیرانی کی وجہ سے کسی امر میں متردد ہونا، اَلْعُمٰی فِی العَیْنِ والعَمَه فی الْقَلْبِ (قرطبی) اَلْعُمٰی آنکھوں کے اندھے پن اور اَلْعَمَهُ دل کے اندھے پن کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی ان کے دل کو کہیں کی بھی راہ نہیں سوجھتی اور وہ ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) شیاطین خود بہکے ہوئے اور دوسروں کو بھی راہ حق سے بھٹکانے والے ہوتے ہیں، یہ جنوں اور انسانوں دونوں گروہوں میں سے ہو سکتے ہیں، ایسے لوگ اہل ایمان کے سامنے ایماندار ہونے کا دعویٰ کرتے

ہیں اور اپنے چیلوں میں جا کر ان سے وفاداری کا دم بھرتے ہیں، قرآن حکیم کی آخری سورۃ الناس میں ان سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی گئی ہے۔

۲) سید مودودیؒ لکھتے ہیں: ''شیطان عربی زبان میں سرکش، متمرد اور شوریدہ سر کو کہتے ہیں، انسان اور جن دونوں کے لیے یہ لفظ مستعمل ہوتا ہے، اگرچہ قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر شیاطین جن کے لیے آیا ہے، لیکن بعض مقامات میں شیطان صفت انسانوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے اور سیاق وسباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں شیطان سے انسان مراد ہیں اور کہاں جن، مندرجہ بالا آیہ مبارکہ میں شیاطین کا لفظ ان بڑے بڑے سرداروں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اس وقت اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔'' (تفہیم القرآن)

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡہُدٰی، فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُہُمۡ وَمَا کَانُوۡا مُہۡتَدِیۡنَ(۱۶)	''یہی (منافقین) وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی، سو ان کی تجارت (سوداگری) نے نفع نہ دیا اور نہ وہ راہ یاب ہوئے۔''

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡہُدٰی﴾

(منافقین) وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی۔

اُولٰٓئِکَ اشارہ بعید یعنی وہ لوگ جن کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے (Those) اَلَّذِیۡنَ (اسم موصول) Relative Pronoun جو لوگ۔ جنہوں، اِشۡتَرَوُا ۔(ش ر ی) مادہ ہے، اِشۡتَرٰی یَشۡتَرِیۡ اِشۡتِرَاءً (باب افتعال) فعل ماضی جمع مذکر غائب، شراء کے معنی ایک چیز کے بدلے میں دوسری چیز حاصل کرنا، اِشۡتَرَوُا، انہوں نے خریدا۔ عربی زبان میں شِراءٌ اور بَیۡعٌ دونوں الفاظ لازم وملزوم ہیں مشتری اسے کہتے ہیں جو قیمت دے کر بدلے میں کوئی چیز لے، جبکہ بائع وہ شخص کہلاتا ہے جو چیز دے کر

قیمت وصول کرے اور یہ اس وقت کیا جاتا ہے جب ایک طرف سے نقدی اور دوسری طرف سے سامان ہو لیکن جب خرید وفروخت جنس کے عوض جنس، (Barter System) ہو تو دونوں یعنی بیچنے والے اور خریدنے والے کو بائع اور مشتری تصور کر سکتے ہیں اور اس عمل کو اردو زبان میں سوداگری اور انگریزی میں (Bargaining) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

عربی زبان میں بیع اور شرا کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں مثلاً شَرَیْتُ بمعنی بِعْتُ (میں نے بیچا) اور اِبْتَعْتُ بمعنی اِشْتَرَیْتُ (میں نے خریدا) آتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے: وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ (یوسف ۱۲:۲۰) ''انہوں نے (یوسف کو) تھوڑی سی قیمت پر بیچ ڈالا۔''

یَشْرُوْنَ الْحَیَاةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ (النساء ۴:۷۴) ''جو لوگ آخرت کو خریدتے ہیں اور اس کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچنا چاہتے ہیں (وہی اجر عظیم کے حقدار ہیں)''۔

پھر شِرَاءٌ اور اِشْتِرَاءٌ کا لفظ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس کے عوض میں دوسری چیز لی جائے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ لَاخَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ (اٰلِ عمران ۳:۷۷) ''جو (لوگ) اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت کے عوض بیچ ڈالیں تو ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں''۔ لَایَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا (اٰلِ عمران ۳:۱۹۹) ''(اللہ سے ڈرنے والے وہ ہیں) جو تھوڑی سی قیمت کے عوض اللہ کی آیات کو نہیں بیچتے ہیں''۔

(مفردات القرآن)

آیت کے الفاظ اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی میں اسی حقیقت کا اظہار ہے کہ (منافقین) وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت اور ایمان ایسی قیمتی اور بے بدل جنس دے کر گمراہی اور کفر ایسی بے کار اور فضول جنس لے لی ہے ایسی عقل پر ماتم اور افسوس ہے اور ایسے سودے پر رونا اور آنسو بہانا ہے۔

اَلضَّلَالَةُ (ضَلَّ یَضِلُّ، ضَلَالَةً) بھٹکنا، گمراہ ہونا الضّلٰلَة– گمراہی بِالْهُدٰی (ب– الهدی) بِ کے معنی ساتھ اور یہاں پر بِ کا معنی عوض (Exchange) کے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ تو پہلے ہی سے کفر ونفاق کی حالت میں تھے پھر انہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کیسے خریدی؟ تو اس کا جواب قرآن نے یہ دیا ہے کہ رب کائنات نے ہر شے کو فطری ہدایت سے نوازا ہے: رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ ۲۰:۵۰) ''(موسیٰ علیہ السلام

نے کہا) ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خِلقت عطا کی اور پھر ہدایت سے نوازا''۔

اور انسان کے متعلق فرمایا: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (الدھر ۷۶:۳) ''ہم نے یقیناً اسے راہ دکھلا دی اب خواہ وہ شکر گزار رہے یا ناشکرا بن جائے''۔

اس ہدایت پر انبیاء کرام کی تشریف آوری سونے پر سہاگہ اور ان نفوس قدسیہ کی پاکیزہ سیرتوں نے زندگی کی راہ کو متعین کر دیا جس سے دنیا و آخرت کی کامیابی یقینی ہو گئی، مگر افسوس کہ نااہل اور بد بخت انسانوں نے کج روی کے باعث ہدایت کے بدلے میں گمراہی کو ترجیح دی، یوں سمجھ لیجئے جیسے ہمارے یہاں نماز ایسی قیمتی چیز کو چھوڑ کر لوگ لہو ولعب میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے اس قسم کے لوگوں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حم السجدہ ۴۱:۱۷)

''رہے ثمود تو انہیں ہم نے سیدھی راہ دکھلائی، مگر انہوں نے راہ دیکھنے کے مقابلہ میں اندھا رہنا پسند کیا۔ (آخر کار وہ عذاب الٰہی کا شکار ہو گئے)''

بعینہ آج ہماری حالت ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمام قسم کی روحانی و مادی نعمتوں سے نوازا ہے، مگر ہم نے ہدایت کی جگہ گمراہی کو پسند کر لیا ہے اور شکر کی بجائے ناشکری اپنا لی ہے اور نت نئی پریشانیوں میں گرفتار ہیں۔

﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِيْنَ﴾

سو ان کی سوداگری نے نفع نہ دیا اور نہ وہ راہ یاب ہوئے۔

فَمَا (ف–ما) پس+نہیں، یہاں پر مانافیہ ہے، رَبِحَتْ ماضی واحد مؤنث (رَبِحَ يَرْبَحُ رِبْحًا) تجارت اور کاروبار میں نفع ہونا، زندگی کا جو سودا انہوں نے کیا ہے وہ انتہائی خسارے کا ہے وَمَا كَانُوْا (كَانَ يَكُوْنُ كَوْنًا) ہونا، تھا، اور وہ نہ تھے۔ مُهْتَدِيْنَ (اِهْتَدٰى يَهْتَدِىْ اِهْتِدَاء) باب افتعال اسم فاعل مُهْتَدِىْ اور جمع مُهْتَدِيْنَ ہدایت پانے والے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) ہدایت یعنی ایمان چھوڑ کر ضلالت یعنی کفر خریدنا بہت گھاٹے کا سودا ہے اور اس مختصر قیمتی زندگی کو اس

طرح برباد کر دینا زبردست نقصان اور خسارے کی بات ہے اور اس سے بڑا کوئی خسارہ نہیں ہے۔

۲) تجارت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصل سرمایہ محفوظ رہے اور نفع اس پر بڑھتا رہے، کفار اور منافقین کے لیے نفع اور فائدہ کا تو ذکر ہی کیا، اصل سرمایہ (حیات) ہی برباد کر ڈالا۔ اس عارضی زندگی میں انہوں نے مال و متاع جمع کر لیا، مگر محرومیِ ایمان سے ابدی زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد کر ڈالا۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا، فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ (۱۷) صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (۱۸)	''ان (منافقوں) کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے (تاریکی میں) آگ جلائی جب آگ نے (اپنے) آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایسی تاریکی میں چھوڑ دیا جس میں ان کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے، ایسے لوگ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں کہ یہ (ایمان کی سچائی کی طرف) لوٹنے والے نہیں۔''

مَثَلُهُمْ (مَثَلُ. هُمْ) مَثَلُ. مثال، هُمْ ان کی۔ ایک چیز کا دوسری چیز کی مانند ہونا اور مشابہت رکھنا۔ مثال (Simile) بیان کرنے سے بات آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے مثلاً کہتے ہیں دودھ جیسا سفید یا پانی کی طرح پتلا تو فوراً ذہن میں بات بیٹھ جاتی ہے، قرآن حکیم آسان اور عام فہم کتاب ہے، اس لیے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے، اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ مثالوں سے وضاحت فرمائی ہے تاکہ بات انسانوں کے ذہن نشین ہو جائے، ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (الزمر ۳۹:۲۷)

''ہم نے قرآن میں لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثالیں بیان کر دی ہیں تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں''۔

كَمَثَلِ (ک. مثل) ک۔ مانند (Like- Similar) اِسْتَوْقَدَ ماضی واحد مذکر غائب (و ق د) مادہ (Root Word) ہے (اِسْتَوْقَدَ يَسْتَوْقِدُ، اِسْتِيْقَادٌ) باب استفعال روشن کرنا، آگ جلانا

(Light up- To Kindle)نَارًا۔آگ فَلَمَّا (ف. لَمَّا)پس۔جب، لَمَّا ماضی سے پہلے آئے تو''جب'' کے معنی دیتا ہے اور مضارع سے پہلے آئے تو''ابھی تک نہیں'' کا معنی دیتا ہے۔ اَضَاءَ تْ(ض وء) مادہ ہے ماضی واحد مؤنث غائب اَضَاءَ یُضِیۡءُ اِضَاءَۃً۔روشن کرنا(To light) مَا حَوۡلَهٗ (مَا. حَولَهٗ) جو۔اس کے اردگرد، آس پاس، ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ (ذَهَبَ یَذهَبُ، ذَهَابًا) جانا، ذَهَبَ کے بعد ب آجائے تو معنی لے جانا کے بن جاتے ہیں۔ ذَهَبَ اللّٰهُ. ب لے گیا اللہ تعالیٰ۔ نورهم (نور – هم) روشنی ان کی۔ان کے کفر اور نفاق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نور ایمان کی روشنی ان سے چھین لی اور وہ اسی طرح گمراہی اور جہالت کی تاریکی میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ﴿وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ﴾ تَرَکَ یَتۡرُکُ تَرۡکًا چھوڑ دینا،فِیۡ حروف جارہ میں سے ہے بعد والے حرف کو عام طور پر زیر دیتا ہے(مگر بعض حروف زیر قبول نہیں کرتے،اس کا ذکر آئندہ کبھی ہو جائے گا)ظُلُمٰتٍ، ظُلۡمَةٌ کی جمع ہے۔تاریکی اندھیرا، کفر اور نفاق کی تاریکی،ظلمت نور کی ضد ہے،نور کا معنی ایمان اور اسلام کی روشنی ہے،ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ (البقرہ۲:۲۵۷)

''اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے وہ انہیں (کفر وشرک کے) اندھیروں سے نکال کر (اسلام کی) روشنی کی طرف لے آتا ہے''۔

آپ غور کیجئے کہ اندھیرے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔کفر، نفاق، شرک، ہر قسم کی طاغوتی راہیں، حسد، بغض وغیرہ جب کہ ایمان اور اسلام ایک ہی سیدھا راستہ ہے اس لیے قرآن حکیم میں نور کا لفظ مفرد جبکہ ظُلُمٰتٍ کا لفظ جمع آیا ہے۔

لَا يُبۡصِرُوۡنَ (اَبۡصَرَ یُبۡصِرُ، اِبۡصَارًا) ''وہ نہیں دیکھتے ہیں،انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا ہے''۔

اَیۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ مِنۡ مَسَالِكِ الۡهِدَا یَةِ وَلَا یَرَوۡنَ طَرِیۡقًامِنۡ طُرُقِهَا ''یعنی ہدایت کے راستوں کی بصیرت نہیں رکھتے اور نہ ہی ان راہوں کو دیکھ ہی سکتے ہیں''۔(تفسیر المنار)

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ جب ایک اللہ کے بندے نے روشنی پھیلائی اور حق کو باطل سے، صحیح کو غلط سے، راہ راست کو گمراہیوں سے چھانٹ کر بالکل نمایاں کر دیا تو جو لوگ دیدہ بینا رکھتے تھے، ان پر تو ساری حقیقتیں روشن ہو گئیں، مگر یہ منافق جو نفس پرستی میں اندھے ہو رہے تھے ان کو اس روشنی میں کچھ نظر نہ آیا''اللہ نے نور

بصارت سلب کرلیا'' کے الفاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کے تاریکی میں بھٹکنے کی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے، اللہ نور بصارت اسی کا سلب کرتا ہے جو خود حق کا طالب نہیں ہوتا، خود ہدایت کے بجائے گمراہی کو اپنے لیے پسند کرتا ہے، خود صداقت کا روشن چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا، جب انہوں نے نور حق سے منہ پھیر کر ظلمتِ باطل ہی میں بھٹکنا چاہا تو اللہ نے انہیں اسی کی توفیق عطا فرمادی۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾

ایسے لوگ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں کہ یہ (ایمان کی سچائی کی طرف) لوٹنے والے نہیں۔

صُمٌّ، بہرے، قوت سماعت سے محروم اَصَمّ کی جمع ہے، بُكْمٌ گونگے ہیں قوت گویائی سے محروم اَبْكَمُ کی جمع ہے، عُمْيٌ اندھے ہیں قوت بصارت سے محروم اَعْمٰی کی جمع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کان ہیں مگر حق بات کو نہیں سنتے ہیں زبانیں ہیں مگر کلمہ حق ادا کرنے سے گنگ ہیں اور ظاہری بصارت ہے مگر بصیرت حق سے محروم ہیں فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ رَجَعَ يَرْجِعُ لوٹنا سو وہ ایمان کی طرف لوٹنے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ انہوں نے دعوت حق کو دل سے یکسر مسترد کر دیا ہے۔

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) حق بات کی روشنی انہیں ملتی ہے جو عقل وشعور سے کام لیتے ہیں، بصارت رکھتے ہوئے نور بصیرت کو بھی استعمال میں لاتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے والوں میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، علی مرتضی رضی اللہ عنہ بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا اور زید بن حارث رضی اللہ عنہ کو یہ روشنی فوری مل گئی اور پھر رفتہ رفتہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے اس صداقت کا اثر اقبول کیا اور ایمان سے بہرہ ور ہوئے، مگر آپ ﷺ کے قریبی اور حقیقی چچا ابولہب اور ابوجہل اس روشنی سے محروم رہے ان کے بارے میں قرآن اعلان کرتا ہے کہ یہ بہرے، گوندے اور اندھے ہیں یا اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا، وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا، اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ، بَلْ هُمْ اَضَلُّ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (الاعراف ۷:۱۷۹)

''ان کے دل تو ہیں، مگر ان سے (حق بات کو) سمجھتے نہیں اور بصیرت ہے، مگر بصیرت سے محرو ہیں اور

کان ہیں مگر وہ ان سے (حق بات کو) سنتے نہیں ہیں، ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں اور یہی لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

۲) قرآن حکیم نے حقیقی اندھا پن، دل کے اندھا پن کو قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: **فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ** (الحج ۲۲:۴۶) ''آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ (حقیقت میں) اندھے تو وہ دل ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں (جو سوجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے)۔''

۳) اسلام یا نور، صراط مستقیم ہے اور خط مستقیم اسے کہتے ہیں جو دو نقاط کو آپس میں ملا دے اور وہ ایک ہی ہوتا ہے جبکہ اس کے علاوہ خطوط منحنی کہلاتے ہیں، قرآن حکیم میں نور کا لفظ مفرد استعمال ہوا ہے یعنی صراط مستقیم ایک ہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین اسلام ہے، جبکہ لفظِ ظلمات (اندھیرے) جمع بھی استعمال ہوا یعنی کفر کے راستے بہت سے ہیں۔

۴) اللہ تعالیٰ کا قانون ہرگز یہ نہیں ہے کہ کسی کو زبردستی ہدایت دے بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ جدھر کوئی چلتا ہے اللہ تعالیٰ ادھر ہی اسے چلنے میں مدد کیا کرتا ہے، کفار اور منافقین نے راہ حق کو اپنے اوپر بند کر لیا اور کسی طرح اس روشنی میں آنے کے لیے تیار نہ ہوئے تو ان کے کانوں اور دلوں پر مہر لگا دی گئی اور ان کی آنکھیں پردے میں گم ہو گئیں کہ حق بات کو دیکھ نہیں پاتے۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ، يَّجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (۱۹)	''(یا پھر ان منافقوں کی مثال ایسی ہے) جیسے آسمان سے موسلا دھار بارش نازل ہو جس میں اندھیرے، بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کوند ہے (جو آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ہے) یہ موت کے اندیشہ سے کڑک کے سبب اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دیے لیتے ہیں اور اللہ کفار کو گھیرے ہوئے ہے (وہ اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے)۔''

اَوْ۔حرف عطف میں سے ہے اس کا معنیٰ ''یا'' (or) کَصَیِّبٍ (کَ۔صَیِّبٍ) ک، مانند، مثل (As, Like) جیسا کہ اَلْمُؤْمِنُ فِیْ الْمَسْجِدِ کَسَمَکٍ فِیْ الْمَآءِ ''مومن مسجد میں ایسا ہے جیسے مچھلی پانی میں'' ک زبر والا اپنے بعد والے اسم کو زیر دیتا ہے۔

صَیِّبٍ موسلا دھار بارش (Rain Storm) صَابَ یَصُوْبُ ، صَوْبًا وَ مَصَابًا بارش ہونا۔ اَلصَّیِّبُ۔ اَلْمَطَرُ یَصُوْبُ وَ یَنْزِلُ ''بارش نازل ہوتی ہے''۔(المراغی)

اَلسَّمَاءُ ،(آسمان) سماء کا لفظ عام طور تو اس سقف نیلگوں کے لیے بولا جاتا ہے جس کو ہم آسمان کہتے ہیں، اس کے علاوہ یہ ابر (بادل) کے معنی میں بھی آیا ہے اور اس فضائے بسیط وعریض کے لیے بھی جو ہمارے سروں پر ہے۔

بارش اگرچہ آسمان ہی سے ہوتی ہے، اس وجہ سے اس کے ساتھ لفظ سماء کا اضافہ بظاہر کچھ غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے لیکن! اس اضافے سے ایک تو بارش کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اور اس تصویر کی کسی تمثیل میں بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے، دوسرے اس سے قرآن مجید کے آسمانی ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ مراد اس بارش سے قرآن ہی ہے۔(تدبر قرآن)

فِیْهِ (فِیْ—هِ) میں، اس، ضمیر کا مرجع صیب اور سماء دونوں ہو سکتے ہیں۔

ظُلُمٰتٌ، مفرد ظُلْمَةٌ، تاریکی، اندھیرا اَلرَّعْدُ، هُوَ الصَّوْتُ الَّذِیْ یُسْمَعُ فِیْ السَّحَابِ اَحْیَانًا عِنْدَ تَجَمُّعِهٖ وہ آواز جو کبھی کبھار بادلوں کے ٹکرانے سے سنی جاتی ہے۔(المراغی)

اَلْبَرْقُ، هُوَ الضَّوْءُ الَّذِیْ یَلْمَعُ فِی السَّحَابِ (المراغی) وہ روشنی جو بادلوں میں سے پیدا ہوتی ہے۔

یَجْعَلُوْنَ (ج ع ل) جَعَلَ یَجْعَلُ جَعْلًا بنانا، ڈالنا فعل مضارع جمع مذکر غائب، ڈالتے ہیں۔

اَصَابِعٌ (انگلیاں) اس کا مفرد اِصْبَعٌ ہے، آذَانٌ (کان) اس کا مفرد اُذُنٌ ہے۔ صواعِقٌ صَاعِقَةٌ کی جمع ہے اس سے مراد وہ ہولناک آواز ہے جو گھن گرج سے پیدا ہوتی ہے، اس بجلی کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے۔

حذر۔خطرہ، اندیشہ حذر الموت موت کا اندیشہ مُحِیْطٌ (ح و ط) اَحَاطَ، یُحِیْطُ ، اِحَاطَةٌ، گھیرنا، احاطہ کرنا، مُحِیْطٌ، اسم فاعل، گھیرنے والا، احاطہ کرنے والا۔

بِالْكٰفِرِين (بِ– الْكٰفِرِين) کو۔کافروں،اللہ تعالیٰ کافروں کوگھیرنے والا ہے(کافراس کی گرفت اور پکڑ سے بچ کر کہاں جاسکتے ہیں؟)

دین اسلام اور قرآن حکیم کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح بارانِ رحمت سے کھیت سرسبز وشاداب اور ہرے بھرے ہوجاتے ہیں اسی طرح اسلام اور قرآن سے روحوں کو تازگی اور شادابی حاصل ہوتی ہے، بلکہ رب کریم کی طرف سے نعمت اسلام کو تکمیل انعام سے یاد کیا گیا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ۵:۳)''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے بحیثیت دین اسلام کو پسند کیا ہے''۔

قرآن حکیم دنیا کے تمام مال ومتاع سے کہیں قیمتی خزانہ ہے، فرمایا: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (یونس۱۰:۵۸)''(یہ) اللہ کے فضل اور اس کی مہربانی سے (نازل کردہ ہے) لہٰذا انہیں اس پر خوش ہونا چاہیے (کہ قرآن سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے) یہ اس سے کہیں بہتر ہے جو وہ (دولتِ دنیا) جمع کر رہے ہیں''۔

آج کے درس میں بجلی، کڑک وغیرہ نفس کی ناگوار قربانیاں ہیں جنہیں سچے اور کھرے مومن تو کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے ہیں جیسا کہ قبولِ اسلام کے بعد انہیں ہر طرح سے ستایا گیا مگر رضائے الٰہی کی خاطر انہوں نے سب کچھ خوشی خوشی برداشت کیا، ہجرت و جہاد میں حصہ لیا یہاں تک کہ میدانِ جہاد میں جان تک کا نذرانہ پیش کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے یہاں سرخرو ہو گئے مگر منکرین اور منافقین کو جان و مال اتنا پیارا ہے اور دنیا کی محبت اس قدر غالب آ گئی ہے کہ وہ ان مشکلات ومصائب کی تاب نہیں لا سکتے ہیں، وہ بچ کر کہاں جاسکتے ہیں؟ بالآخر انہیں موت کے پنجے میں گرفتار ہونا ہے اور اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش ہونا ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ لکھتے ہیں:''اس آیہ مبارکہ میں ایک دوسری قسم کے منافقوں کی مثال بیان کی گئی ہے، پہلی قسم کے منافق تو وہ تھے جن کے دل میں کفر ہی کفر تھا، مگر مفاد پرستی کی خاطر مسلمانوں کے سامنے اسلام کا دعویٰ کرتے تھے اور یہ دوسری قسم ان منافقوں کی ہے جو شک اور تذبذب کا شکار ہیں

اس مثال میں زوردار مینہ سے مراد اسلامی احکامات کا نزول ہے جو پے در پے ہو رہے تھے او جو جملہ انسانیت کے لیے رحمت ہی رحمت تھے اور اس میں تاریکیوں اور کڑک سے مراد وہ مصائب ومشکلات ہیں جو مسلمانوں کو اقامت دین کے سلسلے میں پیش آ رہی تھیں اور چمک سے مراد وہ کامیابیاں اور کامرانیاں ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہو رہی تھیں۔ اب جب کوئی کڑک کی آواز یا مصیبت مسلمانوں کو درپیش ہوئی تو یہ منافقین اپنی جان بچانے کی خاطر مسلمانوں سے الگ ہو کر حفاظتی اقدامات کرنا شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس صورت میں بھی ان کو ہلاک کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے اور مسلمانوں کی کامیابی اور ان کی مسلمانوں سے علیحدگی ہی ان کی موت کا باعث بن سکتی تھی، پھر جب معاملہ ذرا سہل ہو جاتا ہے اور مصائب چھٹ جاتے ہیں تو یہ لوگ اسلام کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں اور جب کوئی سخت احکام نازل ہوتے ہیں تو وہیں ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو پہلی قسم کے منافقوں کی طرح ان کی بصارت اور سماعت کو بھی سلب کر سکتا تھا، مگر اللہ کا قانون ہی یہ ہے کہ جو شخص جس حد تک دیکھنا اور سننا چاہتا ہے اسے اس حد تک سننے اور دیکھنے دیا جائے، اگرچہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' (تیسیر القرآن، جلد اول)

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ، كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ، وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (۲۰)	''(منافقین اس کیفیت میں ہیں) کہ عنقریب بجلی ان کی بصارت اچک لے جب ان کے لیے روشنی ہوتی ہے تو اس میں وہ چار قدم چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو (ٹھٹک کر) رک جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت کو سلب کر لیتا، اللہ تعالیٰ یقیناً ہر بات پر قادر ہے۔''

یَکَادُ (ک و د) کَادَ یَکَادُ کُوْدًا ،قریب ہونا،ممکن ہونا(to be on the point of) افعالِ مقاربہ میں سے ہے،کسی فعل کے قریب الوقوع ہونے کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے۔ کَادَ یَفْعَلُ، قریب تھا کہ وہ اس کام کو کرگزرتا مگر اس نے کیا نہیں۔(مفردات القرآن)

اَلْبَرْقُ۔بادل کی گرج چمک۔اس سے فعل بَرَقَ وابْرَقَ دونوں آتے ہیں اور بَرَقَ ہر چمک دار چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے: فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (القیٰمة ۷۵:۷)

''(قیامت کو)جب(خوف سے)آنکھیں چندھیا جائیں گی''۔(مفردات القرآن)

احوال قیامت کا ذکر ہے کہ یہ وہ سماں ہوگا جب انسان پر مکمل تحیّر طاری ہوگا اور یہ نہیں جان سکے گا کہ یہ آفتاب و ماہتاب آج کیوں اپنی روشنی کھو بیٹھے ہیں۔اس وقت آنکھیں حیرانی و پریشانی سے چندھیا جائیں گی۔

یَخْطَفُ (خ ط ف) خَطِفَ یَخْطَفُ، خَطْفاً اَلْخَطْفُ. اَلْاَخْذُ بِسُرْعَةٍ۔اچک لینا(تفسیر المنار)اَبْصَارَھُمْ(اَبْصَارَ۔ ھُمْ) بَصَرٌ۔آنکھ اور اس کی جمع اَبْصَار۔آنکھیں ھُمْ۔ان کی۔

اس میں بیان ہو رہا ہے آثارِ غلبہ اسلام کی قوت وشدت کا،کہ یہ منافقین کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے کے لیے اور انہیں مرعوب کرنے کے لیے کافی ہے(تفسیر ماجدی)۔وَھٰذَا تَمْثِیْلٌ لِشِدَّةِ الْاَمْرِ عَلَی الْمُنَافِقِیْنَ (کشاف)۔یہ منافقین پر(شوکت اسلام)کے بھاری ہونے کی مثال ہے،وہ حیران و پریشان کھڑے ہیں۔

کُلَّمَا،(کُلٌّ مَا) کُلٌّ۔سب،تمام کے تمام،مَا، جو، جب کُلَّمَا۔جب کبھی(Whenever)۔ کلمہ شرط ہے۔اَضَاءَ بمعنی اَضَآءَ ثُ، روشنی ہونا۔روشن کرنا مَشَوْا (م ش ی) مَشٰی یَمْشِیْ ، مَشْیًا فعل ماضی جمع مذکر غائب۔چلنا۔فِیْهِ. (فِیْ.ہٖ) میں۔اس۔یعنی اس روشنی میں کُلَّمَا اَصَابَ الْمُنَافِقِیْنَ مِنْ عِزِّ الْاِسْلَامِ اِطْمَأَنُّوْا اِلَیْهِ (تفسیر ابن کثیر) یعنی جب ان منافقین کے سامنے اسلام کی کامیابی اور کامرانی ظاہر ہوتی تو اس کی طرف راغب ہونے لگتے ہیں (کہ مال غنیمت اور مسلمانوں سے دوسرے فوائد حاصل کریں)۔

وَاِذَآ. وَ۔اور۔ اِذَاکلمہ شرط(جب)(When)اَظْلَمَ (ظ ل م)اَظْلَمَ یُظْلِمُ، اِظْلَاماً. باب

افعال تاریک ہونا، اندھیرا چھا جانا، قَامُوْا (ق و م) قَامَ یَقُوْمُ قِیَامًا– قَامُوْا فعل ماضی جمع مذکر غائب: وہ سب رک جاتے ہیں۔ ٹھہر جاتے ہیں۔

وَاِذَا اَصَابَ الْاِسْلَامَ نِکْبَۃً قَامُوْا لِیَرْجِعُوْا (ابن کثیر) ''جب ان منافقین کو اسلام (یعنی مسلمانوں سے متعلق) کسی تکلیف اور پریشانی کا علم ہوتا ہے (جہاد وغیرہ میں) تو پھر اس کی طرف بڑھنے سے رک جاتے ہیں''۔ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ. لَوْ کلمہ شرط، شَاءَ یَشَاءُ مَشِیْئَۃً فعل ماضی واحد مذکر غائب (چاہنا، ارادہ کرنا) لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ. لَ زبر کے ساتھ آئے تو تاکیدی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ذَهَبَ. جانا اور اس کے بعد ب آجائے تو لے جانا اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کی سماعت و بصارت کو لے جاتا (سلب کر لیتا) اس لیے کہ صرف اور صرف وہی ہر بات کی قدرت رکھتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ اسم قدیر کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور کے لیے قطعی جائز نہیں ہے، سید مودودیؒ لکھتے ہیں: ''پہلی مثال (آیت ۸) میں ان منافقین کی تھی جو دل میں قطعی منکر تھے اور کسی غرض و مصلحت سے مسلمان بن گئے تھے، اور یہ دوسری مثال ان کی ہے جو شک اور تذبذب اور ضعفِ ایمان میں مبتلا تھے، کچھ حق کے قائل بھی تھے، مگر ایسی حق پرستی کے قائل نہ تھے کہ اس کی خاطر تکلیفوں اور مصیبتوں کو بھی برداشت کر جائیں۔ اس مثال میں بارش سے مراد اسلام ہے جو انسانیت کے لیے رحمت بن کر آیا۔ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک سے مراد مشکلات و مصائب کا وہ ہجوم اور وہ سخت مجاہدہ ہے جو تحریک اسلامی کے مقابلہ میں اہل جاہلیت کی شدید مزاحمت کے سبب سے پیش آ رہا تھا۔ مثال کے آخری حصہ میں ان منافقین کی اس کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب معاملہ ذرا سہل ہوتا ہے تو چل پڑتے ہیں (یعنی جہاد کا موقع نہیں ہوتا) اور جب مشکلات کے دَل بادل چھانے لگتے ہیں یا ایسے احکام دیئے جاتے ہیں جن سے ان کی خواہشات نفس اور ان کے تعصّبات جاہلیت پر ضرب پڑتی ہے تو ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد اول)

آیہ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) منافقین ہمیشہ موقع پرست ہوتے ہیں جب اسلام لانے میں کچھ مطلب براری ہوتی ہے۔ مثلاً مال غنیمت اور مسلمانوں سے مراعات کا حصول وغیرہ تو پھر انہیں بھی اپنے اسلام کا اعلان کرنے میں دریغ

نہیں ہوتا اور جب آزمائش وابتلا کا وقت ہوتو صاف انکار کر دیتے ہیں، انہیں تنبیہہ کی جارہی ہے کہ ایسا نہ کرو، ورنہ اللہ کا عذاب آجائے گا اور پھر تم میں یہ استعداد بھی باقی نہ رہے گی۔

۲) نفاق کی یہ شکل آج بعض مسلمان حکمرانوں میں نظر آتی ہے، قوم سے مفاد حاصل کرنے کے لیے انہیں ہر خدمت اور عایت کا یقین دلاتے ہیں اور جب وہ برسر اقتدار آجاتے ہیں تو ان کی وفاداریاں یہود و ہنود کے ساتھ ہوتی ہیں، انہیں جاننا چاہیے کہ یہ نفاق بالآخران کی تباہی و بربادی کا باعث ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲۱)	لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان سب کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ۔

يٰٓ۔ حرف ندا، کسی کو بلانے اور پکارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اے زید! (یا زید) (O,Zeid!) اور جس کو پکارا جائے اسے منادٰی کہتے ہیں مذکورہ جملے میں زید منادٰی ہے۔

اَيُّهَا۔ ندا میں مزید زور (Stress) اور تنبیہ (Warning) پیدا کرنے کے لیے لاتے ہیں۔

اَلنَّاسُ۔ لوگ (People) انسان کی جمع ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ (لوگو! توجہ اور غور سے سنو) اس میں يٰٓاَيُّهَا۔ حرف ندا ہے اور اَلنَّاسُ منادیٰ ہے، اُعْبُدُوْا (عَبَدَ– يَعْبُدُ– عِبَادَةً) اور اس سے فعل امر اُعْبُدْ اور جمع کا صیغہ اُعْبُدُوْا، تم سب عبادت کرو عجز و انکساری کا اظہار کرو، العبادة کا لفظ انتہائی درجہ کی ذلت اور انکساری ظاہر کرنے پر بولا جاتا ہے اور یہ ذلت و انکساری صرف رب کائنات کے لیے ہوسکتی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا: اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (الاسراء ۱۷:۲۳) ''کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو'' عبادت اور اطاعت میں فرق ہے، اطاعت دوسروں کی بھی ہوسکتی ہے مگر عبادت اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں ہے۔

رَبَّكُمْ (رَبَّ– كُمْ) رب، پالنہار، پروردگار، تمام کائنات اور اس کی ہر چیز پیدا کرنے اور بنانے والا، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے۔ الرب۔ کے اصل معنی تربیت کرنا یعنی کسی چیز کو تدریجاً نشوونما دے کر حد کمال تک پہنچانے کے ہیں۔

اَلرَّبُّ فِیُ الْاَصْلِ اَلتَّرْبِیَۃُ وَھُوَ اِنْشَآءُ الشَّیءِ حَالًا فَحَالًا اِلٰی حَدِّ التَّمَامِ 'رب' کے اصلی معنی تربیت کرنا کے ہیں یعنی کسی چیز کو تدریجاً نشو ونما دے کر حد کمال تک پہنچانا۔ (مفردات القرآن)

رَبُّنَا الَّذِیُ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی (طٰہٰ ۲۰:۵۰) ''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر (زندگی گزارنے) کے لیے اس کی رہبری اور رہنمائی بھی فرمائی (مچھلی کو تیرنا سکھلایا تو بچے کو دودھ پینا بتلا دیا وغیرہ)''

''الرّب'' وہ ہے جس نے تمام جہانوں کو بنایا اور سجایا ہے (انسانوں کا جہان ہے تو مچھلیاں بھی اپنا جہان رکھتی ہیں، غرضیکہ ہر چیز اپنا جہان آباد کئے ہوئے ہے) اس لیے حمد وستائش کے لائق بھی صرف وہی ذات ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الفاتحہ ۱:۲) ''ہر حمد وثنا اللہ ہی کے لیے ہے جو سب جہانوں کا رب ہے''۔

الرب وہ ہے جس سے زمین وآسمان کی کوئی ذرہ برابر چیز بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّۃٍ فِیُ الْاَرْضِ وَلَا فِیُ السَّمَاءِ (یونس ۱۰:۶۱) ''زمین وآسمان میں کوئی ذرہ برابر چیز بھی ایسی نہیں ہے جو آپ کے رب سے چھپی ہو''۔

''الرّب'' وہ ہے جو زمین وآسمان، اور ان کے درمیان جو کچھ ہے سب کا مالک ہے۔ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا، اِنْ کُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ (الشعرآء ۲۶:۲۴) ''موسیٰؑ نے کہا ''رب تو وہ ہے جو آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان سب کا مالک ہے اگر تمہیں کچھ یقین آجائے''۔

غرضیکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ربوبیت کی کرشمہ سازیاں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔ یہ نیلگوں آسمان جو بغیر ستونوں کے ہمارے سروں پر کھڑا ہے اور اس پر جگمگاتے ہوئے ستارے، یہ سر بفلک پہاڑ اور ان کی سرسبز چوٹیاں، یہ بہتے ہوئے دریا اور ندی نالے، یہ آفتاب وماہتاب کا طلوع وغروب، یہ انسان اور ان کی مختلف شکلیں اور آوازیں پھر جسم کے ہر عضو کی قدر وقیمت یہاں تک کہ خوراک جسے وہ صبح وشام کھاتا ہے اس خالق ومالک کی ربوبیت کے نشان ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

انسان کتنا ہی غافل ہو جائے اور کتنا ہی اعراض کرے لیکن دلائل حقیقت کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے اوجھل نہیں ہو سکتیں، ایک انسان تمام دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لے، لیکن بہر حال اپنی شب وروز کی غذا کی طرف سے تو آنکھیں بند نہیں کر سکتا! جو غذا اس کے سامنے دھری

ہے، اسی پر نظر ڈالے، یہ کیا ہے؟ گیہوں کا دانہ ہے، اچھا گیہوں کا دانہ اپنی ہتھیلی پر رکھ لو اور اس کی پیدائش سے لیکر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام احوال وظروف پر غور کرو، کیا یہ حقیر سا ایک دانہ بھی وجود میں آ سکتا تھا۔ اگر تمام کارخانۂ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ رہتا؟ اور اگر دنیا میں ایک ایسا نظامِ ربوبیت موجود ہے، تو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ربوبیت رکھنے والی ہستی موجود نہ ہو؟

(ترجمان القرآن، جلد اول)

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا یہ نور آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی خوئے انقلاب

(بال جبریل)

رَبَّكُمُ (تمہارا رب) لفظ رب مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب (زبر) میں ہے۔ خَلَقَكُمُ (خَلَقَ يَخْلُقُ، خَلْقًا) اِخْتِرَاعُ الشَّیْءِ عَلٰی غَیْرِ مِثَالٍ سَبَقَ (تفسیر معالم) ''کسی سابقہ مثال کے بغیر ایجاد واختراع کو خلق کہتے ہیں۔''

رب کائنات جس کسی امر کا حکم کرتا ہے تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

اِنَّمَا اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (یٰس ۳۶:۸۲)

حقیقت یہی ہے کہ ''جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے فرماتا ہے کہ 'ہو جا' تو ہو جاتی ہے۔''

وَالَّذِیْنَ (اور جو لوگ) مِنْ۔ سے قَبْلِكُمْ (قَبْلِ-كُمْ) پہلے، تم لَعَلَّكُمْ (لَعَلَّ-كُمْ) تا کہ۔ تم سب، لَعَلَّ اظہار شک نیز آرزو کے لیے آتا ہے لیکن یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ادا ہو تو شک کی بجائے یقین کے معنی میں آتا ہے، امام راغب کہتے ہیں کہ لَعَلَّ کئی جگہ کَیْ (تا کہ) کے معنی دیتا ہے تَتَّقُوْنَ (اِتَّقٰی یَتَّقِیْ، اِتِّقَاءً باب افتعال ہے۔ ہر وقت اور ہر جگہ، ظاہر اور باطن میں اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی اطاعت پر عمل پیرا ہونے کو تقویٰ کہتے ہیں اور تقویٰ ہی عبادت کی روح ہے اور اس کے ثمرات ابدی کامیابی ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) عبادت، اللہ تعالیٰ کے حضور عجز اور درماندگی کا نام ہے اور اس میں زندگی کا ہر ہر لمحہ شامل ہے، وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، وہ معاشی میدان ہو یا سیاسی، گویا کہ اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور پوری طرح غلامی کا نام عبادت ہے۔

۲) عبادت اور اطاعت میں یہ فرق ہے کہ اطاعت دوسروں کی بھی ہوسکتی ہے مگر عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوگی اور جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو تو وہاں کسی کی اطاعت بھی نہ ہوگی۔

۳) اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام میں 'الرّب' بھی ہے، وہ ذات جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کی پرورش کا سرو سامان کیا اور ہمہ وقت اس کی نگرانی فرماتا اور ضروریات پوری کرتا ہے۔

۴) عبادت کا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ انسان دنیا میں غلط بیانی اور غلط کاری سے بچ جاتا ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کی توقع ہوتی ہے۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ، فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۲)	''(اللہ) جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنا دیا اور آسمان سے پانی برسایا، جس سے تمہارے کھانے پینے کو (انواع و اقسام) کے پھل پیدا کیے، لہٰذا کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ اور (اتنی موٹی بات کو تو) تم بھی جانتے اور سمجھتے ہو۔''

اَلَّذِیْ جو، جس نے (Relative Pronoun) جَعَلَ (بنایا) فعل ماضی جَعَلَ یَجْعَلُ. لَکُمُ

(لَ–کُمْ) لیے، تمہارے، اَلْاَرْضَ (The Earth) زمین، فِرَاشًا، فرش، بچھونا (a bed, resting place) اَلْاَرْضُ– یُعَبَّرُ بِھَاعَنْ اَسْفَلِ الشَّیءِ کَمَا یُعَبَّرُ بِالسَّمَاءِ عَنْ اَعْلَاہُ (مفردات القرآن) کسی چیز کے اسفل کو ارض اور اعلیٰ کو سماء کہتے ہیں۔ فِرَاشًا بمعنی مفروش، فرش کے معنی بسط اور پھیلانے کے ہیں یعنی ایسی چیز جس پر انسان قرار پکڑ سکے۔

وَالسَّمَآءَ اور آسمان (کو) بِنَآءً چھت (as a canopy) بِنَاءً بمعنی بنائی ہوئی چیز عمارت کو بھی کہتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''آیت کے اس ٹکڑے کی جان یا اصل روح ''جَعَلَ لَکُمْ'' (تمہارے لیے) ہے، مقصود زمین یا آسمان کی ہیئت بیان کرنا، یا ان کی ارضیاتی یا فلکیاتی ماہیت بیان کرنا کسی درجے میں بھی نہیں، بیان صرف یہ کرنا ہے کہ زمین ہو یا آسمان کوئی بھی از خود نہیں بن گئے ہیں بلکہ جو کچھ اور جیسے بھی کچھ ہیں اللہ کے بنائے ہوئے، اور اسی قادر مطلق کے زیر فرمان ہیں..... دوسری تعلیم ساتھ ہی ساتھ یہ ملی کہ زمین و آسمان انسان کے لیے خلق ہوئے ہیں، انسان زمین و آسمان کے لیے خلق نہیں ہوا ہے، مقصود و مطلوب انسان ہے، زمین و آسمان دونوں باذن الٰہی اسی خلیفۃ اللہ کے خادم ہیں، پھر یہ کیسی شدید حماقت ہے کہ انسان اپنے ان خدائی خادموں کے آگے جھکنے لگے اور الٹا انہیں کو معبود قرار دے کر ان کی پرستش کرنے لگے۔''

(تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرٰشًا﴾ پر سید قطب شہید لکھتے ہیں: اس طرزِ ادا سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ البیس زمین پر انسانی زندگی کو آسان بنا دیا گیا ہے اور اسے اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ وہ انسانوں کے لیے راحت بخش، ان کی جائے پناہ اور بچھونے کی طرح ان کا تحفظ کرنے والا مسکن بن سکے! لوگ اس بچھونے کو، جو اللہ نے گہوارے کے طور پر ان کے لیے تیار کیا ہے، اس لیے بھول جاتے ہیں کیونکہ وہ عرصہ دراز سے اس کے عادی ہیں! وہ مختلف عناصر کے درمیان اس ہم آہنگی کو فراموش کر دیتے ہیں جسے اللہ نے روئے زمین میں رکھ دیا ہے تاکہ انسانوں کے لیے وسائلِ حیات فراہم ہوں! وہ اس راحت و آرام اور سامانِ زندگی کو بھی بھول جاتے ہیں جو اللہ نے زمین میں انہیں عطا فرمایا ہے! حقیقت یہ ہے کہ مختلف عناصر کے درمیان اگر ہم آہنگی نہ ہوتی تو اس سیارہ پر انسانی زندگی اس آسانی اور اس طمانیت کے ساتھ نہ

گزرتی! اگر زندگی کے عناصر میں سے کوئی ایک عنصر بھی مفقود ہو جاتا تو انسان کو وہ ماحول میسر نہ آتا جو اس کی زندگی کا ضامن ہے! اگر ہوا کے عناصر میں سے کوئی ایک عنصر بھی اپنی مقررہ مقدار سے کم ہو جاتا تو لوگوں کے لیے سانس لینا اور جینا دوبھر ہو جاتا!

﴿وَالسَّمَآءَ بِنَآءً﴾ ''اور آسمان کو چھت بنایا'' اس پر سید قطب لکھتے ہیں: اس طرز ادا میں تعمیر کی پختگی اور اس کے نظم و ہم آہنگی کی طرف اشارہ ہے!.....زمین پر انسان کی زندگی اور انسانی زندگی کی سہولتوں سے آسمان کا گہرا اور مضبوط تعلق ہے! آسمان اپنی گرمی، اپنی روشنی اپنے اجرام کی کشش و نظم اور زمین سے اپنی تمام نسبتوں اور روابط کے باعث زمین کو زندگی کے قیام و بقا کے لیے ساز گار بناتا اور اس عمل میں اس کی مدد کرتا ہے، اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ خالق کی قدرت رازق کے فضل و کرم اور معبود برحق کی کرشمہ سازیوں کا تذکرہ اس لیے ہوا کہ بندے بھی اسی منعم حقیقی کا حق بندگی ادا کریں۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ﴾ اور آسمان سے پانی برسایا۔

وَاَنْزَلَ (ن ز ل) اَنْزَلَ یُنْزِلُ اِنْزَالًا (باب افعال) پانی کا برسانا۔ مِنْ (حروف جارہ میں سے ہے) سے، بعد والے اسم کو عام طور پر زیر دیتا ہے، السَّمَاءِ- بِنَاءٌ وَهِيَ مُسَقَّفٌ والْمُرادُ هُنَا بِهِ السَّحَابُ (ابن کثیر) ''السماء سے مراد عمارت (چھت) اور یہاں پر مراد بادل ہیں'' رب کریم کی رحمت سے بادلوں سے پانی برستا ہے تو ہر چیز کو زندگانی نصیب ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَجَعَلْنَامِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (انبیاء ۲۱:۳۰) ''اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے زندگانی بخشی۔''

یہی پانی چشموں، نہروں، دریاؤں اور سمندروں میں رواں دواں ہو جاتا ہے اور انسان اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ کسی بھی سمجھدار انسان کو اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے، گرمی کی شدت میں اس کا ایک ایک قطرہ زندگی عطا کرتا ہے اور بے اختیار خالق حقیقی کی حمد و ثنا زبان پر جاری ہو جاتی ہے۔

﴿فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ﴾

جس سے تمہارے کھانے پینے کو (انواع و اقسام کے) پھل پیدا کیے۔

فَاَخْرَجَ (خ ر ج) ف۔پس اَخْرَجَ یُخْرِجُ اِخْرَاجاً (باب افعال) بِہٖ، ساتھ اس کے۔بِہٖ میں ضمیر کا مرجع ماء (پانی ہے) ثَمَرَاتٌ ، ثَمَرَۃٌ کی جمع ہے، نباتات سے ہر قسم کی پیداوار کو ثمرہ کہتے ہیں۔ رِزْقًا ، رزق، غذا، خوراک (food grain) ، پانی سب کو یکساں ملتا ہے مگر ہر قسم کے پھل اور اجناس کا مزہ اور فائدہ مختلف ہوتا ہے، یہ بھی اس کی قدرت اور کاریگری کے نشان ہیں۔

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

لہٰذا کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ اور (اتنی موٹی بات کو تو) تم بھی جانتے اور سمجھتے ہو۔

فَلَا تَجْعَلُوْا (جَعَلَ یَجْعَلُ) بنانا۔ٹھہرانا۔پس نہ ٹھہراؤ۔ لِلّٰهِ (لِ. اللّٰهِ)لیے ، اللہ، پس اللہ کے لیے نہ ٹھہراؤ، اَنْدَادًا نِدٌّ کی جمع ہے شریک اور ہمسر، وَ، اور- حالانکہ، اَنْتُمْ تم سب تَعْلَمُوْنَ صیغہ جمع مخاطب فعل۔جانتے ہو(کہ اس کا کوئی ہمسر اور شریک نہیں ہے)۔

آیہ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) آنکھ بینا ہو تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نشان انسان اپنے اردگرد دیکھ سکتا ہے، اس زمین کو دیکھیے کہ جس پر وہ بود و باش اختیار کرتا ہے، نہ تو یہ پانی کی طرح نرم ہے کہ جس پر چلنا پھرنا مشکل ہو جائے اور نہ ہی پتھر کی مانند سخت ہے کہ جس پر کھیتی باڑی دشوار ہو جائے، بلکہ ایسی متوازن ہے کہ انسان اس پر نہریں، باغات، مکانات اور پل وغیرہ تعمیر کر لیتا ہے۔

۲) آسمان کو بغیر ستونوں کے چھت کی طرح رب کائنات نے ہمارے سروں پر معلق کر دیا ہے اور اسے آفتاب، ماہتاب اور ستاروں سے ایسا سجا دیا ہے کہ ان کی روشنی سے انسان فیض یاب ہوتا ہے اور کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کرتا۔

۳) اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا، جس سے ہر شے کو زندگانی ملتی ہے، نہ صرف حیوانات، بلکہ نباتات بھی پانی سے ہی پھلتے پھولتے ہیں۔

۴) پانی نہ ہو تو یہ دنیا صحرا بن جائے اور انسانی زندگی کا قیام و بقا ممکن نہ ہو، یہ محض اس پروردگار کا فضل ہے

کہ اس نے انسان کو علم و ہنر سے نوازا کہ وہ کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس میں سے وہ رب کائنات مختلف چیزیں اگاتا ہے جو انسان کھاتا پیتا ہے۔

۵) یہ تمام نعمتیں پانے کے بعد یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا کہ یہ غافل انسان اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کی چوکھٹوں پر سجدہ کرتا پھرے اور غیروں کی بندگی میں مصروف ہو جائے۔

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ، وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (۲۳)	''اور جو کلام ہم نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا ہے اگر تمہیں اس میں کچھ شک ہو، تو تم بھی اس جیسی ایک سورت بنالاؤ اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے سب مددگاروں کو بلالو، اگر تم سچے ہو (تو یہ کام ضرور کر دکھاؤ)۔''

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ جملہ شرط ہے۔ كُنۡتُم (ک و ن) كَانَ يَكُوۡنُ فعل ماضی جمع مذکر حاضر (ہونا) فِىۡ رَيۡبٍ مرکب جاری (شک اور تردد میں ہو) مِمَّا (مِنۡ- مَا) اس میں- جو نَزَّلۡنَا (ن ز ل) نَزَّلَ يُنَزِّلُ تَنۡزِيۡلًا باب تفعیل بتدریج نزول، اہتمام سے اتارنا۔ عَلٰى، پر عَبۡدِنَا۔ ہمارا بندہ۔

قرآن حکیم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبد (بندہ) کہہ کر انسانیت کی معراج پر فائز کر دیا ہے، سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں ''اللہ کے بندے ہونے کی یہ صفت اس مقام پر کئی اہم حقیقتوں کو واضح کرتی ہے، ان میں ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عز و شرف کا اظہار اور اللہ کی طرف آپ کی عبودیت کی نسبت کر کے خالق و مالک سے آپ کے قرب کو واضح کرنا مقصود ہے!..... یہ اس لیے کہ اللہ کی بندگی وہ بلند ترین مقام ہے جس کی طرف کسی انسان کو دعوت دی جاسکتی ہے اور جس کی طرف نسبت کر کے کسی انسان کا ذکر کیا جاسکتا ہے، دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس موقع پر، جبکہ تمام انسانوں کو دعوت دی جارہی ہے کہ وہ صرف اپنے رب

کی بندگی کریں اور تمام انداد اور شرکاء کو، جو انہوں نے بنا رکھے ہیں، ساقط کر دیں (چھوڑ دیں) ٹھیک اسی موقع پر اللہ کی عبودیت کی اہمیت اجاگر کی جارہی ہے! دیکھو! یہ نبی ہیں! ان پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے انتہائی بلند مقام ہے! اس بلند ترین مقام پر فائز ہونے کے باوجود انہیں اللہ کا بندہ کہا جارہا ہے اور ان کی بزرگی وشرف کو اللہ کی عبودیت وبندگی کی نسبت سے بیان کیا جارہا ہے۔

قرآن کا چیلنج سورت کے آغاز ہی سے ہے! سورت کے آغاز سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب انہی حروف سے بنی ہے جو ان کے یہاں مستعمل تھے، اگر انہیں اس کے مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰہ ہونے میں شک ہے تو بسم اللہ! آگے بڑھیں اور اس جیسی ایک سورت بنالائیں اور اللہ کے سوا جو لوگ ان کے حق میں گواہی دے سکیں انہیں بھی بلالیں کیونکہ اللہ نے تو اپنے بندے کے سلسلے میں گواہی دے دی ہے کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے۔

یہ چیلنج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی تھا، آپؐ کے بعد بھی! اور آج کے دن بھی ہے، یہ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی ایک ایسی دلیل ہے جس میں بحث ونزاع کی گنجائش نہیں ہے، قرآن انسانی کلام سے واضح اور قطعی طور پر ممتاز ہے اور وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

فَأْتُوْا (اَتٰی یَاْتِیْ اِتْیَانٌ) پس لے آؤ۔ **بِسُوْرَةٍ** (بِ–سُوْرَةٍ) مرکب جاری، بِ متعدی بنانے کے لیے ہے، سورۃ کے معنی بلند مقام کے ہیں اور سورۃ شہر کی فصیل کو بھی کہتے ہیں، قرآن حکیم کی سورتوں کو مقام بلند اور مضامین کا احاطہ کرنے کی بنا پر سورت کہا جاتا ہے۔

مِّنْ مِّثْلِهٖ یعنی مِثْلَ هٰذا الْقُرانَ حَقًّا وَصِدْقًا لَا بَاطِلَ فِیْهِ وَلَا کَذِبَ (ابن جریر)

''جو اس قرآن کی طرح حق وصداقت پر مبنی ہو اور اس میں کسی قسم کے باطل اور کذب کا شائبہ نہ ہو''۔

وَادْعُوْا شُهَدَآءَ کُمْ (وَ– اُدْعُوْا) اور، بلاؤ (د ع و) دعا. یَدْعُوْا. دُعَاءً وَ دَعْوَةً، پکارنا۔ دعوت دینا، مدد حاصل کرنا (To Call) شُهَدَاء جمع اور مفرد شهید (گواہ اور معاون)

مَعْنَاهُ اَعْوَانَکُمْ وَ نُصَرَاءَ کُمْ، اَیْ اُدْعُوْا کُلَّ مَنْ تَعْتَمِدُوْنَ عَلَیْهِ یَشْهَدُ لَکُمْ (المنار) اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنے اعوان وانصار کو دعوت دو اور ہر اس کو جس پر تمہیں اعتماد ہو کہ وہ اس امر میں تمہاری مدد کرسکتا ہے (بلالو)۔

﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ مِنْ (سے) حروفِ جارہ میں سے ہے بعد والے حرف کو عام طور پر زیر دیتا ہے، دُوْنَ سوا، بغیر (without) مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر) اپنے اعوان وانصار کو دعوت دو۔

﴿اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ اِنۡ﴾ شرطیہ کُنۡتُمۡ اگر/تم ہو صٰادِقِیۡن جمع اور مفرد صَادِقٌ سچے (Truthful) قرآن حکیم نے اپنی صداقت پر سورۃ الاسراء میں اس طرح چیلنج کیا:

قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا یَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِہٖ وَلَوۡ کَانَ بَعۡضُہُمۡ لِبَعۡضٍ ظَہِیۡرًا (الاسراء۱۷:۸۸)

''(فرما دیجئے) کہ اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز بنا لانے کی کوشش کریں تو وہ اس جیسا نہیں لا سکیں گے خواہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں''۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اللہ تعالیٰ خالق کائنات اور معبود برحق اور انسان عبد ہے اور خاتم النبیین، سالارِ انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام عبدیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں اور اسی بندگی میں شرف انسانیت ہے، ہر نبی اور ہر رسول نے اس بندگی کا دم بھرا، سیدنا مسیح علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوا:

لَنۡ یَّسۡتَنۡکِفَ الۡمَسِیۡحُ اَنۡ یَّکُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰہِ وَ لَا الۡمَلٰٓئِکَۃُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ وَ مَنۡ یَّسۡتَنۡکِفۡ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَ یَسۡتَکۡبِرۡ فَسَیَحۡشُرُہُمۡ اِلَیۡہِ جَمِیۡعًا (النساء۴:۱۷۲) ''مسیح اس بات میں عار نہیں سمجھتے کہ وہ اللہ کا بندہ ہو کر رہیں اور نہ مقرب فرشتے عار سمجھتے ہیں اور جو شخص اس کی بندگی میں عار سمجھے اور تکبر کرے تو اللہ ان سب کو عنقریب اپنے ہاں اکٹھا کرے گا۔''

بلکہ کائنات کی ہر چیز اس کی غلام اور بندگی کا اعلان کر رہی ہے:

اِنۡ کُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا (مریم۱۹:۹۳)

''ارض وسماوات میں جو کچھ بھی ہے وہ سب رحمٰن کے حضور غلام بن کر آئیں گے۔''

۲) یہ کلام الٰہی اپنے نظم، مضامین اور زبان وبیان میں بے مثل اور بے مثال ہے، اہل عرب کو بتایا جا رہا ہے کہ جنہیں اپنی زبان اور کلام پر بڑا ناز تھا، بلکہ یہاں خطاب دنیا کے تمام انسانوں سے ہے کہ اگر تم اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں، بلکہ کسی انسان کا کلام سمجھتے ہو تو تم بھی انسان ہو اور تم میں بڑے بڑے فصیح اور قادر الکلام لوگ موجود ہیں، پورا کلام کیا تم سب مل کر اس جیسی ایک آیت ہی بنا لاؤ قرآن کا یہ چیلنج آج تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔ ان شاء اللہ!

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوْا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ، اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ (۲۴)	''پھر اگر تم ایسا نہ کرسکو اور ہرگز (ہرگز) نہ کرسکو گے، تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں (اور وہ) کافروں (ہی) کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

فَاِنْ (فَ–اِنْ) پس۔ اگر لَمْ تَفعَلُوْا، لَمْ (نہیں) مضارع کے شروع میں آتا ہے تو اسے حالت جزم میں کردیتا ہے، ''ن'' جمع ہو تو وہ گر جاتا ہے، اور معنی ماضی سے مختص ہوجاتے ہیں۔ تَفْعَلُوْن تھا، لَمْ کی وجہ سے تَفْعَلُوْا رہ گیا، (اگر تم اس جیسی سورت نہ لاسکو) لَنْ تَفعَلُوْا، لَنْ (نہیں، ہرگز نہیں) یہ لفظ جب مضارع کے شروع میں آتا ہے تو اسے حالت نصب (زبر) میں کردیتا ہے اور اگر 'ن' جمع کا آجائے تو وہ گر جاتا ہے اور مضارع کے معنی مستقبل کے ساتھ مختص کردیتا ہے لہٰذا معنی ہوئے: (تو قطعاً ایسا نہ کرسکو گے) یعنی قرآن حکیم اپنی عبارت، مفہوم و مطالب اور فصاحت و بلاغت میں بے مثل اور بے مثال ہے کیونکہ یہ رب العالمین کا کلام ہے اور اسے نازل ہوئے کم و بیش پندرہ صدیاں بیت چکی ہیں مگر اس کی نظیر پیش کرنے سے انسانی عقل عاجز و درماندہ ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۸۸) ''فرمادیجئے کہ اگر انسان اور جن سب مل کر اس قرآن جیسا کوئی کلام لانا چاہیں تو کبھی نہ لاسکیں گے خواہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔''

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''اللہ اکبر! کس زور کی تحدّی ہے اور وہ بھی ایک امی کی زبان سے! اپنی عقل و حکمت، اپنے علوم و فنون پر ناز رکھنے والوں کو کیسا کیسا جوش اس وقت بھی آیا ہوگا اور آج بھی آرہا ہے۔ ع لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی! کتنے نئے نئے مسلک روز پیدا ہورہے ہیں کیسے کیسے 'Isms' (اِزم) ہر روز اٹھ رہے ہیں اور دنیا کو راہ نجات دکھانے میں سب کے سب بے کار ہی ثابت ہورہے ہیں''۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''یہ چیلنج عجیب ہے! اور جس چیز کے لیے چیلنج کیا گیا ہے اس کے ناممکن ہونے کا جزم و یقین اس سے بھی زیادہ عجیب ہے! اگر قرآن کے اس دعویٰ کو جھٹلانا ان کے بس میں ہوتا تو وہ ایک لمحہ کے لیے اس میں کوتاہی نہ کرتے! اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ایسا نہ کرسکیں گے! اور قرآن نے جیسا دعویٰ کیا تھا، ویسا ہی متحقق ہو کر رہا! حقیقت یہ ہے کہ قرآن بذات خود معجزہ ہے! اس میں بحث و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں! منکرین کے سامنے میدان کھلا پڑا تھا! اگر وہ کوئی چیز پیش کر سکتے جو قرآن کے اس دعوے کو رد کرنے والی ہوتی تو قرآن کی حجت اور اس کا سارا استدلال باطل ہو جاتا! لیکن ایسا نہ ہو سکا! اور ایسا نہ ہو سکے گا! قرآن کا چیلنج تمام انسانوں سے ہے، خواہ زمین پر کتنی ہی قومیں اور نسلیں گزر جائیں۔ یہ چیلنج قائم رہے گا! یہ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے سلسلے میں تاریخی اور قطعی فیصلہ ہے! (فی ظلال القرآن، جلد اول)

فَاتَّقُوْا النَّار، ف نتیجہ کو ظاہر کر رہا ہے (پس) **اِتَّقُوْا** فعل امر جمع مذکر (**اِتَّقٰی یَتَّقِیْ، اِتِّقَاءً**) **فَاتَّقُوْا النَّارَ** جوابِ شرط ہے، یعنی تمہارے اس انکار حق کا لازمی نتیجہ جہنم کی آگ ہوگا۔ یہ دنیا کی نہیں دوزخ کی آگ ہوگی، وہ دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ تیز اور جلانے والی ہے اور وہ کبھی ٹھنڈی نہ ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے:

كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۹۷) جب بھی اس (جہنم) کی آگ بجھنے لگے گی ہم ان (منکرین حق) پر اور بھڑکا دیں گے (العیاذ باللہ)

﴿الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ والحِجَارَةُ﴾ الَّتِی اسم موصول Relative Noun **وَقُوْدُ**– مصدر (**وَقَدَ یَقِدُ، وَقُوْدًا**) ایندھن (Fuel) **النَّاسُ** (خاص لوگ) جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، **اَلْحِجَارَةُ** (پتھر) پتھر سے مراد وہ بت اور معبود ہیں جن کی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بندگی کی جاتی تھی۔

والمرادُ بِهَا حِجَارَةٌ تُعْبَدُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ (ابن کثیر)

''مراد وہ پتھر ہیں جو اللہ کے علاوہ پوجے جاتے ہیں۔''

جہنم کا ایندھن انسان ہی نہیں معدنی پتھر (Coak) وغیرہ بھی ہوں گے جو آگ کی شدت کو کئی گناہ تیز کر دیتے ہیں۔ (تیسیر القرآن)

﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ اُعِدَّتْ، ماضی مجہول (Passive Voice) (**اَعَدَّ یُعِدُّ، اِعْدَادٌ**) تیار کرنا، گویا کہ وہ آگ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''یہاں انسانوں اور پتھروں کو کیوں جمع کیا گیا ہے اور وہ بھی اس خوفناک اور دہشت انگیز صورت میں! یہ وہ آگ ہے جو ان منکرین حق کے لیے تیار کی گئی ہے جن کا حال سورت کے آغاز میں الفاظ میں ہوا ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ

''اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑا) ہے۔''

قرآن حکیم ان منکرین کو چیلنج کرتا ہے! وہ چیلنج قبول کرنے سے عاجز رہتے ہیں! مگر شرماتے نہیں! وہ پتھروں میں پتھر ہیں اگرچہ شکل وصورت سے آدمی نظر آتے ہیں! اس لیے پتھروں اور انسانوں کو یکجا ہونا ہی تھا! اس بات کی توقع اور اس امر کا انتظار تھا!

پتھروں کے ذکر سے دل اس خوفناک منظر کے ایک اور پہلو کو محسوس کرتا ہے! آگ کا منظر، جو پتھروں کو کھا رہی ہے! اور انسانوں کا منظر جن کے آگے پیچھے پتھر ہی پتھر ہیں اور آگ سب کو کھا رہی ہے۔ (العیاذ باللہ) (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) نزولِ قرآن کو پندرہ صدیاں بیت رہی ہیں، مگر انسانی عقل اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ودرماندہ ہے۔

۲) دنیا نے حق اور اہل حق کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا، اگر قرآن کے اس دعویٰ کو جھٹلانا اہل باطل کے بس کا روگ ہوتا تو وہ ایک لمحہ بھی اس میں کوتاہی نہ کرتے، سچ تو یہ ہے کہ قرآن خود ایک معجزہ ہے کہ چھے سات برس کا بچہ اسے اپنے سینے میں ضبط کر لیتا ہے اور رمضان المبارک میں کتنے نمازیوں کو سنا ڈالتا ہے یہ وہ حقیقت ہے جو آفتابِ نصف النہار سے بھی زیادہ روشن ہے۔

۳) وہ پتھر دل انسان جو دعوتِ قرآن کو قبول کرنے سے انکاری ہیں ان کا انجام بھی جلتے ہوئے پتھروں میں ہوگا، وہ پتھروں میں پتھر ہیں گو شکل وصورت سے آدمی نظر آرہے ہیں۔

۴) یہ زندگی اللہ تعالیٰ کی عطا وبخشش ہے، اسے آتش جہنم سے بچانا اور سعادت مندی کی راہ اختیار کرنا ہی دانشمندی ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا، قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا، وَّلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۵)	''(اے نبیؐ!) جولوگ ایمان لائیں اوراچھے کام کریں انہیں خوشخبری دیجئے کہ ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہیں، جب بھی انہیں کوئی پھل اس میں سے کھانے کو دیا جائے گا تو کہیں گے (آہا!) یہ تو وہی ہیں جو ہمیں اس سے قبل (دنیا میں) دیے جاچکے ہیں (نہیں نہیں!) اس سے ملتے جلتے اور پھل بھی دیے جائیں گے، اوران کے لیے اس میں پاکیزہ جوڑے (بیویاں یا خاوند) ہوں گے اور وہ ان (باغات) میں ہمیشہ رہیں گے۔''

بَشَّرَ يُبَشِّرُ تَبْشِيْرًا (بابِ تفعیل) سے فعل امر، بَشِّرْ، بشارت دیجئے خوشخبری سنایئے، اَلَّذِيْنَ اسم موصول، اٰمَنُوا (امن يُؤْمِنُ) ماضی جمع مذکر غائب، وہ سب ایمان لائے، ایمان کے معنی یقین کامل کے ہیں، وَعَمِلُوْا (عَمِلَ يَعْمَلُ، عَمَلًا) وعَمِلوا ماضی جمع مذکر غائب عَمَلَ کیے الصَّالِحَات صَالِحَةٌ کی جمع نیک، اچھے وَعَمِلُوْا الصَّالِحات (and they have done good deeds) اور نیک اوراچھے اعمال کیے، یعنی وہ اعمال جوقرآن وسنت کے مطابق ہوں، یادرکھیے وہی اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قبول ہیں جن میں اخلاص ہواور وہ عین شریعت کے مطابق ہوں اوران میں ذاتی خواہشات کا عمل دخل نہ ہو، پھرغور کیجئے کہ ایمان اورعملِ صالح لازم ملزوم ہیں، نیکی ایمان سے الگ نہیں ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''ایمان جب تک قلبی ہے، ایمان ہے، اگر قولی اورلسانی ہے تو اسلام ہے اور وہی ایمان جب عمل سے ظاہر ہونے لگتا ہے تو اس کا نام حسن عمل، حسن کردار یا عمل صالح پڑ جاتا ہے اور حسن عمل کے معنی ہی یہ ہیں کہ

وہ عمل رضائے الٰہی کے مطابق ہو، کوئی نیکی اگر ایسی پیش کی جاتی ہے جس کی تہہ میں جذبہ ایمان خفیف سا بھی موجود نہیں، تو وہ نیکی نہیں، نیکی کی صرف صورت ہے، نیکی کی صرف نقل ہے اور جس نماز کی نقل محض نماز نہیں، اسی طرح کسی نیکی کی نقل پر اطلاق نیکی کا نہیں ہوسکتا، عمل نیک کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عمل ضابطہ شریعت کے موافق ہو۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

قرآن حکیم نے ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح کی اہمیت کو کئی مقامات پر واضح کیا ہے گویا کہ ایمان کی تکمیل اعمالِ صالحہ سے ہوتی ہے یا پھر یوں سمجھ لیجئے کہ ایمان کا بیج قلب انسانی میں بویا جاتا ہے اور عمل صالح سے وہ کونپل نکالتا ہے اور جوں جوں انسان کی نیکیاں بڑھتی ہیں توں توں اس میں پھول اور پتیاں ظاہر ہونے لگتی ہیں اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ وہ مضبوط، تناور، سدا بہار اور سایہ دار درخت بن جاتا ہے۔ قرآن حکیم اس ایمانی کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا، وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (ابراھیم ۱۴:۲۵) ''آپ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ (توحید) کی کیسی عمدہ مثال بیان کی ہے جیسے وہ ایک پاکیزہ درخت ہو جس کی جڑ (زمین میں خوب) جمی ہوئی اور شاخیں آسمان میں ہوں وہ اپنے رب کے حکم سے ہر آن پھل دے رہا ہے، اللہ لوگوں کے لیے مثالیں اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ سبق حاصل کریں۔''

پھر غور کیجئے تو اعمال حسنہ سے ایمان، قوی اور مضبوط ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کی اس آیہ مبارکہ کو توجہ سے پڑھیے: **اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ، اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا** (الانفال ۸:۲ تا ۴) ''مومن تو وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جب اللہ کی آیات انہیں سنائی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں یہی سچے مومن ہیں (اور ایسے ہی لوگوں کا ایمان مضبوط ہے)۔''

یہ بھی یاد رہے کہ ایمان کی مضبوطی ہی سے دنیا و آخرت کی کامیابیاں ہیں۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (اٰلِ عمران ۳:۱۳۹)

''(اور مسلمانو!) نہ تم سستی دکھانا اور نہ ہی غمزدہ ہونا اور اگر فی الواقع تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔''

﴿اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ﴾ اَنَّ ، بے شک، لَهُمْ ان کے لیے، جَنَّاتٌ، باغات جَنَّةٌ، مفرد ہے، جَنَّات ایسے گھنے باغات کو کہتے ہیں کہ جن کے درختوں نے زمین کو ڈھانپ رکھا ہو، تَجْرِیْ (جری یَجْرِیُ) کہ بہتی ہیں، رواں دواں ہیں مِنْ (سے) تَحْتِهَا (تَحْتِ– هَا) نیچے، اس کے، الانهار۔ نہر کی جمع، نہریں، كُلَّمَا (كُلّ–ما) کلمہ شرط، جب کبھی رُزِقُوْا ماضی مجہول (رُزِقَ، يُرْزَقُ، رِزْقًا) انہیں رزق دیا جائے گا، وہ پکار اٹھیں گے۔ ﴿قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ﴾ قَالُوْا۔ کہا انہوں نے، هٰذَا۔ یہ الَّذی (جو) رُزِقْنَا (ہم رزق دیئے گئے) مِن قبل (اس سے پہلے) یعنی دنیا میں ہم نے سیب، انار، انگور، کھجور وغیرہ پھل کھائے ہیں۔ خدّامِ جنت جب ان کے لیے پھل لے کر آ رہے ہوں گے تو وہ دور سے دیکھ کر پکار اٹھیں گے کہ ارے یہ تو دنیا میں ہم کھا چکے ہیں مگر جب انہیں منہ میں ڈالیں گے تو لذت اور لطافت میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ ﴿اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا﴾ اُتُوْا فعل مجہول وہ دیے جائیں گے مُتَشَابِهًا، ان سے ملتے جلتے، جنت میں اور کئی قسم کے پھل دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے۔

وَلَهُمْ– اور ان کے لیے، فِيْهَا (فی–ها) اس جنت میں اَزْوَاجٌ، زَوْجٌ کی جمع ہے، معنی جوڑے (بیوی بھی اور شوہر بھی) یعنی نیک بیوی کے لیے نیک شوہر اور نیک شوہر کے لیے نیک بیوی۔ مُطَهَّرَةٌ (پاکیزہ) یعنی تمام جسمانی، ذہنی و فکری، روحانی و اخلاقی عیوب و نقائص سے پاک۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

'زوج' یہ لفظ شوہر اور بیوی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ شوہر کے لیے بیوی ''زوج'' ہے اور بیوی کے لیے ''شوہر'' زوج مگر وہاں یہ اَزْوَاج پاکیزگی کی صفت کے ساتھ ہوں گے، اگر دنیا میں کوئی مرد نیک ہے اور اس کی بیوی نیک نہیں ہے تو آخرت میں ان کا رشتہ کٹ جائے گا اور اس نیک مرد کو کوئی دوسری نیک بیوی دے دی جائے گی، اگر یہاں کوئی عورت نیک ہے اور اس کا شوہر بد، تو وہاں وہ اس برے شوہر کی صحبت سے خلاصی پا جائے گی اور کوئی نیک مرد اس کا شریک زندگی بنا دیا جائیگا اور اگر یہاں کوئی شوہر اور بیوی

دونوں نیک ہیں تو وہاں ان کا یہی رشتہ ابدی وسرمدی ہو جائے گا (تفہیم القرآن، جلد اول)

وَهُمْ فِيهَا خَالِدُوْنَ، وَ۔اور، هُمْ۔وہ، فِيهَا۔اس میں خَالِدُوْنَ، ہمیشہ رہیں گے، خُلُوْدٌ کے معنی ہمیشگی کے ہیں یعنی ایسی حالت میں رہنا جس میں کبھی تغیر وتبدل اور خرابی وفساد پیدا نہ ہو اور وہ ابدی زندگی ہو۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) بشارت کا لفظ کتنا خوشگوار ہے! دنیا کے چھوٹے چھوٹے امتحانوں میں کامیابی کی خوشخبری ملتے ہی باچھیں کھل جاتی ہیں اور لوگ ہر طرف سے مبارک بادی کا پیغام دینے لگتے ہیں۔ تو اس ابدی وسرمدی کامیابی کی نوید ملتے ہی بھلا خوشی کا کیا ٹھکانہ ہوگا کہ ہر طرف سے ملائکہ جنت سلامتی کا پیغام دے رہے ہوں گے۔

۲) یہ صلہ ہے ایمان اور اعمال صالحہ کا، ایمان کے بغیر نیک اعمال قدر و قیمت نہیں پاتے اور نیک اعمال کے بغیر ایمان سرسبز وشاداب نہیں ہوتا۔ گویا ایمان اور اعمال صالحہ کا چولی دامن کا سا تعلق ہے۔

۳) ایسی پرسکون اور آرام دہ زندگی کا تصور کیجیے کہ باغ وچمن میں رہنے سہنے کی جگہ ہو، سامنے نہریں رواں دواں ہوں، کھانے کے لیے شیریں اور میٹھے پھل ہوں اور پینے کے لیے ٹھنڈے اور خوش ذائقہ مشروبات ہوں اور جی لگانے کے لیے پاکیزہ اور خوش مذاق اہل خانہ ہوں اور موسم بھی معتدل اور سہانا ہو، پھر وہاں دنیا کی طرح نہ کھانے کی فکر اور نہ جھگڑے فساد کا ڈر، نہ بیماری اور جنگ کا خوف اور نہ وہاں سے نکالے جانے کی کوئی تشویش، بلکہ ابدی اور دائمی زندگی!

۴) جنت اور پاکیزگی لازم وملزوم ہیں، وہ مادی اور روحانی ہر قسم کی خوشیوں اور راحتوں کا گھر ہے اور امن اور سلامتی کی جگہ ہے، یہ دنیا میں ایمان اور نیک اعمال کرنے والوں کا بدلہ ہے اور کیا ہی اچھا بدلہ ہے!

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا، فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا، يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا، وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا، وَّمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ(۲۶) الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ(۲۷)	''اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کسی مچھر یا اس سے بھی کسی حقیر تر چیز کی مثال بیان کرے سو جو ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے رب کی طرف سے یہ مثال درست ہے البتہ کافر یہی کہتے رہیں گے کہ ''ایسی حقیر چیزوں کی مثال سے اللہ کیا چاہتا ہے؟'' (اس طرح) اللہ بہت سے لوگوں کو گمراہ رہنے دیتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور گمراہ صرف فاسقوں ہی کو کرتا ہے (اور یہ وہ لوگ ہیں) جو اللہ سے عہد پختہ کرنے کے بعد اسے توڑ ڈالتے ہیں! اور جن (رشتوں) کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں قطع کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، یہی لوگ خسارہ (گھاٹا) پانے والے ہیں۔''

يَسْتَحْيِيْ: اِسْتَحْيٰى يَسْتَحْيِيْ بابِ استفعال اس کا مادہ حیا ہے، لَا يَسْتَحْيِيْ (وہ نہیں شرماتا ہے) اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا، اَنْ، کہ ضَرَبَ يَضْرِبُ ضَرْبًا لفظی معنی ضرب لگانا، مگر عربی زبان میں اس کا استعمال کئی طرح سے آتا ہے، یہاں معنی پیش کرنا، بیان کرنا، مَثَلًا، کوئی مثال مَّا تنکیر اور تقلیل کے لیے ہے (ما کا استعمال کسی تھوڑی سی اور عام سی چیز کو بیان کرنے کے لیے ہوا ہے) مَثَلًا (کوئی سی مثال) یہ لفظ خود نکرہ ہے، اس کے ساتھ مائے تنکیر لا کر اس کے وصف میں اور اضافہ کر دیا ہے، بَعُوْضَةً، بَعْضٌ سے مشتق ہے دوسرے جانداروں کی بہ نسبت انتہائی چھوٹا ہونے کی وجہ سے اسے بَعُوْضَةٌ کہا جاتا ہے، عربی زبان میں انتہائی کمزور چیز کی مثال بَعُوْضَةٌ (مچھر) سے دی جاتی ہے۔

فَمَا فَوْقَهَا، یعنی مچھر سے بھی زیادہ حقیر فَمَا فوقَهَا فِی الصِّغْرِ. (مفردات القرآن)

سید قطبؒ لکھتے ہیں: -''اللہ چھوٹے اور بڑے، سب کا رب ہے، مچھر اور ہاتھی، سب کا خالق ہے، ہاتھی میں جو اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ معجزہ ہے، وہی معجزہ مچھر میں ہے، یہ زندگی کا معجزہ ہے، ایک سربستہ راز کا معجزہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

امام رازیؒ نے یہ بات بھی خوب لکھی ہے کہ صنّاعِ عَالم اور خلّاقِ علیم کی بنائی ہوئی کوئی شے بھی درحقیقت حقیر و بے حقیقت نہیں، بلکہ جو چیز بظاہر جتنی زیادہ چھوٹی اور حقیر ہوگی، اسی قدر اس کا بیان کمالِ علم، کمالِ اطلاع اور کمالِ حکمت پر اور زیادہ دلالت کرے گا۔ (تفسیر کبیر)

مچھر بظاہر معمولی سی چیز ہے مگر اس مغرور انسان کو عاجز و پریشان کر دیتا ہے اور وہ اس سے بچاؤ کے لیے کتنی تدابیر اختیار کرتا ہے! کتنے جتن کرتا ہے پھر بھی بے بس نظر آتا ہے!

ایک اور مقام پر مکھی کی مثال بیان کر کے یہ سمجھایا گیا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر جو خود ساختہ معبود تم نے بنا رکھے ہیں وہ تو مکھی تک پیدا کرنے سے عاجز ہیں، بلکہ مکھی اگر ان کی خوراک سے کوئی ذرہ اچک لے تو وہ اس سے چھڑا تک نہیں سکتے۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ، وَ اِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ، ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (حج ۲۲:۷۳)

''اللہ کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے ہیں، چاہے اس کے لیے سبھی اکٹھے ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے، تو اس سے وہ چیز چھڑا نہیں سکتے ہیں، چاہنے والے اور جسے چاہا جا رہا ہے، دونوں کمزور ہیں۔''

ایک جگہ اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اوروں کو سرپرست بنا رکھا ہے ان کی مثال بیت العنکبوت (مکڑی کے گھر) ایسی ہے، کہ وہ ہوا کے کسی جھونکے سے ٹوٹ پھوٹ سکتا ہے۔ فرمایا:

مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ، اِتَّخَذَتْ بَیْتًا، وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ، لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (العنکبوت ۲۹:۴۱)

''جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اوروں کو سرپرست بنا رکھا ہے ان کی مثال مکڑی (Spider) جیسی ہے جس نے اپنا گھر بنایا ہوا اور سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے، کاش یہ لوگ کچھ جانتے۔''

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ یعنی اہل ایمان جانتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور یہ مثالیں حق ہیں بلکہ ان پر غور وفکر کر کے ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا﴾

اور جو منکرین حق ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایسی مثالوں سے اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے؟

﴿یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا﴾ اَضَلَّ یُضِلُّ اِضْلَالًا فعل مضارع، واحد مذکر غائب باب افعال، گمراہ کرنا، راہ راست سے ہٹانا۔

امام راغب لکھتے ہیں: گمراہ ہونے کی دو صورتیں ہیں۔

''ایک معنی، گم ہو جانا، راستہ بھول جانا (To Lose the way) اور دوسرا معنی، گمراہ ہو جانا، صراط مستقیم سے بھٹک جانا (to go astray)''

﴿وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ﴾ اور گمراہ صرف فاسقوں ہی کو کرتا ہے۔

اَلْفٰسِقِیْنَ، واحد فاسق اس کا مادہ فِسْقٌ ہے۔ فَسَقَ یَفْسُقُ فِسْقًا اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے خروج اور اللہ کے عہد کو توڑنے کا نام فِسْق ہے لغت میں 'فاسق' خَارِجٌ عَنِ الطَّاعَةِ (یعنی اطاعت اور فرمانبرداری سے نکلنے والا فاسق کہلاتا ہے) اس سے اگلی آیت میں فاسقین کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

﴿الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ﴾

(یہ وہ لوگ ہیں) جو اللہ سے عہد پختہ کرنے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ، وہ لوگ، یَنْقُضُوْنَ (ن ق ض) نَقَضَ یَنْقُضُ (توڑنا) جو توڑتے ہیں، عَهْدَ اللّٰهِ (اللہ کے عہد کو) یعنی جو اقرار انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا اسے توڑ ڈالتے ہیں مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ، مِنْ بَعْدِ (اس کے بعد) میثاق، وہ عہد ہے جسے مستحکم اور مضبوط بنایا جائے (Covenant)۔

﴿وَیَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾

اور جن (رشتوں) کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں قطع کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، یہی لوگ خسارہ (گھاٹا) پانے والے ہیں۔

وَيَقْطَعُوْنَ (قطع کرتے ہیں، کاٹتے ہیں) قَطَعَ يَقْطَعُ فعل مضارع جمع مذکر غائب مَآ اَمَرَاللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ جسے اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا ہے، وَيُفْسِدُوْنَ (اور وہ فساد کرتے ہیں) اَفْسَدَ يُفْسِدُ فَسَادًا باب افعال ہے۔ فہم وشعور سے کام نہ لینا سب سے بڑا فساد ہے، احکام الٰہی سے روگردانی اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منہ موڑنا باعث فساد ہے۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ، سب سے بڑا خسارہ پانے والے یہی لوگ ہیں، یہ فاسقین کے اوصاف بیان ہوئے ہیں (العیاذ باللہ)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اللہ تعالیٰ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا خالق و مالک ہے وہ اگر ہاتھی کا پروردگار ہے تو مچھر کا بھی پالنہار ہے اور اس کی پیدا کی ہوئی کوئی چیز بھی حقیر اور بے حقیقت نہیں ہے۔ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہر چھوٹی بڑی چیز سے عبرت ونصیحت حاصل کرتے ہیں اور ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ ساری مخلوق مل کر بھی کوئی چھوٹی سی چیز (مچھر تک) پیدا کرنا چاہے تو ہرگز پیدا نہیں کرسکتی۔

۲) فاسق لوگ محض نکتہ چینی کے لیے حقیر اور چھوٹی چیزوں پر اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ بھلا ان کی تخلیق سے کیا مقصود ہے، تو انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ چھوٹی چیز بھی انسان کو عبرت سکھانے کے لیے کافی ہیں مثلاً کفار کے بت ایسے کمزور اور بے بس ہیں کہ ایک مکھی تک پیدا نہیں کرسکتے، بلکہ ان کی خوراک میں سے کوئی مکھی ذرہ لے اڑے تو چھڑا نہیں سکتے۔

۳) تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بہتر سے بہتر زبان میں آسان اور سادہ لفظوں میں لوگوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے کہ ہر شہری، دیہاتی اسے سمجھ سکے، قرآن حکیم کا اسلوب بیان نہایت ہی عام فہم ہے۔

۴) فطرتِ صالحہ والے لوگ اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور جن کے دل زنگ آلود ہیں وہ بے جا اعتراض کرنے لگتے ہیں اور وہ وہی ہوسکتے ہیں جو فاسق ہیں یعنی جو اپنے ایمان میں پختہ اور مضبوط نہیں ہوتے، بلکہ مسلسل نافرمانی سے اسے توڑتے رہتے ہیں۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸)	''(لوگو!) تم اللہ کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟ حالانکہ تم بے جان (معدوم) تھے تو اس نے تمہیں زندگی عطا کی، پھر وہ تمہیں موت دے گا پھر وہ تمھیں زندہ کرے گا (قیامت کے دن) پھر اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔''

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (لوگو!) تم اللہ کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟

كَيْفَ کیسے، کلمہ استفہام، تنبیہ اور سرزنش کے لیے تَكْفُرُوْنَ (كَفَرَ، يَكْفُرُ، كُفْرًا) انکار کرنا، مضارع جمع مذکر مخاطب كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ (كَيْفَ تَجْحَدُوْنَ وَجُوْدَهُ) اللہ تعالیٰ کے وجود کا کیسے انکار کرتے ہو؟ (How can you disbelieve in Allah?) تمہارے انکار کرنے کی وجہ اور دلیل ہو ہی نہیں سکتی اس لیے کہ تمہارا اپنا وجود اور کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کی کرشمہ سازی اور رحمت کا ظہور ہے۔ لفظ کیف کا استعمال قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی حق تعالیٰ کے سلسلہ میں آیا ہے، سیاق ہمیشہ تنبیہ اور سرزنش ہی کا رہا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ (الفیل ۱۰۵:۱) ''کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں سے کیا برتاؤ کیا؟''

﴿وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا﴾ وَ۔ اور، كُنْتُمْ، تم تھے، اَمْوَاتًا، مردہ، بے جان، ﴿فَاَحْيَاكُمْ﴾ (اَحْيَا يُحْيِيْ اِحْيَانًا) پس تمہیں زندگی بخشی، عالم وجود میں لایا، رب کریم ہر چیز کو زندگی عطا کرنے والا اور اس کے لیے زندگی کا سروسامان بھی مہیا کرنے والا ہے اور انسان کو نہ صرف اس نے مادی چیزوں مثلاً خوراک، لباس، مکان کے حصول کے لیے عقل وفہم سے نوازا ہے بلکہ اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے سے علم وحکمت کی عظیم نعمت بھی عطا کی ہے، اس دنیا میں انسان نے جو کچھ بھی مادی ترقی (material progress) کی ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ذہانت اور فہم سے کی ہے۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''ان دلائل اور اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی موجودگی میں اللہ کے ساتھ کفر انتہائی قبیح اور شنیع فعل ہے جس

کی کوئی دلیل اور کوئی سند نہیں! حقیقت یہ ہے کہ قرآن انسانوں سے وہ بات کہتا ہے جس کا وہ انکار نہیں کر سکتے! جس کے اعتراف اور جس کے مقتضیات کو تسلیم کرنے پر وہ مجبور ہیں! وہ ان کی زندگی کے سفر اور زندگی کے مختلف حالات واطوار کو بیان کرتا ہے، وہ جان نہ رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں زندگی بخشی! وہ موت کی حالت میں تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو موت سے زندگی کی طرف منتقل کیا! موت سے زندگی کی طرف سفر ایک ایسی حقیقت ہے جسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں! اور جس کی اس کے سوا کوئی توجیہ نہیں کہ ایک پیدا کرنے والی قوت موجود ہے! ان کے اندر زندگی موجود ہے! تو کون ہے جس نے ان کے لیے زندگی پیدا کی!

یہی وہ حقیقت ہے جسے کلام الٰہی اس مقام پر لوگوں کے سامنے پیش فرماتا ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ''تم کس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کرتے ہو؟ حالانکہ تم جان نہ رکھتے تھے تو اس نے تمہیں زندگی بخشی!'' (فی ظلال القرآن)

﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ﴾ (پھر) حرف عطف متاخر ہونے پر دلالت کرتا ہے (يُمِيْتُ- كُمْ) وہ موت طاری کریگا۔ تم پر۔ اَمَاتَ، يُمِيْتُ، اِمَاتَةً (باب افعال ہے) مارنا، موت دینا۔ موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ جس کا انکار شدید سے شدید منکر بھی نہیں کرسکتا، بات بڑی سادہ اور سمجھ میں آنے والی ہے کہ جس ذات کے ہاتھ میں موت ہے وہی حیات کا بھی مالک ہے، نیست سے ہست میں لانا اور ہست سے نیست میں لے جانا اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے، وہاں تو صرف حکم ہوتا ہے اور وہ چیز ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

هُوَالَّذِیْ يُحْيِیْ وَيُمِيْتُ ، فَاِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (المؤمن ۲۳:۶۸)

''وہی تو ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے پھر جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اسے اتنا ہی کہتا ہے کہ ''ہوجا'' تو وہ ہوجاتا ہے۔''

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ''پھر وہ تمہیں موت دے گا'' ایک ایسی بات جس میں بحث ونزاع کی گنجائش نہیں! ایک ایسی حقیقت جس کا سامنا زندہ ہستیاں ہر لمحہ کر رہی ہیں! جو زندوں پر عائد ومسلط ہے! اور جس کے سلسلہ میں مباحثہ اور مجادلہ کا کوئی موقع نہیں!

﴿ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ ''دنیا میں موت دینے کے بعد رب قدیر تمہیں حیات ثانیہ عطا کرے گا۔''

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''یہ ہے وہ بات جس کے سلسلہ میں کفار بحث اور جھگڑا کرتے تھے جیسا کہ آج بھی کچھ بے بصیرت افراد، جو صدیوں قبل کی پرانی جاہلیت کی طرف رجعت قہقری (retracing their footsteps) میں مبتلا ہیں اس مسئلہ میں بحث ونزاع کر رہے ہیں، اگر وہ انسانوں کی پہلی تخلیق پر غور وفکر کرتے تو دوسری تخلیق ان کے لیے حیرت کا موجب نہ ہوتی اور نہ وہ اس کی تکذیب کرنے پر آمادہ ہوتے۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ثُمَّ﴾ (پھر) اِلَيْهِ (اس کی طرف) تُرْجَعُوْنَ (تم لوٹائے جاؤ گے) مضارع مجہول جمع مذکر، مخاطب (رَجَعَ يَرْجِعُ رُجُوْعًا) پھر تم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ عقیدہ آخرت اور حساب کتاب اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور کائنات کے نظام عدل کا انحصار صرف اسی عقیدہ پر ہے۔ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لیے دارالجزاء ہو کیونکہ امتحان کے بعد نتیجہ لازمی طور پر ظاہر ہونا چاہیے اور وہ آخرت ہے۔

سید قطبؒ شہید اس آیہ مبارکہ پر بڑی خوبصورت بات لکھتے ہیں:

''اس طرح ایک چھوٹی سی آیہ مبارکہ میں دفتر زندگی کھلتا بھی ہے اور لپٹ بھی جاتا ہے! اس میں نوع انسانی کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے کہ وہ باری تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے! وہ اسے موت کے جمود سے باہر لاکر زندہ کھڑا کر دیتا ہے! پھر موت کے ہاتھوں اسے واپس بلا لیتا ہے! پھر دوبارہ اسے زندہ کرتا ہے! پھر اس کی طرف دوسری زندگی (آخرت) میں اس کی واپسی ہو رہی ہے جس طرح پہلی زندگی (دنیا) میں اسی سے اس کی زندگی کا آغاز ہوا تھا! اس تیز اور سریع جھلک سے ایک قادر طاقت کا ہلکا سا جلوہ سامنے آتا ہے جو ہمارے احساسات پر موثر اور گہرے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔'' (فی ظلال القرآن)

آیہ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) زندگی اور موت ایسی اٹل حقیقتیں ہیں جن سے انکار ممکن نہیں ہے، اس کا مشاہدہ کٹر سے کٹر کافر بھی اپنی آنکھوں سے کرتا ہے، کتنے قریبی رشتہ داروں، دوست احباب، امیروں اور غریبوں کو ہم نے منوں مٹی تلے دفن کر دیا اور آئے دن کرتے رہتے ہیں اور ایک دن خود بھی انہیں مردوں میں شامل ہو جائیں گے، دنیا میں بڑے بڑے اطبا اور حکماء گزر چکے ہیں انہوں نے مختلف امراض کے لیے بڑی بڑی عمدہ

ادویات تجویز کیں، مگر موت کا تریاق تلاش نہ کر سکے۔

۲) ہم کچھ نہیں تھے تو خالق کائنات نے ہمیں زندگی عطا کی اور پھر دنیا سے رخصت ہوں گے تو جس نے پہلی بار زندگی عطا کی تو کیا وہ دوسری بار عطا کرنے پر قادر نہیں ہے؟ یقیناً ہے۔ پھر وہ حساب کتاب کے لیے ہمیں میدان حشر میں اکٹھا کرے گا، اس لیے یہ آیہ مبارکہ ہمیں چوکس اور متنبہ کرتی ہے کہ ہم اس دن کے آنے سے پہلے اپنی دنیاوی زندگی میں کچھ ایسے اعمال کر لیں جو روز قیامت کی رسوائی اور ذلت سے ہمیں بچا لیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا، ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ، وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۲۹)	''اللہ وہی تو ہے جس نے زمین میں موجود ساری چیزیں تمہارے لیے پیدا کیں پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو سات آسمان بنا دیئے اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾

اللہ وہی تو ہے جس نے زمین میں موجود ساری چیزیں تمہارے لیے پیدا کیں۔

هُوَ اسم ضمیر (pronoun) وہ، اَلَّذِیْ اسم موصول (Relative Pronoun) جس نے، خَلَقَ (خَلَقَ یَخْلُقُ) پیدا کرنا۔ لَكُمْ (لَ- كُمْ) لیے، تمہارے یعنی تمہارے نفع اور فائدہ کی خاطر اَیْ لِاَجْلِكُمْ وَ لِانْتِفَاعِكُمْ بِهٖ فِی دُنْیَاكُمْ وَدِیْنِكُمْ (کشاف) ''یعنی یہ تمام اشیاء تمہارے فائدہ اور نفع کے لیے ہیں کہ جس سے تمہیں دین و دنیا کا فائدہ ملتا ہے۔'' دیکھو تم خوراک کھاتے ہو تو جسم کو قوت اور توانائی ملتی ہے اور تم عبادت اور بندگی کے قابل بنتے ہو اور اس سے تمہاری آخرت سنورتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے بہت خوب لکھا ہے:

''خطاب عام نوع انسانی سے ہے، ان سے ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ تم تو خود ہی ساری کائنات ارضی کے مقصود و مطاع ہو، پھر یہ کیسی حماقت ہوگی کہ تم کسی اور مخلوق کو مقصود و مطاع بنالو، یہ آیت ہر قسم کے شرک اور ہر قسم کی مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دینے کے لیے کافی ہے، اس فرشِ زمین پر جو کچھ بھی ہے سب انسان کے لیے ہے نہ یہ کہ انسان کسی اور مخلوق کے لیے ہو اور مشرک انسان اس فطری اور قدرتی ترتیب کو الٹ دیتا ہے۔

حدیث نبوی کا یہ ٹکڑا جو مسلمان ہر جمعہ کو خطیب کی زبان سے سنتا ہے کہ: اِنَّ الدُّنیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَ اِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ ''یعنی دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کئے گئے ہو۔'' اس مفہوم کا ترجمان ہے اور خلیفۃ اللہ کی بے شک یہی شان ہونی چاہیے کہ سب کچھ اس کے لیے ہو اور وہ خود رب کائنات کے لیے ہو۔ وہ جس چیز کو جس طرح بھی چاہے اپنے تصرف میں لائے اور اس کا جواب دہ صرف اپنے مالک و خالق کے سامنے ہو، مرتبہ انسانی کا یہ شرف و احترام اسلام ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔''

(تفسیر ماجدی، جلد اول)

هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا

''وہی (اللہ) ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں''۔

اس پر سید قطبؒ شہید نے بڑے کام کی بات لکھی ہے: ''لَکُمْ (تمہارے لیے) کا یہاں بہت گہرا مفہوم اور اس میں عمیق معنویت ہے! یہ لفظ اس مفہوم کے لیے قطعی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک عظیم کام کے لیے پیدا کیا ہے، اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ زمین میں خلیفہ (Vicegerent) بنے، زمین میں جو کچھ ہے، اس کا مالک ہو، زمین کی تمام اشیا میں موثر فاعل ہو، یہ کہ وہ اس وسیع و عریض ملک میں سب سے اعلیٰ وجود ہے، اس وسیع میراثِ ارضی کا اعلیٰ سردار ہے، زمین اور اس کے حالات و انقلابات میں اس کا رول سب سے اہم ہے وہ زمین اور مشینی آلات کا سردار ہے، مشینی آلات کا غلام نہیں جیسا کہ آج کل مادی دنیا میں ہے، وہ ان تغیرات و انقلابات کا تابع و محکوم نہیں جو مشینی آلات کے ذریعہ نوع انسانی کے باہمی تعلقات و اطوار میں پیدا ہوتے ہیں، جیسا کہ مادیت کے اندھے پرستار مدعی ہیں۔ مادیت کے یہ علم بردار انسان کی حیثیت اور اس کے رول کو حقیر قرار دیتے ہیں اور انسان کو اندھے بہرے مشینی آلات کا تابع بنا کر رکھ دیتے ہیں، حالانکہ انسان زمین کا معزز و مکرم سردار ہے۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

پھر غور کیجئے کہ سطح زمین کے اوپر اور سطح زمین کے نیچے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے بے حساب نعمتیں

پیدا کی ہیں جو انسان کے شمار و قطار سے باہر ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (النحل ۱۶:۱۸) ''اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گننا چاہو تو کبھی نہ گن سکو گے''۔

ہوا، روشنی اور پانی بغیر قیمت کے اتنی بڑی نعمتیں ہیں کہ اگر صرف اسی پر انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہے تو ہرگز ہرگز ادا نہیں کر سکتا۔ اتنے احسانات و انعامات پانے کے بعد اس پر لازم ہے کہ وہ ہر وقت اسی کی اطاعت کا دم بھرے اور اس کا نائب ہونے کی حیثیت سے اسی کا قانون جاری و ساری کرے۔ تمام رسولوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا مقصد یہی تھا: هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (الصف ۶۱:۹) ''وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین (نظام حیات) دے کر بھیجا تا کہ اسے سب ادیان (نظام ہائے حیات) پر غالب کر دے۔''

﴿ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ﴾ ثُمَّ تاخیر کے لیے نہیں بلکہ ہر دو تخلیق کے درمیان فرق کے لیے استعمال ہوا ہے، اِسْتَوٰی متوجہ ہوا۔ قصد و ارادہ کیا (س و ی) اِسْتَوٰی یَسْتَوِیْ اِسْتِوَاءً (باب افتعال) فعل ماضی واحد مذکر غائب۔

﴿فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ تو سات آسمان بنا دیے۔

فَسَوّٰ هُنَّ (فَ- سَوّٰی- هُنَّ) پر۔ سنوارا، سیدھا کیا، انہیں (آسمانوں کو) سَوّٰی یُسَوِّیْ، تَسْوِیَةً (باب تفعیل) هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب (آسمانوں کے لیے یہ ضمیر استعمال ہوئی ہے) سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔ سات آسمان۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''سات آسمان'' سے یہاں کیا مراد اور ان کی شکلیں اور ان کے طول و عرض اور حدود اربعہ کیا ہیں؟ اس پر غور و خوض کا بھی کوئی حاصل نہیں، اس آیت سے جو حقیقت بیان کرنا مقصود ہے، ہمیں اسی پر اکتفا کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی زمین و آسمان کو ٹھیک ٹھاک طریقہ سے بنایا اور یہ بات بھی اس معاملہ پر حیرت و اِستعجاب کے اظہار کے ذیل میں کہی گئی ہے کہ لوگ اس رب کائنات کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کر رہے ہیں جو سب کا خالق ہے، نگران ہے، کائنات کا مقتدر اعلیٰ و فرماں روا ہے، جس نے زمین اور

زمین کی تمام چیزوں کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور آسمانوں کو اس انداز سے بنایا ہے کہ زمین پر زندگی ممکن بھی ہوئی اور راحت بخش بھی!'' (فی ظلال القرآن)

﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ وَ۔اور، هُوَ۔وہ۔ بِكُلِّ (بِ۔كُلِّ) ساتھ۔ہر، شَيْءٍ، چیز، عَلِيمٌ مبالغہ کا صیغہ ہے اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ہے، وہ ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے، چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں ہے۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''جس طرح اس کا نظم اور اس کی فرماں روائی ہر شے کو عام ہے اسی طرح اس کا علم بھی ہر شے کو عام ہے! ان سب صفات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم صرف اس اللہ پر ایمان لائیں جو کائنات کا واحد خالق ہے، صرف اس رب کی بندگی کریں جو کائنات کا یکتا و تنہا مدبر و منتظم ہے اور صرف اسی کی اطاعت کا دم بھریں جو سب کا رازق، داتا، محسن و منعم ہے کہ یہی اس کے احسانات کے اعتراف اور اس کے شکر کا صحیح طریقہ ہے!''

(فی ظلال القرآن)

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) یہ کائنات اور اس کی تمام اشیاء کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے بنایا ہے اور انسان کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔

۲) اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات بے شمار اور لامحدود ہیں، جسم و جان اور اس کے لیے مادی و دنیاوی انعامات کے علاوہ علمی اور روحانی نعمتوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟

۳) اس کائنات کی تخلیق میں تدبیر اور حکیمانہ طریق کار فرما ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ، قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَآءَ ، وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ، قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۳۰)	''اور (یاد کرو) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا ''یقیناً میں زمین پر ایک نائب (خلیفہ) بنانے والا ہوں'' وہ کہنے لگے ''کیا تو زمین میں ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو زمین پر فساد مچائے اور خون بہائے جبکہ ہم تیری حمد وثنا کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں'' اللہ نے جواب دیا ''جو کچھ میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے ہو۔''

وَ- اور، اِذْ ظرف زمانی ہے، جب (Shows time) یعنی وَاذْکُرْ یَا مُحَمَّدَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلَائِکَةِ، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اس وقت کو یاد کیجئے جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا۔

مَلَائِکَةُ (فرشتے) مفرد مَلَکٌ ہے اور وہ الوک سے ہے جس کا معنی پیامبری یا پیغام رسانی کے ہیں، اردو میں انہیں کو فرشتہ کہتے ہیں۔ ان کی لا انتہا تعداد اللہ ہی کے علم میں ہے، وجود میں انسان پر تقدم زمانی رکھتے ہیں سرشت معصومانہ ہوتی ہے یعنی بدی کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں، خالق کے خالص فرمانبردار خادم ہوتے ہیں، مخلوق، محکوم بندے ہوتے ہیں، ایسے ہی جیسے کہ انسان اللہ کے بندے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِکَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ، وَمَنْ یَّسْتَنْکِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ یَسْتَکْبِرْ فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا (النساء۴:۱۷۲) ''مسیح اس بات میں عار نہیں سمجھتے کہ وہ اللہ کا بندہ ہو کر رہیں اور نہ مقرب فرشتے عار سمجھتے ہیں اور جو شخص اس کی بندگی میں عار سمجھے اور تکبر کرے تو اللہ ان سب کو عنقریب اپنے ہاں اکٹھا کرے گا''۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (التحریم۶۶:۶)

''اللہ تعالیٰ انہیں جو حکم دے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کچھ کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے''۔

اِنِّیْ (بے شک میں) جَاعِلٌ (جَعَلَ یَجْعَلُ) سے اسم فاعل (بنانا) بے شک میں بنانے والا ہوں،

فِیْ (میں) حروف جارہ میں سے ہے جو بعد والے اسم کو عام طور پر زیر دیتے ہیں، اَلْاَرْضِ (زمین) خَلِیْفَۃً ، خلف سے مشتق ہے (خَلَفَ یَخْلِفُ خَلْفًا) اس کے معنی پیچھے آنے اور (خَلَفَ یَخْلُفُ خِلَافَۃً) جانشین ہونا، قائم مقام ہونا اور خلافت کے معنی، نیابت کے ہیں اور اس کی انجام دہی کرنے والا خلیفہ (a trustee) کہلاتا ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''خلیفہ: وہ جو کسی کی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے، خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے، اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں، وہ اپنی منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے، اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کی منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

مولانا عبدالماجدؒ دریابادی لکھتے ہیں:

اللہ اللہ! خاک کے پتلے کا یہ شرف و مرتبہ! اللہ کی مخلوق تو اس وقت تک بھی بے شمار تھی، اب ان میں انسان نامی محض ایک نئی صنف کا اضافہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ اللہ کا نائب زمین میں پیدا کیا جا رہا ہے بعض اہل تحقیق نے یہیں سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ تخلیق تو ساری ہی موجودات کی ہوئی۔ جنّات کی بھی اور ملائکہ کی بھی، جنت کی بھی اور عرش کی بھی لیکن اور کسی کے بھی قصد تخلیق کے ذکر کا اہتمام قرآن مجید نے نہیں کیا ہے یہ فخر صرف خلقت آدمؑ کے حصہ میں آیا ہے اور یہ دلیل ہے آدم کی افضلیت و اشرفیت کی۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾

وہ کہنے لگے ''کیا تو زمین میں ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو زمین پر فساد مچائے اور خون بہائے۔

أ- کلمہ استفہام (Interrogative)، مَنْ (جو) یُفْسِدُ (اَفْسَدَ یُفْسِدُ، اِفْسَادًا) الفَسَادُ ضِدُّ الصّلاح بگاڑ خرابی (Disturbance, Disorder)، اس مقام پر خلیفہ سے مراد صرف آدم علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد جنس آدم ہے اور خلافت ارضی بھی انسان کو بخشی گئی ہے اور فرشتوں کا یہ قول

ازراہِ اعتراض یا گستاخی نہ تھا بلکہ یہ قول تمام تر وفورِ نیازمندی، اقرارِ وفاداری اور جوشِ جاں نثاری کا نتیجہ تھا، ظاہر ہے کہ فرشتوں میں نافرمانی کا تو ادنیٰ سا بھی عنصر نہیں ہے، انہوں نے انسان کے وجود سے، کہ وہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے مرکب ہے، اندازہ لگایا۔

وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (سَفَكَ يَسْفِكُ سَفْكًا) خون بہانا (to shed blood) الدِّمَآءَ، (خون) اس کا مفرد 'دَم' ہے۔

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾

اور ہم تیری حمد وثنا کے ساتھ تسبیح وتقدیس کرتے ہیں۔

وَنَحْنُ، ضمیر جمع متکلم (اور ہم سب) نُسَبِّحُ (سَبَّح يُسَبِّحُ، تَسْبِيْحًا) باب تفعیل ہے، اللہ تعالیٰ کو تمام عیوب سے پاک قرار دینا، نُقَدِّسُ، (قَدَّسَ، يُقَدِّسُ، تَقْدِيْسًا) باب تفعیل (ماحول کو اللہ کی نافرمانی سے پاک وصاف رکھنا) یعنی ہماری زبانیں صرف تیری حمد وثنا کے گیت گاتی ہیں اور ہم بھی صرف تیری اطاعت وفرمانبرداری کا دم بھرتے ہیں۔

﴿قَالَ اِنِّی اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

اللہ نے جواب دیا ''جو کچھ میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے ہو۔''

قَالَ (فرمایا) اِنِّیْ (بے شک میں) اَعْلَمُ (ع ل م) عَلِمَ يَعْلَمُ (جاننا) اَعْلَمُ- زیادہ جانتا ہوں، یعنی میرا علم تمام کائنات پر محیط ہے اور میری حکمت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا ہے، ما (جو) لا (نہیں) تعلمون (تم جانتے ہو)۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اس آیہ مبارکہ سے یہ حکمت وبصیرت ملتی ہے کہ اس کائنات میں انسان کا مرتبہ ومقام یقیناً دوسری مخلوقات پر بلند ہے جبکہ وہ خلافت ارضی کا حق ادا کرے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو وہ سب سے کمتر بلکہ ذلیل ترین بن جاتا ہے، قرآن حکیم اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ○ (التین ۹۵:۴،۵)

''ہم نے ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا (شکل وصورت، علم وعمل میں سب سے بلند تر) پھر (اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے) اسے ادنیٰ ترین درجہ میں لوٹا دیا''۔

۲- زندگی کا مقصد عبادت وریاضت سے بڑھ کر اس کائنات میں رب کائنات کے نظام کو جاری وساری کرنا ہے، حقیقت میں عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ تمام نظام ہائے حیات احکام الٰہی کے مطابق ہو جائیں۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ(۳۱) قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ(۳۲)	''اور اللہ نے آدمؑ کو تمام (موجودات) کے نام سکھلا دیے پھر ان (موجودات) کو فرشتوں پر پیش کر کے ان سے کہا کہ ''اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتلاؤ، فرشتے کہنے لگے ''تو ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے، ہم لاعلم ہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھلایا ہے، بے شک تو بے پناہ علم رکھنے والا ہے (اور ہر بات کی) حکمت سے باخبر ہے۔''

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ اور (اللہ نے) آدم کو تمام موجودات کے نام سکھا دیے۔

وَعَلَّمَ (ع ل م) عَلَّمَ يُعَلِّمُ، تَعْلِيْمًا باب تفعیل، فعل ماضی اہتمام سے سکھلانا، حقیقت میں علم کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: "اِدْرَاكُ الشَّيْءِ بِحَقِيْقَتِهٖ" کسی چیز کی حقیقت کو جاننا، وَالْعِلْمُ. اَلْيَقِيْنُ، علم کا مطلب یقین کا حاصل ہونا ہے، وَالْعِلْمُ نُوْرٌ، يَقْذِفُهُ اللّٰهُ فِيْ قَلْبِ مَنْ يُّحِبُّ. علم روشنی ہے اللہ جسے پسند فرماتا ہے اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ وَالْعِلْمُ. اَلْمَعْرِفَةُ، علم معرفت کا نام ہے۔ (المعجم الوسیط)

اٰدم. ابوالبشر آدم علیہ السلام، یہ ادیم الارض سے مشتق ہے اور ان کا نام آدم اس لیے رکھا گیا کہ ان

کے جسم کو بھی اَدِیْمُ الْاَرْضِ یعنی روئے زمین کی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔(مفردات القرآن)الاسماء، اسم کی جمع ہے(بہت سے نام)اس کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے:اَلْاِسْمُ مَایُعْرَفُ بِہٖ ذَاتُ الشَّیءِ جس سے کسی چیز کی ذات کو پہنچانا جائے اسے اسم کہتے ہیں(مفردات القرآن)کُلَّھَا. سب کے سب یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کے نام اور ان کے خواص سے آگاہ فرمادیا تا کہ انسان کی اعلیٰ صلاحیت اور منصب خلافت الٰہی سے اس کی مناسبت، فرشتوں پر بھی ظاہر ہوجائے۔

﴿ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰئِکَةِ﴾ پھران(موجودات)کوفرشتوں پر پیش کیا۔

ثُمَّ پھر(عَرَضَ. ھُمْ)پیش کیا، انہیں (عَرَضَ، یَعْرِضُ، عَرْضًا)پیش کرنا، سامنے لانا، علیٰ پر ملائکة مَلَکٌ کی جمع ہے(فرشتے)۔

''عَرَضَھُمْ. سوال یہ ہے کہ کیا چیز اب فرشتوں کے سامنے پیش کی جارہی ہے؟ اگر چیزوں کے محض نام مراد ہوتے تو لفظ قرآنی محض عَرَضَھَا ہوتا، ضمیر ھُمْ ذوی العقول(عقل مند)کے لیے اور غیر ذوالعقول (غیر عقل مند)ضمناً اور طبعاً اس میں شامل ہوجائیں گے، یہ دلیل ہے اس پر کہ پیش صرف نام نہیں ہورہے تھے بلکہ اصل موجودات، گویا پہلے صورت مثالی سے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام مخلوقات کے نام اور خواص سے اطلاع بخشی گئی۔ پھر خود ان مخلوقات وموجودات کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا۔''(تفسیر ماجدی)

﴿فَقَالَ اَنْبِئُوْنِی بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَاءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾

پھر فرمایا اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتلاؤ۔

فَقَالَ(ف. قال)پس کہا اَنْبِئُوْنِی (ن ب ء) اَنْبَأً یُنْبِیُٔ اِنْبَاءً (باب افعال) سے فعل امر اَنْبِئُوْا (بتلاؤ) اَنْبِئُوْنِی (جمع کا صیغہ) تم مجھے بتلاؤ، بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَاءِ: ھٰٓؤُلَاءِ، اسم اشارہ، یہ چیزیں ان چیزوں کے نام، ان اگر کنتم (تم سب ہو)صادقین (جمع)مفرد صادق (سچا)یعنی اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ان اشیاء کی حقیقت بتاؤ۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''ہم آج بصیرت کی آنکھ سے اس منظر کی کچھ جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں جس کا فرشتوں نے ملأ اعلیٰ میں مشاہدہ کیا، ہم اس عظیم رحمان ورحیم کے راز کو، جسے اس نے انسان کو خلافت ارضی کی کنجیاں سونپتے وقت

ودیعت فرمایا تھا، کچھ کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ چیزوں کے نام رکھنے کے رمز پر انسانی قدرت کا راز! اشخاص اور اشیاء ایسے ناموں سے مسمی کرنے کا راز، جو ان اشخاص اور اشیا کے لیے علامت و رمز ہوں اور جو زبان سے بولے جانے والے الفاظ ہوں، یہ چیز زمین پر انسان کی زندگی میں بہت زیادہ قدر و قیمت کی حامل ہے! اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہم اس وقت کر سکتے ہیں جب ہم یہ سوچیں کہ اگر انسان میں چیزوں کا نام رکھنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو کتنی زیادہ دشواری ہوتی! اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے میں کتنی زحمت پیش آتی، ہر شخص جو دوسرے شخص کو کسی چیز کے بارے میں کچھ بتانا اور سمجھانا چاہتا وہ اس کا محتاج ہوتا کہ خود اس چیز کو اس کے سامنے حاضر کرے! مثلاً کھجور کے درخت کے بارے میں کسی سے کچھ کہنا ہوتا تو کھجور کا درخت اس کے سامنے لانا ہوتا! پہاڑ کے بارے میں کچھ بتانا ہوتا تو خود پہاڑ کے پاس جانا ہوتا! کسی شخص کے متعلق کوئی بات بتانی ہوتی تو اس وقت تک بات کو سمجھنا ممکن نہ ہوتا جب تک کہ اس شخص کو بلا نہ لیا جاتا کتنی بڑی مشقت تھی جس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ زندگی اپنے راستے پر رواں دواں نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ انسان کے اندر چیزوں کے نام رکھنے کی صلاحیت ودیعت نہ کرتا، فرشتے اس صلاحیت کے ضرورت مند نہ تھے انہیں اپنے فرائض ادا کرنے کے سلسلے میں اس صلاحیت کی ضرورت و حاجت نہ تھی، اس لیے انہوں نے اپنی بے بسی اور عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے رب کی تسبیح و تقدیس کی۔ (فی ظلال القرآن)

﴿قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا، اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ﴾

فرشتوں نے کہا: تو ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے، ہم لاعلم ہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھلایا ہے، بے شک تو بے پناہ علم رکھنے والا ہے (اور ہر بات کی) حکمت سے باخبر ہے۔

قَالُوْا. ان سب نے کہا، سبحانک (سبحان. ک) پاک ہے تو۔ نُسَبِّحُ سُبْحَانَکَ، مفعول مطلق (ہم تجھے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک قرار دیتے ہیں) فرشتوں نے کہا کہ اے اللہ! تو ہر عیب اور ہر نقص سے پاک اور منزہ ہے، ہمارا علم تو بالکل محدود ہے اور اتنا ہی ہے جتنا تو نے ہمیں عطا کیا ہے تو اَلْعَلِیْم (بے پناہ علم رکھنے والا ہے اور) اَلْحَکِیْم (تیرا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں) ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انسان کے پاس جو علم ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ انسان کا ذاتی کمال نہیں۔

۲) ہر چیز کے مقصد وجود کی حکمت کو اللہ تعالیٰ جاننا مخلوق کو اس کا کما حقہ ادراک نہیں ہوسکتا۔ جس طرح فرشتوں کو تخلیق آدم کی غایت سمجھ نہ آسکی اور انہوں نے یہ کہہ دیا کہ انسان تو زمین میں خونریزی کرے گا۔

۳) فرشتوں کے پاس بھی ہر چیز کا علم نہیں ہے وہ بھی اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا اللہ تعالیٰ نے ان کو سکھا دیا ہے۔ ہر چیز کا علم رکھنے والی ذات اللہ تعالیٰ ہے۔

۴) اللہ تعالیٰ محض علم ہی نہیں رکھتا بلکہ ہر علم کے ساتھ حکمت بھی اس کا خاصا ہے جو ضروری نہیں کہ مخلوق میں سے بھی ہر علم رکھنے والے کو حاصل ہو۔

۵) چیزوں کے نام سکھا کر اللہ تعالیٰ نے انسان پر مہربانی فرمائی ہے ورنہ ناموں کے بغیر چیزوں کے بارے میں گفتگو کرنا بلکہ انسان کی ساری گفتگو ہی شاید ناممکن ہوجاتی۔

۶) انسان کی قدر ومنزلت صرف عبادت کے ساتھ ہی نہیں علم کے ساتھ بھی ہے اور یہ علم ہی اسے عمل کی راہ پر ڈالتا ہے۔

۷) فرشتوں کی عجز وخاکساری "سبحانک لا عِلْمَ لنا" ادب کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ، فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۳۳)	''اس (اللہ) نے فرمایا ''اے آدم! تم (اب) فرشتوں کو ان اشیاء کے ناموں سے آگاہ کرو''۔ جب آدم نے انہیں ان اشیا کے نام بتلا دیئے تو اللہ نے فرمایا ''کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ زمین و آسمان کے تمام غیب مجھ پر روشن ہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، اسے بھی میں جانتا ہوں!''

﴿قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ﴾

اس (اللہ) نے فرمایا ''اے آدم! تم (اب) فرشتوں کو ان اشیاء کے نام سے آگاہ کرو۔''

اَنۡۢبِئۡهُمۡ، تم انہیں بتلاؤ۔ فعل امر، واحد مذکر (ن ب ء) اس کا مادہ (Root Word) ہے۔ اَنۡۢبَأَ یُنۡۢبِئُ اِنۡۢبَاءً (باب افعال) خبر دینا، بتانا، (to tell-convey) بِاَسۡمَآئِهِمۡ (بِ–اَسۡمَاءِ–هُمۡ) ساتھ- نام- ان (چیزوں کے) یعنی ان اشیاء کے نام- یہاں ضمیر اشیائے کائنات اور ان کے خواص کی طرف راجع ہے، گزشتہ آیت میں جب فرشتے اظہار عجز کر چکے، تو اب آدم سے ارشاد ہوا کہ تم اپنی معلومات کا اظہار کرو۔

﴿فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ﴾

پس جب آدم نے انہیں ان (اشیاء) کے نام بتلا دیے۔

فَلَمَّا (فَ– لَمَّا) پھر جب، لَمَّا کلمہ شرط بمعنی حین۔ جب، جس وقت (when) اَنۡۢبَاَهُمۡ (اَنۡۢبَاَ–هُمۡ) بتلائے، انہیں (اشیاء کے نام اور ان کے خواص)۔

﴿قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ﴾

تو اللہ نے فرمایا۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ زمین و آسمان کے تمام غیب مجھ پر روشن ہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، اسے بھی میں خوب جانتا ہوں!

اَ کلمہ استفہام ہے لَمۡ۔ حرف جزم ہے، فعل مضارع کو ماضی منفی کے معنی میں مختص کر دیتا ہے۔ اَلَمۡ اَقُلۡ (قَالَ یَقُوۡلُ قَوۡلًا) اَقُوۡلُ فعل مضارع واحد متکلم، اَقُوۡلُ سے پہلے لَمۡ لانے سے اَقُلۡ ہو گیا اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا (Did I not tell you?) اِنِّیۡۤ (اِنَّ–یۡ) اِنَّ کلمہ تحقیق کلام۔ بے شک، ی (میں) اَعۡلَمُ (ع ل م) عَلِمَ یَعۡلَمُ (جاننا) اَعۡلَمُ فعل مضارع واحد متکلم (میں جانتا ہوں) غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ غیب سے مراد وہ اشیاء جو مخلوق کی نظر سے پوشیدہ ہوں ورنہ تو اللہ تعالیٰ کے

لیے غیب وشہود یکساں ہیں، اس کے ہاں ماضی، حال اور مستقبل سب کا سب حال ہی ہے۔

"غَیْبَ السَّمٰوٰتِ" مَاغَابَ عَنِ الْاَنْظَارِ فِی السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ زمین وآسمان میں جو بات نظروں سے پوشیدہ ہو وہ غیب کہلاتی ہے (ایسر التفاسیر)

حقیقت یہ ہے کہ غیب کا تمام علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النحل ۱۶:۷۷)

''آسمانوں اور زمین کے خفیہ حقائق کا علم اللہ ہی کو ہے''

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (الانعام ۶:۵۹)

''اور غیب کی چابیاں صرف اسی کے پاس ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

اس کی باریک بینی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ سبحان اللہ!

وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ، وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام ۶:۵۹) ''اور بحر وبر میں جو کچھ ہے اسے وہ جانتا ہے اور (درختوں) سے کوئی پتہ تک نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہی ہے جس سے وہ باخبر نہ ہو اور تر اور خشک جو کچھ بھی ہے سب کتاب مبین (لوح محفوظ) میں موجود ہے''۔

انسانی دلوں میں جو وسوسے (misdoubts) پیدا ہوتے ہیں رب کائنات ان سے بھی باخبر ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (ق ۵۰:۱۶)

''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو کچھ اس کے دل میں وسوسہ گزرتا ہے ہم تو اسے بھی جانتے ہیں''۔

﴿وَاَعْلَمُ مَاتُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ مَا، موصول، (جو) تُبْدُوْنَ (ب د و) اس کا مادہ ہے۔ اَبْدَأَ يُبْدِئُ اِبْدَاءً بابِ افعال (ظاہر کرنا) تُبْدُون۔ تم ظاہر کرتے ہو Disclose، وَمَا (اور جو) كُنْتُم تَكْتُمُوْنَ۔ تم چھپاتے ہو (Hide) ماضی استمراری كَتَمَ يَكْتُمُ كِتْمَانًا (چھپانا، پردہ ڈالنا)۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اس قصۂ آدم علیہ السلام اور تعلیم اسماء کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ علم کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور

اسی نے آدم علیہ السلام کو اشیاء کے نام وخواص بتلائے۔ظاہر ہے کہ یہ نام کسی زبان کے ذریعہ ہی سے سکھلائے گئے ہوں گے، اس لیے زبان اور لغت کا خالق بھی رب کائنات ہے۔ پھر علاقہ، ضرورت اور آب و ہوا کے اثرات سے انسان نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ فہم و بصیرت سے تبدیلیاں پیدا کر لیں۔

۲) انسان نے روز اول ہی سے رہنے سہنے، کھانے پینے، صحت وصفائی اور اخلاق ومعاملات کے اصول سیکھ لیے اور ڈارون کے اس نظریہ کی قطعی طور پر نفی ہوگئی کہ انسان نے حیوانیت سے ترقی کر کے انسانیت کا روپ اختیار کیا ہے۔

۳) آدم علیہ السلام کا فرشتوں کو اشیاء کے نام وخواص بتانا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ فرشتوں کا درجہ طالب علم کا اور آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کا مرتبہ معلم اور استاد کا ہوا۔

۴) اولاد آدم (انسان) پر لازم ہے کہ وہ اپنی حیثیت اور مقام کو پہچانے اور خلافت ارضی کے اتمام وکمال کا حق ادا کرے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ، اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۳۴)	''اور یاد کرو! جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے لیے جھک جاؤ تو سوائے ابلیس کے سب جھک گئے، اس نے تسلیم نہ کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں شامل ہوگیا۔''

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾

اور یاد کرو! جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے لیے جھک جاؤ۔

اِذْ: وقت کو ظاہر کرتا ہے۔ اُسْجُدُوْا (س ج د) سَجَدَ يَسْجُدُ، سَجْدَةً۔ سے فعل امر اُسْجُدْ۔

اور جمع کے لیے اُسْجُدُوْا۔تم سب جھک جاؤ،تعظیم بجالاؤ،لِاٰدَمَ: آدم علیہ السلام کی (تعظیم بجالاؤ)۔

لغت میں سجدہ کی تعریف یوں ہے:

الخَضُوْعُ وَ الْاِنقِیَادُ وَمِنْ اَعْظَمِ مَظَاهِرِهٖ وَضْعُ الجَبْهَةِ عَلَى التُّرَابِ (المراغی) ''لغت میں سجدہ خضوع وخشوع، عاجزی وفروتنی کا نام ہے اور ظاہری طور پر اس کی سب سے نمایاں شکل اپنی پیشانی کو خاک پر رکھ دینا ہے''۔

شریعت میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کے ارادہ سے پیشانی زمین پر رکھنا سجدہ کہلاتا ہے۔یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ سجدۂ عبادت صرف اور صرف رب کائنات، اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور کسی اور کے لیے ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔آیت میں سجدہ سے مراد عزت وتکریم ہے۔

كَانَ السُّجُوْدُ تَحِيَّةً (مدارک) ''آدم کے لیے یہ سجدہ سلام اور عزت کے طور پر تھا''۔

تَكْرُمَةً لِاٰدَمَ وَطَاعَةً لِلّٰهِ، لَا عِبَادَةً لِّآدَمَ (ابن جریر)

''یہ سجدہ آدم کی عزت وتکریم کے لیے تھا نہ کہ آدم کی عبادت کے لیے''۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

قِيْلَ لِلْمَعْنَى اللُّغَوِيِّ ولَمْ يَكُنْ فِيْهِ وَضْعُ الْجِبَاهِ بَلْ كَانَ ذٰلِكَ مُجَرَّدُ تَذَلُّلٍ وَاِنْقِيَادٍ (روح المعانی) ''یہ سجدہ لغوی معنی کے لحاظ سے تھا،اس میں پیشانی کا زمین پر رکھنا نہ تھا، یہ محض عزت واطاعت کے لیے تھا''

اس سے گویا آدمؑ اور ذریت آدمؑ کی عزت وسرفرازی مقصود تھی کہ خلافت ارضی کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا تھا،شریعت محمدیؐ سے پہلے یہ سجدہ (تعظیمی) جائز تھا چنانچہ سیدنا یوسفؑ کو دربار مصر میں اللہ تعالیٰ نے انہیں بلند مقام عطا فرمایا اور ان کے والدین اور بھائی وہاں پہنچے تو بھائی عزت کے طور پر ان کے آگے جھک گئے:وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا (یوسف۱۲:۱۰۰)''اور یوسف کے سامنے جھک گئے''۔

شریعت محمدی ﷺ نے سجدہ تعظیمی کو بھی ممنوع قرار دیا تا کہ شرک وجہالت کے رخنے ہمیشہ کے لیے بند ہوجائیں۔

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (تو سب ملائکہ جھک گئے مگر ابلیس) اِلَّا کلمہ استثنا،سوائے، اِبْلِيْس، بَلَسٌ سے ہے(اَبْلَسَ يُبْلِسُ ، اِبْلَاسًا) اس کا لفظی معنی، مایوس اور ناامید ہونا ہے۔اس نام کی مناسبت غالباً یہ

ہے کہ اس نے آدمؑ کی عزت وتکریم بجالانے میں حکم الٰہی کی نافرمانی کی اور وہاں سے نکالا اور راندا گیا، اس طرح رحمت الٰہی سے مایوس اور نامراد ہوا، ابلیس کون تھا؟ قرآن میں ہے: كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (الکھف ۱۲:۵۰) ''وہ جنوں میں سے تھا، اس نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی''۔

اس نافرمانی سے قبل عبادت وریاضت کی وجہ سے وہ ملائکہ کی صف میں شامل ہو چکا تھا اور اس وقت جب ملائکہ کو آدمؑ کی عزت وتکریم بجالانے کا حکم ہوا تو یہ وہاں موجود تھا۔ جس طرح انسان کی تخلیق خاک سے ہوئی اور وہ آگ سے بنایا گیا تھا، جس طرح انسان کا خاکی ڈھانچہ گوشت پوست سے بنا ہوا ہے اسی طرح اسکے آگ کے ڈھانچہ کی بھی کوئی شکل ہوگی۔ خاک ہمیشہ نیچے بیٹھتی ہے اور آگ کا شعلہ بلند ہوتا ہے۔ اسی بات پر غرور کرتے ہوئے اس نے کہا تھا: اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ، خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف ۷:۱۲) ''(اے رب!) میں آدمؑ سے بہتر ہوں، کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے، اور اسے خاک سے (میں بھلا اس انسان کی عزت کیسے کرسکتا ہوں؟)''

اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی نافرمانی پر اسے بارگاہ الٰہی سے نکل جانے کے آرڈر ملے:

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (الاعراف ۷:۱۳) ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نیچے اتر یہاں سے، تیرا حق نہ تھا کہ تو یہاں تکبر کرتا، تو ذلیل لوگوں سے ہے''۔

یہ ذلت اٹھانے کے بعد ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے انسانوں کو گمراہ کرنے کی تا قیامت مہلت مانگی، جو اسے دے دی گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے، اس کی مکمل حکمت سمجھنا تو ہمارے بس سے باہر ہے، تاہم یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے انسان کی آزمائش اور امتحان مقصود ہے، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی پیروی کرتے ہیں ہمیشہ اس کی مدد کا سہارا لیتے ہیں وہ ابلیس اور اس کے لشکر سے محفوظ ہو جاتے ہیں، وہ دنیا و آخرت میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور جو لوگ خواہشات نفس کا شکار ہو جاتے ہیں اور ابلیس اور اس کے لشکر کے پیچھے چلتے ہیں وہ گمراہ اور برباد ہو جاتے ہیں۔

سید قطبؒ شہید اس سلسلہ میں بڑی خوبصورت بات لکھتے ہیں:

''اب دائمی جنگ کا میدان کھل کر سامنے آ گیا۔ شر کی مجسم مخلوق ابلیس اور خلیفۃ اللہ فی الارض انسان کے مابین جنگ کا میدان! وہ جنگ جو انسانی ضمیر میں مسلسل جاری رہتی ہے اس جنگ میں خیر کو اس حد تک

کامیابی ملتی ہے جس حد تک انسان اپنے ارادے اور اپنے رب سے کئے ہوئے عہد کو مضبوطی سے تھامتا ہے اور شر کو اس قدر کامیابی ہوتی ہے جس حد تک انسان اپنے آپ کو خواہشات کے حوالے کرتا اور اپنے رب سے دور ہوتا ہے۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ كَانَ بمعنی صَارَ (ابلیس) ہوا۔ مِنْ۔ سے، کافر کی جمع کافرین۔ انکار کرنے والے، حکم عدولی کرنے والے، اور ابلیس انکار کرنے والوں میں سے ہوا۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) آدمؑ اور اس کی ذریت کا فرشتوں اور جنوں پر شرف ثابت ہوتا ہے مگر یہ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک وہ رب کائنات کی بندگی اور اطاعت کا دم بھرتے رہیں۔

۲) تکبر اور حسد سے بچو کہ یہی ابلیس کی تباہی و بربادی کا سامان ہوئے

تکبر عزازیل را خوار کرد
بزندانِ لعنت گرفتار کرد

''تکبر نے شیطان کو ذلیل وخوار کیا اور اسے لعنت کے قید خانہ میں (ہمیشہ کے لیے) گرفتار کر دیا۔''

۳) ابلیس سے ہمیشہ دشمنی رکھو کہ وہ اللہ کی نافرمانی سے ناکام ونامراد ہوا۔

۴) نافرمانی سے بچو کہ وہ بالآخر کفر تک پہنچا دیتی ہے۔

۵) انسان خواہ کتنا ہی عبادت گزار ہو جائے پھر بھی اسے عاجز وخاکسار ہی رہنا چاہیے، جونہی غرور اور تکبر پیدا ہوتا ہے تو اس کی عبادت ضائع ہو جاتی ہے۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا، وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۳۵) فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ، وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَّلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۳۶)	''پھر ہم نے کہا: اے آدمؑ! تم اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو سہو اور جہاں چاہو جی بھر کے کھاؤ پیئو البتہ اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ تم دونوں ظالموں میں شمار ہو گے، آخر کار شیطان نے ان دونوں کو پھسلایا اور جس (عیش و آرام) میں وہ تھے، انہیں وہاں سے نکلوا دیا، تب ہم نے کہا، تم سب یہاں سے نکل جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں رہنا سہنا اور گزر بسر کرنا ہوگا۔''

﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا﴾

پھر ہم نے کہا: اے آدمؑ! تم اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو سہو اور جہاں چاہو جی بھر کے کھاؤ پیئو۔

وقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ-- قُلْنَا فعل ماضی، جمع متکلم، ہم نے کہا (قَالَ يَقُوْلُ، قَوْلًا) اُسْكُنْ ،فعل امر، واحد مذکر حاضر، رہو، سکونت اختیار کرو (سَكَنَ يَسْكُنُ، سَكَنًا) اَنْتَ، ضمیر واحد مخاطب (تو) خطاب حضرت آدم علیہ السلام سے ہو رہا ہے اور حکم رب کریم سے مل رہا ہے۔ زَوْجُكَ (ز و ج ک) اے آدم! تو اور تیری بیوی رہو۔ اَلْجَنَّةَ، ایسا باغ جس کے درخت زمین کو چھپالیں اس کی جمع جنات ہے۔ وَكُلَا، فعل امر تثنیہ مذکر (تم دونوں کھاؤ) اَكَلَ يَأْكُلُ، أَكْلًا- مِنْهَا (مِنْ-هَا) سے، ھا کی ضمیر جنت کی طرف ہے۔ رَغَدًا (ر غ د) رَغِدَ يَرْغَدُ سے مصدر رَغَدًا اور اسم صفت بھی ہے یعنی بغیر کسی فکر کے کھانا (eat freely to your fill) حَيْثُ ،ظرف مکان (جہاں سے) شِئْتُمَا (ش ی ء) شَاءَ يَشَاءُ- چاہنا پسند کرنا، شِئْتُمَا تثنیہ مخاطب کا صیغہ ہے، تم دونوں چاہو، ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ وَلَا تَقْرَبَا اور تم دونوں قریب بھی نہ جانا، قَرِبَ يَقْرَبُ اور قَرُبَ يَقْرُبُ، قُرْبًا فعل

نہی، تثنیہ حاضر۔تم دونوں قریب نہ جانا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (اس درخت کے) شجرہ نباتات میں سے ایسا پودا ہے جس کا تنا (Trunk) ہو، اس سے مراد کونسا درخت ہے؟ قرآن وحدیث میں اس کی تصریح موجود نہیں ہے۔

﴿فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ فَتَكُوْنَا (كَانَ يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، تكونا مضارع تثنیہ مخاطب، ف کے معنی (پس) تم دونوں ہو جاؤ گے مِنْ، سے ظَالِمٌ کی جمع ظَالِمُوْنَ اور مِنْ کی وجہ سے ظَالِمِيْنَ پڑھا جائے گا، اور کسی چیز کا محلِ اصلی پر نہ رکھنا ظلم کہلاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی بجائے نافرمانی پر ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

''قرآن حکیم، انسانی خلافت، انسانی علم کے بعد پہلے انسان کے لیے جو جگہ تجویز فرماتا ہے، وہ جنت ہے یعنی رضائے الٰہی کا آخری مظہر، یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان کی اصل جگہ جنت ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ بارگاہ رحمت وفیض میں عیش وخلود کی زندگی بسر کرے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے کہ تم یہیں رہو، مگر اس درخت کو استعمال میں نہ لانا ورنہ رحمت الٰہی سے دور ہو جاؤ گے اور تمہیں کچھ عرصے کے لیے اپنے اصلی مقام سے الگ رہنا پڑے گا۔

یہ قید اس لیے لگادی تا کہ آدم علیہ السلام کو معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ بعض افعال کے ارتکاب سے ناراض ہو جاتا ہے، اس کا خیال رہے، یہی مطلب ہے اس حدیث کا۔ اِنَّ الْجَنَّةَ حُفَّتْ بِالْمَكَارِهِ ''کہ جنت میں آدمی ابتلاء وآزمائش میں پورا اترنے کے بعد جا سکتا ہے،'' ان سب آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کا جو مرتبہ قرآن نے بیان کیا ہے وہ دنیا کی کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے، قرآن کہتا ہے پہلا انسان اللہ کا نائب ہے، اشیاء وحقائق کا عالم ہے، مکین جنت وفردوس ہے اور ساری کائنات کا مرکز مقصود ہے اور فرشتوں کا مسجود ہے''۔ (تفسیر سراج البیان)

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''آدم اور حوّا۔ دونوں کے لیے تمام پھل مباح (جائز) کر دیئے گئے، بجز ایک درخت کے، زمین کی زندگی میں انسان کیلئے جو چیزیں لازماً ممنوع ہونے والی تھیں، یہ درخت ان کیلئے ایک رمز (نشان) کی حیثیت رکھتا ہے! کسی ممنوع چیز کے سامنے آئے بغیر انسانی ارادہ کا اثبات نہیں ہوتا، نہ صاحب ارادہ انسان جانور سے ممتاز ہوتا ہے جسے ہنکایا جاتا ہے، نہ ایفائے عہد اور شرط کی پابندی کرنے کے سلسلہ میں اس کے صبر کا امتحان

ہوتا ہے، ارادہ ہی انسان اور حیوان کے درمیان فرق اور امتیاز پیدا کرتا ہے، اس طرح کے عزم وارادہ کے بغیر جو لوگ دنیا کی نعمتوں سے متمتع ہوتے ہیں وہ حیوانات کی دنیا کے ہیں، خواہ ان کی شکلیں آدمیوں جیسی ہوں''۔

(فی ظلال القرآن)

﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا﴾ (فَ- اَزَلَّ- هُمَا) پس، پھسلایا۔ ان دونوں کو اَزَلَّ یُزِلُّ اِزْلَالٌ باب افعال (زل ل) ڈگمگانا پھسلانا امام راغب لکھتے ہیں: اَلزِّلَّةُ فِی الْاَصْلِ اِسْتِرْسَالُ الرِّجْلِ مِنْ غَيْرِ قَصْدٍ یعنی بغیر قصد وارادہ کے پاؤں کی لغزش (مفردات القرآن) شیطن کا مادہ شطن ہے، اس کے معنی دور ہونا، خیر ورحمت سے دوری کے سبب اسے شیطان کہا گیا ہے، اس کا بڑا (ring leader) تو یقیناً ابلیس ہے، اس کے علاوہ جنوں اور انسانوں میں سے بے شمار ساتھی اس نے بنا لیے ہیں، وہ بذات خود جنوں میں سے ہے، عَنْهَا، عَنِ الشَّجَرَةِ، درخت سے بہکایا، اس طرح سبز باغ دکھاتے ہوئے وہ آدمؑ سے مخاطب ہوا۔ قرآن حکیم میں ہے:

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (طٰہٰ ۲۰:۱۲۰) ''پھر شیطان نے آدمؑ کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا'' آدمؑ! میں تمہیں وہ ابدی زندگی اور لازوال سلطنت کا درخت نہ بتاؤں''۔

﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ (فَ-اَخْرَجَ-هُمَا) پس۔ نکال دیا ان دونوں کو اَخْرَجَ یُخْرِجُ اِخْرَاجًا باب افعال (نکالنا) مِمَّا (مِنْ-مَّا) سے، جو کانا (وہ دونوں تھے) جس میں کہ وہ دونوں تھے، یعنی آدم وحوا عزت وتکریم کی جگہ سے نکالے گئے یعنی جنت سے زمین پر بھیجے گئے، ﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ اِهْبِطُوْا (ہ ب ط) هَبَطَ يَهْبِطُ هَبُوْطًا- امام راغبؒ لکھتے ہیں: هبوط کے معنی بے اختیاری کی حالت میں نیچے آنے کے ہیں۔ (مفردات القرآن) بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو یعنی شیطان تمہارا ازلی دشمن ہے اور تم بھی اس کے ساتھ دشمنی کرو۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا (فاطر ۳۵:۶)

''شیطان یقیناً تمہارا دشمن ہے، لہٰذا تم اسے دشمن ہی سمجھو''

﴿وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾ وَلَكُمْ اور تمہارے لئے، فِی الْاَرْضِ

زمین میں ہے۔ مُسْتَقَرٌّ (اِسْتَقَرَّ یَسْتَقِرُّ، اِسْتِقْرَارًا) ٹھہرنا، مُسْتَقَرٌّ۔ قرار گاہ، ٹھکانہ وَمَتَاعٌ، اَلْاِنْتِفَاعُ، فائدہ حاصل کرنا۔اِلٰی حِیْنٍ ایک مدت تک یعنی جب تک اللہ تعالیٰ نے تمہاری زندگی زمین پر لکھی ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) انسان کا اصلی مقام جنت ہے۔ یہ دنیا عارضی اور دارالعمل ہے اور وہ صرف اچھے اعمال ہی سے اپنی جنت بنا سکتا ہے:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

۲) انسان کو ایسے اعمال سے بچنا لازم ہے جو خالق و مالک کی ناراضی کا سبب ہوں گویا کہ ان کی حیثیت شجر ممنوعہ کی سی ہے۔

۳) شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے اور وہ نت نئے بہانوں اور طریقوں سے انسان کو بہکاتا اور پھسلاتا رہتا ہے بلکہ اس نے اپنے ساتھیوں کا (انسانوں اور جنوں میں سے) اچھا خاصا لشکر تیار کر لیا ہے جس کے افراد ہمہ وقت دشمنیوں پر مامور ہیں۔ لہٰذا تم بھی ان سے دشمنی رکھو۔

(۴) ہمارے لیے مشعل راہ صرف ہدایتِ ربانی ہے اور رب کائنات کی مدد کا سہارا لے کر ہی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیۡہِ، اِنَّہٗ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ (۳۷)	''پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی تو اللہ نے توبہ قبول فرمالی، بلاشبہ وہ توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے۔''

فَتَلَقّٰی (فَ–تَلَقّٰی) پس۔سیکھ لئے، تلَقّٰی ماضی واحد مذکر غائب اس کا مادہ (Root word) (ل

ق ی) ہے تَلَقّٰی یَتَلَقّٰی (بابِ تفعل) ہے، سیکھنا، حاصل کرنا (to learn) مِنْ (سے) حروف جارہ میں سے ہے جو اپنے بعد والے اسم کو عموماً زیر دیتے ہیں۔ رَبِّہٖ، مِنْ کی وجہ سے رَبِّہٖ پڑھا جارہا ہے، ربّ، اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ہے، پروردگار، پالنہار، ہر چیز کو پیدا کرنے والا، نہ صرف پیدا کرتا ہے بلکہ زندگی کا سروسامان بھی کرتا ہے، حفاظت اور نگرانی کرتا ہے، رہبری اور رہنمائی فرماتا ہے اور ہر شے کو اس کی حد کمال تک پہنچاتا ہے۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں: ''اَلرَّبُّ فِی الْاَصْلِ التَّرْبِیَّۃُ وَھُوَ اِنْشَاءُ الشَّیءِ حَالًا فَحَالًا اِلٰی حَدِّ التَّمَامِ'' (مفردات القرآن) ''اَلرَّبُّ کے اصل معنی تربیت کرنا یعنی کسی چیز کو تدریجاً نشوونما دے کر حد کمال تک پہنچانا کے ہیں'' اردو زبان میں اس کیلئے موزوں لفظ مربی ہے، اگر کوئی بندہ اس وسیع و عریض پھیلی ہوئی کائنات پر غور وفکر کرے تو ہر طرف رب العالمین کی کرشمہ سازیاں نظر آئینگی۔ کیا خوب کسی عرب شاعر نے کہا ہے

وَ فِیْ کُلِّ شَیءٍ لَّہٗ اٰیَۃٌ
تَدُلُّ عَلٰی اَنَّہٗ وَاحِدٌ
کائنات کی ہر چیز میں اس کی کاریگری عیاں ہے
اور اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ وہ یکتا ہے

کَلِمٰتٍ: کَلِمَہ اس کا مفرد ہے، وہ کونسے کلمات تھے جو آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے سیکھے؟ مفسرین نے لکھا ہے: اَیْ اَلْھَمَہُ اللّٰہُ اِیَّاھَا فَاَنَابَ اِلَیْہِ بِھَا وَھِیَ کَمَا فِیْ سُورَۃِ الْاَعْرَافِ ''یعنی وہ کلمات جو آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے الہام کیے اور جن سے اس کی توبہ قبول فرمائی، وہ سورۃ اعراف کی اس آیہ مبارکہ کے ہیں:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَاسکتہ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (الاعراف ۷:۲۳) ''اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا، اگر تو ہمیں معاف نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ فرمائے گا تو یقیناً ہم نقصان اٹھائیں گے''۔

فَتَابَ عَلَیْہِ (تَابَ یَتُوْبُ تَوْبَۃً) اظہار ندامت اور معافی طلب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا، فَتَابَ عَلَیْہِ: اَیْ قَبِلَ تَوْبَتَہٗ مِنْہُ (مفردات القرآن) اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کر لی، یہاں پر آدم کے ساتھ ان کی زوجہ کا ذکر نہیں ہے اس لیے کہ مرد متبوع اور زوجہ اس کی تابع ہے اور یہ عربی

بلاغت کا نمونہ ہے، ﴿اِنَّه هُوَ التَوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ اِنَّهُ هُوَ، بے شک وہی تو ہے التّواب- اللہ کا صفاتی نام ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ کثرت سے قبول کرتا رہتا ہے اس لیے اسے توّاب کہا جاتا ہے (مفردات القرآن) الرّحیم- یہ بھی اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے اس کی رحمت ہمیشہ جاری وساری رہتی ہے، نہ صرف اپنے بندوں کی بے حد وحساب توبہ قبول کرتا ہے بلکہ انہیں اپنے سایۂ رحمت میں بھی ڈھانپ لیتا ہے۔ سبحان اللہ!

مولانا محمد حنیف ندویؒ لفظ توبہ پر لکھتے ہیں:

التَّوبَة - گناہ پر نادم و پشیمان ہونا اور اس کے نتیجے میں اللہ کی جانب رجوع ہونا تَابَ - گناہ سے باز آیا اور نیکیوں کی طرف لپکا، توبہ کا صلہ اگر حرف اِلیٰ ہو تو اس کے معنی انابت یعنی اللہ کی طرف لوٹنے کے ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا (النور۲۴:۳۱) ''اور تم سب اللہ کی طرف لوٹو (رجوع کرو)''۔

اور اگر لفظ تَابَ کا فاعل اللہ ہو تو اس کے معنی ''اللہ تعالیٰ کے کرم و بخشش کی ارزانیاں ہوتے ہیں۔''

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ (التوبہ۹:۱۱۷) ''بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے نبی پر اور مہاجرین وانصار پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی۔'' انہی معنوں میں اللہ تعالیٰ توّاب ہے یعنی اس کا کوئی بندہ جب گناہ کی زندگی کو ترک کر کے اللہ کی جانب بڑھتا ہے اور نیکیوں کو اپنا لینے کا قصد کرتا ہے تو اللہ کی رحمتیں جوش میں آجاتی ہیں اور اس کی قدم قدم پر رہنمائی کرتی ہیں۔

گناہ کا اسلامی تصور بنیادی طور پر یہودیوں سے مختلف ہے اسلامی نقطہ نظر سے گناہ کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ ایک انسان صحیح راہ سے بھٹک گیا، لیکن جونہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس کے قدم دوبارہ صحیح راہ پر پڑ گئے۔ اس کا تعلق یکسر فکر و ذہن کی لغزش سے ہے جس کی تلافی ہر وقت ممکن ہے، گناہ ہرگز ایسی چیز نہیں جو انسان سے چپک جائے اور اس سے کسی طرح بھی خلاصی حاصل نہ کی جا سکے، اور قیامت تک نوع انسانی اس کی اذیتوں اور نتائج سے دوچار ہوتی رہے، اسلامی تعلیم یہ ہے کہ گناہ بہر حال قابل عَفْو ہے، توبہ شرط ہے، اگر ایک مسلمان گناہ کی برائیوں کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے، اسے ترک کر دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں نیکیوں کو اختیار کرنے کا تہیہ کر لیتا ہے تو گناہ اپنے تمام اثرات بد کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، یہی مطلب ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا: اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ ''کہ گناہ

سے توبہ کر لینے والا ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے سرے سے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔'' (لسان القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) بھول اور خطا انسانی سرشت میں ہے۔

۲) اچھے انسان وہ ہوتے ہیں جنہیں اپنی غلطیوں اور خطاؤں کا احساس ہو جائے اور وہ اپنے رب کے حضور ندامت کے آنسو بہا کر سچی توبہ کر لیں۔

۳) رب کی شانِ کریمی ہے کہ وہ صدق دل سے توبہ کرنے والوں کو معاف فرما دیتا ہے، نہ صرف معاف فرما دیتا ہے بلکہ انہیں اپنی بے پایاں رحمتوں اور شفقتوں سے نوازتا ہے۔ التّواب کے ساتھ الرّحیم بھی اس کی صفت ہے۔

۴) توبہ کا راستہ دکھانا اُس کی شان ربوبیت ہے ''فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ'' کے الفاظ میں اس طرف اشارہ ہے۔

قُـلْـنَا اهْـبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا، فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۳۸)	''ہم نے کہا تم سب یہاں (جنت) سے نیچے (زمین پر) اتر جاؤ، پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے، تو جو کوئی میری ہدایت کا اتباع کرے گا تو ایسے لوگوں کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

قُلْنَا (ق و ل) قَالَ يَقُوْلُ ، قَوْلًا، قُلْنَا ہم نے کہا، فعل ماضی صیغہ جمع متکلم، اللہ تعالیٰ واحد ہے اور اس کے لیے جمع کا صیغہ عزت وعظمت کے لیے استعمال ہوا ہے، یہ عربی زبان کا قاعدہ ہے۔ اِهْبِطُوْا، تم سب اترو فعل امر (هَبَطَ يَهْبِطُ هَبْطًا) مِنَ الجَبَلِ پہاڑ سے اُترانا (مِصْبَاحُ اللُّغَاتِ) اَلْهَبُوْطُ، اَلْاِنْحِدَارُ عَلٰى سَبِيْلِ الْقَهْرِ كَهُبُوْطِ الحَجَرِ، اَلْهَبُوْطُ کے معنی کسی چیز کے بے اختیاری کی حالت میں

نیچے اترنے کے ہیں جیسا کہ پتھر بلندی سے نیچے گر پڑتا ہے (مفردات القرآن) مِنۡهَا (مِنۡ–هَا) سے، اس سے، یعنی جنت سے (اے اولاد آدم) اِهۡبِطُوۡا جَمِيۡعًا، تم سب جنت سے اتر جاؤ، مراد ذریت آدم ہے، وَالۡمُرَادُ الذُّرِيَّةُ (ابن کثیر) مِنهَا میں ضمیر جنت کی طرف ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''جنت سے زمین پر اترنے کا حکم اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے اس جگہ اس کو مکرر لانے میں غالباً حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین پر اتارنے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا، اس لیے اس کے ساتھ انسانوں کی باہمی عداوت کا بھی ذکر کیا گیا (نیز شیطان اور انسان کی آپس میں دشمنی کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے) یہاں زمین پر اتارنے کا ذکر ایک خاص مقصد خلافتِ الٰہیہ کی تکمیل کے لیے اعزاز کے ساتھ ہے۔ اسی لیے اس کے ساتھ ہدایت بھیجنے کا ذکر ہے جو خلافتِ الٰہیہ کے فرائض منصبی میں سے ہے اس لیے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگرچہ زمین پر اترنے کا ابتدائی حکم بطور عتاب اور سزا کے تھا مگر بعد ازاں جب خطا معاف کردی گئی تو دوسری مصالح اور حکمتوں کے پیش نظر زمین پر بھیجنے کے حکم کو اس کی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا ہے اور اب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذکر تخلیق آدمؑ کے وقت ہی فرشتوں سے کیا جاچکا تھا، کہ زمین کے لیے ان کو خلیفہ بنانا ہے۔'' (معارف القرآن، جلد اول)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''یہ الفاظ دو مرتبہ دہرائے گئے ہیں، ایک مرتبہ حضرت آدمؑ کی لغزش کے بعد، پھر دوبارہ ان کی توبہ کے بعد، لغزش کے بعد اس کا ذکر اس لغزش کا نتیجہ بیان کرنے کے لیے ہوا ہے اور توبہ کے بعد اس کی حکمت بیان کرنے کے لیے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اب تمہیں دنیا میں بھیج کر تمہارا امتحان کرنا چاہتا ہے تاکہ تمہارے برے اور بھلے میں امتیاز ہو سکے تو جو اس امتحان میں پورے اتریں گے وہ اس جنت کے وارث ہوں گے، اور جو اس امتحان میں فیل ہو جائیں گے وہ اس جنت سے محروم رہیں گے۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''انسان اور شیطان کے درمیان جنگ اپنے اصل میدان کی طرف منتقل ہوگئی! اس جنگ کا آغاز ہوگیا جو نہ ختم ہوتی ہے، نہ ایک لمحہ کے لیے ملتوی یا ہلکی ہوتی ہے! اور انسان نے انسانیت کے آغاز ہی میں جان لیا کہ شیطان پر غالب ہونا چاہے تو کیسے غالب ہوتا ہے اور جب وہ اپنے لیے خسران کو پسند کرتا ہے تو کس

طرح شکست کھاتا اور مغلوب ہوتا ہے۔''

آگے چل کر سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا تھا ''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں'' ان الفاظ سے واضح ہے کہ آدمؑ اولین لحہ سے اس زمین کے لیے پیدا کئے گئے تھے تو یہ شجر ممنوعہ کس غرض سے تھا؟ آدمؑ کی آزمائش کس لیے تھی! اور ہبوطِ ارضی کس لئے؟ وہ تو ابتدا ہی سے زمین کے لیے پیدا کئے گئے تھے!

میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ یہ تجربہ اس خلیفہ ارضی کی تربیت اور تیاری کیلئے تھا، اس لیے تھا کہ اس کے وجود میں جو قوتیں پوشیدہ ہیں، وہ بیدار ہو جائیں! اس لیے تھا کہ وہ جان لے کہ کس طرح وہ گمراہی میں مبتلا ہوتا، اس کے انجام کا مزہ چکھتا، ندامت سے دوچار ہوتا، اپنے دشمن کو پہچانتا اور پھر اس ہستی سے پناہ چاہتا ہے جو پناہ دہندہ اور امن کا سرچشمہ ہے!

شجر ممنوعہ، لذت کے ساتھ شیطان کی وسوسہ اندازی! اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے، انسان کا اللہ سے کئے ہوئے عہد کو فراموش کرنا، غفلت و مدہوشی کے بعد ہوش میں آنا، نادم ہونا اور پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہنا..... یہ سارا قصہ فی الواقع نوعِ انسانی کا وہ تجربہ ہے جو بار بار اور نئے نئے انداز میں اسے ہوتا رہتا ہے۔

اس مخلوق- انسان پر اللہ کی رحمت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ انسان اپنی خلافت کے مستقر..... زمین..... پر اس طرح اترے کہ وہ اس تجربہ سے گزر چکا ہو جس سے وہ زمین میں مدت ہائے دراز تک دو چار ہوتا رہے گا، شیطان سے اس دائمی جنگ کے لیے وہ پوری طرح تیار ہو اور اسے شروع ہی میں اس سے آگاہ کر دیا گیا ہو اور اسے عبرت و نصیحت ہو گئی ہو! (فی ظلال القرآن، جلد اول)

فَاِمَّا (فَ–اِنْ– مَّا) فَ: پس۔ **اِنْ** شرطیہ اور **ما** تاکید سے مرکب ہے۔ معنی اگر، **يَأْتِيَنَّكُمْ (يَأْتِيَ–نَّ–كُمْ) اَتَى يَأْتِيْ، اِتْيَانٌ** آنا، **نّ** (شد کے ساتھ، نونِ ثقیلہ کہلاتا ہے اور تاکید کے معنی دیتا ہے) **مِنِّيْ (مِنِّ–يْ)** طرف سے۔ میری۔ **هُدًى– هَدٰى– يَهْدِيْ– هُدًى، وَهَدْيًا وَهِدْيَةً وَهِدَايَةً** (مصباح اللغات) رہنمائی کرنا، ہدایت کرنا **هُدًى** یعنی وہ ہدایت جو رسولوں کے ذریعے سے تمہاری طرف بھیجی جائے گی اور نون ثقلیہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہدایت یقیناً آ کر رہے گی۔ **فَمَنْ (فَ–مَنْ)** پس۔ جس نے، **تَبِعَ (تَبِعَ يَتْبَعُ تَبْعًا)** نقش قدم پر چلنا۔ حکم پر عمل کرنا، **هُدَايَ. هُدًى– مضاف– يَ مضاف اليه**۔ میری ہدایت۔ **فَلَا خَوْفٌ**۔ پس نہیں خوف **عَلَيْهِمْ**– ان پر۔ **وَلَاهُمْ** اور نہ وہ **يَحْزَنُوْنَ**

(ح ز ن) حَزِنَ یَحْزَنُ، غمگین ہونا، پریشان ہونا۔ غم کھائیں گے۔

خَوف آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف ومصیبت کے اندیشہ کا نام ہے اور حُزن کسی مقصد ومراد کے فوت ہوجانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، گویا خوف کا تعلق مستقبل سے ہے جبکہ حُزن کا ماضی سے۔ یعنی ابرار وصالحین کو آئندہ نہ کوئی سزا اور خطرہ پیش آنے والا ہے اور نہ وہ لوگ اپنی دنیاوی زندگی پر کوئی حسرت اور افسوس ہی کریں گے بلکہ ہر طرح سے فرحاں وشاداں رہیں گے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) انسان کو زمین کی خلافت عطا کی گئی ہے، یہ اس کا بہت بڑا شرف ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا نظام جاری وساری کرے۔

۲) انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً انبیاء ورسل کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نسلِ انسانی کی ہدایت کے لیے تشریف لے آئے۔

۳) اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ورحمت کا فیضان ہمیشہ جاری رہا تاکہ انسان عمل صالح کر کے ابدی ودائمی جنت کے حقدار بن جائیں۔

۴) زندگی کے غم وحزن سے چھٹکارا پانے کا صرف یہی حل ہے کہ وہ ہدایت الٰہی کے پیرو بن جائیں۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ، اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۳۹)	''اور جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور انہیں جھٹلایا، وہی اہل جہنم ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

وَالَّذِیْنَ، اور وہ لوگ جنہوں نے، كَفَرُوْا، کفر کیا (ک ف ر) كَفَرَ یَكْفُرُ كُفْرًا، نعمت ایمان کو چھپانا، کفر کرنا، وَكَذَّبُوْا اور انہوں نے جھٹلایا (ک ذ ب) كَذَّبَ یُكَذِّبُ، تَكْذِیْبٌ، باب تفعیل،

تکذیب کرنا، جھٹلانا بِاٰیٰتِنَا (بِ–اٰیَاتِ–نَا) ساتھ، آیات، ہماری یعنی ہماری آیات کو۔ آیت کی جمع آیات، قرآن کی آیات، شہادتیں، معجزات، اسباق، انفس وآفاق میں بکھری ہوئی نشانیاں جیسے کہ ہر پتہ اور ہر ذرہ رب کائنات کی قدرت پر شاہد ہے۔

وَ فِیْ کُلِّ شَیءٍ لَهٗ آیَةٌ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

''ہر چیز میں اس کی قدرت عیاں ہے اور اس کی یکتائی کی شہادت دے رہی ہے۔''

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''آیات جمع ہے آیت کی، آیت کے اصل معنی اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے، قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہی ہے، کہیں آثار کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا ہے، کیونکہ مظاہر قدرت میں سے ہر چیز اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستور ہے، کہیں ان معجزات کو آیات کہا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام لے کر آتے تھے کیونکہ یہ معجزے دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرمانروائے کائنات کے نمائندے ہیں، کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیات کہا گیا ہے کیونکہ وہ نہ صرف حق اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے، اس کے محض مضامین ہی میں نہیں اس کے الفاظ اور انداز بیان اور طرز عبارت تک میں اس کے جلیل القدر مصنف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ ہر جگہ عبارت کے سیاق وسباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں ''آیت'' کا لفظ کس معنی میں آیا ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

آیئے اب قرآن حکیم سے چند آیت کے مختلف معنوں کو سمجھتے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی قدرت:

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ (الروم ۳۰:۲۰) ''اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر اب تم انسان ہو جو ہر جگہ پھیل رہے ہو''۔

اس آیۂ مبارکہ پر غور کیجئے کہ ایک انسان (حضرت آدم علیہ السلام) سے کئی اربوں کی آبادی پیدا ہو چکی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، ہر انسان دوسرے انسان سے شکل وصورت، رنگ روپ، آواز، حتی کہ ہاتھ کے انگوٹھے کے نشان تک میں مختلف ہے، کیا یہ اس کی کاریگری اور قدرت کے نشان نہیں ہیں۔

فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ (المؤمنون ۲۳:۱۴) ''پس بڑا بابرکت ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔''

(۲) زمین وآسمان کی تخلیق:

وَمِنۡ اٰیٰتِہٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَ اَلۡوَانِکُمۡ ، اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ (الروم ۳۰:۲۲) ''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہاری زبانیں اور تمہارے رنگ مختلف بنادیے، اہل علم کے لیے اس میں بھی کئی نشانیاں ہیں''۔

ذرا اس وسیع وعریض پھیلی ہوئی کائنات پر غور کیجئے کہ آسمان بغیر ستونوں کے کھڑا ہے اور زمین انسان کے لیے مطیع و ماتحت بنادی گئی ہے کہ وہ اس پر کھیتی باڑی کرتا ہے، حسب خواہش سڑکیں، پل، عمارات تعمیر کرتا جاتا ہے پھر مختلف علاقوں میں رب عظیم نے آب و ہوا میں لوگوں کی زبانوں (Tongues) میں فرق پیدا کیا جس سے Languages مختلف ہوئیں، یہ رنگ اور نسل، خطہ اور علاقہ فضیلت اور برتری کا معیار نہیں ہے بلکہ بڑائی اور برتری انسان کا حقیقی معنوں میں اپنے رب کا بندہ بننے اور نیکی کی راہ اختیار کرنے میں ہے۔

(۳) رات کو آرام اور دن کو کام:

وَمِنۡ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمۡ بِالَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَابۡتِغَآؤُکُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ، اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ (الروم ۳۰:۲۳) ''اور تمہارا رات اور دن کو سونا اور اس کا فضل (رزق) تلاش کرنا بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے، جو لوگ غور سے سنتے ہیں ان کے لیے اس میں بھی بہت سی نشانیاں ہیں''۔

انسان دن بھر کام کاج سے فارغ ہو کر تھکا ہارا گھر لوٹتا ہے تو جسم آرام کی خواہش کرتا ہے اور اگر کسی کارخانہ یا فیکٹری میں رات کی ڈیوٹی ہے تو دن کو آرام کرنے کا آرزومند ہوتا ہے، اگر انسان میں روزگار کی تلاش اور معاشی دوڑ دھوپ کا داعیہ نہ رکھا جاتا تو دنیا کی یہ ساری چہل پہل اور رونق اور گہما گہمی مفقود ہو جاتی۔

(۴) پانی کا برسنا اور فصلوں کا لہلہانا:

وَمِنۡ اٰیٰتِہٖ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحۡیٖ بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا، اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (الروم ۳۰:۲۴) ''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی دکھاتا ہے جس سے تم ڈرتے بھی ہو اور امید بھی رکھتے ہو (پانی کی امید پیدا ہوتی ہے) اور وہ

آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے، سمجھنے سوچنے والوں کے لیے اس میں بھی بہت سی نشانیاں ہیں''۔

یہ ہیں وہ انفس و آفاق کی آیات (نشانیاں) جنہیں ہم روزمرہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

(۵) قرآن حکیم کی آیات:

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ (البقرہ۲:۹۹)

''ہم نے آپ کی طرف واضح (روشن) آیات نازل کی ہیں''۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اس کائنات میں پھیلی ہوئی آیات اور قرآنی آیات پر تدبر و تفکر کرے تو یقیناً راہ حق کو پالے گا اور اسے رب کائنات کی نعمتوں کا احساس اور شعور پیدا ہوگا اور پھر بے اختیار اس کی اطاعت اور بندگی کا دم بھرے گا اور جو لوگ اندھے اور بہرے ہو کر زندگی گزارتے ہیں اور ان تمام آیات کو جھٹلا دیتے ہیں۔ ارشاد ہوا: ﴿اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ یہ لوگ تو اہل جہنم ہیں، هُمْ: وہ، فِیْهَا: اس میں، خٰلِدُوْنَ: ہمیشہ رہیں گے، اَللّٰهُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ ۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) قرآن حکیم میں آیت کا لفظ چار معنوں میں آیا ہے: (۱) علامت یا نشانی، (۲) آثارِ کائنات، (۳) معجزاتِ انبیاء، (۴) کتاب اللہ کے فقرے۔

۲) اللہ تعالیٰ کی آیات انسان کے لیے رشد و ہدایت کا ذریعہ بن سکتی ہیں اگر وہ ان پر غور و فکر کرے اور ان پر یقین پختہ کر لے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کمال ہے۔

۳) آیت خواہ قرآن کریم کا جملہ ہو، آثارِ کائنات میں سے کوئی اثر ہو، معجزاتِ انبیاء میں سے کوئی معجزہ ہو ان کو جھٹلانا اور ان کا انکار کرنا موجبِ عذاب ہے اور عذاب بھی ایسا جو دائمی ہوگا۔

۴) انسان جو عقل کا بہت پرستار ہے اس کو آیات الٰہی کے سلسلے میں بھی اس عقل کو استعمال کرنا چاہیے نہ یہ کہ صرف امورِ دنیا ہی پر اس کو آزماتا رہے۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ، وَ اِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ (۴۰)	''اے بنی اسرائیل! ذرا میری نعمتوں کو تو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کی تھیں اور تمہارا مجھ سے جو عہد تھا اسے تم پورا کرو اور میرا تم سے جو عہد تھا اسے میں پورا کروں گا۔ اور مجھ ہی سے ڈرو۔''

﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ﴾ یا۔ حرف ندا، بَنِیۡ اِسۡرَائِیل، منادی یعنی جس کو خطاب کیا جائے (O, children of Israelle) حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا، اسی سے یہ نسل بنی اسرائیل کہلائی، اسرائیل عبرانی زبان کا لفظ، اسر بمعنی عبد۔ اِیل بمعنی اللہ، اسرائیل کے لفظی معنی عبداللہ، اللہ کا بندہ، حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہ لقب تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس پر خوبصورت نوٹ لکھا ہے:

''بنی اسرائیل! مشہور و نامور پیغمبر حضرت ابراھیم علیہ السلام عراقی ثم شامی ثم حجازی سے مشہور و نامور دو نسلیں چلیں، ایک بی بی ہاجرہ علیہا السلام مصری کے بطن کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام سے، یہ نسل بنی اسماعیل کہلائی، اور آگے چل کر قریش (مکہ) اسی کی ایک شاخ پیدا ہوئی ان کا وطن عرب رہا، دوسری بی بی سارہ علیہا السلام عراقی کے بطن کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں اور ان کے فرزند حضرت یعقوب عرف حضرت اسرائیل علیہ السلام سے یہ نسل بنی اسرائیل کہلائی، اس کا وطن شام رہا، قدیم جغرافیہ میں فلسطین کوئی الگ ملک نہ تھا، شام ہی کا جزو تھا، ایک تیسری نسل، تیسری بیوی حضرت قطورہ سے چلی اور بنی قطورہ کہلائی، لیکن اسے تاریخ میں اس درجہ کی اہمیت حاصل نہیں۔

بنی اسرائیل کا عروج صدیوں تک رہا، توحید کی علمبردار دنیا میں یہی قوم رہی، انبیاء و مرسلین ان کے درمیان ہوتے رہے، بڑے بڑے عابد و زاہد ان میں پیدا ہوئے، حکمران، سلاطین اور فوجی جنرل بھی ان میں بڑے بڑے پیدا ہوتے رہے، نزول قرآن کے وقت ان کا دنیوی اقتدار مدت ہوئی رخصت ہو چکا تھا، اپنے وطن سے نکل کر عراق، مصر وغیرہ اطراف و جوانب پھیل چکے تھے اور ان کے بعض قبیلے حجاز اور اطراف حجاز خصوصاً یثرب (اسی کا نام بعد کو مدینۃ النبی پڑا) اور حوالیٔ یثرب میں آباد ہو چکے تھے، ''بنی اسرائیل'' تو ایک قومی

ونسلی اصطلاح ہے، مذہبی حیثیت سے یہ لوگ یہود تھے، اہل کتاب تھے، توریت محرّف ومسخ شدہ ہو کر، لیکن بہر حال ان کے درمیان تھی، سلسلہ وحی نبوت اور عقیدہ جزا وسزا کے کسی نہ کسی صورت میں قائل تھے، علوم انبیاء و معارف اولیا کے حامل تھے، مالدار تھے، ساہوکار تھے، ساتھ ہی سفلی عملیات، سحر و کہانت نیز تجارت کے بھی بڑے ماہر تھے، حجاز کی آبادی میں اسی دینی اور دنیوی تفوق کی بنا پر اہمیت انہیں اس وقت اچھی خاصی حاصل تھی، ملک کی عام آبادی مشرکوں اور بت پرستوں کی تھی، وہ لوگ ایک طرف تو یہود کے علم وفضل کے قائل اور ان کی دینی واقفیت سے مرعوب تھے اور دوسری طرف اکثر ان کے قرضدار بھی رہا کرتے تھے گویا کہ دینی و دنیوی اکثر حاجتوں میں انہیں کو مشکل کشا جانتے تھے اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ منظّم وقاہر قوموں کے تمدن سے کمزور اور غیر منظّم قومیں مرعوب ومتاثر ہو جاتی ہیں مشرکین عرب بھی اسرائیلی اخلاق، اسرائیلی روایات بلکہ اسرائیلی عقائد سے بہت کچھ متاثر ہو چکے تھے اور بہت سے مسائل میں یہود کو اپنا استاد جانتے تھے۔ ان سب چیزوں کے علاوہ یہود کے مذہبی نوشتوں اور اسرائیلیوں کی مقدس زبانی روایتوں، دونوں میں ایک آنے والے نبی کی بشارت موجود تھی اور یہ لوگ اس نبی موعود کے ظہور کے منتظر رہتے تھے، ان اسباب عام وخاص دونوں کی بنا پر یہ بالکل قدرتی تھا کہ قرآن مجید میں تخاطب اس قوم کے ساتھ ہو اور خوب مفصل ہو۔

اس منزل پر پہنچ کر بہتر ہوگا کہ ایک نظر قرآن مجید کی ترتیب بیان پر بھی کر لی جائے، قرآن مجید کا اصل تخاطب ساری کائنات انسانی سے ہے، اسی مناسبت سے رکوع اول میں بیان اس کا ہوا کہ نوع انسان کی حقیقی تقسیمیں کل دو ہیں۔ ایک اچھے یا مومن، دوسرے برے یا کافر، مومن یا نیک وہ جو قرآن مجید کے دستور حیات کو تسلیم کرتے ہیں، کافر یا بد وہ جو اس سے انکار کرتے ہیں۔ دوسرے رکوع میں بیان کافروں ہی کی ایک خاص قسم، مخفی کافروں (منافقوں) کا ہوا اور یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ بھی ایمان ونجات سے محروم ہی رہیں گے، تیسرے رکوع میں مخاطب ساری نسل انسانی کو کیا گیا ہے اور قرآن مجید کا اصل پیام یعنی توحید ورسالت بیان کر دیا گیا ہے، چوتھا رکوع تاریخ نسل انسانی پر ہے۔ اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ انسان کی اصل غرض آفرینش دنیا میں قانون الٰہی کی تنفیذ ہے اور حاکمیت الٰہی کی نیابت، ذرا سی غفلت میں نسل انسانی کا دیرینہ دشمن شیطان اسے پچھاڑ سکتا، اور حق سے باطل کی طرف، نور سے ظلمت کی جانب اسے موڑ سکتا ہے، لیکن انسان اگر ذرا بھی ہمت اور توجہ صرف کرتا رہے اور انبیاء کی بتائی ہوئی اور دکھائی ہوئی صراط مستقیم پر قائم رہے تو وہی غالب اور منصور رہے گا۔ اب پانچویں رکوع میں بیان اس کا شروع ہوتا ہے (اور اس کی تفصیل متعدد

رکوعوں تک چلتی رہے گی) کہ مدت دراز ہوئی ایک بڑے مقبول برگزیدہ بندہ کی اولاد میں ایک خاص نسل کو توحید کی نعمت خاص سے سرفراز کیا گیا تھا مگر وہ قوم اس کی نااہل ثابت ہوئی، موقعے اسے بار بار دیئے گئے، رعایت اس کے ساتھ بار بار کی گئی لیکن ہر بار اس نے اس نعمت کو اپنے ہاتھوں ضائع کیا، یہاں تک کہ اپنی نسل کے آخری پیغمبر (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی مخالفت میں توحد ہی سے گزر گئی۔ طویل اور مسلسل مراعات کے بعد اب حکومت الٰہی کا دستور ایک نیا ضابطہ اختیار کرتا ہے، اس ناشکر گزار، نافرمان، عصیان پیشہ قوم کو اس منصب سے معزول کیا جاتا ہے اور یہ نعمت اس سے چھین کر ایک اسمٰعیلی پیغمبر (خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے واسطہ سے دنیا کی تمام قوموں اور ساری نسلوں کے واسطے عام کی جارہی ہے۔

(تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ اُذْكُرُوْا، فعل امر جمع مذکر۔ تم سب یاد کرو (ذَكَرَ، يَذْكُرُ، ذِكْرًا) یاد کرنا، نعمتوں کا احساس کر کے جذبہ شکر گزاری پیدا کرنا۔ نِعْمَتِيَ (نِعمتٌ. ی) نعمتیں۔ میری التی – جو، اسم موصول اَنْعَمْتُ، فعل ماضی واحد متکلم۔ میں نے انعام کی (اَنْعَمَ يُنْعِمُ اِنْعَامًا) بابِ افعال عَلَيْكُم، تم پر، اللہ تعالیٰ کے بنی نوع انسان پر ان گنت احسانات وانعامات ہیں اور ہر شخص پر نعمتوں کی بارش ہے۔ وَاِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراھیم ۱۴:۳۴) ''اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے ہو''۔

انفس وآفاق، جسم وجان، خوراک اور لباس، صبح وشام بے حد وحساب نعمتیں ہیں اور سب سے بڑھ کر ایمان واسلام کی نعمت ہے، بنی اسرائیل کو اور بھی کئی نعمتوں سے نوازا گیا۔ انبیاء کرام کا سلسلہ، دنیوی اقتدار و وجاہت، سیادت و قیادت، منّ وسلویٰ، فرعون کے پنجۂ استبداد سے نجات، یوسف علیہ السلام کو مصر کی بادشاہت وغیرہ انہیں نصیب ہوئی جیسا کہ ارشاد ہوا: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّ اٰتٰىكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (المائدہ ۵:۲۰) ''(اور وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے جبکہ اس نے تم میں کئی نبی پیدا کئے اور کئی بادشاہ بنائے اور تمہیں وہ کچھ دیا جو اقوام عالم میں سے کسی کو نہ دیا تھا''۔

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ﴾ اَوْفٰى يُوْفِيْ اِيْفَاءً۔ (افعال) سے فعل امر، اَوْفُوْا پورا کرو بِعَهْدِيْ

(بِ، عَھد،ی) ساتھ۔ میرا، عہد یعنی یہ عہد کہ میرے عہد کو۔ یعنی یہ عہد کہ تم تورات کے احکامات کی پابندی کروگے اور جب خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئیں تو ان پر ایمان لاؤ گے۔

﴿اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ﴾ میرا جو تم سے عہد ہے اسے میں پورا کروں گا، یعنی دنیا و آخرت میں تمہیں عزت و سربلندی عطا کروں گا۔

﴿وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ﴾ وَ، اور اِیّا۔ خاص، یَ۔ مجھ سے اور صرف مجھ ہی سے۔ فَارْھَبُوْنِ (ف۔ ارھَبُوا۔ نِیْ) اور، ڈرو، مجھ سے، رَھَبَ یَرْھَبُ سے فعل امر اِرْھَبْ ایسا ڈرنا جس میں احتیاط اور اضطراب شامل ہو، اِرْھَبُوا جمع کا صیغہ، تم سب ڈرو۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) انسان پر اللہ تعالیٰ کے بے حد انعامات ہیں اور ہر وقت اس کی رحمتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے۔
۲) انسان پر لازم ہے کہ وہ ہمہ وقت اپنے مولا و مالک کی اطاعت کا دم بھرے اور اس کے احکامات کو اس دنیا میں جاری و ساری کرنے کے لیے ہر طرح سے مستعد رہے۔
۳) رب کریم یقیناً اسے دنیا و آخرت کی کامیابی نصیب فرمائے گا جو اس کے احکامات کی پاسداری کرے گا۔
۴) وہ کبھی تکبر و غرور کا شکار نہ ہو بلکہ اس کے تمام اعمال میں یہ نقطہ پیش نظر ہو کہ وہ مولا و مالک کی بخششوں کا طالب اور امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف اور مضطرب رہے گا۔
۵) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یاد سے شکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اُس کی اطاعت اور محبت کی طرف دل مائل ہوتے ہیں۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۪ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۠ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ (۴۱)	''اور میں نے جو کتاب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر) نازل کی ہے اس پر ایمان لاؤ، یہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے (یعنی تورات کی) لہٰذا سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بن جاؤ، اور نہ میری آیات ہی کو تھوڑی قیمت پر بیچو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔''

وَاٰمِنُوْا، فعل اَمر جمع مذکر حاضر تم سب ایمان لاؤ۔اٰمَنَ یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا باب افعال، بِمَا (بِ، مَا) ساتھ اس کے، جو یعنی قرآن حکیم اَنْزَلْتُ، میں نے نازل کیا، صیغہ واحد متکلم (ن ز ل) اَنْزَلَ یُنْزِلُ، اِنْزَالٌ (اِفْعَالٌ) اتارنا، نازل کرنا، مُصَدِّقًا (ص د ق) صَدَّقَ یُصَدِّقُ تَصْدِیْقًا باب تفعیل، اس سے اسم فاعل مُصَدِّقٌ اور حال ہونے کی وجہ سے منصوب (ق پر زبر) مُصَدِّقًا ہے تصدیق کرنے والا لِمَا مَعَكُمْ، جو تمہارے پاس ہے، اشارہ توریت کی طرف ہے، وَلَا تَكُوْنُوا، فعل نہی (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، وَلَا تَكُوْنُوْا اور نہ ہو جاؤ۔اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ، اَیْ لَا تُبَادِرُوْا اِلَی الْكُفْرِ بِهٖ (المنار) یعنی کفر کی طرف سبقت سے کام نہ لو۔

مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''قرآن مجید اس پیش گوئی کو سچی ثابت کر رہا ہے جو تورات میں آخری نبیؐ کی بعثت اور اس بعثت کی خصوصیات سے متعلق وارد تھی۔ مقصود یہ ہے کہ اگر سمجھ سے کام لو تو قرآن مجید اور یہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے لیے چڑنے کی چیز نہیں ہیں بلکہ سر آنکھوں پر بٹھانے کی چیزیں ہیں کیونکہ ان کے ظہور سے سب سے زیادہ تمہارا ہی سر بلند ہوا ہے، تمہارے صحیفوں میں ان کی پیشین گوئیاں موجود تھیں اور یہ پیشین گوئیاں اب تک اپنے حقیقی مصداق کے ظہور کی منتظر تھیں، اب اس کتاب اور اس پیغمبر کے ظہور نے ان کا مصداق دنیا کے سامنے پیش کر کے تمہاری کتاب کو سند تصدیق عطا کر دی تو تمہیں تو سب سے پہلے اس پر ایمان لانے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔

اس تصدیق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جہاں تک تورات یا انجیل کے آسمانی ہونے کا تعلق ہے قرآن مجید آشکار طور پر ان کے آسمانی ہونے کی تصدیق کرتا ہے، ان کی تعلیمات کی بھی اصولی طور پر تصدیق کرتا ہے، قرآن اگر تردید کرتا ہے تو صرف ان چیزوں کی تردید کرتا ہے جو غلط طریقوں سے ان صحیفوں میں شامل کر دی گئی ہیں یا تحریف کر کے جن کی اصلی شکل بگاڑ دی گئی ہے، اس طرح غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جہاں تک اصل تورات کا تعلق ہے (یعنی جو آسمان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی) قرآن مجید اس کی سچائی کا گواہ بن کر نازل ہوا ہے، وہ اس کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان چیزوں سے اس کو بری قرار دیتا ہے جو اس کو جھٹلانے والی ہیں۔

وَلَاتَكُوْنُوْا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ یعنی سب سے پہلے اس کے کفر کرنے والے نہ بنو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب دوسرے کفر کر لیں تو تمہارے لیے کفر کرنا جائز ہو جائے گا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ قرآن تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا نازل ہوا ہے اور اس پر ایمان لانے کا تم سے اس کے نزول سے پہلے ہی عہد لیا جا چکا ہے، اس وجہ سے اس کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کی سب سے پہلے تم ہی سے توقع کی جا سکتی تھی لیکن یہ عجیب صورت حال ہے کہ دوسرے تو اس سے نا آشنا ہونے کے باوجود اس پر ایمان لانے کے لیے سبقت کریں اور تم اس سے پہلے سے آشنا ہو کر اس کی مخالفت کی راہ میں سبقت کرو۔ (تدبر قرآن، جلد اول)

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

اسلام جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، اللہ کا واحد دین ہے جو ہمیشہ ہے اور ہمیشہ رہے گا! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دائمی دین کو اس کی آخری شکل میں پیش کر رہے ہیں، وہ اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے جو انسانیت کے آغاز سے اللہ کے عہد اور اس کی رسالت کی صورت میں جاری ہے، وہ ماضی کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اور مستقبل میں جو کچھ ہونے والا ہے، اس کے سلسلے میں وہ انسانیت کی دستگیری و رہنمائی کرنے والا ہے، وہ پرانے عہد نامے، تورات اور نئے عہد نامہ، انجیل کی تعلیمات کو یکجا کرتا ہے۔ نیز انسانیت کے طویل مستقبل کے لیے خیر و صلاح کی مزید تعلیمات کا..... جتنا اللہ نے چاہا..... اضافہ کرتا ہے، وہ تمام انسانوں کو اللہ کے عہد اور اس کے دین کی بنیاد پر متحد کرتا ہے اور انہیں بھائی بھائی بنا دیتا ہے جو ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں، نوع انسانی کے افراد، گروہوں، جماعتوں، قوموں اور نسلوں میں بٹنے کے بجائے اس دین کی بدولت اللہ کے بندے بن کر ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں اور وہ سب مل کر اللہ کے اس عہد کو تھامے ہوئے ہوتے ہیں، جو زندگی کی صبح طلوع ہونے سے آج تک کبھی نہیں بدلا! (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَلَا تَشْتَرُوْا﴾ فعل نہی جمع مذکر مخاطب، اور نہ بیچو اِشْتَرٰی یَشْتَرِی اِشْتِرَاءً، خرید وفروخت کرنا، ﴿بِاٰیٰتِیْ﴾ (بِ-آیَاتِ-یْ) ساتھ- آیات میری۔ یعنی میری آیات کو ﴿ثَمَنًا﴾ قیمت، ﴿قَلِیْلًا﴾ تھوڑی یاد رہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت بھی آخرت کے مقابلے میں قلیل ہے، جیسا کہ ایک جگہ ارشاد ہوا:

وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا فِیْ الْآخِرَۃِ اِلَّا مَتَاعٌ (الرعد۱۳:۲۶)

''اور دنیا کی زندگی (آخرت کے مقابلے) میں بہت تھوڑا فائدہ ہے''۔

ایک اور مقام پر اس طرح آیا ہے:

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ (النساء۴:۷۷) ''آپ فرما دیجئے کہ دنیا کا فائدہ تو بہت تھوڑا ہے''۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''تھوڑی قیمت سے مراد وہ دنیوی فائدے ہیں جن کی خاطر یہ لوگ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات کو رد کر رہے تھے، حق فروشی کے معاوضے میں خواہ انسان دنیا بھر کی دولت لے لے، بہر حال وہ تھوڑی قیمت ہی ہے کیونکہ حق یقیناً اس سے گراں تر چیز ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿فَاِیَّایَ﴾ (پس مجھ ہی سے) کلمہ حصر ہے، تاکید پیدا کرتا ہے ﴿فَاتَّقُوْنِ﴾ (فَ، اِتَّقُوا، نِیْ) پس۔ ڈرو۔ مجھ سے اِتَّقٰی یَتَّقِیْ، اِتِّقَاءً۔ باب افتعال، انجام کے خوف سے نافرمانی سے بچنا، یقیناً تمام اعمال کی اصل روح تقویٰ ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت ہی تا قیامت نسل انسانی کے لیے واجب الاطاعت ہے اور اسی میں اخروی نجات مضمر ہے اور سابقہ تمام شریعتیں منسوخ ہیں۔

۲) آیات الٰہی میں کسی قسم کی تحریف کرنا (خواہ معنوی ہو یا لفظی) اور اس سے دنیا کی دولت کمانا، بے فائدہ اور لا حاصل ہے، دنیوی دولت خواہ کتنی عظیم ہو آخرت کے مقابلہ میں وہ بہر حال حقیر اور بے حقیقت ہے۔

۳) آیہ مبارکہ علماء کے لحہ فکریہ کا پیغام رکھتی ہے کہ انہیں یہ بات جان لینی چاہیے کہ علماء کی لغزش عوام کی

لغزش کا سبب ہوتی ہے۔

۴) تمام معاملات میں اللہ ہی سے ڈرنا چاہیے کہ اس کے حضور جواب دہ ہونا ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۴۲)	''اور تم نہ تو حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرو اور نہ حق بات کو چھپاؤ جب کہ تم (اچھی طرح) جانتے بوجھتے بھی ہو۔''

لَا تَلْبِسُوْا فعل نہی، جمع مذکر مخاطب، اور نہ چھپاؤ (لَبِسَ یَلْبِسُ، لَبْسًا) ملانا، خلط ملط کرنا (Intermix)، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: اَصْلُ اللُّبْسِ سَتْرُ الشَّیءِ (مفردات القرآن) دراصل لبس کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں، لباس کو اس وجہ سے لباس کہا جاتا ہے کہ وہ جسم کو چھپا لیتا ہے۔

عربی محاورہ میں کہتے ہیں'' لَبَسَ عَلَیْهِ الْاَمْرُ اَیْ خَلَطَهٗ عَلَیْهِ حَتّٰی لَا یَعْرِفَ حَقِیْقَتَهٗ ،یعنی خلطِ مبحث میں اس شخص پر حقیقت گم ہوگئی (المعجم الوسیط)

اَصْلُ الحَقِّ الْمُطَابَقَةُ وَ الْمُوَافَقَةُ كَمُطَابَقَةِ رِجْلِ الْبَابِ فِیْ حَقِّهٖ لِدَوْرَانِهٖ عَلٰی اِسْتِقَامَةٍ (مفردات القرآن) حق کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت اور مضبوطی کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے۔

لفظ حق کئی طرح استعمال ہوا ہے، قرآن حکیم کی چند آیات سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱) الحقّ، اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ہے، یعنی وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔ لِمُوجِدِ الشَّیْءِ بِسَبَبِ مَا تَقْتَضِیْهِ الْحِكْمَةُ (مفردات القرآن)

ارشاد ہوتا ہے: وَیَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الحَقُّ الْمُبِیْنُ (النور ۲۴:۲۵)

''اور جان لیں گے کہ بے شک اللہ تعالیٰ برحق اور سچ کو سچ کر دکھانے والا ہے۔''

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الحَقُّ (لقمان ۳۱:۳۰) ''یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ہی معبود برحق ہے۔''

هُوَالَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ، مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِکَ اِلَّا بِالْحَقِّ (یونس۱۰:۵)

''وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کر دیں، تاکہ تم برسوں اور تاریخوں کا حساب معلوم کر سکو اللہ تعالیٰ نے (یہ سب کچھ) تدبیر و حکمت سے پیدا کیا ہے''۔

(۲) قیامت کے متعلق فرمایا: وَیَسْتَنْبِؤُنَکَ اَحَقٌّ هُوَ، قُلْ اِیْ وَرَبِّیْ اِنَّهٗ لَحَقٌّ (یونس۱۰:۵۳)

''وہ آپ سے پوچھتے ہیں 'یہ واقعی سچ ہے (یعنی قیامت)' کہیے، میرے رب کی قسم! سچ ہے''۔

(۳) قرآن حکیم کے متعلق فرمایا:

فَلَمَّا جَآءَ هُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْ لَا اُوْتِیَ مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی (القصص۲۸:۴۸)

''پھر جب ہماری طرف سے ان کے پاس حق (قرآن) آ گیا تو انہوں نے کہہ دیا، انہیں ویسے معجزات کیوں نہ دیے گئے جیسے موسیٰ کو دیے گئے تھے''۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہی معجزات کیوں نہ دیئے گئے جو موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن حکیم کی ہمیشہ کے لیے حفاظت اور سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون سا معجزہ ہو سکتا ہے؟

(۴) دین اسلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ، اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل۱۷:۸۱) ''اور کہئے کہ حق (اسلام) آ گیا اور باطل (کفر) بھاگ کھڑا ہوا اور یقیناً باطل تو ہے ہی بھاگ نکلنے والا''

(۵) کہیں یہ عدل کے معنوں میں آیا ہے:

یَوْمَئِذٍ یُّوَفِّیْهِمُ اللّٰهُ دِیْنَهُمُ الْحَقَّ (النور۲۴:۲۵)

''اس دن اللہ انہیں وہ بدلہ دے گا جس کے وہ مستحق ہیں (ان کے ساتھ پورا پورا عدل کیا جائے گا)''۔

(۶) الحق بمعنی توحید اس طرح آیا ہے:

اَمْ یَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ، بَلْ جَآءَ هُمْ بِالْحَقِّ (المومنون۲۳:۷۰)

''یا وہ کہتے ہیں کہ اسے جنون ہے بلکہ درحقیقت وہ ان کے پاس سچی بات (توحید) لایا ہے''۔

(۷) الحق بمعنی الصدق، سچائی:

قَوْلُهُ الْحَقُّ (الانعام۶:۷۳) ''اس (اللہ رب العزت) کی بات سچی ہے''۔

(۸) الحق بمعنی مال (قرض):

وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ (البقرہ۲:۲۸۲)

''اور تحریر وہ شخص کروائے جس کے ذمہ قرض (مال) ہے۔''

(۹) الحق بمعنی اولیٰ، زیادہ مستحق:

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (التوبہ۹:۶۲)

''اللہ اور اس کا رسول زیادہ مستحق ہیں کہ ان کی رضامندی حاصل کریں''۔

الباطل۔ یہ حق کے بالمقابل ہے اور تحقیق کے بعد جس چیز میں ثبات اور پائیداری نظر نہ آئے، اسے باطل کہا جاتا ہے (مفردات القرآن) قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَالحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ (لقمان۳۱:۳۰)

''(یہ حقیقت تم جان لو) کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے اور اس کے سوا جنہیں وہ پکارتے ہیں سب باطل ہیں''۔

باطل کا لفظ قول و فعل دونوں پر بولا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (ال عمران۳:۷۱) ''(اے اہل کتاب) تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو۔''

﴿وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ﴾ (كَتَمَ يَكْتُمُ كِتْمَانٌ) پردہ ڈالنا۔ چھپانا۔ ﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ اور تم اس بات کو جانتے بھی ہو۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

یہود کو ہر موقع پر، جو ان کے سامنے آتا، حق کے ساتھ باطل کو گڈمڈ کرنے اور حق کو چھپانے کی عادت تھی!..... جیسا کہ قرآن نے بہت سے مقامات پر اس کی تفصیل بیان کی ہے..... اور وہ ہمیشہ اسلامی سماج میں فتنہ و فساد اور مسلمانوں کی صفوف میں انتشار و اضطراب پیدا کرنے کے باعث رہے ہیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

اپنے مطالب اور اپنی خواہشات کے لیے نفس مذہب کو بدل دینا بہت بری عادت ہے، یہودی اس میں مبتلا تھے، اس طرح کتمان حق کسی حالت میں بھی درست نہیں، لیکن یہودی اس سے بھی باز نہیں آتے تھے، قرآن حکیم نے انہیں اس عادت پر متنبہ کیا اور کہا، تم جانتے بوجھتے اس قسم کی بدقماشی کا ارتکاب کیوں

کرتے ہو۔ یہ تو گوارا کیا جاسکتا ہے کہ تم مجرم بن جاؤ، اللہ کے حکموں کی مخالفت کرو لیکن اللہ تعالیٰ کے حکموں کو تاویل وتعمق سے بدل ڈالنا تو کسی طرح برداشت نہیں کیا جاسکتا (تفسیر سراج البیان، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

(۱) حق اور باطل کو خلط ملط کرنا شرف انسانیت کے سراسر خلاف ہے چہ جائیکہ اہل کتاب ہوتے ہوئے ایسا کریں: ''خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں''

(۲) کتمانِ حق (سچی بات) کو چھپانا، انسان کے باطن کی خرابی کا نتیجہ ہے اور اس کا انجام دنیا وآخرت میں تباہی وبربادی ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۴۳)	''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اور نماز قائم کرو۔ اَقَامَ يُقِيْمُ اِقَامَةً خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے اور کامل اخلاص کے ساتھ اپنی جبین نیاز اس کے در پر جھکانے کا نام اقامتِ صلوٰۃ ہے۔

اَلْاِقَامَةُ هِيَ الْاِتْيَانُ بِالشَّيءِ مُقَوَّمًا كَامِلًا (المنار) ''کسی چیز کے مکمل اور درست طور پر بجالانے کو اقامت کہتے ہیں''۔ اقامت صلوٰۃ میں (وقت کی پابندی، خشوع، تعدیل ارکان، غرض جملہ لوازم باطنی اور شرائط ظاہری شامل ہیں) صلوٰۃ کے لفظی معنی دعا کے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں ایک مخصوص ہیئت کی معروف عبادت کا نام ہے اور یہ نام بھی اسی سے پڑا ہے کہ دعا ہی اس عبادت کا جزو اعظم ہے۔ (تفسیر ماجدی)

مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''اقامت کے معنی کسی چیز کو کھڑے کرنے یا اس طرح سیدھے کرنے کے ہیں کہ اس میں کوئی

ٹیڑھ باقی نہ رہ جائے، فرمایا ہے کہ نماز قائم کرو، یہ نہیں کہا ہے کہ نماز پڑھو، قرآن نے نماز کے لیے قائم کرنے کا لفظ استعمال کر کے ایک ہی ساتھ کئی حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔

پہلی چیز: جس کی طرف یہ لفظ متوجہ کرتا ہے وہ نماز میں اخلاص ہے یعنی نماز صرف اللہ ہی کے لیے پڑھی جائے اور کسی کو اس میں شریک نہ کیا جائے، اس کے اندر سیدھے کرنے کا جو مفہوم ہے اس کا تقاضا اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک یہ پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ ہی کے لیے نہ پڑھی جائے، دوسرے مقام پر یہ حقیقت واضح لفظوں میں بھی بیان کر دی ہے:

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (الاعراف ۷:۲۹)

''اور اسی کی طرف اپنے رخ کرو ہر مسجد کے پاس، اور اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے''۔

یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ نماز میں رخ قبلہ کی طرف ہونا چاہیے کیونکہ وہی توحید اور اخلاص کا مرکز ہے۔

دوسری چیز: جس کی طرف یہ لفظ اشارہ کرتا ہے، وہ نماز کے اصل مقصود پر دل کو پوری طرح جمانا ہے، نماز کا اصل مقصود ذکرِ الٰہی میں خشوع و خضوع ہے، اگر آدمی اس چیز سے غافل ہو کر نماز پڑھے تو یہ نماز کو قائم کرنا نہیں ہوا بلکہ محض چھدا اتارنا ہوا، اس حقیقت کی طرف بھی قرآن نے بعض مقامات میں توجہ دلائی ہے۔ مثلاً: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ (طٰہٰ ۲۰:۱۴) ''اور نماز کو میرے ذکر کے لیے قائم کرو''۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِىْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (المومنون ۲۳:۱،۲) ''ان مومنوں نے فلاح پائی جو اپنی نمازیں خضوع و خشوع سے ادا کرتے ہیں''۔

تیسری چیز: یہ ہے کہ نماز بغیر کسی کمی بیشی کے اس طریقہ کے مطابق ادا کی جائے جس طریقہ پر اللہ تعالیٰ نے اس کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے:

فَاِذَا اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ (بقرہ ۲:۲۳۹)

''پس جب تم امن میں ہو جاؤ تو اس طریقہ پر اللہ کو یاد کرو جو طریقہ اس نے تمھیں سکھایا ہے''۔

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِىْ اُصَلِّىْ - ''تم نماز اس طرح پڑھو جس طرح کہ مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو'' [صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی]

نماز کی صفوں کا ٹھیک کرنا اور ارکان نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا بھی اس میں شامل ہے، اس سلسلے میں حدیث میں آیا ہے کہ تَسْوِیَۃُ الصُّفُوفِ مِنْ اِقَامَۃِ الصَّلٰوۃِ یعنی صفوں کو برابر کرنا بھی اقامت صلوٰۃ کا ایک جزو ہے۔ [صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ]

چوتھی چیز: اوقات نماز کی پوری پوری پابندی ہے، فرمایا ہے: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۸) ''اور نماز قائم کرو، سورج کے زوال کے وقت سے لے کر رات کے تاریک ہونے تک اور صبح کے وقت قرآن پڑھنا'' (اور حدیث مبارکہ میں ان پانچوں نمازوں کے ابتدائی اور انتہائی اوقات کا تعین کر دیا گیا ہے)۔

اسی چیز کو دوسرے مقامات میں ''نمازوں کی نگرانی'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حَافِظُوا عَلَی الصَّلَوٰتِ (البقرہ ۲:۲۳۸) نمازوں کی حفاظت کرو۔ پانچویں چیز نماز پر قائم رہنا ہے جیسا کہ فرمایا ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَائِمُوْنَ (معارج ۷۰:۲۳) ''وہ اپنی نمازوں پر برابر قائم رہتے ہیں''۔

چھٹی چیز: جمعہ و جماعت کا قیام و اہتمام ہے، خصوصیت کے ساتھ جب امت یا امام کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تب تو واضح طور پر جمعہ و جماعت کا قیام و اہتمام ہی مدنظر ہوتا ہے، مثلاً ملاحظہ ہو:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج ۲۲:۴۱) ''اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا جس میں انہوں نے اپنی ذُرّیّت کا مشن بتایا ہے، ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (ابراہیم ۱۴:۳۸) ''اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اس بن کھیتی کی زمین میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے رب تاکہ یہ نماز قائم کریں''۔

(تدبر قرآن، جلد اول)

وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ اور زکوٰۃ ادا کرو، فعل امر جمع مذکر (ءت ی) اٰتیَ یُؤتِیُ۔ دینا، عطا کرنا، زکوٰۃ زکا سے مشتق ہے، پھلنا پھولنا، بڑھنا اور نشو و نما پانا اور اسی سے لفظ تزکیہ ہے صاف ستھرا بنانا، جیسا

کہ تزکیۂ نفس۔ نفس کو صاف ستھرا بنانا یعنی اعمال صالحہ سے اپنے نفس کی اصلاح کرنا اور عربی محاورہ ہے، زَکَا الزَّرْعُ یَزْکُو، کھیتی کا بڑھنا اور پھلنا پھولنا، زکوٰۃ، مال میں سے وہ حصہ ہے جو حق الٰہی کے طور پر نکال کر فقراء و مساکین کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوٰۃ یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں خیر و برکت کی امید ہوتی ہے یا اس لیے کہ اس سے نفس پاکیزہ ہوتا ہے، (مفردات القرآن) گویا کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے نہ صرف مال اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑھتا ہے بلکہ دنیا سے محبت ختم ہو کر آخرت کی طرف توجہ بڑھتی ہے۔

وَارْکَعُوْا (وَ-اِرْکَعُوا) اور۔تم رکوع کرو، رَکَعَ یَرْکَعُ، سے اِرْکَعْ اور جمع اِرْکَعُوْا، تم سب رکوع کرو اسم فاعل راکع اور جمع راکعون۔ رکوع کرنے والے، رکوع ارکان نماز میں سے ایک رکن ہے مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (رکوع کرنے والوں کے ساتھ) مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھو۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) نماز نہ صرف خالق و مالک کی بندگی اور اس کی مدد تلاش کرنے کا بہترین ذریعہ ہے بلکہ معاشرتی زندگی کو مضبوط بنانے کا وسیلہ بھی۔

۲) زکوٰۃ معاشی مسائل کا بہترین حل ہے، گویا کہ نماز اور زکوٰۃ کے ذریعے معاشرہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، اگر پاکستان میں ان دونوں چیزوں کا عملی طور پر نفاذ ہو جائے تو ہمارے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ نظامِ صلوۃ سے تمام معاشرتی مسائل اور نظام زکوٰۃ سے تمام معاشی مسائل حل ہو جائیں گے، ان شاء اللہ!

أَ تَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۴۴)	''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو مگر خود کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب (تورات) کی تلاوت کرتے ہو، پھر تم کیوں نہیں عقل کرتے؟''

أَ کلمہ استفہام (Interrogative) ہے ''کیا'' کے معنی دیتا ہے۔ تَأْمُرُوْنَ، تم حکم دیتے ہو، فعل

مضارع جمع مذکر مخاطب (اَمَرَ یَاْمُرُ، اَمْرًا) حکم دینا، اَلْبِرُّ، کا لفظ تمام قسم کی نیکیوں کو شامل ہے۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

''اَلْبِرُّ اَیُ التَّوَسُّعُ فِیُ فِعْلِ الْخَیْرِ'' (مفردات القرآن) لفظ بِرّ اعمالِ حسنہ کے لیے وسیع لفظ ہے۔

اَلْبِرُّ هُوَ اِسْمٌ جَامِعٌ لِاَعْمَالِ الْخَیْرِ (تفسیر کبیر) ''اعمال خیر کے لیے ایک جامع لفظ ہے۔''

اَلْبِرُّ۔ صدق، اطاعت، تقویٰ نیکی اور توسع فی الخیر کے لیے آتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ، وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ، وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ، وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّكٰوةَ، وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا، وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ، اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (البقرہ۲:۱۷۷)

''(عبادت کے وقت) تمہارا مشرق اور مغرب کی طرف رخ کر لینا ہی نیکی نہیں (یہ تو نظم ملّی کا تقاضا ہے) اصل نیکی تو اس شخص کی ہے جس کا اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان ہے، ملائکہ اور کتب (سماویہ) اور انبیا پر ایمان ہے اور جو اپنا مال اللہ کی محبت میں رشتہ داروں یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور (قید یا قرض سے) گردن چھڑانے میں خرچ کرتے رہتے ہیں، نمازیں قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں، جو عہد کرتے ہیں تو ان کا ایفا کرتے ہیں، نیز تنگدستی بیماری اور لڑائی کی حالت میں صبر کرنے والے ہیں، یہی لوگ تو تقویٰ شعار ہیں۔''

﴿وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (ن س ی) نَسِیَ یَنْسَی نِسْیَانٌ بھول جانا، فراموش کرنا، نظر انداز کر دینا، کسی چیز کے ضبط کو ترک کرنا جو اسے ودیعت کی گئی ہو، (اَنْفُسَ – كُمْ) اپنے نفسوں کو، نفس کی جمع اَنفس، كُمْ ضمیر جمع مذکر (متصل) مخاطب کے لیے ہے۔ ﴿وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ (وَاَنْتُمْ) اور تم سب ضمیر (متصل) جمع مخاطب تَتْلُوْن (ت ل و) تَلَا یَتْلُوْ، تِلَاوَةً، اس طرح پڑھنا کہ مفہوم و معنی کو سمجھتے جانا (to follow meanings while reading) تلاوت کا لفظ کتب سماویہ کے لیے مخصوص ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تلاوت کی اصل غرض و غایت تلاوت شدہ آیات پر تدبر و تفکر کرنا اور ان پر عمل کرنا ہے، قرآن حکیم میں ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ (البقرہ۲:۱۲۱) ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے یوں پڑھتے ہیں جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے (حقیقت میں) یہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں''۔

قرآن حکیم نے بار بار اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ اسے سوچ سمجھ کر پڑھو، غور وفکر کرو اور اس کی ہدایات پر عمل کرو، اسی میں تمہاری کامیابی کا راز ہے۔

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ اَفَلَا جملہ استفہامیہ ہے، تَعْقِلُوْنَ (ع ق ل) عَقَلَ یَعْقِلُ عَقْلًا، عَقَلُ کے اصل معنی روکنے اور پکڑ لینے کے ہیں، اسی سے عَقَالٌ اس رسی کو کہا جاتا ہے جس سے اونٹ کے زانو کو باندھا جائے، قبول علم اور عملی قوت کا نام عقل ہے، یہ وہ روشنی ہے جس سے انسان کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر بہت بڑا انعام ہے، جو لوگ اس سے ٹھیک ٹھیک فائدہ اٹھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے بصیرت حاصل کر کے عمل کرتے ہیں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں اور جو عقل کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں وہ ناکام ہو جاتے ہیں۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''اس آیت کا رخ اگرچہ ابتداءً بنی اسرائیل کی اس وقت کی حالت و کیفیت کی طرف ہے لیکن اس میں جو تعلیم ہے وہ نوع انسانی کے لیے عموماً اور رجال دین کے لیے خصوصاً دائمی حیثیت رکھتی ہے! یہ ہدایت نہ کسی قوم کے لیے خاص ہے اور نہ کسی دور کے لوگوں تک محدود!

جب دین کاروبار اور پیشہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے تو رجال دین اور علماء و مشائخ، میں یہ کمزوری پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے منہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتیں! وہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں مگر خود اس پر عمل نہیں کرتے، لوگوں کو حق شناسی کی دعوت دیتے ہیں مگر خود حق کو نہیں پہچانتے، وہ اللہ کے کلام کی تحریف کرتے، اسے اس کے مقام سے ہٹاتے اور صریح اور قطعی نصوص کی تاویل کرتے ہیں، اور یہ سب کچھ اپنی اغراض وخواہشات کی تکمیل کے لئے..... وہ ایسے فتوے دیتے اور ایسی تاویلات کرتے ہیں جو آیات الٰہی کے ظاہری مفہوم سے بظاہر اتفاق کرتی نظر آتی ہیں مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ دین کی حقیقت سے بالکل مختلف ہوتی ہیں اور وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں کہ اربابِ ثروت اور اصحابِ اقتدار کی اغراض وخواہشات پوری ہوں۔ جیسا کہ علمائے یہود کرتے تھے۔

نیکی کی طرف دعوت دینا اور داعی کی عملی زندگی کا، اس سے مختلف ہونا، ایک ایسی علت ہے جس سے نہ صرف داعی بلکہ نفس دعوت کے سلسلے میں لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہوتے ہیں! بلکہ اس سے لوگوں کے قلوب اور ان کے افکار متزلزل ہو جاتے ہیں، وہ اپنے کانوں سے عمدہ اور خوبصورت باتیں سنتے اور آنکھوں سے اعمالِ بد کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ قول و عمل کے اس تضاد سے وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں، عقیدہ سے ان کی روح میں جو شعلہ پیدا ہوا تھا، وہ بجھ جاتا ہے اور ایمان سے ان کے دل میں جو نور روشن ہوا تھا، وہ رخصت ہو جاتا ہے، دین کے حامل افراد پر سے ان کا اعتماد اٹھ جانے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود دین پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

دعوت خواہ کتنی ہی زوردار، جوشیلی اور شعلہ بیانی سے پر کیوں نہ ہو، داعی کا دل اگر ایمان سے معمور نہیں ہے تو وہ ایک مردہ اور بے جان بات اور بجھی ہوئی آگ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کوئی انسان کسی شخص کی دعوت کو حق تسلیم نہیں کر سکتا جب تک کہ داعی اپنی دعوت کا زندہ ترجمان اور مجسم پیکر نہ ہو، جب داعی اپنی دعوت کا چلتا پھرتا نمونہ ہوتا ہے تو لوگ اس کی دعوت پر یقین اور اس پر بھروسہ کرنے لگتے ہیں۔ خواہ دعوت میں جوش و خروش اور چمک دمک نہ ہو، اس دعوت کو قوت داعی کی عملی زندگی سے حاصل ہوتی ہے، نہ کہ دعوت کی بلند آہنگی سے، اس دعوت کو حسن و جمال کردار کی سچائی سے ملتا ہے نہ کہ دعوت کی چمک دمک سے، یہ دعوت سرتاپا زندگی ہوتی ہے کیونکہ وہ زندگی سے پھوٹتی ہے۔

قول و فعل میں مطابقت اور عقیدہ و عمل میں ہم آہنگی کی اس اہمیت کی بنا پر کوئی آسان کام اور سہل اور ہموار راستہ نہیں ہے، اس کے لیے بڑی ریاضت، جدوجہد اور تگ و دو کی ضرورت ہے، اس کے لیے اللہ سے تعلق ضروری اور اس سے استعانت ناگزیر ہے، یہ کام اللہ کی ہدایت سے مدد حاصل کیے بغیر نہیں ہو سکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ عملی زندگی کے حالات و ضروریات اور اس کی مجبوریاں بسا اوقات ایک شخص کو اس حق سے عملاً دور کر دیتی ہیں، جس پر وہ دل کی گہرائیوں سے یقین رکھتا ہے یا جس کی طرف داعیان حق اسے دعوت دیتے ہیں، فانی انسان کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، بہرحال وہ کمزور ہی ہے جب تک وہ اللہ تعالیٰ کی دائمی قوت سے تعلق قائم نہ کر لے، شر، طغیان اور ضلالت و گمراہی کی طاقتیں اس سے زیادہ قوی ہیں، حق پرست انسان اگرچہ ان طاقتوں سے جنگ میں بار بار غالب و فتح مند ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کمزوری و ناتوانی کا شکار ہو کر لڑکھڑاتا اور پستیوں میں جا گرتا ہے اور پھر ماضی، حال اور مستقبل، سب کا زیاں اس کے

حصے میں آتا ہے، ہاں! جب وہ اللہ تعالیٰ کی ازلی وابدی قوت سے رشتہ جوڑ لیتا ہے تو وہ سراپا طاقت بن جاتا ہے۔ ہر طاقت ور سے زیادہ طاقت ور، وہ اپنی خواہشات اور ضعف پر قابو پالیتا ہے اور اپنی ضروریات اور مجبوریوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے، وہ ان تمام اربابِ طاقت واقتدار سے زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے جو (راہ حق میں) اس کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہوں۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) دعوتِ حق صرف اور صرف اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب داعی کی اپنی زندگی اخلاق حسنہ کا نمونہ ہو اور اسی کا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں ثبت ہوتا ہے۔

۲) عمل اور اخلاق کے حصول کے لیے رب کائنات سے مدد اور استعانت ناگزیر ہے کہ بندہ صرف اسی کی رحمت اور مدد کے سہارے اس کمال سے آراستہ ہوسکتا ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ، وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (۴۵) اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۴۶)	''(ہر حال میں اللہ ہی سے) مدد چاہو صبر اور نماز سے، بلاشبہ (صبر اور نماز) بھاری ہے مگر ان لوگوں پر نہیں (جو اللہ کے آگے) عاجزی اختیار کرنے والے ہیں۔ (یہی وہ لوگ ہیں) جو یقین رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کے روبرو حاضر ہونا ہے اور بلاشبہ اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔''

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ (اِسْتَعَانَ يَسْتَعِيْنُ، اِسْتِعَانَةً) باب استفعال، مدد طلب کرنا، الصبر- عقل وشریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضا کے مطابق اپنے آپ کو روک رکھنا، صبر ایک عام لفظ ہے جو مختلف مواقع پر استعمال کے اعتبار سے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، چنانچہ کسی مصیبت پر نفس کو روک رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے۔ یہ جزع فزع (چیخ وپکار) کی ضد ہے، اور جنگ میں نفس

کو روک رکھنے کو شجاعت کہا جاتا ہے اس کی ضد جُبْن (بزدلی) ہے، یعنی صبر اگر کسی پریشان کن حادثہ کو برداشت کرنے کی صورت میں ہو تو اسے رَحْبُ الصَّدْرِ (کشادہ دلی) کہتے ہیں جس کی ضد ضَجَرٌ (تنگ دلی) ہے۔ (مفردات القرآن)

قرآن حکیم کی چند آیات پر غور کیجئے:

(۱) جان و مال کے نقصان پر صبر

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ، وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (البقرۃ ۲:۱۵۳) ''اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک، مال اور جانوں کے نقصان، نیز میووں (اور فصلوں) کے خسارے سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صابرین کو (اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی) بشارت سنا دیجئے''۔

(۲) دشمن کے مقابلے میں صبر

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (ال عمران ۳:۲۰۰) ''اے اہل ایمان (کفار کے مقابلے میں) ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو اور (مورچوں پر) جمے رہو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ مراد حاصل کرو''۔

(۳) دعوت و تبلیغ میں صبر

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ، اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان ۳۱:۱۷) ''(لقمان نے کہا) اے میرے بیٹے! نماز کی پابندی رکھنا اور (لوگوں کو) اچھے کام کرنے کا حکم دینا اور بری باتوں سے منع کرتے رہنا اور (اس سلسلہ میں) جو مصیبت تجھ پر واقع ہو اس پر صبر کرنا، بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں''۔

(۴) دوسروں کو معاف کر دینا بھی صبر ہے

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ، وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (النحل ۱۶:۱۲۶) ''اور اگر تم ان کو تکلیف دینا چاہو تو اتنی ہی دو جتنی تکلیف تم کو ان سے پہنچی ہے اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت اچھا ہے (اللہ انہیں اجر عظیم سے نوازے گا)''۔

غرضیکہ صبر زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کی سنہری کلید ہے (Golden Key) ہے، صبر کے

ساتھ اَلصَّلٰوۃَ (نماز) کا ذکر آیا ہے، صلوٰۃ کے لغوی معنی دعا مانگنے اور رحمت طلب کرنے کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں اس طرح نماز ادا کرنا ہے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھ کر دکھائی ہے۔(صَلُّوا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِی اُصَلِّیْ)[صحیح مسلم، صحیح بخاری:۶۰۰۸]

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

اگر تمہیں نیکی کے راستے پر چلنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے تو اس دشواری کا علاج صبر اور نماز ہے، ان دو چیزوں سے تمہیں وہ طاقت ملے گی جس سے یہ راہ آسان ہو جائیگی۔(تفہیم القرآن، جلد اول)

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''صبر سے استعانت کی ضرورت بار بار پڑتی ہے، یہی وہ زادِراہ ہے جو ہر مشقت کا مقابلہ کرنے کے لیے ناگزیر ہے اور سب سے زیادہ مشقت کا کام یہ ہے کہ انسان حق کے احترام، اس کے ایثار اور حقیقت کے اعتراف اور اس کے آگے سرِتسلیم خم کرنے کے لیے سرداری و پیشوائی کے منصب اور اس سے وابستہ مفادات و منافع سے دست بردار ہو جائے اور نماز سے استعانت کیا ہے؟ نماز بندے اور رب کے مابین ربط و ملاقات کا نام ہے، ایسا ربط جس سے دل کو قوت حاصل ہوتی ہے اور روح اللہ تعالیٰ سے تعلق کا احساس کرتی ہے، نماز سے انسان کو (راہ حق کے لئے) وہ زادِراہ ملتا ہے جو دنیا کے تمام ساز و سامان سے زیادہ قیمتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو آپ نماز کی طرف لپکتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ سے آپ کا تعلق بہت پختہ تھا اور آپ کی روح وحی والہام کے ذریعہ اللہ سے مربوط تھی، یہ سرچشمہ حیات آج بھی ہر اس مومن کے دسترس میں ہے جسے راہ حق کے لیے توشہ درکار ہو، دوپہر کی شدید گرمی میں سیرابی کا طالب ہو، ہر طرف سے مدد کے مسدود ہونے پر مدد کا طالب ہو اور سامانِ سفر کے ختم ہو جانے کے بعد اسے زادِراہ کی ضرورت ہو۔(فی ظلال القرآن، جلد اول)

وَاِنَّهَا کی ضمیر کا مرجع الصلوٰۃ ہے، لَکَبِیْرَۃٌ یہاں پر لام تاکید کے لیے آیا ہے، کَبِیْرَۃٌ کے معنی ثقیل اور بوجھل کے ہیں یعنی نماز طبیعت پر گراں اور بھاری ہے، کس کے لئے؟ جس کی زندگی میں دین رچا بسا نہ ہو اور وہ شخص جو اسلام اور ایمان کی چاشنی سے محروم ہو، اس پر نماز کی پابندی شاق گزرتی ہے۔ اِلَّا کلمہ استثناء (مگر) خاشعین اسم فاعل (ڈرنے والے، عاجزی کرنے والے) خَشَعَ یَخْشَعُ، خَشْعًا وَ خُشُوْعًا عجز وانکسار کا اظہار کرنا، خَاشِعٌ عاجزی اختیار کرنے والا اور جمع خَاشِعُوْنَ، اور اِلَّا کی وجہ سے خَاشِعِیْنَ ہوا۔

خشوع اختیار کرنے والے کون لوگ ہیں؟ اَلَّذِیْنَ وہ لوگ جو یَظُنُّوْنَ (ظ ن ن) ظَنَّ یَظُنُّ ظَنًّا یقین کرنا، یَظُنُّوْنَ– اَیْ یَعْلَمُوْنَ وَیَسْتَیْقِنُوْنَ جو جانتے اور یقین کرتے ہیں۔ اَنَّھُمْ (اَنَّ–ھُمْ) بلاشبہ، وہ مُلَاقُوْا (ل ق ی) لَاقٰی یُلَاقِیْ (ملنا، کسی کے سامنے آنا) اس سے اسم فاعل مُلَاقُوْنَ، حاضر ہونے والے، سامنے آنے والے، مضاف ہونے کی وجہ سے 'نْ' گر گیا ہے۔ رَبِّھِمْ (رَبِّ–ھِمْ) رب، اپنے کے، یعنی جو لوگ اپنے رب کے پاس حاضر ہونے والے ہیں، وَاَنَّھُمْ اور بے شک وہ اِلَیْہِ (اِلٰی–ہِ) طرف، اس کے، رَاجِعُوْنَ (ر ج ع) رَجَعَ یَرْجِعُ رَجْعًا (لوٹنا، واپس ہونا) اس سے اسم فاعل رَاجِعُوْنَ۔ لوٹنے والے، عبادت میں خشوع وخضوع وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جنہیں اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے کا قوی یقین ہوتا ہے اور یہ یقین ان کے لیے مشکلات ومصائب پر صبر اور صلوٰۃ سے آسان ہو جاتا ہے۔

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) صبر اور صلوٰۃ مسلمانوں کے دکھوں اور پریشانیوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہترین انعام ہے اور خصوصاً آج جبکہ عالم اسلام پر نکبت وادبار کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ ان کے لیے یہ آیات روشنی فراہم کرتی ہیں۔

۲) نماز کے فیوض وبرکات سے حقیقی طور پر وہی لوگ فیضیاب ہو سکتے ہیں جنہیں آخرت میں اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے اور زندگی کے ہر معاملے میں جوابدہی کا یقینِ کامل ہو جو ہر وقت مستحضر رہے۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۴۷) وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَیْئًا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْھَا عَدْلٌ وَّ لَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ (۴۸)	''اے بنی اسرائیل! میرے ان احسانات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور (خاص طور پر) اس بات کو کہ میں نے تمہیں اہل جہاں پر فضیلت عطا کی تھی اور اس دن سے ڈرتے رہو جب نہ تو کوئی کسی دوسرے کے کام آسکے گا، نہ اس کے حق میں سفارش قبول ہوگی، نہ کسی سے فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔''

﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ﴾

اے بنی اسرائیل! میرے ان احسانات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور (خاص طور پر) اس بات کو کہ میں نے تمہیں اہل جہاں پر فضیلت عطا کی تھی۔

"یَا" حرف ندا بَنِیۡ اِسۡرَآءِیۡلَ بہ ترکیب اضافی، منادیٰ ہے "بنی" اِبْنٌ کی جمع اَبْنَاءٌ اور بَنُوْنَ دونوں طرح آتا ہے۔ بَنِیۡ چونکہ منادیٰ مضاف ہے اس لیے نصب (زبر کی حالت) میں ہے اور مضاف ہونے سے نون ساقط ہو گیا۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے، یا بنی اسرائیل، اے اولادِ یعقوب!، اُذْکُرُوا (ذ ک ر) ذَکَرَ یَذْکُرُ ذِکْرًا، سے فعل امر اُذْکُرْ اور جمع مذکر حاضر کا صیغہ اُذْکُرُوْا (تم سب یاد کرو) نِعْمَتِیَ (نِعْمَةِ–یْ) میری نعمتیں، میرے احسانات اَلَّتِی (جو) اسم موصول اَنْعَمْتُ ماضی واحد متکلم (میں نے انعام کیں) اَنْعَمَ یُنْعِمُ اِنْعَامًا باب افعال، عَلَیۡکُمۡ (عَلٰی–کم) تم پر وَاَنِّیْ، (اَنَّ–یْ) بلاشبہ، میں نے، اَنَّ کے بعد یا ئے متکلم اس میں تاکید ہے کہ صرف میری ذات نے تمہیں یہ نعمتیں عطا کی ہیں۔ فَضَّلْتُکُمْ (فَضَّلْتُ– کُمْ) میں نے فضیلت دی۔ تمہیں فَضَّلَ یُفَضِّلُ ، تَفْضِیْلٌ، باب تفعیل، فضیلت عطا کرنا، برتری دینا عَلَی الْعٰلَمِیْنَ، عَالَمٌ کی جمع عَالَمِیْنَ، بہت سے جہاں، اقوام عالم یعنی دنیا کی قوموں پر تمہیں برتری اور فضیلت عطا کی۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"یہ اس دور کی طرف اشارہ ہے جب کہ تمام دنیا کی قوموں میں ایک بنی اسرائیل کی قوم ہی ایسی تھی، جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا علم حق تھا اور جسے اقوام عالم کا امام و رہنما بنا دیا گیا تھا، تاکہ وہ بندگیِ رب کے راستے پر سب قوموں کو بلائے اور چلائے۔" (تفہیم القرآن، جلد اول)

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اقوام عالم پر فضیلت عطا کی تھی (کہ پے در پے انبیاء کرام کا سلسلہ ان میں جاری رہا، انہیں اس بات کی یاد دہانی اس لیے کرائی گئی کہ وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس سے کئے ہوئے عہد کو یاد کریں، اس میں اس بات کی ترغیب بھی ہے کہ دعوتِ اسلامی نے ان کے لیے جو

سنہری موقع فراہم کیا ہے، وہ آگے بڑھ کر اس سے فائدہ اٹھائیں اور اللہ نے ان کے آباؤ واجداد کو جو فضیلت بخشی تھی، اس کا شکر ادا کرتے ہوئے اللہ کے عہد کی طرف واپس آجائیں، اس طرح وہ اس مقام عزت کے بھی مستحق ہوں گے جو اہل ایمان کو ملنے والا ہے۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾

اور اس دن سے ڈرتے رہو جب نہ تو کوئی کسی دوسرے کے کام آسکے گا، نہ اس کے حق میں سفارش قبول ہوگی، نہ کسی سے فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔''

وَاتَّقُوْا (اور ڈرو) فعل امر جمع مذکر، اِتَّقَى يَتَّقِىْ، اِتِّقَاءٌ باب افتعال، يَوْمًا (اس دن سے) یعنی روز جزا وسزا سے، لَا تَجْزِىْ (نہ فائدہ دے گا) فعل مضارع واحد مونث غائب، جَزٰى يَجْزِىْ جَزَاءً، جزاء کے اصل معنی کافی ہونے، یا فائدہ دینے کے ہیں یعنی روز قیامت کوئی نفس کسی دوسرے نفس کو کچھ بھی فائدہ نہ دے سکے گا۔ شَيْئًا اسم نکرہ، کچھ بھی، ذرہ بھر بھی۔ اس لفظ نے معاملہ کو واشگاف کر دیا ہے۔ وَلَا يُقْبَلُ اور نہ قبول کی جائے گی (قَبِلَ يَقْبَلُ، قَبُوْلًا) سے يُقْبَلُ فعل مضارع مجہول (قبول کیا جانا) مِنْهَا (مِنْ– هَا) سے، اس هَا کی ضمیر نفس کی طرف جاتی ہے یعنی اس نفس سے، شَفَاعَةٌ، درخواست، سفارش، وَلَا يُؤْخَذُ اور نہ لیا جائے گا، مضارع مجہول فعل نہی (اَخَذَ يَأْخُذُ اَخْذًا) لینا، حاصل کرنا يَأْخُذُ سے مجہول کا صیغہ يُؤْخَذُ، مِنْهَا، اس نفس سے عَدْلٌ کے معنی عوض، بدلہ، فدیہ اور معاوضہ کے ہیں، وَلَا هُمْ اور نہ ان کی، يُنْصَرُوْنَ، ان کی مدد کی جائے گی۔ مضارع مجہول جمع مذکر غائب، نَصَرَ يَنْصُرُ، نَصْرًا يَنْصُرُ سے جمع کا صیغہ يَنْصُرُوْنَ اور مجہول کا صیغہ۔ يُنْصَرُوْنَ۔

علامہ بیضاویؒ فرماتے ہیں: یہ آیہ مبارکہ ہر لحاظ سے عذاب کو دور کرنے کی کلی طور پر نفی کرتی ہے۔

غور کیجئے کہ کوئی شخص کسی جرم کا مرتکب ہو اور اسے عدالت میں پیش کیا جائے تو سزا سے بچنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ:

(الف) کوئی دوسرا شخص مجرم کی جگہ اپنے آپ کو پیش کر دے۔

(ب) کسی بڑے کی سفارش ہو جائے اور یوں مجرم کی نجات ہو جائے۔

(ج) جرمانہ اور معاوضہ ادا کر کے مجرم کو چھڑا لیا جائے۔

(د) یا رومددگار آ کر اپنی قوت وطاقت سے کام لے کر ملزم کو چھڑا لیں۔

یوم جزا وسزا مندرجہ بالا تمام باتیں بے سود اور بے اثر ہو جائیں گی صرف اور صرف ایمان اور اعمال صالحہ نجات کا ذریعہ ہوں گے۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو کئی مقامات پر واضح کیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہوا: یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ وَ صَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ لِكُلِّ امْرِیءٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ (عبس ۸۰: ۳۴-۳۷) ''(اس دن ایسی نفسانفسی پڑی ہوگی) کہ آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص کو اپنی اپنی نجات کی فکر ہوگی کہ وہ اس کو اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا''

دوسری جگہ فرمایا: لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ، یَوْمَ الْقِیَامَةِ یَفْصِلُ بَیْنَكُمْ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (الْمُمْتَحِنَة ۶۰: ۳) ''(یوم قیامت) نہ تمہارے رشتے ناتے کچھ فائدہ دیں گے اور نہ تمہاری اولاد۔ وہ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا (اور یاد رکھو) جو کچھ بھی تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اسے باریک بین نگاہوں سے دیکھ رہا ہے''۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے ان گنت احسانات وانعامات ہیں جن میں سے انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری اور جو کتب ان پر نازل کی گئیں نیز ان نفوس قدسیہ کی پاکیزہ سیرتیں، احساناتِ ربانی میں سے سرفہرست ہیں۔

۲) قیامت میں نجات کے لیے حسب ونسب، قبیلہ اور برادری، مال ودولت اور زور وزر کام نہ آئیں گے بلکہ صرف اور صرف نیک اعمال کامیابی کا ذریعہ بنیں گے۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ (۴۹) وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۵۰)	''(اے آل یعقوب اس دن کو یاد کرو) جب ہم نے تمہیں فرعون کے اعوان وانصار سے نجات دی تھی، یہ لوگ تمہیں سخت دکھ دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کرڈالتے اور (خدمت گزاری کے لئے) تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی اور جب ہم نے تمہاری خاطر دریا کو پھاڑا، تو ہم نے تمہیں نجات دی اور فرعون کے اعوان و انصار کو تمہارے دیکھتے دیکھتے غرق کردیا۔''

﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾

اور جب ہم نے نجات دی تمہیں فرعون کے اعوان وانصار سے۔

(نجینا-کم) ہم نے نجات دی۔ تمہیں (ن ج ی) نجّٰی یُنَجِّی سے جمع متکلم کا صیغہ نَجَّيْنَاہ نجات کے معنی اَلْاِزْ تِفَاعُ مِنَ الْهَلَاكِ، ہلاکت سے دُوری کو نجات کہتے ہیں (مفردات القرآن) مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ، فرعون کے اعوان وانصار سے، اٰل اور اَهْل قریب قریب معنی رکھتے ہیں، ان میں فرق یہ ہے کہ اٰل صرف معرفہ کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اہل عام ہے جیسا کہ فلاں شخص کے اہل وعیال اور یہ معرفہ اور نکرہ دونوں کی طرف منسوب ہوسکتا ہے، جبکہ اٰل صرف خصوصیت اور اہمیت رکھنے والوں کے لیے آتا ہے خواہ وہ خصوصیت قریبی قرابت کے لحاظ سے ہو یا دین وایمان کے لحاظ سے ہو۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''اٰل سے مراد صرف کسی شخص کی اولاد نہیں ہوا کرتی بلکہ یہ لفظ آل واولاد، قبیلہ وقوم اور اتباع وانصار سب پر حاوی ہے۔'' (تدبر قرآن)

قرآن حکیم میں ہے: وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (الاعراف ۷:۱۳۰) ''اور پھر ہم نے فرعونیوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ

شاید وہ کوئی سبق حاصل کریں۔''

اس آیہ مبارکہ میں جس عذاب کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ فرعون اور اس کی ساری قوم ہی پر آیا، اور سورہ البقرہ آیت ۵۰ میں وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ سے مراد فرعون اور اس کا لاؤلشکر ہے۔

﴿یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَ کُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَ کُمۡ وَ فِیۡ ذٰلِکُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ﴾

یہ لوگ تمہیں سخت دکھ دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے اور (خدمت گزاری کے لئے) تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔

یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ (س و م) سَامَ یَسُوۡمُ، سَوۡمًا وَسَامٌ، تکلیف دینا، سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ یعنی اس کے لیے شدید اور رسوا کن عذاب یُذَبِّحُوۡنَ (ذ ب ح) ذَبَّحَ یُذَبِّحُ تَذۡبِیۡحٌ باب تفعیل ذبح کرنا، اَبۡنَآءَ کُمۡ (اَبۡنَاءَ- کُمۡ) بیٹے تمہارے یعنی فرعون تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتا وَیَسۡتَحۡیُوۡنَ (ح ی ی) اِسۡتَحۡیٰ یَسۡتَحۡیِیۡ اِسۡتِحۡیَاءً، زندہ رکھنا، بابِ استفعال ہے نِسَآءَ کُمۡ (نِسَاءَ- کُمۡ) عورتیں تمہاری، اِمۡرَاَۃٌ۔عورت اور اس کی جمع نساءٌ ہے۔وَفِیۡ ذٰلِکُمۡ اور اس بات میں بَلَآءٌ (ب ل و) بَلَا یَبۡلُوۡ، آزمانا، آزمائش کرنا، اور بَلَاءٌ آزمائش، مِنۡ رَّبِّکُمۡ تمہارے رب کی طرف سے، عَظِیۡمٌ بہت بڑی، یعنی اس بات میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

''یوسف علیہ السلام کے زمانہ سے بنی اسرائیل مصر میں آ کر آباد ہوئے، موسیٰ علیہ السلام تک ان کو تقریباً چار صدیاں ہوئیں، اس عرصے میں قبطیوں نے تمام مناصب پر قبضہ جما لیا اور سارے نظام حکومت پر چھا گئے، بنی اسرائیل کے لیے سوائے محنت و مزدوری کے اور کوئی کام باقی نہ رہا، ادھر فراعنہ نے جب یہ دیکھا کہ بنی اسرائیل زیادہ قوی اور ذہین ہیں تو انہیں خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ساری حکومت ہی ان کے ہاتھ میں نہ آ جائے، عموماً حکومتیں زور آور اور توانا قوموں سے خائف رہتی ہیں، اس لیے انہوں نے اور زیادہ مظالم توڑے تاکہ ان میں رہی سہی قوت بھی جاتی رہے، بالآخر جب کاہنوں نے فرعون کو ڈرایا کہ بنی اسرائیل میں ایک شان دار انسان پیدا ہونے والا ہے جس سے تیری جابرانہ حکومت خطرہ میں پڑ جائے گی تو اس نے بچوں

کے قتل عام کا حکم دے دیا اور بچیوں کو خدمت وغیرہ کے لیے زندہ باقی رکھا، ان آیات میں ان ہی واقعات کی طرف اشارہ ہے کہ دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس ذلت و خِفّت سے نجات دی تم میں موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا جس نے تمہیں آزادی و حریت کی نعمتوں سے بہرہ ور کیا۔'' (سراج البیان، جلد اول)

خواجہ عبدالحیؒ فاروقی لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ مصر کے بادشاہ (فرعون) نے ایک خواب دیکھا، صبح کو تمام کاہنوں کو جمع کر کے ان سے اس کی تعبیر پوچھی کہ میں نے بیت المقدس کی طرف ایک آگ آتے دیکھی ہے، جس نے تمام مصر کو گھیر لیا ہے اور چن چن کر ایک ایک قبطی کو جلا دیا ہے یہ سن کر کاہنوں نے کہا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص پیدا ہوگا جو آپ کی ہلاکت اور سلطنت کے زوال کا سبب بنے گا، فرعون نے ملک کی تمام دائیوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو، فوراً قتل کر دیا جائے البتہ لڑکی کو زندہ چھوڑ دیا جائے، اس حکم کے مطابق بنی اسرائیل کے ہزاروں بچے پیدا ہوتے ہی قتل کر دیئے گئے۔'' (درس قرآن، جلد اول)

﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾

اور جب ہم نے تمہاری خاطر دریا کو پھاڑا، تو ہم نے تمہیں نجات دی اور فرعون کے اعوان و انصار کو تمہارے دیکھتے دیکھتے غرق کر دیا۔

وَاِذْ فَرَقْنَا اور جب ہم نے پھاڑا (ف ر ق) فَرَقَ يَفْرِقُ، جدا کرنا، الگ الگ کرنا، بِكُمْ (بِ-كُمْ) لئے۔ تمہارے اَیْ فَرَقْنَا بِسَبَبِكُمْ وَ بِسَبَبِ اِنْجَائِكُمْ (کشاف) یعنی تمہاری وجہ سے اور محض تمہیں نجات دینے کے لیے اَلْبَحْرَ، ایسی وسیع جگہ جہاں بہت سا پانی جمع ہو، یہ لفظ بڑے دریا اور سمندر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اَلْبَحْرَ۔ سمندر۔ بڑا دریا (مصباح اللغات) فَاَنْجَيْنَاكُمْ (فَ-اَنْجَيْنَا-كُمْ) پس۔ بچایا ہم نے۔ تمہیں (ن ج و) اَنْجٰى يُنْجِيْ۔ نجات دینا، وَاَغْرَقْنَا اور ہم نے غرق کیا (غ ر ق) اَغْرَقَ يُغْرِقُ اِغْرَاقًا (باب افعال) غرق کرنا۔ اٰلَ فِرْعَوْنَ اور فرعون کے لاؤ لشکر کو، فرعون مصر کے بادشاہ کا لقب تھا اور ہر حکومت کرنے والے بادشاہ کے لیے بولا جاتا تھا جیسا کہ چین کے بادشاہ کو خاقان اور روم کے بادشاہ کو قیصر اور ایران کے بادشاہ کو کسریٰ کہتے تھے، وَاَنْتُمْ اور تم سب، تَنْظُرُوْنَ (نَظَرَ- يَنْظُرُ- نَظْرًا) دیکھنا یعنی یہ سب کچھ تمہارے سامنے ہوا اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

الْبَحْر سے مراد یہاں دریائے قلزم ہے، موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو آمادہ کرلیا کہ وہ راتوں رات ارض مصر سے نکل جائیں۔ یہ ہجرت اس لیے تھی تاکہ فرعون کے اثر سے الگ رہ کر ان میں صحیح طریقہ پر دین کی روح پھونکی جائے، غلامی سے دماغی اور ذہنی قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ضرورت تھی کہ آزاد آب وہوا میں انہیں لے جایا جائے، فرعون کو جب یہ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل ہاتھ سے نکلے جاتے ہیں تو اس نے باقاعدہ بنی اسرائیل کا تعاقب کیا اور دریائے قلزم پر ان کو جالیا (وہ اللہ کے حکم سے) دریا پھٹ جانے کی وجہ سے پار اتر گئے اور فرعون مع اپنے لشکر کے دریا میں ڈوب گیا، یہ اس لیے تھا کہ بنی اسرائیل اپنی آنکھوں سے دشمن کا عبرتناک انجام دیکھ لیں۔'' (سراج البیان، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) جو قوم اپنی فلاح و بہبود کے لیے تگ ودو کرتی ہے اللہ کی رحمتیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔

۲) مصائب ومشکلات سے نکالنے والا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے اور جب کسی قوم پر نکبت وادبار کی گھٹائیں چھا رہی ہوں تو افرادِ قوم کو اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کر کے اپنا راستہ سیدھا کرنا ضروری ہے۔ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے حقدار ٹھہریں، آج پاکستانی قوم کا حال بھی شاید ایسا ہی ہے۔

۳) ظالموں کا انجام بالآخر فرعون اور اس کے لاؤ لشکر ایسا ہوتا ہے، حکمرانوں اور خاص طور پاکستانی حکمرانوں کو ان آیات سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

۴) ظُلم بہرحال ظُلم ہے، وہ جلد یا بدیر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۵۱) ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵۲)	''اور جب ہم نے موسیٰؑ کو چالیس راتوں کے وعدہ پر بلایا، پھر (ان کی غیر موجودگی میں) تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم فی الواقع ظالم تھے، پھر اس کے بعد ہم نے تمہارا یہ جرم بھی معاف کر دیا، کہ شاید تم شکرگزار بن جاؤ۔''

﴿وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾

''اور جب ہم نے موسیٰؑ کو چالیس راتوں کے وعدہ پر بلایا۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا۔ اور جب ہم نے وعدہ کیا۔ (و ع د) وَاعَدَ یُوَاعِدُ۔ایک دوسرے سے وعدہ کرنا (باب مفاعلہ) موسیٰ علیہ السلام نے حاضری کا اور اللہ تعالیٰ نے کتاب عطا فرمانے کا وعدہ کیا۔ موسیٰ بن عمران، سلسلہ اسرائیلی کے سب سے زیادہ مشہور و جلیل القدر پیغمبر کا نام ہے، آپ کا زمانہ مورخین کا تخمینہ ہے کہ پندرھویں اور سولہویں صدی قبل مسیح کا تھا۔ (تفسیر ماجدی)

اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ موسیٰ عبرانی لفظ ہے، بعض محققین نے مصری لفظ بیان کیا ہے، جس کے معنی بچہ یا بیٹا کے ہیں، آپ کے والد کا نام عمران تھا، آپ کی بہن مریم اور بھائی ہارون تھے اور یہ دونوں آپ سے بڑے تھے، آپ نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلائی۔ (درس قرآن)

اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً، چالیس راتیں، غروب آفتاب سے صبح صادق تک کے وقت کو لیل کہا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ وعدے کا زمانہ ذوالقعدہ کا پورا مہینہ اور دس دن ذوالحجہ کے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

جب بنی اسرائیل فرعون کے پنجۂ استبداد سے نجات پا کر جزیرہ نمائے سینا میں پہنچ گئے تو وہ اب ایک آزاد قوم تھے، جن کے لیے زندگی گزارنے کے لیے قانون اور دستور العمل کی ضرورت تھی، ورنہ ضابطہ نہ ہونے کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ ان کے خیالات میں انتشار اور روزمرہ کے معاملات میں فساد نہ پھیل جائے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ کوہ طور پر آ کر چالیس روز تک اعتکاف کریں کہ ذکر و فکر سے روح اپنے کمال کو پہنچتی ہے۔ یہ مدت گزرنے کے بعد سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ ہدایت تورات سے نوازا کہ اس کی تعلیمات سے اپنی قوم کو آگاہ فرمائیں۔

﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾

پھر (ان کی غیر موجودگی میں) تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم فی الواقع ظالم تھے۔

ثُمَّ۔ پھر۔ حرف عطف ہے، ترتیب اور تراخی کے لیے مستعمل ہے (مصباح اللغات) اِتَّخَذْتُمْ تم نے بنایا، پکڑا۔ ماضی جمع مذکر مخاطب (اِتَّخَذَ یَتَّخِذُ، اِتِّخَاذٌ) باب افتعال، اَلْعِجْلَ، بچھڑا، گائے کا بچہ۔ فرعون

کی قوم گوسالہ پرستی میں مبتلا تھی، شاید ان کی دیکھا دیکھی یہ بھی اس برائی میں مبتلا ہوئے، مِنۡ بَعۡدِہٖ، اَیۡ مِنۡ بَعۡدِ ذَھَابِ موسیٰ یعنی موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد، وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ اور تم سب ظالم تھے، گائے کو معبود بنانا صریحاً شرک تھا اور قرآن شرک کو ظلم عظیم قرار دیتا ہے، اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ. (لقمن ۳۱:۱۳)

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام تو وہاں مصروفِ ذکر اللہ تھے، ان کی غیر حاضری میں بنی اسرائیل کی قوم نے سونے چاندی کا بچھڑا پوجنا شروع کر دیا، اور اس کے مختلف اسباب تھے۔

(۱) یہ لوگ مصر میں قریباً چار سو سال سے مقیم تھے، مصری گائے کی پرستش کیا کرتے تھے، بنی اسرائیل نے انہیں دیکھا، تو انہوں نے بھی اس کی پوجا شروع کر دی اور یہ ان کی صحبت و ہم نشینی کا اثر تھا۔

(۲) بنی اسرائیل مدت ہائے دراز سے مصریوں کے ماتحت زندگی بسر کر رہے تھے، فرعون نے تمام جلیل القدر عہدے اپنی قوم کے لیے مخصوص کر لیے تھے اور ادنیٰ ترین کام ان کے سپرد تھے، ان کی آمدنی کے اسباب و ذرائع بند تھے، جس قدر ملتا تھا، ان کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہوتا تھا، اس لیے انہیں دولت کے ساتھ الفت و دلبستگی ہوگئی اور یہ ہر غلام و محکوم کے امتیازات میں سے ہے کہ اسے دولت سے محبت پیدا ہو، پھر روپیہ ان کا امام و پیشوا ہوتا ہے اور یہی ان کا قبلہ و کعبہ اور مسجود، ان کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

گر جاں طلبی مضائقہ نیست
وگر زر طلبی سخن دریں است

بنی اسرائیل آزاد ہو چکے ہیں، اب ان پر کسی انسان کی حکومت نہیں ہے، ایک اللہ کے غلام ہیں، آزاد سرزمین ہے اور وہ ہیں، مگر غلامی کے اثرات اب تک ان کے دل و دماغ پر حاوی ہیں اور ان کے رگ و پے میں جاری و ساری، جس وقت انہوں نے سونے چاندی کا بچھڑا دیکھا، فوراً یوں سجدے میں گر پڑے کہ اس کی بندگی ان کا مایۂ حیات ہے، چنانچہ ان کی آئندہ قومی زندگی میں اس قسم کے بکثرت واقعات پیش آئے جن سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوگئی کہ ان کا مقصد حیات صرف مال و دولت جمع کرنا تھا، کہیں ان کے بارے میں ان کا یہ قول نقل ہوا:

اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاءُ (ال عمران۳:۱۸۱) ''اللہ تو محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔'' (نعوذ باللہ)

اور کہیں انہیں تنبیہ ہو رہی ہے:

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (البقرہ۲:۴۱) ''اور نہ میری آیات کو تھوڑی قیمت پر بیچو۔''

صدیاں گزر گئیں، مگر یہ خصوصیت کبریٰ اب تک یہودیوں میں علی وجہ الکمال دکھائی دیتی ہے، ان سے بڑھ کر اور کوئی قوم صاحب دولت وثروت نظر نہیں آتی (امریکہ کی معیشت پر یہی لوگ چھائے ہوئے ہیں)

(۳) جب ایک قوم ترقی کرنے لگتی ہے تو قانون نہ ہونے کی شکل میں اس سے دو قسم کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ (یا قانون موجود ہو اور وہ اسے پس پشت ڈالے رکھے)

(الف) افراط: روحانیت میں جائز حدود سے تجاوز کر جانا، نصاریٰ نے عبداللہ کو ابن اللہ بنا دیا (اور یہودی بھی اس بارے میں نصاریٰ سے پیچھے نہ رہے)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (التوبہ۹:۳۰)

''اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ اُن کے منہ کی باتیں ہیں۔ پہلے کافر بھی اسی طرح کی باتیں کہا کرتے تھے یہ بھی انہیں کی ریس کرنے لگے ہیں۔ اللہ انہیں غارت کرے یہ کہاں بہکے جا رہے ہیں''۔

(ب) تفریط: مادیت میں بہت دور نقل جانا، یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو تاریخ مرتب کی ہے، اس کی بہترین مثال ہے، یہی دونوں اصولی غلطیاں ہیں جن سے سورۃ فاتحہ میں پناہ مانگی گئی ہے:

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (الفاتحہ۱:۷)

یہودی تفریط کی وجہ سے ہلاک ہوتے ہیں کہ وہ سرے سے مسیح علیہ السلام کا انکار کرتے ہیں اور عیسائی افراط میں مبتلا ہوتے کہ ایک بشر (عیسیٰ علیہ السلام) کو خدا بناتے ہیں۔

یہ لوگ (قوم موسیٰ) دونوں غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں (یعنی افراط وتفریط) سونے کا بچھڑا پوجنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات (جو ہر قسم کے شرک سے منزہ ہے) اس میں حلول کر گئی ہے..... بت پرست یہی خیال کرتے ہیں، پیر پرست اور قبروں کو پوجنے والے اس سے عبرت اندوز ہوں (یہ تفریط کی مثال ہے) افراط کی مثال آگے آئے گی جبکہ انہوں نے کہا:

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً (البقرہ۲:۵۵)
اور جب تم نے موسیٰ سے کہا کہ ''ہم تو جب تک اللہ کو علانیہ دیکھ نہ لیں تجھ پر ایمان نہ لائیں گے۔''
(الفرقان فی معارف القرآن)

﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ﴾
پھر اس کے بعد ہم نے تمہارا یہ جرم بھی معاف کر دیا، کہ شاید تم شکر گزار بن جاؤ۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ، ثُمَّ حرف عطف پھر، عَفَوْنَا، ہم نے معاف کیا فعل ماضی، جمع متکلم (ع ف و) عَفَا، یَعْفُوْ، عَفْوًا، معاف کرنا، عَنْکُمْ (عَنْ–کُم) سے، تم یعنی تمہیں معاف کر دیا، مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ، سے، پیچھے، اس کے، یعنی اس ظلم و شرک کے بعد، لَعَلَّکُمْ (لَعَلَّ–کُمْ) شاید، تم تَشْکُرُوْنَ شکر بجالاؤ (ش ک ر) شَکَرَ یَشْکُرُ، شُکْرًا شکر کرنا، شکر اظہار نعمت ہے جبکہ اس کے مقابل کفران نعمت لایا جاتا ہے، قوم موسیٰؑ کو سمجھایا جا رہا ہے کہ باوجود اتنی بڑی جرأت کے تمہیں تھوڑی سی سزا دے کر معاف کر دیا جس کی تفصیل آگے آئے گی اور پھر تمہیں زندگی کے نشیب و فراز سمجھنے کے لیے مکمل دستور العمل عنایت کیا۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) جو قوم اللہ کا قانون (دستورِ حیات) ملنے کے بعد بھی اس سے منہ موڑے اس سے زیادہ ظالم اور خاسر قوم اور کوئی نہیں ہو سکتی، یہ حال موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا تھا اور یہی حال اب امت مسلمہ کا ہو رہا ہے، اسی وجہ سے اس پر نکبت و ادبار کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔

۲) جو قوم اللہ کی بندگی ترک کر دیتی ہے پھر وہ کئی باطل معبود بنا لیتی ہے جیسا کہ قوم موسیٰؑ نے کیا، اس وقت مسلمانوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ وہ خواہشاتِ نفس کے پجاری بن چکے ہیں، کاش کہ ہم حقیقت کی طرف لوٹنے کی کوشش کریں۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۵۳) وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ، فَتَابَ عَلَيْكُمْ، اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۵۴)	''اور (یاد کرو جب) ہم نے موسیٰ کو کتاب اور قانون فیصل دیا، تاکہ تم ہدایت پاسکو، اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا ''اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر بڑا ظلم ڈھایا ہے، لہٰذا اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو (بطور سزا) ہلاک کرو، اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے، پھر اس نے تمہاری توبہ قبول فرمالی، یقیناً وہ بڑا توبہ قبول فرمانے والا، بہت مہربان ہے۔''

﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ﴾

اور، جب ہم نے دی، موسیٰؑ کو کتاب اور قانون فیصل دیا۔

اِذْ بمعنی اُذْکُرُوْا، یاد کرو، اٰتَیْنَا، فعل ماضی جمع متکلم اٰتٰی یُؤْتِیْ، اِیْتَاءٌ، دینا، عطا کرنا، اَلْکِتٰبَ، اس سے مراد خاص کتاب کیونکہ ال معرفہ کے لیے آتا ہے، خاص کتاب سے مراد ''التوراۃ'' ہے، اَلْفُرْقَان، تورات کی صفت ہے جو حق و باطل اور حلال و حرام میں فرق پیدا کرے، قرآن حکیم اور انجیل کو بھی فرقان سے تعبیر فرمایا گیا ہے:

تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ (الفرقان ۲۵:۱)

''بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل فرمایا۔''

یوم بدر کو یوم الفرقان اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ تاریخ اسلام میں پہلا دن ہے جس میں حق و باطل میں کھلا کھلا امتیاز ہو گیا تھا۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (لَعَلَّ-کُمْ) شاید۔ تم تَهْتَدُوْنَ، مضارع جمع مذکر مخاطب تم ہدایت پا جاؤ (ہ د ی) اِهْتَدٰی، یَهْتَدِی، اِهْتِدَاءً، باب اِفتعال۔ راہ ہدایت پر چلنا، ہدایت پانا۔

خواجہ عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''فرقان اس قوت کو کہتے ہیں جس سے حق و باطل، نیک و بد اور اسلام و کفر میں تمیز ہو، ہر کتاب الٰہی کے نزول سے قبل لوگوں میں ایک قوی احساس پیدا کر دیا جاتا ہے، وہ اپنے روزمرہ کے اعمال دیکھتے ہیں تو معلوم کر لیتے ہیں کہ ان میں بہت زیادہ اصلاح و تہذیب کی ضرورت ہے، اپنے آپ کو کسی مصلح اور ریفارمر کا محتاج سمجھتے ہیں، حق کے لیے ان کے اندر تشنگی پیدا ہوتی ہے اور اب وہ اس چشمۂ آب کی تلاش میں نکلتے ہیں جو ان کی پیاس کو دور کر دے۔ اگر فرقان پہلے سے نہ پیدا کر دیا جائے تو کتاب بے کار ثابت ہوتی ہے کیونکہ جب لوگ ضرورت اصلاح ہی محسوس نہیں کرتے تو انہیں اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اگر پیاس نہ ہو تو کتنے ہی برف سے ٹھنڈے کئے ہوئے گلاس بھر بھر کر پیش کیجئے، کسی کی نگاہ بھی نہ اٹھے گی، جب بھوک نہیں تو کھانے کی ہر چیز بیکار ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ الْاَمَانَةَ نَزَلَتْ فِی جَذْرِ قُلُوْبِ الرِّجَالِ فَعَلِمُوْا مِنَ الْکِتَابِ وَعَلِمُوْا مِنَ السُّنَّةِ۔ ''لوگوں کے سویدائے قلب میں امانت کا نزول ہوا، اس لیے انہوں نے کتاب و سنت کی تعلیم حاصل کی اور ان سے بہرہ اندوز ہوئے۔'' [صحیح بخاری، صحیح مسلم]

اس میں امانت سے مراد یہی فرقان ہے جو نبی کی بعثت سے قبل نازل ہوا ہے اور جس کی وجہ سے لوگ نبی کے لیے سراپا انتظار بن جاتے ہیں، رسول اللہ کی بعثت سے قبل عرب میں اس قسم کے لوگ موجود تھے جو دین جاہلیت کو چھوڑ کر یہ خبریں دیا کرتے تھے کہ عنقریب ایک رسول ظاہر ہونے والا ہے جو ابلیس اور اس کے لشکر پر غالب ہوگا۔ ان اشخاص میں عثمان بن حریث، عبید، زید بن عمرو اور ورقہ بن نوفل کے نام خصوصیت سے مشہور ہیں، زید بن عمرو تو وہ بزرگ ہیں جنہوں نے رسولِ موعود کی تلاش میں دور دور کے سفر کئے اور آخر یہ معلوم کر کے کہ وہ مکہ میں پیدا ہوں گے، اسی مبارک انتظار میں رہ کر انتقال کر گئے، یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچا تھے۔

اسی فرقان سے مراد وہ تشنگی ہے جو بنی اسرائیل میں قانون الٰہی کے لیے پیدا کر دی گئی تھی، بعض لوگوں نے اس سے نجاتِ موسیٰ اور تباہی فرعون بھی مراد لی ہے مگر بعد کی آیت پہلے معنی کی زیادہ مؤید ہے، ہر نبی کے ساتھ دونوں چیزیں نازل کی جاتی ہیں، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو بھی نوازش کی گئی کہ بنی اسرائیل راہ حق اپنے سامنے دیکھ لیں اور آئندہ کسی غلط کاری کے مرتکب نہ ہوں۔'' (الفرقان فی معارف القرآن)

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ، فَتَابَ عَلَیْكُمْ، اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا ''اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر بڑا ظلم ڈھایا ہے، لہٰذا اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو (بطور سزا) ہلاک کرو، اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے، پھر اس نے تمہاری توبہ قبول فرمالی، یقیناً وہ بڑا توبہ قبول فرمانے والا، بہت مہربان ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا، **لِقَوْمِهٖ** اپنی قوم سے، لفظ قوم اسم جمع (Collective noun) ہے، مرد اور عورت دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، **یٰقَوْمِ**، یا حرف ندا اور قوم منادیٰ ہے، اے میری قوم! **اِنَّكُمْ** (اِنَّ – كُمْ) بے شک، تم نے **ظَلَمْتُمْ** تم نے ظلم کیا۔ صیغہ جمع مذکر مخاطب (ظَلَمَ یَظْلِمُ ظُلْمًا) **اَنْفُسَكُمْ** (اَنْفُسَ – كُمْ) جانوں، اپنی (پر) **نَفْسٌ** مفرد ہے **بِاتِّخَاذِكُمُ** (بِ – اتِّخَاذِ – كُمْ) ساتھ، بنایا، تم نے، **اَلْعِجْلَ**۔ بچھڑا یعنی بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، **فَتُوْبُوْا**، پس توبہ کرو فعل امر جمع مذکر (تَابَ، یَتُوْبُ، تَوْبَةً) توبہ کرنا، رجوع کرنا، **اِلٰی**، طرف **بَارِئِكُمْ** (بَارِئٌ – كُمْ) پیدا کرنے والا، خالق، اپنے یعنی اپنے خالق کے حضور توبہ کرو، بَرَاَ یَبْرَءُ سے اسم فاعل بَارِئٌ، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے جو بغیر مادہ (matter) کے حرف کن فرما کر اشیاء کو وجود میں لاتا ہے۔ **فَاقْتُلُوْا**، پس تم قتل کرو فعل امر جمع مذکر (قَتَلَ یَقْتُلُ، قَتْلًا) **اَنْفُسَكُمْ**۔ اپنی جانوں کو **ذٰلِكُمْ**۔ یہ (بات)، **خَیْرٌ**، بہتر ہے **لَّكُمْ**، تمہارے لیے **عِنْدَ بَارِئِكُمْ** تمہارے خالق کے نزدیک، **فَتَابَ**، پس اس نے توبہ قبول کی، ماضی واحد مذکر (تَابَ، یَتُوْبُ، تَوْبَةً) **فَتَابَ عَلَیْكُمْ** پس اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی۔ **اِنَّهٗ هُوَ** بلاشبہ وہی تو ہے۔ **اَلتَّوَّابُ الرَّحِیْمُ** دونوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں اور مبالغہ کے صیغے ہیں بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، بہت زیادہ مہربان یعنی صرف وہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور انہیں اپنی رحمتوں سے نوازتا ہے۔

﴿**فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ**﴾ (اپنی جانوں کو مار ڈالو) یعنی جن لوگوں نے بچھڑے کو سجدہ نہیں کیا تھا، وہ

سجدہ کرنے والوں کو قتل کریں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''دنیا کے پردہ پر وہ کونسی پاگل گورنمنٹ ہے جو اپنے قانونِ فوجداری کے شدید مجرموں، لٹیروں، ڈاکوؤں، نقب زنوں کو محض معافی طلب کرنے پر چھوڑ دیتی ہے؟

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ اور اس خیریت اور بہتری کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ خیر سے اشارہ یہاں نجات، مغفرت اور گناہ کی گندگی سے پاک صاف ہونے سے ہے، یہاں ذکر تو ایک اسرائیلی ضابطہ شریعت کا ہے، لیکن خود اسلامی شریعت کا ضابطہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ رہزنی، سرقہ، زنا کاری وغیرہ جن جن جرائم کے لیے حدود مقرر ہیں وہ دنیا میں معاف نہیں ہو سکتے، خواہ مجرم صدق دل سے تائب ہی کیوں نہ ہو، البتہ اجرائے حد کے بعد یہ امید ضرور قائم ہو جاتی ہے کہ وہ نادم و تائب حشر میں دھلا دھلایا، پاک وصاف حاضر ہوگا۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) وہ اقوام اور افراد نعمتِ فرقان (حق و باطل، سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے کی صلاحیت) سے بہرہ ور رہتے ہیں جو تقویٰ (اللہ تعالیٰ سے ہر وقت خوف) کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (الانفال:۲۹) ''اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہے تو اللہ تمہیں (حق و باطل) میں قوت تمیز عطا فرمائے گا۔''

۲) اور جو قوم یا افراد نعمت فرقان سے محروم ہو جاتے ہیں پھر وہ خرافات اور لایعنی اور بے مقصد باتوں کا شکار ہو جاتے ہیں جیسا کہ بنی اسرائیل ہوئے اور یہی بات آج ہماری قوم میں نظر آتی ہے، نمازیں ضائع ہو رہی ہیں اور افرادِ قوم ٹی وی، کیبل کے بیہودہ کھیل تماشوں میں مصروف ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بچھڑے کی جگہ ان کی پرستش ہو رہی ہے، پرستش صرف بتوں ہی کی نہیں ہوتی بلکہ خواہشات کے پیچھے چلنا بھی ہوائے نفس کی پرستش ہے۔ ارشاد ہوا: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (القصص:۵۰) ''اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر محض اپنی خواہش کے پیچھے لگا ہوا ہو۔''

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۵۵) ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۵۶)	''اور یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تو جب تک اللہ کو علانیہ دیکھ نہ لیں تجھ پر ایمان نہ لائیں گے، پھر تمہارے دیکھتے ہی دیکھتے تمہیں برقِ صاعقہ (گرنے والی بجلی نے) آ لیا، پھر تمہاری موت کے بعد ہم نے تمہیں زندہ کر اٹھایا کہ شاید اب تم شکرگزار بن جاؤ۔''

وَاِذْ (وَاذْ کُرُوْا) اور وہ وقت یاد کرو، قُلْتُمْ تم سب نے کہا۔ ماضی جمع مذکر مخاطب (قَالَ یَقُوْلُ قَوْلًا) یٰمُوْسٰی– یآ حرف ندا، موسیٰ، منادی، لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ ہرگز یقین نہ کرینگے تیرے ساتھ، لَنْ حروف ناصبہ میں سے ہے یعنی وہ حروف جو فعل مضارع کے شروع میں آئیں تو انہیں زبر دیتے ہیں اور 'نْ' جمع کا یا 'نْ' تثنیہ کا ہو تو وہ گر جاتا ہے اور مستقبل کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (ال عمران ۳:۹۲) ''تم نیکی کو نہیں پہنچ سکو گے جب تک کہ اپنی ان چیزوں میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو''۔

نُّؤْمِنَ، لَنْ کی وجہ سے نُومِنَ، کے آخری نون پر زبر آیا، ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے (اٰمَنَ یُؤْمِنُ، ایْمَانًا) باب افعال ہے ایمان لانا، اعتبار کرنا، حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهْرَةً، یہاں تک کہ ہم دیکھ لیں، اللہ کو علانیہ، حَتّٰی، کلمہ ناصبہ ہے یعنی اپنے بعد والے حرف کو زبر دیتا ہے جیسا کہ نَرَی کی 'رْ' پر زبر ہے۔ نَرَیَ، ہم دیکھ لیں، فعل مضارع جمع متکلم (رَاٰی یُرٰی) جَهْرَةً۔ علانیہ، برملا، فَاَخَذَتْكُمُ (فَ– اَخَذَتْ– کُمْ) پس۔ پکڑا۔ تم کو، الصَّاعِقَةُ، ہولناک آواز۔ الصَّاعِقَةُ– نَارٌ مِنَ السَّمَاءِ اَوْصَیْحَةٌ مِنْهَا، آسمان سے آگ یا زور دار کڑکے کو صاعقہ کہتے ہیں (کلمات القرآن) وَاَنْتُمْ، اور تم سب۔ ضمیر متصل جمع مذکر مخاطب، تَنْظُرُوْنَ، فعل مضارع جمع مذکر مخاطب، تم دیکھ رہے تھے (نَظَرَ یَنْظُرُ، نَظْرًا) دیکھنا، ثُمَّ، حرف عطف ہے، ترتیب اور تراخی کے لیے مستعمل ہے۔ بَعَثْنٰكُمْ اَیْ اَحْیَیْنَا کُمْ، یعنی تم کو زندہ کیا، فعل

ماضی جمع متکلم (بَعَثَ یَبْعَثُ بَعْثًا) اٹھانا، زندہ کرنا، مِنْ- سے، بَعْدِ۔ بعد مَوتِکُمْ (مَوْتِ- کُمْ) موت۔تمہاری یعنی تمہاری موت کے بعد، لَعَلَّکُمْ (لَعَلَّ- کُمْ) شاید کہ۔تم، تَشْکُرُوْنَ شکرگزار بنو (شَکَرَ یَشْکُرُ، شُکْرًا) شکرادا کرنا۔

خواجہ عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام توراۃ لینے کے لیے کوہ طور پر گئے تو اپنے ساتھ بنی اسرائیل میں سے بہترین دل ودماغ کا انتخاب کیا، اوران میں سے ستر اشخاص کو اپنے ساتھ لیتے گئے مگر انہوں نے صاف کہہ دیا کہ جب تک ہم ان آنکھوں سے کھلم کھلا اللہ کو نہ دیکھ لیں گے تمہاری کبھی تصدیق نہ کرینگے۔ چونکہ انہوں نے بے انتہا گستاخی سے کام لیا اور موسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر ایمان لانے سے انکار کر دیا حالانکہ وہ بکثرت نشانات دیکھ چکے تھے، اس سے صاعقہ حق نے ان کو آلیا اوران پر بیہوشی طاری ہوگئی۔

تمام محققین کا اتفاق ہے کہ صاعقہ سے موت نہیں ہوتی، اس سے انسان بیہوش ہوجاتا ہے، البتہ اگر وقت پر خبر نہ لی جائے تو اس کی موت کا باعث ہوجائیگی جب سب پر غشی طاری ہوگئی تو موسیٰ علیہ السلام سخت پریشان ہوئے، انہیں اس امر کا اندیشہ ہوا کہ اگر یہ لوگ مرگئے تو قوم بغیر کسی نگران کار ومحافظ کے رہ جائیگی، جب کام کرنے والے دماغ نہ رہیں گے تو قوم خود بخود فنا ہوجائے گی، اس لیے انہوں نے والہانہ ومضطربانہ دعا کی۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ، قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَکْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِیَّایَ، اَتُهْلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا، اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُکَ، تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَتَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ، اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْلَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ (الاعراف ۷:۱۵۵)

''اور ہماری طے شدہ میعاد کے لیے موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر آدمی چن لیے، پھر جب انہیں زلزلے نے آلیا تو موسیٰ نے عرض کی: اے رب! اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے انہیں اور مجھے بھی ہلاک کرسکتا تھا، کیا تو ہم سب کو ہلاک کرتا ہے جو ہم میں سے کچھ احمقوں نے کیا؟ یہ تیری ایک آزمائش تھی جس سے تو جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دکھادیتا ہے۔تو ہی ہمارا سرپرست ہے، لہٰذا ہمیں معاف فرما اور ہم پر رحم کر اور تو بہترین معاف کرنے والا ہے۔''

اس بیہوشی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دی اور دوبارہ ان کے اندر احساس پیدا ہوگیا، تاکہ وہ پھر اس

غلط کاری میں مبتلا نہ ہوں اور (راہ راست پر آ جائیں)۔ (الفرقان فی معارف القرآن)

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''بہت سے معجزات، اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں اور ان کی مسلسل اور پیہم نافرمانیوں سے اللہ تعالیٰ کا عفو و درگزر، ان میں سے کوئی چیز ان کی سخت اور درشت فطرت کو بدل نہ سکی، ان کی فطرت محسوسات کے علاوہ کسی چیز کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی، وہ اللہ کے احکام میں مسلسل ٹال مٹول اور بحث و جدل کے عادی تھے اور سخت دار و گیر اور شدید تازیانہ عذاب کے بغیر احکام الٰہی کی اطاعت کے لیے آمادہ نہ تھے، دراصل ظالم و جابر فرعون کے ظالمانہ اقتدار کے تحت غلامی و ذلت کے جس طویل دور سے وہ گزرے تھے، اس نے ان کی فطرت میں عمیق فساد پیدا کر دیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ طویل ظالمانہ و جابرانہ نظام جس ذلت و پستی کو جنم دیتا ہے، اس سے زیادہ انسانی فطرت کو بگاڑنے والی کوئی چیز نہیں، غلامی انسانی فطرت کی تمام صفات کو تہس نہس کر دیتی ہے، فطرت کے بنیادی عناصر و جذبات کو تباہ کر دیتی ہے اور اس کے اندر غلامانہ فطرت پیوست کر دیتی ہے، اس کے بعد انسان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ جلاد کے کوڑے کے تحت عاجزی و تذلل کا رویہ اختیار کرتا ہے لیکن جونہی کوڑا ہٹ جاتا ہے وہ سرکش اور ہٹ دھرم ہو جاتا ہے اور جب اسے دولت و اقتدار سے کچھ حصہ مل جاتا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا اور یہی حال بنی اسرائیل کا ہمیشہ رہا ہے۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) جب کوئی قوم ایمان و اخلاق کے تقاضوں کو فراموش کر ڈالتی ہے تو ان کا انجام قوم موسوی کی طرح ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ برق صاعقہ کی شکل میں عذاب ہوتا ہے اور کبھی یہ بھوک اور قحط سالی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی ان پر ظالم و جابر حکمران مسلط کر دیئے جاتے ہیں جیسا کہ اس وقت پاکستانی قوم کے ساتھ ہو رہا ہے۔

۲) گنہگار بندوں کو رحمت الٰہی بار بار اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اور جہاں سے مایوسی اور نامرادی کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔

(۳) بنی اسرائیل کی طرح شاید ہم نے بھی غلامانہ ذہنیت کا پھندا اپنے گلے سے نہیں اتارا، ہماری تہذیب و

ثقافت اس کی آئینہ دار ہے اور ہمارے حکمرانوں کے صلاح ومشورے بھی اپنے سابقہ آقاؤں ہی سے ہوتے ہیں جس سے مایوسیاں روز بروز بڑھ رہی ہیں اور معاشی واخلاقی لحاظ سے روبہ زوال ہیں، انگریز کی صدسالہ غلامی کے بعد آزاد ہونے پر ہمیں اللہ تعالیٰ کے ہر لحاظ سے شکرگزار بندوں کی حیثیت سے زندگی گزارنی چاہیے تھی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ سوچیے اب ہم کہاں کھڑے ہیں؟

(۴) جو قوم یا افراد متواتر اور لگاتار نافرمانیوں کا شکار رہیں بالآخر تباہی وبربادی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے اور اُن سے زندگی کا سکون رخصت ہو جاتا ہے، کیا ہماری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی نہیں ہے؟

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ، وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۵۷)	”(اے بنی اسرائیل! فرعون سے نجات دلانے کے بعد) ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا اور مَنّ وسلویٰ اتارا (اور کہا) یہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں (مگر انہوں نے ناشکری اور حکم عدولی کی) اور اس سے انہوں نے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ہی جانوں پر ستم ڈھاتے رہے۔“

وَظَلَّلْنَا۔ اور ہم نے سایہ کیا، فعل ماضی جمع متکلم، اللہ تعالیٰ واحد ہے اور جمع متکلم کا صیغہ اس کی عزت کے لیے آیا ہے۔ (ظَلَّلَ يُظَلِّلُ،، تَظْلِيْلًا) باب تفعیل، سایہ کرنا اور ظِلٌّ سایہ کو کہتے ہیں، الغَمَامَ جمع ہے اس کا مفرد غمامہ ہے (بادل)، بادلوں کیلئے قرآن حکیم میں سَحَابٌ ، عَارِضٌ ، مُعْصِرَاتٌ، مُزْنٌ اور صَيِّبٌ کے الفاظ بھی آئے جس میں تھوڑے تھوڑے فرق سے عربی زبان کی وسعت اور فصاحت کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں: سحاب (سحب بمعنی گھسیٹنا اور کھینچنا) بادل کے لیے اس کا استعمال عام ہے، ہر قسم کے بادل کو سحاب کہہ لیتے ہیں، تاہم اس لفظ کا اطلاق اس بادل پر ہوتا ہے، جسے ہوائیں اٹھا کر آسمان پر پھیلا دیتی ہیں، گویا یہ ہر بادل کی ابتدائی شکل ہے۔

قرآن میں ہے:وَاللّٰهُ الَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا (فاطر۳۵:۹)

''اور اللہ ہی تو ہے جو ہوائیں چلاتا ہے پھر وہ بادل اٹھالاتی ہیں''۔

غَمَام: وہ بادل ہے جو تہہ بہ تہہ گاڑھا ہو جائے اور سورج کی روشنی کو زمین تک آنے سے روک دے آج کے الفرقان میں انہیں بادلوں کا ذکر ہے۔

عارض: جب گاڑھے اور پھیلے ہوئے بادل سے بوندا باندھی شروع ہو جائے تو وہ عارض ہوتا ہے، قرآن حکیم میں ہے۔

قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا، بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِیْحٌ فِیْهَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ (الاحقاف ۴۶:۲۴)''(قوم ہود نے) جب بادل اپنے میدانوں میں بڑھتے دیکھے تو کہنے لگے''یہ بادل ہم پر برسے گا'' بلکہ یہی چیز تھی جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے یعنی آندھی جس میں المناک عذاب تھا۔''

مُعْصِرَاتٌ: مُعْصِرَةٌ کی جمع ہے یعنی ایسے بادل جو پانی سے لدے ہوئے اور برسنے والے ہوں (نچوڑنے والے بادل)۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَآءً ثَجَّاجًا (النبا۷۸:۱۴)

''اور نچوڑنے والے بادلوں سے ہم نے لگاتار بارش نازل کی''۔

مُزْنٌ: سفید اور چمک دار بادلوں کو کہتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ (الواقعہ۵۶:۲۹)

''(پانی جو تم پیتے ہو) کیا اسے بادل سے تم نے اتارا یا اتارنے والے ہم ہیں؟''

صَیِّبٌ: سخت گرجدار بادلوں کو صیب کہتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَرَعْدٌ وَّ بَرْقٌ (البقرہ۲:۱۹)''یا جیسے آسمان سے زوردار بارش ہو جس میں تاریکیاں، بجلی کی گرج اور چمک ہو''۔(مترادفات القرآن)

وَاَنْزَلْنَا عَلَیْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی اور ہم نے نازل کیا تم پر من اور سلوی (اَنْزَلَ، یُنْزِلُ، اِنْزَالًا) باب افعال، اتارنا، نازل کرنا الْمَنَّ، اسم جنس، امام راغب لکھتے ہیں: اَلْمَنُّ شَیْءٌ فِیْهِ حَلَاوَةٌ یُسْقَطُ عَلَی الشَّجَرِ (مفردات القرآن) میٹھی چیز جو درختوں پر گرائی جاتی تھی۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''مَنَّ کے اصل معنی فضل واحسان کے ہیں، لیکن یہاں اس سے مراد وہ خاص غذا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے صحرائے سینا میں خاص اپنے فضل سے مہیا فرمائی، جس کے لیے نہ انہیں ہل چلانے پڑے، نہ تخم ریزی اور آب پاشی کی زحمتیں اٹھانی پڑیں۔'' (تدبر قرآن)

﴿سَلوٰی﴾ مَنْ کی طرح سلویٰ بھی عربی میں اہل کتاب کے واسطہ سے آیا ہے اور اہل عرب نے اس کو اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے، یہ لفظ ان پرندوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے لیے بھیجے، یہ بٹیروں سے ملتے جلتے تھے اور بٹیروں ہی کی طرح ان کا شکار نہایت آسان تھا۔ (ایضاً)

﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جو کہ رزق دیا ہم نے تم کو، كُلُوْا، فعل امر جمع مذکر (اَكَلَ يَأْ كُلُ اَكْلًا) طَيِّب اس چیز کو کہتے ہیں جو فی نفسہٖ حلال ہو اور اس کے حصول کے ذرائع بھی جائز اور حلال ہوں (رشوت، چوری، ڈاکہ، غبن یا کسی اور باطل طریقے سے حاصل نہ کیا گیا ہو)، مَا موصولہ جو رَزَقْنٰكُمْ، جمع متکلم (رَزَقْنَا- كُمْ) ہم نے رزق دیا، تمہیں، وَمَا ظَلَمُوْنَا اور انہوں نے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا، وَلٰكِنْ اور لیکن ''لٰكِنْ'' کلمۂ استدراک کلام ہے (اصل حقیقت کو جاننے کے لیے استعمال ہوتا ہے) اَنْفُسَهُمْ (اَنْفُسَ- هُمْ) اپنے نفسوں پر يَظْلِمُوْنَ وہ ظلم ڈھاتے تھے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہاں کلام کا سیاق وسباق اس امر کو واضح کر رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں کا حق نہیں پہچانا، وہ اِن نعمتوں کو پا کر شکر گزار بننے کی بجائے ان کی ناقدری اور اللہ کی نافرمانی کرتے رہے، یہ بات چونکہ سیاق کلام سے واضح ہے اس وجہ سے لفظوں میں ظاہر نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ اس کی جگہ پر یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔'' (تدبر قرآن)

آیۂ مبارک کی حکمت وبصیرت:

۱) جو لوگ اللہ تعالیٰ کے انعامات کی ناقدری کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔

۲) کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ ملک عطا فرمایا، حصول وطن کے لیے ان گنت جانی اور

مالی قربانیاں دی گئیں، مگر افسوس کہ ہم سب کچھ بھلا کر ناشکریوں پر اتر آئے، دیکھیے کہ آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟ فاعتبروا یا اولی الابصار

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ، فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۸) فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَالَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۵۹)	''اور جب ہم نے ان سے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس کی پیداوار میں سے جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھاؤ اور جب اس کے دروازے سے گزرو تو سر جھکائے ہوئے گزرنا اور (زبانوں پر) حِطَّةٌ حِطَّةٌ (ہمارے گناہ معاف ہوں) کے الفاظ جاری و ساری ہوں، ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے (اور خلوص قلب سے) نیکی کرنے والوں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے، مگر جو بات کہی گئی تھی، ظالموں نے اسے بدل کر کچھ سے کچھ کر دیا، تو ہم نے ان ظالموں پر ان کی نافرمانیوں کی بنا پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔''

﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ، فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

اور جب ہم نے ان سے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس کی پیداوار میں سے جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھاؤ اور جب اس کے دروازے سے گزرو تو سر جھکائے ہوئے گزرنا اور (زبانوں پر) حِطَّةٌ حِطَّةٌ (ہمارے گناہ معاف ہوں) کے الفاظ جاری و ساری ہوں ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے (اور خلوص قلب سے) نیکی کرنے والوں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے۔

وَاِذْ قُلْنَا، اِذْ (واذْکُرُوْا) اور یاد کرو، اِذْ عربی زبان میں وقت اور زمانے کو ظاہر کرتا ہے (Refers time) قُلْنَا ہم نے کیا (قَالَ یَقُوْلُ قَوْلًا) کہنا، اُدْخُلُوْا، تم سب داخل ہو جاؤ، فعل امر، جمع مذکر (دَخَلَ یَدْخُلُ، دُخُوْلًا) داخل ہونا، هٰذِهِ، اسم اشارہ قریب، اَلْقَرْیَةَ، بستی، گاؤں۔ هِیَ اَرِیْحَا، قَرْیَةٌ مِّنْ بَیْتِ الْمُقَدَّسِ (ابن جریر) ''اس سے بیت المقدس کی بستی اریحا مراد ہے۔''

فَکُلُوْا، تم سب کھاؤ فعل امر جمع مذکر (اَکَلَ یَاْکُلُ اَکَلًا) کھانا مِنْهَا (مِنْ—هَا) سے، اس سے (یعنی بستی کی پیداوار میں سے) حَیْثُ، ظرف مکان (Place) کو ظاہر کرتا ہے، جہاں اور جس جگہ سے شِئْتُمْ۔ تم چاہو صیغہ ماضی جمع مذکر مخاطب (ش ی ء) شَاءَ یَشَاءُ چاہنا، پسند کرنا، رَغَدًا، بافراغت، اچھی طرح، وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا، وَادْخُلُوْا، تم سب داخل ہو جاؤ (دَخَلَ یَدْخُلُ دُخُوْلًا) اَلْبَابَ، دروازہ (شہر کا) The main gate سُجَّدًا، سجدہ کرتے ہوئے یعنی سر جھکائے ہوئے، عاجزی کے ساتھ وَقُوْلُوْا اور کہو، فعل امر جمع مذکر (قَالَ یَقُوْلُ قَوْلًا) حِطَّةٌ ''(ح ط ط) حَطَّ یَحُطُّ، بوجھ ہلکا کرنا، بھاؤ کا کم ہو جانا، کہا جاتا ہے۔ حَطَّ السِّعْرُ، بھاؤ کم ہو گیا، گر گیا۔

حَطَّ اللّٰهُ اَوْزَارَهُمْ، اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہ معاف کر دیئے یعنی گناہوں کے بوجھ کو ہلکا کر دیا، اَلْحِطَّةُ، طلب مغفرت، توبہ۔

وَقُوْلُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ ''اور کہتے جاؤ، توبہ ہے، ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے۔''

بنی اسرائیل کو طویل دشت نوردی کے بعد جب ان کی خواہش و آرزو کے تحت اریحا کے شہر میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ازراہ نصیحت کہا کہ اس شہر میں آباد ہونے کے بعد پہلے کی طرح سرکشی و نافرمانی کی زندگی بسر نہ کرنا بلکہ ہمیشہ سلامتی و مغفرت اور انابت و توبہ کا شیوہ اختیار کرتے رہنا تاکہ شہری زندگی کا آغاز تمہاری دنیاوی و روحانی کامرانیوں کا آئینہ دار بن سکے حِطَّةٌ عربی لفظ ہے اور بنی اسرائیل کی زبان عبرانی تھی۔ معلوم ہوتا ہے عبرانی کا جو لفظ اس وقت بولا گیا اس کے معنی عربی میں توبہ و انابت کے اظہار ہی کے ہوں گے، غرض یہ نہیں کہ تم بعینہ یہ لفظ دہراتے ہوئے شہر میں داخل ہو، بلکہ یہ ہے کہ شہر میں داخلے کے وقت تمہاری زبان پر بخشش و انابت اور توبہ و استغفار کے کلمات جاری ہوں۔ (لسان القرآن، جلد دوم)

نَغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ (غ ف ر) غَفَرَ یَغْفِرُ، غُفْرَانٌ، ڈھانپنا، چھپانا، معاف کر دینا، (خَطَایَا—کُمْ) گناہ۔ تمہارے، خَطَایَا جمع ہے اس کا مفرد خَطِئَةٌ ہے، وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ، زَادَ یَزِیْدُ زیادہ عطا

کرنا، نَزِیْدُ، ہم زیادہ عطا کریں گے نَزِیْدُ پر 'س' کا اضافہ مستقبل قریب کا معنی دیتا ہے، یعنی عنقریب اضافہ کریں گیا الْمُحْسِنِیْنَ، اس کا مفرد اَلْمُحْسِنُ ہے یعنی نیکوکار، ہر وقت اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنے والا۔

سید مودودیؒ حِطَّةٌ کی تشریح میں لکھتے ہیں: حکم یہ تھا کہ جابر و ظالم فاتحوں کی طرح اکڑتے ہوئے نہ گھسنا، بلکہ خدا ترسوں کی طرح منکسرانہ شان سے داخل ہونا، جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے اور حِطَّةٌ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جانا۔ دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتل عام کی بجائے بستی کے باشندوں میں درگزر اور عام معافی کا اعلان کرتے جانا (اخلاق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا چمن بھی فتح مکہ پر اسی اعلان سے مہک اٹھا تھا)۔

﴿فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ﴾

مگر جو بات کہی گئی تھی، ظالموں نے اسے بدل کر کچھ سے کچھ کر دیا، تو ہم نے ان ظالموں پر ان کی نافرمانیوں کی بنا پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔''

فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا، پس تبدیل کر دیا (خلاف ورزی کی)۔ ان لوگوں نے جو ظالم تھے، بَدَّلَ یُبَدِّلُ، تَبْدِیْلًا، بدلنا، حکم عدولی کرنا، ظَلَمُوْا ماضی جمع مذکر غائب، انہوں نے ظلم کیا۔ ظلم کسے کہتے ہیں۔

اَلظُّلْمُ وَضْعُ الشَّیْءِ مِن غَیْرِ مَحَلِّهٖ ''کسی چیز کو غلط جگہ پر رکھنے کو ظلم کہتے ہیں مثلاً سچ کی جگہ جھوٹ، انصاف کے مقام پر ناانصافی کرنا ظلم ہے۔''

قَوْلًا (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) مصدر ہے بات چیت، غَیْرَ، سوائے، اَلَّذِیْ، جو، قِیْلَ، فعل ماضی مجہول، کہی گئی یعنی جو کلمات استغفار انہیں تلقین کئے گئے تھے انہیں چھوڑ کر وہ بے مقصد اور مہمل کلمات زبان سے ادا کرنے لگے۔

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ شہر کے دروازے میں جھک کر داخل ہونا اور زبان سے حِطَّةٌ کہنا (یعنی گناہوں کی بخشش مانگنا) مگر وہ اپنی سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور حِطَّةٌ کی بجائے حَبَّةٌ فِیْ شَعْرَةٍ (دانہ بالی کے اندر) کہنے لگے۔ [صحیح بخاری، مسلم]

فَاَنْزَلْنَا ماضی جمع متکلم، ہم نے نازل کیا (اَنْزَلَ، یُنْزِلُ، اِنْزَالًا) نازل کرنا اتارنا۔ عَلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا، ان لوگوں پر جنہوں نے نافرمانی کی، رِجْزًا، عذاب، اَلرِّجْزُ– العِتابُ (تفسیر المراغی) رِجْزًا میں تنوین عذاب کی شدت اور ہولناکی پر دلالت کرتی ہے، اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ وہ طاعون کی بیماری میں مبتلا ہو گئے اور دشمنوں کا رعب و دبدبہ ان پر طاری ہو گیا۔ (المراغی)

بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ (بِ– مَا) اس لیے کہ ''ب'' یہاں پر وجہ کو ظاہر کر رہا ہے ای بِسَبَبِ فِسْقِھِمْ (جلالین) یعنی یہ عذاب ان کے مسلسل انکار اور سرکشی کی وجہ سے تھا۔

یَفْسُقُوْنَ مضارع جمع مذکر غائب وہ فسق کرتے (عہد و پیمان کو توڑتے) فَسَقَ یَفْسُقُ، فِسْقًا، فسق اختیار کرنا، راہ حق کو چھوڑ کر من مانی کرنا۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) جب افراد اور قوموں کو اللہ تعالیٰ فتح و نصرت سے ہمکنار فرمائے تو کسی تکبر اور غرور کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہیے بلکہ عجز و خاکساری سے رب تعالیٰ کے حضور جھک جانا چاہیے کہ کامیابی اور کامرانی صرف اور صرف اسی نے عطا فرمائی ہے، پھر اس کے اس لطف و احسان پر اس کے حضور اپنی سابقہ غلطیوں اور خطاؤں پر توبہ و استغفار کرتے ہوئے سیدھی اور سچی راہ اختیار کرنی چاہیے، بنی اسرائیل نے مسلسل اور پیہم راہ حق سے تجاوز کیا اور عذاب الٰہی کا شکار ہو گئے۔

۲) حصول وطن کے لیے ہم نے بھی لاتعداد جانی و مالی قربانیاں دی، اور ہماری زبانوں پر یہی بات تھی ''پاکستان کا مطلب کیا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ'' جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں کامیابی سے ہمکنار کر دیا اور یہ وطن معرض وجود میں آ گیا تو ہم نے (بنی اسرائیل کی طرح) نافرمانی اور سرکشی کا راستہ اختیار کر لیا۔ اب غور کریں تو ہمارے اوپر بھی طرح طرح کے عذاب مسلط ہیں..... قحط سالی، مہنگائی، بے روزگاری، مار دھاڑ، دنگا فساد، ظالم و جابر حکمران وغیرہ، اسلام نے اس دلدل سے نکلنے کا راستہ بھی بتایا ہے کہ ہم سچے دل سے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ و استغفار کریں اور آئندہ قرآن و سنت کے مصفّٰی اور پاکیزہ اصولوں پر عمل پیرا ہو جائیں۔

وَاِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ، فَقُلۡنَا اضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡحَجَرَ فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡہُ اثۡنَتَا عَشۡرَۃَ عَیۡنًا، قَدۡ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَھُمۡ، کُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ اللّٰہِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ (۶۰)	’’اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے (لق و دق صحرا میں) پانی کے لیے درخواست کی، تو ہم نے (موسیٰ سے) کہا ’’فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو‘‘ تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر قبیلے نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا (ہم نے انہیں کہہ دیا) اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ رزق سے کھاؤ پیو زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔‘‘

وَاِذۡ– (وَاذۡکُرُوۡا) اور یاد کرو اس وقت کو، اِسۡتَسۡقٰی ماضی واحد مذکر غائب اس نے پانی مانگا (پانی کے لیے درخواست کی) اِسۡتَسۡقٰی یَسۡتَسۡقِیۡ، اِسۡتِسۡقَاء باب استفعال، فَقُلۡنَا (فَ– قُلۡنَا) پس، ہم نے کہا فعل ماضی جمع متکلم، اللہ تعالیٰ واحد ہے، اس کے لیے جمع کا صیغہ عزت و تعظیم کے لیے آتا ہے۔ اِضۡرِبۡ (ضَ رَبَ) ضَرَبَ یَضۡرِبُ ضَرۡبًا فعل امر اِضۡرِبۡ تو مارو، واحد مذکر حاضر، بِعَصَاکَ (بِ– عَصَا– کَ) ساتھ، لاٹھی اپنی، یعنی اپنی لاٹھی کے ساتھ۔ اَلۡحَجَرَ، چٹان، پتھر، اس سے مراد وہ خاص چٹان ہے جو اس وقت (درخواست کے وقت) موسیٰ علیہ السلام کے قریب تھی۔ فَانۡفَجَرَتۡ (فَ– انۡفَجَرَتۡ) پس، پھوٹ نکلے۔ اِنۡفَجَرَ یَنۡفَجِرُ اِنۡفِجَارًا، باب انفعال، بہنا، پھوٹ نکلنا (ف ج ر) فجر صبح کو بھی کہتے ہیں جو رات کی تاریکی کو پھاڑتی ہے اور فاجر اس شخص کو کہتے ہیں جو امانت اور دیانت داری کے پردے کو پھاڑتا ہے۔ مِنۡہُ (مِنۡ–ہُ) اس یعنی اس چٹان سے۔ اِثۡنَتَا عَشۡرَۃَ بارہ، عَیۡنًا چشمے، قومِ بنی اسرائیل بارہ قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی، ہر قبیلہ کے لیے الگ چشمہ اس لیے مقرر کیا گیا تا کہ ان کے درمیان کوئی جھگڑا اور فساد پیدا نہ ہو۔

قَدۡ عَلِمَ تحقیق جان لیا، قَدۡ کلمہ تحقیق کلام ہے یعنی گفتگو پر زور دیتا ہے۔ (عَلِمَ، یَعۡلَمُ، عِلۡمًا) حقیقت کو پالینا، پہچاننا، جاننا، ادراک کرنا۔ (مصباح اللغات) کُلُّ اُنَاسٍ ہر قبیلہ اور ہر گروہ نے، مَشۡرَبَھُمۡ

(مَشْرَبَ– هُمْ) پینے کی جگہ۔ اپنی، یعنی (اس میں سے ہر گروہ نے اپنے پینے کی جگہ کو جان پہچان لیا)شَرِبَ یَشْرَبُ (پینا)اس سے اسم ظرف مکان مَشْرَبٌ (گھاٹ) کُلُوْا وَاشْرَبُوْا، کھاؤ اور پیو، مِنْ رِزْقِ اللّٰهِ، مِنْ (سے) رِزْقِ اللّٰهِ، اللہ تعالیٰ کا رزق، یعنی اللہ تعالیٰ کے رزق سے کھاؤ اور پیو۔ وَلَا تَعْثَوْا، اور نہ تجاوز کرو (فتنہ وفساد میں) فعل نہی جمع مذکر مخاطب۔ عَثَا یَعْثُوْا عَثْوًا وَعُثُوًّا، اَفْسَدُ وَ اَشَدُّ اُلِافْسَادِ، فتنہ وفساد میں تجاوز کر جانا (المعجم الوسیط)، فِی حروف جارہ میں سے ہے جو اپنے بعد والے اسم کو زیر دیتے ہیں فِی الْاَرْضِ زمین میں مُفْسِدِیْنَ، اسم فاعل، خرابی اور فساد پیدا کرنے والے (ف س د) اَفْسَدَ یُفْسِدُ اِفْسَاد، باب افعال سے اسم فاعل مُفْسِدٌ اس کا جمع مُفْسِدُوْنَ ہے اور حال ہونے کی وجہ سے مُفْسِدِیْنَ حالت نصبی میں آیا ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''یہ قصہ بھی وادی تیہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو (قوم موسیٰ) نے پانی مانگا۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عَصَا مارنے سے قدرت خداوندی سے بارہ چشمے نکل پڑے اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے افسر بھی جدا جدا تھے، اس لیے چشمے بھی بارہ ہی نکلے، کھانے سے مراد مَنٌ و سَلْویٰ اور پینے سے مراد یہی پانی تھا اور نافرمانی اور ترک احکام کو فتنہ وفساد سے تعبیر فرمایا۔'' (معارف القرآن، جلد اول)

اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعض پتھروں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اس کا ذکر قرآن حکیم کے دوسرے مقام پر اس طرح آیا: وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ، وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ (البقرۃ ۲:۷۴) ''پتھروں میں سے کچھ تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی ابلنے لگتا ہے۔''

عاجز کو خود اس کا تجربہ ہوا، ایوبیہ سے نتھیا گلی جاتے ہوئے ایک پہاڑ سے صاف وشفاف، ٹھنڈا اور میٹھا پانی نیچے آرہا تھا، سیر وتفریح میں جانے والے وہاں کچھ دیر کیلئے رک جاتے ہیں، نہ صرف رب کائنات کی قدرت کا نظارہ کرتے ہیں بلکہ اس صحت بخش مشروب سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں، یقیناً یہ پانی سالہا سال سے بہہ رہا ہوگا۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ.

سید مودودیؒ لکھتے ہیں: ''وہ چٹان (جس پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے عصا کی ضرب لگائی تھی) اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے، سیاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اس میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

''اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے کھاؤ پیو اور زمین میں فساد مچاتے ہوئے نہ پھیلو۔''

اس پر مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ اس عظیم نعمت کا حق بیان ہوا جس کا ذکر اوپر ہوا (من وسلویٰ کا نزول اور چشمے بہہ نکلنا) اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت جو ہمیں حاصل ہوتی ہے زبان حال سے ہمیں اس حق کی یاد دہانی بھی کراتی ہے جو اس سے بہرہ مند ہونے کے سبب سے ہم پر عائد ہوتا ہے یہ اس حق کی تعبیر ہے اور انسان کی فطرت اگر کفران نعمت کی سیاہی سے مسخ نہ ہو چکی ہو تو اس حق سے انکار نہیں کر سکتا ہے، یہ اس کی فطرت ہی کی صدا ہے جو وحی الٰہی اس کے کانوں کو سنا رہی ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں پانے کے بعد اس کا شکر گزار بندہ بننا ضروری ہے، اس سے مزید انعامات ملنے کی توقع ہوتی ہے، اور اگر ناشکری ہوتی رہے تو اس کی سزا بھی مل جاتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (ابراھیم ۱۴:۷)

''اور جب تمہارے رب نے اعلان کیا تھا کہ اگر تم شکر کرو گے تو تمہیں اور زیادہ دونگا اور اگر ناشکری کرو گے تو پھر میرا عذاب بھی بڑا شدید ہے۔''

۲) اس آیہ مبارکہ کی روشنی میں ہم اپنے احوال کا جائزہ لیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں آزادی سے ہمکنار فرمایا، چاہیے یہ تھا کہ ہم اس کا شکر ادا کرتے ہوئے اس ملک میں اسی کا قانون جاری وساری کرتے، مگر ایسا نہ ہوا۔ نتیجۃً ملک کا آدھا حصہ ہم سے کٹ گیا جو یقیناً بہت بڑا المیہ ہے اور بقیہ حصہ گزشتہ کئی برسوں سے معاشی اور سیاسی، اخلاقی اور روحانی انتشار کا شکار ہے کیا قرآن حکیم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مشعل راہ بناتے ہوئے ہم اپنے حالات کو سدھارنے کی فکر کریں گے؟ کہ آئندہ تباہی و بربادی سے محفوظ رہ سکیں!

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا، قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ، اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ، وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ، ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (٦١)	''اور جب تم نے کہا ''اے موسیٰؑ! ہم سے تو (روز، روز) ایک ہی طرح کے کھانے پر نہیں رہا جائے گا، لہٰذا ہمارے لیے اپنے رب سے ان چیزوں کے لیے دعا کرو جو زمین سے پیدا ہوتی ہیں جیسے ساگ پات، کھیرا ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز (وغیرہ) موسیٰ نے انہیں کہا (نا سمجھو!) کیا تم بہتر چیز کے بدلے گھٹیا چیز تبدیل کرنا چاہتے ہو؟ (یہی بات ہے تو) کسی شہر کی طرف نکلو، جو مانگتے ہو، تمہیں ملے گا اور (انجام کار) ان پر ذلت وخواری اور پستی و بدحالی مسلط کر دی گئی، وہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں گھر گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کرنے لگے تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرتے اور (حدود شریعت) سے آگے نکل جاتے تھے۔''

﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا، قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ﴾

اور جب تم نے کہا ''اے موسیٰؑ! ہم سے تو (روز، روز) ایک ہی طرح کے کھانے پر نہیں رہا جائیگا، لہٰذا ہمارے لیے اپنے رب سے ان چیزوں کے لیے دعا کرو جو زمین سے پیدا ہوتی ہیں جیسے ساگ پات،

کھیرا ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز (وغیرہ) موسیٰ نے انہیں کہا (نا سمجھو!) کیا تم بہتر چیز کے بدلے گھٹیا چیز تبدیل کرنا چاہتے ہو؟

وَاِذْ، اور جب (وہ وقت یاد کرو) قُلْتُمْ۔ تم نے کہا، فعل ماضی جمع مذکر مخاطب (قَالَ یَقُوْلُ قَوْلًا) کہنا، لَنْ نَصْبِرَ، ہرگز ہم صبر نہ کرینگے۔ فعل مضارع نہی، مضارع کے شروع میں ''لَنْ'' لائیں تو وہ اس پر زبر دیتا ہے جیسا کہ نَصْبِرُ سے نَصْبِرَ ہوا، اور زور بیان پیدا کرتا ہے یعنی ہرگز ہرگز صبر نہ کریں گے، عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ ایک ہی قسم کے کھانے پر (جو مَنْ و سَلْوٰی) روزانہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسمان سے نازل فرماتا تھا، وہ اس پر ناک بھوں چڑھانے لگے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''بنی اسرائیل عرصہ دراز تک ایک ہی قسم کی غذا (من وسلوی) کھاتے کھاتے اکتا گئے تھے اور اب اپنے پیغمبر سے فرمائش کر رہے تھے کہ اس بیابان سے نکال کر کہیں دوسری جگہ لے چلئے جہاں قسم قسم کے شہری اور دیہاتی کھانے موجود ہوں۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

فَادْعُ لَنَا، پس دعا کیجئے، لَنَا ہمارے لیے (دَعَا یَدْعُوْا، دَعْوَۃً) سے فعل امر واحد مذکر اُدْعُ ہے تو پکار، مِمَّا (مِنْ– ما) سے، جو یعنی اس چیز سے جو، تُنْبِتُ الْاَرْضُ، اگاتی ہے، زمین۔ (ن ب ت) اَنْبَتَ، یُنْبِتُ اِنْبَاتٌ، باب افعال، اگانا، اور تُنْبِتُ فعل مضارع واحد مؤنث غائب، زمین (الارض) عربی میں مونث استعمال ہوتی ہے اس لیے اس کا صیغہ مؤنث غائب کا ہوا، مِنْ (سے) بَقْلٌ کا لفظ سبزیوں اور ترکاریوں کے تمام اقسام کے لیے عام ہے (تدبر قرآن) بَقَّالٌ عربی میں سبزی فروش کو کہتے ہیں، قِثَّاءٌ، ککڑی اور کھیرے، فُوْمٌ اور ثُوْمٌ ایک ہی چیز ہے اس کے معنی لہسن کے ہیں، اہل عرب 'ث' کو کبھی کبھی 'ف' سے بدل دیتے ہیں۔ (تدبر قرآن)

عَدَسٌ، مسور اور بَصَلٌ، پیاز کو کہتے ہیں، ان الفاظ کے ساتھ ھا کی ضمیر سے الارض (زمین) کی طرف اشارہ ہے اور زمین عربی میں مؤنث ہے، قَالَ۔ کہا (قَالَ یَقُوْلُ. قَوْلًا) أ، کلمہ استفہام (کیا) تَسْتَبْدِلُوْنَ۔ تم بدلتے ہو فعل مضارع جمع مذکر مخاطب (اِسْتَبْدَلَ یَسْتَبْدِلُ، اِسْتِبْدَالٌ) باب استفعال کسی چیز کا کسی دوسری چیز سے بدلنا۔ اِسْتِبْدَالٌ: طَلَبُ الشَیءِ بَدَلًا مِنَ الآخَرِ (المنار) استبدال میں یہ مفہوم ایک چیز کو دوسری چیز کے عوض تبدیل کرنا۔ اَدْنٰی اس کا مادہ دَنُوَ ہے جس کا معنی نزدیکی اور قرب

کے ہیں اور اس سے مراد حقیر چیز کے بھی ہیں۔ بِالَّذِی (بِ– الَّذِی) ساتھ۔ اس کے، ب کے معنی یہاں بدلے کے ہیں، هُو، وہ، خیرٌ، بہتر اچھی یعنی من وسلویٰ جیسی بہترین نعمتوں کو چھوڑ کر تم ادنیٰ درجہ کی اشیاء طلب کرتے ہو۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

"اَدْنٰی" دناء ت سے ہے یعنی کیا تم ایک اعلیٰ غذا کو ایک ادنیٰ اور گھٹیا غذا سے بدلنا چاہتے ہو، یہ من و سلویٰ کی غذا تمہارے لیے تمہارے پروردگار نے مہیا فرمائی ہے اور تمہیں اس صحرا میں اس حالت میں مل رہی ہے کہ تم فرعونیوں کی غلامی اور شرک و کفر کی اطاعت کی ذلت سے بالکل آزاد ہو، روکھی پھیکی غذا جو آزادی کے ساتھ نصیب ہو رہی ہے غلامی اور ذلت کے حلوے سے ہزار درجے بڑھ کر ہے لیکن یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم چٹخاروں کے ایسے رسیا ہو کہ ان کے پیچھے تمہاری نگاہوں میں اس آزادی کی بھی، جس میں اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارے اوپر کسی کی حکومت باقی نہیں رہی ہے۔ کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ، وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ، ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾

(یہی بات ہے تو) کسی شہر کی طرف نکلو، جو مانگتے ہو، تمہیں ملے گا اور (انجام کار) ان پر ذلت وخواری اور پستی و بدحالی مسلط کر دی گئی، وہ اللہ تعالیٰ کے غضب میں گھر گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کرنے لگے تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرتے اور (حدود شریعت) سے آگے نکل جاتے تھے۔

اِهْبِطُوْا تم سب اترو، فعل امر جمع مذکر (ہ ب ط) هَبَطَ يَهْبِطُ سے امر کا صیغہ اِهْبِطْ (اترنا) مِصْرًا، اور مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے، کوئی بھی شہر جس کی حد بندی ہو چکی ہو مصر کہلاتا ہے۔ فَاِنَّ، پس بے شک لَكُمْ تمہارے لیے (ہے) مَّا (جو) سَاَلْتُمْ تم نے سوال کیا۔ ماضی جمع مذکر مخاطب (سَاَلَ، يَسْاَلُ، سُؤَالًا) وَضُرِبَتْ اور مسلط کی گئی فعل ماضی مجہول صیغہ واحد مونث غائب ضَرَبَ يَضْرِبُ ضَرْبًا۔ مارنا کبھی اس کے معنی بیان کرنے اور کبھی مسلط کرنے کے بھی آتے ہیں۔ ضَرَبَ سے

مجہول کا صیغہ ضُرِبَ ہوا، اور اس سے واحد مونث غائب کا صیغہ ضُرِبَتْ بنا، عَلَيْهِمُ، ان پر، اَلذِّلَّةُ، الذِّلُ وَالْهَوَانُ (الراغی) ذلت وخواری المَسْكَنَةَ- الفقر (مسکنت کے معنی فقر کے ہیں) والمُرَادُ هُنَا فَقْرُ النَفْسِ وشُحُّهَا، اور اس سے یہاں مراد نفس کی ذلت اور خودغرضی ہے۔ وَبَآءُ وْا (بَاءَ يَبُوْءُ بَوْءً وَبُوْءً) لوٹنا۔ اترنا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ، اللہ کے غضب کے ساتھ، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر لوٹے۔ ذٰلِكَ اسم اشارہ بعید، گزشتہ واقعہ یا بات کی طرف اشارہ بھی مقصود ہوتا ہے۔ بِاَنَّهُمْ، 'ب' یہاں پر سبب اور وجہ کو ظاہر کر رہی ہے بِسَبَبِ كُفْرِهِمْ، یعنی ان کے کفر کے سبب، كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ تھے، وہ کفر کرتے بِاٰيٰتِ اللّٰهِ، اللہ تعالیٰ کی آیات (احکامات) کا، آيَةٌ نشانی، قرآن حکیم کی آیہ مبارکہ اور اس کی جمع آیات ہے، انفس وآفاق میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں (آیات) بکھری ہوئی ہیں۔ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ اور وہ قتل کرتے تھے انبیا کرام کو النَبِيّٖنَ اس کا مفرد نَبِيٌّ ہے اور یہ نَبَاءٌ سے مشتق ہے اس کے معنی عظیم خبر کے ہیں نَبِيٌّ فعیل بمعنی فاعل، خبر دینے والا، اصطلاح شریعت میں اللہ کی طرف سے براہ راست بذریعہ وحی پیغام لانے والے کو نبی کہا جاتا ہے۔ نبوت کسبی (کوشش) سے نہیں ملتی بلکہ وہبی (اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش کا نتیجہ) ہوتی ہے۔ بِغَيْرِ الْحَقِّ بغیر حق کے یعنی ناحق، ذٰلِكَ، اسم اشارہ بعید، یعنی ان پر جو غضب نازل ہوا۔ حدود الٰہی توڑنے کی وجہ سے، بِمَا (یا یہاں پر وجہ کو ظاہر کر رہا ہے) بِمَا اس وجہ سے جو عَصَوْا، انہوں نے نافرمانی کی، (عَصٰى يَعْصِيْ عِصْيَان) نافرمانی کرنا، حکم نہ ماننا، وَكَانُوْا اور وہ تھے۔ يَعْتَدُوْنَ، وہ حد سے تجاوز کرتے، اِعْتَدٰى يَعْتَدِيْ اِعْتِدَاءً باب افتعال، حد سے بڑھنا، سرکشی اختیار کرنا۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُ وْ بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ

یہ ہولناک حادثہ کہ بنی اسرائیل پر ذلت ومسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو گئے، تاریخی اعتبار سے اس دور کا واقعہ نہیں ہے جبکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے، مسور، پیاز اور سبزی ترکاری وغیرہ کا مطالبہ کیا تھا، یہ تو بہت بعد کے زمانے کا واقعہ ہے جبکہ ان سے ان جرائم کا صدور ہوا جن کا ذکر آیت کے آخری حصہ میں ہے یعنی: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ، ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ

بنی اسرائیل نے جس سنگ دلی، انکار وجحود اور ظلم وستم کے ساتھ حق کے داعیوں اور ہادیوں کا استقبال

کیا، اس کی کوئی مثال کسی امت کی تاریخ میں نہیں ملتی، انہوں نے کتنے ہی انبیاء کو قتل اور ذبح کیا اور آروں سے انہیں چیرا..... بدترین حرکت جو کوئی قوم حق کے مخلص داعیوں کے ساتھ کر سکتی ہے..... انہوں نے بدترین کفر، حدود الٰہی سے انتہائی انحراف اور اللہ تعالیٰ کی شدید ترین نافرمانی کی..... ان میں سے ہر میدان میں ان کے بدترین سیاہ کارنامے ہیں جن کی کوئی مثال کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

ان بدترین سیاہ کارناموں کے باوجود بنی اسرائیل کے لمبے چوڑے اور عجیب وغریب دعوے تھے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا دعویٰ کرتے تھے کہ صرف وہی ہدایت یافتہ ہیں، وہی اللہ کی منتخب اور چہیتی قوم ہیں، تنہا وہی اللہ کے ہاں اجر وثواب پائیں گے اور بلاشرکتِ غیرے وہی اللہ کے فضل وکرم کے مستحق ہیں۔''

(فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) بنی اسرائیل کے اس رویہ میں ان مسلمان قوموں کے لیے ایک بہت بڑا درسِ عبرت ہے، جنہوں نے تمدن وتنوعات کے پیچھے اپنی آزادی کی نعمت خطرے میں ڈال دی اور اس بات پر دھیان نہ کیا کہ جو لذائذ دنیا انہوں نے حاصل کئے ان کے ساتھ ذلت کے کتنے گھناؤنے مفاسد چپکے ہوئے ہیں، قرآنِ مجید کے اس مقام سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسان کا ضمیر زندہ ہو تو وہ کھانے کی لذت دسترخوان کے تنوعات کے اندر نہیں ڈھونڈتا بلکہ ضمیر اور ارادہ کی آزادی کے اندر ڈھونڈتا ہے، یہ چیز اگر اس کو حاصل ہو تو خشک روٹی بھی اس کے لیے جملہ الوانِ نعمت فراہم کرتی ہے:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

ہمارے اسلاف دل کی آزادی اور صرف رب کائنات کی غلامی کے ساتھ کس عزت وعظمت کے مقام پر تھے اور ہم سامانِ شکم کے پیچھے لگ کر کہاں جا گرے ہیں، جسم تو خوب تنومند ہیں مگر روحیں بیمار اور بے کار ہو چکی ہیں جس سے تمام تر عظمت وشوکت رخصت ہو چکی ہے اور ذلت وخواری در آئی ہے۔

۲) جو قوم بھی اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتی ہے اور انبیاء کرام کے اسوۂ حسنہ کو نظر انداز کر کے ان نفوسِ

قدسیہ پر دست درازی کرتی ہے یا عملاً اس کا رویہ نافرمانی اور زیادتی کا ہو جاتا ہے وہ کبھی راہ یاب نہیں ہو سکتی، تباہی و بربادی اور رسوائی و خواری اس کا مقدر ہو جاتی ہے جیسا کہ آج کل ہمارے ساتھ ہو رہا ہے، ہمیں تباہی کے عمیق گڑھے میں گرنے سے پہلے اپنے آپ کو سنوار لینے کی فکر کرنی چاہیے؟

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا، وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا، وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـُٔوۡنَ، مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا، فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ(۶۲)	بے شک جو لوگ ایمان لائے اور (اسی طرح) یہود، نصاریٰ اور صابئین سے جو لوگ بھی اللہ پر ایمان لائے اور روز آخرت پر بھی ان کا یقین کامل ہے اور نیک اعمال بھی کیے تو ایسے ہی لوگوں کو اپنے رب کے ہاں اجر ملے گا اور انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ کسی غم سے دوچار ہوں گے۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ اور جو لوگ ایمان لائے، اٰمَنُوۡا ماضی جمع مذکر غائب (اٰمَنَ یُؤۡمِنُ، اِیۡمَانًا) ایمان لانا، دل و جان سے تسلیم کرنا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان لانے والے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا..... اَیۡ اِنَّ الۡمُصَدِّقِیۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ صَلَی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ فِیۡمَا اَتَاهُمۡ بِهٖ مِنَ الۡحَقِّ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ (المراغی) ''وہ لوگ جو اس حق کو تسلیم کرتے ہیں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر تشریف لائے۔'' اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا الۡمُرَادَ بِالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا الَّذِیۡنَ صَدَّقُوا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ وَ صَارُوا مِن جُمۡلَةِ اَتۡبَاعِهٖ ''اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سے مراد وہ نفوس قدسیہ ہیں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور آپ کے اصحاب میں شامل ہو گئے'' (فتح القدیر)

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جو رسول پیغام حق لے کر آتا ہے اس کی ذات گرامی کو بھی سچ تسلیم کرنا

لازمی امر ہے، اور اس کی زندگی تو لوگوں کے لیے نمونہ ہوتی ہے، ہر رسول کی یہی پکار رہی۔

اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ، فَاتَّقُوْا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ (الشعراء۲۶:۱۲۶) ''یقیناً میں تمہارے لیے امین رسولؐ ہوں لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔'' اور خاتم النبیین محمدؐ کی حیاتِ طیبہ تو نسل انسانی کے لیے نمونہ ہے۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (الاحزاب۳۳:۲۱) ''تمہارے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات) میں بہترین نمونہ ہے۔'' آج کے درس کے حوالے سے یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کامیابی کا ضابطہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے ساتھ ساتھ زندگی کو اعمال صالحہ سے آراستہ کرنا بھی ہے اور یہ دین مسلمانوں ہی کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ یہود و نصاریٰ اور فرقہ صابئین جو بھی صدق دل سے اسے قبول کرتا ہے، اسے لازوال اجر و ثواب سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''اور اس قانون میں بظاہر تو مسلمانوں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی لیکن اس سے کلام پاک میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہوگئی ہے، اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے، کوئی موافق ہو یا مخالف، جو شخص بھی اطاعت کرے گا مورد عنایت ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے، سنانا تو اصل میں مخالف کو ہے، لیکن اس میں نکتہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر عنایت ہے سو اس کی علت ان سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں بلکہ ان کی صفت موافقت پر مدار ہے، ہماری عنایت کو، سو اگر مخالف بھی اختیار کر لے تو وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا، اس لیے مخالف کے ساتھ موافق کا بھی ذکر کر دیا گیا۔'' (معارف القرآن، جلد اول)

﴿وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا﴾ اور جو لوگ یہودی ہوئے۔ ھَادَ اَوْ تَھَوَّدَ اِذْ دَخَلَ فِی الْیَھُوْدِیَّۃِ (بیضاوی) ھَادُوْا کا معنی یہودیت اختیار کرنا ہے۔ ھَادُوْا اَیْ وَالَّذِیْنَ دَخَلُوا فِیْ الْیَھُوْدِیَّۃِ (المراغی) یہ لوگ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سے تھے مگر اصل دین کو چھوڑ کر بدعات و خرافات کا شکار ہو گئے۔ مفسرین کے نزدیک ان میں سے اکثر یہود ابن یعقوب کی نسل میں سے تھے۔

﴿وَالنَّصَارٰی﴾ نصرانی کی جمع ہے اور یہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے گاؤں ناصرہ سے مشتق ہے، سُمُّوْا بِذٰلِکَ اِنْتِسَابًا اِلٰی قَرْیَۃٍ یُقَالُ لَھَا نَصْرَانَ (مفردات القرآن) نصران گاؤں سے انتساب کی وجہ سے انہیں نصرانی اور جمع نَصَارٰی کہا جاتا ہے، ان میں سے ایسے بھی تھے جنہوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ

السلام کی دین کے معاملے میں مدد کی، ہر رسول اور ہر نبی کا دین اسلام تھا، قرآن حکیم میں آتا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا: مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ، قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ، اٰمَنَّا بِاللّٰهِ، وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (ال عمران ۳:۵۲) ''(عیسیٰؑ نے کہا) کوئی ہے جو اللہ (کے دین) کے لیے میری نصرت کرے۔ حواری (ایماندار ساتھی) کہنے لگے، ہم اللہ کے انصار (اس کے دین کے مدد گار ہیں) ہم ایمان لائے اور گواہ رہیے کہ ہم مسلمان ہیں۔''

یہودیت ہو یا نصرانیت یہ خود ساختہ نام ہیں، اللہ تعالیٰ کا دین روز اول سے ایک ہی رہا ہے اور وہ دین اسلام ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (ال عمران ۳:۱۹) ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین، اسلام ہی ہے۔''

یہود و نصاریٰ دونوں سیدنا ابراھیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا اور امام تسلیم کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کو دعویٰ تھا کہ وہ (ابراھیمؑ) ہمارے مذہب پر تھے۔ قرآن حکیم ان دونوں کی تردید اس طرح کرتا ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا، وَّ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (ال عمران ۳:۶۷) حضرت ابراھیمؑ نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ سب سے ہٹ کر اللہ ہی کا حکم ماننے والے (یعنی مسلم) تھے اور وہ ہرگز مشرک نہ تھے۔

﴿وَالصّٰبِئِيْنَ﴾ اور اس کا مفرد صَابِئٌ ہے جس کا معنی اپنے دین کو چھوڑنے والا قِيْلَ لِكُلِّ خَارِجٍ مِنَ الدِّيْنِ اِلٰى دِيْنٍ اٰخَرَ، صَابِئٌ (مفردات القرآن) ''ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونے والے کو 'صابی' کہتے ہیں'' چنانچہ قریش مکہ میں سے جو شخص اسلام قبول کر لیتا اسے صابی کہتے تھے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یہ وہ لوگ ہیں جو یقیناً ابتداءً دین حق کے پیرو رہے ہوں گے (اسی لیے قرآن میں یہودیت و نصرانیت کے ساتھ لیکن ان سے الگ کر کے ایک جماعت کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا گیا ہے) لیکن بعد میں ان کے اندر فرشتہ پرستی اور ستارہ پرستی آ گئی یا یہ کسی دین کے پیرو نہ رہے، اس لیے لامذہب لوگوں کو صابی کہا جانے لگا۔'' (تفسیر احسن البیان)

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا، فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾

ان میں سے جو کوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے اور اعمال صالحہ کرے ان کے لیے ان کے رب کے ہاں ان کا اجر ہے۔

﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾

پھر نہ تو ان پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

خوف واندیشہ کا تعلق مستقبل سے ہے اور غم وحزن کا ماضی سے، یعنی اہل ایمان کو نہ اپنے ماضی پر حسرت ہوگی نہ اپنے مستقبل کی طرف سے تشویش۔ (تفسیر ماجدی)

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نام، خاندان اور نسل کی بڑائی کی غلط فہمی کو دور کیا اور یہ اعلان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نام اور لقب کوئی چیز نہیں اور نہ اس کے ہاں کسی مخصوص نسل یا قوم کی خاندانی عزت اور امتیاز قابل اعتبار ہے، لوگ خواہ کسی نسل یا قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور خواہ ان کا لقب کچھ بھی ہو، ان کی نجات کے لیے دو باتیں ضروری ہیں ایک یہ کہ وہ اللہ اور آخرت کو دل سے مانیں اور دوسرے یہ کہ نیک کام کریں، اللہ کو مانیں گے تو اس کے احکام کو بھی مانیں گے، اللہ کے احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے معلوم ہوئے، اس لیے رسول کا ماننا اس میں شامل ہے، آخرت کو مانیں گے تو عذاب کو ثواب مانیں گے۔'' (درس قرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اسلام کی دعوت، عام اور عالمگیر ہے تمام فرقے اور ٹولے خود ساختہ ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے:

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

آج دنیا بھر میں مسلمان اسی فرقہ بندی کے سبب ذلیل وخوار ہورہا ہے اور پاکستان میں بھی اسلامی نظام انہی فرقوں کی وجہ سے آج تک قائم نہ ہوسکا۔

۲) آخرت میں کامیابی صرف ایمان اور عمل صالح کی بنیاد پر ہوگی، وہاں کوئی سفارش، کوئی امارت بجز نیک اعمال کے کام نہ آئے گی۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ، خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (٦٣) ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ، فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ (٦٤)	اور (یاد کرو وہ وقت!) جب ہم نے تم پر طور پہاڑ کو بلند کر کے اس طرح پختہ عہد لیا تھا کہ ''جو کتاب (توراۃ) ہم نے تمہیں دی ہے، اس پر مضبوطی سے عمل پیرا ہو جاؤ اور جو احکام و ہدایات اس میں ہیں انہیں یاد رکھو، اس طرح تم متقی بن جاؤ گے'' پھر تم اس عہد و پیمان سے پھر گئے اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو تم تباہ و برباد ہو چکے ہوتے!''

﴿وَاِذْ﴾ وَاذْكُرُوْا (اور اس وقت کو یاد کرو) ﴿اَخَذْنَا﴾ ہم نے لیا ماضی جمع متکلم، اللہ تعالیٰ، واحد ہے اور اس کے لیے جمع کا صیغہ عزت و عظمت کے لیے آتا ہے (اَخَذَ، يَأْخُذُ، اَخْذًا) پکڑنا، ٹھہرانا، لینا، طے کرنا۔ مِيْثَاقَ، پختہ عہد و پیمان العَهْدَ عَلَيْكُمْ بِالْعَمَلِ بِمَا فِي التَّوْرٰةِ (کلمات القرآن) یعنی وہ عہد

یہ تھا کہ تورات کے احکام وہدایات پر عمل پیرا ہو جاؤ گے۔ وَ رَفَعْنَا اور ہم نے بلند کیا، فعل ماضی صیغہ جمع متکلم (رَفَعَ، یَرْفَعُ، رَفْعًا) بلند کرنا، اٹھانا، سامنے لانا۔

﴿فَوْقَكُمُ﴾ (فَوْقَ- كُمْ) اوپر- تمہارے، اَلطُّوْرُ: جَبَلٌ وَ هُوَ الْجَبَلُ الَّذِیْ نَاجَی اللّٰهُ تعالٰی عَلَیْهِ مُوْسَی علیه السلام (ایسر التفاسیر) پہاڑ یا وہ خاص پہاڑ جہاں اللہ تعالیٰ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے ہمکلام ہوا۔

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ تھام لو (عمل پیرا ہو جاؤ) مَا (جو (کتاب) کہ) اٰتَیْنٰكُمْ (اٰتَیْنَا- كُمْ) ہم نے عطا کی۔ تمہیں بِقُوَّةٍ (مضبوطی کے ساتھ) یعنی پوری طرح عمل پیرا ہو جاؤ وَاذْكُرُوْا- اور یاد کرو۔ (ذَكَرَ، یَذْكُرُ، ذِكْرًا وَتِذْكَارًا) ذِكْرُ اللّٰهَ، اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتمجید کرنا، ذَكَرَ الشَّیءَ، دل میں یاد کرنا۔ ذَكَرَ الْاَمَرَ۔ اچھی طرح سمجھنا اور فہم حاصل کرنا (مصباح اللغات) ﴿وَاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ﴾ اور اچھی طرح فہم وادراک حاصل کرو ان باتوں کا کہ جو کچھ (توراۃ) کتاب میں درج ہیں، یہی بات قرآن حکیم کے بارے میں کہی گئی ہے:

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ (الزمر:۲۷) ''اور یقیناً ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثالیں بیان کر دی ہیں تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

محض کتاب اللہ کی تلاوت بغیر سوچے سمجھے کرنے پر امام غزالیؒ نے ایک مثال بیان کی ہے کہ ایک آقا نے اپنے چند غلاموں کو اپنے ایک باغ کی اصلاح اور دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا اور اس کے لیے انہیں ایک تحریری کتابچہ بھی دیا کہ اس کے مطابق اس کی اصلاح کریں، باغ کے پھلوں سے استفادہ کے ساتھ اپنے کام کو اچھی طرح سرانجام دینے پر انہیں اجر وانعام کا بھی وعدہ کیا۔ لیکن آقا کی طرف سے اس دی ہوئی کتاب سے ان کا تعلق صرف یہ تھا کہ وہ اس (تحریری کتابچہ) کی صرف تعظیم کرتے اور محض اس کے الفاظ کا تکرار کرتے اور لکھی ہوئی ہدایات کی پروانہ کرتے، اس طرح انہوں نے اپنی غفلت سے اس باغ کو تباہ کر دیا، پس اس غفلت اور کوتاہی کی وجہ سے سزا کے مستحق ٹھہرے اور وہ کتابچہ ان کے خلاف حجت بنا..... یہی حال کتاب الٰہی سے غفلت کرنے والوں کا ہے، کتاب الٰہی کا صحیح علم اور اس کے مطابق عمل ہی باعث نجات ہے۔

اور یاد رکھیے کہ جو افراد یا قومیں احکام الٰہی کے مطابق اپنے اعمال نہیں بناتیں، ذلت ورسوائی ان

کا مقدر ٹھہرتا ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تاکہ تم متقی اور پرہیزگار بن جاؤ۔ (یہ اسی صورت ممکن ہے کہ احکام الٰہی پر عمل پیرا ہو جاؤ)

مولانا عبدالحیؒ فاروقی لکھتے ہیں:

''بنی اسرائیل حضرت موسیٰ سے بار بار اصرار کرتے تھے کہ ہمارے لیے احکام کی ایک مستند کتاب لا دیجئے تاکہ اس پر عمل کر سکیں، یہ لوگ وعدے کرتے تھے کہ دین کی پوری پوری پیروی کریں گے، لیکن جب انہیں تورات دی گئی، تو اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ تورات کے حکم تو بڑے بھاری اور مشکل ہیں۔ ہم سے ان پر عمل نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس نافرمانی اور بغاوت سے روکنے کیلئے کوہِ طور کو حکم دیا جو ان سب کے سروں پر بلند ہو گیا۔ وہ ڈر کے مارے کانپنے لگے، اس وقت حکم ہوا کہ ''اس آسمانی کتاب کے احکام اور مضامین کو زندگی بسر کرنے کا قانون بناؤ اور ان پر پابندی سے عمل کرو۔'' (درس قرآن)

پہاڑ کا سروں پر معلق ہونے کا ذکر سورۃ الاعراف میں بھی آتا ہے:

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ، خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الاعراف ۷:۱۷۱)

''اور جب ہم نے ان پر پہاڑ کو اس طرح لا کھڑا کیا تھا گویا کہ وہ سائبان ہے اور انہیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے اور (حکم دیا کہ) جو کتاب ہم نے تمہیں دی ہے، اسے مضبوطی سے پکڑو اور جو اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو تاکہ تم متقی بن سکو۔''

﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ پھر، تم پھر گئے اس واقعہ کے بعد تَوَلَّيْتُمْ۔ جمع مذکر حاضر۔ تم سب پھر گئے۔

﴿فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ﴾ پس اس کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی، لَوْ کلمہ شرط، لَا کلمہ نفی، فَضْلُ اللّٰهِ اللہ کا فضل وَرَحْمَتُهٗ اور اس کی رحمت، لَكُنْتُمْ (لَ-كُنْتُمْ) لَ (منصوب) زبر والا تاکید پیدا کرتا ہے (كَانَ يَكُوْنُ) ہونا، كُنْتُمْ، تم سب ہوئے، جمع مذکر حاضر، خَاسِرِيْنَ اس کا واحد خَاسِرٌ ہے، اسم فاعل، خسارہ اٹھانے والے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) عالم ارواح میں بحیثیت مجموعی نسل انسانی کے ہر ہر فرد نے رب تعالیٰ سے وفاداری کا عہد کیا تھا جس کا نباہنا ہر انسان کی ذمہ داری ہے۔

۲) کلمہ طیبہ کے اقرار کے بعد ہر مسلمان روز ازل کے عہد کی تجدید کرتا ہے۔ اب اس کا اولین فرض بنتا ہے کہ شریعت اسلامیہ کو نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ رب کی دھرتی میں رب ہی کا قانون جاری وساری کرنے کی ہر ممکن سعی وجستجو کرے۔

۳) حصول پاکستان کے وقت ہم نے بھی اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ تیرے عطا کردہ وطن میں تیرا ہی قانون نافذ کریں گے۔ ہم نے اس عہد کی پاسبانی کہاں تک کی ہے؟

۴) مختلف ادوار اور اوقات میں ہمیں ہلایا اور جھنجھوڑا گیا..... زلزلے، قحط سالیاں، بے روزگاری اور ظالم حکومتیں۔ عوام کے لیے قہر بن کر نازل ہوئیں اور محض رب کریم کی رحمت اور فضل ہی سے ہم ابھی تک بچے ہوئے ہیں۔

۵) بقول سید قطب شہید: یہ معاہدہ کرنے والے کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ راحت وآرام، سہولت وتن آسانی کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ رہا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے..... جب ان پر دعوت حق کی ذمہ داری ڈالی گئی..... فرمایا تھا ''سونے کا زمانہ گزر گیا! خدیجہؓ!'' اور جیسا کہ ان کے رب نے ان سے فرمایا تھا: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (مزمل ۷۳:۵) ''ہم عنقریب تم پر ایک بھاری بات ڈالیں گے''۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے فرمایا:

خُذُوا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَّاذْکُرُوْا مَا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

اور اس آیہ مبارکہ کے ذریعے ہمیں بھی آگاہ کیا جا رہا ہے کہ قرآن حکیم ایسی عظیم کتاب کو ہم اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ (٦٥) فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (٦٦)	''اور تم اپنے ان لوگوں کا حال جانتے ہی ہو جنہوں نے ''سبت'' کے بارے میں زیادتی کی، لہٰذا ہم نے ان سے کہا کہ ہو ''جاؤ ذلیل وخوار بندر!'' پھر ہم نے اس واقعہ کو موجودہ اور بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت کا سامان اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے موعظت ونصیحت کا واقعہ بنا دیا۔''

(وَلَقَدْ) لَ اور قَدْ دونوں جملے کے شروع میں تاکید کے لیے آتے ہیں۔ عَلِمْتُمْ، ماضی جمع مذکر مخاطب، تم سب نے جان لیا (عَلِمَ يَعْلَمُ عِلْمًا) جاننا پہچاننا، اَلَّذِيْنَ، اسم موصول (Relative Pronoun) وہ لوگ جنہوں نے اِعْتَدَوْا، ماضی جمع مذکر غائب، تجاوز کیا، زیادتی کی (اِعْتَدٰى يَعْتَدِي اِعْتِدَاءً) باب افتعال اس کا مادہ (ع د و) ہے، زیادتی کرنا، تجاوز کرنا) عَدُوٌّ دشمن کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ زیادتی کر جاتا ہے۔ مِنْكُمْ (مِنْ-كُمْ) سے، تم یعنی تم میں سے فِي السَّبْتِ (ہفتہ کے دن کو) یہود کے لیے ہفتہ کا دن عبادت کے لیے مخصوص تھا اور اس دن کاروبار ممنوع تھا۔ فَقُلْنَا، (قَالَ يَقُوْلُ قَوْلًا) کہنا، پس ہم نے کہا، كُوْنُوْا فعل امر۔ تم سب ہو جاؤ (كَانَ يَكُوْنُ كَوْنًا) ہونا۔ قِرَدَةً (بندر) اس کا مفرد قِرْدَةٌ ہے، خٰسِئِيْنَ ذلیل وخوار اس کا مادہ (خ س ء) ہے خَسَأَ يَخْسَأُ سے اسم فاعل خَاسِئٌ اور جمع خَاسِئُوْنَ اور حالت نصبی ہونے کے سبب خَاسِئِيْنَ ہوا۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ سے ایک دن چاہا تھا جو ان کے لیے آرام کا دن ہو، ساتھ ہی مقدس ہو! اللہ تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول فرمالی اور سبت (ہفتہ) کے دن کو ان کے لیے مقدس اور آرام کا دن قرار دیا اور حکم دیا کہ اس دن وہ اپنی معاش کے لیے کوئی کام نہ کریں، پھر اللہ تعالیٰ نے مچھلیوں کے ذریعہ ان کا امتحان لیا! ہفتہ کے روز مچھلیاں کثرت سے سطح آب پر نظر آتیں اور بقیہ دنوں میں چھپ جاتیں، اس آزمائش میں بنی اسرائیل ثابت قدم نہ رہ سکے، وہ سامنے کے شکار کو ہاتھ سے کس طرح جانے دیتے! کیا وہ اللہ تعالیٰ

سے کیے ہوئے عہد و پیمان کی خاطر اتنی بہت سی مچھلیوں کو کھو دیتے؟ یہ یہود کی فطرت نہیں ہے؟ انہوں نے سبت (ہفتہ) کی بے حرمتی کی! انہوں نے احکام الٰہی کی خلاف ورزی حیلے اور بہانے سے کی! وہ سبت کے دن مچھلیوں کو گھیر لیتے اور آڑ کھڑی کر کے انہیں سمندر سے الگ کر لیتے، البتہ اس دن ان کا شکار نہ کرتے، جب سبت کا دن ختم ہو جاتا تو (شام) کو جلدی سے ان گھیری ہوئی مچھلیوں کو پکڑ لیتے۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ﴾ ''تو ہم نے ان سے کہا 'ہو جاؤ ذلیل و خوار بندر!''

اللہ سے انہوں نے جو عہد کیا تھا، اسے توڑنے کی سزا انہیں مل کر رہی، وہ جانور بنا دیے گئے کیونکہ وہ ارادہ و اختیار رکھنے والے انسان کے مقام سے گر کر حیوانات کی دنیا میں شامل ہو گئے تھے، جانور ارادہ و اختیار نہیں رکھتا، جانور پیٹ کی خواہش اور پکار سے اوپر نہیں اٹھتا، ان لوگوں نے ارادہ و اختیار کی خصوصیت کو کھو دیا تھا جس کے ذریعہ انسان عہد الٰہی کے سلسلے میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتا ہے، اور وہ جانور کے پست مقام پر جا گرے تھے۔

ضروری نہیں ہے کہ وہ جسمانی اعتبار سے بھی بندر ہو گئے ہوں، وہ اپنی روح اور اپنے طرز فکر کے اعتبار سے بندر ہو گئے تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے طرز فکر کا، اس کے چہرے، اس کے ظاہر اور اس کے خدوخال پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔

انسانوں کے بندر بنائے جانے کا یہ واقعہ تمام مخالفین حق کے لئے، جو اس دور میں تھے یا اس سے متصل ادوار میں ہوئے، عبرت کا سامان بنا اور اہل ایمان کے لیے تو وہ ہر دور میں موعظت و نصیحت کا حامل واقعہ تھا۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''انسان کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کی کوئی خواہش پوری کرتے وقت پہلے یہ دیکھتا ہے کہ اس خواہش کو پورا کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو اس کے لیے کیا شرعی اور اخلاقی حدود و قیود ہیں؟ (انسان میں جب واقعی اخلاق و انسانی شعور ہو) برعکس اس کے بندر کی کسی خواہش اور اس کے فعل کے درمیان اخلاقی حدود و قیود کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی جس چیز کو اس کا نفس چاہ بیٹھتا ہے اس کو وہ فوراً کر گزرتا ہے۔ اگر یہی حالت اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں کسی انسان کی یا کسی انسانی گروہ کی ہو جائے تو اس کے

درمیان اور بندر کے درمیان کوئی معنوی فرق نہیں رہ جاتا ہے صرف ایک ظاہری فرق تھوڑا سا رہ جاتا ہے جو صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک عقلی اور اخلاقی زوال اپنی آخری حد کو نہیں پہنچ جاتا۔ جب یہ زوال آخری حد کو پہنچ جاتا ہے تو یہ تھوڑا سا ظاہری فرق بھی بالآخر مٹ ہی کے رہتا ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''ان کے اخلاق جانوروں کی طرح ہو گئے، وہ اگرچہ انسانوں کی صورت میں تھے، مگر اب ان میں اور حیوانوں میں کوئی چیز مابہ الافراق (ممیّز) نہ رہی تھی، اب وہ خَیرُ البَرِیَّہ (بہترین مخلوق) کی بجائے شَرُّ البَرِیَّہ (بدترین مخلوق) اَلْاَعْمٰی (اندھے) الَّذِیْنَ لَایَعْلَمُونَ (بے خبر، عقل سے عاری انسان) تھے، انجام کار قوم کی قوم زنا کی عادی بن گئی اور جس کی آخری کڑی یہ تھی کہ وہ بندر اور سور بنا دیئے گئے کیونکہ بعض امراض اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انسان کی صورت مسخ ہو جاتی ہے اور وہ بالکل جانوروں کے مشابہ ہو جاتا ہے۔'' (الفرقان فی معارف القرآن)

اللہ تعالیٰ بداعمالیوں کی سزا جیسے اور جس طرح چاہے دے سکتا ہے، ایک مقام پر ارشاد ہوا:

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ، اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (المائدہ ۵:۶۰)

''وہ لوگ جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان پر اس کا غضب نازل ہوا پھر ان میں سے بعض کو اس نے بندر اور سور بنا دیا اور بعض کو طاغوت (شیطان) کے بندے بنا دیا، یہی لوگ درجہ کے لحاظ سے بدتر اور سیدھی راہ سے بہت بہکے ہوئے ہیں۔''

اور پھر ایک دوسرے مقام پر ان لوگوں کا حال بتایا جو صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے اور خواہشات نفس کے بندے ہیں:

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف ۷:۱۷۹)

''ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہیں (نہیں نہیں) بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔''

﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾

پھر ہم نے اس واقعہ کو موجودہ اور بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت کا سامان بنا دیا۔

فَجَعَلْنٰهَا (فَ–جَعَلْنٰهَا) پس، بنایا ہم نے اس کو۔ ھا کی ضمیر سزا یا قوم بنی اسرائیل کی طرف جاتی ہے وَجَعَلْنَا تِلْکَ الْعُقُوْبَةَ (ابن جریر) اور ہم نے اس سزا کو بنایا، نَکَالًا، عبرتناک سزا۔ لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَ مَا خَلْفَهَا، مَا یہاں پر دونوں جگہ مَنْ کا معنی دیتا ہے یعنی (جو) لِاُمَمِ الَّتِی فِیْ زَمَانِهَا وَبَعْدِهَا (جلالین) یعنی وہ لوگ جو ان کے ہم عصر تھے یا بعد میں آنے والے، یعنی ان سے یہ ہم عصر اور بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے یہ سزا باعث عبرت بنی۔

﴿وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ (وَعَظَ یَعِظُ وَعْظًا، اور مَوْعِظَةً) نصیحت، مُتَّقِیْ مفرد اور جمع مُتَّقِیْن پرہیزگار، پرہیزگاروں کے لیے یہ سزا یا قوم بنی اسرائیل باعث نصیحت بنی تاکہ ویسی غلطی کا ارتکاب نہ کریں اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کا دم بھرتے رہیں۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) جو افراد یا جو قومیں خلاقی حدود و قیود سے تجاوز کرتی ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہیں سکتی ہیں، اس کا قانون اٹل اور یقینی ہے، کیا پاکستانی قوم گمراہی اور تباہی کا شکار نہیں ہو چکی ہے؟ کیا حکمران اور کیا عوام شب و روز دھن دولت کے چکر میں نہیں؟ کتنے دولت لوٹ کر باہر جا چکے ہیں اور ملک کو کنگال بنا گئے ہیں اور کتنے سمیٹنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ کیا آزادی کی قدر و قیمت ہم نے یہی ڈالی ہے؟

۲) ہمارے یہاں روزمرہ کے جھگڑے اور فسادات سے نہ معلوم کتنے خاندان برباد اور کتنے گھرانے اجڑ رہے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم میں انسانیت کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے، یہاں پر مجھے پھر شاعر کا ہمنوا ہونا پڑتا ہے:

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖٓ، اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً، قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا، قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (٦٧) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَاهِيَ، قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ، عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ، فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ (٦٨)	''اور یاد کرو اس بات کو کہ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا ''کہ اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے'' تو وہ کہنے لگے ''کیا ہم سے مذاق کرتے ہو؟'' موسیٰ نے جواب دیا ''میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہل و نادان بنوں'' وہ کہنے لگے (اچھا!) تو اپنے رب سے درخواست کیجئے، کہ وہ ہم پر واضح کرے کہ وہ کیسی ہے؟ موسیٰ نے کہا ''وہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، بلکہ اوسط عمر کی ہو، لہٰذا جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرو۔''

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ﴾ وَاِذْ (Shows time) اور وہ وقت یاد کرو قَالَ (کہا)، موسیٰ: سیدنا موسیٰ علیہ السلام سلسلہ بنی اسرائیل کے سب سے زیادہ مشہور اور جلیل القدر پیغمبر کا نام ہے۔ لِقَوْمِهٖ (لِ–قَوْمِ–ہٖ) کو، قوم، اپنی یعنی اپنی قوم کو کہا ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، اِنَّ جملے کے شروع میں زور کلام کے لیے آتا ہے يَاْمُرُكُمْ فعل مضارع، واحد مذکر غائب (اَمَرَ– يَاْ مُرُ– اَمْرًا) حکم دینا (يَاْمُرُ– كُمْ) حکم دیتا ہے تمہیں، اَنْ (کہ) تَذْبَحُوا ذَبَحَ يَذْبَحُ، ذَبْحًا۔ ذبح کرنا یہ لفظ تَذْبَحُوْنَ تھا اَنْ آنے کی وجہ سے ن گر گیا اور تَذْبَحُوْا رہ گیا بَقَرَةً کوئی سی گائے۔

یہاں پر اس واقعہ کا بیان ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص قتل ہو گیا، قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا، قاتل کی نشاندہی کے لیے گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا، عرصہ دراز مصر میں رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بہت سی شرکیہ رسومات پیدا ہو چکی تھیں، ان میں سے گائے کا تقدس بھی تھا، ہندوستان کی طرح مصر میں بھی گائے کی تقدیس اور پرستش کی جاتی تھی، گاؤ پرستی کے شرک کو توڑنے کے لیے ضروری تھا کہ ان کے ہاتھوں گاؤکشی کا عمل تسلسل کے ساتھ کروایا جائے تا کہ اس جانور کی عظمت و تقدیس دلوں کی کمین گاہوں

سے نکل جائے، یہی وجہ ہے کہ تورات میں گائے کی قربانی کا حکم کئی مقامات پر ہے۔

﴿قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾ انہوں نے کہا، کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ أ کلمہ استفہام ہے، تَتَّخِذُنَا مضارع واحد مخاطب۔ تم مذاق کرتے ہو ہمارے ساتھ (اتَّخَذَ یَتَّخِذُ، اِتِّخَاذٌ) پکڑنا۔ بنانا، هُزُوًا، استہزاء، مذاق۔ بنی اسرائیل ایسے مقدس جانور کے ذبح کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے بس یہی سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام ان سے ہنسی مذاق کر رہے ہیں۔

﴿قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾

(فرمایا) (موسیٰ علیہ السلام نے) میں پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہل و نادان بنوں۔

اَعُوْذُ (عَاذَ، یَعُوْذُ، اِعَاذَةً) میں پناہ مانگنا، اَعُوْذُ مضارع واحد متکلم کا صیغہ ہے میں پناہ مانگتا ہوں، اَنْ (کہ) اَكُوْن (میں ہو جاؤں) مِن (سے) الجٰهِلِيْنَ، جَاهِلٌ، کسی کام کو صحیح طریق کے برخلاف کرنے والا، یعنی اجڈ شخص، اس کی جمع جَاهِلُوْنَ ہے مِنْ کی وجہ سے جَاهِلُوْنَ کی بجائے جَاهِلِيْنَ آیا ہے۔

انبیا کرام کی تعلیم و تربیت کا نگران رب العالمین ہوتا ہے اس لیے کہ ان نفوس قدسیہ کی زندگیاں لوگوں کے لیے نمونہ قرار پاتی ہیں، بھلا ان سے جہالت اور نادانی کا صدور کیونکر ہو سکتا ہے؟

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ﴾ انہوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لیے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ اُدْعُ فعل امر واحد مذکر غائب يُبَيِّنُ (بَيَّنَ يُبَيِّنُ، تَبْيِيْنٌ) بیان کرنا، لَنَا، ہمارے لیے مَا هِيَ کیسی ہے، وہ (گائے)۔

﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ﴾

موسیٰ نے کہا ''وہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا۔

قَالَ کہا (موسیٰ نے) اِنَّه (اِنَّ–هٗ) بلاشبہ۔ وہ يَقُوْلُ (وہ کہتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ) اِنَّهَا (اِنَّ–هَا) بے شک۔ وہ گائے، ھا کی ضمیر گائے کی طرف جاتی ہے۔ فَارِضٌ (ف ر ض) فَرُضَ يَفْرُضُ گوشت کا گھٹ جانا یا کم ہو جانا یعنی عمر کا وہ حصہ جس میں گوشت گھلنا اور کم ہونا شروع ہو جائے اشارہ بڑھاپے کی طرف ہے۔ بِكْرٌ ایسی گائے جس نے ابھی بچہ نہ جنا ہو، لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ یعنی اوسط عمر کی گائے۔

عَوَانٌ– '' اَلْعَوَانُ'' النِّصْفُ فِي السِّنِّ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَهَائِمِ (المنار) ''عورتوں اور بہائم میں

سے درمیانی عمر والے کو عوان کہتے ہیں۔''

﴿فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ﴾ (فَعَلَ یَفْعَلُ) کرنا، پس تم سب کرو مَا (جو، جس کا) مخاطب تُؤْمَرُوْنَ (اَمَرَ یَأْمُرُ، اَمْرًا) حکم دینا، یَأْمُرُ سے مجہول یُؤْمَرُ اور اس سے مخاطب، تُؤْمَرُ اور جمع تُؤْمَرُوْنَ ہے۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''جب قانون پر عمل کرنا منظور نہ ہو تو اس میں فلسفیانہ موشگافیوں سے کام لیا جاتا ہے بال کی کھال اتاری جاتی ہے اور مقصد یہی ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس سے نجات مل جائے، سوالات کثرت سے کیے جاتے ہیں، باتیں بہت سی پوچھی جاتی ہیں فرضی صورتیں پیش کرتے ہیں اور ان تمام کا ماحصل ترک قانون کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

اگر وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حکم سنتے ہی گائے ذبح کر دیتے تو انہیں اتنی تکالیف برداشت کرنے کی نوبت ہی نہ آتی مگر ان کی نیت نہ تھی، اس لیے کثرت سوال سے موسیٰ کو تنگ کر دیا، پس خود تنگی میں مبتلا ہو گئے، قاعدہ ہے کہ قانون اپنی ابتدائی شکل میں بہت سادہ اور سہل ہوتا ہے مگر جوں جوں آپ سوالات کرتے جائیں گے، قیود اور پابندیاں بڑھتی جائیں گی اور اس کا دائرہ تنگ ہوتا جائے گا۔''

(الفرقان فی معارف القرآن)

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) جب کوئی قوم فسادی اور جھگڑالو ہو جائے تو اس کی اصلاح کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ وہ اپنی خطاؤں پر نادم وشرمسار ہو، اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ واستغفار کے بعد اپنی اصلاح کرے اور اس کی اطاعت اور غلامی کا دم بھرنا شروع کر دے، وہ نہ صرف راہ راست پر آجاتی ہے بلکہ اسے دنیا وآخرت میں کامیابی کی نوید بھی ملتی ہے۔ افراد یا قوموں کی ذلت ورسوائی اس میں ہے کہ وہ خطا کار بھی ہوں اور اپنی خطاؤں پر پردہ ڈالنے کے لیے حیل وحجت سے بہانے بھی تلاش کرتے پھریں، جن پر چوری اور سینہ زوری کا محاورہ صادق آتا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کا حال ہو چکا تھا۔

کچھ ایسا ہی ہمارا حال ہے پاکستان کو معرض وجود میں آئے ساٹھ برس ہونے کو ہیں اللہ تعالیٰ سے اس وعدہ پر یہ ملک ملا تھا کہ اس میں نظام اسلام کا نفاذ ہوگا اور زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام ہی کا عادلانہ قانون جاری وساری ہوگا مگر افسوس کہ ہم نے عہد کی پاسداری نہ کی جس کے نتیجہ میں آدھا ملک ہاتھ سے جاتا رہا اور باقی حصہ بھی ڈانواں ڈول ہے۔ ابھی مرے کے مرے، کیونکہ جب کوئی قوم اخلاقی

لحاظ سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے تو اس کا وجود ہمیشہ خطرے میں رہتا ہے۔
ملک کا نصف حصہ ضائع ہونے کے بعد بھی ہمیں نصیحت نہیں ملی ہے، سود کے معاملہ ہی کو لیجئے کہ عرصہ سے اخبارات میں آ رہا ہے کہ فلاں ماہ سے سودی کاروبار ختم کر دیا جائے گا مگر سود کیا ہر طرف اسلام سے بغاوت ہے اور ہر طرف ہم نے اپنے لیے کانٹے بو رکھے ہیں، ہمارا مشورہ قرآن و سنت سے نہیں بلکہ امریکہ اور برطانیہ سے ہوتا ہے۔ سچ ہے

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا، قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ، فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ (٦٩) قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا، وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ (٧٠) قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي الْحَرْثَ، مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا، قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ، فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ (٧١)	''وہ کہنے لگے (موسیٰ علیہ السلام سے) اپنے رب سے درخواست کیجئے، کہ وہ ہمارے لیے اس (گائے) کے رنگ کی وضاحت کر دے، موسیٰ نے کہا کہ اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسے شوخ زرد رنگ کی ہو جو دیکھنے والوں کو خوش کر دے'' کہنے لگے موسیٰ! ہمارے لیے اس کی مزید وضاحت کی درخواست کیجئے کیونکہ ایسی گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے، اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور اس کا پتہ لگا لیں گے۔ موسیٰ نے جواب دیا ''اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے کوئی خدمت نہیں لی جاتی، نہ زمین جوتتی ہے، نہ پانی کھینچتی ہے، صحیح و سالم اور بغیر داغ دھبہ کے ہے'' اس پر وہ پکار اٹھے کہ ہاں! اب تم نے ٹھیک بتلایا ہے، پھر انہوں نے گائے ذبح کی ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔''

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا﴾ انہوں نے (موسیٰ سے) کہا کہ وہ رب سے درخواست کر کے گائے کا رنگ پوچھیں یُبَیِّنُ (بَیَّنَ یُبَیِّنُ، تَبْیِیْنٌ) باب تفعیل بیان کرنا، وضاحت کرنا (لَوْنُ–هَا) رنگ، اس کا، ھا کی ضمیر گائے کی طرف جاتی ہے۔

﴿قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ، فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ﴾ کہا بے شک اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (اِنَّ–هٗ) بے شک وہ هٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے یَقُوْلُ فعل مضارع صیغہ واحد مذکر غائب (قَالَ یَقُوْلُ قَوْلًا) کہنا بَقَرَةٌ (گائے) صَفْرَاءُ (زرد رنگ) اَصْفَرُ سے مونث صَفْرَاءُ بنا، بَقَرَةٌ چونکہ مونث ہے اس لیے اس کی صفت بھی صَفْرَآءُ (مؤنث) آتی ہے، عربی میں صفت موصوف کی حالت یکساں ہوتی ہے۔ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا گہرا اور کھلتا ہوا رنگ، تَسُرُّ (خوش کرے، اچھی لگے) (سَرَّ یَسُرُّ، سُرُوْرًا) خوشنما دکھائی دے، خوش کرے، اَلنَّاظِرِیْنَ نَظَرَ یَنْظُرُ (دیکھنا) اسم فاعل، نَاظِرٌ (دیکھنے والا) اس کی جمع نَاظِرِیْنَ ہے (بہت سے دیکھنے والے)۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''چونکہ ان لوگوں کو یعنی بنی اسرائیل کو اپنی ہمسایہ قوموں سے گائے کی عظمت و تقدیس اور گاؤ پرستی کے مرض کی چھوت لگ گئی تھی، اس لیے ان کو حکم دیا گیا کہ گائے ذبح کریں۔ ان کے ایمان کا امتحان ہی اس طرح ہو سکتا تھا کہ اگر وہ واقعی اب اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے تو یہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے جس بت کو معبود سمجھتے رہے ہیں اسے اپنے ہاتھ سے توڑیں، یہ امتحان بہت کڑا امتحان تھا، دلوں میں پوری طرح ایمان اترا ہوا نہ تھا، اس لیے انہوں نے ٹالنے کی کوشش کی اور تفصیلات پوچھنے لگے مگر جتنی جتنی تفصیلات وہ پوچھتے گئے اتنے ہی گھرتے چلے گئے یہاں تک کہ آخر کار اسی خاص قسم کی سنہری گائے پر جسے اس زمانے میں پرستش کے لیے مختص کیا جاتا تھا، گویا انگلی رکھ کر بتا دیا گیا کہ اسے ذبح کرو۔ بائبل میں بھی اس واقعے کی طرف اشارہ ہے مگر وہاں یہ ذکر نہیں ہے کہ بنی اسرائیل نے اس حکم کو کس کس طرح ٹالنے کی کوشش کی تھی۔''

(تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا، وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ﴾ کہنے لگے (اے موسیٰ) اُدْعُ، پکاریئے، درخواست کیجئے (د ع و) دَعَا یَدْعُوْا، پکارنا، اس سے فعل امر اُدْعُ، لَنَا (ہمارے لئے) رَبَّکَ (رَبَّ–کَ) رب، تیرا، یعنی اپنے رب سے، یُبَیِّنْ (وہ

واضح کرے)مَا (کیا؟،کیسی؟)هِیَ (وہ گائے ہے)۔اِنَّ الْبَقَرَ بے شک وہ گائے،تَشٰبَهَ عَلَيْنَا،ہمیں اشتباہ پڑ گیا ہے،(ش ب ہ)تَشَابَهَ يَتَشَابَهُ تَشَابُهًا(باب تفاعل)شبہ کا پیدا ہونا،مشتبہ ہونا،وَاِنَّا (بلاشبہ ہم)اِنْ،شرطیہ،شَاءَ يَشَاءُ (چاہنا)ان شاءاللہ،اگر اللہ نے چاہا، لَمُهْتَدُوْنَ (لَ– مُهْتَدُوْنَ) ضرور بضرور–راستہ پانے والے ہیں(ہ د ی) اِهْتَدٰى يَهْتَدِیْ، اِهْتِدَاءً باب افتعال،ہدایت پانا اس سے اسمِ فاعل مُهْتَدٰی ہدایت پانے والا اور جمع مُهْتَدُوْنَ،اس سے پہلا لام زبر کے ساتھ تاکید پیدا کرتا ہے۔

﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِی الْحَرْثَ، مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا، قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ، فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾

موسیٰ نے جواب دیا''اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے کوئی خدمت نہیں لی جاتی،نہ زمین جوتتی ہے،نہ پانی کھینچتی ہے،صحیح وسالم اور بغیر داغ دھبہ کے ہے''اس پر وہ پکار اٹھے کہ ہاں!اب تم نے ٹھیک بتلایا ہے،پھر انہوں نے گائے ذبح کی ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ، موسیٰ نے کہا اِنَّهٗ، بے شک وہ،هٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے يَقُوْلُ، (وہ کہتا ہے) اِنَّهَا، بے شک وہ گائے،لَا ذَلُوْلٌ (نہیں،محنت کرنے والی)(ذَ لَ لٌ)ذَلَّ يَذُلُّ سے مبالغہ کا صیغہ ذَلُوْلٌ کمزور ہونا،خستہ حال ہونا،محنت کر کے تھک جانا،یعنی وہ گائے کھیتی باڑی اور پانی نکالنے کے عمل سے خستہ حال نہ ہو چکی ہو،تُثِيْرُ الْاَرْضَ (ث و ر) اَثَارَ يُثِيْرُ اِثَارَةً۔زراعت کے لیے زمین کو پھاڑنے کو کہتے ہیں،اَلْاَرْضَ (زمین)وَلَا تَسْقِیْ اور نہ وہ سیراب کرتی ہو،(س ق ی)سَقٰى يَسْقِیْ سَقَاءً،سیراب کرنا،پانی دینا الْحَرْثَ،کھیتی،زراعت مُسَلَّمَةٌ صحیح وسلامت(س ل م) سَلَّمَ يُسَلِّمُ، تَسْلِيْمًا (باب تفعیل)محفوظ رکھنا،اس سے اسم مفعول مؤنث مُسَلَّمَةٌ، لَا،نفی جنس کے لیے ہے شِيَةَ (داغ دھبہ) لَاشِيَةَ یعنی وہ گائے ایک ہی رنگ کی ہو اور اس کے رنگ میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو،قَالُوْا، کہا انہوں نے اَلْئٰنَ، اب جِئْتَ تو آیا ہے(جَاءَ، يَجِیْءُ، سے فعل ماضی واحد مذکر حاضر کا صیغہ۔بِالْحَقِّ (بِ– الْحَقِّ) ساتھ حق کے یعنی واضح اور سچی بات کے ساتھ فَذَبَحُوْهَا (فَ–ذَبَحُوْا–هَا)پس، ذبح کیا انہوں نے،اس گائے کو هَا کی ضمیر گائے کی طرف ہے،وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ مَا۔کلمہ نفی کا ہے، كَادَ يَكَادُ، سے كَادُوْا فعل ماضی جمع مذکر غائب ممکن ہونا،کسی کام کو عنقریب سرانجام دینے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ، یعنی وہ ایسا کرنے کے قریب تک نہ تھے۔(انہوں نے بادل نخواستہ حکم الٰہی کی تعمیل کی)۔

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) افراد یا اقوام کا سرکشی اوراخلاقی جرائم کا شکار ہونا تباہی و بربادی کا نشان ہے، بجائے ندامت اور شرمساری کے ان جرائم پر پردہ ڈالنااور بھی بڑا گناہ ہے۔

۲) توبہ وندامت کے ساتھ ساتھ احکام الٰہی کی بے چون و چرا اطاعت ہی نجات اور سلامتی کی راہ ہے، غرور اور کٹ حجتی میں سراسر نقصان اور خسارہ ہے۔

۳) راہ نجات اس میں ہے کہ پیغام ہدایت کے سیدھے اور سچے اصولوں کو کھلے دل سے مان لیا جائے اور جب افرادِ قوم میں تفصیل طلبی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ عمل سے محروم ہو جاتی ہے، جب تک مذہب اپنی سادہ حالت میں رہے، لوگوں میں جوش عمل موجود رہتا ہے اور جب وہ کج بحثیوں میں مبتلا ہو جائیں تو وہ عمل سے محروم وجاتے ہیں۔

۴) ہمارے لیے یہ آیات عبرت وموعظت کا عظیم پیغام رکھتی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اسلام کے سچے اور کھرے اصولوں کو بلا حیل وحجت اپنی انفرادی اور قومی زندگی میں نافذ کر ڈالیں، ورنہ بنی اسرائیل کی طرح سوائے تباہی و بربادی کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا، حق تو یہ ہے کہ قرآن کے اصول سادہ، سہل، آسان اور قابل عمل ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر ۵۴:۱۷)

''ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے یقیناً آسان بنا دیا ہے، پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟''

یہ حقیقت ہے کہ قرآن حکیم کی زریں ہدایات پر عمل کرنے سے زندگی دنیا اور آخرت میں مسرتوں اور شادمانیوں سے ہمکنار ہو جاتی ہے مگر کیا کیجئے کہ انسان اپنی سرکشیوں میں تباہی و بربادی کی طرف جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو پکار پکار کر انسانوں کو اپنی طرف بلا رہا ہے مگر انسان ہیں کہ توجہ ہی نہیں کرتے۔ بقول حکیم الامت علامہ محمد اقبال:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے، جوہر قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا، وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۷۲) فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا، كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۷۳)	''(اور تمہیں وہ واقعہ یاد ہے) جب تم نے ایک آدمی کو مار ڈالا، پھر تم الزام ایک دوسرے کے سر تھوپ رہے تھے (اور یہ نہیں جانتے تھے کہ) جو تم چھپانا چاہتے تھے، اللہ اسے ظاہر کرنے والا تھا، سو ہم نے حکم دیا کہ اس کا ایک ٹکڑا لاش پر مارو، اللہ اس بھی طرح مردوں کو زندہ کر سکتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھلاتا ہے تا کہ تم سمجھو (کہ قیامت کا ہونا خلاف قیاس نہیں ہے)''

﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا﴾

(اور تمہیں وہ واقعہ یاد ہے) جب تم نے ایک آدمی کو مار ڈالا، پھر تم الزام ایک دوسرے کے سر تھوپ رہے تھے۔

وَاِذْ (اور اس وقت کو یاد کرو) قَتَلْتُمْ تم نے قتل کیا، فعل ماضی جمع مذکر مخاطب (قَتَلَ يَقْتُلُ، قَتْلًا) قتل کرنا، جان سے مار ڈالنا نَفْسًا، کسی نفس کو، کسی جان کو، فَادّٰرَءْتُم، (فَ–اِدَّارَءْتُمْ) پس۔ ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے (درء) اِدَّارَءَ، يَدَّارَءُ آپس میں الزام لگانے کو کہتے ہیں دَرَءٌ کے معنی دفع کرنے اور پھینکنے کے ہیں اسی سے تَدَّارَأْتُمْ ہے جو ادغام کے قاعدے سے اِدَّارَءْتُمْ ہو گیا ہے اس کے معنی آپس میں ایک دوسرے پر الزام لگانے کے ہیں (تدبر قرآن) فِيْهَا (فِيْ–هَا) میں اس جان یعنی اس جان میں، هَا کی ضمیر نفس یا جان کی طرف ہے۔

﴿وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ اور اللہ نکالنے والا تھا جو تم چھپاتے تھے۔

مُخْرِجٌ، اسم فاعل، نکالنے والا، (خ ر ج) اَخْرَجَ يُخْرِجُ، اِخْرَاجًا نکالنا، مَا (جو) كُنْتُمْ فعل ماضی جمع مذکر مخاطب، تم تھے (كَانَ يَكُوْنُ كَوْنًا) ہونا، اسے فعل مضارع کے شروع میں لائیں تو ماضی استمراری کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، مضارع کے ساتھ ساتھ كَانَ کے صیغے بھی بدلتے جاتے ہیں جیسا کہ

كَانَ يَكْتُمُ– كَانَا يَكْتُمَانِ، كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ سے جمع مذکر مخاطب كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ، تم سب چھپاتے تھے كَتَمَ يَكْتُمُ، كِتْمَانًا۔ چھپانا، پردہ ڈالنا۔﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ تو ہم نے حکم دیا: تم اس کا ایک ٹکڑا (یعنی گائے کے گوشت کا) لاش پر مارو، (فَ–قُلْنَا) پس، کہا ہم نے قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا، کہنا اِضْرِبُوْهُ، اسے مارو (ضَرَبَ يَضْرِبُ ضَرْبًا) هٗ کی ضمیر مقتول کی طرف ہے بِبَعْضِهَا یعنی اس گائے کے بعض اجزا میں سے مقتول پر مارو، هَا کی ضمیر گائے کی طرف ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ اللہ اس طرح بھی مردوں کو زندہ کرسکتا ہے۔

كَذٰلِكَ، کلمہ تشبیہ، يُحْيِيْ زندہ کرتا ہے فعل مضارع صیغہ واحد مذکر غائب (اَحْيٰى، يُحْيِيْ، اِحْيَاءً) زندہ کرنا الْمَوْتٰى (مردے) اس کا مفرد مَيِّتٌ ہے یعنی اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتا ہے، ﴿وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ﴾ اور وہ دکھاتا ہے تمہیں (يُرِيْ– كُمْ) (اَرٰى، يُرِيْ، اِرَاءَةٌ) باب افعال ہے دکھانا (to show) اور رَاَى، يَرٰى کے معنی ہیں دیکھنا (to see) اٰيَاتِهٖ (اٰيَاتِ– هٖ) آیات۔ اپنی، ہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور جمع مونث سالم ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں زبر کی بجائے زیر استعمال ہوئی ہے۔ آیات کا مفرد، اٰيَةٌ ہے، اس کے معنی، قرآن حکیم کی آیات، اسباق، نشانات اور انفس وآفاق کے شواہد ہیں (Proofs, evidences, verses, Lessons, Signs revelations etc.) غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہوا کا ہر جھونکا، پانی کی ہر لہر، ریت کا ہر ذرہ اور درخت کا ہر پتہ رب کائنات کی کبریائی وعظمت پر شاہد ہے کیا خوب کسی نے کہا ہے:

"وَفِيْ كُلِ شَيءٍ لَّهٗ اٰيَةٌ تَدُلُّ عَلٰى اَنَّهٗ وَاحِدٌ"

کائنات کی ہر چیز میں اس کی کاریگری عیاں ہے
اور اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ وہ یکتا ہے

﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (لَعَلَّ–كُمْ) شاید۔ تم، تَعْقِلُوْنَ، مضارع جمع مذکر مخاطب (عَقَلَ، يَعْقِلُ، عَقْلًا) عقل سے کام لینا، تدبر وتفکر کرنا۔

خواجہ عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''ان آیات میں گزشتہ آیات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ بنی

اسرائیل میں ایک شخص قتل ہو گیا تھا لیکن قاتل کا پتہ نہیں چلتا تھا، کیونکہ مشتبہ لوگ ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اصل قاتل کا نام بتانے کے لیے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ ایک گائے ذبح کریں، انہوں نے ٹال مٹول کی، جب کافی حیلے بہانے کر کے وہ اس پر تیار ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا اس مقتول کی لاش پر مارو۔ گوشت کا مارنا تھا کہ مقتول زندہ ہو گیا اور اس نے قاتل کا نام و پتہ سب بتا دیا اور اس طرح ایک بہت بڑی مشکل حل ہو گئی اور مقتول یہ بتانے کے بعد مر گیا۔

(اس بات سے) اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا کہ انسان کو مار کر جگانا ہمارے بس کی بات ہے اور جس طرح اس مقتول نے دوبارہ زندہ ہو کر اپنی پہلی زندگی کے حالات بتا دیئے تھے، اسی طرح ہم تمام انسانوں کو جب قیامت کے دن زندہ کریں گے تو وہ خود اپنے اعمال کی گواہی دیں گے۔'' (درس قرآن، جلد اول)

الاستاذ محمد امین الشنقیطی لکھتے ہیں:

''یہ آیات مرنے کے بعد زندہ ہونے پر شاہد ہیں، اس لیے کہ جو رب ایک جان کو زندہ کر سکتا ہے وہ تمام لوگوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے، اس حقیقت کو قرآن حکیم میں ایک دوسرے مقام پر بیان کیا گیا ہے: مَاخَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (لقمٰن:۲۸) ''تمہیں پیدا کرنا اور دوبارہ زندہ کر کے اٹھا لینا ایسا ہے جیسا ایک نفس کو پیدا کرنا ہے''۔ (اضواء البیان)

آیات مبارکہ کی حکمت و بصیرت

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

۱) یہ قتل کا وہی واقعہ ہے جس کی بنا پر بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس قتل کا راز فاش کر دیا دراں حالیکہ وہ قتل رات کی تاریکی میں لوگوں سے چھپ کر کیا گیا تھا، مطلب یہ ہوا کہ نیکی یا بدی تم کتنی بھی چھپ کر کرو، اللہ کے علم میں ہے اور اللہ تعالیٰ اسے لوگوں پر ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اس لیے خلوت ہو یا جلوت ہر وقت اور ہر جگہ اچھے کام ہی کیا کرو تا کہ اگر وہ کسی وقت ظاہر بھی ہو جائیں اور لوگوں کے علم میں آ جائیں تو شرمندگی نہ ہو بلکہ اس کے وقار و احترام میں اضافہ ہی ہو اور بدی کتنی بھی چھپ کر کیوں نہ کی جائے اس کے فاش ہونے کا امکان ہے جس سے

انسان کی بدنامی اور ذلت ورسوائی ہوتی ہے۔(تفسیر احسن البیان)

۲) قیامت کے روز مُردوں کا دوبارہ زندہ ہونا منکرین قیامت کے لیے ہمیشہ حیرت واستعجاب کا باعث رہا ہے،اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کو بھی قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف اسالیب اور پیرایوں میں بیان فرمایا ہے۔ مندرجہ بالا واقعہ کے علاوہ سورۂ بقرۃ ہی میں آیت ۵۶، ۲۴۳، ۲۵۹، ۲۶۰ میں ملاحظہ کیجئے۔

۳) کتمانِ جرم سے معاشرتی زندگی تہہ وبالا ہو جاتی ہے جس کا ثبوت مندرجہ بالا واقعہ سے ہوتا ہے اور یہی حال اب ہمارے اس وطن میں ہے، مجرم، جرم کر کے راہ فرار اختیار کرتے ہیں اور حکومت کی گرفت اتنی کمزور ہے کہ مجرم مزید جرم کے لیے دلیر ہو جاتے ہیں۔

۴) مجرمین کو سزا دینے میں تاخیر کرنا انصاف کے سراسر خلاف ہے۔ (Delay in justice, Deny in Justice) اور مجرموں کی پشت پناہی کرنا تو اس سے بھی بڑا جرم ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً، وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ، وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ، وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۷۴)	”(مسلسل نافرمانیاں کرنے کے نتیجے میں) آخر کار تمہارے دل سخت ہو گئے، اتنے سخت جیسے پتھر ہوں یا ان سے بھی سخت تر، کیونکہ پتھروں میں سے تو کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی رسا کرتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے ڈر سے (لرز کر) گر پڑتے ہیں اور جو کچھ بھی تم کر رہے ہو اس سے اللہ بے خبر نہیں ہے۔“

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾

ثُمَّ حروف عطف میں سے ہے، اور پہلی چیز سے دوسری متاخر ہونے پر دلالت کرتا ہے (مفردات القرآن) قَسَتْ سخت ہو گئے۔ ماضی واحد مونث غائب (قَسٰی یَقْسُوْ، قَسْوَۃً) صلابت اور سختی کو کہتے ہیں قُلُوْبُکُمْ (قُلُوْب– کُمْ) دل تمہارے، قلب۔ مفرد ہے مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ یعنی یہ تمام روشن معجزات دیکھنے کے بعد، فَهِیَ (فَ–هِیَ) پس، یہ هِیَ کی ضمیر قُلُوْب کی طرف جاتی ہے، کَالْحِجَارَةِ (کَ–الْحِجَارَةِ) مانند، پتھروں (کے) ک تشبیہ کے لیے استعمال ہوا ہے، حَجَرٌ مفرد ہے، اَوْ یا (or) بلکہ اَشَدُّ، شَدِیْدٌ سخت، اس سے اسم تفضیل (Comparative degree) قَسْوَۃً، تمیز ہے اس لیے حالتِ نصب میں ہے، تمیز حالت اور کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہاں ثُمَّ کے استعمال سے یہ بات نکلتی ہے کہ دین کے معاملہ میں تمہاری اس قسم کی کٹ حجتیوں اور فرار پسندیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ تمہارے دل سخت ہو گئے، یہاں اگرچہ تصریح نہیں ہے لیکن سیاق کلام دلیل ہے کہ بنی اسرائیل نے جس طرح گائے کے ذبح کے حکم کی تعمیل میں بہت سی حجتیں پیدا کیں اسی طرح اس کے ذبح کے بعد بھی اس قربانی کا صحیح احترام ملحوظ نہیں رکھا بلکہ جھوٹی قسمیں کھا کر قاتل کو چھپانے کی کوشش کی، کسی جرم کے ساتھ جب حیلہ بازی اور کٹ حجتی اور پھر مزید برآں ڈھٹائی اور جسارت بھی شامل ہو جائے تو ایسے مجرموں کے دل قانون الٰہی کے مطابق پتھر کے مانند سخت ہو جایا کرتے ہیں جس کے بعد نیکی اور تقویٰ کی روئیدگی کی صلاحیت ان کے اندر بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے۔ فَهِیَ کَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً، (پس وہ پتھر کی مانند ہو گئے یا پتھر سے زیادہ سخت) یہ اس طرح کا اسلوبِ کلام ہے جیسا کہ دوسری جگہ وارد ہے: اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (اعراف ۷:۱۷۹) ''یہ لوگ (جو احکام الٰہی کو توڑتے ہیں) چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ''۔ یہ محض مبالغہ کا ایک اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ یکسر تعبیر حقیقت ہے، جمادات وغیرہ میں جو سختی ہوتی ہے، وہ سختی ان کو ان صلاحیتوں سے محروم نہیں کرتی جو قدرت کی طرف سے ان کے اندر ودیعت ہوتی ہیں، برعکس اس کے انسان اگر اپنے آپ کو بگاڑتا ہے تو اس کا بگاڑ آہستہ آہستہ قانون الٰہی کے بموجب ان تمام صلاحیتوں سے اس کو محروم کر دیتا ہے جو فطرت کی طرف سے اس کو ودیعت ہوئی ہوتی ہیں، پتھر سخت سے سخت ہو کر بھی پتھر ہی رہتا ہے اس کی رگوں کے اندر پانی کی سوت جاری کرنے کی صلاحیت اگر قدرت نے رکھی ہوتی ہے تو اس سختی کے باوجود یہ چیز اس کے اندر باقی رہتی ہے برعکس اس کے

انسان کا دل اگر کسی اخلاقی بیماری کے سبب سخت ہو جائے تو اس کے دل کی تمام سوتیں بالکل خشک ہو جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ بگڑے ہوئے انسان کے بگاڑ کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں کر سکتی اگرچہ وہ کتنی ہی بگڑی ہوئی کیوں نہ ہو۔'' (تدبر قرآن، جلد اول) بقول شاعر:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

﴿وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ﴾ اِنَّ بلاشبہ، جملے میں تاکید اور زور پیدا کرتا ہے، مِنَ الْحِجَارَةِ پتھروں میں سے، لَمَا (لَ– مَا) لَ ۔تاکید کے لئے مَا۔جو، یعنی پتھروں میں سے کچھ ایسے ہیں جن سے یقیناً، يَتَفَجَّرُ پھوٹ بہتے ہیں (تَفَجَّرَ يَتَفَجَّرُ، تَفَجُّرًا) اس کا مادہ فجر ہے اس کے معنی وسیع شگاف کے ہیں، اَلْاَنْهٰرُ، اس کا مفرد نَهَرٌ پانی کی نہر، (چشمے) یعنی بعض پتھر باوجود سختی کے نفع رسانی سے خالی نہیں ہیں مگر افسوس کہ یہ دل ان سے بھی گئے گزرے ہیں وَاِنَّ مِنْهَا اور بلاشبہ ان میں سے، ھا کی ضمیر پتھروں کی طرف جاتی ہے لَمَا جن سے یقیناً۔يَشَّقَّقُ، (اِشَّقَّقَ، يَشَّقَّقُ) اصل میں تَشَقَّقَ يَتَشَقَّقُ تھا (پھٹنا)، فَيَخْرُجُ (فَ– يَخْرُجُ) پس، نکلتا ہے، صیغہ واحد مذکر غائب فعل مضارع، خَرَجَ يَخْرُجُ خُرُوْجًا (نکلنا) مِنْهُ (مِنْ.هُ) سے، اس یعنی اس پتھر میں سے۔اَلْمَآءُ، پانی، وَاِنَّ اور بے شک مِنْهَا (مِنْ.هَا) سے، وہ (پتھر) لَمَا جو کہ يَهْبِطُ گرتا ہے (هَبَطَ يَهْبِطُ هُبُوْطًا) گرنا، مِنْ (سے) خَشْيَةِ اللّٰهِ، (اللہ تعالیٰ کی ہیبت) یعنی پتھروں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، آخر دریاؤں میں جو ریت ملتی ہے وہ پانی کے ساتھ ان پتھروں میں سے بہہ کر آتی ہے۔﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے غافل اور بے خبر نہیں ہے، مَا نافیہ ہے، نفی کا معنی دیتا ہے کبھی مَا سوالیہ ہوتا ہے جیسا کہ مَا اسْمُكَ؟ آپ کا نام کیا ہے؟ بِغَافِلٍ (بِ.غَافِلٍ) سے غافل یعنی تمہارے اعمال سے وہ غافل نہیں ہے۔عَمَّا (عَن.مَا) سے، جو، اس سے جو تَعْمَلُوْنَ، تم عمل کرتے ہو (عَمِلَ يَعْمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''بنی اسرائیل کے دلوں کا مقابلہ جب پتھروں اور چٹانوں سے کیا جاتا ہے تو ان کے دل چٹانوں سے زیادہ سخت اور بنجر ثابت ہوتے ہیں، بہت سی چٹانوں کا، خود بنی اسرائیل کو تجربہ تھا! انہوں نے اپنی آنکھوں

سے دیکھا تھا کہ ایک چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے تھے، انہوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تجلی سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور موسیٰ علیہ اسلام بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے لیکن بنی اسرائیل کے دل تو چٹانوں سے بھی زیادہ سخت ہیں، وہ نہ نرم ہوتے ہیں، نہ پسیجتے ہیں، نہ ان میں اللہ کا خوف اور تقویٰ پیدا ہوتا ہے، سخت بنجر، کفر و انکار سے بھرے ہوئے دل، اسی لیے اللہ تعالیٰ کی تہدید ان الفاظ میں سامنے آتی ہے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

ان الفاظ کے ساتھ بنی اسرائیل کی تاریخ کا..... جو کفر، انبیا کی تکذیب، کج روی، کٹ حجتی، قساوتِ قلب، سرکشی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے پُر ہے.....ایک باب اختتام پذیر ہوتا ہے۔

(فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) جو قوم ایمان و عمل، عقل و شعور اور اطاعت و فرمانبرداری ایسی صفات سے عاری ہو جائے، وہ پھر لایعنی باتوں میں مبتلا ہو جاتی ہے، اسے اخلاقی زوال آ گھیرتا ہے، لوگ مختلف جرائم کا شکار ہوتے ہیں اور انہیں چھپانے کے لیے نت نئے حربے تلاش کرتے ہیں، جیسا کہ قوم بنی اسرائیل ہوئی اور ٹھیک یہی صورت حال ہماری موجودہ قوم کی ہے۔

۲) بنی اسرائیل میں قساوتِ قلبی کیونکر پیدا ہوئی؟ قرآن اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً (المائدہ ۵:۱۳) ''پھر چونکہ انہوں نے اپنے عہد کو توڑ ڈالا، لہٰذا ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دل سخت کر دیئے''۔

قساوت قلبی سے مزید برائیاں در آئیں، بخل، سود خوری، حرام مال کھانا (رشوت وغیرہ)، انبیاء کرام ایسے نفوس قدسیہ کے ساتھ گستاخی، ضد اور ہٹ دھرمی، باہمی منافرت وغیرہ غرضیکہ زندگی گزارنے کا صالح تصور غائب ہو گیا اور یہ نتیجہ ہوتا ہے حدود الٰہی کو پس پشت ڈالنے کا۔ کیا ہم بھی اپنے اخلاقی انحطاط کا عکس ان آیات کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں؟

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ(۷۵)	''(مسلمانو!) اب بھی کیا تمہیں (ان یہودیوں سے) توقع ہے کہ وہ تمہارے کہنے سننے سے اسلام کو قبول کر لیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا شیوہ یہ رہا ہے کہ اس نے اللہ کا کلام سنا، پھر جانتے بوجھتے اس میں تحریف کی۔''

﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ﴾ کیا تم توقع رکھتے ہو، مضارع جمع مذکر حاضر (اَ.ف.تَطْمَعُوْنَ) کیا تم توقع رکھتے ہو (ط م ع) طَمِعَ، يَطْمَعُ، طَمْعًا، لالچ کرنا، توقع رکھنا ﴿اَنْ يُّؤْمِنُوا لَكُمْ﴾ یہ کہ وہ ایمان لائیں گے، تمہارے باعث (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا) ایمان لانا، يُؤْمِنُوْنَ تھا اَنْ آنے کی وجہ سے ن جمع کا گر گیا، لَكُمْ، یعنی تمہاری خاطر سے، تمہارے کہنے سے یا تمہاری دعوت پر، لِاَجْلِ دَعْوَتِكُمْ وَيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ (کشاف) یعنی تمہاری دعوت (اسلام) اور اسے قبول کرنے کے لئے، ﴿وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ اور تحقیق ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے اللہ کا کلام سنا، قَدْ کلمہ میں زور پیدا کرتا ہے، (كَانَ يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، فَرِيْقٌ، جماعت، گروہ يَسْمَعُوْنَ، مضارع جمع مذکر غائب سنتے ہیں (سَمِعَ يَسْمَعُ، سَمْعًا) سننا، یہودیوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سنتے ہیں كَلٰمَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کا کلام، ثُمَّ (پھر) یعنی سننے کے بعد، يُحَرِّفُوْنَهٗ (يُحَرِّفُوْنَ.هٗ) وہ بدل ڈالتے ہیں اسے۔ هٗ کی ضمیر کلام اللہ کی طرف جاتی ہے، مِنْۢ بَعْدِ اس کے بعد مَا (کہ۔جو) عَقَلُوْهُ۔ سمجھ لیا۔ اس کو، هٗ کی ضمیر کلام اللہ کی طرف جاتی ہے۔ (عَقَلَ يَعْقِلُ، عَقْلًا) سمجھنا بوجھنا، وَهُمْ۔ اور وہ (لوگ) يَعْلَمُوْنَ وہ اچھی طرح اس بات کو جانتے ہیں (عَلِمَ يَعْلَمُ عِلْمًا) جاننا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''[اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوا لَكُمْ] یہ خطاب مدینے کے ان نومسلموں سے ہے جو قریب کے زمانے ہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، ان لوگوں کے کان میں پہلے سے نبوت، کتاب، ملائکہ،

آخرت، شریعت کی جو باتیں پڑی ہوئی تھیں، وہ سب انہوں نے اپنے ہمسایہ یہودیوں ہی سے سنی تھیں، اور یہ بھی انہوں نے یہودیوں ہی سے سنا تھا کہ دنیا میں ایک پیغمبر اور آنے والے ہیں (خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم) اور یہ کہ جو لوگ ان کا ساتھ دیں گے وہ ساری دنیا پر چھا جائیں گے، یہی معلومات تھیں جن کی بنا پر اہل مدینہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا سن کر آپ کی طرف خود متوجہ ہوئے اور جوق در جوق ایمان لائے، اب وہ متوقع تھے کہ جو لوگ پہلے ہی سے انبیاء اور کتب آسمانی کے پیرو ہیں اور جن کی دی ہوئی خبروں کی بدولت ہی ہم کو نعمت ایمان میسر ہوئی ہے، وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے بلکہ اس راہ میں پیش پیش ہوں گے، چنانچہ یہی توقعات لے کر یہ پرجوش نومسلم اپنے یہودی دوستوں اور ہمسایوں کے پاس جاتے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے پھر جب وہ اس دعوت کا جواب انکار سے دیتے تو منافقین اور مخالفین اسلام اس سے یہ استدلال کرتے تھے کہ معاملہ کچھ مشتبہ ہی معلوم ہوتا ہے، ورنہ اگر یہ واقعی نبی ہوتے تو آخر کیسے ممکن تھا کہ اہل کتاب کے علماء اور مشائخ اور مقدس بزرگ جانتے بوجھتے ایمان لانے سے منہ موڑتے اور خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کر لیتے، اس بنا پر بنی اسرائیل کی تاریخی سرگزشت بیان کرنے کے بعد اب ان سادہ دل مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کی سابق روایات یہ کچھ رہی ہیں، ان سے لمبی چوڑی توقعات نہ رکھو ورنہ جب ان کے پتھر دلوں سے تمہاری دعوت حق ٹکرا کر واپس آئے گی تو دِل شکستہ ہو جاؤ گے، یہ لوگ تو صدیوں کے بگڑے ہوئے ہیں، اللہ کی جن آیات کو سن کر تم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، یہ انہی سے کھیلتے اور تمسخر کرتے ان کی نسلیں بیت گئی ہیں، دین حق کو مسخ کر کے یہ اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال چکے ہیں اور اسی مسخ شدہ دین سے یہ نجات کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، ان سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ حق کی آواز بلند ہوتے ہی ہر طرف سے دوڑے چلے آئیں گے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ﴾ پر سید مودودی لکھتے ہیں:

''ایک گروہ، سے مراد ان کے علماء اور حاملین شریعت ہیں 'کلام اللہ' سے مراد تورات، زبور اور وہ دوسری کتابیں ہیں جو ان لوگوں کو ان کے انبیا کے ذریعے سے پہنچیں، تحریف کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اصل معنی و مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنی پہنا دینا، جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں، نیز الفاظ میں تغیر و تبدل کرنے کو بھی تحریف کہتے ہیں۔ علمائے بنی اسرائیل نے یہ دونوں طرح کی تحریفیں کلام

الٰہی میں کی ہیں۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) یہود ہوں یا نصاریٰ ان سے کسی بھی خیر کی کبھی بھی توقع نہیں کی جاسکتی، قرآن حکیم نے آج سے چودہ سو برس پہلے بتادیا تھا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ، بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ، وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (المائدہ۵:۵۱) ''اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، یہ تو ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انہیں میں سے ہوگا، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

مگر افسوس کہ آج بھی اکثر مسلم ملکوں کا برسر اقتدار طبقہ امریکہ اور برطانیہ کے حکمرانوں سے خائف اور متاثر ہے اور ان کے اشاروں پر چلنے کی کوشش کرتا ہے، جس کے فائدے کم اور نقصانات زیادہ ہیں، شاید اس لیے بھی کہ ان سے سود پر قرضہ جات لیے جاتے ہیں حالانکہ اسلامی ملکوں کا بلاک بننے سے نہ صرف فوجی استحکام ہوسکتا ہے بلکہ معاشی استحکام بھی ہوسکتا ہے اور بلاسود آپس میں ایک دوسرے کی مدد ہوسکتی ہے اور جہاں تک سیاسی معاہدوں کا تعلق ہے اس سے اسلام کبھی نہیں روکتا وہ کسی سے بھی ہو سکتے ہیں۔

۲) کلام اللہ میں لفظی اور معنوی تحریف بہت بڑا جرم ہے، الحمدللہ قرآن حکیم کی حفاظت کی پوری ذمہ داری تا قیامت رب العالمین نے اپنے ذمہ لی ہے، اور قیامت تک حفاظ اور علماء کرام کا حق پرست طبقہ اس کی خدمت میں کوشاں رہے گا۔

ہاں! مسلمانوں کی عملی زندگی میں قرآن حکیم کی تعلیمات کا فقدان ضرور نظر آتا ہے جس کا نہ انہیں خود نقصان ہورہا ہے بلکہ اس کے اثرات دور ونزدیک پہنچ رہے ہیں، کاش کہ مسلمان اس حقیقت کو جاننے کی کوشش کریں!

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا، وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۷۶) اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۷۷)	اور یہ جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب بعض بعض کے پاس علیحدہ ہوتے ہیں تو (آپس میں) کہتے ہیں، کیا تم ان (مسلمانوں) کو وہ (راز کی) باتیں بتلاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس تمہارے خلاف حجت کے طور پر پیش کر دیں، کیا تمہیں کچھ بھی عقل نہیں۔ کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ کو سب باتوں کا علم ہے؟

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا، وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾

اور یہ جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب بعض بعض کے پاس علیحدہ ہوتے ہیں تو (آپس میں) کہتے ہیں، کیا تم ان (مسلمانوں) کو وہ (راز کی) باتیں بتلاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس تمہارے خلاف حجت کے طور پر پیش کر دیں

وَاِذَا۔ اور جب، اِذَا، کلمہ شرط، لَقُوا، وہ ملتے ہیں، ملاقات کرتے ہیں، ماضی جمع مذکر غائب (لَقِيَ، يَلْقٰى، لِقَاءً) ملنا، ملاقات کرنا۔ اَلَّذِيْنَ۔ اسم موصول وہ لوگ (ان لوگوں سے) جو۔ اٰمَنُوْا، ایمان لائے (اٰمَنَ يُؤْمِنُ اِيمَانًا) ایمان لانا، حق بات کو تسلیم کر لینا، قَالُوْا، کہا انہوں نے۔ فعل ماضی جمع مذکر غائب (قَالَ يَقُوْلُ قَوْلًا) کہنا اٰمَنَّا، ماضی جمع متکلم، ہم ایمان لائے، یہود میں سے منافقین کا ذکر ہے کہ جب یہ مومنوں سے ملتے تو کہتے ہم بھی ایمان لے آئے ہیں۔ جبکہ ان کے دل کفر سے بھرے ہوئے ہوتے تھے، وَاِذَا اور جب، خَلَا، الگ ہوتے، خلوت میں ہوتے، (خ ل و) خَلَا، يَخْلُوْ، خَلَاءٌ وَخَلْوَةٌ، تنہا ہونا، الگ ہونا بَعْضُهُمْ (بَعْضُ—هُمْ) بعض ان میں سے اِلٰى طرف، بَعْضٍ (بعض) یعنی جب وہ آپس میں

اکٹھے ہوتے (When they (Jews) meet one another in private) قَالُوْا۔تو کہتے (قَالَ. یَقُوْلُ. قَوْلًا) کہنا أ۔کلمہ استفہام (کیا؟) تُحَدِّثُوْنَ، تم بیان کرتے ہو، فعل مضارع جمع مذکر مخاطب (حَدَّثَ یُحَدِّثُ، تَحْدِیْثٌ) بات کرنا۔بتانا، بِمَا (بِ.مَا) ساتھ۔اس کے یعنی وہ بات جسے تم (جانتے ہو) فَتَحَ، واحد مذکر غائب کھولا ہے (فَتَحَ یَفْتَحُ، فَتْحًا) کھولنا، ظاہر کرنا، فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ یعنی وہ بات جس کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں علم دیا ہے، مراد یہ ہے کہ تورات میں خاتم النبیّن محمد ﷺ کی صفات اور تشریف آوری کا ذکر تھا، یہود میں سے بعض اپنے ساتھیوں پر اعتراض کرتے کہ تم مسلمانوں کو تورات کی خوشخبریاں کیوں بتاتے ہو؟ لِیُحَآجُّوْكُمْ (لِ.یُحَاجُّوْ. كُمْ) تا کہ۔حجت قائم کریں۔تم پر، لامِ تعلیل، وجہ بیان کرتا ہے (حَاجَّ یُحَاجُّ، حُجَاجَةً) جھگڑا کرنا، اَلْحُجَّةُ، دلیل اور برھان یُحَاجُّوْنَ تھا لامِ تعلیل کی وجہ سے، یُحَاجُّوْ حالت نصب میں ہے اس لیے نون جمع کا گر گیا ہے، بِهٖ (بِ.ہٖ) ساتھ۔اس کے، یعنی اس کلام الٰہی کے ساتھ، عِنْدَ رَبِّكُمْ، تمہارے رب کے ہاں۔تا کہ مسلمان رب کریم کے یہاں قرآن حکیم سے تم پر حجت قائم کریں کہ تورات کے یہ بیان قرآن کے مطابق ہیں اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، أ۔کلمہ استفہام، اَفَلَا، کیا تم نہیں؟ تَعْقِلُوْنَ۔عقل رکھتے ہو (عَقَلَ یَعْقِلُ، عَقْلًا) عقل کرنا شعور سے کام لینا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ تورات اور دیگر کتب آسمانی میں جو پیشین گوئیاں اس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق موجود ہیں یا جو آیات اور تعلیمات ہماری مقدس کتابوں میں ایسی ملتی ہیں جن سے ہماری موجودہ روش پر گرفت ہو سکتی ہے، انہیں مسلمانوں کے سامنے بیان نہ کرو، ورنہ یہ تمہارے رب کے سامنے ان کو تمہارے خلاف حجت کے طور پر پیش کریں گے، یہ تھا اللہ کے متعلق ان ظالموں کے فسادِ عقیدہ کا حال، گویا وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر دنیا میں وہ اپنی تحریفات اور اپنی حق پوشی کو چھپا لیں گئے، تو آخرت میں ان پر مقدمہ نہ چل سکے گا اسی لیے بعد کے جملہ معترضہ میں ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا تم اللہ کو بے خبر سمجھتے ہو؟'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ﴾

کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے۔

اَوَ، کلمہ استفہام، لَا یَعْلَمُوْنَ، نہیں جانتے ہیں فعل نہی مضارع جمع مذکر غائب (عَلِمَ یَعْلَمُ عِلْمًا) جاننا پہچاننا، مَا (جو) موصولہ (Relative pronoun) یُسِرُّوْنَ وہ چھپاتے ہیں مضارع جمع مذکر غائب (اَسَرَّ یُسِرُّ، اِسْرَارًا) چھپانا، دل میں راز رکھنا وَمَا (اور جو) یُعْلِنُوْنَ وہ ظاہر کرتے ہیں مضارع جمع مذکر غائب (اَعْلَنَ یُعْلِنُ، اِعْلَانًا) ظاہر کرنا، دل کی بات زبان پر لانا۔

مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''یوں تو یہ جملہ عام ہے، اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کو جانتا ہے لیکن یہاں موقع کلام اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ دھوکہ بازی کرتے ہوئے اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس 'اٰمَنَّا' کی حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف ہے جس کو وہ ظاہر کرتے ہیں اور ان کی خاص مجلسوں میں آپس میں ایک دوسرے کو مسلمانوں کے سامنے افشائے راز پر جو سرزنشیں اور ملامتیں ہوتی ہیں ان کو بھی وہ خوب جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ احمق لوگ مسلمانوں کے سامنے تو اپنے آپ کو ظاہر داری کے اس لبادہ میں چھپا سکتے ہیں لیکن اس اللہ سے انہوں نے اپنے آپ کو چھپانے کی کیا تدبیر سوچی ہے جو ان کی خلوت و جلوت میں ہر جگہ موجود ہے اور جس پر ظاہر و خفی سب کچھ روشن ہے۔''

(تدبر قرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) زبانی دعویٰ ایمان کی کوئی حقیقت نہیں، وہی ایمان قابل قبول ہے جس پر دل اور زبان سے اقرار کے علاوہ اعمال صالحہ سے بھی مہر تصدیق ثبت کی جائے۔

۲) منافقین کا ٹولہ مسلمانوں کے اندر ہمیشہ موجود رہا ہے جو ظاہر میں تو مسلمانوں کا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوتا ہے مگر ان کا دل لگاؤ کہیں اور ہوتا ہے۔ اپنے وطن میں ہمیں ایسے حکمرانوں سے سابقہ رہا ہے جو بظاہر تو مسلمانوں کے ہمدرد اور اسلام کا دم بھرتے رہے ہیں مگر عملی طور پر قانون اسلام سے گریزاں رہے ہیں اور وہ اطاعت کسی اور کی کرتے ہیں جسے قرآن کی اصطلاح میں طاغوت کی پیروی کہتے ہیں۔

۳) ہم کسی بات میں خواہ کیسے حیلے بہانے کریں، نفس کی خباثتیں اور خرابیاں بالآخر ظاہر ہو کر رہتی ہیں۔

(۴) دنیا کی سزا سے کسی طرح بچ بھی نکلیں، تو آخرت کی سزا سے بچنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔

وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ (۷۸) فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ يَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَيۡدِيۡهِمۡ، ثُمَّ يَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِيَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا، فَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِمَّا كَتَبَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ وَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا يَكۡسِبُوۡنَ (۷۹)	’’اوران میں ایک گروہ ان پڑھ لوگوں کا ہے جو کتاب (تورات) کا علم نہیں رکھتے مگر صرف جھوٹی آرزوئیں (لئے بیٹھے) ہیں اور صرف وہم وگمان کی بات کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے ہلاکت ہے جو کتاب (یعنی تورات بدل کر) اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہی اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) ہے، تاکہ اس سے تھوڑے دام لے سکیں، ان کے ہاتھوں کی لکھائی کی وجہ سے ان کے لیے ہلاکت ہے اور افسوس ہے جو وہ کمائی کر رہے ہیں۔‘‘

﴿وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ﴾

اور ان میں ایک گروہ ان پڑھ لوگوں کا ہے جو کتاب (تورات) کا علم نہیں رکھتے مگر صرف جھوٹی آرزوئیں (لئے بیٹھے) ہیں اور صرف وہم وگمان کی بات کرتے ہیں۔

وَمِنۡهُمۡ (مِنۡ– هُمۡ) سے، ان، اور ان میں سے یعنی یہود میں سے اُمِّيُّوۡنَ، ان پڑھ اس کا مفرد اُمِّی مَنۡ لَا يَقۡرَءُ وَلَا يَكۡتُبُ جو پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو (المعجم الوسیط) اُمٌّ، ماں کو بھی کہتے ہیں یعنی اُمِّی وہ شخص کہلاتا ہے کہ جیسے وہ ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا ویسے ہی ہے۔ لَا يَعۡلَمُوۡنَ نہیں جانتے ہیں مضارع جمع مذکر غائب (عَلِمَ يَعۡلَمُ، عِلۡمًا) جاننا، الۡكِتٰبَ ال لگنے سے خاص کتاب ہوگئی، (التوراۃ) اِلَّاۤ کلمہ استثناء (مگر) اَمَانِيَّ خواہشات، آرزوئیں اس کا مفرد اُمۡنِيَّةٌ ہے اس سے فعل تَمَنّٰی يتمَنّٰی خواہش کرنا، تمنا کرنا، جو غلط سلط باتیں انہوں نے اپنے علماء سے سن رکھی ہیں اور پھر بطور تقلید انہیں نقل کرتے رہتے ہیں، وَاِنۡ هُمۡ اور نہیں وہ۔ اِلَّا مگر، يَظُنُّوۡنَ وہ وہم وگمان کرتے ہیں (ظَنَّ يَظُنُّ، ظَنًّا) گمان کرنا، تخمینہ سے کام

لینا (یقین سے نہیں بلکہ اٹکل پچو) سے کام لینا۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''گویا لکھنا پڑھنا جانتے نہیں مگر خواہشات بڑی بڑی ہیں، اپنے علماء سے جو کچھ سن رکھا ہے اسی کو مایۂ ناز وسرمایۂ آخرت تصور کرتے ہیں۔ ان کی آرزوہائے باطلہ ملاحظہ ہوں کہ جنت میں یہودی اور نصرانی کے سوا دوسرا کوئی شخص جا نہیں سکتا:

لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى، تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ (البقرہ۲:۱۱۱)

''(اہل کتاب کہتے ہیں) کہ جنت میں صرف وہی شخص داخل ہوگا جو یہودی ہو یا عیسائی ہو، یہ (محض) ان کی جھوٹی تمنائیں ہیں''۔

اور اگر بہ فرض محال یہودی جہنم میں گئے بھی تو صرف چند روز کے لئے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (البقرہ۲:۸۰)

''اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ چند ایام کے سوا انہیں آگ ہرگز نہ چھوئے گی۔''

اس قسم کے خیالاتِ فاسدہ ہیں جو ان کو خوش رکھتے ہیں حالانکہ جنت میں جانے کا قاعدہ یہ ہے کہ صرف ایک اللہ کی غلامی کی جائے اور قلبِ سلیم لے کر اس کے حضور میں حاضر ہوا جائے، ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ○ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (الشعراء۲۶:۸۹) ''جس دن نہ مال کوئی فائدہ دے گا اور نہ اولاد اِلا یہ کہ کوئی سلامتی والا (اطاعت گزار) دل لے کر اللہ کے حضور حاضر ہو''۔

نیز فرمایا:

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرۃ۲:۱۱۲) ''بات دراصل یہ ہے کہ (جو کوئی) اپنے آپ کو اللہ ہی کا فرمانبردار بنادے اور وہ نیکوکار بھی ہو تو اس کا اجر اس کے رب کے ہاں ضرور ملے گا اور انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

(الفرقان فی معارف القرآن)

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ، ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا، فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴾

ایسے لوگوں کے لیے ہلاکت ہے جو کتاب (یعنی تورات بدل کر) اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہی اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) ہے، تاکہ اس سے تھوڑے دام لے سکیں، ان کے ہاتھوں کی لکھائی کی وجہ سے ان کے لیے ہلاکت ہے اور افسوس ہے جو وہ کمائی کر رہے ہیں۔

فَوَيْلٌ (فَ–وَيْلٌ) پس خرابی ہے، وَيْلٌ، عظیم ہلاکت اور تباہی، وَيْلٌ۔ کلمة العذاب عذاب اور ہلاکت کا کلمہ ہے (المعجم الوسیط) لِلَّذِيْنَ (لِ–لَّذِيْنَ) لئے، ان لوگوں کے یعنی ان لوگوں کے لیے (يَكْتُبُوْنَ) جو لکھتے ہیں (كَتَبَ يَكْتُبُ، كِتَابَةٌ) لکھنا الْكِتَاب (خاص کتاب) یعنی تورات بِاَيْدِيْهِمْ (بِ–اَيْدِيْهِمْ) ساتھ، اپنے ہاتھوں کے، يَدٌ مفرد اَيْدِى۔ جمع، جہاں بس چلا تورات میں لفظی تبدیلی پیدا کردی یا معنی بدل ڈالے، ثُمَّ، پھر يَقُوْلُوْنَ، کہتے ہیں مضارع جمع مذکر غائب، هٰذَا یہ بات مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، (نعوذ باللہ) اپنے ہاتھوں سے لکھی بات کو اللہ تعالیٰ کا کلام کہتے ہیں لِيَشْتَرُوْا (لِ–يَشْتَرُوْا) تاکہ۔ خریدیں مضارع جمع مذکر غائب (اِشْتَرٰى يَشْتَرِى اِشْتِرَاءً) لام مکسور (زیر والا) آنے سے 'نْ' جمع کا گر گیا ہے، يَشْتَرُوْنَ تھا اور اس سے لِيَشْتَرُوْا ہوا، بِهٖ (بِ–هٖ) ساتھ۔ اس کے یعنی اس تحریف شدہ کلام سے، ثَمَنًا قَلِيْلًا، قیمت، تھوڑی، دنیا کا بہت زیادہ فائدہ بھی آخرت کے مقابلہ میں قلیل اور حقیر ہے، صرف حق ہی وہ متاع گراں مایہ ہے جس کے مقابلہ میں پوری دنیا کا مال و دولت ہیچ اور حقیر ہے، فَوَيْلٌ پس تباہی ہے لَّهُمْ ان کے لیے مِمَّا (مِنْ–مَا) سے، جو۔ یعنی اس بات سے جو كَتَبَتْ لکھی ماضی واحد مونث غائب اَيْدِيْهِمْ ان کے ہاتھوں نے، وَيْلٌ (خرابی) دوبارہ لانے سے عذاب کی شدت کی طرف اشارہ ہے لَهُمْ ان کے لیے مِّمَّا، اس سے جو يَكْسِبُوْنَ وہ کماتے ہیں مضارع جمع مذکر غائب (كَسَبَ يَكْسِبُ، كَسْبًا) کمانا، یعنی جو وہ حرام مال کماتے ہیں۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یہ یہود کے علماء کی جسارت اور خوف الٰہی سے بے نیازی کی وضاحت ہے کہ اپنے ہاتھوں سے مسئلے گھڑتے ہیں اور بہ بانگ دہل یہ باور کراتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہیں (جس کے نتیجہ میں انہیں وَیل کی سزا مل رہی ہے)۔'' (احسن البیان)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) دین کی بنیاد علم ویقین پر ہے نہ کہ ظن وتخمین پر۔

۲) دنیا کی زندگی محض عارضی اور ناپائیدار ہے جبکہ آخرت کی زندگی ابدی اور لازوال ہے، چند عارضی چمکتے ہوئے سکوں کی خاطر آخرت کو نظر انداز کر دینا عقلمندی نہیں ہے۔

۳) یقین وعمل کے بغیر محض جھوٹی آرزوؤں اور خواہشات کو یہود نے اپنے سینوں میں سجا رکھا تھا جبکہ آخرت میں کامیابی کی بنیاد صرف ایمان اور اعمال صالحہ پر ہے کچھ ایسا ہی اب مسلمانوں کا حال ہے۔ جھوٹے پیروں نے نہ معلوم اپنے مریدوں کو کیسی کیسی طفل تسلیاں اور دلاسے دے رکھے ہیں۔

۴) اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مفہوم ومطالب کو بدلنا بہت بڑا جرم ہے جس کی سزا ''ویل'' (جہنم اور عذاب) ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً، قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۸۰) بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ، هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۸۱)	''(یہودی) کہتے ہیں کہ ہمیں (دوزخ) کی آگ بجز گنتی کے (چند) دنوں کے ہرگز نہیں چھوئے گی آپ پوچھئے کہ ''کیا تم نے اللہ سے کوئی ایسا عہد لے رکھا ہے جس کی وہ خلاف ورزی نہ کرے گا؟ یا بے جانے بوجھے اللہ کے ذمہ ایک بات کہے اور لگائے دیتے ہو'' بات (تو دراصل) یہ ہے کہ جو گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں اور گناہوں میں گھرتے چلے جاتے ہیں، وہ دوزخی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾

(یہودی) کہتے ہیں کہ ہمیں (دوزخ) کی آگ بجز گنتی کے (چند) دنوں کے ہرگز نہیں چھوئے گی۔

وَقَالُوْا۔اور انہوں نے کہا (یعنی یہود نے) (قَالَ یَقُوْلُ قَوْلًا) کہنا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ ہرگز نہ چھوئے گی، ہمیں آگ (مَسَّ یَمَسُّ، مَسًّا) چھونا، مس کرنا، مضارع سے پہلے لَنْ لگانے سے جملہ میں تاکید اور زور پیدا ہوتا ہے اِلّا کلمہ استثنا۔سوائے، (Except) اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً، دن۔گنے چنے، یَوْمٌ کی جمع اَیَّامٌ ہے مَّعْدُوْدَةً، عَدَدٌ سے (عَدَّ، یَعُدُّ) گننا، اور مَّعْدُوْدَةً گنے ہوئے اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً (a few numbered days)، یہود کا یہ وہم باطل تھا کہ چالیس دن جس میں انہوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی وہی گنے چنے دن انہیں دوزخ میں رکھا جائے گا۔(ابن عباسؓ)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یہود کہتے تھے کہ دنیا کی کل عمر سات ہزار سال ہے اور ہم ہزار سال کے بدلے ایک دن جہنم میں رہیں گے۔اس حساب سے صرف سات دن جہنم میں رہیں گے، کچھ کہتے تھے کہ ہم نے چالیس دن بچھڑے کی عبادت کی تھی، چالیس دن جہنم میں رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم نے اللہ سے عہد لیا ہے؟ یہ بھی استفہام انکاری ہے؟ یعنی یہ غلط کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس قسم کا کوئی عہد و پیمان نہیں ہے۔''

(تفسیر احسن البیان)

﴿قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ﴾

آپ پوچھئے ''کیا تم نے اللہ سے کوئی ایسا عہد لے رکھا ہے۔'' تو اللہ اپنے وعدہ کی ہرگز خلاف ورزی نہ کرے گا۔

قُلْ فعل امر واحد مذکر (قَالَ یَقُوْلُ قَوْلًا) کہنا، اتَّخَذْتُمْ تم نے لیا ہے، ماضی جمع مذکر مخاطب (اتَّخَذَ یَتَّخِذُ) پکڑنا، لینا۔ عِنْدَ اللّٰهِ، اللہ کے یہاں (سے) عَهْدًا۔کوئی وعدہ، (ف– لن) پس ہرگز (اَخْلَفَ یُخْلِفُ اِخْلَافًا) خلاف ورزی کرنا۔''لَنْ'' مضارع پر نصب (زبر) دیتا ہے۔

﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

یا (خواہ مخواہ) بے جانے بوجھے اللہ کے ذمہ ایک بات کہے اور لگائے دیتے ہو۔

اَمْ بمعنی یا (or) حرف عطف تَقُوْلُوْنَ، مضارع جمع مذکر مخاطب: تم کہتے ہو قَال کے بعد علی آجائے

تو اس کے معنی خواہ مخواہ کسی کے ذمہ کوئی بات لگانا ہے مَا جو، لَا تَعْلَمُوْن، تم جانتے نہیں ہو۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یعنی تمہارا یہ دعویٰ کہ ہم اگر جہنم میں گئے بھی تو صرف چند دن ہی کے لیے جائیں گے، تمہاری اپنی طرف سے ہے اور اس طرح تم اللہ کے ذمہ ایسی باتیں لگاتے ہو جن کا تمہیں خود بھی علم نہیں ہے، اگلی آیۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ اپنا وہ اصول بیان فرما رہا ہے جس کی رو سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نیک و بد کو ان کی نیکی اور بدی کی جزا دے گا۔'' (احسن البیان)

﴿بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ ہاں، (اصل بات یہ ہے) جو گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں عربی زبان کا اصول ہے کہ جس استفہام کے شروع میں انکار ہو اس کے لیے 'بَلٰی' لایا جاتا ہے اور ایسا جملہ جہاں استفہام میں انکار نہ ہو سکے اس کے لیے 'نَعَمْ' لایا جاتا ہے۔ یہاں پر بَلٰی ان کے دعویٰ کو رد کرنے کے لیے ہے۔ كَسَبَ (اس نے کمایا) ماضی واحد مذکر غائب، ایسا عمل جو ارادے کے ساتھ کیا جائے كَسَبَ کہلاتا ہے (كَسَبَ يَكْسِبُ، كَسْبًا، وَاكْتَسَبَ) كَسَبَ لِاَهْلِهٖ۔ اس نے بال بچوں کے لیے محنت سے رزق حاصل کیا، كَسَبَ الْاِثْمَ گناہ اٹھانا، (المعجم الوسیط) سَيِّئَةٌ، برائی، گناہ، حَسَنَةٌ کی ضد ہے اس کا مادہ سُوْءٌ جس کا اطلاق ہر قسم کے شر و فساد، بدی اور برائی پر ہوتا ہے، ﴿وَ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ﴾ اور احاطہ کر لیا۔ ساتھ اس کے۔ اس کی خطاؤں نے، (اَحَاطَ يُحِيْطُ، اِحَاطَةً) گھیرنا احاطہ کرنا، بِهٖ (ب—ہ) ساتھ۔ اس کے، خَطِيْٓـَٔتُهٗ (خطیئۃٌ—ہ) خطاؤں۔ اس کی، یعنی وہ شخص خواہشات کا غلام اور اسیر ہو گیا اور ہر طرف سے اپنی خطاؤں میں جکڑا گیا اور اس نے کبھی انہیں دور کرنے کی کوشش اور جستجو نہ کی اور نہ کبھی ندامت اور شرمساری کے آنسو خالق و مالک کے حضور بہائے کہ اس کی رحمت اور بخشش کا سمندر تو ہر وقت ٹھاٹھیں مار رہا ہے، اور صدا آتی ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (الزمر:۵۳) ''آپ لوگوں سے کہہ دیجئے' اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، اللہ یقیناً تمام کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ غفور رحیم ہے۔''

یہ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء ہے، نیکوں کو آخرت میں اچھا بدلہ اور بروں کو ان کی برائیوں کا

بدلہ دیا جائے گا، جو گناہوں اور خطاؤں میں ڈوبا رہا اور اس نے توبہ نہ کی تو فرمایا:

﴿فَأُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ، هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ وہی لوگ دوزخی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، صَحب کی جمع اصحاب (ساتھی) خَلَدَ يَخْلُدُ، خُلُوْدًا۔ ہمیشہ رہنا اس سے اسم فاعل خَالِدٌ، ہمیشہ رہنے والا۔ جمع خالِدُون ہے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) جب کوئی شخص بدی کا ارتکاب کرتا ہے اور اس میں کوئی عبرت اور ندامت کا احساس تک نہیں ہوتا تو وہ مزید دلیر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ رشد و ہدایت کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ وہ تکبر، غرور، ضد اور ہٹ دھرمی سے خیر کی تمام راہیں اپنے اوپر بند کر لیتا ہے تو پھر بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی نجات کا ذمہ نہیں لے سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کے دربار میں صرف اور صرف اعمالِ صالحہ ہی نجات کا ذریعہ ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ○ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (الشعراء۲۶:۸۸)

''جس روز نہ مال کوئی فائدہ دے گا اور نہ اولاد اِلّا یہ کہ کوئی اطاعت گزار دل لے کر اللہ کے حضور حاضر ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ أُحْصِيْهَا لَكُمْ ثُمَّ أُوَفِّيْكُمْ اِيَّاهَا فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ (صحیح مسلم)

''یہ تمہارے اپنے اعمال ہیں جن کو میں تمہارے لیے گن کر رکھتا ہوں پھر تمہیں ان کا پورا بدلہ دیتا ہوں پس جو بھلائی پائے وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرے اور جو اس کے علاوہ پائے وہ اپنے ہی نفس کو ملامت کرے۔''

قرآن حکیم نے جہاں کفّارہ کا رد کیا (کہ کوئی شخص کسی کے گناہ بخشوا لے)

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا، وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام۶:۱۶۴)

''اور جو کوئی برا کرے گا تو اس کا بار اسی پر ہوگا، کوئی شخص کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔'' (یعنی ہر شخص اپنی بدیوں اور نیکیوں کا بوجھ خود اٹھائے ہوگا)۔

وہاں یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ کسی بزرگ کی اولاد میں سے ہونا یا کسی ولی کی طرف منسوب ہونا نجات کا باعث نہیں ہوسکتا، غور کیجئے کہ نوح جیسے جلیل القدر پیغمبر نے اپنے بیٹے کی نجات کے لیے اللہ تعالیٰ سے التجا کی تو وہاں سے جواب ملا:

اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ، اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ھود:۲۶) ''وہ تیرے اہل سے نہیں تھا کیونکہ اس کے عمل اچھے نہ تھے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی لخت جگر فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یوں مخاطب کرتے ہیں:

يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ اِنْقِذِي نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ فَاِنِّي لَا أُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا [صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی] ''اے فاطمہ! محمدؐ کی بیٹی اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچالے، اس لیے کہ میں (کل قیامت کے دن) تیرے کسی کام نہیں آسکوں گا۔''

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ، فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۸۲)	''اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے، تو یہی لوگ جنت کے مستحق ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

وَالَّذِيْنَ — اور وہ لوگ، اٰمَنُوْا، ایمان لائے فعل ماضی جمع مذکر غائب (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا) ایمان لانا، سچے دل سے یقین کرنا، وَعَمِلُوْا، اور انہوں نے کام کئے (عَمِلَ، يَعْمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا، الصّٰلِحٰتِ، نیک کام صالحة اس کا مفرد ہے، نیک کام وہی کہلاتے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوں اور ٹھیک قرآن اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہوں۔ ایمان کے ساتھ عمل صالح کی قید لگائی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اعمال صالحہ کے ساتھ ہی ایمان کی تکمیل ہوتی ہے، ایمان کی مثال بیج کی سی ہے جو قلب میں بویا جاتا ہے اور اعمال صالحہ کی مثال شاخوں کی سی ہے جو بیج سے پھوٹتی ہیں، پھر وہ سدا بہار تناور درخت بن جاتا ہے، قرآن اس شجر طیبہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ ○ تُؤْتِىْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا، وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (ابراھیم ۱۴:۲۴،۲۵) ''آپ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ (توحید) کی کیسی عمدہ مثال بیان کی ہے جیسے وہ ایک پاکیزہ درخت ہو جس کی جڑ (زمین میں خوب) جمی ہوئی اور شاخیں آسمان میں ہوں، وہ اپنے رب کے حکم سے ہر آن پھل دے رہا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ سبق حاصل کریں''۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ کی جو ترتیب یہاں ہے، قرآن نے ہر جگہ اور بڑی کثرت سے ملحوظ رکھی ہے اور اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ گو عمل صالح اپنی جگہ پر نہایت اہم اور ضروری ہے لیکن ایمان کی حقیقت نیت، عمل اور فکر کی تصحیح ہے اور قرآن مجید نے بالکل فطری ترتیب کے مطابق تصحیح فکر کو تصحیح عمل پر مقدم رکھا ہے، محض عمل، اگر نیت سے قطع نظر کر لی جائے تو صرف صورت عمل رہ جاتی ہے، حقیقت عمل نہیں۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''یہ بات ایمان کے تقاضوں میں سے ہے کہ اس سے عمل صالح کا پودا پھوٹ کر باہر آئے! جو لوگ ایمان کے مدعی ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں.....اور ہم لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، سب سے زیادہ اس بات کو جاننے اور اس پر یقین رکھنے کے ضرورت مند ہیں..... کہ اگر ایمان سے عمل صالح کا پودا نہ پھوٹے تو اس ایمان کی کوئی حقیقت نہیں ہے! جو لوگ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہوں مگر زمین پر فساد پھیلاتے ہوں اور خیر و صلاح کی اس اولین حقیقت سے کہ زندگی میں اسلامی نظام اور اسلامی شریعت اور سماج میں اسلامی اخلاق کا قیام ہو، برسر پیکار ہوں (یعنی ان کی تمام جدوجہد نظام اسلام کے نفاذ میں حائل ہو رہی ہو) ان کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں اللہ کے اجر میں ان کا کوئی حصہ نہیں اور اللہ کے عذاب سے انہیں کوئی بچانے والا نہیں، خواہ وہ یہود کی طرح خوش عقیدگیوں کا سہارا لیں جن کی حقیقت کی وضاحت اللہ نے یہود اور عام انسانوں کے لیے ان آیات میں کر دی ہے۔''

(فی ظلال القرآن، جلد اول)

سچے دل سے ایمان قبول کرنے کے بعد ایک بندۂ مومن کو ان تمام صفات سے آراستہ ہونا چاہیے جن کا قرآن وحدیث میں ذکر آیا ہے، جن میں سے چند اس طرح ہیں:

-- اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ (الانعام۶:۸۲)

''جو لوگ ایمان لائے پھر اپنے ایمان کو ظلم (شرک وکفر) سے آلودہ نہیں کیا انہیں کے لیے امن و سلامتی ہے اور یہی لوگ ہدایت پر ہیں۔''

-- وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (البقرۃ۲:۱۶۵)

''اور اہل ایمان سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔''

-- یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (البقرۃ۲:۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔''

-- یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (البقرۃ۲:۱۵۳)

''اے ایمان والو! (مصائب کے وقت) صبر اور نماز سے مدد لو۔''

-- یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ (المائدۃ۵:۵۱) ''اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو (کبھی بھی) اپنا دوست نہ بناؤ (وہ تمہارے کبھی خیر خواہ نہیں ہو سکتے ہیں)''

سورۃ المجادلۃ کی طویل آیت میں اہل ایمان کا ذکر اس طرح آیا ہے:

-- ''جو لوگ اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، تم ان کو اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے اور فیض غیبی سے ان کی مدد کی ہے اور وہ ان کو باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ہمیشہ انہی میں رہیں گے، اللہ ان سے خوش اور وہ اللہ سے خوش، یہی گروہ اللہ کا لشکر ہے اور سن رکھو کہ اللہ ہی کا لشکر مراد حاصل کرنے والا ہے۔''

(المجادلہ۵۸:۲۲)

اب چند احادیث مبارکہ سے ایمان کی حقیقت جانتے ہیں:

-- عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، مَا الْاِیْمَانُ؟ قَالَ اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَاءَ تْکَ سَیِّئَتُکَ، فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ [رواہ احمد]

''حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب تم کو اپنے اچھے عمل سے مسرت ہو اور برے کام سے رنج وقلق ہو، تو تم مومن ہو۔''

-- عَنِ العَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ المُطَّلِبِ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ذَاقَ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ رَّضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا [رواہ مسلم]

''حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ یہ فرماتے سنا کہ ''ایمان کا مزہ اس نے چکھا اور اس کی لذت اسے ملی، جو اللہ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول اور ہادی ماننے پر دل سے راضی ہو گیا۔''

-- عَنْ اَنَسٍ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ [صحیح مسلم، صحیح بخاری]

''حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کو اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ مجھ سے محبت نہ ہو۔''

-- عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ، قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ '' اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَائِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ''

[رواہ الترمذی]

''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلم وہ ہے جس کی زبان درازیوں اور دست درازیوں سے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس کی طرف سے لوگوں کو اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں کوئی خوف وخطرہ نہ ہو۔''

تکمیل ایمان کے لیے اور بہت سی باتیں ہیں جو قرآن وحدیث میں پھیلی ہوئی ہیں جن کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان صبح وشام ان کے مطالعے کے لیے وقت نکالیں اور اللہ تعالیٰ سے عمل کی توفیق مانگیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ، فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

یہی لوگ جنت کے مستحق ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اُولٰٓئِکَ، اسمِ اشارہ جمع بعید، اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ جنت کے ساتھی ھُمْ۔ وہ، اسم ضمیر جمع کے لئے، فِیْھَا، (فِیْ– ھَا) میں، اس یعنی اس جنت میں، ھا کی ضمیر جنت کی ہے، خٰلِدُوْنَ(خَالِدٌ، خَالِدَانِ خَالِدُوْنَ) اسم فاعل ہے، وہ سب ہمیشہ رہنے والے ہیں۔(They will dwell there in for ever)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ایمان کی تکمیل اعمال صالحہ سے ہوتی ہے، قرآن حکیم کے مطابق ایمان اور اعمال صالحہ لازم وملزوم ہیں۔
۲) ایمان میں حلاوت اور لذت اعمال صالحہ سے پیدا ہوتی ہے۔ بندۂ مومن کے لیے صوم وصلوٰۃ کی پابندی، زکوٰۃ اور فریضہ حج کی ادائیگی، ذکر واذکار، لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آنا، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، والدین کی خدمت، پڑوسیوں سے ہمدردی، مریضوں کی تیمارداری، مہمانوں کی خاطر تواضع وغیرہ تمام باتیں ایمان کو قوی اور مضبوط بناتی ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ، وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۸۳)	’’(اور وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے اور والدین، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے اچھا برتاؤ کرو گے اور عام لوگوں سے بھلی باتیں کہو گے، نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے، پھر تم میں سے ماسوائے چند آدمیوں کے باقی عہد سے پھر گئے اور تم ہو ہی اعراض کرنے والے۔‘‘

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ﴾ اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا۔

اِذْ (جب) وقت کو ظاہر کرتا ہے (Shows time) اَخَذَ، یَأْخُذُ (پکڑنا، لینا) مِیْثَاقَ ایسا عہد جو قسم کے ذریعے پختہ کیا جائے (to take a bond) بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ، حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد، لَا تَعْبُدُوْنَ، تم عبادت نہیں کرو گے، صیغہ جمع مذکر مخاطب (عَبَدَ یَعْبُدُ، عِبَادَۃً) عبادت کرنا، انتہائی عجز وانکسار کا اظہار کرنا، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: ''اَلْعُبُوْدِیَّۃُ کے معنی کسی کے سامنے ذلت اور انکسار ظاہر کرنا ہے مگر اَلْعِبَادَۃ کا لفظ انتہائی درجہ کی ذلت اور انکسار ظاہر کرنے پر بولا جاتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ معنوی اعتبار سے اَلْعِبَادَۃ کا لفظ اَلْعُبُوْدِیَّۃُ سے زیادہ بلیغ ہے، لہٰذا عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہوسکتی ہے جو بے حد صاحب افضال وانعام ہو اور ایسی ذات صرف ذاتِ الٰہی ہی ہے۔ اسی لیے فرمایا: اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اِیَّاہُ (بنی اسرائیل: ۲۳) ''کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو'' (مفردات القرآن)

قرآن حکیم نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر بیان کیا ہے اور مذکورہ آیت: ۸۳ میں بھی فرمایا: ﴿لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا (ہرگز) کسی کی عبادت نہ کرو گے، ﴿وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک، اَلْاِحْسَانُ اِلَی الْوَالِدِیْنِ مُعَاشَرَتُھُمَا بِالْمَعْرُوْفِ وَالتَّوَاضُعُ لَھُمَا، وَ اِمْتِثَالُ اَمْرِھِما (زبدۃ التفسیر من فتح القدیر) والدین سے احسان یہ ہے کہ کھانے پینے اور بود و باش میں ان کے ساتھ نیکی اور بھلائی اور عجز و خاکساری سے پیش آنا (اور دنیاوی معاملات) میں ان کی فرمانبرداری کرنا۔''

تاہم جہاں تک احکام دین اور عبادت و ریاضت کا تعلق ہے وہ صرف اور صرف رب العالمین کی بجا لائیں گے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے حق کے بیان کے بعد یہ معاً والدین کے حق کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کے بعد سب سے بڑا حق انسان پر اگر کوئی ہے تو ماں باپ ہی کا ہے اور کسی کا بھی نہیں ہے، لیکن یہ حق صرف احسان یعنی حسن سلوک کا متقاضی ہے عبادت کا نہیں، اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عبادت میں والدین کو شریک کرنے کی اجازت نہیں دی جن کا درجہ خدا کے بعد سب سے اونچا ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسید!'' (تدبر قرآن: جلد اول)

﴿وَ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ﴾ وَ ذِی الْقُرْبٰی اور قرابتداروں (رشتہ داروں)

کے ساتھ حسن سلوک ذُوْ صاحب، مالک، حالت رفعی میں ذُوْ، حالت نصبی میں ذَا اور حالت جری میں ذِی استعمال ہوتا ہے، وَ الْیَتٰمٰی، یتیم کی جمع ہے، اَلْیَتِیْمُ نابالغ بچہ جس کا باپ فوت ہو گیا ہو وَالْمَسٰکِیْنِ اور مساکین (کی خدمت) مِسْکِیْنٌ اس کا مفرد ہے، ایسا شخص جو کھانے کمانے سے عاجز ہو اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے (مصباح اللغات) رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور مرّوت کرنے کا دوہرا اجر وثواب ہے ایک تو صدقہ کرنے کا اور دوسرا رشتہ جوڑنے کا۔

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم لوگ افطار کرو تو کھجور سے کرو، اس میں برکت ہے، اگر کھجور نہ ملے تو پانی سے کھولو، پانی پاک کرنے والا ہے اور صدقہ مسکین پر باعث اجر ہے اور (مستحق) رشتہ داروں پر صدقہ کرنے میں دو فضیلتیں ہیں، صدقہ اور رشتہ جوڑنا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اپنے رزق میں کشائش چاہتا ہو اور اپنی عمر میں ترقی کا خواہشمند ہو وہ صلہ رحمی کرے (رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرے)۔[بخاری، مسلم]

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے، انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی میں کچھ فرق رکھ کر بتایا کہ اس طرح (یعنی جس طرح ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے کے قریب ہیں، اسی طرح انہیں جنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نصیب ہوگی)۔[صحیح بخاری]

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یتیم کی کفالت کرنے والا خواہ اس کا (قریبی) ہو یا دوسرے کا، وہ اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے، راوی نے انگشت شہادت کو درمیانی انگلی سے ملا کر بتایا کہ اس طرح اور وہ راوی مالک بن انسؓ تھے۔[صحیح مسلم]

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَیْسَ الْمِسْکِیْنُ الَّذِی تَرُدُّهُ التَّمْرَةَ وَالتَّمْرَتَانِ وَلَا اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ، اِنَّمَا الْمِسْکِیْنُ الَّذِی یَتَعَفَّفُ [صحیح بخاری، صحیح مسلم]

”مسکین وہ نہیں ہے کہ آپ ایک کھجور یا دو کھجوریں، ایک لقمہ یا دو لقمے اس کو پلٹا دیں، (حقیقت میں) مسکین وہ ہے جو غربت کے باوجود سوال کرنے سے بچے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بیوہ اور مسکین کی خبر لینے والا، اللہ کے راستے میں لڑنے والے کی طرح ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ بھی فرمایا، ایسے عابد کی طرح ہے جو سست نہ پڑے یا ایسے روزہ دار کی طرح ہے جو افطار نہ کرے۔ (متفق علیہ)

﴿وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ ''اور کہو لوگوں سے اچھی بات''، یعنی ماں باپ ہوں، یا عزیز و اقارب، یا پھر یتامیٰ اور مساکین جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ ان سے بالخصوص اور عام لوگوں سے بالعموم انتہائی ادب و لحاظ سے، نرم اور شائستہ لب ولہجہ میں گفتگو کرنی ہے البتہ حق وصداقت کو ہر حال میں پیش نظر رکھنا ہے۔

﴿وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ اور قائم کرو نماز اور دو زکوٰۃ (اَقَامَ، يُقِيْمُ، اِقَامَةً) قائم کرنا، اِقَامَةُ الصَّلٰوة میں وقت کی پابندی، خشوع وخضوع، دوام اور با جماعت نماز ادا کرنا ہے (حضرات مسجدوں میں جبکہ خواتین گھروں میں نماز ادا کریں) وَاٰتُوا (اٰتٰی، يُؤْتِیُ، اِيْتَاءً) ادا کرنا، الزَّكٰوة لفظی معنی نشوونما اور چیز کا عمدہ حصہ جبکہ شرعی طور پر صدقہ وخیرات جو رزق حلال میں سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے غربا اور مساکین کو دیا جاتا ہے، ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ﴾ (تَوَلّٰی يَتَوَلّٰی) پھر جانا، منحرف ہونا اِلَّا، کلمۂ استثناء مگر اور سوائے کا معنیٰ دیتا ہے (except) ﴿قَلِيْلًا مِّنْكُمْ﴾ تھوڑے تم میں سے، ﴿وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ اور تم ہو، پھر جانے والے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر یہود سے خطاب ہے کہ ان میں سے اکثر نے اسلام سے اعراض اور مسلمانوں سے دشمنی کی اور تھوڑے ہی اسلام کی طرف مائل ہوئے جن میں سے مشہور صحابی عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اس آیہ مبارکہ میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سلسلہ میں جو ہدایات دی گئی ہیں، اگرچہ ان کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں لیکن بعینہ یہی ہدایات امت محمدیہ کے لیے بھی ہیں۔

۲) ان ہدایات کو پس پشت ڈالنے سے بنی اسرائیل خائب وخاسر ہوئے تو اگر ہم بھی ان ہدایات کو نظر انداز کر دیں گے تو سراسر نقصان اٹھائیں گے۔ (العیاذ باللہ)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (۸۴)	''اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ تم آپس میں خونریزی نہ کرو گے اور نہ اپنے بھائی بندوں کو ان کے گھروں سے جلا وطن کرو گے، تم نے اقرار کیا تھا اور اس بات کی تم خود گواہی بھی دیتے ہو۔''

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ﴾ اور جب ہم نے لیا پختہ عہد تم سے وَاِذْ (اور یاد کرو جب) اَخَذْنَا، ہم نے لیا (اَخَذَ يَأْخُذُ، اَخْذًا) لینا، پکڑنا مِيْثَاق۔ پختہ عہد، ﴿لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ﴾ تم نہ بہاؤ گے خون اپنے تَسْفِكُوْنَ، مضارع جمع مذکر مخاطب (سَفَكَ يَسْفِكُ، سَفْكًا) بہانا (دِمَاءَ. كُمْ) خون اپنا دَمٌ کی جمع دِمَاءٌ (Shed not the blood of your people)۔ انسانی جان کی قدر و قیمت ہمیشہ رہی ہے، بنی اسرائیل کو ایک مقام پر اس طرح حکم ہوا:

كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَائِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا، وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ ۵:۳۲) ''ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا کہ جس شخص نے کسی دوسرے کو جان کے بدلہ کے سوا یا زمین میں فساد بپا کرنے کے جرم کے سوا قتل کیا تو اس نے گویا سب لوگوں کو مار ڈالا اور جس نے کسی کو (قتل ناحق سے) بچا لیا تو وہ گویا سب لوگوں کی حیات کا موجب ہوا۔''

اس آیۂ مبارکہ نے ناحق قتل کی کس قدر مذمت کی ہے کہ اثرات کے اعتبار سے پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے، ایسا قاتل گویا کہ پوری انسانیت اور امن عامہ کا دشمن ہے، دوسرے لوگ بھی اسے قتل کرتے ہوئے یا فساد پھیلاتے ہوئے دیکھ کر جرائم کرنے میں دلیر ہو جاتے ہیں اور یہ نسل انسانی سے دشمنی ہے۔

سید مودودی اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کی زندگی کا بقا منحصر ہے اس پر کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کی جان کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقا و تحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا

ہو۔ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے، وہ صرف ایک ہی فرد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیات انسانی کے احترام سے اور ہمدردی نوع کے جذبہ سے خالی ہے، لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے کیونکہ اس کے اندر وہ صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افراد انسانی میں پائی جائے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جائے، اس کے برعکس جو شخص انسان کی زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے، وہ درحقیقت انسانیت کا حامی ہے کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کی بقا کا انحصار ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

ناحق کسی بھی جان کو مارنا، اسلام کے نزدیک بہت بڑا جرم ہے جس کے متعلق آپ مندرجہ بالا آیت میں پڑھ چکے ہیں۔ چہ جائیکہ کسی مسلمان اور مومن کی ناحق جان لینا، یہ تو اور بڑا گناہ کبیرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (النساء ۴:۹۳)

''اور جو شخص کسی مسلمان کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

مسلمانوں کے باہم حسنِ سلوک اور جان و مال کی حفاظت کے متعلق ارشاد رسولؐ ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں نہ ان کی خیانت کرے، نہ ان سے جھوٹ بولے نہ ان کو رسوا کرے، ہر مسلمان پر مسلمان کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت حرام ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ اشارہ کر کے فرمایا تقویٰ یہاں (یعنی دل میں) ہے اور انسان کے لیے اتنی ہی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر خیال کرے۔ [ترمذی شریف]

﴿وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ﴾ اور نہ نکالو گے اپنے نفسوں کو اپنے گھروں سے، **تُخْرِجُوْنَ** مضارع جمع مذکر مخاطب (اَخْرَجَ يُخْرِجُ، اِخْرَاجًا) نکالنا، (**اَنْفُسَ – كُمْ**) نفس۔ اپنے، یعنی اپنے بھائی بندوں کو مِنْ۔ سے (**دِيَارِكُمْ**) گھروں اپنے، دار کی جمع دیار یعنی اپنے بھائی بندوں کو ان کے گھروں سے نکال کر وطن سے بے وطن نہ کرو گے، **﴿ثُمَّ﴾** پھر، **﴿اَقْرَرْتُمْ﴾** تم سب نے اقرار کیا ماضی جمع مذکر مخاطب (اَقَرَّ يُقِرُّ، اِقْرَارًا) اقرار کرنا **﴿وَ اَنْتُمْ﴾** اور تم سب، **﴿تَشْهَدُوْنَ﴾** شہادت دیتے ہو مضارع جمع مذکر مخاطب (شَهِدَ، يَشْهَدُ، شَهَادَةً) گواہی دینا یعنی اپنے اعمال پر خود گواہ ہو۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''اس سورۃ کے پانچویں رکوع سے مسلسل یہود کا ذکر ہو رہا ہے، یہودی اپنے اصل دین سے بھٹک چکے تھے، اللہ کی دی ہوئی کتاب تورات میں تحریف وتبدیل کرتے تھے، اللہ کے احکام سن کر اور ان کی تعمیل کا وعدہ کر کے اس سے پھر جاتے تھے اور وہ جھوٹے اور من گھڑت عقیدوں میں مبتلا تھے، انہیں یہ گمان تھا کہ وہ خواہ کتنے ہی گناہ کریں اور معصیت کے مرتکب ہوں، انہیں ہرگز سزا نہ ہوگی بلکہ ان کے بزرگ انہیں دوزخ کی آگ سے بچالیں گے۔

یہود کے ان غلط عقائد کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعہ ظاہر کر دیا کہ نجات کا اصل قانون کیا ہے؟ صرف وہی لوگ جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، جنت کے مستحق ہوں گے، لیکن جو شخص معصیت میں گھر گیا، وہ ہر حالت میں دوزخ میں داخل ہوگا، نجات کا قانون بیان فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے صالح اور نیک بندے بننے کا طریقہ بتایا اور ان کے میثاق کی طرف انہیں توجہ دلائی۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے دو اور باتوں کا وعدہ بھی لیا تھا یعنی یہ کہ ایک تو وہ آپس میں خونریزی نہ کریں گے، دوسرے یہ کہ اپنی قوم کو ناحق جلاوطن نہ کریں گے کیونکہ اس سے قوم کا اجتماعی رعب ختم ہو جائے گا، مخالفوں کو موقع ملے گا کہ وہ حملہ کر کے ان پر تسلط جمالیں اور حاکم بن بیٹھیں۔'' (درس قرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) کلمہ طیبہ کا اقرار کرنے کے بعد ہر شخص احکام الٰہی کا پابند ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرے گا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کا اتباع نہ کرے گا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی قرآن حکیم کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور جب تک مسلمانوں نے کتاب وسنت کی پیروی کی وہ راہ راست پر رہے اور جونہی اس صراط مستقیم کو چھوڑا وہ بھٹک گئے۔

۲) یہود کی طرح بھٹکی ہوئی امت مسلمہ کئی خرابیوں کا شکار ہوگئی اور اس کے سامنے مسائل کا انبار بھی لگ گیا افسوس کہ:

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَ تُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِنۡ دِيَارِهِمۡ، تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ، اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ، فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ (۸۵)	”پھر تم ہی وہ لوگ ہو جو اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو، برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں (جلاوطن) کر دیتے ہو، اور حق تلفی اور ظلم وسرکشی کر کے ان کے خلاف (ان کے دشمنوں کو) مدد دیتے ہو، اگر وہ قیدی بن کر آئیں تو (ناک کٹتی دیکھ کر) فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا بھی لیتے ہو، حالانکہ ان کی بستیوں سے انہیں نکالنا ہی تم پر حرام تھا..... کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو لوگ اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں، ان کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا میں ذلت وخواری سے دو چار ہوں اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیئے جائیں۔ اور اللہ ان اعمال سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔“

﴿ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ وَ تُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِنۡ دِيَارِهِمۡ، تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ﴾

پھر تم ہی وہ لوگ ہو جو اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو، برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں (جلا وطن) کر دیتے ہو، اور حق تلفی اور ظلم وسرکشی کر کے ان کے خلاف (ان کے دشمنوں کو) مدد دیتے ہو، اگر وہ قیدی بن کر آئیں تو (ناک کٹتی دیکھ کر) فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا بھی لیتے ہو، حالانکہ ان کی بستیوں

سے انہیں نکالنا ہی تم پر حرام تھا۔

ثُمَّ، حرف عطف ہے، ترتیب کے لیے استعمال ہوتا ہے، اَنْتُمْ ضمیر جمع مذکر مخاطب۔تم سب (لوگ) هٰٓؤُلَآءِ، اسم اشارہ جمع،تم سب تَقْتُلُوْنَ،قتل کرتے ہو مضارع جمع مخاطب (قَتَلَ یَقْتُلُ قَتْلاً) قتل کرنا، اَنْفُسَكُمْ (اَنْفُسَ–كُمْ) نَفْسٌ کی جمع اَنْفُسٌ۔جانیں، اپنی یعنی اپنے بھائی بندوں کو مارتے ہو، تُخْرِجُوْنَ مضارع جمع مذکر مخاطب (اَخْرَجَ یُخْرِجُ، اِخْرَاجًا) نکالنا جلا وطن کرنا، فَرِيْقًا۔گروہ، جماعت، مِنْ سے، دِيَارِهِم، دَارٍ کی جمع دِيَارٍ (دِيَارِ– هِمْ) گھروں ان کے یعنی انہیں ان کے گھروں سے نکالتے ہو، زبردست زیردستوں کو وطن سے بے وطن کر دیتے ہیں، تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ چڑھائی کرتے ہو ان پر (تَظَاهَرَ، يَتَظَاهَرُ، تَظَاهُرٌ) اصل میں تَتَظَاهَرُوْن تھا ثقالت دور کرنے کے لیے ایک تاء کو حذف کر دیا گیا، تَظٰهَرُوْن فعل مضارع جمع مذکر حاضر، (چڑھائی کرنا، فوقیت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے سامنے آنا) تَظَاهَرَ باب تفاعل ایک دوسرے کی مدد کرنا (مصباح اللغات) بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (بِ–الْاِثْمِ) ساتھ۔گناہ کے، وَالْعُدْوَانِ اور ظلم وتعدی سے) اِثْمٌ کی تعریف حدیث شریف میں اس طرح آئی ہے:

وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِیْ صَدْرِكَ وَ كَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ [صحیح مسلم]

''گناہ وہ ہے جو چیز تیرے دل میں خلش پیدا کرے اور تو اس پر لوگوں کے مطلع ہونے کو ناپسند کرے۔''

عُدْوَانِ، ظلم وزیادتی، اسی سے عَدُوٌّ، بنا ہے جس کے معنی دشمن کے ہیں۔

گویا کہ اثم وہ گناہ ہے جس سے کوئی شخص دل سے گنہگار ہوتا ہے۔اور عدوان کا مطلب دوسروں پر ظلم وزیادتی کر کے مزید اپنے سر گناہوں کا بوجھ اٹھانا ہے، اس طرح ظاہر و باطن دونوں طرح سے وہ گناہوں میں ملوث ہو جاتا ہے۔

﴿وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ، اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ، فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾

اگر وہ قیدی بن کر آئیں تو (ناک کٹتی دیکھ کر) فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا بھی لیتے ہو، حالانکہ ان کی بستیوں سے انہیں نکالنا ہی تم پر حرام تھا..... کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو لوگ اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں، ان کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا میں ذلت وخواری سے دوچار ہوں اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیئے جائیں۔ اور اللہ ان اعمال سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔

اِنْ۔ (حرف شرط ہے) اگر یَّاْتُوْکُمْ (یَّاْ تُوْ-کُم) وہ آتے ہیں۔ تمہارے پاس (اَتٰی، یَاْتِیْ، اِتْیَانٌ) آنا، اُسٰرٰی، قیدی اَسِیْرٌ کی جمع ہے، تُفٰدُوْھُمْ (تُفٰدُوْ-ھُم) تم فدیہ دیتے ہو ان کا، اس کا مادہ فَدَی ہے، کسی کو بچانے کیلئے فدیہ (رقم) دینا، یعنی جب وہ قید ہو کر تمہارے پاس پہنچتے ہیں تو فدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے ہو۔ وَھُوَ۔ اور وہ (بات) یعنی ان کا اخراج (نکالنا) مُحَرَّمٌ (حرام ہے) حَرَّمَ یُحَرِّمُ تَحْرِیْمًا، حرام کرنا، مُحَرَّمٌ جو بات حرام کی گئی ہو، اِخْرَاجُھُمْ (اِخْرَاجُ- ھُمْ) نکالنا، ان کا۔ حالانکہ ان کا گھر سے بے گھر کرنا ہی تمہارے لیے حرام تھا، اَفَتُؤْمِنُوْنَ اَ۔ کلمۂ استفہام، تُؤْمِنُوْنَ، تم ایمان لاتے ہو، مضارع جمع مذکر مخاطب (اٰمَنَ یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا) ایمان لانا بِبَعْضِ الْکِتَابِ (کتاب کے ایک حصے پر) وَتَکْفُرُوْنَ تم کفر کرتے ہو مضارع جمع مذکر مخاطب (کَفَرَ یَکْفُرُ. کُفْرًا) کفر کرنا، بِبَعْضٍ (ایک حصے کا) یعنی اللہ کی کتاب (تورات یا قرآن) کے بعض احکام مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہی ایمان قابل قبول ہے جسے پوری طرح مانا جائے۔ فَمَا جَزَآءُ، پس کیا ہے جزا (بدلہ) مَنْ (جو) اسم موصول ہے یَّفْعَلُ (کرتا ہے) مضارع واحد مذکر غائب (فَعَلَ یَفْعَلُ) کرنا ذٰلِکَ (وہ، ویسی بات جو شریعت کے خلاف ہو) اِلَّا۔ کلمہ استثناء (سوائے) خِزْیٌ، رسوائی، ذلت، یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بعض حصوں کو ماننا اور بعض سے انکار (قولی یا عملی طور پر) رسوائی اور ذلت کو لازم کر دیتا ہے۔ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا. فِی، میں۔ حَیَاۃِ الدُّنْیَا۔ دنیا کی زندگی، ایسے افراد یا اقوام دنیا کی زندگی میں رسوائی اور ذلت اٹھاتے ہیں۔ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اور قیامت کے دن، یُرَدُّوْنَ وہ لوٹائے جائیں گے فعل مضارع مجہول جمع مذکر غائب (رَدَّ، یَرُدُّ، رَدًّا) واپس کرنا، لوٹانا اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ، شدید ترین عذاب کی طرف، اس عذاب کی ہولناکی اور شدت کا تصور نہیں کیا جا سکتا! وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ اور نہیں اللہ تعالیٰ غافل، مَا نافیہ ہے (کبھی ماسوالیہ کے معنی دیتا ہے) بِغَافِلٍ (غافل، بے خبر) عَمَّا (عَنْ. مَا) اس سے۔ جو تَعْمَلُوْنَ۔ تم عمل

کرتے ہو، مضارع جمع مذکر مخاطب (عَمَلَ یَعْمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا، وہ باریک بین ہے، ہر چھوٹی بڑی بات کی ہمہ وقت خبر رکھتا ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں انصار کے دو قبیلے تھے۔ اوس اور خزرج، (اسلام سے قبل) ان کی آپس میں آئے دن جنگ رہتی تھی، اسی طرح یہود مدینہ کے تین قبیلے تھے..... بنوقینقاع بنونضیر اور بنوقریظہ۔ یہ بھی آپس میں لڑتے رہتے تھے، بنوقریظہ اوس کے حلیف (ساتھی) تھے اور بنوقینقاع اور بنو نضیر، خزرج کے حلیف (ساتھی) تھے، جنگ میں یہ اپنے اپنے حلیفوں (ساتھیوں اور دوستوں) کی مدد کرتے اور اپنے ہی ہم مذہب، یہودیوں کو قتل کرتے، ان کے گھروں کو لُوٹتے اور انہیں جلا وطن کر دیتے۔ حالانکہ تورات کے مطابق ایسا کرنا ان کے لیے حرام تھا، پھر انہی یہودیوں کو جب وہ مغلوب ہونے کی وجہ سے قیدی بن جاتے تو فدیہ دے کر چھڑاتے اور کہتے کہ ہمیں تورات میں یہی حکم دیا گیا ہے، ان آیات میں یہودیوں کے اسی کردار کو بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے شریعت کو موم کی ناک بنالیا تھا، کسی حکم پر عمل کر لیتے اور کسی وقت شریعت کے حکم کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتے، قتل، اخراج اور ایک دوسرے کے خلاف مدد کرنا، ان کی شریعت میں حرام تھا، ان امور کا تو انہوں نے بے محابا (کھلم کھلا) ارتکاب کیا اور فدیہ دے کر چھڑا لینے کا جو حکم تھا اس پر عمل کیا حالانکہ اگر وہ پہلے تین امور کا لحاظ رکھتے (قتل و غارت گری سے باز رہتے، دوسروں کو جلا وطن نہ کرتے، ظلم وستم سے رک جاتے) تو فدیہ دے کر چھڑانے کی نوبت ہی نہ آتی۔'' (تفسیر احسن البیان)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

مندرجہ بالا آیہ مبارکہ ہمارے لیے عبرت وموعظت کا عظیم پیغام رکھتی ہے، سچ بات تو یہ ہے کہ قوم بنی اسرائیل سے ہم دو چار قدم آگے ہی بڑھ چکے ہیں، وہ تو پھر کتاب (تورات) کے بعض حصوں کو مانتے اور بعض کا انکار کرتے تھے (تو اس پر ان کا انجام اچھا نہ ہوا) یہاں پر سرے سے کتاب (قرآن حکیم) کا انکار ہی انکار ہے (اگرچہ زبان سے نہ سہی مگر عمل سے تو آشکارا ہے) گزشتہ ساٹھ برس سے اسلام کے عادلانہ نظام کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئی ہیں، کسی بھی حکومت کو نفاذ شریعت کی توفیق نہ مل سکی نتیجتاً ہم قعر مذلت میں گر چکے ہیں اگر بنی اسرائیل نے احکام الٰہی کی خلاف ورزی سے نقصان اٹھایا تو

کیا ہمارا طرزِ عمل ہمیں کامیاب بنادے گا؟

یہ مجھ سے عقیدت کے دعوے، قانون پہ راضی غیروں کے
یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں، ایسے بھی ستایا جاتا ہوں

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا بِالۡاٰخِرَۃِ، فَلَا یُخَفَّفُ عَنۡھُمُ الۡعَذَابُ وَلَاھُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ (۸۶)	''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو خریدا، لہٰذا ان سے نہ تو عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مدد ہی مل سکے گی۔''

اُولٰٓئِکَ، اسم اشارہ بعید جمع کے لیے، وہ لوگ، الَّذِیۡنَ، اسم موصول وہی تو ہیں اِشۡتَرَوُا، خرید افعل ماضی جمع مذکر غائب (اِشۡتَرٰی، یَشۡتَرِیۡ، اِشۡتِرَاءً) خریدنا، اَلۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا۔ زندگی، دنیا کی۔ بِالۡاٰخِرَۃِ (بِ. الۡاٰخِرَۃِ) بدلے، آخرت کے، اَلۡبَاءُ لِلۡعِوَضِ، یعنی 'ب' بدلے کے معنی دیتا ہے، جن اہل کتاب کا اس سے قبل کی آیات میں ذکر آیا ہے کہ من چاہی زندگی ان کا دستور العمل رہا، کتاب الٰہی کے بعض حصوں کو تسلیم کیا اور بعض کا انکار کیا، انہیں دنیا اور آخرت میں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا اور عذاب الٰہی ان کا مقدر ٹھہرا۔ یہ اس لیے کہ دنیا کی زندگانی ہی ان کو مقصود تھی۔

قرآن حکیم کی متعدد آیات میں دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے دوام کا ذکر آیا ہے اور اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ دنیا عارضی اور ناپائیدار ہے جبکہ آخرت دائمی اور پائیدار ہے، اب یہ انسان کی اپنی سوچ ہے کہ وہ کس کو اختیار کرتا ہے، یہ دنیا دار العمل ہے جبکہ آخرت دار الجزاء ہے، چند آیات پر غور کیجئے:

- اَرَضِیۡتُمۡ بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا مِنَ الۡاٰخِرَۃِ، فَمَا مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیۡلٌ، (التوبہ ۹:۳۸) ''(جہاد ایسی قیمتی نعمت کو چھوڑ کر تمہیں دنیا سے لگاؤ ہو گیا) کیا تم آخرت (کی نعمتوں) کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو بیٹھے ہو، دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں۔''

● مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا، وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ، وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (ھود۱۱:۱۵،۱۶) ''جولوگ دنیا کی زندگی اوراس کی زیب وزینت کے طالب ہوں (اورایمان کے ساتھ آخرت کے لیے اعمال حسنہ کی انہیں مطلق فکر نہ ہو) تو ہم ان کے اعمال (جوتھوڑے بہت انہوں نے کئے) کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اوراس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آتش جہنم کے سوااور کچھ نہیں اور جوعمل انہوں نے (بغیرایمان) کے دنیا میں کئے سب برباد ہوگئے اور جو کچھ وہ کرتے رہے سب ضائع ہوا۔''

● اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا (الکھف ۱۸:۴۶) ''مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی (رونق) وزینت ہیں اور نیکیاں (اعمال حسنہ) باقی رہنے والی ہیں، وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے پروردگار کے ہاں بہت اچھی اور امید (کامیابی) کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں۔''

● وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (القصص:۶۰) ''اور جو چیزیں (بود و باش اور کھانے پینے کے لئے) تم کو دی گئی ہیں وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اوراس کی زینت ہیں اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے کیا تم (اس حقیقت کو) کو سمجھتے نہیں ہو؟''

● بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا، وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (الاعلیٰ ۸۷:۱۶،۱۷) ''(لوگو!) تم تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو (اسی میں مصروف اور مگن رہتے ہو) حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔''

اب چند احادیث پر نظر ڈالتے ہیں:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما تھے اور (صحابہ کرامؓ) آپ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ مِمَّا اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِي مَا يَفْتَحُ عَلَيْكُمْ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتِهَا [بخاری و مسلم] ''یقیناً مجھے یہ ڈر رہتا ہے کہ میرے بعد تم پر دنیا کی آرائش اوراس کی زینت نہ کھول دی جائے۔''

اورایک روایت میں اس طرح آیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ الدُّنْیَا حُلْوَۃٌ خَضِرَۃٌ وَاِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی مُسْتَخْلِفُکُمْ فِیْھَا، فَیَنْظُرُ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ فَاتَّقُوْا الدُّنْیَا وَاتَّقُوْا النِّسَاءَ [صحیح مسلم] ''دنیا سرسبز اور شیریں ہے، اللہ تعالیٰ تم کو اس میں جانشین بنائے گا پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو، پس تم دنیا اور عورتوں (کے فتنہ) سے بچنا۔''

مَا الدُّنْیَا فِی الْآخِرَۃِ اِلَّا مِثْلَ مَا یَجْعَلُ اَحَدُکُمْ اِصْبَعَہٗ فِی الْیَمِّ ، فَلْیَنْظُرْ بِمَ یَرْجِعُ [رواہ مسلم] ''آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ایسی ہی نسبت ہے جیسے سمندر میں کوئی انگلی ڈالے اور دیکھے کہ وہ سمندر کا کتنا پانی ساتھ لائی ہے؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک یہ دعا بھی تھی:

اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا أَکْبَرَ ھَمِّنَا

''اے اللہ دنیا ہی کو ہمارا سب سے بڑا غم نہ بنا دینا۔''

اَللّٰھُمَّ لَاعَیْشَ اِلَّاعَیْشَ الْآخِرَۃِ [صحیح بخاری، صحیح مسلم]

''اے اللہ! اصلی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔''

جن لوگوں نے حصول دنیا ہی کو مقصد حیات بنا لیا اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے اسے حاصل کرنے میں لگ گئے، ان کے بارے میں ارشاد ہوا ﴿فَلَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ﴾ پس نہ خفیف (ہلکا) کیا جائے گا ان سے عذاب (خَفَّفَ یُخَفِّفُ تَخْفِیْفًا) ہلکا کرنا، یُخَفَّفُ مضارع واحد مذکر مجہول یعنی ان کے برے اعمال کی وجہ سے ان کے عذاب میں تخفیف نہ کی جائے گی۔ ﴿وَلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ﴾ اور نہ وہ مدد دیے جائیں گے (نَصَرَ. یَنْصُرُ. نَصْرًا) مدد کرنا، یَنْصُرُ سے مجہول کا صیغہ یُنْصَرُ اور جمع یُنْصَرُوْنَ.

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

خواہشات کی پیروی سے دین کی حقیقت بھول جاتی ہے۔ یہود دنیا حاصل کرنے میں اتنے مگن ہوئے کہ آخرت کی جواب دہی نظر سے اوجھل ہوگئی، آج کل کی اصطلاح میں موقع شناسی ان کا فن بن گئی تھی، دنیا کے چند چمکتے سکوں کے عوض آخرت کی لازوال نعمتوں کو وہ بھلا بیٹھے تھے، کچھ ایسا ہی حال آج مسلمانوں کا ہو چکا ہے۔ (العیاذ باللہ)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ، اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ، فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (۸۷)	''اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی پھر اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسیٰؑ ابن مریم کو واضح معجزے عطا کئے اور روح القدس (جبریل امین) سے ان کی تائید کی، پھر کیا (بارہا ایسا نہ ہوا کہ) جب کبھی تمہارے پاس کوئی رسول ایسا حکم لایا جو تمہارے جی کو نہ بھایا تو تم تکبر کرنے لگے، پھر (رسولوں کی) ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو تم نے قتل کر ڈالا۔''

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی پھر اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسیٰؑ ابن مریم کو واضح معجزے عطا کئے اور روح القدس (جبریل امین) سے ان کی تائید کی۔

لَقَدْ جملے میں تاکید پیدا کرتا ہے (لَ–قَدْ) البتہ۔ بے شک۔ لام زبر والا بھی جملے میں زور اور تاکید پیدا کرتا ہے، قَدْ بھی تحقیق کلام کے لیے آتا ہے گویا کہ لَقَدْ میں انتہائی زور کلام ہے، اٰتَيْنَا ہم نے عطا کی (اٰتٰى يُؤْتِيْ، اِيْتَاءً) عطا کرنا، موسیٰ، سیدنا موسیٰ علیہ السلام، سلسلہ اسرائیلی کے سب سے زیادہ مشہور اور جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ الْكِتٰبَ خاص کتاب (یعنی تورات)، وَقَفَّيْنَا اور ہم نے پے در پے بھیجے ماضی جمع متکلم (قَفّٰى يُقَفِّيْ، تَقْفِيَةً) پیچھے بھیجنا، مِنْۢ بَعْدِهٖ، ان کے بعد یعنی موسیٰ علیہ السلام کے بعد بِالرُّسُلِ (بہت سے رسول) رَسُوْلٌ کی جمع رُسُلٌ ہے وَاٰتَيْنَا اور ہم نے عطا کیا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ عیسیٰ ابن مریم۔ سیدنا عیسیٰؑ مریم کے بیٹے کو، مریم بنت عمران، قوم اسرائیل کے ایک بڑے معزز خاندان سے تھیں اور بڑی باعصمت تھیں، ابن مریم کے لفظ میں اشارہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ اپنی پیغمبرانہ عظمت کے باوجود محض

بشری تھے اور ایک عورت کے بطن سے پیدا ہوئے اور شان الوہیت سے بالکل مبرا تھے، عیسیٰ بَرَوَزن فعلیٰ.....بعض کے نزدیک یہ لفظ عجمی ہے۔ سریانی میں ایسوع اور انجیل میں یسوع آیا ہے جس کے معنی سیّد، یا مبارک کے ہیں، مریم کے معنی سریانی میں خادمہ اور عابدہ کے ہیں، بعض کے نزدیک مریم عربی لفظ ہے اس عورت کو کہتے ہیں: " اَلَّتِی لَا تُحِبُّ مُحَادَثَةَ الرِّجَالِ وَلَا تَفْجُرُ" جو نہ تو مردوں سے کلام کو پسند کرے اور نہ ہی فاجرہ ہو۔ اَلْبَیِّنَاتُ واضح، بیِّنَةٌ مفرد، صریح اور کھلے معجزے وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ، اور ہم نے تائید کی، ان کی روح القدس (جبریل امین) کے ساتھ۔ حضرت جبریل انبیاء کرام اور رسولوں کے پاس اللہ کا پیغام لاتے تھے اور بینات سے وہ معجزات مراد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے جیسے مُردوں کو وہ کہتے کہ اللہ کے حکم سے زندہ ہو جاؤ تو وہ زندہ ہو جاتے یا اللہ کے حکم سے کوڑھی اور اندھے کو صحت یاب کر دیتے۔ دیکھئے ال عمران آیت ۴۹ (اَیَّدَ، یُؤَیِّدُ، تَائِیْدًا) تائید کرنا۔

خواجہ عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

قَفَّیْنَا (ہم نے پے در پے بھیجے) بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کے بعد انبیا کا سلسلہ برابر جاری رہا، جن میں بعض مشہور نبی یہ ہیں.....حضرت یوشع، داؤد، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام۔ عیسیٰ بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے آخری نبی ہیں، بنی اسرائیل میں آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوا، اس کے بعد نبوت بنو اسماعیل کی طرف چلی گئی، اس خاندان میں حضرت محمد صلی اللہ علی وسلم پیدا ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا اور نہ آئے گا یعنی آپ ﷺ پر نبوت ختم ہوگئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خاص طور پر آپؐ کے تشریف فرما ہونے کی بشارت دے گئے تھے۔ سن عیسوی حضرت عیسیٰ کے نام سے ہی جاری ہے، ملک شام میں ایک قصبہ ناصرہ ہے جو آپ کا آبائی وطن تھا، اسی نسبت سے آپ کو مسیح ناصری کہتے ہیں۔

(درس قرآن، جلد اول)

﴿اَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ﴾ جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس ان (احکام) کے ساتھ آیا جو تمہارے نفس کو نہ بھایا تو تم تکبر اور غرور کا شکار ہو گئے۔ أ بطور استفہام استعمال ہوتا ہے اور تعجب پر دلالت کرتا ہے كُلَّمَا (كُلَّ– مَا) جس وقت، جب کبھی (Whenever) جَآءَكُمْ (جَاءَ–كُمْ) آیا۔ تمہارے پاس (جَاءَ يَجِيءُ) آنا رَسُوْلٌ (کوئی رسول) اسم نکرہ ہے، بِمَا (بِ–مَا) ساتھ– اس چیز کے (جسے) لَا تَهْوٰى، نہ پسند کرتے ہیں، (هَوَى

یَھْوِیْ، ھَوَاءٌ) چاہنا، پسند کرنا، اَنْفُسُکُمْ (اَنْفُسُ–کُمْ) نفس تمہارے نفس کی جمع اَنْفُس اِسْتَکْبَرْتُمْ تم نے غرور کیا (اِسْتَکْبَرَ. یَسْتَکْبِرُ، اِسْتِکْبَارًا) بابِ استفعال۔ تکبر اور غرور کرنا۔

قوم بنی اسرائیل نے رسولوں کی دعوت حق کو غرور اور تکبر سے ٹھکرا دیا اور اپنی آرزوؤں اور خواہشات کے پیچھے چل پڑے۔

﴿فَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾

(رسولوں کی) ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا اور ایک فریق کو تم قتل کرتے رہے۔

فریق گروہ۔ جماعت کَذَّبْتُمْ جمع مذکر مخاطب تم سب نے جھٹلایا (کَذَّبَ یُکَذِّبُ، تَکْذِیبًا) باب تفعیل، جھٹلانا جیسا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور تَقْتُلُوْنَ (تم قتل کرتے تھے) (قَتَلَ یَقْتُلُ) قتل کرنا جیسا کہ حضرت زکریا اور یحییٰ علیہما السلام نے ان کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) انسانوں کی رہبری اور رہنمائی کے لیے جب سے دنیا بنی ہے، رسول اور انبیا تشریف لاتے رہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کا دین لوگوں تک پہنچایا اور ان کی اپنی زندگیاں سیرت وکردار کا عمدہ نمونہ ٹھہریں یہاں تک کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ نبوت ختم کر دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تا قیامت ابدیت حاصل رہے گی۔ ان میں سے بعض رسولوں کو معجزات سے نوازا گیا کہ عقیدہ کے کمزور اور پست ہمت لوگوں پر حجت قائم ہو جائے۔

۲) انسان کی شقاوت اور بدبختی کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے جب وہ خواہشات کا غلام بن جاتا ہے اور فہم و بصیرت اور عقل وشعور سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے، تو وہ اوج ثریا سے قعرِ مذلت میں جا گرتا ہے، پھر وہ حیوانوں اور درندوں کو بھی مات کر دیتا ہے، غور کیجئے کہ انبیائے کرام پیکرِ صدق وصفا ہوتے ہیں اور ان پاکبازوں کی بے داغ زندگیاں لوگوں کے لیے روشنی کے مینارے ہوتی ہیں۔ وہ لوگوں کو نیکی اور راستبازی کا سبق سکھاتے ہیں۔ اخلاق ومروت سے آراستہ کرتے ہیں اور انسانیت کے بلند مقام پر

کھڑا کرنا چاہتے ہیں مگر بد بخت انسان ان نفوس قدسیہ پر ظلم وستم ڈھاتے ہیں اور اپنی دنیا و عاقبت تباہ و برباد کرتے ہیں۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ، بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلاً مَّا يُؤْمِنُوْنَ (۸۸) وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ، وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ، فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۸۹)	''اور کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف ہیں، نہیں بلکہ ان کے کفر کی بنا پر اللہ نے ان پر لعنت کی، پس بہت کم ایمان لاتے ہیں اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کتاب (قرآن حکیم) پہنچ گئی جو اس کتاب (تورات) کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے اور اس سے قبل وہ کفار کے مقابلہ میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے تو جب ان کے پاس وہ (آخری فرمان الٰہی) پہنچ گیا جسے انہوں نے جان پہچان کر (از راہ تکبر) انکار کر دیا، سو ایسے کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔''

﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ اور کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف ہیں۔

وَقَالُوْا، اور انہوں نے کہا (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، اردو میں قول وقرار مقولہ، مقالہ وغیرہ کثیر الاستعمال الفاظ ہیں، قُلُوْبُنَا (قلوب.....نا) دل، ہمارے قلب مفرد ہے غُلْفٌ غلاف میں ہیں جمع اغلف و غلاف.

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یہود فخریہ اور علانیہ کہتے تھے کہ یہ نئے پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کچھ بھی کر ڈالیں ہم ان کے کہنے

میں نہیں آنے کے، ہمارے دل گنجینۂ علوم ہیں، معارفِ موسوی سے لبریز ہیں۔ہمیں ضرورت کسی نئی تعلیم کے قبول کرنے کی نہیں ہے۔'' (تفسیر ماجدی)

یہ محض ان کا زبانی جمع خرچ تھا اور ان کی عملی زندگی شریعت موسوی سے کہیں دور تھی، اگر وہ تورات کی اصل تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے تو انہیں شریعت محمدی قبول کرنے میں قطعاً کوئی اعتراض نہ ہوتا کیونکہ قرآن حکیم سابقہ کتب آسمانی کے حقائق کا علمبردار ہے۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ مذہبی امام و پیشوا ہیں، ان کے پاس اللہ کی کتاب ہے اور بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے ان کا اولین فرض یہ ہونا چاہیے کہ حق بات کو جاننے کے لیے تیار رہیں اور اس کو اس طرح لبیک کہیں جیسے بھوکا کھانے کو اور پیاسا پانی کو لینے کے لیے لپکتا ہے، مگر ان بدبختوں کی حالت یہ ہے کہ ایسی تعلیم صحیح کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں جو دنیا اور آخرت کی ترقی کا ذمہ لیتی ہے اور تمسخر و استہزا کے طور پر کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو ان مضامین سے کیا تعلق۔ گویا دوسرے الفاظ میں ان کا فیصلہ یہ ہے کہ جس جگہ آج ہیں اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھیں گے، پھر جس قوم نے خود ہی ترقی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو، اپنے پاؤں میں اندھی تقلید کی بوجھل زنجیریں ڈال لی ہوں، ان سے اب کیا توقع ہو سکتی ہے۔ وہ تنزل و انحطاط کو پسند کرتے ہیں، پس اس جمود و استبداد کی بنا پر، جس کا سببِ وحید وہ کفر و عصیان ہے جس کا انہوں نے پہلے ارتکاب کیا، ان پر اللہ کی لعنت نازل ہو چکی ہے، ان کے دل حق بات قبول کرنے کیلئے تیار نہیں اور اس کی رحمت ان سے روٹھ گئی ہے۔ (الفرقان فی معارف القرآن)

﴿بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ﴾ بلکہ لعنت کی ان پر اللہ نے بوجہ ان کے کفر کے۔

بَلْ ،حرف عطف ہے سابق سے اضراب کے لیے آتا ہے جیسا کہ مَاذَهَبَ زَيْدٌ بَلْ عَمْرو (زید نہیں بلکہ عمرو گیا)۔ (لَعَنَ. هُمْ) لعنت کی، ان پر، لعنت رحمت الٰہی سے بُعد اور توفیق الٰہی سے دوری کا نام ہے (بِكُفْرِ. هُمْ) بسبب کفر ان کے 'ب' یہاں پر وجہ اور سبب کو ظاہر کرتا ہے (فَ. قَلِيْلاً) پس، بہت تھوڑے، ما (جو) يُومِنُوْن ایمان لاتے ہیں قلیل کے بعد ما مزید قلت کے معنی دیتا ہے۔

﴿وَلَمَّا جَآءَ هُمْ كِتٰبٌ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کتاب (قرآن حکیم) پہنچ گیا جو اس کتاب (تورات) کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس ہے۔

لَمَّا کلمہ شرط ہے (جَآءَ. هُمْ) آئی۔ ان کے پاس كِتابٌ مِّنْ عِند اللّٰهِ (کتاب، اللہ کی طرف سے) مراد قرآن حکیم ہے۔ مُصَدِّقٌ ، اسم فاعل، تصدیق کرنے والا (صَدَّقَ، يُصَدِّقُ، تَصْدِيْقاً) تصدیق کرنا، باب تفعیل ہے لِمَا (لِ. ما) واسطے، اس کے جو (مَعَ. هُمْ) ہیں۔ ان کے ساتھ (پاس) تھی (تورات) یعنی قرآن حکیم تورات کی تصدیق کرتا ہے مگر اس کتاب کی جو ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی نہ کہ تحریف شدہ کتاب کی۔

﴿وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾

اور اس سے قبل وہ کفار کے مقابلہ میں فتح و نصرت کی دعائیں، مانگا کرتے تھے۔

وَكَانُوْا اور تھے وہ، كَانَ مضارع کے شروع میں لائیں تو ماضی استمراری بن جاتا ہے اور كَانَ کا صیغہ بھی فعل کے ساتھ بدلتا جاتا ہے، (اِسْتَفْتَحَ، يَسْتَفْتِحُ، اِسْتِفْتَاحٌ) فتح طلب کرنا عَلَى الَّذِيْنَ..... اوپر ان لوگوں کے کہ جنہوں نے (یعنی ان لوگوں کے خلاف) جنہوں نے كَفَرُوْا، کفر کیا، فعل ماضی جمع مذکر غائب۔ یہود مشرکین کو بتاتے کہ وہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر ان پر فتح حاصل کر لیں گے۔

﴿فَلَمَّا جَاءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ﴾

تو جب ان کے پاس وہ پہنچ گیا جسے انہوں نے پہچان لیا تو (از راہ تکبر) اس سے انکار کر دیا۔

فَلَمَّا کلمہ شرط (جاءَ. هُمْ) آیا، ان کے پاس، مَاعَرَفُوْا، جسے انہوں نے پہچان لیا (عَرَف، يَعْرِفُ، عِرْفَانٌ) جاننا پہچاننا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور قرآن کی حقانیت کو پالیا، كَفَرُوْا بِهٖ اس سے انکار کر دیا، فَلَعْنَةُ اللّٰهِ، پس اللہ کی لعنت ہے (یعنی رحمت سے دوری ہے) عَلَى الْكَافِرِيْن کفار پر۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے حد و حساب انعامات ملتے رہے، روحانی اصلاح کے لیے، انبیاء

کرام، مختلف اقوام اور مختلف ادوار میں تشریف لاتے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس طرح جسمانی اور مادی انعامات بھی ان گنت اور بے شمار ہیں، مگر بہت کم ہی انسان ان نعمتوں پر شاکر اور احسان مند ہوتے ہیں۔

(۲) ان آیات سے پتا چلتا ہے کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی آیات کا کفر کریں، یا ان میں تحریف و تبدیلی کریں، یا مسلسل ناشکری اور نافرمانی کریں تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے محروم ہو جاتے ہیں اور پھر یہ لوگ ایمان اور دین سے خالی اور اخلاق و اچھے اعمال سے تہی دامن بھی ہو جاتے ہیں جیسا کہ یہود کا حال ہو چکا تھا کہ دین حق روز روشن کی طرح واضح ہونے کے باوجود وہ اس سے فیض یاب نہ ہو سکے، وہ اپنے پندار اور غرور میں مارے گئے، ضد اور حسد کی بنا پر صداقت اور سچائی سے دور رہے، اگر نافرمانی سے یہود اس خسارے اور نقصان سے دوچار ہوئے تھے تو آج کے مسلمان اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن حکیم اور آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے منہ موڑ کر کیسے سرخرو ہو سکتے ہیں؟ ہمارے اسلاف کیوں معزز تھے اور ہم کیوں ذلیل و خوار ہیں؟

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ، فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ، وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۹۰)	”بہت بری ہے وہ قیمت جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا کہ انہوں نے اللہ کی نازل کردہ کتاب (قرآن) کا انکار کر دیا اس ضد (اور اس جلن) میں کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کیوں اپنے فضل سے (اپنی کتاب) نازل فرماتا ہے! (سو انکار کے سبب) وہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے اور ایسے کفار کیلئے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔“

بِئْسَمَا (بِئْسَ– مَا) بری ہے۔ وہ چیز جو، بِئْسَ کا مادہ بُؤْسٌ ہے جس کے معنی شدتِ کراہت کے ہیں۔

بَأْسٌ وَ بَأْسَاءُ، سختی، جنگ، عذاب۔ زجاج کا کہنا ہے کہ بَأْسٌ کے معنی بھوک کے ہیں اور بَأْسَاءُ اس تکلیف کو کہتے ہیں جس کا تعلق مالی مشکلات سے ہو، قرآن حکیم میں ہے:

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ (البقرہ۲:۱۷۷)

''اور سختی اور تکلیف اور معرکہ جنگ میں ثابت قدم رہیں''۔

لَا بَأْسَ محاورہ ہے جس کے معنی ہیں کوئی حرج نہیں، کوئی مضائقہ نہیں بِئْسَ کلمۂ ذم ہے (مذمت کے لیے بولا جاتا ہے) ایسے ہی عربی میں نِعْمَ (تعریف کے لیے بولا جاتا ہے)، اَلْبَائِسَ فقیر اور بے مایہ، زبوں حال شخص کو کہتے ہیں جیسا کہ وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْر (الحج:۲۸) ''اور فقیر اور درماندہ کو بھی کھلاؤ''

(لسان القرآن)

اِشْتَرَوْا، فعل ماضی جمع مذکر غائب، ان سب نے خریدا (اِشْتَرٰی، يَشْتَرِیْ، اِشْتِرَاءً) باب افتعال ہے خرید و فروخت دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یہاں پر بیچنے کے معنی میں ہے مَعْنَاهُ بَاعُوْا (بیضاوی) بِهٖ (بِ–ہٖ) بدلے۔ اس کے اَنْفُسَهُمْ (اَنْفُسَ–هُمْ) جانوں، اپنی۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ بہت بری ہے وہ قیمت جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا (Vile is that for which they have bartered their souls) یعنی انہوں نے قرآن حکیم ایسی عظیم کتاب اور خاتم النبیّن ایسے جلیل القدر نبی کا انکار کیا۔ ﴿اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا﴾ یہ کہ کفر کیا ساتھ اس کے جو اللہ نے نازل کیا، بَغْيًا۔ مفعول لَهٗ، فساد اور ظلم کی وجہ سے (grudging) ﴿اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ (نَزَّلَ. يُنَزِّلُ، تَنْزِيْلًا) حد سے بڑھ جانا، سرکشی اور ظلم پر اتر آنا، بغاوت کرنا۔ اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ، یہ کہ نازل کرتا ہے اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے (نَزَّلَ، يُنَزِّلُ، تَنْزِيْلًا) باب تفعیل نازل کرنا۔ مِنْ۔ سے (فَضْلِ.ہٖ) فضل، اپنے سے، عَلٰى۔ پر، مَنْ يَّشَآءُ جس پر وہ چاہے (شَاءَ. يَشَاءُ، مَشِيَّةٌ) چاہنا عِبَادَهٗ (عِبَادَ–هٗ) بندوں، اس کے عَبْدٌ کی جمع عِبَادٌ۔ ﴿فَبَاءُ وْ

بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ﴾ پس وہ لوٹے پے در پے غضب کے ساتھ (بَاءَ یَبُوءُ، بُوْأً) لوٹنا، واپس ہونا، عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا انکار کیا تو خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو بھی نظر انداز کر دیا، اس طرح غضب در غضب کے مستحق ٹھہرے۔ ﴿وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ﴾ وَلِلْکٰفِرِیْنَ (وَلِ. الْکٰفِرِیْنَ) اور، لئے، کفار کے، عَذَابٌ، عذاب مُّهِیْنٌ، رسوا کرنے والا۔ اسم فاعل، (اَهَانَ یُهِیْنُ اِهَانَةً) رسوا کرنا، ذلیل کرنا۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ یہودی حد درجہ خود غرض اور نفس پرست لوگ ہیں، وہ اس کے ساتھ ہی ضدی اور حاسد بھی ہیں وہ ہر بات کو حتی کہ اللہ کے احکام کو بھی تجارتی اور قومی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ان کا فائدہ ان احکام کی پیروی میں ہے یا ان کی نافرمانی میں، اگر ان احکام کو بدل کر یا ان سے سرکشی کر کے ان کی ذاتی غرضیں پوری ہوتی دکھائی دیں تو وہ ایسا کرنے سے ہرگز نہیں چوکتے۔

تعصب اور نفس پرستی کے نتیجہ میں ان کے اندر حسد بڑی شدت سے پیدا ہوا، چونکہ وہ چاہتے تھے کہ ہر قسم کی نعمت ان کے حصہ میں آئے گویا یہ ان کا پیدائشی حق ہے، ان کے اعمال کچھ بھی ہوں، ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ان کے شامل حال رہیں گی۔

جب حضرت محمد نبی آخر الزمان کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تو یہود نے بہت پیچ و تاب کھائے، ان کے اندر حسد کی آگ بھڑک اٹھی کہ نبوت ان کے اپنے خاندان سے نکل کر بنی اسماعیل میں کیوں چلی گئی، حالانکہ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے اپنا فضل کرتا ہے اور اس کو نبوت و رسالت عطا کرتا ہے لیکن یہودیوں نے ضد میں آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے سے انکار کر دیا اور حق کی طرف رخ نہ کیا۔

یہود کے مسلسل کفر و انکار کی پاداش میں دنیا کے اندر اللہ کا غصہ ان پر نازل ہوا اور قیامت میں بھی ان پر بڑی ذلت اور رسوائی والا عذاب ہوگا کیونکہ وہ منکر ہونے کے علاوہ ضدی اور حاسد بھی ہیں۔''

(درس قرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) شعور، بصیرت اور عقل و فہم سے انسان کے لیے کامیابی کی منزل روشن اور واضح ہو جاتی ہے، قرآن حکیم نے بار بار انسانوں کے دلوں پر دستک دی ہے، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ؟ کیا تم عقل و فکر سے

کام نہیں لیتے، کیا تم دیکھتے بھالتے نہیں؟

(۲) ضد اور حسد سے کبھی حق کی روشنی نہیں مل سکتی، یہود اور نصاریٰ (اہل کتاب) کو یہی روش سچائی سے دور لے گئی، اگر آج کے مسلمان بھی اسی طریق کار کو اختیار کریں گے تو ذلت اور تباہی ان کا بھی مقدر ٹھہرے گی، سچائی اور راست بازی کسی کی میراث نہیں جو بھی اسے اختیار کرے گا کامیابی اس کے قدم چومے گی اور جو بھی اس سے روگردانی کرے گا خائب وخاسر ہوگا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ، قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ، وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ، قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۹۱)	''اور جب ان (یہود) سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس کتاب پر جو اللہ نے (محمد ﷺ پر) نازل فرمائی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم (تو صرف) اس کو مانتے ہیں جو ہم پر اتری ہے (یعنی تورات) اور اس کے سوا (جو کتب سماویہ ہیں) ان کو وہ نہیں مانتے حالانکہ وہ (قرآن) برحق ہے جو اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے (یعنی اصل تورات کی نہ کہ تحریف شدہ نسخہ کی) جو ان کے پاس ہے، آپ پوچھیے کہ اگر تم ایمان لانے والے ہو تو اس سے قبل اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے ہو (یہ تو سراسر ایمان کے منافی عمل ہے)۔''

اِذَا، کلمہ شرطیہ، قِيْلَ، فعل ماضی مجہول کہا جاتا ہے، اِذَا کے بعد ماضی کا ترجمہ حال میں کیا جاتا ہے (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا اٰمِنُوْا۔ تم سب ایمان لاؤ فعل امر جمع مذکر (اٰمَنَ يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا) ایمان لانا، بِمَآ (بِ—مَا) ساتھ۔ اس پر جو اَنْزَلَ اللّٰهُ، اللہ نے نازل کیا (یعنی قرآن حکیم خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ نے نازل کیا)، قَالُوْا. انہوں نے (یعنی یہود نے) کہا، نُؤْمِنُ ہم ایمان لائیں گے،

بِمَآ۔ ساتھ اس کے جو اُنْزِلَ۔ نازل کیا گیا (اَنْزَلَ) نازل کیا، ماضی مجہول اُنْزِلَ نازل کیا گیا عَلَيْنَا (علٰی. نَا) پر، ہم یعنی ہم پر تورات نازل کی گئی (سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ انہیں تورات دی گئی) وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَ هٗ، وَ يَكْفُرُوْنَ اور وہ کفر کرتے ہیں انکار کرتے ہیں، مضارع جمع مذکر غائب (كَفَرَ. يَكْفُرُ، كُفْرًا) بِمَا (بِ. مَا) ساتھ اس کے۔ جو، وَرَآءَ هٗ (وَرَاء. هٗ) علاوہ (سوا) اس کے (یعنی تورات کے) تورات کے سوا دوسری کتب سماویہ کا انکار کرتے ہیں، وَهُوَ الْحَقُّ اور وہ (قرآن) اَلْحَقُّ۔ حق اور ثابت شدہ امر ہے مُصَدِّقٌ، اسم فاعل تصدیق کرنے والا ہے (صَدَّقَ، يُصَدِّقُ، تَصْدِيْقًا) باب تفعیل ہے، تصدیق کرنا، سچ گردانا لِمَا (لِ۔مَا) واسطے اس کے۔ جو، یعنی اس کتاب کی جو مَعَهُمْ، (مَعَ۔ هُمْ) پاس، ان کے ہے یعنی قرآن تورات کی تصدیق کرتا ہے (وہ نسخہ جو آسمان سے نازل ہوا تھا نہ کہ اس تحریف شدہ نسخہ کی جو ان کے پاس ہے) قُلْ فعل امر واحد مذکر۔ کہہ دیجئے (قَالَ يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، فَلِمَ (فَ۔لِمَ) پس۔ کیوں؟ حرف استفہام، تَقْتُلُوْنَ۔ تم قتل کرتے ہو جمع مذکر مخاطب۔ فعل مضارع (قَتَلَ، يَقْتُلُ، قَتْلًا) اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ اللہ کے نبیوں کو، نبیٌّ مفرد ہے، احکام الٰہی کی خبر دینے والا مِنْ قَبْلُ اس سے قبل، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اگر تم تھے مومن۔ اِنْ حرف شرط، اگر، كُنْتُمْ، ماضی جمع مذکر مخاطب، (كَانَ يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، مُؤْمِنِيْنَ مومن کی جمع۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہودیوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے دل تو پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ کے ان احکام سے بھرے ہوئے ہیں جو ہماری آسمانی کتاب تورات میں موجود ہیں۔ اس لیے ہمیں کسی نئی تعلیم اور نئی وحی وغیرہ کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان لوگوں کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کیونکہ وہ اپنی آسمانی کتاب کو بھی پوری طرح سے نہیں مانتے اور اس کے احکام کی پیروی نہیں کرتے اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے نبیوں کو جھٹلاتے رہے ہیں بلکہ بعض کو انہوں نے قتل ہی کر دیا ہے، اگر اس کتاب اور اس کے احکام پر ان کا ایمان پختہ ہوتا تو وہ ہرگز ایسے نافرمان نہ ہوتے۔

یہ دلیل پیش کر کے اللہ تعالیٰ انہیں یہ تنبیہ کرتا ہے، کہ تم راہ راست سے بالکل بھٹک چکے ہو اور دین

حق کو چھوڑ چکے ہو، اس لیے تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ دین اسلام کو اختیار کرلو، اور قرآن مجید کو مان لو، یہ آخری آسمانی کتاب ہے، یہ کتاب خود تمہاری کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور (مسائل) اصلاح شدہ شکل میں پیش کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب کو مانے بغیر تمہارا اپنی کتاب (تورات) کے ماننے کا دعویٰ بالکل غلط ہے۔ (درس قرآن)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) قرآن حکیم ان تمام صداقتوں کی تصدیق کرتا ہے جو سابقہ کتب آسمانی میں موجود تھیں اور صداقت ہمیشہ صداقت ہی رہتی ہے، خواہ وہ تورات میں ہو یا انجیل میں، زبور میں ہو یا قرآن میں، ان سب کو ماننا اور تسلیم کرنا ہی حقیقی ایمان ہے، اگر اس میں سے کسی کتاب کا انکار کر دیا جائے تو گویا اس صداقت کی نفی ہو جائے گی جس کی تصدیق قرآن کر رہا ہے، اس طرح ایمان ضائع ہو جائے گا مگر ہمارا ایمان ٹھیک ان الفاظ اور ان کتب آسمانی پر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام پر نازل کی گئی تھیں نہ کہ ان تحریف شدہ نسخوں پر جو یہود و نصاریٰ کے پاس ہیں جن کی اصل زبان تک محفوظ نہیں ہے، جبکہ قرآن حکیم عربی زبان میں نازل ہوا اور الحمدللہ آج تک محفوظ ہے۔ اس کی حفاظت نہ صرف کتابی شکل میں ہے بلکہ یہ سینوں میں بھی محفوظ ہے۔ چھ سات برس کا ایک ننھا سا بچہ اسے اللہ کے فضل سے ضبط کر لیتا ہے اور رمضان المبارک میں ہزاروں لوگوں کی امامت کرتے ہوئے اسے سنا ڈالتا ہے۔

(۲) اگر یہود نے انبیاء کرام کے ساتھ گستاخی کر کے ذلت وخواری اٹھائی اور اپنی آخرت کو تباہ و برباد کیا تو کیا مسلمان سید المرسلین، خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وسیرت سے روگردانی کر کے سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں؟

وَلَقَدْ جَآءَ كُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۹۲) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ، خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا، قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا، وَ اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ، قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۹۳)	''تمہارے پاس موسیٰ کیسے واضح معجزے لے کر آئے تھے پھر تم نے ان (طور پر جانے) کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ہی تو ظالم لوگ ہو (کہ شرک ظلم عظیم ہے) اور (یاد کرو) جب ہم نے طور کو تمہارے اوپر معلق کر کے تم سے اقرار لیا کہ جو کتاب (تورات) ہم نے تمہیں دی ہے اس پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونا اور غور سے سننا (خوف کے مارے) زبان سے تو کہہ دیا کہ ہم نے سن لیا اور (دل سے کہا) ہم مانیں گے نہیں، (اس لیے کہ) کفر کے سبب بچھڑے (کی محبت) ان کے دلوں میں رچ بس گئی تھی، آپ ان سے کہیے اگر تم مومن ہو (تو سن لو) کہ تمہارا ایمان تمہیں بری باتوں کا حکم دیتا ہے۔''

﴿وَلَقَدْ جَآءَ كُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ﴾

اور بے شک آئے تمہارے پاس موسیٰ واضح نشانیاں لے کر۔

لَقَدْ (لَ–قَدْ) البتہ بے شک، لام زبر کے ساتھ تاکید کے لیے آتا ہے، قَدْ بھی تحقیق پیدا کرتا ہے، گویا لَقَدْ جملے کے شروع میں زبردست تاکید پیدا کر دیتا ہے، (جَاءَ– كُمْ) آئے تمہارے پاس (جَاءَ، يَجِيءُ) آنا، موسیٰ۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام، (بِ– الْبَيِّنَات) ساتھ۔ واضح معجزات کے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کھلے ہوئے نشانات اور معجزات جو فرعون کے مقابلہ میں تھے۔ عَصَا اور يَدِ بَيْضَا وغیرہ وہ تو مشہور ہی ہیں لیکن جَاءَ كُمْ سے اشارہ یہ نکلتا ہے کہ کچھ معجزات موسوی خود بنی اسرائیل کے لیے بھی تھے۔

(تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ پھر تم نے ٹھہرالیا (معبود) بچھڑے کو ثُمَّ، حرف عطف ہے، ترتیب کے لیے آتا ہے، اِتَّخَذْتُمْ ماضی جمع مذکر مخاطب (اِتَّخَذَ، یَتَّخِذُ، اِتِّخَاذًا) پکڑنا، ٹھہرانا الْعِجْلَ، بچھڑا، اِتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا مِنْۢ بَعْدِهٖ ان کے بعد یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کے بعد، وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ اور تم ظلم کرنے والے ہو۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''یہ یہود کے دعوائے ایمان کی مزید تردید ہے اور اس تردید کا خاص پہلو یہ ہے کہ ان کی ابتدائی تاریخ کے واقعۂ گوسالہ پرستی کو یاد دلا کر ان کی سرزنش کی گئی ہے کہ آج تم نے اپنے ایمان اور اپنی دینداری کی حکایت اتنی بڑھا رکھی ہے کہ نہ قرآن کو خاطر میں لانے کے لیے تیار ہو نہ پیغمبر آخر الزمان کو، حالانکہ تمہارے اس ایمان کا حال آج تو درکنار شروع سے یہ رہا ہے کہ عین موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں، ان کے کھلے کھلے معجزات کو دیکھتے ہوئے تم نے اپنے رب کو چھوڑ کر ایک بچھڑے کی عبادت شروع کر دی۔

یہود کے اسی قسم کے فخر پر بعض پچھلے انبیاء نے بھی ان کو سرزنش کی ہے اور اس واقعہ گوسالہ پرستی کی طرف تعریض کرتے ہوئے یہ الفاظ تک فرمائے ہیں کہ ''اے اسرائیل (بنی اسرائیل) تو، تو وہ ہے کہ تو نے پہلی شب میں بے وفائی کی'' قرآن کے الفاظ اس کے اپنے مرتبہ کے شایان شان ہیں لیکن بات وہی کہی گئی ہے جو سابق انبیاء نے فرمائی تھی۔

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ٹھیک ٹھیک وَاَنْتُمْ مُشْرِكُوْنَ کے معنی میں ہے، قرآن میں شرک کو متعدد مقامات میں ظلم کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، ظلم کا اصلی مفہوم حق تلفی ہے، حقوق اللہ اور خود اپنے نفس کی جو حق تلفی، آدمی شرک کا ارتکاب کر کے کرتا ہے وہ کسی بھی اور دوسرے طریقہ سے نہیں کرتا، اس کی وضاحت قرآن مجید نے متعدد مقامات میں کی ہے، اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ'' (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ، خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا، قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا، وَ اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ، قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے طور کو تمہارے اوپر معلق کر کے تم سے اقرار لیا کہ جو کتاب (تورات) ہم نے

تمہیں دی ہے اس پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونا اور غور سے سننا (خوف کے مارے) زبان سے تو کہہ دیا کہ ہم نے سن لیا اور (دل سے کہا) ہم مانیں گے نہیں، (اس لیے کہ) کفر کے سبب بچھڑے (کی محبت) ان کے دلوں میں رچ بس گئی تھی، آپ ان سے کہئے اگر تم مومن ہو (تو سن لو) کہ تمہارا ایمان تمہیں بری باتوں کا حکم دیتا ہے۔

وَاِذْ اور جب، اور وہ وقت یاد کرو اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ ہم نے لیا پختہ وعدہ (اَخَذَ، یَأْخُذُ، اَخْذًا) لینا، (مِیْثَاقَ. کُمْ) پختہ عہد۔ تم سے and (remember) when we took your covenant وَ رَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ، اور ہم نے بلند کیا، اوپر تمہارے کوہ طور کو رَفَعْنَا (رَفَعَ یَرْفَعُ، رَفْعًا) بلند کرنا، اٹھانا، رَفَعْنَا، صیغہ ماضی جمع متکلم اللہ تعالیٰ کے لیے جمع کا صیغہ بطور عزت آتا ہے، بلاشبہ وہ واحد ہے، الطُّوْرَ، ہر پہاڑ کو طور کہہ سکتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں طور سے مخصوص پہاڑ جبل سینا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے سروں پر جبل سینا کو سائبان کی طرح لاکر کھڑا کر دیا کہ شاید خوف سے احکامات الٰہی کو سنیں اور اطاعت کریں، وقتی طور پر تو انہوں نے عہد کر لیا مگر جونہی وہ پہاڑ رب کریم کے حکم سے سروں سے ہٹ گیا تو نافرمانی پر اتر آئے (خلاصہ تفسیر ابن کثیر) خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ پکڑو (عمل پیرا ہو جاؤ) اس کو جو ہم نے دی (یعنی تورات) تم کو، مضبوطی کے ساتھ، (اَخَذَ. یَأْخُذُ اَخْذًا) پکڑنا، پکڑنے سے مراد عمل پیرا ہونا ہے مَا (جو) (اٰتَیْنَا. کُمْ) ہم نے عطا کی، تمہیں (اٰتٰی، یُؤْتِیْ) دینا، عطا کرنا، بِقُوَّۃٍ، قوت کے ساتھ پختہ عزم سے Hold firmly to what we have given to you (act upon its teachings) وَ اسْمَعُوْا، اور سنو (سَمِعَ، یَسْمَعُ، سَمْعًا) سننا، یعنی سن کر دل میں جگہ دینا، قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَا، ان لوگوں نے کہا ہم نے سنا (زبان سے) اور نافرمانی کی (دل سے)، (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، (سَمِعَ، یَسْمَعُ، سَمْعًا) سننا، (عَصٰی، یَعْصِیْ، عِصْیَانٌ) نافرمانی کرنا، گویا کہ انہوں نے سنی ان سنی کر دی، کسی فرد اور قوم کی یہ حرکت انتہائی مذموم ہے، کہ وہ حق بات کو سمجھتے بوجھتے نافرمانی پر اُتر آئے، وہ شرف انسانیت سے محروم ہے، اور اجر و ثواب سے یکسر خالی ہے، وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْعِجْلَ بِکُفْرِھِمْ، اور وہ پلائے گئے (اور ڈال دی گئی) ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت ان کے کفر کی وجہ سے، (اَشْرَبَ یُشْرِبُ) باب افعال، پلانا اُشْرِبُوْا، فعل ماضی مجہول اِشْرَابُ جمع مذکر غائب، فِیْ قُلُوْبِھِمْ، قلب کی جمع قلوب، دل، الْعِجْلَ، بچھڑا، یَشْرَبُ۔ خود پانی پینا اور اَشْرَبَ

یُشْرِبُ۔ کسی کو پلانا، شَرَابٌ شربت، مشروب پینے کی چیز، جس طرح پانی جسم کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے اسی طرح عربی زبان میں کسی چیز سے انتہائی محبت کو پینے کی چیز سے تشبیہہ دی گئی ہے، وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ کے معنی یوں ہوئے کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں سرایت کر گئی (رچ بس گئی) بِكُفْرِهِمْ (بِ– كُفْرِهِمْ) بسبب ان کے کفر کے، ب وجہ اور سبب کو ظاہر کرتا ہے، قُلْ کہو (قَال، يَقُوْلُ، قَوْلًا اور اس سے فعل امر قُلْ) بِئْسَمَا (بِئْسَ–مَا) برا ہے۔ جو، بِئْسَ کلمہ خدمت ہے يَأْمُرُكُمْ (يَأْمُرُ– كُمْ) حکم دیتا ہے، تمہیں بِهٖ ساتھ اس کے اِيْمَانُكُمْ (اِيْمَانُ–كُمْ) ایمان۔ تمہارا یعنی تمہارا طرز عمل سراسر ایمان کے منافی ہے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، اگر تم مومن ہو، ایمان کا دعویٰ کرتے ہوئے خلافِ ایمان عمل کرنا گویا کہ عملی طور پر ایمان کی نفی ہے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) جب انسان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عقل وشعور کی نعمت پس پشت ڈال دیتے ہیں اور وحی الٰہی جو اس شعور پر دستک دیتی ہے اسے بھی نظر انداز کر دیتے ہیں تو پھر وہ قعر مذلت میں جا گرتے ہیں (جیسا کہ قوم بنی اسرائیل) پھر ان کی روح اس قدر کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے سے حقیر چیز کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام قوم کے لیے نسخہ ہدایت لینے کے لیے کوہ طور پر گئے اور ان کی عدم موجودگی میں قوم مٹی کے بنے ہوئے بچھڑے کی پرستش کرنے لگی۔

۲) کتاب الٰہی دلوں کے لیے روشنی کا سامان ہوتی ہے، اس کی پاکیزہ اور مصفیٰ تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ہی دنیا وآخرت میں کامیابی کی نوید ہے، مسلسل اور پیہم نافرمانی اور سرکشی سے دل سخت ہو جاتے ہیں اور حق وصداقت کی راہ روشن ہونے کے باوجود اچھی نہیں لگتی اور برائیوں میں مزا آنے لگتا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کے لیے شرک ایسی برائی ہی پسندیدہ عمل بن گئی تھی، آج امت مسلمہ بھی کتاب الٰہی اور اس کی روشن تعلیمات سے منہ موڑ چکی ہے، یہی اس کی ذلت ورسوائی کا سبب ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۹۴) وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ (۹۵)	''اے نبیؐ! (ان یہود سے) کہہ دیجیے کہ اگر اللہ کے ہاں آخرت کا گھر دوسرے تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے مخصوص ہے، تم اگر اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو تو پھر مرنے کی تمنا کرو (کہ جلد وہاں پہنچ جاؤ) یقین جانو کہ یہ لوگ ایسی تمنا کبھی نہیں کریں گے کیونکہ انہوں نے (گناہوں کے کام) آگے بھیجے ہیں اللہ تو ظالموں کے (ڈھکے چھپے) حال سے باخبر ہے۔''

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

اے نبیؐ! (ان یہود سے) کہہ دیجیے کہ اگر اللہ کے ہاں آخرت کا گھر دوسرے تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے مخصوص ہے، تم اگر اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو تو پھر مرنے کی تمنا کرو (کہ جلد وہاں پہنچ جاؤ)۔

قُلْ۔ فعل امر واحد مذکر (قَالَ، يَقُوْلُ قَوْلًا) کہنا، اِنْ شرطیہ ہے، كَانَتْ ہے، واحد مونث غائب (كَانَ، يَكُوْنُ كَوْنًا) ہونا الدَّارُ الْاٰخِرَةُ، آخرت کا گھر، اس سے مراد جنت اور وہاں کے انعامات ہیں، عِنْدَ اللّٰهِ، اللہ کے پاس خَالِصَةً، (خ ل ص) اس کا مادہ (Root Word) خَلَصَ يَخْلُصُ، مخصوص ہونا، اس سے اسم فاعل خَالِصٌ اور خَالِصَةٌ، واحد مونث کا صیغہ کیونکہ دار عربی میں مونث استعمال ہوتا ہے خَالِصَةً، كَانَتْ کی خبر ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے، مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ لوگوں کو چھوڑ کر، فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ، پس تم تمنا کرو، موت کی، (تَمَنّٰى، يَتَمَنّٰى، تَمَنِّيًا) باب تفعیل ہے، خواہش کرنا، تمنا کرنا (ف۔ تَمَنَّوْا) پس، تم تمنا کرو، فعل امر جمع مذکر حاضر، اِنْ حرفِ شرط ہے، كُنْتُمْ ہو تم (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، صٰدِقِيْنَ، سچے، صَادِقُوْنَ اسم فاعل ہے، حالت نصبی ہونے کی بنا پر صَادِقِيْنَ میں تبدیل ہوا۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے ایک اور عقیدے کی تردید فرمائی ہے، یہودیوں نے من گھڑت اور جھوٹی آرزوئیں قائم کر رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ موت کے بعد صرف وہی جنت میں جائیں گے اور وہ جنت کے تنہا وارث ہوں گے، ان کے سوا دنیا کی کوئی قوم نہ بخشی جائے گی اور نہ جنت میں داخل ہوگی۔ (ملاحظہ ہو سورہ بقرہ کی آیت: ۱۱۱ اور آیت: ۸۰)

ان کے اس من گھڑت اور جھوٹے عقیدے کو اللہ تعالیٰ نے نہایت عام فہم دلیل سے غلط ثابت کر دیا ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ان یہودیوں سے کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ جنت کے تنہا تم ہی وارث ہو اور تم ضرور جنت میں جاؤ گے تو پھر موت کی تمنا کر کے دکھاؤ کیونکہ جس شخص کو یہ یقین ہو کہ مرنے کے بعد وہ لازمی طور پر بہشت میں جائے گا، اسے موت کی تمنا کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ اس دنیا میں تو بے شمار تکلیفیں اور مصیبتیں ہیں، جنت میں ہر قسم کی آسائشیں اور نعمتیں ہوں گی، اس لیے جو شخص بہشت کا وارث ہونے کا دعویٰ کرے، اسے چاہیے کہ جتنی جلدی ہو سکے، اس دنیا کو خیر باد کہہ کر اس دنیا کا رخ کرے تاکہ ان مصائب سے نجات پا کر ہمیشہ کے آرام کی زندگی حاصل کر سکے، علامہ اقبالؒ کا ایک فارسی شعر ہے:

نشانِ مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

(یعنی مومن کی شان تو یہ ہے کہ موت کے وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے)

یہی دلیل یہودیوں کے سامنے پیش کی گئی، کہ اگر تمہیں پورا یقین ہے کہ جنت صرف تمہارے ہی لیے ہے اور وہاں سوائے تمہارے اور کوئی قوم نہیں جائے گی، تو اپنے اس دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے موت کی تمنا کر کے دکھاؤ۔'' (درس قرآن، جلد اول)

﴿وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾

یقین جانو کہ یہ لوگ ایسی تمنا کبھی نہیں کریں گے کیونکہ انہوں نے (گناہوں کے کام) آگے بھیجے ہیں اللہ تو ظالموں کے (ڈھکے چھپے) حال سے باخبر ہے۔

وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ اَبَدًا، اوروہ کبھی بھی تمنا نہ کریں گے اس کی (یعنی موت کی) وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ، مضارع منفی تاکید بلَنْ صیغہ جمع مذکر غائب، اَبَدًا کبھی بھی، بِمَا (بِ–مَا) سبب اس کے جو (یعنی اس کی وجہ یہ ہے) قَدَّمَتْ، آگے بھیجا (قَدَّمَ يُقَدِّمُ، تَقْدِيْمٌ) آگے بھیجنا، (اَيْدِى هِمْ) ہاتھوں۔ان کے یعنی جو اعمال انہوں نے آگے بھیجے ہیں، وہ انہیں اچھی طرح جانتے بوجھتے ہیں کہ وہ اعمال خیر نہیں بلکہ اعمال بد ہیں اس لیے وہ کبھی بھی موت کی تمنا نہ کریں گے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، (عَلِمَ يَعْلَمُ) جاننا اور اسم مبالغہ عَلِيْمٌ خوب جاننے والا، (بِ الظّٰلِمِيْنَ) ظالموں کو، یہود کو دنیا اور دنیاوی زندگی سے بڑی شدید محبت ہے اس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) جو شخص ایمان لانے کے بعد اپنی ہر متاعِ حیات کائنات کے خالق و مالک کے لیے قربان کرنے کو تیار نہیں، اسے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے آپ کو محبوب الٰہی کے نام سے مشہور کرے اور وہ شخص ہرگز قابل اعتماد نہیں۔

۲) صرف اور صرف اعمال صالحہ اطمینان وطمانیت کا باعث بنتے ہیں جو نہ صرف اس دنیا میں بلکہ ابدی زندگی میں بھی دائمی سرور بخشتے ہیں۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ، وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا، يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ، وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (۹۶)	اور آپ (یہود کو) سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پائیں گے حتیٰ کہ یہ اس معاملے میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں، ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزار برس جیے حالانکہ لمبی عمر بہرحال اسے عذاب سے تو دور نہیں پھینک سکتی، جیسے کچھ اعمال یہ کر رہے ہیں، اللہ تو انہیں دیکھ ہی رہا ہے۔

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ، وَّمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا﴾

اور آپ (یہود کو) سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پائیں گے حتیٰ کہ یہ اس معاملے میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ، اور البتہ پائیں گے آپ ان کو، (وَ– لَ– تَجِدَنَّ– هُمْ) وَجَدَ، يَجِدُ، وِجْدَانًا۔ پانا، تَجِدُ۔ فعل مضارع واحد مذکر حاضر، نون مشدد ساتھ لگانے سے تاکید پیدا ہوتی ہے تَجِدَنَّ کے معنی یہ ہوئے کہ آپ انہیں ضرور بضرور پائیں گے اور شروع میں لام زبر کے ساتھ لانے سے مزید تاکید پیدا ہوگئی، اَحْرَصَ النَّاسِ لوگوں میں سب سے زیادہ حریص، (حَرِصَ، يَحْرَصُ حِرْصًا) حرص کرنا، تمنا رکھنا، حَرِيْصٌ سے اسم تفضیل، اَحْرَصُ یعنی حریص ترین (Superlative Degree) ہے وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا، اور ان لوگوں (میں سے بھی زیادہ) جنہوں نے شرک کیا (اَشْرَكَ يُشْرِكُ اِشْرَاكًا) شرک کرنا، اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور اس کے اختیارات میں کسی کو شریک کرنا جو کہ قرآن حکیم میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمٰن:۱۳) ''شرک تو بہت بڑا ظلم ہے''۔ اس پوری کائنات کا خالق و مالک تنہا اللہ تعالیٰ ہے، اس کے ساتھ کسی اور کو شامل کرنا سب سے بڑی نادانی ہے اور یہ ایسی حماقت ہے کہ جب تک زندگی میں سچے دل سے توبہ نہ کر لی جائے آخرت میں بھی معافی نہیں ہو سکے گی۔

ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ، وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا (النساء۴:۴۸)

سید مودودیؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بس شرک نہ کرے باقی دوسرے گناہ دِل کھول کر کرتا رہے، بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک جس کو ان لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا تھا، تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے حتیٰ کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ معاف نہیں کیا جا سکتا، علماء یہود شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے، بلکہ ان کا سارا وقت ان

جزئیات کی ناپ تول ہی میں گزرتا تھا جوان کے فقیہوں نے استنباط در استنباط کر کے نکالے تھے، مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہلکا فعل تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میں انہیں کوئی مضائقہ نظر آتا تھا۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿یَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾

چاہتا ہے ان میں سے ہر ایک کہ کاش وہ زندہ رہے ہزار سال۔

یَوَدُّ (وَدَّ، یَوَدُّ، وُدًّا) آرزو رکھنا، شدید خواہش کرنا، اَحَدُھُمْ، ان میں سے ہر ایک، ھُمْ کی ضمیر یہود کی طرف جاتی ہے، لَوْ، کلمہ تمنا ہے، کاش کہ، یُعَمَّرُ اس کا مادہ (ع م ر) ہے عَمَّرَ یُعَمِّرُ تَعْمِیْرًا، آباد کرنا، عمر بڑھانا، لَوْ یَطُوْلُ عُمُرُہٗ کاش کہ اس کی عمر طویل ہو جائے، اَلْفَ (ہزار) سَنَةٍ (سال) ہر یہودی کی یہ خواہش اور آرزو ہوتی ہے کہ وہ ہزاروں سال زندہ رہے اس کے برعکس مومنوں کی انتہائی آرزو اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور جلد از جلد پہنچ جائیں۔

مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''اس میں حیرت واستعجاب کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین عرب تو آخرت کے منکر تھے، ان کی بہار اور عیش تو جو کچھ ہے دنیا ہی ہے اس لیے وہ اگر طویل عمر کی تمنا کریں تو چنداں عجیب نہیں، مگر یہود تو آخرت کے قائل اور بزعم خود آخرت کی نعمتوں کا اپنے آپ ہی کو مستحق کہتے تھے، پھر بھی وہ دنیا میں رہنے کی تمنا کریں یہ ہے حیرت وتعجب کی بات۔

پس باوجود اعتقادِ آخرت کے طولِ عمر کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نعمت اخروی کا اپنے آپ کو مستحق سمجھنے کا دعویٰ صرف دعوی ہی ہے، حقیقت جو ہے اس کو یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر جہنم ہی ٹھکانا بنے گا، اس لیے جب تک بچے رہیں تب تک ہی سہی!'' (معارف القرآن، جلد اول)

﴿وَمَاھُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ﴾

حالانکہ لمبی عمر، بہر حال اسے عذاب سے تو دور نہیں پھینک سکتی۔

مَا یہاں نفی کے معنی دیتا ہے، هُوَ ضمیر اس شخص کی طرف ہے جو یہ تمنا رکھتا ہے (بِ- مُزَحْزِحِ- ہٖ) دور کرنے والا۔ اس کو مِنَ الْعَذَابِ (عذاب سے) یعنی اس طولانی عمر کے باوجود وہ عذاب سے نہیں بچ سکتا، (زَحْزَحَ یُزَحْزِحُ) دور ہٹانا زَحَّ اس کا مادہ ہے کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا دینے کو کہتے ہیں اَنْ (یہ کہ) یُعَمَّرَ (اسے عمر دی جائے)،

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ، بَصِيْرٌ دیکھنے والا ہے بَصِرٌ اس کا مادہ ہے قوتِ بصارت۔ دیکھنے کی قوت بصیر صفت ہے وہ ذات جسے باریک سے باریک چیز کی بھی خبر ہے، کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں بلکہ ظاہر ہے بِمَا (بِ- مَا) ساتھ۔ اس کے جو یَعْمَلُوْنَ وہ عمل کرتے ہیں، فعل مضارع جمع مذکر غائب (عَمِلَ، یَعْمَلُ، عَمَـلًا) عمل کرنا، زندگی گزارنا اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے اور وہ ہر بات کو دیکھتا ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) ایمان تقاضا کرتا ہے کہ بندۂ مومن کی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے بڑھ کر ہو، ارشاد ہوتا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرہ۲:۱۶۵) ''اور اہل ایمان سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں''۔ اور ان کے جینے کا مقصد محض مولا و مالک کی رضا ہوتی ہے، وہ اس کی رضا حاصل کرنے کیلئے زندگی کو اعمال صالحہ سے مزیّن کرتے ہیں اور اس کے ہاں حاضری کی تمنا رکھتے ہیں، جبکہ دوسرے لوگوں کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

۲) زندگی کی قدر و قیمت طولانیِ عمر سے نہیں بلکہ اعمالِ حسنہ سے پڑتی ہے، دیکھئے پھول کی زندگی کتنی مختصر ہوتی ہے مگر اس مختصر عمر میں وہ فیض رسانی کا کتنا سامان کر جاتا ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۹۷) مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ (۹۸)	''آپؐ (ان یہود سے) کہہ دیجیے کہ جو جبریل کا دشمن ہے۔ (اسے معلوم ہونا چاہیے) کہ جبریل ہی نے تو اس قرآن کو اللہ کے حکم سے آپؐ کے دل پر اتارا ہے جو اپنے سے پہلی (آسمانی) کتب کی تصدیق کرتا ہے اور مومنوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے، (اگر جبریل سے ان کی عداوت کا سبب یہی ہے، تو کہہ دیجئے کہ) جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں، اور جبریل اور میکائیل کے دشمن ہیں تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کافروں کا دشمن ہے۔''

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ﴾ آپؐ (ان یہود سے) کہہ دیجیے کہ جو جبریل کا دشمن ہے۔

قُلْ فعل امر واحد مذکر، کہہ دیجئے (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا مَنْ جو کوئی اسم موصول، اکثر ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ كَانَ ہے (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، عَدُوًّا، دشمن، جِبْرِيْلَ، یہ جلیل القدر ملائکہ میں سے ہیں اور ان کا شمار ملائکہ مقربین میں سے ہوتا ہے۔ انبیاء کرام پر وحی لاتے رہے جبریل کے معنی عبداللہ (اللہ کا بندہ) ہے ملائکہ بھی انسانوں کی طرح اللہ کے بندے ہیں، یہ خالق کائنات کے کسی بھی امر میں دخیل نہیں بلکہ مامور ہیں اور اس کی تسبیح و تقدیس میں شب و روز مصروف ہیں اور اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری بجالاتے ہیں۔

''فرشتے اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہتے اور اہل زمین کے لیے (رب کے حضور) معافی مانگتے رہتے ہیں'' (الشوریٰ ۴۲:۵) اور خاص طور پر اہل ایمان کے لیے (دیکھیے المومن ۴۰:۷) اللہ کے حکم سے وہ جنگ کے مواقع پر اہل ایمان کی مدد بھی کرتے ہیں (دیکھیے ال عمران ۳:۱۲۵) وہ انسانوں کے اعمال ہر وقت لکھتے اور درج کرتے ہیں (الزخرف ۴۳:۸۰) زندگی کے اعمال ہی نہیں بلکہ ہر لفظ اور قول کو نوٹ کرتے ہیں (ق ۵۰:۱۸، الانفطار ۸۲:۱۱-۱۲، الطارق ۸۶:۴) مومنوں کے لیے موت کے وقت خوشخبری اور تسلی

کے ساتھ آتے ہیں (حٰم السجدہ ۴۱:۳۰) جنت میں داخلے کے وقت ایمان والوں کا استقبال کرتے ہیں اور ان پر سلام بھیجتے ہیں (النحل ۱۶:۳۲) لیل ونہار اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنے میں تھکتے نہیں ہیں (حٰم السجدہ ۴۱:۳۸) اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے رہتے ہیں اور مومنوں کو بھی ایسا کرنے کا حکم ہے (الاحزاب ۲۳:۵۶) اور ہر وقت احکام الٰہی کو بجالاتے (التحریم:۶) ان ملائکہ میں سے جبریل امین سب سے زیادہ ذی مرتبہ ہیں اور انبیاء کرام پر وحی لاتے رہے ہیں ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (فَ- اِنَّهٗ) پس بے شک اس نے، هٗ کی ضمیر جبریل کی طرف ہے، نَزَّلَهٗ (نَزَّل-هٗ) نازل کیا، اسے، یہاں پر هٗ کی ضمیر قرآن کی طرف ہے، عَلٰى پر قَلْبِكَ (قَلْبِ-كَ) دل، آپ کے، ک کی ضمیر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ اللہ کے حکم سے یعنی جبریل نے یہ قرآن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نازل کیا۔ اپنی مرضی اور اختیار سے نہیں کیا، لہٰذا جبریل سے عداوت اللہ سے دشمنی کے مترادف ہے۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی ایک اور جھوٹی اور بے معنی دلیل کی قلعی کھول دی ہے، یہودی کہتے تھے کہ ہمارے باپ دادا پر وقتاً فوقتاً جو عذاب نازل ہوتا رہا، اس کی خبریں جبریل ہی لایا کرتا تھا، یہ ہمارا قومی دشمن ہے، جس نبی پر یہ فرشتہ وحی لائے گا، ہم اسے نہیں مانیں گے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر یہی جبریل وحی لاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہماری بھید کی باتوں، سازشوں اور تدبیروں کو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر کر دیتا ہے، لہٰذا ہم اسلام قبول نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب اس آیت میں دیا ہے کہ جبریل کی حیثیت تو محض پیغام پہنچانے والے فرشتے کی ہے، اصل میں ہر قسم کا حکم اور عذاب سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے نازل ہوتا ہے، جبریلؑ اور دوسرے فرشتوں یا رسولوں کی دشمنی بالکل بے معنی ہے، اس کی سزا میں کافر خود اللہ تعالیٰ کی دشمنی کے سزاوار ہوں گے۔'' (درس قرآن، جلد اول)

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ مُصَدِّقًا تصدیق کرتا ہے اسم فاعل (صَدَّقَ، يُصَدِّقُ، تَصْدِيقًا) باب تفعیل، تصدیق کرنا لِمَا (لِ-مَا) واسطے، اس کے جو بَيْنَ يَدَيْهِ لفظی ترجمہ اس کے ہاتھوں کے درمیان۔ محاورہ میں اپنے سامنے کی اشیاء، یعنی قرآن حکیم سابقہ کتب سماویہ، (توراۃ، زبور، انجیل) کی تصدیق کرتا ہے مگر ٹھیک ٹھیک ان الفاظ اور مضامین کی جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئے تھے نہ

کہ تحریف شدہ کتب کی، ﴿وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ هُدًى، ہدایت (هَدَى، يَهْدِى، هِدَايَةً، وَهُدًى) هُدى، یہ قرآن کی صفت ہے، افراد اور قوموں کو ہدایت کی طرف بلاتا ہے بُشْرٰى بشارت اور خوشخبری، اللہ تعالیٰ کے یہاں کامیابی کی بشارت دیتا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''آیہ کریمہ کے اس حصہ میں قرآن کی مزید تین صفتیں بیان ہوئی ہیں ایک یہ کہ وہ پچھلے صحیفوں کا مصدق ہے، دوسری یہ کہ وہ راہ حق کی طرف رہنمائی کر رہا ہے، تیسری یہ کہ جو اس کی رہنمائی قبول کر لیں وہ ان کو آخرت کی فوز و فلاح کی بشارت سنا رہا ہے، یہ تفصیل یہاں اس لیے پیش کی گئی ہے تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ یہود کی یہ مخالفت صرف قرآن ہی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ خود ان کی اپنی کتاب کی بھی مخالفت ہے۔ وہ اس ہدایت کے بھی مخالف ہیں جو پہلے نازل ہوئی اور اس ہدایت کے بھی دشمن ہیں جو اب دنیا کی رہنمائی کیلئے نازل ہوئی۔ (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ﴾

جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں، اور جبریل اور میکائیل کے دشمن ہیں۔

مَنْ جو کوئی، اسم موصول، كَانَ ہے (كَانَ يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، عَدُوًّا دشمن، لِّلّٰهِ اللہ کا، وَمَلٰٓئِكَتِهٖ اور اس کے فرشتوں کا، وَجِبْرِيْلَ اور جبریلؑ کا، وَمِيْكٰلَ اور میکائیلؑ (فرشتے کا) یہ بھی مقرب فرشتے کا نام ہے۔ میکائیل کے معنی عبید اللہ (اللہ کا چھوٹا سا بندہ)، مخلوق کی رزق رسانی اور بارش کا کام اس کے سپرد ہے، بہر حال جبریلؑ ہو یا میکائیلؑ یا اور فرشتے، سب کے سب اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے ہیں اور اپنے اپنے فرائض بجالانے پر مامور ہیں، اور ان کے درمیان کوئی اختلاف اور دشمنی نہیں ہے، جو کوئی ان سے دشمنی رکھتا ہے تو اسے جان لینا چاہیے، ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ تو بے شک اللہ تعالیٰ ان کافروں کا دشمن ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''روایات سے واضح ہوتا ہے، میکائیل فرشتہؑ کو حضرت جبریلؑ کے برعکس (یہود) اپنا ہمدرد سمجھتے تھے، قرآن نے یہاں حضرت جبریلؑ کے ساتھ حضرت میکائیل کو شامل کر کے یہ واضح کیا ہے کہ جبریلؑ کا مخالف

جس طرح اللہ اور اس کے تمام نبیوں اور رسولوں کا مخالف ہے اسی طرح وہ میکائیلؑ کا بھی مخالف ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام فرشتوں اور تمام رسولوں کی ملت ایک ہے، جبریل اور میکائیل اسی ملت سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے درمیان کوئی رقابت اور چشمک نہیں ہے کہ جبریل سے جن کی لڑائی ہو میکائیل اس سے دوستی گانٹھے رکھیں۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) فرشتے اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور ہمہ وقت اس کے احکام بجالاتے ہیں، ان میں سے کسی سے بھی دشمنی رکھنا ایمان کے منافی ہے۔

(۲) قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب نہ صرف اسے جبریلؑ امین نے خاتم النبیینؐ کے قلب اطہر پر نازل کیا، بلکہ تمام انبیاء کرام پر یہی وحی لاتے رہے۔

قرآن سابقہ کتب آسمانی کا مصدق ہے، اسے تسلیم کرنا ہدایت اور بشارت کی نوید ہے، نسل انسانی کے لیے تا قیامت صرف اور صرف یہی کتاب ہدایت ہے جس کا عملی نمونہ سیرت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ، وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ(۹۹) اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ، بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰۰)	''ہم نے آپ کی طرف واضح آیات نازل کی ہیں اور ان کی پیروی سے صرف وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو فاسق ہیں، کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا ہے کہ جب بھی یہود نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اسے ضرور ہی پس پشت ڈال دیا بلکہ ان میں سے اکثر ایمان ہی نہیں لاتے۔''

﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ﴾ وَ (لَ– قَدْ) اور، البتہ تحقیق۔ لام اور قد، کلام میں تاکید پیدا کرتے ہیں۔ اَنْزَلْنَآ، ہم نے نازل کیا (اَنْزَلَ، يُنْزِلُ، اِنْزَالٌ) نازل کرنا۔ اٰيٰتٍ، آیۃ کی جمع ہے،

قرآن میں ہر دو گول دائروں کی درمیانی عبارت ایک آیۃ کہلاتی ہے۔ آیۃ کے لفظی معنی نشان کے ہیں۔ ہر فقرہ جس میں کوئی حکم ہو، یا وہ ایک مستقل عبارت ہو، اسے آیۃ کہا جاتا ہے، قرآن حکیم میں کل آیات والناس تک ۶۲۳۶ ہیں (الاتقان فی علوم القرآن)، بَیِّنَاتٍ، روشن اور واضح، بَیِّنَۃٌ کی جمع ہے ایَاتٍ بَیِّنَاتٍ، مرکب توصیفی ہے، جمع مونث سالم ہے اس لیے زبر کی بجائے زیر استعمال ہوئی ہے، قرآنِ حکیم کی آیات کے علاوہ انفس وآفاق اور انسان کے جسم وجان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کی بے شمار نشانیاں بکھری پڑی ہیں، ان سب کو آیات کہا گیا ہے لیل ونہار کی آمد ورفت، کشتیوں اور جہازوں کے سطح آب پر چلنے، بادلوں کے ہواؤں کے دوش پر ادھر ادھر اڑنے، پانی کے برسنے اور مختلف چیزوں کے اگنے کو آیات یعنی اللہ تعالیٰ کی کاریگری کے نشان کہا گیا ہے جو عقلمندوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ (دیکھیے البقرہ ۲:۱۶۴)

شہد کی مکھی پر غور کیجئے کس طرح یہ پہاڑوں پر بسیرا کرتی، پھلوں اور پھولوں سے رس چوستی ہے، جس سے ایسا لذیذ، میٹھا، مصفیٰ اور صحت بخش مشروب تیار ہوتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت عیاں ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (النحل ۱۶:۶۷) ''(اہل فکر) کے لیے اس میں اللہ کی قدرت کے نشان ہیں''۔

زمین کی پیداوار..... مختلف اجناس، پھل اور سبزیاں جو انسان کی صحت اور زندگی کا سامان بنتی ہیں، اس رحمٰن ورحیم کے نشان ہیں: اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الۡاَرۡضِ کَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً، وَمَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ (الشعراء ۲۶:۷،۸) ''کیا انہوں نے زمین کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں ہر قسم کی کتنی نفیس چیزیں اگائی ہیں، کچھ شک نہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے مگر اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں''۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت کاملہ سے مریم کے بطن سے بغیر باپ کے پیدا کیا، اس کو بھی نشانی قرار دیا۔ وَجَعَلۡنَا ابۡنَ مَرۡیَمَ وَاُمَّہٗۤ اٰیَۃً (المومنون ۲۳:۵۰) ''اور ہم نے مریم کے بیٹے اور ان کی ماں کو نشانی بنایا'' اور کوئی انسان عقل وفکر سے کام لے تو معلوم ہوگا کہ ہر ذرہ اور ہر پتہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نشان ہے، کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وَفِیۡ کُلِّ شَیۡءٍ لَہٗ اٰیَۃٌ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّہٗ وَاحِدٌ

کائنات کی ہر چیز میں اس کی کاریگری ہویدا ہے اور یہ پتا دے رہی ہے کہ اس کا خالق اکیلا ہے۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے واضح وصریح آیات نازل فرمائی ہیں مگر بنی اسرائیل ان کا انکار کر رہے ہیں ان کے انکار کی اصل وجہ کیا ہے؟ پہلی آیت میں اس وجہ کو بے نقاب کیا گیا ہے، انکار کی وجہ اللہ تعالیٰ سے ان کی بغاوت اور ان کی کج فطرتی ہے، فطرتِ سلیم کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ ان آیات پر ایمان لائے، ہر راست رو اور بے کھوٹ دل مجبور ہوگا کہ وہ ان آیات کو قبول کرے، اگر یہود یا دوسرے لوگ ان واضح آیات کا انکار کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آیات ہدایت کیلئے کافی نہیں ہیں یا دلائل سے خالی ہیں بلکہ اس لیے کہ ان کی فطرت فاسد ہے اور وہ اللہ کے باغی و نافرمان ہیں''۔(فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ﴾ یہاں پر مَا نافیہ ہے یعنی نفی کے معنی دیتا ہے یَکْفُرُ، وہ کفر کرتا ہے فعل مضارع واحد مذکر غائب (کَفَرَ، یَکْفُرُ، کُفْرًا و کُفْرانًا) انکار کرنا۔ کفر کرنا اِلَّا، کلمہ استثنائے کلام، سوائے، مگر (Except) الفاسقون، فاسق لوگ، نافرمان۔ فاسق کی جمع، فاسق وہ لوگ ہیں جو حدود اللہ کو توڑتے ہیں، بِهَا، یہ ضمیر آیات کی طرف جاتی ہے، یعنی نافرمان اور حدود اللہ کو توڑنے والے ہی آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں۔

﴿اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ﴾

جب بھی یہود نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اسے ضرور ہی پس پشت ڈال دیا۔

اَوَ، ہمزہ استفہام (کیا) کے لیے استعمال ہوا اور واؤ عطف کے لیے آیا ہے۔ کُلَّمَا، حرف شرط (جب کبھی) Whenever، عٰهَدُوْا، انہوں نے عہد کیا، فعل ماضی جمع مذکر غائب (عَاهَدَ یُعَاهِدُ، مُعَاهَدَةً) عہد کرنا۔ عَهْدًا، کوئی عہد، نَّبَذَهٗ (نَّبَذَ–هُ) پھینک دیا توڑ ڈالا۔ اسے۔ فَرِيْقٌ، گروہ، جماعت۔ مِنْهُمْ (مِنْ– هُمْ) سے، ان یعنی جب کبھی بھی انہوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے کسی نہ کسی گروہ یا جماعت نے اسے توڑ ڈالا (اس کی خلاف ورزی کی)، ﴿بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ بَلْ بلکہ (اَكْثَرُ –هُمْ) اکثر ان کے، لَا يُؤْمِنُوْنَ نہیں، ایمان رکھتے (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا) ایمان لانا، رکھنا۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''یہودیوں کی تاریخ غداری، عہد شکنی، نافرمانی اور سرکشی کے واقعات سے بھری پڑی ہے جب کبھی ان کے پاس اللہ کا کوئی رسول نشانیاں لے کر آیا، انہوں نے اس کو جھٹلایا، بلکہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے کا عہد

کر لینے کے بعد بھی اس پر قائم نہ رہے۔ اسی انکار اور نافرمانی کی عادت نے انہیں حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے اقرار کرنے سے روکا''۔ (درس قرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

فسق (عہد شکنی) کی راہ یہود نے اختیار کی تو وہ ذلیل وخوار ہوئے، تو کیا اگر مسلمان اس راہ پر چلیں گے تو رسوائی سے بچ سکیں گے؟ آج امت مسلمہ کی حالت زار کا سبب کیا یہی فسق نہیں ہے؟ کلمہ طیبہ پڑھنے کے بعد مسلمانوں پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں جنہیں وہ فراموش کئے ہوئے ہیں، کاش کہ وہ آیات قرآنی پر غور وفکر کریں۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ، كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۱)	''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے رسول (ﷺ) تشریف لائے، وہ تصدیق فرماتے ہیں اس کتاب (یعنی تورات) کی جو ان (یہود) کے پاس ہے تو اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے (خود) کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔''

﴿وَلَمَّا جَآءَ هُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ وَلَمَّا اور جب لَمَّا۔ کلمہ شرط ہے، وقت کو ظاہر کرتا ہے اسے فعل ماضی کے شروع میں لگاتے ہیں (جَآءَ – هُمْ) آیا، ان کے پاس، جَاءَ، يَجِيءُ آنا، رَسُوْلٌ مِنْ عِنْدَاللّٰهِ، اللہ کی طرف سے رسول، یعنی اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس اللہ کی طرف سے تشریف لائے، ﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ (تصدیق کرنے والا) اسم فاعل ہے، صَدَّقَ يُصَدِّقُ، تُصْدِيْقٌ تصدیق کرنا باب تفعیل لِمَا (لِ– مَا) لیے اس کے جو مَعَهُمْ (مَعَ– هُمْ) پاس۔ ان کے یعنی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کتاب کی تصدیق فرماتے ہیں جو ان کے پاس ہے (تورات کی)۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یہود کو بتایا جارہا ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو تشریف لائے ہیں، یہ تمہاری کتاب اور اس کے دین کو مٹانے کے لیے نہیں، یہ تو عین اسے تازگی بخشنے اور حیات تازہ دینے کے لیے آئے ہیں۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

صداقت ہمیشہ صداقت ہی رہتی ہے، قرآن حکیم نے ان تمام صداقتوں کو تسلیم کیا ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں، تمام انبیاء کی بنیادی تعلیم اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار ہے، اس کے علاوہ اخلاقیات اور عدل و انصاف کی باتیں بھی ہمیشہ یکساں رہی ہیں، اس لیے اسلام نے سابقہ انبیاء اور ان پر نازل ہونے والی کتب پر ایمان کو ضروری قرار دیا ہے، سورۃ بقرہ کے آغاز میں متقین کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (البقرہ۲:۴) ''وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نازل شدہ وحی (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر بھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اتاری گئی (یعنی سابقہ کتب اور انبیا علیہم السلام پر)''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ، وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى، وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ، لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ، وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (البقرہ۲:۱۳۶) ''(اے مسلمانو!) تم کہو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اترا ہم پر (یعنی قرآن) اور جو اترا ابراھیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام پر اور ان کی اولاد پر اور جو عطا ہوا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اور جو دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے ملا، ہم ان سب (پیغمبروں) میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے (سب کے سب واجب التعظیم ہیں) اور ہم اسی کے فرمانبردار (یعنی مسلم) ہیں''۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ایمان کی تکمیل اسی وقت ہوگی جب ہم دل و جان سے سب انبیاء کرام کی تعظیم کریں گے جبکہ اطاعت صرف اور صرف خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

﴿نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ، كِتَابَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ نَبَذَ پھینک دیا، قابل توجہ نہ سمجھا (نَبَذَ، يَنْبُذُ نَبْذًا) پھینک دینا، فَرِيْقٌ، جماعت، گروہ، اسم جمع، مِّنَ الَّذِيْنَ ان میں سے جن کو، اُوْتُوا الْكِتٰبَ دی گئی کتاب، اُوْتُوا فعل ماضی مجہول، جمع مذکر غائب

(اٰتٰی، یُؤْتِیُ، اِیْتَاءٌ) عطا کرنا، دینا، کِتَابَ اللّٰہِ، اللہ کی کتاب (تورات، قرآن حکیم) وَرَآءَ، پیچھے، (ظُھُوْرِ – ھِمْ) اپنی پشتوں کے، ظَھْرٌ، پشت اور اس کی جمع ظُھُوْرٌ ہے پس پشت ڈالنے سے مراد بھلانا اور فراموش کرنا۔ کَاَنَّھُمْ (کَاَنَّ – ھُمْ) گویا کہ وہ، کَاَنَّ مشبہ بفعل ہے تشبیہ کے معنیٰ دیتا ہے، لَایَعْلَمُوْنَ، نہیں جانتے ہیں (عَلِمَ، یَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''اس سے قبل کی آیہ مبارکہ میں یہود کی عہد شکنی کی جس روش کا ذکر ہوا ہے اس آیت میں اسی کی واقعاتی شہادت پیش کر دی گئی ہے کہ دیکھو جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول آیا، جو ان پیشین گوئیوں کے بالکل مطابق ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہیں تو ان کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا اس سے کبھی کے آشنا ہی نہیں ہیں۔

''رسول'' سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لفظ اگرچہ نکرہ کی صورت میں استعمال ہوا ہے لیکن بعد کی صفات اور سیاق وسباق سے مراد متعین ہو جاتی ہے، نیز اس سے رسول کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

''کتاب اللہ'' سے مراد تورات بھی ہو سکتی ہے اور قرآن بھی، تورات مراد لینے سے مطلب یہ ہوگا کہ ان اہل کتاب نے اہل کتاب ہو کر اللہ کی کتاب کو نبی آخر الزمان کے معاملہ میں اس طرح نظر انداز کیا گویا اس کو جانتے ہی نہیں، قرآن مجید مراد لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ایک کتاب کو شناخت کرنے کے سب سے زیادہ اگر اہل تھے تو یہ تھے، اس لیے کہ یہ ایک آسمانی کتاب کے وارث اور امین ہونے کے مدعی بھی تھے اور اس طرح کی ایک کتاب (یعنی قرآن اور خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے آنے کی پہلے سے ان کو خبر بھی تھی، لیکن ضد اور حسد کا برا ہو کہ اہل کتاب ہو کر وہ اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک رہے ہیں گویا کہ اس کو جانتے ہی نہیں۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

آیہ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام انبیا ورسل نے دعوت حق کو پیش کیا، سب نے ایک دوسرے کی تائید کی، سب کا مشن ایک ہی تھا کہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا جائے۔

۲) ضد اور ہٹ دھرمی، تکبر وغرور، راہ حق قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ، وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ، وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ، فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ، وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ، وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ، وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰيهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ، وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۲) وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۳)

’’اور وہ (یہود) ان (خرافات) کی پیروی میں لگ گئے جو شیاطین سلیمانؑ کے دورِ حکومت میں پڑھتے پڑھاتے تھے۔ سلیمانؑ نے کبھی کفر کا ارتکاب نہیں کیا (وہ سحر سکھانے نہیں، دین سکھانے آئے تھے) مگر ہاں کفر شیاطین نے کیا جو لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے (اور وہ اس علم کے پیچھے ہو لئے) جو شہر بابل میں ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں پر اترا تھا اور وہ دونوں فرشتے کسی کو (سحر) نہیں سکھاتے تھے جب تک وہ پہلے صاف طور پر (لوگوں کو) متنبہ نہ کر دیتے تھے کہ ہم تو (محض ذریعہ) آزمائش ہیں پس تو کفر میں نہ پڑ پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے وہ شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیں، ظاہر تھا کہ اذن الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی نقصان نہ پہنچا سکتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود ان کے لیے نفع بخش نہیں، بلکہ نقصان دہ تھی اور وہ خوب جانتے تھے کہ جو کوئی اس (سحر) کا خریدار ہو اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، کتنی بری چیز تھی جسے انہوں نے اپنی جانوں کے عوض خریدا، کاش (کھرے دل سے) وہ سمجھتے!‘‘

﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ﴾

وَاتَّبَعُوْا۔اورانہوں نے پیروی کی فعل ماضی جمع مذکر غائب (اِتَّبَعَ، یَتَّبِعُ، اِتِّبَاعًا)مَا،(اس چیز کی۔ جو)مَائے موصول ہے، تَتْلُوْا، تلاوت کرتے تھے،فعل مضارع واحد مونث غائب (تَلَا، یَتْلُوْا تِلَاوَۃً) کسی کے پیچھے اس طرح چلنا کہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو، پڑھنے کے ساتھ ساتھ اگر معنیٰ ومفہوم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آئے تو اسے تلاوت کہا جاتا ہے، کسی عبارت کو پڑھنے پر بھی اس کا اطلاق اسی لیے ہوتا ہے کہ اس میں بھی الفاظ یکے بعد دیگرے پڑھے جاتے ہیں، تلاوت کا لفظ عام طور پر کتب سماوی کے لیے مخصوص ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (البقرہ۲:۱۲۱) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اسے یوں پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے (مفہوم ومطالب پر غور وفکر کرتے ہیں)۔

الشَّيٰطِيْنُ اس کا مفرد شیطان ہے، سرکش اور خبیث روح جس میں خیر کی کوئی رمق نہ ہو۔

شَيْطَانٌ وَهُوَ مِنْ خُبْثٍ وَ تَمَرُّدٍ وَلَمْ يَنقَ فِيْهِ قَابِلِيَّةٌ لِلْخَيْرِ (ایسر التفاسیر) یہاں شیاطین سے مراد وہ سرکش اور متمرّد جِنّات ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد مبارک میں تھے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ سرکش انسان ہوں (مفردات القرآن) عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ، یعنی سلیمان علیہ السلام کے عہد میں یہاں پر عَلٰی بمعنی فِی یعنی یہاں عَلٰی کا معنیٰ 'میں' کے ہیں (In the reign of Sulaiman) سلیمان علیہ السلام، سیدنا داؤد علیہ السلام کے بیٹے تھے، عظیم پیغمبر ہونے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عظیم بادشاہت بھی عطا کی تھی، ان کی بہت بڑی سلطنت تھی کہ پرند، چرند، ہوا اور جِنّات کو ان کا مطیع بنا دیا گیا تھا، شام اور فلسطین کے علاوہ آپ کی حکومت کی حدیں مشرق کی طرف عراق تک اور مغرب میں مصر تک پھیلی ہوئی تھیں۔

﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾

اور سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا (یعنی سحر وساحری نہیں کی) لیکن شیاطین نے کفر کیا کہ وہ تعلیم دیتے تھے لوگوں کو (سحر) جادو کی، سِحْرٌ کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے اول دھوکہ اور بے حقیقت تخیلات پر بولا جاتا ہے جیسا کہ شعبدہ باز اپنے ہاتھ کی صفائی سے نظروں کو حقیقت سے پھیر دیتا ہے یا نَمَّامُ (چغل خور)

ملمع سازی کی باتیں کر کے کانوں کو صحیح بات سننے سے روک دیتا ہے۔ (مفردات القرآن)

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہود کی ایک اور ناروا حرکت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی حقیقی وحی ماننے کی بجائے جادو اور سفلی عملیات کی پیروی کرتے ہیں، یہ جادو اور سفلی عملیات وہ ہیں جو حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں شیاطین نے عام کر رکھے تھے۔

یہ لوگ جادو اور کفر والی حرکتیں تو خود کرتے تھے۔ لیکن انہیں حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر دیتے تھے ان پر یہ الزام لگاتے تھے کہ یہ جادو حضرت سلیمانؑ سکھاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعہ حضرت سلیمانؑ کی بریت کا اعلان کر دیا اور کہا کہ یہ لوگ سراسر جھوٹ بولتے ہیں۔ (درس قرآن، جلد اول)

﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ﴾

وَمَا۔ اور اس کا جو، اُنْزِلَ نازل کیا گیا، عَلَى الْمَلَكَيْنِ دو فرشتوں پر، مَلَكٌ، فرشتہ، مفرد ہے، بِبَابِلَ۔ شہر بابل میں، بابل عراق کے دارالخلافہ بغداد سے ساٹھ میل جنوب دریائے فرات کے کنارے مشہور شہر تھا۔ تقریباً وہیں جہاں آج کل ہلہ کی آبادی ہے، هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ، دو فرشتوں کے نام ہیں۔

(تفسیر ماجدی)

﴿وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ﴾

وَمَا يُعَلِّمٰنِ اور وہ دونوں نہیں سکھلاتے تھے۔ مِنْ اَحَدٍ، کسی کو، حَتّٰى يَقُوْلَآ، یہاں تک کہ وہ دونوں کہتے (خبردار کرتے) اِنَّمَا نَحْنُ سوائے اس کے نہیں کہ ہم ہیں، فِتْنَةٌ فتنہ آزمائش ہیں، فَلَا تَكْفُرْ پس نہ تم کفر کرو۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں، مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قید اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لیے بھیجا ہوگا جس طرح قوم لوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے، اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے وہاں ایک طرف انہوں نے

بازار ساحری میں اپنی دکان لگائی ہوگی اور دوسری طرف وہ اتمام حجت کیلئے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو: ہم تمہارے لیے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو، مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات، نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آ کر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو، وہ سلطنت الٰہی کے کارپرداز ہیں، اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں، ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آ کر کام کر جاتے ہوں گے، رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بُری تھی تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خور حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تا کہ اسے عین حالت ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔''

(تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ﴾

فَيَتَعَلَّمُوْنَ، پس وہ سیکھتے تھے جمع مذکر غائب (تَعَلَّمَ، يَتَعَلَّمُ، تَعَلُّمًا) سیکھنا، مِنْهُمَا ان دونوں سے، هُمَا کی ضمیر ھاروت، ماروت کی طرف جاتی ہے، مَا۔ جو، يُفَرِّقُوْنَ تفریق پیدا کریں، مضارع جمع مذکر غائب (فَرَّقَ، يُفَرِّقُ، تَفْرِيْقًا) باب تفعیل، تفرقہ ڈالنا، بِهٖ (بِ. ہٖ) ساتھ اس کے بَيْنَ درمیان، الْمَرْءِ، مرد، وَ زَوْجِهٖ، (زوج۔ہٖ) اس کی زوجہ (بیوی) یعنی وہ ان فرشتوں سے ایسا علم حاصل کرتے تھے جس سے مرد اور عورت میں تفرقہ ڈالیں، وہ فرشتے یقیناً انہیں صالح اور پاکیزہ زندگی کی خوبیاں اور بری اور بے حیائی کی زندگی کی خامیاں بتاتے ہوں گے مگر جنہوں نے اپنی فطرت ہی کو بگاڑ لیا ہو انہیں برائی ہی میں مزہ آتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں ازدواجی تعلق انسانی تمدن کی جڑ ہے عورت اور مرد کے تعلق کی صحت اور درستی پر پورے انسانی تمدن کی صحت اور درستی کا دارومدار ہے اور اس میں خرابی اور فساد سے یہ سارا نظام تلپٹ ہو جاتا ہے اور وہ شخص انتہا درجہ کا شریر اور فسادی ہے جو اس درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتا ہے، ظاہر ہے کہ شیاطین اور ان کے ساتھی ہی ہر برائی اور بے حیائی پھیلانے میں پیش پیش ہیں۔ جبکہ وحی الٰہی اور انبیاء علیہم السلام نیز ابرار و صالحین کی پاکیزہ زندگیاں دوسرے انسانوں کے لیے مشعل راہ بنتی ہیں۔

﴿وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾

وَمَا هُمْ اورنہیں وہ، یہاں پر مَا نفی کے معنی دیتا ہے بِضَآرِّيْنَ(بِ. ضَآرِّيْنَ)اسم فاعل،اس کا مادہ (ض،ر،ر)(ضَرَّ يَضُرُّ، ضَرًّا، ضُرًّا، ضِرَارًا) نقصان پہچانا،ضراءسختی اورقحط کے معنی بھی دیتا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہوا:وَالضّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ (البقرہ:۱۷۷)''اور بدحالی اورسختی (تنگی وترشی) میں صبر کرنے والے۔'' بِهٖ (بِ. ہٖ) ساتھ،اس کے،یعنی ساتھ اس سحر (جادو) کے مِنْ اَحَدٍ،کسی کو، اِلَّا مگر، بِاِذْنِ اللّٰهِ، اللہ کے حکم سے،یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کسی کو،کوئی شخص نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

﴿وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ﴾

وَيَتَعَلَّمُوْنَ اور وہ سیکھتے،مضارع جمع مذکر غائب (تَعَلَّمَ، يَتَعَلَّمُ، تَعَلُّمًا) سیکھنا، مَا، جو(موصول) يَضُرُّهُمْ،ضرر پہنچائے انہیں،وَلَا يَنْفَعُهُمْ، اورنہ فائدہ پہنچائے انہیں۔

﴿وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾

وَلَقَدْ اور البتہ ضرور بضرور لَقَدْ اور لام تحقیق کلام کیلئے آتے ہیں، عَلِمُوْا ان سب نے جان لیا (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، لَمَنِ (لَ. مَنْ) البتہ، جس کسی نے، اِشْتَرٰهُ، خریدا، اسے (اِشْتَرٰى، يَشْتَرِىْ، اِشْتِرَاءً) خریدنا (جادوکو)هُ کی ضمیر سحر (جادو) کی طرف ہے۔مَا لَهٗ نہیں ہے اس کے لیے،فِي الْاٰخِرَةِ،آخرت میں،مِنْ خَلَاقٍ، کچھ،حصہ (سحر) جادو،اختیار کرنا کفر کی راہ ہے اور آخرت میں اس کا بدلہ ناکامی ہے۔

﴿وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾

وَلَبِئْسَ (وَلَ. بِئْسَ)البتہ، برا ہے، لام تاکید کے لیے ہے بِئْسَ، کلمہ ذم ہے، مذمت کے لیے آتا ہے۔مَا، جو،شَرَوْا انہوں نے بیچا،فعل ماضی جمع مذکر غائب (شَرٰى، يَشْرِىْ، شَرَاءً) بیچنا،بِهٖ۔ساتھ،اس کے، اَنْفُسَهُمْ، اپنی جانوں کو،اس جادو کے بدلے میں جوانہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے یہ انتہائی مذموم حرکت ہے،دین حق جو دنیا اور آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے اسے چھوڑ دیا اور سحر اور کفر کو ترجیح دی کہ جو دنیا اور آخرت میں رسوائی کا سامان ہے،لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ لَوْ،کاش،حرف تمنا، كَانُوْا، ہوئے، يَعْلَمُوْنَ

جانتے، کاش کہ انہیں حقیقت تک رسائی ہوتی۔

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾

وَلَوْ، اوراگر، اَنَّهُمْ (اَنَّ. هُمْ) بے شک، وہ، اٰمَنُوْا، ایمان لاتے، (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، ایمانًا) ایمان لانا، وَاتَّقَوْا اور ڈرتے، (و ق ی) اس کا مادہ ہے (اِتَّقٰی، يَتَّقِیْ، اِتِّقَاءً) ڈرنا، بچنا (گناہوں سے) باب افتعال ہے لَمَثُوْبَةٌ (لَ. مَثُوْبَةٌ) ثَابَ يَثُوْبُ، ثَوْبًا وَ ثُوْبًا اس کا لفظی معنی لوٹنا، اَلثَّوَابُ اور المَثُوْبَةُ، اعمال کا بدلہ ہے کیونکہ نیکی کرنے والے کی طرف اس کا اجر لوٹتا اس لیے اسے ثواب کہتے ہیں، مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہتر، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ، کاش کہ وہ اس حقیقت کو جانتے اگر یہ جادو کی تعلیم حاصل کرنے کی بجائے اللہ پر ایمان لاتے اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے صاف ستھری زندگی گزارتے تو اس کی یہاں اجر عظیم پاتے، مگر افسوس کہ خواہشات کے پیچھے چل کر انہوں نے کتنے بڑے اجر کو ضائع کر دیا۔

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) سحر کفر ہے، انبیاء علیہم السلام کا دامن اس قسم کی تعلیم سے مبرا ہوتا ہے، وہ لوگوں کو ایمان ویقین، عفو و درگزر، احسان ومروت اور صبر وثبات کی تعلیم سے آراستہ کرتے ہیں جبکہ سحر میں نفاق وشقاق، حسد و بغض، نفرت وعداوت اور غداری ودغابازی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۲) جب بندہ اللہ تعالیٰ کے سایہ رحمت میں آجاتا ہے تو شیاطین اور ان کے ساتھیوں کے تمام تر مکر وفریب بے کار اور معطل ہو جاتے ہیں۔

۳) سحر ایسی لایعنی باتوں کا نہ تو دنیا میں کوئی فائدہ ملتا ہے اور نہ آخرت ہی میں کوئی اجر وثواب ہے، گویا کہ دنیا وآخرت دونوں کا خسارہ ہے۔

۴) وہ ہر شے جو کاہن اور جادوگر کفر وخیانت کے وسائل سے حاصل کرتے ہیں، مومن اس سے کہیں بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں حاصل کر لیتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ جو رب کائنات کا پیارا ہو جائے کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے تابع ہو جاتا ہے مگر اکثر لوگ اس بات سے غافل ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا، وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ(۱۰۴) مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ، وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ، وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ(۱۰۵)	''اے ایمان والو! (پیغمبر علیہ السلام سے) رَاعِنَا نہ کہا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا کہا کرو اور (بات کو پہلے ہی) توجہ سے سنا کرو (تا کہ دہرانے کی ضرورت ہی نہ پڑے) اور منکرین کے لیے تو المناک عذاب ہے، وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی (قرآن) نازل ہو، اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے اور وہ بڑا ہی فضل کرنے والا ہے۔''

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو يٰٓاَيُّهَا حرف نِدَا (بلانے اور پکارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے) الَّذِيْنَ وہ لوگ جو (اسم موصول)، اٰمَنُوْا ایمان لائے (منادیٰ) جسے بلایا جائے، پکارا جائے خطاب اہل ایمان کو ہو رہا ہے اور خطاب کرنے والا رب العالمین ہے قرآن حکیم میں اٹھاسی مقامات پر اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ اہل ایمان کو جہاں بھی خطاب کیا جاتا ہے۔ انہیں کوئی اہم بات بتائی جاتی ہے کہ وہ اس کی پیروی اور اطاعت کریں، اور نافرمانی سے بچیں، ﴿لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا﴾ نہ تم کہو، رَاعِنَا (رَاعِ– نَا) خیال کیجئے، ہمارا (رَاعیٰ، يُرَاعِيْ، مُرَاعَاة) باب مفاعلہ۔ حفاظت کرنا، خیال کرنا، اس سے فعل امر واحد مذکر حاضر رَاعِ.

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''مسلمان کے نزدیک حبِّ رسولؐ وہ گرانمایہ متاع ہے جس سے وہ کسی حالت میں بھی دست بردار

ہونے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ شیفتگی اصل ایمان ہے، صحابہ کرامؓ جب دربارِ رسالت میں ہوتے اور مختلف مسائل کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ عالی کو اپنی طرف مبذول کرانا ہوتا تو کہتے راعِنَا کہ حضور ہمارا بھی خیال رہے، لیکن بد باطن اور بدعقیدہ یہودی مسلمانوں کی اس عقیدت کو برداشت نہ کرسکے۔ انہوں نے ازراہِ تمسخر وتحقیر راعِنا (زبان کو دباتے ہوئے) کہنا شروع کردیا جس کے معنی ان کے ہاں کم عقل کے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اس موقع پر اُنْظُرْنَا کہو (جس کے معنی بھی اگرچہ، راعنا کی طرح ہمارا خیال کیجئے، ہماری طرف توجہ فرمایئے ہے، مگر یہ لفظ ذو معنیٰ استعمال نہیں ہوسکتا ہے) اس میں انہیں خبث باطن کے اظہار کا کوئی موقع نہیں ملے گا، اس آیت سے حرمت رسولؐ کی حفاظت مقصود ہے اور یہ تلقین ہے کہ کوئی ایسا کلمہ جو توہین کا موجب بھی ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے استعمال نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ دلوں سے عقیدت مندی و اِرادت کے جذبات محو ہوجائیں اور بجائے ایمان کے نرا کفر ہمارے حصہ میں آئے۔'' (تفسیر سراج البیان)

﴿وَاسْمَعُوْا﴾ اور تم سب غور سے سنو، فعل امر جمع مخاطب (سَمِعَ، یَسْمَعُ، سَمْعًا) سننا، یعنی جو تمہیں حکم دیا جارہا ہے اسے گوش دل سے سنو اور اس پر علم پیرا ہوجاؤ۔ ﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ اور کفار کے لیے، عذاب ہے، دردناک۔ اسلام کا مذاق اڑانے والوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانے والوں کا انجام کبھی بہتر نہیں ہوسکتا۔

﴿مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾

اور نہیں پسند کرتے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے یہ کہ نازل کی جائے تمہارے اوپر کوئی بھلائی، تمہارے رب کی طرف سے۔

مَا یہاں پر نفی کے معنیٰ دیتا ہے، یَوَدُّ، وہ پسند کرتا ہے، فعل مضارع واحد مذکر غائب (وَدَّ، یَوَدُّ، وُدًّا) پسند کرنا، چاہنا الَّذِیْنَ، اسم موصول وہ لوگ جنہوں نے کَفَرُوْا، کفر کیا (کَفَرَ، یَکْفُرُ، کُفْرًا) کفر کرنا، دین حق کا انکار کرنا، اَهْلِ الْكِتٰبِ کتاب والے، اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اور نہ مشرکین ہی، مشرکین مشرک کی جمع ہے۔ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں دوسروں کو شریک

ٹھہرائیں، حالانکہ اس تمام کائنات میں ہر چیز کا صرف اور صرف وہ یکتا مالک ہے۔ اَنْ یُّنَزَّلَ، کہ نازل کی جائے، مضارع مجہول ہے (نَزَّل، یُنَزِّلُ، تَنْزِیْلًا) باب تفعیل، نازل کرنا، اتارنا اَنْ کی وجہ سے، یُّنَزَّلَ حالت نصب میں ہے، عَلَیْکُمْ تم پر، مِّنْ خَیْرٍ کوئی بھلائی، مِّنْ رَّبِّکُمْ تمہارے رب کی طرف سے یعنی جو لوگ کافر ہیں، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی یعنی قرآن نازل ہو یا مسلمانوں کو کوئی بھلائی ملے۔

﴿وَاللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ، وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ﴾

اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے اور وہ بڑا ہی فضل کرنے والا ہے۔

یَخْتَصُّ (اِخْتَصَّ، یَخْتَصُّ، اِخْتِصَاصٌ) چن لینا، مختص کرنا (بِرَحْمَتِ. ہٖ) اپنی رحمت سے، مَنْ یَشَآءُ جسے چاہتا ہے (شَاءَ، یَشَاءُ) چاہنا، وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ اور اللہ تعالیٰ مالک ہے بڑے فضل کا، ذُوْ، مالک، الفَضْل فضل، رحمت، الْعَظِیْمِ بہت بڑا، اور اللہ تعالیٰ تو بہت بڑے فضل کا مالک ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''(وہ جس فرد، جس نسل، جس جماعت کو چاہے اپنے فضل وکرم سے نواز دے) اور اب اگر کسی قوم یا نسل کو محروم کیا جا رہا ہے تو اس کی بنا یہ نہیں کہ ادھر سے فضل وکرم میں کچھ کمی ہوگئی ہے بلکہ یہ اس لیے کہ خود اس قوم (بنی اسرائیل) نے اپنی مسلسل نالائق روش سے اپنے کو اس فضل وکرم کا نااہل ثابت کر دیا اور اب وہ اسے اس نعمت (نبوت) سے نوازے تو یہ آئین حکمت کے منافی ہے (یہ انعام اب بنی اسماعیل کو منتقل ہو رہا ہے)۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ایمان کا تقاضا ہے کہ خاتم النبیّین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وتکریم، والدین، بہن بھائی، عزیز واقارب، اپنی جان یہاں تک تمام لوگوں سے بڑھ کر ہو۔

۲) مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کی کوئی غیر مسلم قوم ان کی دوست نہیں بن سکتی بلکہ ان کے مقابلہ میں تمام کفار ومشرکین، یہود ونصاریٰ ایک ہو جاتے ہیں، اَلْکُفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ، پوری دنیا کے کفار ایک ہی ملت ہیں، سورہ انفال میں ارشاد ہوا: وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَاءُ بَعْضٍ (الانفال ۸:۷۳)

''اور جو لوگ کافر ہیں، وہ تو ایک دوسرے کے دوست ہیں''۔

سورۃ آل عمران میں مسلمانوں کو تنبیہ کی جارہی ہے:

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (ال عمران ۳:۲۸)

''مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کفار کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔''

مگر مسلمانوں نے ان آیات کو نظر انداز کر دیا، ان کا احترام ان کے دلوں سے جاتا رہا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہر طرف ذلت و رسوائی کا سامنا ہے، فلسطین، کشمیر، چیچنیا، کوسووا میں مسلمانوں پر کس قدر ظلم و ستم ڈھایا گیا ہے اور حال ہی میں افغانستان اور عراق کے نہتے مسلمانوں پر کیا بیتی ہے؟ امریکہ بلا جواز اپنے حواریوں کے سہارے ان پر بمباری کرتا رہا ہے، اس میں ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کا ناحق خون بہایا گیا ہے۔ نماز تراویح کے دوران بھی کئی مسلمان جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ کئی اسلامی ملکوں کے سربراہ اس کھلم کھلا جارحیت کی حمایت کر رہے ہیں، گویا کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی کے خواہاں ہیں، یہ احکام الٰہی کی ڈھٹائی سے مخالفت ہے، اس نافرمانی سے بھلا عزت کیونکر مل سکتی ہے۔

خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْآخِرَۃَ وَذٰلِکَ ھُوَالْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ (الحج ۲۲:۱۱) ''انہوں نے دونوں جہان کا نقصان اٹھالیا اور واقعی یہ کھلا نقصان ہے۔''

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا، نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْ مِثْلِھَا، اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۱۰۶) اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ (۱۰۷)	''ہم جب کبھی کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا اسے (بالکل) محو کر دیتے ہیں تو اس جیسی یا اس سے بہتر آیت لاتے ہیں، کیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے؟ کیا تم جانتے نہیں ہو کہ زمین اور آسمانوں کی فرماں روائی اللہ ہی کے لیے ہے؟ نیز یہ کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز ہے، نہ مددگار!''

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا﴾ ہم جب منسوخ کرتے ہیں کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں اسے، مَا جو کہ، نَنْسَخْ مضارع جمع متکلم (نَسَخَ، يَنْسَخُ، نَسْخًا) ہم منسوخ کرتے ہیں اردو زبان میں بھی تنسیخ اور منسوخ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اصطلاحِ شرع میں ایک حکم کی بجائے دوسرے حکم کا اِجراء مراد ہے، اللہ تعالیٰ واحد ہے اور اس کے لیے جمع کا صیغہ بطور عزت کے آیا ہے، یہ عربی زبان کا اصول ہے کہ واحد کے لیے جمع کا صیغہ عزت و تکریم کے لیے لایا جاتا ہے۔ مِنْ اٰيَةٍ سے، آیت یعنی کسی آیت کو یا کسی حکم کو، اَوْ، یا۔ نُنْسِهَا، ہم بھلا دیتے ہیں (اَنْسَى، يُنْسِيْ، اِنْسَاءً) بھلا دینا، نسیان طاری کرنا۔ ﴿نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا﴾ ہم لاتے ہیں، اس سے بہتر یا اس جیسی، نَاْتِ ہم لاتے ہیں (اَتٰى، يَاْتِيْ، اِتْيَانٌ) آنا اور اس کے بَ آ جائے تو لانا کے معنی پیدا ہونگے۔ بِخَيْرٍ (بِ. خَيْرٍ) ساتھ بہتر یعنی ہم اس سے بہتر آیت یا حکم لاتے ہیں، اَوْ، یا، مِثْلِهَا، (مِثْلِ. هَا) اس جیسی۔

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

کیا تمہیں خبر نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے؟

اَ کلمۂ استفہام (کیا؟)، لَمْ تَعْلَمْ، تم نہیں جانتے ہو۔ اَنَّ اللّٰهَ، بے شک، اللہ تعالیٰ، عَلٰى، پر، كُلِّ شَيْءٍ ہر چیز، قَدِيْرٌ، قدرت رکھنے والا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ ایک شبہ کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے، ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے، تو ان کے بعض احکام کی جگہ اس میں دوسرے احکام کیوں دیے گئے ہیں؟ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر تمہارا قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی اور عیسائی اس تعلیم کے حصے کو بھول گئے ہیں جو انہیں تعلیم دی گئی تھی، آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی تعلیم ہو اور وہ حافظوں سے محو ہو جائے؟ یہ ساری باتیں وہ تحقیق کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے مِن جانب اللہ ہونے میں شک ہو جائے، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں مالک ہوں، میرے اختیارات

غیر محدود ہیں، اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کر دوں اور جس چیز کو چاہوں، حافظوں سے محو کر دوں، مگر جس چیز کو میں منسوخ یا محو کرتا ہوں، اس سے بہتر چیز اس کی جگہ پر لاتا ہوں یا کم از کم وہ اپنے محل میں اتنی ہی مفید اور مناسب ہوتی ہے جتنی پہلی چیز اپنے محل میں تھی۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

یہ بات تو ہمارے روز مرہ مشاہدہ میں آتی ہے کہ ملکی قوانین میں کوئی بھی اچھی حکومت عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر ترمیم و تنسیخ کرتی رہتی ہے اور لوگوں کے مناسب حال اور سہولت کے لیے جو حکم بہتر اور مفید ہوتا ہے نافذ کر دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ تو احکم الحٰکمین ہے وہ لوگوں کے فائدے اور بہتری کے لیے جو حکم بھی چاہے بدل سکتا ہے اور مختلف حالات میں مختلف قسم کے احکام جاری کرنا عین اس کی حکمت و مصلحت ہے، عقیدہ اور ایمان میں کبھی تبدیلی نہیں آتی وہ روز اول سے اٹل اور یقینی ہیں، ہاں زندگی کے دوسرے معاملات میں کمی و بیشی ہوتی رہی، سورۃ انفال میں مسلمانوں کو جب کہ ان کی تعداد تھوڑی تھی اپنے سے دس گنا لشکر کے مقابلہ کا حکم ہوا اور پھر جب تعداد بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ بوجھ ہلکا کر دیا اور دوگنی تعداد پر فتح کا مژدہ سنا دیا گیا۔ (دیکھیے آیات: ۶۵-۶۶)

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ (النحل ۱۶:۱۰۱)

''اور جب ہم ایک آیت کے بجائے دوسری آیت تبدیل کر کے نازل کرتے ہیں (تو اس کی حکمت و مصلحت) کو بھی اللہ ہی خوب جانتا ہے اور جو کچھ وہ نازل فرماتا ہے۔ (وہ بھی اس کے علم میں ہے)''

مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''اس قسم کے اعتراضات اٹھا کر یہود مسلمانوں کو قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کی کوشش کر رہے تھے، قرآن نے یہ ان کا جواب دیا ہے کہ تورات کا جو قانون منسوخ کیا جاتا ہے اس سے بہتر قانون اس کی جگہ دیا جاتا ہے، اسی طرح تورات کے جو احکام یہود نے فراموش کر دیے تھے ان کی تجدید کی جاتی ہے اور اگر تجدید نہیں کی جاتی بلکہ ان کو نظر انداز کرایا جاتا ہے تو ان سے ملتے جلتے احکام دیے جاتے ہیں یعنی اس تبدیلی سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایک تو خوب سے خوب تر کی طرف بڑھا رہا ہے، دوسرے دین کی جو دولت ضائع کر دی گئی تھی اس کی جگہ دین کے خزانہ کو نئی دولت سے معمور کر رہا ہے ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو قابل اعتراض قرار دی جا سکے۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ﴾

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی حکمرانی اللہ ہی کی ہے اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز ہے، نہ مددگار!

مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہاں بھی مخاطب وہی ہیں جو اوپر والی آیت (۱۰۶) میں مخاطب ہیں، البتہ جواب میں اس ذہنیت کو ملحوظ رکھ کر جو مذکورہ بالا سوال کے پس پردہ چھپی ہوئی تھی، تھوڑی سی تفصیل آ گئی ہے، یہود نسخ کے سوال کو اٹھا کر سادہ لوح لوگوں کے اندر جو وسوسہ اندازی کر رہے تھے اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اس بات کو تاڑ گئے تھے کہ یہ تورات کے احکام کو منسوخ ہونا اور ان کی جگہ دوسرے احکام کا آنا محض تورات کے بعض احکام ہی کا منسوخ ہونا نہیں ہے بلکہ اس کے اندر یہود کی منصب امامت سے معزولی اور ان کی جگہ ایک دوسری امت (امت خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے نصب و تقرر کا پیام بھی مضمر ہے، دراصل اس چیز کا غم و غصہ تھا جو انہیں کھائے جا رہا تھا اور اس کے اظہار کے لیے وہ نسخ کے سوال کو ایک پردہ کے طور پر استعمال کر رہے تھے، قرآن نے اس پردے کو اٹھا کر ان کو یہ جواب دیا کہ آسمان و زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور اس کے اختیار میں ہے، وہ جس سے چاہتا ہے اس کو چھینتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے، اب اگر تم اس منصب کے نا اہل ثابت ہو چکے ہو جس پر اس نے تم کو سرفراز کیا تھا اور اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہاری جگہ اس منصب پر کسی اور کو سرفراز فرمائے تو تمہارے غم و غصہ کے علی الرغم یہ بات ہو کے رہے گی اور تمہارا کوئی حامی اور مددگار خدا کے اس فیصلہ سے تمہیں بچا نہیں سکتا (وہ تو ہر چیز اور ہر بات پر یقیناً قادر ہے)۔'' (تدبر قرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) یہود کا یہ غم و غصہ ہر دور اور ہر زمانے میں رہا ہے وہ مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے ہیں، حال ہی میں امریکہ کے اندر جو سازش ہوئی اس کی تہہ میں یہود کی شرارتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے اور افغانستان، عراق اور لبنان کے نہتے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھایا گیا ہے وہ تمام تر سرمایہ اور مہلک ہتھیار یہود کے فراہم کردہ ہیں۔

۲) یہود نے اپنے ساتھ نصاریٰ کو بھی ملا لیا ہے، بلکہ اسلامی ملکوں کے کئی سربراہ بھی زور وزر سے اپنے مطیع وفرمانبردار بنا لیے ہیں کاش کہ مسلمان قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھیں کہ صرف اور صرف یہی روشن کتاب اور اس کی پاکیزہ تعلیمات انہیں کامرانیوں سے ہمکنار کر سکتی ہیں۔

اَمۡ تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡئَلُوۡا رَسُوۡلَكُمۡ كَمَا سُئِلَ مُوۡسٰى مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَمَنۡ يَّتَبَدَّلِ الۡكُفۡرَ بِالۡاِيۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ (۱۰۸) وَدَّ كَثِيۡرٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَوۡ يَرُدُّوۡنَكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِكُمۡ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِهِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الۡحَقُّ ۚ فَاعۡفُوۡا وَاصۡفَحُوۡا حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ (۱۰۹)	’’(اے مسلمانو!) پھر کیا تم اپنے رسول سے اسی قسم کے سوالات کرنا چاہتے ہو جو اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے کئے جا چکے ہیں اور جس شخص نے ایمان کو کفر سے بدلا، وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا، اہل کتاب میں سے اکثر یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہارے ایمان لانے کے بعد پھر سے تمہیں کافر بنا دیں، اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لیے ان کی یہ خواہش ہے، لہٰذا اس کے جواب میں تم عفو و درگزر سے کام لو، یہاں تک کہ اللہ (ان کے بارے میں) اپنا فیصلہ صادر فرمائے، (جان لو) کہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔‘‘

﴿اَمۡ تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡئَلُوۡا رَسُوۡلَكُمۡ كَمَا سُئِلَ مُوۡسٰى مِنۡ قَبۡلُ﴾

(اے مسلمانو!) پھر کیا تم اپنے رسول سے اس قسم کے سوالات کرنا چاہتے ہو جو اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے کیے جا چکے ہیں۔

اَمْ حرف ہے، معنی: یاتُرِیْدُوْنَ، تم ارادہ کرتے ہو مضارع جمع مذکر مخاطب (اَرَادَ، یُرِیْدُ، اِرَادَۃً) اَنْ تَسْئَلُوْا، یہ کہ تم سوال کرو (سَأَلَ، یَسْأَلُ، سُؤَالٌ) سوال کرنا، کَمَا (کَ. مَا) جیسا کہ سُئِلَ، ماضی مجہول واحد مذکر، سوال کیے گئے، مُوْسٰی، سیدنا موسیٰ علیہ السلام، مِنْ سے، قَبْلُ پہلے یعنی اس سے پہلے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے بے مقصد اور لایعنی سوالات کئے۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''موسیٰ علیہ السلام کی قوم..... بنی اسرائیل..... نے انہیں طرح طرح سے پریشان کیا، ان سے دلائل اور معجزات کا مطالبہ کیا اور جب بھی ان کے رسول نے انہیں کوئی حکم دیا، یا ان پر کوئی ذمہ داری ڈالی، تو انہوں نے ان کو زِچ کیا جیسا کہ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر ان کی اس روش کو بیان کیا گیا ہے..... کچھ مسلمان، جو اس سے ملتی جلتی روش اختیار کر رہے تھے، اس پر نکیر کی گئی ہے اور انہیں بتایا گیا ہے کہ اس راستے پر چلنے کا انجام ہولناک ہے اور وہ ہے گمراہی اور ایمان کے بدلے کفر کو اختیار کرنا، یہود اس راہ پر چل کر اس مقام تک پہنچے اور وہ مسلمانوں کو اپنی رہنمائی میں اس ہولناک انجام تک پہنچانا چاہتے ہیں۔''

(فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ﴾

'(اس کا انجام یہ ہوگا) کہ جس نے ایمان کو کفر سے بدلا وہ صراط مستقیم سے بھٹک گیا۔

وَمَنْ اور جو (من) موصول، یَّتَبَدَّلِ تبدیل کرنا، (تَبَدَّلَ، یَتَبَدَّلُ تَبَدُّلًا) باب تفعل، تبدیل کرنا، الْکُفْرَ کفر، ایمان کی ضد ہے، بِالْاِیْمَانِ (بِ–الْاِیْمَانِ) بدلے، ایمان کے، یعنی جو ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کرتا ہے، فَقَدْ (فَ– قَدْ) پس، بلاشبہ، قَدْ کلام میں تحقیق پیدا کرتا ہے۔ ضَلَّ (ضَلَّ. یَضِلُّ. ضَلَالًا) گمراہ ہوا، بھٹک گیا، ضلالت و گمراہی اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، سَوَآءَ السَّبِیْلِ سیدھی راہ، صراط مستقیم، کفر کی راہ یقیناً حق و صداقت کی راہ سے الگ تھلگ ہے اور جو بھی اسے اختیار کرتا ہے سیدھی راہ سے دور جا پڑتا ہے۔

''وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ اَیْ اَخَذَ الْکُفْرَ وَتَرَکَ الْاِیمانَ، کفر اختیار کیا اور ایمان کو چھوڑا، فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِیْلَ اَیْ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ، وہ گویا کہ صراط مستقیم سے بھٹک گیا۔''

(تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن)

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا﴾

اہل کتاب میں سے اکثر یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہارے ایمان لانے کے بعد پھر سے تمہیں کافر بنادیں۔

وَدَّ (وَدَّ، يَوَدُّ، وُدًّا) چاہنا، دل سے خواہش رکھنا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ (اہل کتاب میں سے) اَیْ تَمَنّٰی كَثِيْرٌ مِّنَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰی اَنْ يَصْرِفُوْكُمْ عَنْ تَوْحِيْدِاللّٰهِ وَالْاِيْمَانِ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ يَرْجِعُوْكُمْ كُفَّارًا كَمَا كُنْتُمْ حَسَدًا لَّكُمْ، یہود ونصاری میں سے اکثر تمہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان سے پلٹا کر کفر کی طرف لے جانا چاہیں گے محض حسد اور بغض کی وجہ سے (المراغی) لَوْ کلمہ تمنّا (کاش) يَرُدُّوْنَكُمْ (يَرُدُّوْنَ. كُمْ) لوٹائیں وہ۔تم کو (رَدَّ، يَرُدُّ، رَدًّا) لوٹانا، واپس کرنا، ﴿مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا﴾ تمہارے ایمان لانے کے بعد کفر میں، یعنی یہود ونصاریٰ کی یہ انتہائی خواہش ہے کہ تم ایمان اور اسلام کو چھوڑ کر کفر کو اختیار کرلو، ﴿حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ حسد کے سبب جو ان کے نفسوں میں جوش مارتا ہے، دوسروں کی نعمت کے زوال کی خواہش کو حسد کہتے ہیں اور دل میں ایسا بغض رکھنے والا حاسد کہلاتا ہے اور یہ بدترین عادت ہے، قرآن حکیم میں حاسد کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی گئی ہے: وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (الفلق ۱۱۳:۵) ''(اے اللہ! میں پناہ مانگتا ہوں) حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے۔''

یاد رکھیے سورۃ الاخلاص، سورۃ الفلق، سورۃ الناس کو خاص طور پر سونے سے پہلے ضرور پڑھ لینا چاہیے۔

غبطه اور حسد میں فرق ہے، غبطه کسی اچھی بات پر رشک کرنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا ہے یہ خواہش کیے بغیر کہ کسی سے کوئی نعمت چھن جائے جبکہ حسد میں ہمیشہ دوسروں کی نعمت دیکھ کر دل جلتا رہتا ہے، مومن اچھے کاموں پر رشک کرتا ہے جبکہ منافق حسد سے کام لیتا ہے۔

﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ﴾ اس بات کے بعد کہ حق (دین حق) ان پر واضح ہوگیا۔

یعنی خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور قرآن حکیم کی حقانیت ان پر واضح ہوگئی کہ یہ بشارت تورات وانجیل میں بھی موجود تھی۔

﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾

فَاعْفُوْا (فَ. اعْفُوْا) پس،تم معاف کردو،فعل امر جمع مذکر (عَفَا، یَعْفُوْ، عَفْوًا) گناہ کو معاف کر دینا اور اس پر مواخذہ نہ کرنا، وَاصْفَحُوْا (وَ. اِصْفَحُوْا) اور، درگزر کر، فعل امر جمع مذکر (صَفَحَ، یَصْفَحُ، صَفْحًا) لعنت ملامت نہ کرنا، بلکہ کشادہ دلی سے چھوڑ دینا، حَتّٰی یہاں تک کہ یَأْتِیَ لائے (اَتٰی یَأْتِی، اِتْیَانٌ)، آنا اور اس کے بعد 'ب' آجائے تو مفہوم لانا کے ہوتے ہیں، حَتّٰی یَأْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''اور تم اس راستے پر چلتے رہو جو اللہ نے تمہارے لیے منتخب فرمایا ہے اور اپنے رب کی بندگی و اطاعت کرو اور اس کے یہاں اپنے نیک اعمال کا ذخیرہ کرتے رہو (اور ان کے معاملات میں خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کرو)۔''

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) بغیر کسی مقصد کے سوالات کرتے رہنا اور عمل سے گریزاں رہنا، پسندیدہ بات نہیں ہے۔

۲) ایمان لانے کے بعد کفر میں پڑنا انتہائی مذموم بات ہے گویا کہ ایسا شخص جو ایمان لانے کے بعد کفر کو اختیار کرتا ہے وہ روشنی کو چھوڑ کر تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے۔

۳) حق اور باطل میں صرف وہی شخص فرق کر سکتا ہے جو تعصب اور ضد کی عینک اتار پھینکتا ہے۔

۴) دوسروں کے ساتھ حتی الوسع عفو و درگزر سے کام لینے اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہنے سے انسان کو بہت سی مشکلات سے نجات مل جاتی ہے، قرآن نے کئی جگہ مختلف پیرایوں میں یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہیں کہا گیا: وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِیْنَ (الاعراف:۱۹۹) یعنی جہلا سے کنارا کرتے رہیں۔ اور کہیں عباد الرحمٰن کے بارے میں ارشاد ہوا: وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا (الفرقان:۶۳) ''اور اگر جاہل ان سے مخاطب ہوں تو وہ ان کو (دور سے) سلام کرتے ہیں (یعنی الگ ہو جاتے ہیں اور ان کے منہ نہیں لگتے ہیں)''

۵) اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی مسلمانوں سے دشمنی ہمیشہ رہی ہے، وہ کبھی بھی مسلمانوں کو پھلتے پھولتے دیکھنا پسند نہیں کرتے، افغانستان میں نظام اسلام کا قوت پکڑنا انہیں کسی طرح بھی پسند نہ تھا،

چنانچہ وہ کفر کی طاقتوں کو اکٹھا کر کے بلا جواز نہتے مسلمانوں پر گزشتہ دو ماہ سے بمباری کر رہے ہیں (جو آج 20 رمضان 1422ھ تک جاری ہے) اور نا قابل بیان جانی و مالی نقصان ہوا ہے، افسوس کہ مسلمانوں نے قرآن حکیم کی روشن تعلیمات کو فراموش کر رکھا ہے، اسی وجہ سے انہیں نقصان پہنچ رہا ہے، کفار نے تو اپنا پلیٹ فارم ایک بنا لیا ہے بلکہ مسلمانوں میں سے منافقین کو بھی اپنے ساتھ جوڑ لیا ہے مگر افسوس کہ مسلمان بکھرے ہوئے ہیں اور ان کی صفوں میں کہیں اتحاد نظر نہیں آتا۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ، وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱۰)	اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور تم اپنی عاقبت کے لیے جو بھلائی کما کر آگے بھیجو گے، اللہ کے ہاں اسے موجود پاؤ گے اور جو کام تم کرتے ہو بلاشبہ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ۔

وَاَقِيْمُوْا اور قائم کرو فعل امر جمع مذکر (اَقَامَ، يُقِيْمُ، اِقَامَةً) قائم کرنا، ''اِقَامَةِ صَلٰوة'' نماز کو پورے آداب کے ساتھ سنت کے مطابق وقت کی پابندی سے باجماعت، نیز خشوع و خضوع اور حضور قلب سے ادا کرنا ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

''الاقامة فی المکان کے معنی کسی جگہ پر ٹھہرنے اور قیام کرنے کے ہیں اور اِقَامَةُ الشَّیْءِ (کسی چیز کی اقامت) کے معنی اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ (المائدہ ۵:۶۸) ''فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب! جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہ رکھو گے تم کسی بھی راہ پر نہیں ہو سکتے (یعنی

جب تک کہ علم وعمل سے ان کے پورے حقوق ادا نہ کرو، راہ ثواب نہیں پا سکتے ہو)

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں کہیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے یا نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے وہاں اِقَامَۃٌ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس میں اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ نماز سے مقصود محض اس کی ظاہری ہیئت کا ادا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسے جملہ شرائط کے ساتھ ادا کرنا مراد ہے، اسی بنا پر کہیں اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ اور کہیں وَالۡمُقِیۡمِیۡنَ الصَّلٰوۃَ یعنی 'نماز کو قائم کرنے والے' آیا ہے۔ (مفردات القرآن)

الصلٰوۃ کے لغوی معنی دعا کے ہیں مگر اصطلاح میں صَلٰوۃ (نماز) سے مراد وہ مخصوص عبادت ہے جو مسلمان دن رات میں پانچ وقت اللہ تعالیٰ کے حضور دست بستہ کھڑے ہو کر رکوع وسجود کی صورت میں بجا لاتا ہے۔

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ اور ادا کرو زکوٰۃ (اٰتٰی، یُؤۡتِیۡ، اِیۡتَاءٌ) دینا، عطا کرنا، الزَّکٰوۃ اس کا مادہ (ز ک و) ہے۔

امام راغب لکھتے ہیں:

''الزکوٰۃ کے اصل معنی پھلنے پھولنے کے ہیں، یہ بات اللہ تعالیٰ کی عنایت ورحمت سے حاصل ہوتی ہے، اس کا تعلق دنیاوی چیزوں سے بھی ہے اور اُخروی امور سے بھی، عربی محاورہ ہے: زَکَا الزَّرعُ، کھیتی پھلی پھولی۔ ایک آیہ مبارکہ میں ہے: اَیُّھَا اَزۡکٰی طَعَامًا (الکھف:۱۹) کس کا کھانا زیادہ صاف ستھرا ہے۔

اَزۡکٰی سے ایسا کھانا مراد ہے جو حلال اور خوش ذائقہ ہو۔ اس سے زکوٰۃ کا لفظ مشتق ہے یعنی (کسب حلال) سے وہ مال جو اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ حق نکال کر فقراء ومساکین کو دیا جاتا ہے۔ اسے زکوٰۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں خیر وبرکت کی امید ہوتی ہے اور اس لیے بھی کہ اس سے نفس پاکیزہ ہوتا ہے۔ (مفردات القرآن)

﴿وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ﴾

اور جو کچھ تم آگے بھیجو گے اپنے لیے نیکی میں سے، پاؤ گے (اجر اس کا) اللہ تعالیٰ کے پاس۔ بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم عمل کرتے ہو اسے دیکھتا ہے۔

وَمَا اور جو یہاں پر مَا موصولہ ہے تُقَدِّمُوۡا مضارع جمع مذکر مخاطب (قَدَّمَ، یُقَدِّمُ، تَقۡدِیۡمٌ) آگے بھیجنا، لِاَنۡفُسِکُمۡ (لِ. اَنۡفُسِ. کُمۡ) لئے، نفسوں، اپنے کے، یعنی اپنے نفسوں کے لیے مِّنۡ خَیۡرٍ، بھلائی اور نیکی میں سے تَجِدُوۡہُ تم پاؤ گے اسے (وَجَدَ، یَجِدُ، وِجۡدٌ) پانا، عِنۡدَ اللّٰہِ، اللہ تعالیٰ کے پاس، اِنَّ

اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ، بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم عمل کرتے ہو اسے دیکھتا ہے۔ کلمہ طیبہ کے سچے دل سے اقرار کے بعد اسلامی معاشرے کو مضبوط اور توانا بنانے میں نماز اور زکوٰۃ کا بڑا اہم کردار ہے نماز معاشرتی زندگی کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کرتی ہے جبکہ زکوٰۃ تمام معاشی ناہمواریوں کا بہترین حل ہے۔ کوئی ریاست جب معاشرتی اور معاشی طور پر مضبوط ہو جاتی ہے تو وہاں ہمہ جہت تعمیر و ترقی ہوتی ہے اور کوئی دشمن اسے میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا اور وہ ہر طرح سے فلاحی ریاست کہلاتی ہے۔ اس لیے قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر نماز اور زکوٰۃ کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ مسلمانوں کو معاندین اسلام کی مخالفتوں کا علاج بتایا گیا ہے کہ اگر تم ان فتنوں پر غالب آنا چاہتے ہو تو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو، اسی سے تمہاری وہ روحانی و اخلاقی تربیت ہوگی جو تمہیں ایک طرف تو مخالفین کی وسوسہ اندازیوں سے بالکل مامون کر دے گی دوسری طرف تم کو جماعتی حیثیت سے ایک ایسی بنیانِ مرصوص بنا دے گی کہ کوئی طاقت بھی تمہیں ہلا نہ سکے گی، قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کو تمام دین کی بنیاد، تمام تربیت و اصلاح کی اساس اور تمام قوت و طاقت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے اور دوسری ساری چیزوں کو ان کے تابع قرار دیا گیا ہے، مکی سورتوں میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کے مقابل میں صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے، وہاں نماز کی تاکید کی گئی ہے، سورہ البقرہ میں تحویل قبلہ کے حکم کے بعد جب مخالفت کا طوفان اٹھا تو فرمایا گیا کہ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ (بقرہ۲:۱۵۳) ''اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ مدد چاہو بلا شبہ اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔'' اسی طرح جو لوگ مضبوط تربیت کے بغیر جنگ و جہاد کے لیے جلدی مچاتے تھے ان کو نماز و زکوٰۃ کے ذریعہ اپنی تربیت کرنے کی ہدایت کی گئی ہے: كُفُّوۡۤا اَیۡدِیَكُمۡ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (النساء:۷۷) ''ابھی تم اپنے ہاتھ روکو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔''

سورۂ حج میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم دینے کے بعد ہدایت فرمائی کہ: فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ (حج:۷۸) ''پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ (کہ وہی حقیقی سہارا ہے)۔''

(تدبر قرآن)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) جہاد ایسی قیمتی چیز سے پہلے نفس کی تہذیب واصلاح، نیز معاشرتی اور معاشی قوت ضروری ہے اور اس کا حصول صرف نماز اور زکوٰۃ سے ہوسکتا ہے، ہمارے اسلاف نے قرآن حکیم کی ان تعلیمات پر کاربند ہوکر کامیابیاں حاصل کی ہیں اور ہم انہیں فراموش کرکے خائب وخاسر ہوئے ہیں۔

۲) نماز کی صف بندی سے اتحاد کی قوت پیدا ہوتی ہے اور امام کی اقتداء میں نظم وضبط کا شعور پیدا ہوتا ہے، پھر غور کیجئے، اس کا دائرہ کتنا وسیع ہوتا ہے، محلّہ اور بستی کی مسجد سے آگے شہروں کی جامع مسجد میں نماز جمعہ پھر کھلے میدانوں میں عیدین کی نمازیں، پھر ایام حج میں عرفات کے میدان میں دنیا بھر کے مسلمانوں کی صف بندی کا روح پرور اجتماع انہیں اتحاد واتفاق کا عظیم درس دیتا ہے، کاش کہ مسلمان اس کو سمجھنے کی کوشش کریں، ایک اور نیک بن کر، آپس میں معین ومددگار بنیں، تو دنیا کی سپر پاور وہی ہوں گے۔ ان شاء اللہ!

۳) اگر تمام اسلامی ملکوں میں نماز اور زکوٰۃ کا نظام جاری وساری ہوجائے تو مسلمان نہ صرف عظیم قوت بن سکتے ہیں بلکہ قرض اٹھانے کی بجائے (جس میں ذلت وخواری کے سوا کچھ نہیں ہے) زکوۃ کے مال سے اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہوسکتے ہیں۔

۴) پاکستان میں آج تک اسلامی قانون شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا جس کے لیے ہم سب مجرم ہیں، اخلاقی اور معاشی دونوں طرح ملک دیوالیہ ہوچکا ہے، اگر شروع ہی سے نماز اور زکوٰۃ کا نظام نافذ ہوتا تو یہ برے دن دیکھنے نہ پڑتے، کیا اتنا نقصان اٹھانے کے بعد اب بھی ہم سنبھلنے کی کوشش نہ کریں گے؟

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ، قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۱۱) بَلٰى، مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ، وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ، وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱۱۲)	اور وہ (یہود و نصاریٰ) کہتے پھرتے ہیں کہ جنت میں صرف وہی شخص داخل ہوگا جو یہودی ہو یا عیسائی ہو، یہ ان کی (جھوٹی) تمنائیں ہیں آپ ان سے کہیے کہ ''اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو تو اس کے لیے کوئی دلیل پیش کرو۔'' بات دراصل یہ ہے کہ جس کسی نے (احکام الٰہی کے سامنے) سر تسلیم خم کر لیا اور وہ (زندگی بھر) نیکوکار رہا، تو اس کا اجر اس کے رب کے ہاں (ثبت) ہو گیا اور ایسے لوگوں کو (احتساب سے قبل) نہ کوئی خوف و ہراس ہوگا اور (احتساب کے بعد) نہ وہ ملول و حزین ہوں گے۔''

﴿وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾

اور انہوں نے کہا، ہرگز داخل نہ ہوں گے جنت میں مگر جو کوئی ہو یہودی یا نصرانی۔

وَقَالُوْا اور انہوں نے کہا (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، قول و قرار اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے، لَنْ يَّدْخُلَ ہرگز داخل نہ ہوگا (دَخَلَ، يَدْخُلُ، دُخُوْلًا وَ مُدْخَلًا) اندر آنا، داخل ہونا، لَنْ فعل مضارع کے حروف ناصبہ میں سے ہے (یعنی جو الفاظ فعل مضارع پر زبر ڈالتے ہیں مثلاً يَدْخُلُ سے لَنْ يَدْخُلَ ہوا اور نفی اور استقبال کے معنی پیدا کرتا ہے، وہ ہرگز داخل نہ ہوگا) اِلَّا کلمہ استثناء، سوائے (Except) مَنْ (جو کوئی) اسم موصول ہے، كَانَ، ہو (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) واقع ہونا، هُوْدًا، یہودی (هَادَ، يَهُوْدُ) کے لغوی معنی، توبہ کرنا، حق کی طرف لوٹنا اس سے اسم صفت هائد اور جمع هُوْدٌ، تائب اور رجوع کرنے والا اب یہ لفظ یہود کے لیے مخصوص ہو گیا اور اس میں صفت کے معنی ختم ہو گئے ہیں، نصاریٰ، نصرانی کی جمع ہے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گاؤں 'ناصرہ' سے لیا گیا ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ یہود و نصاریٰ خود ساختہ نام ہیں، روز اول ہی سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے زندگی گزارنے کا جو منشور عطا کیا وہ اسلام ہے، اسی دین کی دعوت ہر نبی اور رسول نے اپنی اپنی قوم کو دی اور خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دین کے ساتھ نسل انسانی کو یہ مژدۂ جانفزا سنایا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ ۵:۳) ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے بحیثیت دین، اسلام کو پسند کیا ہے۔''

ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ، مِنْ قَبْلُ وَ فِیْ ھٰذَا (الحج ۲۲:۷۸) ''اللہ نے اس سے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (مسلم ہی رکھا ہے)''۔

﴿تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ﴾ یہ ان کی خواہشات ہیں، تِلْکَ اسم اشارہ بعید واحد مؤنث، اُمْنِیَّۃٌ، آرزو، تمنا، مفرد ہے، (اَمَانِیُّ. ھُمْ) تمنائیں، ان کی، یہ تو محض ان کی خام خیالیاں ہیں، ﴿قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ کہہ دیجیے، لاؤ، دلیل اپنی اگر تم سچے ہو، قُلْ فعل امر، (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا ھَاتُوْا. لاؤ، (بُرْھَانَ. کُمْ) دلیل، اپنی، اِنْ کُنْتُمْ اگر ہو تم صٰدقین سچے، یعنی اس دعوے کی سچائی پر اپنی کتاب سے کوئی دلیل پیش کرو، کوئی سند لاؤ اس لیے کہ علم کی بنیاد ٹھوس شواہد پر ہوتی ہے، اس کے بعد قرآن حکیم اسلامی فکر کا ایک بنیادی اصول بیان کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جزا ٹھوس عقیدہ اور عمل صالح پر مرتب ہوگی اور اس میں کسی امت، کسی گروہ، کسی نسل اور قوم اور کسی فرد کا کوئی پاس و لحاظ نہ کیا جائے گا۔

﴿بَلٰی، مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَلَہٗٓ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ﴾ کیوں نہیں، جو کوئی، سپرد کر دے، چہرہ اپنا، اللہ کے واسطے (یعنی احکام الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے) اور وہ محسن (نیکوکار بھی ہو) پس، اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ، اور نہیں خوف اوپر ان کے وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) یہود ونصاریٰ یوں تو آپس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، آئے دن ان کے اندر مذہبی اختلاف کی بنا پر لڑائی جھگڑا، دنگا فساد برپا رہتا تھا اور ایک دوسرے کی تکذیب وتنقیص میں پیش پیش تھے جیسا کہ قرآن نے کہا: ''یہود یہ کہتے ہیں کہ نصاریٰ کے پاس کچھ نہیں اور نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ یہود کے پاس کچھ نہیں ہے حالانکہ وہ دونوں کتاب (تورات، انجیل) پڑھتے ہیں'' (البقرہ:۱۱۳) مگر اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں دونوں آپس میں بڑے روادار بن جاتے اور ہم زبان ہوکر یہ پروپیگنڈہ کرتے کہ جس کو نجات مطلوب ہو وہ یہودی بنے یا نصرانی، یہ نیا دین (دین محمدی) ان کے لیے قابل قبول نہیں ہے، حالانکہ یہی وہ دین حق ہے جس کی ابتدا آدم علیہ السلام سے ہوئی اور جس کی تکمیل کی خوشخبری خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی، یہود ونصاریٰ کی مسلمانوں کے خلاف یہ دشمنی آج تک جاری ہے، حال ہی میں افغانستان اور عراق پر جو ظلم وستم ڈھایا گیا اور جس وحشت وبربریت کا مظاہرہ ہوا وہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے اور پھر دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم ہوتا ہے انہیں خوشی اور اطمینان ہوتا ہے، فلسطینی کتنے برسوں سے یہود کے ظلم وستم کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں، اقوام عالم نے اس کے خلاف کتنی مرتبہ قرار دادیں منظور کیں مگر امریکہ نے ہمیشہ ''ویٹو'' کرکے بھرپور انداز سے یہود کی حمایت کردی۔

۲) اسلام کی دعوت عام اور عالمگیر ہے، وہ گروہ بندیوں اور دھڑے بندیوں سے بالا ہے، وہ دین فطرت ہے اور زندگی گزارنے کا شفاف اور پاکیزہ دستور ہے اور جو شخص بھی خواہ اس کا تعلق کسی رنگ اور نسل سے ہو، کسی خطے اور علاقے کا رہنے والا ہو، کوئی بھی زبان بولتا ہو، وہ اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ بن کر اس کے احکام کو زندگی کا لائحہ عمل بنالے تو اس کے لیے دنیا وآخرت کی کامیابی کا مژدہ جانفزا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ، وَقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ، كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۱۱۳)	یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا دین کچھ نہیں ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے ؟ حالانکہ اللہ کی کتاب دونوں پڑھتے پڑھاتے ہیں (اور اصل دین دونوں کے لیے ایک ہی ہے) ٹھیک ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی جو (مقدس نوشتوں کا) علم نہیں رکھتے (یعنی مشرکین عرب) سو اللہ ہی روز قیامت ان کے درمیان حاکم ہوگا اور جس بات میں وہ جھگڑ رہے ہیں اس کا فیصلہ کر دے گا۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ﴾ اور کہا یہود نے کہ نہیں نصاریٰ کسی شے پر، (یعنی ان کا دین کچھ نہیں) (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا اور اس سے قَالَتْ فعل ماضی واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور جماعت یہود کے لیے استعمال ہوا ہے لَيْسَتْ، فعل ماضی مؤنث (ناقص) کہلاتا ہے۔ لَيْسَ نفی کے لیے آتا ہے، اس کی گردان صرف ماضی معروف تک محدود ہے، النَّصٰرٰى، عیسائی، عَلٰى شَيْءٍ (کسی چیز پر) (شَاءَ يَشَاءُ) چاہنا، ارادہ کرنا، لفظ شَيْءٍ اسی سے ماخوذ ہے شئے، اشیاء، مشیت اردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں، یعنی یہود نے کہا کہ نصاریٰ کا دین صحیح نہیں اور وہ دین حق سے غافل اور بیگانہ ہیں۔

﴿وَقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ﴾

اور یہی بات نصاریٰ نے یہود کے حق میں کہی۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''اسلام کی مخالفت کے لیے یہود اور نصاریٰ دونوں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے اور ایک دوسرے کو بڑی فیاضی کے ساتھ نجات یافتہ اور جنتی قرار دے رہے ہیں لیکن اس پلیٹ فارم سے الگ ان کی باہمی

تکفیر و تفسیق اور جنگ و جدل کا یہ حال ہے کہ یہود نصاریٰ کی کوئی جڑ بنیاد تسلیم نہیں کرتے اور نصاریٰ یہود کے لیے کوئی بنیاد تسلیم نہیں کرتے، حالانکہ دونوں ایک ہی کتاب کی پیروی کے مدعی ہیں، تورات دونوں میں مشترک ہے اس سے واضح ہوا کہ آج جو ان کے اندر یہ گٹھ جوڑ ہو گیا ہے یہ نہ تو دین کے تحفظ کے لیے ہے نہ کسی اخلاص اور نیک نیتی پر مبنی ہے بلکہ محض اسلام دشمنی کا جذبہ ہے جس نے ان کو متحد کر دیا ہے''۔ (تدبر قرآن)

حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں:

''نجران کے نصاریٰ کا وفد جب نبی کریم ﷺ کے پاس آیا تو ان کے پاس یہودیوں کے علماء بھی آئے۔ اس وقت ان لوگوں نے انہیں اور انہوں نے ان کو گمراہ بتایا حالانکہ دونوں اہل کتاب ہیں تورات میں انجیل کی تصدیق اور انجیل میں تورات کی تصدیق موجود ہے پھر ان کا یہ قول کس قدر لغو ہے، اگلے یہود و نصاریٰ دین حق پر قائم تھے لیکن پھر بدعتوں اور فتنہ پردازیوں کی وجہ سے دین ان سے چھن گیا اب نہ یہود ہدایت پر ہیں اور نہ نصاریٰ۔'' (تفسیر ابن کثیر، جلد اول)

﴿كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ﴾

اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے۔ ان کے قول کے مثل۔

كَذٰلِكَ 'اسی طرح یعنی جس طرح یہود و نصاریٰ کی بات ہے **لَا يَعْلَمُوْنَ** نہیں جانتے ہیں (**عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا**) جاننا، **مِثْلَ قَوْلِهِمْ** ان کے قول کے مثل۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''**الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ** (جو علم نہیں رکھتے) سے مراد مشرکین بنی اسماعیل ہیں، اس لیے کہ یہ کتاب و شریعت سے ناآشنا اُمّی تھے، ان کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے بھی انہی لوگوں کی سی بات کہی یعنی یہ بھی اپنے سوا سب کو باطل پر سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام کی مخالفت کے لیے آج یہ بھی اس مشترکہ محاذ میں شامل ہیں۔ وہ (یہود و نصاریٰ) ایک کتاب کے علم اور عمل کے مدعی ہوتے ہوئے دین کی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور یہ (مشرکین) بغیر کسی علم ہی کے پانچوں سواروں میں جا شامل ہوئے ہیں۔ **كَذٰلِكَ** اور **مِثْلَ قَوْلِهِمْ** کے الفاظ بظاہر دونوں ایک ہی مفہوم کے حامل نظر آتے ہیں لیکن غور کرنے سے دونوں سے یہ حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں: ایک سے تحرک اور جذبہ کا اشتراک ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے سے تعبیر کا، یعنی یہ بھی نیت اور عمل دونوں میں انہی یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾

پس اللہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن اس بات کا جس میں کہ وہ اختلاف کرتے ہیں۔

يَحْكُمُ (حَكَمَ، يَحْكُمُ، حُكْمًا) فیصلہ کرنا' بَيْنَهُمْ 'ان کے درمیان' یعنی اہل حق اور اہل باطل کے درمیان' اہل حق کے لیے جنت ہوگی اور اہل باطل کے لیے جہنم' يَوْمَ الْقِيَامَةِ' قیامت کے روز' فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ 'اس بات پر جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں (اِخْتَلَفَ، يَخْتَلِفُ، اِخْتِلَافًا) اختلاف کرنا۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) حق اور باطل کی پہچان کا معیار ذاتی خواہشات نہیں بلکہ حقیقی علم ہے اور وہ وحی الٰہی ہے۔
۲) کوئی شخص کبھی کسی حقیقت کو نہیں پا سکتا جب تک کہ تعصب اور ہٹ دھرمی سے بالا ہو کر نہ سوچے۔
۳) یہود و نصاریٰ کا آپس میں مذہبی عناد محض ضد اور جہالت پر مبنی تھا۔
۴) مسلمانوں میں دھڑے بندیاں اور فرقہ بندیاں بھی محض نفس کی خباثتوں کا نتیجہ ہے ورنہ دین تو حق وصداقت، رواداری اور مساوات، اخوت و بھائی چارہ اور احسان ومروت کا درس دیتا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا، اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ، لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۱۴) وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ، فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۱۱۵)	اور اس (بدقسمت انسان) سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی مساجد میں اللہ کے ذکر سے منع کرے اور ان کی ویرانی میں کوشاں ہو، انہیں تو چاہیے تھا کہ مساجد میں اللہ سے ڈرتے ڈرتے داخل ہوتے ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی (مقدر) ہے اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے مشرق بھی اللہ تعالیٰ کا ہے اور مغرب بھی اللہ تعالیٰ کا ہے پس تم جس طرف بھی رخ کرو گے، اللہ تعالیٰ کو متوجہ پاؤ گے، اللہ تعالیٰ صاحب وسعت ہے اور صاحب علم وحکمت ہے۔

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا﴾
اوراس (بدقسمت انسان) سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی مساجد میں اللہ کے ذکر سے منع کرے اوران کی ویرانی میں کوشاں ہو۔

وَمَنْ اورکون ہے؟ مَنْ، استفہامیہ ہے اور کبھی یہ انکار اور نفی کے لیے آتا ہے اَلْاِسْتِفْهَامُ لِلْاِنْكَارِ وَ النَّفْيِ (ایسر التفاسیر) اَظْلَمُ ، بڑا ظالم، ظَالِمٌ، ظلم کرنے والا، اس سے تفضیل کا صیغہ اَظْلَمُ ہے، بڑا ظالم، مِمَّنْ اس سے جو (مِنْ. مَا) سے، جو، مَّنَعَ ،منع کرے، روکے (مَّنَعَ ، يَمْنَعُ، مَنْعًا) روکنا، منع کرنا، مَسٰجِدَ اللّٰهِ اللہ کی مساجد، اس کا مفرد مَسْجِدٌ ہے، اَنْ يُّذْكَرَ کہ ذکر کیا جائے اَنْ مضارع پر نصب (زبر) دیتا ہے (ذَكَرَ، يَذْكُرُ، ذِكْرًا) يَذْكُرُ سے مجہول کا صیغہ يُذْكَرُ ہوا اور اَنْ کی وجہ سے يُّذْكَرَ ہوا، فِيْهَا (فِيْ. هَا) میں، ان۔هَا کی ضمیر مساجد کی طرف جاتی ہے، اسْمُهٗ (اِسْمُ. هٗ) نام، اس کا (اللہ تعالیٰ کا) هٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے، وَسَعٰى اور کوشش کرے (سَعٰى، يَسْعٰى، سَعْيٌ) کوشش کرنا، سعی اور کوشش اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ فِيْ خَرَابِهَا ان کی خرابی میں، (یعنی مساجد کو بے رونق اور بے آباد کرنے میں) هَا کی ضمیر مساجد کی طرف جاتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''فقہاء نے کہا ہے کہ جس طرح اللہ کے ذکر سے مسجد آباد ہوتی ہے، ممنوعات اور بدعات کے ارتکاب سے مسجد کی بربادی سمجھی جائے گی نیز وہ تمام امور جو نمازیوں کی کمی اور مسجد کی ویرانی کے باعث ہوں، آیت کے تحت داخل ہوجاتے ہیں۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

محمد جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں:

''گزشتہ آیات میں یہود و نصاریٰ کی گمراہی کا تذکرہ تھا اس آیہ مبارکہ میں مشرکین مکہ کی کج روی کا ذکر ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنھم کو سرزمین مکہ سے نکالا اور بیت اللہ میں نمازیں ادا کرنے سے روکا اور منع کیا، یہ اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے سال عمرہ کی غرض سے وہاں تشریف لے گئے اور مشرکین مکہ نے اپنے بتوں اور شرکاء کی خاطر بیت اللہ کی ویرانی اور خرابی کا سروسامان کیا اور مسلمانوں کو حرم مکہ میں داخلے کی اجازت نہ

دی، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

❐ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْا اَوْلِيَآءَهٗ، اِنْ اَوْلِيَاؤُهٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (الانفال ۸:۳۴)

''اللہ ان لوگوں کو کیوں عذاب نہ دے جو دوسروں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں حالانکہ وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی تو وہی ہو سکتے ہیں جو متقی ہوں لیکن ان میں سے اکثر لوگ یہ حقیقت نہیں جانتے ہیں''۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

❐ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ، اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَ فِى النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ، اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ، فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ (التوبہ ۹:۱۷،۱۸)

''مشرکوں کا یہ کام نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں، وہ تو خود اپنے آپ پر کفر کی شہادت دے رہے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے سب اعمال ضائع ہو گئے اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، اللہ کی مساجد کو آباد کرنا تو اس کا کام ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، قیام صلوٰۃ کی پابندی کرے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے، امید ہے کہ ایسے ہی لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے''۔

اور مسجد سے مراد صرف بیت اللہ ہی نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں (دنیا) کی ہر مسجد آ جاتی ہے۔ اِس آیہ مبارکہ میں لفظ مساجد (جمع) استعمال ہوا ہے پھر سورۃ التوبہ کی آیت ۱۶/اور ۱۷/ میں بھی مساجد (جمع کا صیغہ) استعمال ہوا ہے، جس سے مراد دنیا بھر کی مساجد ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ﴾

انہیں تو چاہیے تھا کہ مساجد میں اللہ سے ڈرتے ڈرتے داخل ہوتے۔

اُولٰٓئِكَ وہی لوگ ہیں، اسم اشارہ جمع مذکر (دور کے لیے) مَا كَانَ نہیں ہے، مَا (نافیہ) نفی کے معنی دیتا ہے، مَا كَانَ لَهُمْ أَىْ مَا يَنبَغِىْ لَهُمْ، ان کے لیے مناسب نہیں ہے یعنی یہ لوگ اس لائق نہیں ہیں، اَنْ (کہ) يَّدْخُلُوْهَآ (داخل ہوں ان مساجد میں) هَا کی ضمیر مساجد کی طرف جاتی ہے، اِلَّا، مگر، کلمہ

استثناء خَآئِفِيْنَ، سہمے ہوئے، خوف کرتے ہوئے، خائف، ڈرنے والا۔ کفار اور غیر مسلموں کے لیے مساجد میں بلا اجازت داخلہ ممنوع ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''داخلہ کی اجازت غیر مسلم کو صرف اس حال میں دی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کا محکوم ہو اور اس کا داخلہ سرکشانہ نہیں مطیعانہ ہو۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یہ الفاظ خبر کے ہیں لیکن مراد اس سے یہ خواہش ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تمہیں تمکن اور غلبہ عطا فرمائے تو تم ان مشرکین کو اس میں صلح اور جزیے کے بغیر رہنے کی اجازت نہ دینا، چنانچہ جب ۸ ہجری میں مکہ فتح ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ آئندہ سال کعبہ میں کسی مشرک کو حج کرنے کی اور ننگے طواف کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اور جس سے جو معاہدہ ہے، معاہدے کی مدت تک اسے یہاں رہنے کی اجازت ہے، بعض نے کہا ہے کہ یہ خوشخبری اور پیش گوئی ہے کہ عنقریب مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو جائے گا اور یہ مشرکین خانہ کعبہ میں ڈرتے ہوئے داخل ہوں گے کہ ہم نے جو مسلمانوں پر پہلے زیادتیاں کی ہیں ان کے بدلے میں ہمیں سزا سے دوچار یا قتل نہ کر دیا جائے چنانچہ جلد ہی یہ خوشخبری پوری ہوگئی (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اخلاق حسنہ سے معافی کا عام اعلان فرما دیا)''۔ (تفسیر احسن البیان)

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾

(ایسے لوگوں کے لیے) دنیا میں رسوائی (مقدر) ہے اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے۔

لَهُمْ (لَ. هُم) واسطے، ان کے، فِي الدُّنْيَا دنیا میں، خِزْيٌ، ذلت اور رسوائی، وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اور ان کے لیے آخرت میں ہے، عَذَابٌ عَظِيْمٌ، عذاب، بہت بڑا۔

﴿ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ، فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾

مشرق بھی اللہ تعالیٰ کا ہے اور مغرب بھی اللہ تعالیٰ کا ہے پس تم جس طرف بھی رخ کرو گے، اللہ تعالیٰ کو متوجہ پاؤ گے، اللہ تعالیٰ صاحب وسعت ہے اور صاحب علم وحکمت ہے۔

وَلِلّٰهِ اور اللہ ہی کے لیے، الْمَشْرِقُ، تمام تر مشرق وَالْمَغْرِبُ اور تمام تر مغرب، فَاَيْنَمَا حرف شرط

اَیْنَمَا حرف شرط ہے، اس کے بعد مضارع آنے سے نون جمع کا گر گیا، کیونکہ یہ حالت جزم میں ہے، تُوَلُّوْا، تم رخ پھیرو (وَلّٰی، یُوَلِّیْ) رخ پھیرنا، فَثَمَّ (فَ. ثَّم) پس، وہیں (پاؤ گے) وَجْهُ اللّٰهِ چہرہ اللہ کا یا رخ اللہ کا، گویا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہر جگہ موجود پاؤ گے، اِنَّ اللّٰهَ بے شک اللہ تعالیٰ، وَاسِعٌ صاحب وسعت ہے، عَلِیْمٌ صاحب علم وحکمت ہے۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''جاہلیت کے زمانہ میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ بھی زمان ومکان کی قید میں ہے، اس لیے اس کی طرف منہ کرنے کے لیے ہمیں بھی کسی خاص سمت کی طرف مڑنا چاہیے، وہ یہ سمت خود ہی فرض کر کے اس کی طرف منہ کر کے پوجا کرتے تھے، یہود ونصاریٰ میں بھی آپس میں اس بات پر جھگڑا تھا، ہر ایک نے سمت مقرر کر رکھی تھی، وہ اسی سمت کو بہتر تصور کرتے تھے۔ قرآن مجید نے اس باطل عقیدے کی تردید کی اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص عبادت گاہ کی چار دیواری کے اندر محدود نہیں ہے اور نہ وہ کسی مکان اور سمت میں قید ہے بلکہ جہاں کہیں بھی اسے اخلاص کے ساتھ یاد کیا جائے وہ متوجہ ہوگا، وہ کسی خاص مقام، کسی خاص شہر یا سمت سے مخصوص اور وابستہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نہ تو صرف مشرق کو پسند کرتا ہے اور نہ صرف مغرب کو، بلکہ تمام سمتیں اسی کی ہیں، وہی ساری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس کی کوئی حد نہیں، وہ ہر جگہ ہے، اس لیے جس جگہ اور جس طرف رخ کر کے خلوص کے ساتھ پکارا جائے گا، وہ ضرور متوجہ ہوگا، وہ خوب جانتا ہے کہ کون سچے دل سے مجھے پکارتا ہے اور کون محض دکھاوے کے لیے۔

اس آیت کا ایک شان نزول یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ مسافر اور سوار کو قبلہ کا رخ معلوم کرنا چونکہ مشکل ہوتا ہے اس لیے حکم ہوا کہ اس وقت جس طرف بھی رخ کر کے عبادت کرو گے، وہ قبول ہوگی (خلوص شرط ہے) کیونکہ اللہ ہر سمت اور ہر جگہ پر حاوی ہے چنانچہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر نماز کے لیے قبلہ کا صحیح رخ معلوم نہ ہو سکے تو جس طرف دل گواہی دے، اس طرف رخ کر کے نماز ادا کر لو اور نفل نماز اگر سواری پر ہو تو خواہ سواری کی سمت بدل جائے، تم اپنی نماز جاری رکھو۔'' (درس قرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) مساجد جہاں اللہ تعالیٰ کے ذکر وفکر، عبادت وریاضت، تعلیم وتعلم اور درس وتدریس کے لیے مخصوص

ہیں، وہاں یہ جگہیں امن وسلامتی اور سکون وعافیت کے گہوارے بھی ہیں جیسا کہ بیت اللہ کے متعلق ارشاد ہوا ''مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا'' اس میں داخل ہونے والا امن وسلامتی سے ہمکنار ہوا، ظاہر ہے کہ دنیا کی تمام مساجد اسی حکم میں آتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے بیت اللہ اور تمام مساجد کو ایسی ہی فضیلت عطا کی۔

۲) مشرکین مکہ نے جہاں بہت سی غلطیاں کیں..... وہاں خانہ کعبہ کے تقدس کو بھی پامال کیا، دورِ حاضر کے تہذیب یافتہ پاکستانی مسلمان بھی اس سلسلہ میں پیچھے نہ رہے انہوں نے مساجد میں کتنے مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے شہید کر ڈالا، اور کتنے لوگوں کو اپاہج اور معذور بنا دیا، کتنی خواتین کو بیوہ اور کتنے بچوں کو یتیم بنا دیا؟ یہ کام یقیناً مساجد کی ویرانی اور تخریب کاری کے زمرہ میں آتے ہیں، اگر مشرکین مکہ کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم مقدر ٹھہرا تو کیا ایسے تخریب کار عذاب الٰہی سے بچ سکیں گے؟

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (۱۱۶) بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۱۱۷)	(یہود ونصاریٰ) کا کہنا ہے کہ اللہ اولاد رکھتا ہے، اللہ (اس الزام سے) پاک و برتر ہے آسمانوں اور زمین کی (وسعتوں) میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا ہے اور یہ سب اسی کے تابع فرمان ہیں، وہ آسمانوں اور زمینوں کا موجد ہے اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اتنا ہی کہہ دیتا ہے کہ ''ہوجا'' تو وہ ہوجاتا ہے۔''

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾

(یہود و نصاریٰ) کا کہنا ہے کہ اللہ اولاد رکھتا ہے، اللہ (اس الزام سے) پاک و برتر ہے آسمانوں اور زمین کی (وسعتوں) میں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا ہے اور یہ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا، اور انہوں نے کہا کہ بنالیا، اللہ نے، بیٹا۔ وَقَالُوْا، اور انہوں نے کہا ماضی جمع مذکر غائب (اہل کتاب نے) قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا، کہنا، اتَّخَذَ فعل ماضی واحد مذکر غائب (اِتَّخَذَ، یَتَّخِذُ، اِتِّخَاذٌ) باب افتعال پکڑنا، ٹھہرانا، ٹھہرالینا، وَلَدًا، بیٹا، یہود سیدنا عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور نصاریٰ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ قرار دیتے تھے جبکہ مشرکین مکہ، ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے (نعوذ باللہ) سُبْحٰنَهٗ، وہ پاک ہے، (سُبْحٰنَ.هٗ) یعنی اس کی ذات اس سے منزہ اور بالاتر ہے، بَلْ لَّهٗ بلکہ اس کے لیے ہے، مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، كُلٌّ لَّهٗ، سب کے سب اس کے واسطے ہیں قٰنِتُوْنَ، فرمانبردار، اسم فاعل، یہ لفظ قنوت سے ہے جس کے معنی اطاعت اور عاجزی کے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوا: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا (النحل:۱۲۰) ''بلاشبہ ابراہیم (اپنی ذات میں) ایک امت تھے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور یکسو رہنے والے تھے (ان کی تمام زندگی خالصۃً، رضائے الٰہی کے لیے وقف تھی)''۔

حقیقت یہ ہے کہ پھیلی ہوئی کائنات اور اس کی تمام اشیاء، زبان حال سے اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور اطاعت کا اقرار کر رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ، وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (بنی اسرائیل:۴۴) ''ساتوں آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب اس (خالق کائنات) کی تسبیح کرتے ہیں، بلکہ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں''۔

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (وہ اللہ) بنانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا۔

بَدِيْعٌ (ب د ع) بَدَعَ، یَبْدَعُ، بغیر نمونے کے کوئی چیز ایجاد کرنا۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: ''کسی کی تقلید اور اقتداء کے بغیر کسی چیز کو ایجاد کرنا، اس لیے نئے کھودے ہوئے کنویں کو رَكِيَّةٌ بَدِيْعٌ کہا جاتا ہے، جب ابداع کا لفظ اللہ عزوجل کے لیے استعمال ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں بغیر کسی آلہ (سامان) بغیر

مادہ اور بغیر زمان و مکان کے کسی شے کو ایجاد کرنا اور یہ معنیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔'' (مفردات القرآن)

نیز دین میں کوئی ایسا کام ایجاد کرنا جس کی عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی مثال نہ ہو، وہ بدعت کہلاتا ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے جس کا انجام ناکامی اور نامرادی ہے۔

﴿وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾

اور جب وہ فیصلہ کر لیتا ہے کسی امر کا تو بس اتنا کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

اِذَا، کلمہ شرط ہے، قَضٰی، فعل ماضی واحد مذکر غائب (قَضٰی، یَقْضِیْ، قَضَاءً) ارادہ کرنا، فیصلہ کرنا، فَاِنَّمَا، کلمہ حصر (سوائے اس کے نہیں کہ) یَقُوْلُ، وہ کہتا ہے (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، کُنْ فعل امر ہے (کَانَ یَکُوْنُ کَوْنًا) ہونا، فَیَکُوْنُ پس وہ ہو جاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یَقُوْلُ'' کہتا ہے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری آپ کی طرح یہ دو حرفی لفظ ''کُنْ'' بولتا ہے، نہ حق تعالیٰ کا تلفظ زبان، ہونٹ یا اعصاب کا محتاج ہے، بندوں کی سمجھ کے لائق آخر اس کے سوا قریب سے قریب پیرایہ بیان اور اسلوب تعبیر اور کیا بیان کیا جائے، مقصود صرف اس قدر ہے کہ ادھر حق تعالیٰ کا ارادہ ہوا ادھر معاً اور بلا توسط و توقف اس کا ظہور عملاً ہو گیا۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) اللہ جل جلالہ کی ذات ہر قسم کے مشرکانہ اوصاف سے پاک ہے، دلیل یہ ہے کہ ساری کائنات اس کے قبضہ قدرت میں ہے، ہر چیز اس کی تسبیح و قنوت میں مصروف ہے، آفتاب سے لے کر ذرہ تک سب اس کی حمد و ثنا کر رہے ہیں، وہ خالق یکتا ہے اور سب اس کی بندگی کا دم بھر رہے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ○ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (مریم ۱۹:۹۲،۹۳) ''رحمٰن (کی شان) کے لائق نہیں کہ وہ کسی کو اولاد بنائے (حقیقت تو یہ ہے) کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب کے سب اس کے روبرو بندے کی حیثیت

سے حاضر ہوں گے۔‘‘

۲) یہ کارخانہ خود بخود وجود میں نہیں آیا، بلکہ اس کا خالق اور مالک اللہ ہے اور وہی اس کا موجد ہے جس نے اپنی قدرت کاملہ سے اسے سجایا اور بنایا ہے۔ ارشاد ہوا: صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ، اِنَّهٗ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ (النمل ۲۷:۸۸) ’’یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا ہے، بلا شبہ تم جو کام کر رہے ہو، وہ اس سے باخبر ہے۔‘‘

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَآ اٰیَةٌ، كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ، تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ، قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (۱۱۸) اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ (۱۱۹)	اور نادان لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا؟ یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی؟ (یہ کوئی نئی بات نہیں ہے) ایسی ہی باتیں ان سے پہلے لوگ بھی کہا کرتے تھے، (ایسے جہلا) کے دل ملتے جلتے ہیں، (حقیقت یہ ہے) کہ ہم نے اپنی آیات صاحب یقین قوم کے لیے (بڑی وضاحت سے) بیان کر دی ہیں، (اے رسولؐ) ہم نے آپ کو یقیناً حق کے ساتھ (نیک اعمال پر) بشارت دینے والا اور (برے اعمال پر) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور اہل دوزخ سے متعلق آپ سے سوال نہ ہوگا۔

﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَآ اٰیَةٌ، كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ، تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ، قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ﴾

اور نادان لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا؟ یا کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں

نہیں آتی؟ (یہ کوئی نئی بات نہیں ہے) ایسی ہی باتیں ان سے پہلے لوگ بھی کہا کرتے تھے، (ایسے جہلا) کے دل ملتے جلتے ہیں، (حقیقت یہ ہے) کہ ہم نے اپنی آیات صاحب یقین قوم کے لیے (بڑی وضاحت سے) بیان کردی ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اور کہا ان لوگوں نے کہ نہیں علم رکھتے (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا **الَّذِيْنَ** اسم موصول (Relative Pronoun) (وہ لوگ جو) **لَا يَعْلَمُوْنَ** نہیں علم رکھتے (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، علم رکھنا، **لَوْ لَا** کیوں نہیں، **يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ** (يُكَلِّمُ. نَا) کلام کرتا ہے، ہم سے، اللہ تعالیٰ، **اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ**، یا آتی ہمارے پاس کوئی نشانی، اَوْ، یا، کلمہ اختیار بمعنی (or) **يَاْتِيْنَا** (يَاْتِيْ. نَا) آتی ہمارے پاس مضارع واحد مؤنث (اَتَى، يَأْتِيْ، اِتْيَانٌ) آنا، **اٰيَةٌ** نشانی، علامت، اس کی جمع اٰيَاتٌ ہے، ﴿**كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ**﴾ اسی طرح، کہا، ان لوگوں نے (جو) ان سے پہلے تھے، ان کے قول کی مانند **كَذٰلِكَ**، کلمہ تشبیہ (So,like this) **قَالَ** (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، **الَّذِيْنَ** اسم موصول، (وہ لوگ) **مِنْ قَبْلِهِمْ** (ان سے پہلے) **مِّثْلَ قَوْلِهِمْ**، (ان کے قول کے مثل) **تَشَابَهَتْ** (ملتے جلتے ہیں)، صیغہ واحد مؤنث غائب باب تفاعل ہے (تَشَابَهَ، يَتَشَابَهُ، تَشَابُهٌ) ایک دوسرے کے ساتھ مشابہ ہونا شبہ، مشابہت اردو میں استعمال ہوتے ہیں، **قُلُوْبُهُمْ** (قُلُوْبُ. هُمْ) دِل، ان کے، قَلْبٌ کی جمع **قُلُوْبٌ** ہے (Their hearts are alike) ﴿**قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ**﴾ تحقیق، ہم نے بیان کردیں آیات (نشانیاں)، یقین رکھنے والوں کے لیے، قَدْ کلمہ تحقیق کلام، بَيَّنَّا (بَيَّنَ. نَا) ہم نے بیان کیں، دونوں جمع ہوجائیں تو ایک نون دوسرے میں مدغم ہوجاتا ہے اور اس سے ثقالت دور ہوجاتی ہے اَلْاٰيٰتِ (نشانیاں) آیۃ کی جمع، قرآن حکیم کی آیات بھی واضح ہیں اور انفس وآفاق کی نشانیاں بھی واضح ہیں مگر کن کے لیے ان افراد کے لیے جو عقل وفکر، دانش بینش سے کام لیں اور یقین کی راہ اختیار کرلیں۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''**اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ**، جو لوگ علم نہیں رکھتے، اس سے مراد عرب کے امی (بے علم) ہیں جو مشرک تھے، ان کے پاس کتاب الٰہی کا علم نہ تھا، یہ مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا بہت زیادہ مطالبہ کرتے تھے کہ اللہ ان سے ہمکلام ہو یا ان کے سامنے کوئی مادی معجزہ ظاہر ہو، یہاں اس قول کے ذکر سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ جو قومیں ان مشرکین سے پہلے تھیں۔ یہود وغیرہ، وہ بھی اپنے انبیاء سے اسی طرح کے

مطالبے کرتی تھیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اللہ کو علانیہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں (اور موسیٰ علیہ السلام کو اس کا انتظام کرنا چاہیے) وہ ان سے خارقِ عادت معجزات طلب کرتے اور انہیں زچ کرتے رہتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین عرب اور ان سے قبل کی قوموں، یہود وغیرہ..... کے درمیان طبیعت، فکر اور گمراہی میں مشابہت و وحدت ہے ''ان کے دل ایک جیسے ہو گئے ہیں'' جب صورت حال یہ ہے اور مشرکین اور یہود، دونوں کے دل، فکر، سرکشی اور گمراہی میں ایک جیسے ہو گئے ہیں تو یہود کو مشرکین پر کوئی فضیلت و برتری نہیں رہی۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ''حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ یقین دلانے والے ہیں، ان کے لیے ہم نے بہت سی نشانیاں واضح کر دی ہیں۔'' جو شخص ذوق یقین رکھتا ہے، وہ نشانیوں میں اپنے یقین کا مصداق اور اپنے ضمیر کی طمانیت پاتا ہے، نشانیاں یقین پیدا نہیں کرتیں، قلبی یقین ان نشانیوں کے مدعا کو پاتا اور ان کی حقیقت سے اطمینان حاصل کرتا ہے، وہی دل کو اس بات کے لیے تیار کرتا ہے کہ وہ صحیح بات کو، جو اللہ تعالیٰ سے جوڑنے والی ہے، اخذ کرے۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا﴾ (اِنَّ.نا) بلاشبہ، ہم نے۔ وہی اوپر والا قاعدہ ہے کہ اگر دونون جمع ہو جائیں تو ثقالت دور کرنے کے لیے ایک کو دوسرے میں مدغم کر دیتے ہیں، اَرْسَلْنٰكَ (اَرْسَلْنَا.كَ) ہم نے بھیجا، آپ کو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، بِالْحَقِّ (صداقت اور حقانیت کے ساتھ) بَشِيْرًا، بروزن فعیل، بشارت دینے والا، نَذِيْرًا بروزن فعیل ڈرانے والا، ﴿وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ﴾ وَلَا۔ اور نہیں تُسْئَلُ، آپ سے پوچھا جائے گا فعل مضارع مجہول واحد مذکر حاضر (سَأَلَ، يَسْئَلُ سُؤَالًا) سوال کرنا، تَسْئَلُ، تو سوال کرتا ہے، تُسْئَلُ، تو سوال کیا جاتا ہے۔ عَنْ (سے، بارے میں) اَصْحٰبِ، صاحب کی جمع ہے، ساتھی، دوست الْجَحِيْمِ، جہنم، دوزخ۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''ان الفاظ میں جو قوت اور جو یقین ہے وہ ثابت قدمی بخشنے اور گمراہ کرنے والوں کے شبہات، سازشوں کے کید و مکر اور دھوکہ دینے والوں کی تلبیس کو ختم کرنے کے لیے ہے، اس کے آہنگ میں جو مضبوطی اور شدت ہے، اس سے بھی جزم و یقین مترشح ہوتا ہے۔

بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ''(تم قبول حق پر جنت کی) خوشخبری دینے والے ہو اور (انکار پر جہنم سے) ڈرانے

والے ہو۔'' بس دعوت حق پہنچا دینا آپ کی ذمہ داری ہے اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے نتیجہ میں جہنم میں جائیں گے، ان کے بارے میں آپ سے باز پرس نہ ہوگی۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) جہالت کا مزاج ہر دور اور ہر زمانے میں یکساں رہتا ہے، وہ اہل کتاب کی جہالت ہو یا مشرکین مکہ کی، ماضی کی جہالت ہو یا دور حاضر کی، اس کا شرفِ انسانیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، اگر دورِ جاہلیت میں لوگ بتوں کی پرستش کرتے تھے تو دور حاضر کے جاہلین قبروں اور مزاروں کو وسیلہ پکڑتے ہیں بلکہ کتنے جاہل وہاں پہنچ کر سجدہ ریز ہو جاتے ہیں، اگر ماضی میں عورت اپنا عزو وقار کھو چکی تھی (جسے اسلام نے آکر بحال کیا) تو تہذیب حاضر نے اسے بے حجاب کر کے شرافت ونجابت سے دور پھینک دیا ہے بلکہ دور جاہلیت کو بھی مات کر کے رکھ دیا۔ اگر دور جہالت میں معمولی معمولی باتوں پر قوموں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تھی تو دور حاضر میں محض شک کی بنا پر ظالم بمباری کر کے کمزوروں کی بستیاں اور شہر تباہ وبرباد کر دیتے ہیں۔

۲) اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نشان ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہیں، اگر انسان نے عقل وبصیرت کو گم نہیں کیا تو انفس وآفاق میں اس کو قدرت کے جلوے ہر وقت دکھائی دیتے ہیں۔ ہوا کا ہر جھونکا، پانی کی ہر لہر، آفتاب کی ہر کرن، بارش کا ہر قطرہ اور پھول کی ہر پنکھڑی بلکہ انسان کا اپنا وجود اور اس کا ہر ہر عضو رب کائنات کی قدرت کا شاہکار ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَ فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات:۲۱) ''تمہارے نفسوں میں بھی (معرفت حق) کی نشانیاں ہیں کیا تم غور نہیں کرتے ہو!'' (صرف آنکھ کی پتلی پر غور کر لیجیے، اس میں نور کس نے بھر دیا ہے؟)

۳) انبیاء ورسل دعوت حق بلا خوف وخطر پیش کرتے ہیں، جو لوگ قبول کر لیں انہیں جنت کی نوید ملتی ہے اور منکرین کے لیے برے انجام کا پیغام ہوتا ہے (کہ شاید وہ سنبھل کر دعوتِ حق قبول کر لیں) مگر ان کے برے انجام کی بنا پر ان داعیانِ حق پر کوئی گرفت نہیں ہے۔

۴) حق اور سچ بات کی حقیقت صرف وہی پا سکتے ہیں جو حق بات پر غور وفکر کرتے ہیں اور سچائی کو قبول کر کے صاحب یقین بن جاتے ہیں۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ، قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى، وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِى جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ، مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۱۲۰) اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ، وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ، فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۲۱)	”یہودی اور عیسائی تو آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک آپ ان کے طریقے پر نہ چلنے لگیں، آپ ان سے صاف کہہ دیجیے کہ (ہدایت کا) راستہ تو بس وہی ہے، جو اللہ نے بتایا ہے، اور اگر آپ علم آنے کے بعد ان کی خواہشات کی پیروی کریں گے تو آپ کو اللہ سے بچانے والا کوئی حامی و ناصر نہ ہوگا، جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے (حقیقت میں) یہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو اس کتاب کا انکار کرتے ہیں تو ایسے ہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔“

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾

اور ہرگز راضی نہ ہوں گے آپ سے یہود اور نہ عیسائی یہاں تک کہ آپ اتباع کریں ان کے طور طریقوں کا۔

وَلَنْ تَرْضٰى (رَضِيَ، يَرْضٰى، رِضًا) راضی ہونا، حرف لَنْ، جب مضارع کے شروع میں آتا ہے تو اسے نصب (زبر) دیتا ہے اور نون جمع کا ہو تو وہ گر جاتا ہے اور معنی میں زور (Stress) پیدا کرتا ہے، یہاں پر الْيَهُوْدُ جمع مکسر ہے اس لیے مؤنث کا صیغہ استعمال ہوا ہے، حَتّٰى (یہاں تک کہ) یہ بھی مضارع پر نصب (زبر) دیتا ہے تَتَّبِعَ (آپ پیروی کریں، پیچھے چلیں) اِتَّبَعَ ، يَتَّبِعُ، اِتِّبَاعًا پیروی کرنا،

مِلَّتَهُمْ (مِلَّتَ. هُمْ) طریقہ۔ان کا۔

مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''اس آیت میں ملت کا جو لفظ آیا ہے، اس کے اصل معنیٰ طریقہ کے ہیں لیکن اس سے کسی شخص یا گروہ کا وہ طریقۂ زندگی مراد ہوتا ہے جس کی بنیاد مذہب اور روایات مذہب پر ہو۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى﴾

کہہ دیجیے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی (عطا کردہ) ہدایت ہی، اصل ہدایت ہے۔

قُلْ (قَالَ، يَقُولُ، قَوْلًا) کہنا، اور فعل امر، قُلْ کہہ دیجیے هُدَى اللّٰهِ (اللہ کی ہدایت) یعنی دین اسلام ہی اصل ہدایت ہے اور سیدھی راہ ایک ہی ہے جو جنت میں لے جاتی ہے، اس کے سوا تمام راہیں صراط مستقیم سے بھٹکا دیتی ہیں۔قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ، وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (الانعام ۶:۱۵۴)''(اور دیکھو!) یہی (دین اسلام) میری سیدھی راہ ہے، لہٰذا اس پر چلتے رہو اور (اس کے علاوہ) دوسری راہوں کے پیچھے نہ جاؤ ورنہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کر دینگے''۔

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَ هُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾

اور اگر آپ نے اتباع کیا ان کی خواہشات کا، اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آیا۔

وَلَئِنْ (وَ. لَ. اِنْ) اور، یقیناً، اگر، لام یہاں پر تاکید کو ظاہر کرتا ہے، اتَّبَعْتَ، آپ نے اتباع کیا، فعل ماضی واحد مذکر مخاطب (اِتَّبَعَ، يَتَّبِعُ، اِتِّبَاعًا)، اتباع کرنا، پیروی کرنا اَهْوَآءَ هُمْ، (اَهْوَآءَ . هُمْ) خواہشات ان کی بَعْدَ الَّذِیْ اس کے بعد کہ جَآءَكَ (جاءَ.ک) آیا آپ کے پاس، (جَاءَ، يَجِیءُ) آنا ک ضمیر واحد مذکر مخاطب، مِنَ الْعِلْمِ، علم سے یعنی وحی الٰہی۔

﴿مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ﴾ (مَا. لَکَ) نہیں ہے واسطے تیرے، مِنَ اللّٰهِ، اللہ کی طرف سے، مِنْ وَّلِیٍّ کوئی دوست، وَّلَا نَصِیْرٍ اور نہ کوئی مددگار، اگرچہ یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو ہے مگر اس میں تہدید تمام امت مسلمہ کو قیامت تک کے لیے ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں (یہود و نصاریٰ) کی ناراضی کا سبب یہ تو ہے نہیں کہ وہ سچے طالب حق ہیں اور تم نے ان کے سامنے حق کو واضح کرنے میں کچھ کمی کی ہے، وہ تو اس لیے تم سے ناراض ہیں کہ تم نے اللہ کی آیات اور اس کے دین کے ساتھ وہ منافقانہ اور بازی گرانہ طرز عمل کیوں نہ اختیار کیا، خدا پرستی کے پردے میں وہ خود پرستی کیوں نہ کی، دین کے اصول و احکام کو اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اس دیدہ دلیری سے کیوں نہ کام لیا، وہ ریاکاری اور گندم نمائی و جوفروشی کیوں نہ کی جو خود ان کا اپنا شیوہ ہے، لہٰذا انہیں راضی کرنے کی فکر چھوڑ دو، کیونکہ جب تک تم ان کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کر لو دین کے ساتھ وہی معاملہ نہ کرنے لگو جو خود یہ کرتے ہیں اور عقائد و اعمال کی انہی گمراہیوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ جن میں یہ مبتلا ہیں، اس وقت تک ان کا تم سے راضی ہونا محال ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''یہاں ملت سے مراد وہ دین نہیں جو تورات میں یا انجیل میں مذکور ہے بلکہ وہ دین ہے جس میں وہ سب خرافات بھی شامل ہیں۔ جنہیں ان لوگوں نے دین سمجھ رکھا ہے اور وہ رنگ ڈھنگ بھی جو یہ لوگ اختیار کیے ہوئے ہیں، لہٰذا انہیں خوش رکھنے کی فکر چھوڑ دیجیے کیونکہ جب تک آپ عقائد و اعمال کی ان ہی گمراہیوں میں مبتلا نہ ہو جائیں جن میں یہ پڑے ہوئے ہیں اس وقت تک ان کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے راضی ہونا محال ہے''۔ (تیسیر القرآن، جلد اول)

﴿اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ﴾

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے (حقیقت میں) یہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں۔

اَلَّذِیۡنَ، اسم موصول جمع مذکر، وہ لوگ جو کہ۔ اٰتَیۡنٰہُمُ (اٰتٰی. نَا. ھُمْ) دی ہم نے ان کو اَلۡکِتٰبَ (تورات) اگرچہ سیاق و سباق سے یہاں الکتٰب سے مراد تورات ہے، تاہم اس سے مراد القرآن بھی ہے۔ تمام آسمانی کتب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں، ان کی تلاوت کا حق اس وقت ادا ہوگا جبکہ ان کے

احکام کو حرز جاں بنایا جائے، اسی لیے ارشاد فرمایا، یَتْلُوْنَهٗ (یَتْلُوْنَ.هٗ) وہ تلاوت کرتے ہیں، اس کی (یعنی کتاب الٰہی کی) حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (جیسا کہ) حق چاہیے اس کی تلاوت کا اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ، وہی (لوگ) یُؤْمِنُوْنَ ایمان رکھتے ہیں بِهٖ (بِ.هٖ) ساتھ اس کے (کتاب)۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اہل کتاب کے ناخلف لوگوں کے مذموم اخلاق و کردار کی ضروری تفصیل کے بعد ان میں جو چند لوگ صالح اور اچھے کردار کے تھے اس آیت میں ان کی خوبیاں اور ان کے مومن ہونے کی خبر دی جا رہی ہے ان میں عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان جیسے دیگر افراد ہیں جن کو یہودیوں میں سے قبول اسلام کی توفیق ملی۔''

(تفسیر احسن البیان)

معلوم ہوا کہ جن اہل کتاب نے تورات (حقیقی نہ کہ تحریف شدہ) کی تلاوت کا حق ادا کیا، انہیں وہاں سے بھی روشنی ملی، پھر وہی روشنی انہیں قرآن حکیم میں ملی جو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اور خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہے۔

﴿وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾

اور جو کوئی کفر کرتا ہے ساتھ اس (کتاب) کے پس وہی خسارہ پانے والے ہیں۔

وَمَنْ (اور جو کوئی) اسم موصول، یَكْفُرْ (کَفَرَ، یَکْفُرُ، کُفْرًا) کفر کرنا بِهٖ (بِ.هٖ) ساتھ۔ اس کے (کتاب الٰہی کے) فَاُولٰٓئِکَ پس وہی (لوگ) ہیں، الْخٰسِرُوْنَ، خسارہ اٹھانے والے اسم فاعل، الخاسِرُ، مفرد ہے (خَسِرَ، یَخْسَرُ، خَسَارَةً) نقصان اٹھانا کتاب الٰہی سے کفر یہ ہے کہ اس کے احکام کو نظر انداز کر دیا جائے اور خواہشات نفسانی کی پیروی کی جائے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) حقیقی علم و معرفت کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، جو انسانوں کو انبیاءِ کرام کے ذریعے حاصل ہوا۔

۲) انسانوں کی گمراہی کا سبب خواہشات کی پیروی ہے، شیطان کی سر توڑ کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ انسانوں کو ہدایت الٰہی سے محروم کر دے۔

۳) یہود و نصاریٰ کی گمراہی کا سبب بھی خواہشات نفس کی پیروی بنا گویا کہ انہوں نے شیطان کی رفاقت

اختیار کرلی اور اس گمراہی میں وہ دوسروں کو بھی شامل کرنے کی سعی وجستجو کرتے ہیں، آیہ مبارکہ پر پھر غور کیجیے، واضح اور واشگاف الفاظ میں بتایا جارہا ہے: وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ''یہود ونصاریٰ ہرگز ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے ہمنوا اور ساتھی نہ بن جائیں''۔ ''لَنْ'' اس کے دوام اور ہمیشگی کی طرف اشارہ ہے، ان میں مسلمانوں اور اسلام کے لیے بغض وعداوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، جس کا مشاہدہ ہم سب اپنی آنکھوں سے کررہے ہیں، مگر افسوس کہ مسلمان اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر غفلت کا شکار ہورہے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ ذلیل و خوار بھی ہورہے ہیں۔

۴) ہمارے پاس تو علم حقیقی (قرآن حکیم اور سیرت طیبہؐ) موجود ہے، اس قیمتی سرمایہ سے صَرفِ نظر کرکے کامیابی کیسے ممکن ہے؟

۵) تلاوتِ کتاب کا حق یہ ہے کہ اسے قلب سلیم کے ساتھ، تدبر وتفکر کرتے ہوئے، ہدایت ورہنمائی کے لیے پڑھا جائے اور اس کے احکام پر صدق دل سے عمل پیرا ہونے کی ہر ممکن کوشش کی جائے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اخلاص کی راہ اختیار کرنے والوں کو ہی ہدایت واستقامت نصیب ہوتی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۱۲۲) وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۱۲۳)	اے بنی اسرائیل! (اولادِ یعقوب) میری وہ نعمتیں یاد کرو جن سے میں نے تمہیں سرفراز کیا تھا، میں نے تمہیں دنیا کی قوموں میں برگزیدگی اور فضیلت عطا فرمائی تھی! اور دیکھو، اس دن سے ڈرو جو یقیناً آنے والا ہے اس دن نہ تو کوئی جان دوسری جان کے کام آئے گی نہ کسی طرح کا بدلہ قبول کیا جائے گا نہ کسی کی سعی وسفارش چل سکے گی اور نہ ہی ایسا ہوگا کہ مجرموں کو کہیں سے مدد ملے۔

﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ﴾

اے بنی اسرائیل! (اولاد یعقوب) یاد کرو میری نعمتیں یاد کرو جن سے میں نے تمھیں سرفراز کیا تھا اور میں نے تمھیں دنیا کی قوموں میں برگزیدگی اور فضیلت عطا فرمائی تھی!

یَا، کلمہ ندا بنی اسرائیل، منادی (جس کو خطاب کیا) اذْکُرُوْا، تم سب یاد کرو فعل امر جمع مذکر، (ذَکَرَ، یَذْکُرُ، ذِکْرًا) یاد کرنا، نِعْمَتِیَ (نِعْمَتِ. یَ) نعمتیں، میری، الَّتِیْ جو، اسم موصول اَنْعَمْتُ، میں نے انعام کی فعل ماضی واحد متکلم (اَنْعَمَ، یُنْعِمُ، اِنْعَامًا) انعام کرنا، عَلَیْکُمْ (عَلٰی، کُمْ) تم پر، وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ، اور بلاشبہ میں نے تمھیں فضیلت بخشی، جہان والوں پر وَاَنِّیْ (اَنَّ. نِیْ) بلاشبہ میں نے اس میں ایک نون دوسرے نون میں قاعدہ ادغام سے (اَنِّیْ) پڑھا جائے گا، فَضَّلْتُکُمْ فضیلت دی تم کو میں نے (فَضَّلْتُ. کُمْ) (فَضَّلَ یُفَضِّلُ تَفْضِیْلٌ) فضیلت دینا، عَلَی الْعٰلَمِیْنَ جہان والوں پر، عَالَمٌ (جہان) لام کی زبر کے ساتھ، اس کی جمع عالمین ہے، بہت سے جہان، مراد اس سے تمام نسل انسانی ہے۔

﴿وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّ لَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ﴾

اور دیکھو، اس دن سے ڈرو جو یقیناً آنے والا ہے اس دن نہ تو کوئی جان دوسری جان کے کام آئے گی نہ کسی طرح کا بدلہ قبول کیا جائیگا نہ کسی کی سعی وسفارش چل سکے گی اور نہ ہی ایسا ہوگا کہ مجرموں کو کہیں سے مدد ملے۔

وَاتَّقُوْا، فعل امر جمع مذکر (اِتَّقٰی، یَتَّقِیْ، اِتِّقَاءً) باب افتعال، ڈرنا، بچنا یَوْمًا دن (اس دن سے مراد یوم قیامت ہے) لَّا تَجْزِیْ، نہ جزا دے گا مضارع منفی (جَزَی، یَجْزِی، جَزَاءً) بدلہ دینا، فائدہ دینا، شَیْئًا، کچھ بھی، وَّلَا یُقْبَلُ، اور نہ قبول کیا جائے گا یُقْبَلُ مضارع مجہول منفی (قَبِلَ، یَقْبَلُ قَبُوْلًا) قبول کرنا اور یَقْبَلُ سے یُقْبَلُ، یعنی ی پر پیش سے مجہول بن گیا۔ مِنْهَا (مِنْ. هَا) اس، نفس سے، هَا کی ضمیر

نفس کی طرف جاتی ہے، عَدْلٌ، (معاوضہ فدیہ)، وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ اور نہ نفع دے گی (اس نفس کو) کوئی سفارش (شفاعت) وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے۔ (نَصَرَ يَنْصُرُ، نَصْرًا) مدد کرنا، يُنْصَرُوْنَ مضارع مجہول جمع مذکر غائب بنی اسرائیل سے خطاب اس سے قبل آیت ۴۰ اور آیت ۴۷ میں گزر چکا ہے، یہاں پر ان کی علمی اور عملی کمزوریوں اور اعتقادی واخلاقی کج رویوں کو بیان کرنے کے بعد انہیں پھر تنبیہ کی جارہی ہے کہ آخرت کا معاملہ دنیا کی طرف نہیں ہے کہ زور وزر سے، فدیہ اور تاوان دے دلا کر چھوٹ جاؤ، وہاں تو صرف اور صرف خالص ایمان اور پاکیزہ عمل سے ہی نجات پاسکتے ہو۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

''ان آیات میں دوبارہ بنی اسرائیل کو مخاطب کیا ہے، تاکہ ان پر وہ تمام انعامات جو کیے گئے ہیں، گنائے جائیں اور انہیں دین حنیف کی طرف مائل کیا جائے، اوّلاً یہ فرمایا کہ تمہیں ہم نے اپنے تمام معاصرین پر مادی وروحانی فضیلت دی، ثانیاً ان کو ان کے موجودہ مزعومات (باطل عقائد) سے باز رہنے کی تلقین فرمائی کہ تم یہ نہ سمجھو کہ تمہارے احبار وعلماء تمہارے اولیاء وشہداء تمہیں مکافاتِ عمل کے ہمہ گیر قانون کی گرفت سے بچالیں گے، اس قسم کی سفارش جو ذاتی عمل سے معرا (خالی) ہو، قطعاً سودمند نہیں ہے۔ قرآن حکیم نے عام طور پر شفاعت کی نفی کی ہے اور کہیں کہیں اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ کہہ کر ایک نوع کے لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، جس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ سفارش کا وہ مفہوم جو یہ لوگ سمجھے ہوئے تھے بالکل غیر موزوں ہے یعنی شریعت کی مخالفت کے باوجود شفاعت پر بھروسہ، یہ محض فریب نفس ہے جس میں یہ لوگ مبتلا تھے، اس لیے قرآن حکیم نے اس عقیدے کی پرزور تردید کی اور انہیں عمل پر آمادہ کیا۔'' (تفسیر سراج البیان)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مادی وروحانی انعامات سے نوازا ہے۔ کہیں انواع واقسام کے پھل، پھول، ساگ پات، ہوا، روشنی، پانی ایسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں تو کہیں انبیاء کرام کے ذریعہ کتاب وحکمت کی تعلیم سے نوازا ہے، بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ودیعت فرمائی ہے، جسمانی صحت کے ساتھ روحانی مسرت بھی عطا کی ہے، قرآن حکیم میں ارشاد ہوا: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ''اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے انعامات گننا چاہو تو ہرگز انہیں شمار میں نہیں کرسکتے ہو۔'' انسانوں پر لازم ہے کہ وہ اللہ

تعالیٰ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں۔

۲) شکر گزاری کی راہ زندگی کو نیک اعمال سے آراستہ کرنا ہے، احکام الٰہی کی پیروی اور اطاعت رسول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ، سَلِيْنِيْ مِنْ مَّالِيْ مَا شِئْتِ، لَا أُغْنِي عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ''اے فاطمہ بنت محمدؐ! تو میرے مال سے (اس دنیا میں) جو چاہے مانگ لے، اللہ کی طرف سے (آخرت میں) میں تمہیں کچھ بھی عطا نہیں کر سکتا (بلکہ تیرے اعمال ہی تیرے کام آئیں گے)۔''

[صحیح بخاری ۲۷۵۳، صحیح مسلم ۲۵۰۱]

۳) روز قیامت صرف اور صرف نیک اعمال کی قیمت پڑے گی اور ہر شخص اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہو گا، کوئی وسیلہ اور سفارش اور دست و بازو کی قوت کام نہ آئے گی۔

۴) سفارش صرف اللہ تعالیٰ کے حکم اور اذن سے ہو گی اور یہ غالباً ان لوگوں کے لیے جن کے اعمال میں تھوڑی بہت کمی رہ گئی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ:۲۵۵) ''کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے''۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ، فَاَتَمَّهُنَّ، قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ، قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (۱۲۴)	''اور (یاد کرو) کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا وہ ان سب میں پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے کہا ''میں تمہیں نسل انسانی کا امام (پیشوا) بنانے والا ہوں'' ابراہیمؑ نے عرض کیا ''کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے، ارشاد ہوا ''جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں ان کا میرے اس عہد میں کوئی حصہ نہیں۔''

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ، فَاَتَمَّهُنَّ﴾

اور جب آزمایا، ابراہیمؑ کو، اس کے رب نے چند باتوں میں تو (ابراہیم) نے انہیں پورا کیا۔

وَاِذْ (اور وہ وقت یاد کرو) اِذْ وقت اور زمانے کو ظاہر کرتا ہے، اِبْتَلٰٓی مبتلا کیا، آزمایا (اِبْتَلٰی، یَبْتَلِیْ، اِبْتِلَاءٌ) آزمانا، باب افتعال ہے، اِبْرٰھِیْمَ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر ہیں، تورات میں آپ کی عمر ۱۷۵ سال درج ہے اور جدید تحقیق کے مطابق پیدائش ۲۱۶۰ ق م ہے، والد کا نام آذر ہے جس کا قرآن میں ذکر آیا ہے، آبائی وطن بابل یا کلدانیہ ہے، آثار قدیم کے ماہرین نے ۱۹۲۲ء کی کھدائی میں اس قدیم شہر کے آثار دریافت کر لیے ہیں، یہ شہر خلیج فارس کے دہانہ فرات اور بغداد کے درمیان واقع ہے۔ (بحوالہ تفسیر ماجدی)

ان کا سلسلہ نسب سیدنا حضرت نوح علیہ السلام سے جا ملتا ہے، ان پر صحف کا نزول ہوا، جو صحف ابراہیم کے نام سے مشہور ہیں، ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی، صُحُفِ اِبْرَاهِیْمَ وَمُوْسٰی (الاعلیٰ ۸۷:۱۹) ''یقیناً یہ (سب کچھ) اگلے صحیفوں میں بھی لکھا ہوا ہے (ایمان اور اعمال صالحہ کی باتیں) ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں بھی'' آپ نے بت پرست قوم میں آنکھیں کھولیں مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں نعمت اسلام سے نوازا، توحید کی فہم و بصیرت عطا فرمائی اور اس پر ایسی استقامت عطا کی کہ پوری قوم سے ٹکرا گئے اور استقامت و عزیمت کی لازوال اور بے مثال تاریخ رقم کی، دعوتِ حق کا اعلان اس شد و مد سے کیا کہ فرد واحد کو امت کا لقب عطا ہوا: اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِیْفًا، وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (النحل ۱۶:۱۲۰) ''بلاشبہ ابراہیمؑ (اپنی ذات میں) ایک امت تھے، اللہ کے فرمانبردار اور یکسو رہنے والے (صرف اسی ذاتِ حق کے پرستار) تھے اور وہ ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔''

اسی للّٰہیت اور خلوص کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انہیں خلیل (دوست) کے پروقار لقب سے نوازا:

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا (النساء ۴:۱۲۵) ''اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا۔''

نیز انہیں 'حنیف' کہہ کر یاد فرمایا، یعنی ایسا شخص جس نے فکر و آرزو اور عمل و کردار کے اعتبار سے اپنی ذات کو صرف توحید اور اطاعت الٰہی کے ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا تھا اور ہر وقت سراپا محبت الٰہی میں سرشار رہتے تھے اور زندگی کا ہر ہر لمحہ صرف اسی کی رضا کے لیے وقف تھا، یہی ایک سچے مسلمان کی شان ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا (ال عمران ۳:۶۷)

''ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ سب سے بے تعلق ہو کر ایک اللہ کے ہو رہے تھے اور اسی کے

فرمانبردار (یعنی مسلم) تھے۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں توحید کی اشاعت وفروغ کے لیے بیت اللہ کی بنیاد رکھی، جس کے انوار و برکات سے تا قیامت اذہان وقلوب کسب فیض کرتے رہیں گے اور چار دانگِ عالم سے مسلمان رب کائنات کی کبریائی وعظمت بیان کرنے کے لیے وہاں کشاں کشاں پہنچا کریں گے، اس کا مشاہدہ دنیا کا ہر شخص موسم حج میں کرسکتا ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مختلف ابتلاء وآزمائش کی کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑا اور وہ ہر آزمائش میں بفضل تعالیٰ ثابت قدم رہے۔ کبھی پوری بت پرست قوم اور برادری سے ٹکر لے کر نعرۂ توحید بلند کیا اور ان کے بتوں کو پاش پاش کر ڈالا جس کی سزا یہ دی گئی کہ آگ کے بہت بڑے الاؤ میں انہیں پھینکا گیا مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ آگ ان کے لیے گلزار بن گئی، اور کبھی رضائے الٰہی کے لیے اپنے مولد ومسکن کو خیر باد کہا کہ جو ہر داعیِ حق کے لیے ضروری اور ناگزیر ہے، اور کبھی اپنے لخت جگر اسماعیل اور ان کی والدہ بی بی ہاجرہ کو لق ودق صحرا میں اپنے مولا ومالک کی رضا کے لیے چھوڑ کے چلے آئے اور کبھی خواب میں اللہ کی طرف سے اشارہ پا کر اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے..... اسی ایثار وفدویت، فداکاری وسرفروشی کے صلہ میں انہیں نسل انسانی کی امامت وپیشوائی عطا ہوئی۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ رَبُّهٗ اور جب آزمایا ابراہیمؑ کو (رب ۔ ۵) اس کے رب نے، **بِكَلِمٰتٍ**، (بِ. كَلِمٰتٍ) چند کلمات (باتوں) کے ساتھ وہ چند باتیں جو ہمیں قرآن حکیم سے معلوم ہوئی ہیں ان کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے **فَاَتَمَّهُنَّ** (فَ. اَتَمَّهُنَّ) پس پورا کیا انہیں (اَتَمَّ، یُتِمُّ، اِتْمَامٌ) پورا کرنا، هُنَّ کی ضمیر کلمات کی طرف جاتی ہے، یہ بات ذہن میں رہے کہ سیدنا ابراہیمؑ کی نبوت ورسالت کا انحصار ان کلمات کو پورا کرنے کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ نبوت تو وہبی (اللہ کی عطا وبخشش) امر ہے، البتہ ان کلمات کو بسر وچشم اور بخیر وخوبی سر انجام دینے پر دنیا کی امامت اور پیشوائی سے سرفراز کیے گئے، ﴿**قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا**﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بے شک میں بنانے والا ہوں تجھے نسل انسانیت کے لیے امام (پیشوا) یعنی ایسا امام اور قائد جس کی پیروی کی جائے، جس کے قُدوۂ حسنہ کو نمونہ بنایا جائے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بعد جو بھی نبی آئے وہ ملت ابراہیمی ہی کے پیروکار تھے، یہی پاکیزہ اور سچا، دائمی اور ابدی دین ہے اور یہی نجات کا واحد راستہ ہے، ملت ابراہیم کی پیروی کا متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے، صرف اس آیت کو درج کرتا ہوں جس میں

امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی گئی ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ، هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ، مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ، هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ، مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ، فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ، وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ، هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (الحج ۲۲:۷۸)

''اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے (اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اشاعت دین میں کھپا دو) اس نے تمہیں (اپنے دین کے لیے) چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی (احکام سہل اور قابل عمل ہیں) یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے (جو پوری انسانیت کے امام ہیں) اللہ نے اس سے پہلے بھی تمہارا نام مسلم (فرمانبردار) رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا نام مسلم ہی ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم (امت محمدیؐ) لوگوں پر گواہ ہو، لہٰذا نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ (کے دین) کو مضبوطی سے تھامے رکھو وہ تمہارا کارساز ہے، وہ کیا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار ہے۔''

﴿قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ﴾ پوچھا (ابراہیمؑ نے) اور میری اولاد میں سے (سب کو یہ امامت وسیادت نصیب ہوگی؟) ﴿قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ فرمایا (اللہ تعالیٰ) نے، لَا يَنَالُ نہیں پہنچے گا (نَالَ، يَنَالُ، نَيْلًا) پالینا، پہنچنا، عَهْدِي میرا وعدہ (عَهْدِ. ی) یعنی منصب امامت کا، الظّٰلِمِيْنَ، ظالموں تک، ظالم کی جمع ہے اور ظالم وہ لوگ ہوتے ہیں جو اطاعت وفرمانبرداری کی راہ چھوڑ کر خواہشات نفس کی پیروی کریں، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بتایا جا رہا ہے کہ منصب امامت کے حق دار ابرار وصالحین میں سے ہوں گے نہ کہ فجار واشرار میں سے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ابتلا وآزمائش سے اپنے بندوں کی اخلاقی وروحانی تربیت کرنا، اللہ تعالیٰ کی سنت ہے اس سے ان کی مخفی صلاحیتیں ابھرتی، نکھرتی اور نشوونما پاتی ہیں، پھر اس سے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز پیدا ہوتا ہے اور یہ نرم اور سخت، خوش کن اور رنج دہ، حوصلہ افزا اور حوصلہ شکن دونوں طرح کے حالات کے ذریعہ ہوتا ہے، حدیث مبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے اور اس کے ہر معاملہ میں خیر ہی خیر ہے اور یہ مومن کے سوا اور کسی کے نصیب میں نہیں ہے، اگر اسے بھلائی اور راحت پہنچتی ہے تو شکر کے جذبات سے اس کا دل معمور ہو جاتا ہے اور یہ اس کے لیے فوز وفلاح کا باعث ہوتا ہے اور اگر وہ تنگی ترشی سے دوچار ہوتا ہے تو صبر و قناعت کی تصویر بن جاتا ہے تو یہ بھی اس کی کامیابی کا مژدہ جانفزا ہوتا ہے۔[صحیح مسلم]

۲) اللہ تعالیٰ کے وفادار بندے، صرف اپنے خالق و مالک کی رضا کے طالب ہوتے ہیں، وہ خواہشات نفس ہوں یا قوم اور برادری کی غلط رسومات وخرافات ہوں یا ان کے غلط عقائد ونظریات ہوں ان سب باتوں سے منہ موڑ کر حق اور سچ پر ثابت قدم رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے دین پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی حق پرستی نے ہمیں یہ روشنی دی ہے کہ وفا اور حریت کی راہ میں قومیت کی آہنی زنجیریں پاؤں کو بوجھل نہیں کرسکتیں، راہِ حق میں وطن اور اولاد کی محبت بھی آڑے نہیں آ سکتی۔ اسلام اور ایمان کی صداقت سب سے بالا ہے، اللہ تعالیٰ کی غلامی کا حق سب سے مقدّم ہے اور اپنے مالک کو راضی کرنے کے لیے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے، اسی استقامت اور ثابت قدمی پر رب کریم کی طرف سے امامت وسیادت کی خوشخبری ملتی ہے، کامیابی اور کامرانی کی نوید سنائی جاتی ہے اور دنیا وآخرت میں فوز وفلاح کی بشارت دی جاتی ہے۔

۳) نبوت وامامت ایسی شے نہیں جو وراثۃً خاندانوں میں منتقل ہوتی رہے، اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ کون اس کا جائز حقدار ہے، ارشاد ہوتا ہے: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام:۱۲۴) ''اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا کام کس سے لے۔''

چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو یہ بات سمجھا دی گئی کہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ امامت آپ کے خاندان میں رہے گی، مگر خاندان کے ان افراد کو اس نعمت عظمیٰ سے نوازا جائے گا جو اس کے اہل ہوں گے اور نافرمان اس سے محروم رہیں گے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے فرزند، اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام اس نعمت سے نوازے گئے، پھر سیدنا اسحاق علیہ السلام کے بیٹے یعقوبؑ کو اس نعمت سے سرفراز کیا گیا اور ان سے یہ نعمت ان کے فرزند یوسف علیہ السلام کو منتقل ہوئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوا، سیدنا شعیب علیہ السلام کا تعلق قبیلہ مدین سے تھا ان کا سلسلہ نسب بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے جاملتا ہے، سیدنا اسحاق علیہ السلام کی نسل سے سیدنا

عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے جبکہ سالار انبیا خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ نسب سیدنا اسماعیل علیہ السلام سے جاملتا ہے۔

۴) نیکی اور اچھائی کا اصول قوموں اور ملکوں پر بھی صادق آتا ہے، وہ قومیں پھلتی پھولتی ہیں جو عدل و انصاف اور سچائی وراستبازی پر قائم رہتی ہیں اور جو ظلم وستم، دھوکہ اور فریب، لڑائی جھگڑوں اور دنگا فساد کو زندگی کا لائحہ عمل بناتی ہیں، انہیں بالآخر صفحۂ ہستی سے جلد یا بدیر مٹا دیا جاتا ہے، قرآن حکیم نے عاد و ثمود ایسی ظالم اقوام کا ذکر کیا ہے، ظالموں کے لیے نہ تو دنیا میں کوئی مقام ہے اور نہ آخرت ہی میں کوئی نجات۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا، وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى، وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (۱۲۵)	''اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے اس گھر (خانہ کعبہ) کو مرجع خلائق اور دارالامن قرار دیا (اور لوگوں کو حکم دیا کہ) مقامِ ابراہیم کو مقامِ نماز بنائیں اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھیں۔''

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا﴾

اور جب ہم نے بنایا گھر (بیت اللہ) کو اجتماع کی جگہ (مرجع خلائق) اور مقام امن۔

وَاِذْ (اور یاد کرو) اِذْ، وقت کو ظاہر کرتا ہے جَعَلْنَا، ہم نے بنایا (جَعَلَ، يَجْعَلُ) بنانا، مقرر کرنا، الْبَيْتَ، خاص گھر یعنی بیت اللہ، مَثَابَةً، اجتماع کی جگہ، اس کا مادہ ثوب ہے، جس کے معنی لوٹ آنا، جمع ہونا کے ہیں اور مَثَابَةً، مقام اور مرکز، وہ جگہ جہاں لوگ رجوع الی اللہ کے لیے جمع ہوں۔ کسی عرب شاعر نے کیا

خوب کہا ہے جس کا ترجمہ ہے: ''روز اول ہی سے اس کے محاسن اور خوبیاں عیاں ہیں اور لوگوں کے دل مقناطیس کی طرح وہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔'' وَ اَمْنًا، مقام امن وسلامتی۔ قرآن حکیم میں آتا ہے وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ''جو اس میں داخل ہوا مامون ہوگیا۔'' (ال عمران:۹۷)

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''مَثَابَةً، مصدر ثوب کے معنی ہیں، کسی شے کا اپنی حالت اصلی یا حالت مقصودہ کی طرف لوٹنا اور جب کچھ لوگ کسی مقام کی طرف لوٹتے ہیں تو کہا جاتا ہے 'ثَابَ الْقَوْمُ'' یعنی لوگ واپس آ گئے، مَثَابَةً میں ۃ مبالغہ کی ہے، اس میں زور اور تاکید کے معنی پیدا ہوتے ہیں اور یہ مثاب میں اضافی ہے، گویا مَثَابَةً کے معنی ہیں وہ مقام جس کی طرف انسان بار بار رجوع کرے اور پھر بھی جی نہ بھرے اور بیت الحرام کا یہ وصف سب کے دیکھنے میں آتا ہے، لوگ حج پر حج اور عمرہ پر عمرہ کرتے چلے جاتے ہیں اور اس سے اکتاتے نہیں اور پھر چونکہ 'البیت' عمرہ اور حج کے لیے مرجع خلائق ہے اس لیے اجتماع ورجوع کے ساتھ عبادت کا مفہوم بھی لازماً اس لفظ میں شامل ہوگیا ہے، عام زائرین کا جو تانتا کعبۃ اللہ کی زیارت اور عمرہ کا سال کے ہر موسم، ہر فصل، ہر زمانہ میں لگا رہتا ہے، اس سے قطع نظر تصور میں نقشہ ان لاکھوں انسانوں کا جمایئے جو صرف حج کے موقع پر کھنچے چلے آتے ہیں، صرف حجاز یا ملک عرب ہی کے ہر حصہ سے نہیں بلکہ روئے زمین کے ہر خطہ، ہر علاقہ، ہر ملک سے اور پھر یہ بھی ذہن میں رکھ لیجیے کہ یہ سلسلہ دس بیس سال سے نہیں، حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ یعنی تقریباً چار ہزار سال سے قائم ہے! جب جا کر للناس (لوگوں کے لیے) کی جامعیت کی تفسیر ذہن میں آ سکے گی۔ 'اَمْنًا' مامونیت اسی سے ظاہر ہے کہ صرف عمارت کعبہ یا مسجد الحرام ہی نہیں بلکہ اردگرد کی سرزمین میلوں تک داخل حرم ہے اور حرم وہ علاقہ ہے جہاں انسان کی جان لینا الگ رہا جانور تک کا شکار جائز نہیں اور یہ حکم تو خیر شریعت اسلامی کا ہے اَرْضِ حرم کا مامن (جائے امن وسلامتی) ہونا جاہلیتوں کو بھی مُسَلَّمْ رہا ہے (یعنی دور جاہلیت میں بھی حرم کا تقدس تسلیم کیا جاتا تھا)۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾

اور مقرر کرلو (بنالو)؛ مقامِ ابراہیم کو مقامِ نماز۔

وَاتَّخِذُوْا فعل امر جمع مذکر (اتَّخَذَ، یَتَّخِذُ، اِتِّخَاذٌ) بنانا، مقرر کرنا، مِنْ سے، مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کا آغاز کیا تھا اور بعض کے نزدیک حرم اور اطراف حرم سب کا سب مقام ابراہیمؑ ہے۔

مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''آیت میں مقام ابراہیمؑ کا لفظ آیا ہے، مقام سے کیا مراد ہے؟ علمائے تفسیر سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں''ایک گروہ کے نزدیک اس سے مراد وہ پتھر ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ مفسرین کے دوسرے گروہ کے نزدیک.....واضح رہے کہ اس گروہ میں ابن عباسؓ مجاہدؒ اور عطاؒ جیسے اکابر علمائے تفسیر شامل ہیں۔ اس سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے، اس گروہ نے مقام کے لفظ کو کسی مخصوص (مقام) پر کھڑے ہونے کے بجائے مسکن و مستقر کے مفہوم میں لیا ہے، ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے، اس تاویل میں وسعت و جامعیت کے ساتھ ساتھ خاص اہمیت رکھنے والا پہلو یہ ہے کہ نظم کلام کے اعتبار سے یہ اس مقصد کو زیادہ واضح کرنے والی ہے جس کے لیے یہ بات کہی گئی ہے، یہاں یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہی گھر تمام اولادِ ابراہیم کا قبلہ رہا ہے، اسی لیے کہ یہی گھر ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے اس مستقر میں تعمیر کیا جس میں ہجرت کے بعد انہوں نے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ سکونت اختیار کی۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

ظاہر ہے کہ مقام ابراہیم کوئی وسیع جگہ ہے، جس میں حج اور عمرہ کرنے والے ہزاروں اور لاکھوں انسان بیک وقت سما سکیں اور رب جلیل کی چوکھٹ پر جبین نیاز خم کر سکیں اور یہ حرم کا پورا علاقہ ہے جسے جائے نماز (مُصَلّٰی) بنایا جاتا ہے۔

﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾

اور ہم نے تاکید کی اسماعیلؑ اور ابراہیمؑ کو کہ (وہ) پاک صاف رکھیں، میرے گھر کو، طواف اور اعتکاف اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔

عَهِدْنَا اَیْ اَمَرْنَا ہم نے حکم دیا، ہم نے باتاکید کہا، اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو،

سیدنا اسماعیل علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے تھے، ابراہیمؑ کی مصری بیوی حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے تھے سال ولادت غالباً ۲۰۷۴ ق،م، توریت کے مطابق عمر ۱۳۷ سال کی پائی، عرب کا مشہور و عالی نسب قبیلہ قریش آپ ہی کی نسل سے ہے، اس لیے آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی مورث اعلیٰ ہوئے۔ (تفسیر ماجدی)

اَنْ طَهِّرَا، یہ کہ تم دونوں (ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ) پاک صاف رکھو (طَهَّرَ، يُطَهِّرُ، تَطْهِيْرًا) پاکیزہ رکھنا اور یہ طہارت دو طرح سے ہوتی ہے، ظاہری طور پر غلاظت اور گندگی سے طہارت اور صفائی کا خیال رکھنا اور باطنی لحاظ سے شرک و بدعت فتنہ و فساد سے بچنا، لِلطَّآئِفِيْنَ طواف کرنے والے، اس کا مفرد طائِف ہے (طَافَ يَطُوْفُ، طَوْفًا) طواف کرنا، یعنی خانہ کعبہ کے گرد اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی بیان کرتے ہوئے چکر لگانا جو فدویت اور نیاز مندی کا ثبوت ہے، حج اور عمرہ میں یہ فرض ہے وَالْعٰكِفِيْنَ، اعتکاف کرنے والے، عاکف اس کا مفرد ہے (عَكَفَ، يَعْكِفُ عُكُوْفًا) ٹھہرنا، پابند ہو جانا، شریعت کی اصطلاح میں اعتکاف، مسجد کے اندر عبادت کی نیت سے ایک مدت تک قیام کو کہتے ہیں، رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف سنت ہے۔

وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ اور رکوع و سجود کرنے والے الرُّكَّعِ اس کا مفرد رَاكِعٌ ہے السُّجُوْد، اس کا مفرد سَاجِدٌ ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) اسلام کی صداقت کی بہت بڑی دلیل اس کی ہمہ گیر جاذبیت بھی ہے، اس جذب و کشش کا سب سے بڑا مرکز بیت اللہ ہے، سیدنا ابراہیمؑ نے اپنے فرزند ارجمند سیدنا اسماعیلؑ سے مل کر کئی سو سال پہلے اس وادیِ غیرِ ذی زرع بے آب و گیاہ زمین میں اللہ کا گھر بنایا اور رب کریم کے حضور فریاد کی کہ ''فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ'' (ابراہیم: ۳۷) الٰہ العالمین! ایسے اسباب مہیا فرما دے کہ یہ زمین تیری عبادت کے لیے مرجع خلائق بن جائے اور اس کی بظاہر ویرانی، باطنی انوار سے مالا مال ہو جائے اور لوگ اقصائے عالم سے اس کی طرف کھنچے چلے آئیں، رب کریم نے اپنے اس مخلص اور وفادار بندے کی دعا قبول فرمائی۔ لوگ دور دراز کا سفر طے کر کے، عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرتے

ہوئے وہاں پہنچتے ہیں..... دنیا کے ہر خطے اور ہر ملک کے مسلمان، ہر نسل اور ہر ذات کے اہل ایمان اس مقدس مرکز میں جمع ہوتے ہیں اور سب کے سب ایک ہی قسم کے لباس میں ملبوس اور ایک ہی جیسی صدائے توحید سے فضا کو معمور کر دیتے ہیں۔ ان میں اونچ نیچ، کالے گورے، مشرقی و مغربی کی تفریق مٹ جاتی ہے گویا کہ سب مسلمان اخوت و محبت کی تصویر بن جاتے ہیں اور ''كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ'' (گویا کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہیں) کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے دراصل اسلام اپنے ماننے والوں کے درمیان بھائی چارے کی ایسی ہی فضا قائم کرنا چاہتا ہے۔

۲) حکم ہوتا ہے کہ مقام ابراہیمؑ کو نماز کی جگہ بناؤ، حرم میں داخل ہونے پر زائر کو چاہیے کہ سیدنا ابراہیمؑ کی طرح لوجہ اللہ اپنی جان، اپنا مال، وطن و دیار اور شعوب و قبائل کو قربان کرنے کو تیار ہو، کیونکہ ابراہیمؑ کو انہی قربانیوں نے دنیا کا امام و پیشوا بنایا تھا۔

۳) جس طرح بیت اللہ کی ظاہری اور باطنی پاکیزگی کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح دنیا میں بنائی جانے والی ہر مسجد اسی حکم کے تحت آجاتی ہے، اور مسجد کے اردگرد بسنے والوں کا فرض بنتا ہے کہ اس بات کا پورا خیال رکھیں۔

۴) مساجد کی شان قیامِ صلوٰۃ اور رکوع و سجود سے برقرار رہتی ہے، اسی سے مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی زندگی مضبوط ہوتی ہے، افسوس کہ مسلمانوں نے اس کی روح کو ضائع کر دیا ہے..... دن میں پانچ بار محلّہ کی مساجد میں نمازیں، جمعۃ المبارک جامع مساجد میں نماز، کھلے میدانوں اور پارکوں میں عیدین کی نماز اور پھر ہر سال حج کا عظیم الشان اجتماع، کیا ان کی صف بندی اور اتحاد کا بے نظیر اور بے مثال مظاہرہ نہیں ہے؟ کیا وہ مل بیٹھ کر اپنے تمام مسائل حل نہیں کر سکتے ہیں؟ آج مسلمان ذلیل و خوار کیوں ہو رہے ہیں؟ آیئے قرآن کی ہدایات پر عمل پیرا ہو جائیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ، وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۲۶)	''اور یاد کرو اس بات کو کہ ابراہیمؑ نے دعا کی، ''اے میرے رب! اس جگہ (مکہ) کو امن والا شہر بنا اور اس کے باشندوں کو جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، ہر قسم کے پھلوں کے رزق سے نواز''، اللہ نے فرمایا ''دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان میں کفار کو بھی دوں گا اور پھر عالم بے بسی میں (انہیں سوء اعمال کے سبب) عذاب جہنم میں داخل کروں گا اور (دوزخ تو) بہت برا ٹھکانا ہے۔''

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾

اور جب کہا ابراہیمؑ نے، اے رب! بنا دے اس کو امن والا شہر۔

وَاِذْ (اور اس وقت کو یاد کرو) اِذْ وقت کو ظاہر کرتا ہے، قَالَ (قَالَ، يَقُوْلُ قَوْلًا) کہنا، قول و قرار اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے، اِبْرٰهٖمُ سیدنا ابراہیم علیہ السلام، رَبِّ کا معنی یا رب، اے پروردگار، اِجْعَلْ بنا دے (جَعَلَ، يَجْعَلُ، جَعْلًا) بنانا، اِجْعَلْ فعل امر واحد مذکر، هٰذَا بَلَدًا اس (مکہ) کو شہر، اٰمِنًا، امن والا، یہاں کے باشندوں کو ہر طرح سے سکون اور سلامتی نصیب ہو۔ یہ وادِ غیر ذی زرع کے لیے دعا ہے جب یہاں آبادی ہوگئی، شہر بس گیا تو اس وقت کی دعا هٰذَا البلد اٰمنا کے الفاظ سے سورۂ ابراہیم کی آیت ۳۵ میں ہے۔

﴿وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾

اور رزق عطا فرما، اس کے باشندوں کو، پھلوں میں سے جو کوئی ایمان لائے ان میں سے، اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر۔

وَارْزُقْ فعل امر، واحد مذکر، اور رزق عطا فرما (رَزَقَ، يَرْزُقُ، رِزْقًا) رزق دینا، اَهْلَهٗ (اَهْلَ.هٗ)

اس کے باشندوں کوہٗ کی ضمیر (بَلَدًا) شہر کی طرف جاتی ہے، الثَّمَرٰتِ اس کا مفرد ثمرہ (پھل) مَنْ (جو کوئی) اٰمَنَ، ایمان لائے، مِنْهُمْ (مِنْ.هُمْ) ان میں سے، بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، اللہ اور روزِ آخرت پر،

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''اٰمِنًا (کے معنی) مامون و مطمئن کے ہیں، یہ دعا حضرت ابراہیمؑ نے اس سرزمین کے لیے فرمائی ہے جس پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا اور جہاں حرم کی تعمیر کی، یہ علاقہ جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، تہذیب و تمدن اور آبادی و زرخیزی سے بالکل محروم تھا، خانہ بدوش قبائل پانی اور چراگاہوں کی تلاش میں موسموں کے تغیر کے ساتھ ساتھ ادھر سے ادھر منتقل ہوتے رہتے تھے، معاش کا ذریعہ یا تو گلہ بانی تھا یا شکار یا پھر لوٹ مار، اس وجہ سے اس سرزمین کے دو مسئلے خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں بڑے اہم تھے، ایک امن کا، دوسرا غذا کا۔

حضرت ابراہیمؑ کی مذکورہ دعا انہی دو چیزوں کے لیے تھی، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا جس طرح قبول فرمائی اور اس کی جو برکتیں حضرت ابراہیمؑ کی ذریت اور اس علاقہ کے باشندوں کے لیے ظاہر ہوئیں وہ تاریخ کی ایک ایسی زندہ اور محسوس حقیقت ہے کہ کوئی کٹر سے کٹر مخالف بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

ثمرات سے مراد صرف میوہ جات نہیں ہیں بلکہ ہر قسم کا پاکیزہ رزق ہے۔ میوہ جات کے لیے عربی کا لفظ فَوَاكِهٌ مخصوص ہے جبکہ ثمرات کا استعمال وسیع معنوں میں ہوتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ (قصص:۵۷)

''کیا ہم نے مامون حرم میں ان کے قدم نہیں جمائے جہاں ہر چیز کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں''۔

اس بات کا آج بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر سال لاکھوں کی تعداد میں دنیا کے کونے کونے سے لوگ حج اور عمرہ کے لیے وہاں جمع ہوتے ہیں اور انواع و اقسام کی پاکیزہ نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور کسی طرح کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

پھر غور کیجیے کہ دشمن اور بھوک کا ڈر زندگی کے ایسے خوفناک سائے ہیں جس سے وہ کرکری اور خواری کا شکار ہو جاتی ہے، سکون اور عافیت رخصت ہو جاتے ہیں، ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں، اور ہر وقت اضطراب اور بے چینی میں گزر بسر ہوتی ہے، رب کریم نے اہل مکہ کو ان دشمنوں سے نجات عطا فرمائی، اس کا ذکر اس آیہ مبارکہ میں بھی کیا: فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ، الَّذِىْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ

خَوْفٍ (قریش:۳،۴) ''انہیں (قریش مکہ کو) چاہیے کہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک میں کھلایا (پلایا) اور (دشمن) کے خوف سے امن اور اطمینان نصیب کیا'' اور یہ حقیقت ہے کہ اگر کسی دشمن نے ان کی طرف بری نظر سے دیکھا تو اسے نیست و نابود کر دیا گیا۔

خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے کوئی پچاس دن قبل یمن کا گورنر ابرہہ بیت اللہ کی عظمت و شوکت کو مٹانے کے لیے ہاتھیوں کے بہت بڑے لشکر کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھا، اللہ تعالیٰ نے ابابیل پرندوں کے ذریعے اس پورے لشکر کو تباہ و برباد کرا دیا۔ یہ اپنی چونچوں میں نوکدار کنکریاں اٹھا کر لاتے اور بارش کی طرح لشکر پر برساتے تھے اس کا تذکرہ سورۃ الفیل میں آتا ہے۔

﴿قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا﴾

فرمایا اور جس کسی نے کفر کیا، پس اسے (چند روزہ زندگی میں) فائدہ اٹھانے کا تھوڑا سا موقع دوں گا۔

قَالَ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، وَمَنْ اور جس کسی نے، كَفَرَ فعل ماضی واحد مذکر غائب (كَفَرَ، يَكْفُرُ، كُفْرًا) کفر کرنا، انکار کرنا، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جھٹلانا، ناشکری کی راہ اختیار کرنا، فَأُمَتِّعُهُ (فَ.أُمَتِّعُ.هُ) پس، میں اسے نفع دوں گا، فعل مضارع، واحد متکلم (مَتَّعَ، يُمَتِّعُ، تَمْتِيعٌ) باب تفعیل، فائدہ دینا قَلِيلًا، تھوڑا سا، دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں یقیناً تھوڑی سی ہے، اس دنیا میں مومن اور کافر دونوں کو رزق دیا جاتا ہے بلکہ کافر کو فراوانی سے عطا کیا جاتا ہے مگر آخرت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات سے صرف مومن بہرہ ور ہوں گے۔

﴿ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ، وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾

پھر مجبور کروں گا میں اس کو (کافر کو) عذاب جہنم کی طرف اور وہ رہنے کی بدترین جگہ ہے۔

ثُمَّ پھر، حرف عطف کہلاتا ہے، اَضْطَرُّهُ اس کا مادہ (ض رر) ہے (اِضْطَرَّ، يَضْطَرُّ، اِضْطِرَارٌ) باب افتعال ہے کسی کو نقصان دہ اور ناپسندیدہ کام پر مجبور کرنا، اردو زبان میں اضطرار بے قراری اور بے چینی کے معنی میں آتا ہے، کفار کو روز قیامت طوعاً و کرھاً، جہنم میں دھکیلا جائے گا، عَذَابِ النَّارِ، جہنم کی سزا، وَبِئْسَ الْمَصِيرُ، اور وہ رہنے کی بدترین جگہ ہے، بئسَ فعل ذَمْ ہے الْمَصِيرُ، ٹھکانا، لوٹنے کی جگہ، مَصِيرُ

وہ آخری حالت ہے جس کی طرف انسان منتقل ہوتا ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب منصب امامت کے متعلق پوچھا تھا تو ارشاد ہوا تھا کہ اس منصب کا وعدہ تمہاری اولاد کے صرف مومن وصالح لوگوں کے لیے ہے، ظالم اس سے مستثنیٰ ہیں، اس کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ رزق کے لیے دعا کرنے لگے، تو سابق فرمان کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے صرف اپنی مومن اولاد ہی کے لیے دعا کی، مگر اللہ تعالیٰ نے جواب میں اس غلط فہمی کو فوراً رفع فرما دیا اور انہیں بتایا کہ امامت صالحہ اور چیز ہے اور رزقِ دنیا دوسری چیز، امامت صالحہ صرف مومنین صالحین کو ملے گی، مگر رزقِ دنیا مومن و کافر سب کو دیا جائے گا، اس سے یہ بات خود بخود نکل آئی کہ اگر کسی کو رزقِ دنیا فراوانی کے ساتھ مل رہا ہو تو وہ اس غلط فہمی میں نہ پڑے کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور وہی اللہ کی طرف سے پیشوائی کا مستحق بھی ہے۔

(تفہیم القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) غور کیجیے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کائنات کے خالق و مالک کے حضور کس عاجزی وخاکساری سے دعا کی ''اے میرے رب! اس جگہ کو دارالامن بنا دے اور اس کے باسیوں کو ثمرات (رزق حلال) سے نواز'' اس میں دعا کا سلیقہ اور ادب سکھلا دیا اور خود یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی رحمت وشفقت اور لطف وکرم کو متوجہ کرنے پر مقبول وموثر ہیں۔

۲) سیدنا ابراہیم نے رب کریم کے حضور امن اور سلامتی کو طلب کیا کہ خوشگوار زندگی مال ودولت کی فراوانی سے نہیں بلکہ ماحول کے اطمینان وسکون سے ملتی ہے، چنانچہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دنیا میں کتنے ہی مالدار ہیں جو امن اور عافیت سے محروم ہیں!

۳) سیدنا ابراہیم نے رزقِ حلال کی کشادگی (ثمرات) کی تمنا کی کہ اس سے بھی روح مسرت وشادمانی سے ہمکنار ہو جاتی ہے، اس لیے بندہ مومن کو اللہ تعالیٰ کے حضور پاکیزہ رزق کے حصول کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے۔

۴) یہ دنیا عارضی اور فانی ہے، مال و دولت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ شکر گزاری، ایمان اور اللہ تعالیٰ کی بندگی ضروری ہے، ناشکری اور کفر انسان کو عذاب جہنم سے دوچار کرنے کا باعث ہوں گے۔

۵) آیے ہم سب مل کر دعا کریں ''اے رب! ہمارے اس وطن عزیز میں، امن اور سلامتی پیدا فرما، ہمارے اوپر نیک حکمران مسلط فرما جو تیرے دین کو اس ملک میں جاری وساری کریں، نصف صدی سے زاید عرصہ سے غریب عوام ظلم وستم کی چکی میں پس رہے ہیں، اے پروردگار! ہمیں ظلم اور ظالموں سے نجات عطا فرما۔ آمین!

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا، اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۲۷) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ، وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا، اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۱۲۸) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ، اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۲۹)	اور یاد کرو اس بات کو کہ جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو لبوں پر یہ دعا جاری تھی) ''اے ہمارے رب! (یہ خدمت) ہماری طرف سے قبول فرما! یقیناً تو ہی (فریادوں اور دعاؤں کا) سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار..... مسلم..... بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک امت تشکیل فرما جو تیری فرمانبردار..... مسلم..... ہو! ہمیں اپنی بندگی کا طریقہ اور سلیقہ سکھلا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما! یقیناً تو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے، اے ہمارے رب! انہی میں سے ایک ایسا رسول بھیج جو ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان (کے دلوں) کا تزکیہ کرے، لاریب کہ تو عزیز وحکیم ہے۔

﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ﴾

اور جب اٹھا رہے تھے ابراہیمؑ بنیادیں بیت اللہ کی اور اسماعیلؑ (بھی ان کے ساتھ تھے)

وَاِذْ (اور اس وقت کو یاد کرو جب) یَرْفَعُ، وہ اٹھاتا ہے، فعل مضارع صیغہ واحد مذکر غائب (رَفَعَ، یَرْفَعُ، رَفْعًا) اٹھانا، بلند کرنا۔ اَلْقَوَاعِدَ بنیادیں، اس کا مفرد اَلْقَاعِدَہ ہے اس کا مادہ (ق ع د) ہے قَعَدَ، یَقْعُدُ، بیٹھنا، مَقْعَدٌ بیٹھنے کی جگہ، بنچ وغیرہ، دیوار کی بنیاد کو القاعدہ کہا جاتا ہے کیونکہ بنیاد نیچے بیٹھی ہوتی ہے اور اس پر عمارت کو اٹھایا جاتا ہے، مِنَ الْبَیْتِ (گھر کی) بیت کے معنی گھر کے ہیں اور اس کے شروع میں اَلْ کا اضافہ معرفہ کی علامت ہے یعنی خاص گھر، اس سے مراد بیت اللہ ہے سیدنا اسماعیلؑ، سیدنا ابراہیمؑ کے فرزند ارجمند ہیں ان کی والدہ ماجدہ کا نام ہاجرہ تھا، سیدنا اسماعیلؑ ابھی شیر خوار بچے ہی تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ اپنے لخت جگر اور ان کی والدہ محترمہ کو مکہ کی بے آب و گیا وادی میں چھوڑ کر چلے آؤ، اس وفادار بندے نے مولا و مالک کے حکم کی فوری تعمیل کی اور وادی میں کھڑے ہو کر اس کے حضور یوں دعا کی:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ (ابراہیم ۱۴:۳۷) ''اے ہمارے رب! میں نے تیرے ہی حکم اور اذن سے اپنی اولاد میں سے (اسماعیل کو) اس وادی غیر ذی زرع میں تیرے محترم اور معزز گھر کے پاس لا بسایا ہے، اے ہمارے رب! تا کہ وہ نماز قائم کریں لوگوں کے دل ان کی طرف راغب اور مائل فرما دے، تو انہیں کھانے کو (ثمرات) پاکیزہ رزق مہیا فرما، تا کہ وہ شکرانِ نعمت کریں''۔

غور کیجیے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اس پر خلوص دعا کو رب العالمین نے شرفِ قبولیت سے کیسے نوازا۔ بی بی ہاجرہؑ کا پانی کی تلاش میں صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا، اسماعیلؑ کی ایڑیوں سے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ٹھنڈے اور شیریں چشمے کا جاری ہونا، گزرنے والے قافلوں کا اس بابرکت پانی سے فیض یاب ہونا، پھر آہستہ آہستہ لوگوں کا وہاں آباد ہونا، پھر چھوٹی سی بستی سے شاندار شہر کی بنیاد پڑنا اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے مقدس ہاتھوں سے بیت اللہ کی تعمیر ہونا اور اقصائے عالم سے ہر سال حج کے لیے لاکھوں افراد کا وہاں جمع ہونا اور انہیں ہر طرح کے پاکیزہ رزق سے نوازا جانا، یہ اس دعائے ابراہیمی کے مستجاب ہونے کی

زندہ جاوید مثال ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

سیدنا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ بیت اللہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے، تو لبوں پر یہ کلمات جاری تھے:

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾

''اے ہمارے رب! (یہ خدمت) ہماری طرف سے قبول فرما، یقیناً تو ہی (فریادوں اور دعاؤں) کا سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے''۔

اِنَّکَ (اِنَّ. کَ) بلاشبہ، تو، اس میں 'ک' ضمیر متصل مخاطب ہے اس کے بعد اَنْتَ ضمیر منفصل مخاطب لانے سے مزید تاکید پیدا ہوئی، اردو میں اس کا ترجمہ ''تو ہی'' سے ادا ہوتا ہے، السَّمِیْعُ، الْعَلِیْمُ، یہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کائنات میں ہر ذی روح کی پکار کو بیک وقت سنتا ہے اور تمام مخلوق کے حالات و معاملات سے ہر وقت باخبر رہتا ہے بلکہ ہر شخص کی نیت کو بھی جانتا ہے۔

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ﴾

اے ہمارے رب! اور بنا دے ہم کو مسلم (فرمانبردار) اپنا، اور اے رب! ہماری اولاد میں سے ایک امت تشکیل فرما جو تیری فرمانبردار (یعنی مسلم) ہو۔

مُسْلِمَیْنِ، تثنیہ کا صیغہ ہے اس کا مفرد مسلم ہے (س ل م) اس کا مادہ ہے جس کا معنی نجات پانا، ظاہری اور باطنی آفات سے محفوظ رہنا، اسی سے لفظ اسلام ہے جس کے معنی، اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں یعنی احکام الٰہی کو دل و جان سے قبول کر لینا اور مسلم اسم فاعل ہے یعنی ایسا شخص جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دے، مسلمان کی تعریف حدیث مبارکہ کی روشنی میں اس طرح آئی ہے: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ اور سلامت رہیں''۔

سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا اسماعیلؑ نے اسلام پر ثابت قدمی کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی، بلکہ اپنی اولاد کے لیے بھی ایسی ہی تمنا اور آرزو کی۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ لکھتے ہیں:

''یہ دونوں پیغمبر (ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ) جب خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو ساتھ ساتھ دعا بھی کر رہے تھے کہ الٰہی: ہماری یہ خدمت قبول فرما اور ہمیں اپنا مسلم (مطیع فرماں) بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک مسلم قوم پیدا کر اور مسلم وہ ہوتا ہے جو اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اپنے آپ کو کلیۃً اللہ کے سپرد کر دے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے، اس عقیدے اور طرز عمل کا نام اسلام ہے اور یہی تمام انبیاء کا دین رہا ہے۔'' (تیسیر القرآن)

﴿وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا، اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾

اور دکھا ہم کو احکام حج (طریقہ بندگی) اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، بے شک تو ہی بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔

وَاَرِنَا (وَ. اَرِ. نَا) اور دکھلا ہمیں اس کا مادہ (رءی) ہے۔ رَاٰی، یَرٰی فعل لازم ہے یعنی خود دیکھنا (to see) اور اَرٰی یُرِیُ فعل متعدی ہے دوسروں کو دکھانا (to show) اور اس سے فعل امر اَرِ ہوا تو دکھلا صیغہ واحد مذکر، رُؤْیَتٌ (دیکھنا) رویت ہلال کمیٹی (نئے چاند کو دیکھنے والی مجلس) یہ لفظ اردو میں استعمال ہوتا ہے حقیقت میں لفظ رُؤْیَتٌ آنکھ کے ادراک کے علاوہ عقل وفکر کے ادراک کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے اس کا مفہوم عربی میں ''عَلِّمْنَا وَ عَرِّفْنَا'' یعنی ''ہمیں علم و معرفت عطا کر'' سے پورا ہوتا ہے مَنَاسِكَنَا (مَنَاسِکَ. نَا) احکام حج (آداب بندگی ہمارے) یعنی ہمیں احکام حج (احکام بندگی) سے آشنا فرما، نُسُک کے اصل معنی عبادت کے ہیں، النَّاسِک، عابد و زاہد کو کہتے ہیں، مَنَاسِک اس کا مفرد مَنْسِکٌ ہے اس کے معنی عبادت و طاعت کے ہیں، منَّاسِکُ کا لفظ بالخصوص ارکانِ حج کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

﴿وَتُبْ عَلَيْنَا، اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾

اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما، یقیناً تو بڑا توبہ قبول کرنے ولا اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

وَتُبْ عَلَيْنَا اور ہماری توبہ قبول فرما، تُبْ فعل امر صیغہ واحد مذکر حاضر (تَابَ، یَتُوْبُ، تَوْبَةً) اس فعل کے بعد اِلٰی آجائے تو اس کا معنی اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرنے کے ہوتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا (التحریم:۸) ''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے حضور سچے دل سے توبہ کیا کرو۔''

اور اگر اس فعل کے بعد عَلٰی آجائے تو توبہ قبول کرنے کے معنی پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا آیۂ مبارکہ میں ہے، التَّوَّابُ، الرَّحِيْمُ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے صفاتی نام ہیں، اور دونوں مبالغے کے صیغے ہیں یعنی بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور بہت زیادہ رحم کرنے والا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر لمحہ بندوں کی خطاؤں سے درگزر فرماتا ہے اور ان پر متواتر اور لگاتار رحم بھی فرماتا ہے، اس کا یہ اعلان ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا، اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (الزمر۳۹:۵۳) ''آپ لوگوں سے کہہ دیجیے اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، اللہ تو یقیناً سارے ہی گناہ معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ غفور اور رحیم ہے۔ (بخشنا اور رحم کرنا اس کی عادت ہے)''

کاش کہ بندے اس کی طرف رجوع کریں:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾

اے ہمارے رب! مبعوث فرما ان میں ایک رسول ان ہی میں سے۔

وَابْعَثْ، تو مبعوث فرما فعل امر صیغہ واحد مذکر (بَعَثَ، يَبْعَثُ، بَعْثًا) اٹھانا، بھیجنا فِيْهِمْ (فِیْ. هِمْ) ان میں یعنی اس امت مسلمہ میں سے یا اولاد اسماعیلؑ سے رَسُوْلًا مِّنْهُمْ، ایک رسول انہی میں سے، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے پیدا ہوئے۔

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ﴾ جو تلاوت کرے ان پر تیری آیات۔

يَتْلُوْا فعل مضارع واحد مذکر غائب (تَلَا، يَتْلُوْا، تِلَاوَةً) تلاوت کرنا، پڑھنا، عَلَيْهِمْ (عَلٰی. هِمْ) ان پر، اٰيٰتِكَ (آيَاتِ. كَ) آیات، تیری آیۃ کی جمع آیات، اس کا مطلب قرآن کی آیات اور اس

سے مراد انفس وآفاق کی آیات (نشانیاں) بھی ہیں، قرآن حکیم میں ایک گول دائرہ سے دوسرے گول دائرہ تک کی عبارت ایک آیت کہلاتی ہے، سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الناس تک کل آیات کی تعداد چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۶۶۶۶) ہے اور ہر آیت اس کی قدرت وحکمت کی نشانی ہے۔ (الاتقان فی علوم القرآن)

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلا کام اپنی امت کے سامنے تلاوت آیات ہے، یعنی اللہ کا کلام پہنچانا اور پڑھانا، گویا آپ کی پہلی حیثیت مبلغ اعظم کی ہے''۔ (درس قرآن، جلد اول)

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ انہیں کتاب کی تعلیم دے۔

یہاں اَلْكِتٰبَ سے مراد، القرآن ہے (عَلَّمَ، يُعَلِّمُ، تَعْلِيْمًا) تعلیم دینا، سکھلانا، سمجھانا، ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف تبلیغ اور پیام رسانی پر ختم نہیں ہو جاتا، آپ کا کام کتاب الٰہی کی تبلیغ کے بعد اس کی تعلیم کا بھی ہے، گویا آپ کی دوسری حیثیت معلم اعظم کی ہے۔'' (حوالہ: ایضاً)

﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ دانائی کی باتیں۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا کام حکمت ودانائی سکھانا، قرآنی احکام ومسائل سمجھانا، دین کے قاعدے اور آداب سکھانا اور زندگی کے گوناگوں اور پیچیدہ مسائل کا اسی کی روشنی میں بہترین حل بتانا ہے۔ گویا کہ آپ کی تیسری حیثیت مرشد اعظم کی ہے۔'' (حوالہ: ایضاً)

﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ اور انہیں پاک کردے۔

تزکیہ سے مراد دل کی صفائی ہے ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چوتھا کام اپنی صحبت وتربیت سے اخلاق کی پاکیزگی اور نیتوں کا اخلاص پیدا کرنا ہے یعنی آپ کی چوتھی حیثیت مصلح اعظم کی ہے۔'' (حوالہ: ایضاً)

''حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے جاتے تھے کہ اے ہمارے رب ہماری نسل سے اپنی ایک فرمانبردار امت پیدا کر، ان ہی میں سے ایک نبی مبعوث فرما، اس کی چار خصوصیات ہوں وہ کتاب اللہ سنائے، پڑھائے،

سمجھائے اور اس کے ذریعے سے دلوں کو پاک کرے یعنی وہ مبلغ بھی ہو، معلم بھی، حکیم و مرشد بھی ہو اور مصلح بھی۔ یہ تمام باتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پوری ہوئیں۔'' (حوالہ: ایضاً)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) مندرجہ بالا آیات مبارکہ میں سب سے اہم بات سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام کی بیت اللہ کی تعمیر کے وقت پُرخلوص دعا ہے جو کہ ہر مسلم اور مومن کے دل کی آواز ہے۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں: ''دعا کا نغمہ، دعا کا ترنم، دعا کی فضا سب کی سب سامنے موجود و حاضر ہیں! گویا وہ اس وقت زندہ و متحرک ہماری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہیں!..... یہ قرآن کے حسین و جمیل طرزِ ادا کی اہم خصوصیت ہے! وہ آنکھوں سے اوجھل گزرے ہوئے منظر کو اس طرح سامنے لے آتا ہے کہ آنکھوں کو نظر آتا، کانوں کو سنائی دیتا اور متحرک و محسوس معلوم ہوتا ہے، گویا زندگی اس سے پھوٹی پڑ رہی ہو، سچی ''فنی تصویر کشی'' کی یہ ایک خصوصیت ہے جو دائمی کتاب الٰہی کے شایانِ شان ہے۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

۲) دعا کے بین السطور کیا ہے؟ نبوت کا ادب، نبوت کا ایمان، کائنات میں عقیدے کی قیمت، نبوت کا شعور، قرآن اسی ادب، اسی ایمان اور اسی شعور کی تعلیم وارثین انبیا کو دیتا اور ان کے قلوب و احساسات کی گہرائیوں میں ان الفاظ کے ذریعے اتارنا چاہتا ہے۔

۳) اس دعا میں ''رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا، اِنَّکَ اَنْتَ السَمِیْعُ العَلِیْمُ اے ہمارے رب! ہماری طرف سے (ہمارے اس عمل کو) قبول فرما یقیناً تو (دعاؤں کا) سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ یہ قبولیت کی درخواست ہے، یہی عمل کی غایت ہے، عمل خالصۃً اللہ کے لیے ہے، اس عمل کے ذریعے خشوع و خضوع اور انابت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رخ کیا گیا ہے، اس عمل سے جس آخری مقصد کے حصول کی امید ہے وہ اللہ کی رضا اور قبولیت حق ہے اور قبولیت کی امید اس حقیقت سے وابستہ ہے کہ اللہ دعاؤں کا سننے والا اور عمل کے پیچھے جو نیت اور شعور ہے اسے جاننے والا ہے۔

۴) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ ..... اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْم یہ دعا اسلام کی طرف رہنمائی کے لیے اللہ کی مدد کی توقع ہے، یہ اس بات کا شعور ہے کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت

میں ہیں، یہ کہ ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے اور یہ کہ اللہ کی مدد کے بغیر نہ کوئی قوت کارآمد ہے اور نہ کوئی تدبیر، اللہ کے بندے اسی کی مدد اور اسی کے سہارے کامیاب و بامراد ہوتے ہیں۔

۵) ''وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ'' اس دعا سے واضح ہوتا ہے کہ قلبِ مومن کو کس بات کی فکر ہوتی ہے، یہ عقیدہ ہے جو اس پر چھایا رہتا ہے اور سب سے زیادہ اور سب سے پہلے مومن کو اسی کی فکر ہوتی ہے، سیدنا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو اللہ نے جو نعمت ..... ایمان کی نعمت عطا فرمائی تھی، اس کے شعور نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنی نسل کے لیے بھی اس نعمت کے حریص ہوں اور اپنے رب سے دعا کریں کہ وہ ان کی ذریت کو اس نعمت سے محروم نہ رکھے، جس کے برابر کوئی نعمت نہیں، ان بزرگوں نے اس سے قبل اپنے رب سے دعا کی تھی کہ وہ ان کی ذریت کو پیداوار (ثمرات) کا پاکیزہ رزق عطا فرمائے، اب انہوں نے فراموش کیے بغیر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ وہ ان کی نسل کو ایمان کی نعمت سے بھی نوازے، انہیں مناسکِ حج اور اپنی عبادت کے طریقے بتلائے اور سکھلائے اور ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں کے سلسلے میں ان کی توبہ قبول فرمائے کیونکہ وہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، بہت مہربان ہے۔

۶) ''رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا ..... اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' سیدنا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی دعا کی قبولیت ہی کا ثمرہ تھا کہ صدیوں بعد ان دونوں کی نسل سے خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی جو انہیں اللہ کی آیات سناتے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں۔

۷) تلاوت آیات، ان آیات کا ٹھوس اور مضبوط علم، احکام کی حکمت و بصیرت اور اس کی روشنی میں زندگی کو طہارت اور پاکیزگی سے آراستہ کرنا، یہ وہ بلند مقاصد حیات ہیں جن کی طرف رب العالمین کی عظیم کتاب نے ہماری رہنمائی کی ہے ہمارے مکاتب و مدارس، سکولوں اور یونیورسٹیوں میں طلبا کی تعلیم و تربیت میں یہی ہدف پیش نظر رہنا چاہیے، افسوس کہ مسلمانوں نے قرآن حکیم کی پاکیزہ اور بلند تعلیمات کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ذلت و خواری کا شکار ہو رہے ہیں۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ، وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا، وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۳۰)	اور ابراہیمؑ کے دین سے کون منہ موڑ سکتا ہے بجز اس شخص کے جو حماقت کا شکار ہو، بلاشبہ ہم نے انہیں دنیا میں (امام رشد و ہدایت) منتخب کیا اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین کے زمرے میں ہوں گے۔

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ﴾

اور ابراہیمؑ کے دین سے کون منہ موڑ سکتا ہے بجز اس شخص کے جو حماقت کا شکار ہو۔

وَمَنْ، اور کون ہے جو، مَنْ استفہام انکاری ہے، يَّرْغَبُ (رَغِبَ، يَرْغَبُ، رَغْبَةً) اس کے بعد اگر اِلٰی یا فِیْ کا استعمال ہو تو اس کے معنی کسی چیز کی خواہش اور آرزو ہوتی ہے مثلاً اَرْغَبُ فِی التَّعْلِیْمِ، میں تعلیم میں شوق اور رغبت رکھتا ہوں اور اگر اس کے بعد عَنْ کا استعمال ہو تو پھر اس سے مراد بے رغبتی اور اعراض ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ بالا آیہ مبارکہ میں ہے یا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ [صحیح بخاری، صحیح مسلم] ''جس نے میری سنت سے منہ موڑا، وہ مجھ سے نہیں ہے۔''

مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ، ابراہیمؑ کی ملت (ملت سے یہاں مراد دین ہے) دین اور ملت میں فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت نبی کی طرف ہوتی ہے جیسا کہ ملت ابراہیم، جبکہ دین کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے۔ جیسا کہ سورۂ نصر میں آیا ہے: وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (۲) ''اور آپ نے (فتح مکہ پر) دیکھا کہ لوگ گروہ در گروہ اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں''۔

جب کوئی نبی احکامِ الٰہی کو اپنے متبعین میں جاری و ساری کر دیتا ہے تو وہ نظام ''ملت'' کہلاتا ہے گویا ملت کی اصل دین ہی ہوتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ، هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا (الحج ۲۲:۷۸) ''یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے، اللہ نے اس سے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (مسلم ہی رکھا ہے)۔''

اور دین تو ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (ال عمران:۱۹) ''دین تو اللہ

کے نزدیک (ہمیشہ) اسلام ہی رہا ہے"۔ اس آیہ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ یہودیت یا نصرانیت، ہندومت یا بدھ مت وغیرہ یہ خودساختہ نام ہیں، اللہ تعالیٰ نے زندگی گزارنے کا انسانوں کو جو نظام دیا ہے، وہ شروع دن سے یعنی سیدنا آدم علیہ السلام سے ایک ہی ہے اور وہ "اسلام" ہے اور خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس دین کو ہر طرح سے مکمل کر دیا گیا، ارشاد ہوتا ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ۵:۳) "آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے بحیثیت دین، اسلام کو پسند کیا" تو اس پاکیزہ، پسندیدہ، صاف ستھرے اور شفاف دستورِ زندگی سے بھلا کون منہ موڑ سکتا ہے؟ ﴿اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ﴾ سوائے اس کے جس نے اپنے آپ کو احمق بنا لیا ہو، اِلَّا کلمہ استثناء ہے مَنْ، موصول ہے (جو، جس نے) (سَفِهَ، يَسْفَهُ سَفْهًا) ہلکا کرنا، ردی اور ناقص ثابت کرنا، بیوقوف بنا لینا۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

"ملت ابراہیمیؑ سے روگردانی صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس میں ذرا عقل نہ ہو، کیونکہ یہ ملت عین دین فطرت ہے، کوئی سلیم الفطرۃ انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا۔" (معارف القرآن، جلد اول)

﴿وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے چن لیا ان کو دنیا میں۔

ل اور قَدْ، تحقیق اور زور کلام کے لیے آتے ہیں اِصْطَفَيْنٰهُ ہم نے چن لیا، ماضی جمع متکلم، رب العزت کے لیے جمع کا صیغہ بطور عزت و تکریم آتا ہے (اِصْطَفٰى، يَصْطَفِيْ، اِصْطِفَاءً) چن لینا، منتخب کرنا، اس کا مادہ صَفَوٌ ہے، فِي الدُّنْيَا دنیا میں، یعنی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ان کی بے پناہ قربانیوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انہیں (امام رشد و ہدایت) بنایا "اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" "بے شک میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں"۔

﴿وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾

اور بے شک وہ آخرت میں صالحین کے زمرے میں ہوں گے۔

اِنَّهٗ کی ضمیر کا مرجع سیدنا ابراہیمؑ ہیں، لَمِنَ (لَ. مِنْ) ضرور بضرور سے، لام تاکید کے لیے ہے،

صالحین کا مفرد صالح ہے، یعنی آخرت میں ضرور بضرور صالحین (نیک لوگوں میں) ان کا شمار ہوگا۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) سلامت روی اور حماقت کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے ایسے ہی جیسے جہالت اور دانشمندی کا کبھی جوڑ نہیں ہو سکتا یا روشنی اور اندھیرا ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتے۔ ٹھیک اسی طرح اسلام تو سلامتی کا راستہ ہے اس کا انکار وہی کرتا ہے جو جہالت وحماقت کے پھندے میں گرفتار ہو۔

۲) اللہ تعالیٰ کا دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے مگر افسوس کہ خواہشات اور غرورِ نفس نے انسانوں کو راہ حق سے دور لے جا پھینکا اور وہ مختلف فرقوں اور گروہ بندیوں کا شکار ہو گئے اور شیطان نے ان کے درمیان نفرت وعداوت کے بیج بو دیے اور ان کے درمیان جنگ وجدل اور فتنہ وفساد کی چنگاریاں سلگنے لگیں۔

۳) اللہ کے دین کو 'الاسلام' کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں یعنی ہر طرح کی نسبتوں اور گروہ بندیوں سے الگ تھلگ ہو کر صرف اطاعت حق کی طرف بنی نوع انسان کو دعوت دی جائے، اسی میں ان کے لیے دنیا وآخرت کی صلاح وفلاح ہے۔

۴) مسلمانوں کی ذلت وخواری کا سبب یہ ہے کہ وہ یہود ونصاریٰ کی طرح فرقہ بندیوں کا شکار ہو چکے ہیں اور بنی اسرائیل کے علماء کی مانند مختلف ٹولیوں اور جماعتوں میں بٹ چکے ہیں۔ جو سراسر دین کی پاکیزہ تعلیمات کے منافی ہے، پاکستان میں نظام اسلام نہ آنے کی یہی سب سے بڑی وجہ ہے۔

۵) اگر ہم دنیا میں عزت چاہتے ہیں اور آخرت میں صالحین کے گروہ میں آنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ سیدنا ابراہیمؑ کی طرح مسلم بن کر رہیں۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ، قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۳۱) وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ، يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۳۲)	''اور جب ان کے رب نے انہیں کہا کہ (میرے حضور) سر اطاعت خم کر دو، تو انہوں نے (ابراہیمؑ نے) کہا میں رب العالمین کے حضور سر اطاعت خم کرتا ہوں اور یہی نہیں بلکہ ابراہیمؑ اور یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو اسی کی وصیت کی کہ ''اے میرے بیٹو! اللہ نے اسی دین کو تمہارے لیے پسند فرمایا ہے اور (یاد رکھو!) تمہیں اسلام ہی پر (جینا) مرنا ہے''

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ﴾

اور جب کہا اسے اس کے رب نے کہ تو اپنے آپ کو میرے سپرد کر دے۔

اِذْ جب (وہ وقت یاد کرو) قَالَ، کہا (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، لَهٗ اسے (لَ.هٗ) واسطے اس کے هٗ کی ضمیر سیدنا ابراہیمؑ کی طرف جاتی ہے، رَبُّهٗ (ربّ.ہ) اس کے رب نے۔ یہاں بھی هٗ کی ضمیر سیدنا ابراہیمؑ کی طرف جاتی ہے، اَسْلِمْ اپنے آپ کو سپرد کرو (اَسْلَمَ، يُسْلِمُ، اِسْلَامًا) اسلام کے معنی سپرد کرنا، حوالے کرنا، فرمانبردار بننا، مطیع ہونا، یعنی اپنے آپ کو اپنے رب کے سپرد کر دو۔

﴿قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

(ابراہیم نے) کہا میں رب العالمین کے حضور سر اطاعت خم کرتا ہوں۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''یعنی جب فرمایا ابراہیمؑ سے ان کے رب نے کہ اطاعت اختیار کرو تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی، رب العالمین کی'' اس طرز بیان میں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ اللہ جل شانہ کے خطاب اَسْلِمْ کا جواب بظاہر خطاب ہی کے انداز میں ہونا چاہیے کہ اَسْلَمْتُ لَکَ یعنی میں نے آپ کی اطاعت اختیار کر لی، مگر حضرت خلیل علیہ السلام نے اس طرزِ خطاب کو چھوڑ کر یوں عرض کیا کہ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ

الْعَالَمِیْنَ یعنی میں نے پروردگار عالم کی اطاعت اختیار کر لی، ایک تو اس میں رعایت ادب کے ساتھ، حَقّ جَلّ شانہٗ کی حمد وثنا شامل ہوگئی جس کا مقام تھا، دوسرے اس کا اظہار ہوگیا کہ میں نے جو اطاعت اختیار کی وہ کسی پر احسان نہیں کیا بلکہ میرے لیے اس کا کرنا ہی ناگزیر تھا کیونکہ وہ رب العالمین سارے جہان کا پروردگار ہے سارے جہان اور جہان والوں کو اس کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، جس نے اطاعت اختیار کی اس نے اپنا فرض ادا کر کے اپنا نفع حاصل کیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ملت ابراہیمی کا بنیادی اصول اور پوری حقیقت ایک لفظ اسلام میں مضمر ہے جس کے معنی ہیں اطاعت حق اور یہی خلاصہ ہے ابراہیم علیہ السلام کے مذہب ومسلک کا اور یہی حاصل ہے ان امتحانات کا جن سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا یہ خلیل اپنے مقام عالی تک پہنچا ہے اور اسلام یعنی اطاعت حق ہی وہ چیز ہے جس کے لیے یہ سارا جہاں بنایا گیا ہے اور جس کے لیے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، آسمانی کتابیں نازل کی گئیں، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسلام ہی تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترک دین اور نقطہ وحدت ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر آنے والے رسول اور نبی نے اسی کی طرف دعوت دی، اسی پر اپنی اپنی امت کو چلایا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں فرمایا:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ، ''دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔'' نیز فرمایا: وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (ال عمران: ۸۵) اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین و مذہب اختیار کرے وہ مقبول نہیں اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ خصوصی امتیاز حضرت ابراہیمؑ ہی کی تجویز (اور دعا) کے مطابق امت محمدیہ (عَلٰی صاحبها الصّلوٰة والسلام) کو حاصل ہوا کہ اس کا نام امت مسلمہ رکھا گیا اور اس کی ملت بھی ملت اسلامیہ کے نام سے معروف ہوئی قرآن کریم کا ارشاد ہے: مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهٖمَ، هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ، مِنْ قَبْلُ وَ فِیْ هٰذَا ''تم اپنے باپ ابراہیمؑ کے دین پر قائم رہو، اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے، پہلے بھی (یہی نام تھا) اور اس (قرآن) میں بھی (یہی نام ہے)۔''

﴿وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ﴾

اور وصیت کی ساتھ اس کے ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوبؑ نے بھی۔

وَصّٰی اس نے وصیت کی (وَصّٰی، یُوَصِّیُ، تَوْصِیَۃً) باب تفعیل وصیت کرنا، اس باب کی خاصیت میں مبالغہ بھی ہے یعنی سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا یعقوبؑ اپنے بچوں کو اسلام پر قائم ودائم رہنے کی مسلسل اور متواتر وصیت کرتے رہے۔

﴿یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ﴾

اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے چن لیا ہے تمہارے لیے دین (اسلام) کو۔

یٰبَنِیَّ، یآ کلمہ ندا، (یعنی جس سے کسی کو مخاطب کیا جائے، پکارا جائے) بَنِیَّ، منادیٰ (وہ شخص جس کو خطاب کیا جائے) اِصْطَفٰی اس نے چن لیا، (اِصْطَفٰی، یَصْطَفِیُ، اِصْطِفَاء) چن لینا، منتخب کر لینا لَكُمُ تمہارے لیے الدِّیْنَ، دین (اسلام)۔

﴿فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ پس نہ مرنا تم مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

(ف. لا) پس، نہ، لَا نہی کا ہے، تَمُوْتُنَّ مرنا تم، فعل مضارع بنون ثقیلہ اس میں ''ن'' تشدید کے ساتھ زور بیان اور تاکید کے لیے ہے یعنی تمہیں ہرگز ہرگز موت نہ آئے اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''یہ (دین) اللہ کا انتخاب ہے، اس کے بعد ان کے لیے کسی انتخاب کی گنجائش ہے اور نہ کسی اور طرف رخ کرنے کی، اللہ کے بخشے ہوئے اس شرف اور اس خصوصی فضل وکرم کا، سب سے کم درجے کا حق یہ ہے کہ اس دین کے ان کے لیے منتخب کیے جانے پر وہ اللہ کا شکر ادا کریں، اس دین کے حریص اور شائق رہیں اور اس بات کی پوری کوشش کریں کہ وہ اس دنیا سے نہ جائیں مگر اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ امانت ان میں پوری طرح محفوظ ہو، اور اب ایک سنہری موقع سامنے ہے، ان کے پاس وہ رسول آیا (خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جو انہیں اسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے اور وہ اس دعا کا ثمرہ ہے جو ان کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اللہ تعالیٰ کی طرف سے زندگی گزارنے کے لیے جو ہدایات دی گئیں اس دستورِ حیات کا نام ''الاسلام'' ہے حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء ورسل نے اسی دین کی دعوت وتبلیغ کی، اہل خانہ اور برادری کو بلایا، اور اسی دعوتِ حق کو لوگوں میں پھیلایا اور اسی پر جینے اور مرنے کی تمنا اور آرزو کی، اور یہی ہر مومن کی خواہش ہونی چاہیے:

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرضِ، اَنْتَ وَلِیّ فِی الدُّنیَا وَالاٰخِرَۃِ، تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (یوسف:۱۰۱) ''اے آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے! دنیا وآخرت میں تو ہی میرا کارسازِ مطلق ہے، میری موت ایک سچے مسلمان کی موت ہو اور مجھے زمرۂ صالحین میں شامل فرمادے''۔

۲) خواہشات نفسانی اور شیاطین کے مکروفریب سے لوگ مختلف ٹولیوں اور فرقہ بندیوں کا شکار ہوئے، قرآن حکیم نے واشگاف الفاظ میں بتلایا ہے کہ تمام نسل انسانی ایک ہے اور تمام کا خالق بھی ایک ہے اس لیے انہیں اسی کا فرمانبردار اور عبادت گزار ہوجانا چاہیے۔

اِنَّ ھٰذِہٖ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء:۹۲) ''(اے انسانو!) یہ تمہاری امت ہے، جو حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں، پس تم میری عبادت کرو''۔

۳) جب اسلام نسل انسانی کا ہمدرد اور خیرخواہ ہے اور سب کو جوڑنا چاہتا ہے تو اگر مسلمان آپس کی فرقہ بندیوں اور گروہ بندیوں کا شکار ہوجائیں تو کتنے افسوس اور صدمے کی بات ہے۔

۴) مسلمان تو نسل انسانی کے لیے روشنی اور ہدایت کا سامان ہیں۔ ان کے آپس کے فساد اور انتشار سے نہ صرف اپنوں کو بلکہ غیروں کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے، کاش کہ وہ قرآن کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ، اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ م بَعْدِىْ، قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۳) تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ، وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۳۴)	''(اے یہود! یہ جو کہتے ہو کہ یعقوبؑ کی وصیت یہودیت کے متعلق تھی) کیا تم یعقوبؑ کے انتقال کے وقت موجود تھے؟ جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے تو انہوں نے جواب دیا ہم اسی ایک معبود (برحق) کی عبادت کریں گے جو آپ کا اور آپ کے آباء و اجداد..... ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کا معبود ہے اور وہ معبود یکتا ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے۔ یہ جماعت گزر چکی، ان کو ان کے اعمال کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے اعمال کا اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پرسش تم سے نہیں ہوگی۔''

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ﴾

کیا تم حاضر تھے جب آیا یعقوبؑ کو موت (کا وقت)۔

اَمْ، حرف عطف یہاں پر بہ معنی (یا) استعمال ہوا ہے كُنْتُمْ شُهَدَآءَ تھے تم حاضر، شاہد (حاضر) مفرد اور اس کی جمع شُهَدَاءَ ہے، یہ خطاب بنی اسرائیل (اولادِ یعقوبؑ) سے ہے اِذْ جب، وقت کو ظاہر کرتا ہے حَضَرَ (حاضر ہوا، آیا) يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ یعقوبؑ کو موت کا (وقت)۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں: ''حَضَرَ الْمَوْتُ'' یعنی وقت موعود قریب آ گیا اور آپ کو علامات و آثار اس کے محسوس ہونے لگے، یہ مراد نہیں کہ خود موت ہی آپ پر طاری ہوگئی۔ ''اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ'' خطاب اہل کتاب سے ہے اور استفہام میں لہجۂ زجر (تنبیہ) شامل ہے یعنی تم جو واہیات خرافات حضرت یعقوبؑ کی جانب منسوب کر رہے ہو تو تمہارا اس وقت وجود ہی کہاں تھا؟ صحیح واقعات وہ ہیں جو قرآن بیان کر رہا ہے۔''

''سیدنا یعقوبؑ حضرت ابراہیمؑ خلیل کے پوتے اور حضرت اسحاقؑ نبی کے صاحبزادے تھے اور نبی زادہ

ہونے کے علاوہ خود بھی نبی تھے، اسرائیل آپ ہی کا دوسرا نام ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ﴾

جب اس نے کہا اپنے بیٹوں سے کہ کس کی تم عبادت کرو گے میرے بعد۔

اِذْ، وقت کو ظاہر کرتا ہے، قَالَ کہا (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہا مَا تَعْبُدُوْنَ، کس کی عبادت کرو گے؟ (عَبَدَ، یَعْبُدُ، عِبَادَةٌ) عبادت کرنا، بندگی کرنا مِنْۢ بَعْدِیْ، میرے بعد یعنی میری وفات کے بعد، حضرات انبیاء کرام کو زندگی کی طرح اپنے آخر وقت میں بھی سب سے مقدم فکر دین ہی کی ہوتی ہے۔

﴿قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمَاعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾

انہوں نے کہا، ہم عبادت کریں گے تیرے معبود کی اور تیرے آباؤ اجداد کے معبود کی یعنی ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی، جو معبود یکتا ہے۔ اور ہم سب اسی کے لیے اطاعت گزار ہیں۔

﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ﴾ وہ ایک امت (جماعت) تھی جو گزر چکی۔

تِلْكَ، اسم اشارہ بعید، یہ امت کے لیے استعمال ہوا ہے، قَدْ زور کلام کے لیے استعمال ہوتا ہے، یقیناً بلاشبہ، (خَلَا، یَخْلُوْ، خُلُوٌّ) گزرنا، اُمَّةٌ کے لیے خَلَتْ کا صیغہ واحد مؤنث غائب استعمال ہوا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''اور ان کے فضائل و کمالات بھی ان کے ساتھ گزر چکے، تمہیں آخر ان کے نام گنانے سے کیا حاصل؟ تِلْكَ اُمَّةٌ سے مراد یہی اجدادِ یہود ہیں جن کا شمار جماعتِ انبیاء میں ہے، خطاب یہاں یہود سے ہے جو آبائی مفاخرت، نسلی عظمت پیغمبر زادگی کے نشہ میں چور تھے، اس میں بڑا سبق آج کل کے پیرزادوں، رسمی مشائخ زادوں اور بہت سے بدعتی فرقوں کے لیے موجود ہے، بلا سعی و عمل محض بزرگوں کی نسبت سے فائدہ اٹھانے کی جڑ ہی اسلام نے کاٹ دی ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْ يَعْمَلُوْنَ ﴾

اس (جماعت) کے لیے وہی ہے جو اس نے کمایا اور تمہارے لیے وہ ہے جو تم کماؤ گے اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے۔

(كَسَبَ، يَكْسِبُ، كَسْبًا) کمانا، (روزی کا، یا اعمال کا)، ان کے اچھے برے اعمال کا نفع و نقصان انہیں ہوگا اور تمہارے اچھے برے اعمال کا نفع ونقصان تمھیں ہوگا اور نہ تم سے سوال کیا جائے گا اس بات کا جو وہ عمل کرتے تھے یعنی وہ اپنے اعمال کے لیے اور تم اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہوگے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اسلام ہی وہ پاکیزہ دستور حیات ہے جو سب سے بڑی دولت اور سب سے بڑا سرمایہ (Assets) ہے اور اس کی ہر طرح سے حفاظت ہی دنیا وآخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے۔

۲) اسوہ انبیاء علیہم السلام کی روشنی میں مسلمان والدین اپنی اولاد کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر زندہ رہنے اور اسی حال میں مرنے کی وصیت کرتے رہیں۔

۳) انبیاء علیہم السلام کی وصیت سے اس چیز کا پتہ چلتا ہے کہ ان کی ساری زندگی کس مقصد کے حصول میں گزری..... وہ آخری اوقات میں اولاد کو مال و دولت سپرد نہیں کرتے، کوٹھیوں اور کاروں کے متعلق ہدایات نہیں دیتے، کھیتوں اور کھلیانوں کی حفاظت کی تاکید نہیں فرماتے، کوئی چیز انہیں بے چین اور بے قرار رکھتی ہے تو وہ اولاد کی روحانی تربیت ہے، اخلاقی ہدایات ہیں اور ابدی وسرمدی کامیابی کی رہنمائی ہے..... وہ ایمان کی دولت اور اسلام کی راہ ہے اور یہی لازوال سرمایۂ حیات ہے۔

۴) وہ والدین جو اپنے بچوں کے لیے مال و دولت کے انبار تو جمع کر جاتے ہیں مگر ان کی روحانی تربیت سے غافل رہتے ہیں..... وہ اولاد پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ درحقیقت ان پر ظلم کرتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ صالح اور سعادتمند اولاد بجائے خود ایک جائیداد ہے اور بدکردار اولاد کے پاس اگر قارون کے خزانے بھی ہوں تو بھی وہ نیک والدین کی جائز وارث ثابت نہیں ہوتی۔

۵) سیدنا یعقوبؑ کی اولاد نے اسلام پر ثابت قدمی کے اظہار اور عزم سے انہیں سکون وطمانیت سے سرشار کیا اور اولاد کی بھی خوش قسمتی تھی کہ انہیں نیک والد کی حیات افزا نصیحت ہاتھ آئی اور یہی اچھے

والدین کی خواہش ہونی چاہیے۔

۶) زندگی مال و دولت کے انبار نہیں بلکہ نیک اعمال سے بنتی ہے اور ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے کوئی دوسرا شخص نہیں اور یہ وراثت صرف عمل سے منتقل ہوتی ہے ورنہ ؎

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو!

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا، قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا، وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۳۵) قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ، لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ، وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۶)	''یہودیوں نے کہا، یہودی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔ نصاریٰ نے کہا نصرانی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔آپ کہیے صحیح راہ پر تو ملت ابراہیمی والے ہیں اور ابراہیم خالص اللہ کے عبادت گزار تھے اور ہرگز مشرک نہ تھے، مسلمانو! تم کہو ''ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو ہم پر اتارا گیا (یعنی قرآن حکیم) اور اس پر بھی جو حضرت ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر اتارا گیا تھا اور اس وحی و ہدایت پر بھی جو موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی، ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (رب کائنات) کے فرمانبردار ہیں۔''

﴿وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا﴾

اورانہوں نے کہا، ہوجاؤ یہودی یا نصرانی، ہدایت پاجاؤ گے۔

(قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلاً) کہنا، بات چیت کرنا (کَانَ، یَکُوْنُ، کَوْنًا) ہونا، ھُوْدًا، یہودی، اَوْ، یا نٰصٰری، نصرانی عیسائی، تَھْتَدُوْا (اِھْتَدٰی، یَھْتَدِی، اِھْتِدَاءً) ہدایت پانا، راہ راست پر آنا، تَھْتَدُوْا فعل مضارع جمع مذکر مخاطب۔

یہود و نصاریٰ خود ساختہ نام ہیں، انہیں بھی مسلمان رہنے اور دین اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی، انہوں نے دین حنیف کو چھوڑا تو ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے، جس کی قرآن شہادت دیتا ہے اور اس کا ذکر اسی سورت کی آیت ۱۱۳ میں آچکا ہے۔

﴿قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰھٖمَ حَنِیْفًا وَّمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ﴾

کہہ دیجیے بلکہ ملت ابراہیم ہی کھری اور سچی راہ ہے اور سیدنا ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''ایک یہ کہ یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں 'یہودیت' اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی اور ''عیسائیت'' جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے وہ تو حضرت مسیحؑ کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسر ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے تو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء اور نیک لوگ، جو ان مذہبوں کی پیدائش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو خود یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ ''یہودیت'' اور ''عیسائیت'' نہ تھی، لہٰذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار، ان مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں بلکہ دراصل اس کا مدار اس عالمگیر صراط مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ خود یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے اور ان کا مشن ہی یہ تھا کہ خدائی

صفات وخصوصیات میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، لہٰذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اس راہ راست سے منحرف ہوگئی ہیں جس پر حضرت ابراہیمؑ چلتے تھے کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہوگئی ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾

کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو نازل کیا گیا ہماری طرف۔

(قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا اس سے فعل امر قُلْ (واحد مذکر) اور قُوْلُوْا (جمع مذکر) تم سب کہو، اٰمَنَّا، ہم ایمان لائے (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا) ایمان لانا، وَمَآ اُنْزِلَ اور جو نازل کیا گیا (اَنْزَلَ، يُنْزِلُ، اِنْزَالًا) نازل کرنا اور اُنْزِلَ ماضی مجہول واحد مذکر غائب، نازل کیا گیا، اِلَيْنَا (اِلٰى. نَا) طرف۔ ہماری یعنی قرآن حکیم، یہ خطاب مسلمانوں سے ہے کہ وہ اس بات کا برملا اقرار کریں کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کتاب پر جو اس نے خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے ایمان رکھتے ہیں۔

﴿وَمَا اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ﴾

اور جو نازل کیا گیا ابراہیمؑ کی طرف اور اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد کی طرف۔

اَلْاَسْبَاطِ، اس کا مفرد سِبط ہے۔ اس سے مراد پوتے اور نواسے ہیں، یعنی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے اللہ تعالیٰ نے جن جن کو نبوت سے نوازا خواہ ان کا تعلق کسی بھی ملک اور علاقے سے ہو، ہمارے لیے واجب الاحترام ہیں اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سچے اور موحد رسول تھے اور جو کتابیں اور صحیفے ان پر نازل ہوئے وہ بھی حق اور درست تھے۔

﴿وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَا اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾

اور جو دیا گیا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اور جو عطا ہوا انبیاء کرام کو ان کے رب کی طرف سے۔

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ، وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾

ہم تفریق نہیں کرتے ان میں سے کسی کے درمیان اور ہم اسی (پروردگار عالم) کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔

لَا کلمۂ نفی نُفَرِّقُ ہم تفریق کرتے ہیں (فَرَّقَ، یُفَرِّقُ، تَفْرِیْقًا) فرق پیدا کرنا، بَیْنَ اَحَدٍ، کسی کے درمیان وَنَحْنُ اور ہم سب (امت محمدیؐ کے مسلمان) لَهٗ اس کے لیے عین رب کائنات کے لیے مُسْلِمُوْنَ، مطیع اور فرمانبردار ہیں، مسلم کے معنی ہی احکام الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا کے ہیں۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''تمام نبوتوں اور تمام رسولوں کے درمیان یہ وحدت کبریٰ، فکر اسلامی کا بنیادی اصول ہے اسی اصول کے تحت امت مسلمہ زمین میں اللہ کے دین پر قائم عقیدے کے ترکے کی وارث بنتی ہے کیونکہ وہ اس قدیم اور گہرے اصول کے ساتھ مربوط ہے اور ہدایت اور نور کے ساتھ زندگی کی راہوں میں رواں دواں ہوتی ہے، اسی اصول کے نتیجہ میں اسلامی نظام، عالمی نظام بنتا ہے جس کے سائے میں سب لوگ کسی تعصب اور زیادتی کے بغیر زندگی بسر کرتے ہیں اور اسی اصول کی برکت ہے کہ اسلامی سماج کا دروازہ سلامتی اور محبت کے ساتھ سب انسانوں کے لیے کھلا رہتا ہے۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) آخرت میں فوز وفلاح کے لیے محض حسب ونسب، دولت وامارت یہاں تک کہ انبیاء کرام سے انتساب بھی بے معنی ولاحاصل ہے اور یہود ونصاریٰ اسی زعم باطل میں مبتلا تھے۔

۲) کامیابی کے لیے ایمان اور عملِ صالح شرط ہے اور انبیاء کرام کی دعوت توحید ہمیشہ یکساں رہی ہے اور ان سب کا دین بھی دین فطرت (اسلام) ہی رہا ہے۔

۳) نجات، یہودیت وعیسائیت کے محدود دائروں میں نہیں بلکہ توحید واسلام کے وسیع حلقہ میں ہے۔

۴) قرآن حکیم نے مسلمانوں کو فرقہ بندیوں سے ڈرایا ہے، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ، اِنَّمَا اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (الانعام:۱۵۹) ''جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور کئی فرقوں میں بٹ گئے ان سے آپ کو کچھ سروکار نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے کہ وہ کن کاموں میں

مصروف تھے۔'' یہ آیہ مبارکہ عام ہے تاہم بعض مفسرین نے اس سے یہود و نصاریٰ مراد لیے ہیں، قابل غور بات یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی گروہ بندیاں اللہ تعالیٰ کو پسند نہ تھیں تو کیا مسلمانوں کی دھڑے بندیاں پسند ہوں گی، فاعتبروا یا اولی الابصار!

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا، وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ، فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۱۳۷) صِبْغَةَ اللّٰهِ، وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً، وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (۱۳۸) قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ، وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ، وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ (۱۳۹)	سو اگر یہ (اہل کتاب) اسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم لائے ہو تو وہ بھی ہدایت پالیں گے اور اگر اس سے منہ پھیریں تو ظاہر ہے کہ وہ مخالفت میں پڑ گئے ہیں، (لہٰذا اطمینان رکھو کہ) ان کے مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لیے کافی ہے، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، ہم نے اللہ کا رنگ (قبول کیا) اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہوسکتا ہے، ہم تو اسی کی عبادت کرتے ہیں، (اے نبیؐ) ان سے کہیے، کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ جبکہ وہی ہمارا اور تمہارا رب ہے، ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، اور ہم اللہ ہی کے لیے اپنی بندگی خالص کر چکے ہیں۔''

﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾

پس اگر وہ ایمان لائیں مانند اس کے جیسا کہ ایمان لائے تم ساتھ اس (کلمہ طیبہ) کے، تو انہوں نے بھی ہدایت پالی۔

فَاِنْ پس اگر اِنْ شرطیہ ہے (اٰمَنَ، یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا) ایمان لانا بِمِثْلِ (اس جیسا) مَآ (جو، جس طرح) اٰمَنْتُمْ، صیغہ جمع مذکر مخاطب، تم ایمان لائے ہو فَقَدِ اهْتَدَوْا، تو وہ ہدایت پا گئے (اِهْتَدٰی، یَهْتَدِیْ اِهْتِدَاءً) ہدایت پانا، بابِ افتعال ہے۔

﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ﴾

اور اگر وہ پھر جائیں تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مخالفت میں پڑے ہیں۔

وَاِنْ، شرطیہ ہے تَوَلَّوْا، وہ پھر جائیں، فعل ماضی جمع مذکر غائب (تَوَلّٰی، یَتَوَلّٰی، تَوَلِّیٌ) رخ پھیرنا، منہ موڑنا، فَاِنَّمَا پس بے شک، هُمْ وہ سب، فِیْ شِقَاقٍ مخالفت میں، ضد اور ہٹ دھرمی میں۔

﴿فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾

ان کے مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لیے کافی ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

(فَ.سَ. یَكْفِیْ. كَ. هُمُ) پس، عنقریب، کافی ہوگا، آپ کے لیے ان کو۔ (اطمینان رکھو) کہ ان کے مقابلے میں اللہ تمہاری حمایت کے لیے کافی ہے، وَهُوَ، اور وہ ہے السَّمِیْعُ، ہر وقت، ہر بات کا سننے والا الْعَلِیْمُ، ہر وقت ہر بات کو جاننے والا۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''قرآن مجید نے اپنی صداقت اور اپنے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت دے کر اہل کتاب کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، ان کے باطل عقیدوں کی تردید کی، غلط آرزوؤں کو بیہودہ قرار دیا اور انہی کے دلائل سے ثابت کر دیا کہ جس ابراہیمی دین پر قائم ہونے کا وہ دعویٰ کرتے ہیں، اس کی اصل شکل ان کے پاس باقی نہیں رہی، اب اس قدیم دین کی اصل شکل قرآن مجید پیش کر رہا ہے، اس لیے انہیں بہر صورت اسلام قبول کر کے دین و دنیا کی فلاح حاصل کرنی چاہیے۔

وعظ و نصیحت کی یہ تمام باتیں سن کر بھی یہود و نصاریٰ اپنی ضد اور ہٹ پر قائم رہے، بلکہ خود اسلام قبول کرنے کے بجائے الٹا مسلمانوں کو دعوت دیتے رہے کہ وہ یہودیت اور عیسائیت اختیار کر لیں اس سے زیادہ ڈھٹائی، تعصب اور خود غرضی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے ہمارا پیغام پہنچا کر اپنا فرض پورا کر دیا، اب اگر یہ لوگ اپنا بھلا چاہتے ہیں، تو اسلام قبول کر لیں، کامیاب ہو جائیں گے، ہم ان کے پچھلے گناہ معاف فرما دیں گے، لیکن اگر یہ سب کچھ کہنے سننے کے بعد بھی اس سے منہ پھیریں تو پھر یہ ان کی سخت دلی اور ہٹ دھرمی ہے اور کچھ نہیں، اے پیغمبر ان لوگوں کی اس ضد اور دشمنی و تعصب کا آپ کچھ فکر نہ کریں، ان سے نبٹنے کے لیے آپ کی طرف سے ہم کافی ہیں، ہم یقیناً ان سب کی باتیں سنتے ہیں اور ان کے دلوں کے احوال اور ظاہر و باطن سب جانتے ہیں، آیت کے آخری حصہ میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور کی امت کو کس قدر اعلیٰ بشارت ہے کہ تمہارے لیے اللہ کافی ہے بھلا اللہ جس کا ہو جائے اسے اور کس کی ضرورت رہ جاتی ہے، وہ مولا کریم جس کا دستگیر ہو جائے، اسے کسی اور کا سہارا درکار نہیں۔''

(درس قرآن، جلد اول)

﴿صِبۡغَةَ اللّٰهِ، وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً، وَّ نَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ﴾

رنگ اللہ کا اور اللہ کے رنگ سے حسین تر کس کا رنگ ہے؟ ہم تو اسی کی عبادت کرتے ہیں۔

صِبۡغَةَ اللّٰهِ، اللہ کا رنگ، مراد دین اسلام ہے، وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً، اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہو سکتا ہے، یعنی دین اسلام سے بہتر اور کونسا مذہب ہو سکتا ہے؟ وَّ نَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ اور ہم سب اسی کے عبادت گزار ہیں عَابِدٌ، مفرد اور جمع عَابِدُوْن۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''صِبۡغَةَ اللّٰهِ، اللہ کا رنگ مراد ہے، ''اللہ کا دین'' محاورہ کے اعتبار سے یہاں ایک لفظ محذوف ہے یعنی قَبِلۡنَا (ہم نے قبول کیا) اس طرح پورے جملہ کا معنی یوں ہوں گے، ہم نے اللہ کا رنگ یعنی اللہ کا دین قبول کیا۔ اہل کتاب یہودی اور عیسائی اپنے بچوں کو رنگدار پانی میں بٹھاتے ہیں اور کوئی مسیح کا دین قبول کرے تو اس پر رنگین پانی چھڑکتے ہیں اسے 'اِصۡطباغ' یعنی بپتسمہ کہتے ہیں، گویا ان کے نزدیک عیسائیت کا رنگ پانی سے چڑھتا ہے، حالانکہ اصل رنگ وہ ہے جو ایمان اور کردار سے پیدا ہو۔'' (درس قرآن، جلد اول)

﴿قُلۡ اَتُحَآجُّوۡنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمۡ، وَلَنَآ اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ، وَنَحۡنُ لَهٗ مُخۡلِصُوۡنَ﴾

کہہ دیجیے کیا تم ہم سے جھگڑا کرتے ہو اللہ کے بارے میں، اور وہی رب ہے ہمارا اور رب ہے تمہارا، اور ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال اور ہم اسی کے لیے مخلص ہیں۔

قُلْ فعل امر، کہہ دیجیے (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، أَکلمہ اُستفہام، تُحَاجُّونَ، تم جھگڑا کرتے ہو، فعل مضارع جمع مذکر مخاطب (حَاجَّ، یُحَاجُّ، مُحَاجَّۃٌ) باب مفاعلہ، حجت بازی کرنا، جھگڑا اور بحث کرنا، فِی اللّٰہِ، اللہ کے بارے میں، وہ ذات تو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہے وَھُوَ رَبُّنَا، اور وہ ہمارا رب ہے، وَرَبُّکُمْ، اور وہ تمہارا رب ہے، وہ تو اس پوری کائنات کا رب ہے اور اس کے نزدیک مقرب وہی ہے جو اس کا عبادت گزار ہے اور خالص اسی کا بندہ بن کر رہتا ہے وَلَنَا اَعْمَالُنَا، وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ، ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، ہر کوئی صرف اپنے ہی اعمال کا ذمہ دار ہے اور صرف بزرگوں سے نسبت کوئی سودمند اور کامیابی کی ضمانت نہیں بن سکتی، وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ اور ہم اسی (اللہ تعالیٰ) کے لیے اپنی بندگی خالص کر چکے ہیں، یہ محض اسی کا فضل وکرم ہے کہ اس نے خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر ہمیں اسلام اور ایمان کی نعمت سے نوازا ہے اور ہم خلوص سے اس کی عبادت میں مصروف ہیں۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ایمان وہی کامل ہوسکتا ہے جسے پورے انشراحِ صدر سے قبول کیا جائے، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قبول کیا، اس لیے کہا جارہا ہے کہ اگر تم دعوتِ ایمان ایسے ہی قبول کرو جیسا کہ ان نفوس قدسیہ نے قبول کیا تو یقیناً راہ یاب ہو جاؤ گے۔

۲) تنگ دلی اور تعصب، ضد اور ہٹ دھرمی راہ حق قبول کرنے میں ہمیشہ مانع رہی ہے، جب انسان اس سے آزاد ہو کر غور وفکر کرتا ہے تو حق وصداقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے اور اسے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ہے۔

۳) مصائب وتکالیف میں، مخالفتوں اور منکروں کے مقابلے میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی مدد کافی ہوتی ہے، لہٰذا مومن کو کبھی شکستہ دل اور پریشان نہ ہونا چاہیے۔

۴) 'اللہ کا رنگ' یعنی دین اسلام ہی زندگی گزارنے کے لیے سب سے بہتر اور اچھی راہ ہے۔

۵) حسب ونسب نہیں بلکہ اعمال صالحہ ہی کامیابی کی ضمانت بنتے ہیں۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْنَصٰرٰى، قُلْءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ، وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ، وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۴۰) تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ، لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ، وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۴۱)	کیا تمہارا (یعنی یہود اور نصاریٰ کا) دعویٰ یہ ہے کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ یہودی تھے یا نصرانی تھے۔ اے پیغمبر، ان سے کہیے ''تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ (اگر اللہ جانتا ہے، تو اس کی گواہی تو خود تمہاری کتاب میں موجود ہے جسے تم دیدہ و دانستہ چھپا رہے ہو) پھر بتلاؤ اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوسکتا ہے جس کے پاس اللہ کی گواہی موجود ہو اور وہ اسے چھپائے؟ یاد رکھو جو کچھ بھی تم کر رہے ہو، اللہ اس سے غافل نہیں ہے، (سچ تو یہ ہے) یہ ایک امت تھی جو گزر چکی ہے، اس کے لیے وہ تھا جو اس نے اپنے (اعمال سے) کمایا اور تمہارے لیے وہ ہوگا جو تم اپنے (اعمال سے) کماؤ گے، تم سے (روز جزا) کچھ ان کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں ہوگی کہ ان کے اعمال کیسے تھے؟

﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْنَصٰرٰى﴾

یا تم کہتے ہو کہ بے شک ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد یہودی تھے یا نصرانی۔

اَمْ، کلمۂ استفہام، تنبیہ و توبیخ کے لیے آیا ہے، تَقُوْلُوْنَ تم کہتے ہو مضارع جمع مذکر مخاطب (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، بات کرنا، اَلْاَسْبَاطَ، سِبْط اس کا مفرد ہے، اولاد یعنی اے اہل کتاب کیا تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ مذکورہ انبیاء کرام اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے؟

﴿قُلْءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ﴾ کہہ دیجیے کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ۔

ءَ، کلمہ استفہام، اَنْتُمْ ضمیر جمع مذکر مخاطب، اَعْلَمُ، زیادہ جانتے ہو، (عَلِمَ، یَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، پہچاننا، اَعْلَمُ، اسم تفضیل کا صیغہ ہے یہ جملہ ان مخاطبین کو بطور طنز وتعریض کہا گیا ہے ورنہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک، بھلا عالم الغیب و الشھادہ کے علم کے مقابلے میں بندے کی حقیقت ہی کیا ہے اور جو کچھ بندے کو عطا ہوا ہے وہ بھی تو اسی کی عطا اور بخشش ہے۔

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ﴾

اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوسکتا ہے جس نے چھپایا اس شہادت کو جو اس کے پاس ہے اللہ کی طرف سے۔

مَنْ کلمہ استفہام اَظْلَمُ بڑا ظالم (ظَلَمَ، یَظْلِمُ، ظُلْمًا) ظلم کرنا ظَالِمٌ، ظلم کرنے والا، اس سے اسم تفضیل کا صیغہ اَظْلَمُ، مِمَّنْ (مِنْ.مَّنْ) اس سے، جس نے مِنْ حرف جار، اور مَنْ کلمہ استفہام، كَتَمَ، چھپایا، ماضی واحد مذکر غائب (كَتَمَ، يَكْتُمُ كِتْمَانٌ) چھپانا، کتمانِ حق، حق بات کو چھپانا، شَهَادَةً شہادت، گواہی، عِنْدَهٗ (عِنْدَ.هٗ) پاس، اس کے، مِنَ اللّٰهِ، اللہ کی طرف سے، وہ شہادت اسلام کی حقانیت ہے۔ تمام انبیاء کرام اسی دعوت حق کے ساتھ تشریف لائے اور اسی کا اعلان خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور آپ کے رسول برحق ہونے کی شہادت تورات اور انجیل میں بھی موجود تھی۔ مگر یہود و نصاریٰ عنادِ حق کی بنا پر اس واضح شہادت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے دراں حالیکہ حق کو چھپانا اور اس پر پردہ ڈالنا بہت بڑا ظلم ہے اور ایسا کرنے والا ظالم بلکہ بہت بڑا ظالم ہے۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور نہیں غافل اللہ تعالیٰ اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔

مَا، نہیں، مائے نافیہ ہے عَمَّا (عَنْ. مَا) اس سے جو، تَعْمَلُوْنَ، تم عمل کرتے ہو، مضارع جمع مذکر مخاطب (عَمِلَ، یَعْمَلُ، عَمَلًا) یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ہر ہر عمل کی خبر رکھتا ہے اور روز جزا تمہارا اعمال نامہ تمہارے سامنے رکھ دے گا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ خطاب ان کے علماء سے ہے جو خود بھی اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ یہودیت اور عیسائیت

اپنی موجودہ خصوصیات کے ساتھ بہت بعد میں پیدا ہوئی ہیں، مگر اس کے باوجود وہ حق کو اپنے ہی فرقوں میں محدود سمجھتے تھے اور عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ انبیاء کے مدتوں بعد جو عقیدے، جو طریقے اور جو اجتہادی ضابطے اور قاعدے ان کے فقہا، صوفیاء اور متکلمین نے وضع کیے انہی کی پیروی پر انسان کی فلاح اور نجات کا مدار ہے۔ ان علماء سے جب پوچھا جاتا تھا کہ اگر یہی بات ہے، تو حضرت ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ وغیرہ انبیاء علیہم السلام آخر تمہارے ان فرقوں میں سے کس سے تعلق رکھتے تھے تو وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے، کیونکہ ان کا علم انہیں یہ کہنے کی تو اجازت نہ دیتا تھا کہ ان بزرگوں کا تعلق ہمارے ہی فرقے سے تھا، لیکن اگر وہ صاف الفاظ میں یہ مان لیتے کہ یہ انبیاء نہ یہودی تھے، نہ عیسائی تو پھر ان کی حجت ہی ختم ہوئی جاتی تھی۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ، لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ، وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾

وہ ایک امت (جماعت) تھی جو گزر چکی، واسطے اس کے وہ ہے جو اس نے کمایا اور واسطے تمہارے وہ ہے جو تم کماؤ گے اور نہ پوچھے جاؤ گے تم، اس سے متعلق جو تھے وہ (عمل) کرتے۔

تِلْکَ، اسم اشارہ بعید، مؤنث کے لیے، چونکہ اُمَّۃٌ کا لفظ مؤنث استعمال ہوتا ہے، اس لیے اشارہ بھی مؤنث آیا ہے۔ قَدْ، تحقیق کلام کے لیے استعمال ہوتا ہے، خَلَتْ، گزر چکی، ماضی واحد مؤنث غائب (خَلَا، یَخْلُوْا، خَلْوَۃً) گزر جانا، رخصت ہونا، لَھَا، (لَ. ھَا) واسطے، اس کے، ھا کی ضمیر امت کی طرف ہے کَسَبَتْ اس نے کمایا، واحد مؤنث غائب، (کَسَبَ، یَکْسِبُ کَسْبًا) کمانا، روزی کا، یا اجر کا، (اعمال کے صلہ میں) وَلَکُمْ (لَ. کُمْ) اور واسطے، تمہارے مَّا جو (موصولہ) کَسَبْتُمْ تم نے کمایا ماضی جمع مذکر مخاطب وَلَا اور نہ، کلمہ نفی، تُسْئَلُوْنَ، تم سوال کیے جاؤ گے، مضارع مجہول جمع مذکر مخاطب (سَأَلَ، یَسْأَلُ، سُؤَالًا) سوال کرنا، یَسْأَلُ سے یُسْئَلُ، مضارع مجہول بنتا ہے، عَمَّا (عَنْ. مَا) اس سے۔ جو کَانُوْا، تھے، کَانَ سے جمع کا صیغہ ہے، یَعْمَلُوْنَ، وہ عمل کرتے۔ مضارع جمع مذکر غائب (عَمِلَ، یَعْمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا، ہر قوم، اور ہر گروہ، ہر مرد اور ہر عورت الگ الگ اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے۔

یہ آیت انہی الفاظ میں پہلے بھی گزر چکی ہے (آیت ۱۳۴) وہاں اس آیت کے مخاطب یہود تھے اور

یہاں تمام انسانوں کو خطاب کر کے بتلایا جا رہا ہے کہ ابدی و سرمدی نجات کے لیے انبیاء و صالحین، ولیوں اور بزرگوں پر بھروسہ کرنا بالکل عبث ہے، تم اپنے اعمال کے لیے خود جوابدہ ہو گے اور ان کے مطابق جزا اور سزا پاؤ گے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) کسی بھی صداقت کو بیان کرنے کے لیے کوئی سند اور شہادت ضروری ہوتی ہے، یہود و نصاریٰ کے پاس اپنی حقانیت کے ثبوت میں کونسی دلیل ہے؟ ان میں ایک نے سیدنا ابراہیمؑ کو محض اپنے خیال سے یہودی اور دوسرے نے نصرانی قرار دیا، لیکن قرآن حکیم اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے:
مَاكَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا، وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (ال عمران:٦٧) ''ابراہیمؑ نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے بلکہ خالص اللہ والے اور اللہ کے فرمانبردار (مسلم) تھے اور ہرگز مشرک نہ تھے''۔
اور یہی عقیدہ و ایمان سیدنا اسماعیلؑ، سیدنا اسحاقؑ، سیدنا یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کا تھا، جس کا اقرار اور اظہار سورۃ بقرہ کی آیات (۱۲۸، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳) میں ہو چکا ہے۔

۲) انسانوں کی سب سے بڑی گمراہی کا سبب خواہشات نفسانی کی پیروی ہے، پھر شیطان اور اس کی ذریت انہیں بہکانے میں سونے پر سہاگہ کا کام کرتے ہیں، راہ حق کو چھوڑ کر انسان جو کچھ بھی کریں، اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے اور روزِ جزا و سزا سب کچھ نکھر کر سامنے آجائے گا۔

۳) نظام حیات صرف دین اسلام ہے اور یہ روز اول ہی سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے زندگی گزارنے کا پسندیدہ راستہ مقرر ہوا ہے، اسی کی اشاعت ہر نبی اور رسول نے کی ہے اس کے سوا جتنی راہیں ہیں ان سب میں تعصب و جہالت کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔

۴) یہود و نصاریٰ کی گمراہی کا سبب اس راہ حق کو چھوڑنا تھا، آج مسلمان بھی اس سے اِعراض کی بنا پر ذلت و خواری کا شکار ہیں۔

۵) ہر شخص اور ہر فرد اپنے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور روز جزا و سزا اس کے لیے جوابدہ ہے۔ کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا	نادان لوگ ضرور کہیں گے کہ مسلمان جس قبلہ کی
وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوا عَلَيْهَا، قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۴۲)	طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے، کیا بات ہوئی کہ ان کا رخ اس سے پھر گیا، اے پیغمبرؐ! فرما دیجئے کہ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے راہ راست کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ﴾ عنقریب کہیں گے، لوگوں میں سے احمق۔

(قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، س مضارع کے شروع میں آجائے تو اسے مستقبل قریب سے مختص کر دیتا ہے، السُّفَهَآءُ (س ف ہ) سَفِهَ، يَسْفَهُ، سَفَهًا بیوقوف بنالینا، اس سے اسم صفت سَفِيْهٌ، احمق، بیوقوف اور اس کی جمع سُفَهَآءُ ہے، اس سے مراد یہود ہیں جو مدینہ میں رہتے تھے کیونکہ ال معرفہ کی نشانی ہے، مِنَ النَّاسِ، لوگوں میں سے۔

﴿مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوا عَلَيْهَا﴾

کس چیز نے پھیر دیا ان کو، ان کے قبلہ سے جس کے اوپر تھے وہ۔

مَا کلمہ استفہام، وَلّٰهُمْ (وَلّٰى. هُمْ) پھیر دیا، انہیں (وَلّٰى، يُوَلِّيْ، تَوْلِيَةً) باب تفعیل، پھیرنا، ہٹا دینا عَنْ، سے قِبْلَتِهِمْ (قِبْلَةِ. هُمْ) قبلہ، ان کا كَانُوا عَلَيْهَا، (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، كَانُوا ماضی جمع مذکر غائب، تھے (عَلٰى. هَا) عَلٰى، پر، هَا کی ضمیر قبلہ کی طرف جاتی ہے یعنی وہ قبلہ جس پر وہ پہلے تھے۔ جس طرف رخ کر کے نماز پڑھیں اسے قبلہ کہتے ہیں، یعنی مسلمان جس قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے (یعنی بیت المقدس) کیا بات ہوئی کہ ان کا رخ اس سے پھر گیا۔ (اور اب وہ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے لگے)۔

مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''سفہا، سفیہ کی جمع ہے جس کے معنی نادان اور بے وقوف کے ہیں۔ یہاں، اس سے اشارہ یہود کی طرف ہے، یہود ایک طرف تو ملت ابراہیمؑ کے پیرو ہونے کے مدعی تھے دوسری طرف رسول اللہ ﷺ اور آپ کی دعوت و تعلیم کے سخت دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے حالانکہ آپ ﷺ اصل ملت ابراہیمی کے داعی بن کر تشریف لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی الٹی حرکت نادان اور بے وقوف لوگ ہی کر سکتے تھے، اس وجہ سے قرآن نے ان کے لیے سفہاء کا لفظ استعمال کیا۔

یہ آیہ مبارکہ ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ﴾ تمہید ہے تحویل قبلہ کے اس حکم کی جس کا ذکر دو آیات کے بعد آ رہا ہے، اس تمہید میں اشارہ ہے اس ردعمل کی طرف جو اس حکم کا یہود اور منافقین پر ہوگا، اصل حکم سے پہلے اس کے ردعمل کے بیان کرنے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم کوئی معمولی حکم نہیں تھا۔ اسلام کے مخالفوں اور اس کے حامیوں دونوں ہی کے اندر یہ خاصی ہلچل پیدا کر دینے والا حکم تھا، اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس حکم سے پہلے اس کے متوقع ردعمل کے لیے ذہنوں کو تیار کر دیا جائے، دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ اس سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کی جو سرگزشت بیان ہوئی ہے، اس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر ہر قاری کے سامنے آ چکی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد کا مذہب اسلام تھا، حضرت ابراہیمؑ نے مکہ میں عبادتِ الٰہی کے لیے جو مرکز تعمیر کیا وہ ان کی ساری ہی ذریت کا مرکز اور قبلہ تھا یہاں تک کہ بیت المقدس بھی جب تعمیر ہوا تو اس کی تعمیر بھی اس طرح ہوئی کہ بنی اسرائیل کی قربانیوں کا رخ خانۂ کعبہ کی طرف ہو، یہ تمام باتیں بالکل غیر مبہم طور پر اس بات کو ظاہر کر رہی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا ایک بالکل عارضی معاملہ تھا اور اب وقت آ گیا ہے کہ آپ کو بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم دے دیا جائے، اسی وجہ سے یہ تمہید ایک ایسے واقعہ کی تمہید تھی جس کے واقع ہونے کا انتظار یہود و نصاریٰ کو بھی تھا اور مسلمانوں کو بھی۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

کہہ دیجئے اللہ ہی کے لیے ہیں یہ مشرق اور مغرب، وہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہے سیدھے راستے کی طرف۔

قُلْ فعل امر واحد مذکر کے لیے (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، لِلّٰہِ، اس میں لفظ اللہ سے پہلے لام ملکیت کے معنی دیتا ہے، یعنی اللہ ہی مالک ہے الْمَشْرِقُ، جہت مشرق وَالْمَغْرِبُ، جہت مغرب، مشرق ہو یا مغرب، اطراف کا وہی مالک ہے، اگر پہلے بیت المقدس قبلہ تھا اور اب کعبۃ اللہ کو قبلہ قرار دے دیا گیا تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو باعث اعتراض ہو، قبلہ بذات خود کوئی پرستش کی چیز نہیں، اللہ تعالیٰ کے حکم نے اسے یہ شرف عطا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت وفرمانبرداری بندۂ مومن کی زندگی کا حصہ ہے، یَهْدِیْ وہ ہدایت دیتا ہے فعل مضارع واحد مذکر غائب (هَدٰی، یَهْدِیْ، هِدَایَةً) ہدایت دینا، مَنْ یَّشَآءُ جسے چاہے (شَاءَ، یَشَاءُ، مَشِیْئَةً) چاہنا، اِلٰی طرف، حروف جارہ میں سے ہے اور اپنے بعد والے اسم کو عام طور پر زیر دیتا ہے صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ راستہ، سیدھا، صفت، موصوف ہے اور صفت وموصوف کی اِعرابی حالت یکساں ہوتی ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) مشرق ومغرب ہو یا شمال وجنوب سب اطراف کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے اور جدھر بھی رخ کریں اور جہاں بھی اسے پکاریں، وہ ملتا ہے اور ہماری پکار کو سنتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ، فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ۲:۱۱۵)

''اور مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے ہیں تم جدھر بھی رخ کرو گے اللہ تعالیٰ کو پاؤ گے، بلاشبہ اللہ بہت وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے''۔

۲) مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے تو یہ اللہ کے حکم ہی سے ایسا کرتے تھے اور اب بیت اللہ کی طرف رخ کر رہے تھے تو یہ بھی اللہ ہی کے حکم کی تعمیل ہو رہی تھی۔ مسلمان کو تو اطاعت کا مظاہرہ کرنا اور رب کے سامنے جھکنا ہے اسے اس کا رب جس طرح بھی رخ کرنے کا حکم دے گا وہ اس طرف رخ کر کے عمل عبادت بجالائے گا۔ اسے اس پر کوئی اعتراض وناگواری کیونکر ہو سکتی ہے۔

۳) مسلمان کے اندر اطاعت وتسلیم کا یہ جذبہ موجود ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کا فضل ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کو ہدایت سے نوازتا ہے اور مسلمان کو ہدایت سے نواز کر اس کے اوپر اپنا انعام کیا ہے۔ جبکہ اعتراض کرنے والوں کو یہ انعام وفضل نصیب نہیں ہو سکتا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا، وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ، وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ، وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ، اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۴۳)	اور اسی طرح (مسلمانو!) ہم نے تمہیں امت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (محمد ﷺ) تم پر گواہ بنیں اور جس قبلے پر تم (پہلے) تھے اس کو ہم نے اس لیے مقرر کیا تھا تاکہ معلوم کریں کہ کون (ہمارے) پیغمبر کا اتباع کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ اور یہ بات (یعنی تحویل قبلہ لوگوں پر) شاق گزری، مگر ان لوگوں پر نہیں جنہیں اللہ نے ہدایت سے نوازا ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ اللہ، تمہارے ایمان کو یونہی ضائع کر دے، اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر بڑا ہی مہربان اور صاحب رحمت ہے۔

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ اور اسی طرح ہم نے بنایا تم کو، امت معتدل۔

وَكَذٰلِكَ اور اسی طرح، جَعَلْنٰكُمْ (جَعَلْنَا۔ كُمْ) ہم نے بنایا، تمہیں، اُمَّةً، امت، جماعت۔

امت سے مراد: ''ہر وہ جماعت جس کے افراد کے درمیان دینی رشتہ ہو یا وہ جغرافیائی اور عصری وحدت میں منسلک ہوں اور وہ رشتہ اور تعلق اختیاری ہو یا غیر اختیاری۔'' (مفردات القرآن)

قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (الانعام:۳۸)

''اور زمین پر جو چلنے پھرنے والے (حیوانات) ہیں اور جتنے بھی اپنے بازوؤں (پروں) سے اڑنے والے پرندے ہیں وہ تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ (گویا یہ فطری اور تسخیری طور پر خاص قسم کی زندگی بسر کر

رہے ہیں)۔''

ایک مقام پر اس طرح ارشاد ہوا:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً، فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ، وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (البقرہ:۲۱۳) ''ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریق (دین) پر تھے (پھر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا) تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیجا جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے، ان کے ساتھ اللہ نے حق کو واضح کرنے والی کتاب نازل فرمائی تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کردے جن میں انہوں نے اختلاف کیا''۔

حافظ عتیق الرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت میں ہدایت کی بنیاد اور اختلافات کے دخول کا پورا سلسلۂ عروج وزوال سمجھا دیا ہے، ابتدا میں لوگ ایک ہی طریقے پر تھے، یہ کون سا طریقہ تھا؟ یہ طریقہ اسلام تھا، اس سے اس فلسفہ کی تردید ہو جاتی ہے جو بعض فلسفی سمجھاتے ہیں کہ شروع میں صرف جہالت تھی، بعد میں ارتقاء ہوتے ہوئے انسان توحید کی روشنی تک پہنچا۔

پھر جب اختلافات پیدا ہونے کی وجہ سے ہدایت مٹ جاتی رہی تو اللہ تعالیٰ انبیاء بھیج دیتا جن کے ساتھ کتاب بھی اتار دیتا کہ وہ جہالت کے اندھیروں کو چھانٹ کر لوگوں پر حق کو پھر سے واضح کردیں۔ لوگوں میں اختلافات کی ابتدا تو وہ کرتے رہے جن کے پاس ہدایت ہوتی اور روشن دلیل بھی ہوتی مگر وہ ضد، ہٹ دھرمی اور مفاد پرستی کی بنیاد پر اختلافات کو ہوا دیتے۔'' (تیسیر القرآن)

انبیاء کرام علیہم السلام کے فریضۂ حق کو تا قیامت ادا کرنے کے لیے خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کو منتخب کیا گیا، ارشاد ہوتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (ال عمران ۳:۱۱۰) ''(مسلمانو!) تم بہترین امت ہو جنہیں لوگوں (کی اصلاح وہدایت) کے لیے پیدا کیا گیا ہے تم لوگوں کو بھلے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان بھی رکھتے ہو''۔

پھر اس امت کو ''اُمَّةً وَّسَطًا'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے کہ افراط وتفریط سے دور اور اعتدال پسند ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''امت مسلمہ کو امتِ وسط کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ امت ٹھیک ٹھیک دین کی اس بیچ شاہراہ پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہنمائی کے لیے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے کھولی ہے اور جو ابتدا سے ہدایت کی اصل شاہراہ ہے، یہود و نصاریٰ اللہ کے نبیوں میں تفریق کر کے اس شاہراہ سے ہٹ گئے اور انہوں نے یہودیت و نصرانیت کی پگ ڈنڈیاں نکال لیں، اسی طرح وہ اصل قبلہ سے منحرف ہو کر مشرق و مغرب کے جھگڑوں میں پڑ گئے، لیکن یہ امت ان کج بیچ کی راہوں میں بھٹکنے کے بجائے دین کی اصلی راہ پر قائم ہے اس کا کلمہ تفریق کے بجائے وحدت کا کلمہ ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

تا کہ ہو تم، شاہد (گواہ) لوگوں پر اور ہوں رسول گواہ تم پر۔

(كَانَ، يَكُوْن، كَوْنًا) ہونا (لِ.تَكُونُوا) تا کہ تم ہو، فعل مضارع مذکر حاضر، لام کی وجہ سے حالت نصب میں ہے، اس لیے نون اعرابی گر گیا، شُهَدَآءَ، گواہ اس کا مفرد شَهِيْدٌ ہے، عَلَى النَّاسِ لوگوں پر۔

سید مودودیؒ فرماتے ہیں:

''اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا، اس وقت رسول ہمارے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکر صحیح اور عمل صالح اور نظام عدل کی جو تعلیم ہم نے اسے دی تھی، وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھایا، اس کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا ہو گا اور یہ شہادت دینی ہو گی کہ رسول نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا، وہ تم نے انہیں پہنچانے میں اور جو کچھ رسول نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے انہیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی تو نہیں کی۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾

اور نہیں بنایا ہم نے (وہ) قبلہ جس پر کہ آپ تھے مگر (اس لیے) کہ ہم معلوم کریں کہ کون اتباع کرتا ہے رسول (ﷺ) کا اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا اور نہیں بنایا ہم نے، ما نافیہ ہے (جَعَلَ، یَجْعَلُ، جَعْلًا)، بنانا، ٹھہرانا، اَلْقِبْلَةَ، سمتِ نماز، اَلَّتِیْ، جو، اسم موصول، کُنْتَ تو تھا (کَانَ، یَکُوْنُ، کَوْنًا) ہونا، عَلَیْهَآ (عَلٰی.هَا) اس، پر۔ها کی ضمیر قبلہ کی طرف جاتی ہے اِلَّا۔ مگر کلمہ استثناء لِنَعْلَمَ (لِ.نَعْلَمَ) تا کہ، ہم جانیں فعل مضارع جمع متکلم (عَلِمَ، یَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، لام کی وجہ سے حالت نصب میں ہے مَنْ یَّتَّبِعُ، کون اتباع کرتا ہے، مَنْ اسم موصول، جو، یَتَّبِعُ، پیروی کرتا ہے، اتباع کرتا ہے (اِتَّبَعَ، یَتَّبِعُ، اِتِّبَاعًا) مِمَّنْ (مِنْ.مَنْ) مِنْ، حرف جار اور مَنْ، اسم موصول، اس سے (جو) یَّنْقَلِبُ (اِنْقَلَبَ، یَنْقَلِبُ، اِنْقِلَابٌ) پھرنا، پلٹنا، عَقِبَیْهِ اپنی دونوں ایڑیوں (کے بل) (عَقِبَیْ.هِ) عَقِبٌ کا تثنیہ عَقِبَانِ اور حالت جری میں عَقِبَیْنِ مضاف ہونے کی صورت میں ''ن'' گر گیا ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یعنی اس سے مقصود یہ دیکھنا تھا کہ کون لوگ ہیں جو جاہلیت کے تعصّبات اور خاک وخون کی غلامی میں مبتلا ہیں اور کون ہیں جو ان بندشوں سے آزاد ہو کر حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہیں، ایک طرف اہل عرب اپنے وطنی ونسلی فخر میں مبتلا تھے اور عرب کے کعبے کو چھوڑ کر باہر کے بیت المقدس کو قبلہ بنانا ان کی اس قوم پرستی کے بت پر نا قابل برداشت ضرب تھا، دوسری طرف بنی اسرائیل اپنی نسل پرستی کے غرور میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنے آبائی قبلے کے سوا کسی دوسرے قبلے کو برداشت کرنا ان کے لیے محال تھا، ظاہر ہے کہ یہ بت جن لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہوں، وہ اس راستے پر کیسے چل سکتے تھے جس کی طرف اللہ کا رسول انہیں بلا رہا تھا، اس لیے اللہ نے ان بت پرستوں کو سچے حق پرستوں سے الگ چھانٹ دینے کے لیے پہلے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا تا کہ جو لوگ عربیت کے بت کی پرستش کرتے ہیں، وہ الگ ہو جائیں پھر اس قبلے کو چھوڑ کر کعبے کو قبلہ بنایا تا کہ جو اسرائیلیت کے پرستار ہیں، وہ بھی الگ ہو جائیں، اس طرح صرف وہ لوگ رسول کے ساتھ رہ گئے جو کسی بت کے پرستار نہ تھے محض اللہ تعالیٰ کے پرستار تھے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾

اور یہ (تحویل قبلہ) لوگوں پر شاق (بھاری) ہوا، مگر ان لوگوں پر نہیں جنہیں اللہ نے ہدایت سے نوازا۔

وَاِنْ اور اگرچہ، اِن شرطیہ، کَانَتْ ہوتی ہے (یہ بات) فعل ماضی واحد مؤنث غائب (کَانَ یَکُوْنُ،

كَوْنًا) ہونا لَكَبِيْرَةً (لَ. كَبِيْرَةً) البتہ، دشوار (بھاری گراں)، اِلَّا، مگر کلمہ استثناء، الَّذِيْنَ، وہ لوگ هَدَى اللّٰهُ، (جنہیں) اللہ نے ہدایت دی۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ، اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾

اور نہیں ہے اللہ (کہ) ضائع کرے تمہارے ایمان کو یقیناً اللہ لوگوں پر شفیق اور مہربان ہے۔

وَمَا اور نہیں، ما نافیہ ہے كَانَ، ہے (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا وَمَا كَانَ اللّٰهُ اور ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ لِيُضِيْعَ، کہ ضائع کرے (اَضَاعَ، يُضِيْعُ، اِضَاعَةً) ضائع کرنا، (اِيْمَانَ. كُمْ) ایمان، تمہارے لَرَءُوْفٌ (لَ. رَءُوْفٌ) ضرور بضرور شفیق، رَّحِيْمٌ، مہربان۔ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھی گئیں یا بیت اللہ کی طرف رخ کر کے وہ ضائع نہیں ہوئی ہیں اصل بات تو احکام الٰہی کی اطاعت ہے، اسے کسی خاص سمت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) امت مسلمہ کو اعتدال پسند بنایا گیا اور لوگوں کے لیے اس کی راہنمائی تا قیامت ہے مگر ہم نے اپنی جہالت اور حماقت سے اس اعتدال پسندی کو ضائع کر دیا۔

۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت تو یقیناً برحق ہے کہ انہوں نے اللہ کا دین بلاکم وکاست ہم تک پہنچا دیا، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی شہادت بھی برحق ہے کہ انہوں نے کلمۂ حق پہنچانے میں ہر قسم کی جانی ومالی قربانیاں دیں، مگر ہماری حالت دگرگوں ہے ۔

تھے تو آباء وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو!

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِی السَّمَآءِ، فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا، فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَحَیْثُ مَا کُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ شَطْرَهٗ، وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ، وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ (۱۴۴)	''(اے محمد ﷺ) ہم نے آپ کا چہرہ (انتظار وحی) میں آسمان کی طرف بار بار اٹھتا دیکھ لیا، ہم اسی قبلے کی طرف آپ کو پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں، تو لیجئے اپنا منہ (نماز میں) مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لیجئے اور (مسلمانو!) جہاں کہیں بھی تم ہو (نماز پڑھتے وقت) اسی مسجد کی طرف منہ کرلیا کرو، وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی، خوب جانتے ہیں کہ (تحویل قبلہ کا) یہ حکم ان کے رب ہی کی طرف سے برحق ہے مگر اس کے باوجود جو کچھ وہ کر رہے ہیں (فتنہ وفساد کی باتیں) اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔''

﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِی السَّمَآءِ﴾

تحقیق، دیکھتے ہیں ہم پھیرنا، چہرہ، آپ کا آسمان کی طرف۔

قَدْ کلمہ تحقیق کلام، نَرٰی ہم دیکھتے ہیں فعل مضارع جمع متکلم (رَاٰی، یَرٰی، رُؤْیَةً) دیکھنا، تَقَلُّبَ، (ق ل ب) اس کا مادہ ہے تَقَلَّبَ یَتَقَلَّبُ تَقَلُّبٌ (باب تفعل) سے اسم مصدر تَقَلُّبَ (بار بار پلٹنا) باب تفعل کی وجہ سے اس میں اہتمام کا معنی پیدا ہوگیا ہے، وَجْهِکَ (وَجْهِ.کَ) چہرہ، آپ کا، فِی السَّمَآءِ آسمان کی طرف، یہاں پر فِی کا معنی اِلٰی ہے، فِی جِهَةِ السَّمَآءِ آسمان کی جانب۔ (کشاف)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کو صحیح جذبۂ دینی کے ماتحت اس کا یقین تھا کہ اب جبکہ امامت بنی اسرائیل سے چھن چکی ہے تو ان کا قبلہ بھی قبلہ امت نہیں رہ سکتا، تحویل قبلہ کا حکم اب آ کر رہے گا اور فرشتۂ وحی کے انتظار میں آپ کی نظر بار بار آسمان کی طرف اٹھ جاتی تھی، یہاں اسی کیفیت کا بیان ہے، حق تعالیٰ اگرچہ ہرگز کسی جہت

کا پابند، کسی مکان سے محدود نہیں تاہم تجلیاتِ خاصہ کو قرآن میں آسمان کی جانب منسوب کیا گیا ہے، اس لیے محققین نے لکھا ہے کہ بوقت اضطرار ودعا آسمان کی طرف منہ کرنا موجباتِ قبول میں سے ہے بلکہ اس نسبت عُلوی سے کمالِ یقین اور تصفیۂ قلب میں اور مدد ملتی ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾

البتہ ضرور پھیریں گے ہم تجھ کو (اس) قبلہ کی طرف جو آپ کو پسند ہے۔

فَ پس، لام مفتوح (زبر والا) تاکید کلام کے لیے آتا ہے، فَلَنُوَلِّيَنَّكَ پس البتہ ضرور پھیریں گے ہم (فَ. لَ. نُوَلِّيَ. نَّ. كَ) اس میں فعل نُوَلِّي ہے (وَلّٰی، يُوَلِّيْ، تَوْلِيَةً) باب تفعیل ہے رخ پھیرنا، لَ (زبر والا) اور نَّ، (نون تشدید والا) تاکید در تاکید کا مفہوم پیدا کر رہا ہے یعنی ہم ضرور بضرور پھیریں گے آپ کا رخ، قِبْلَةً اس (قبلہ) کی طرف تَرْضٰهَا (جسے) آپ پسند کرتے ہیں (رَضِيَ، يَرْضٰى، رِضًى) راضی ہونا، پسند کرنا، رضامندی اردو میں استعمال ہوتا ہے ''ھا'' کی ضمیر ''قِبْلَة'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾

تو پھیر لیجئے چہرہ اپنا طرف مسجد حرام (کی)۔

فَوَلِّ (فَ. وَلِّ) تو، پھیر لیجئے، وَلِّ، فعل امر، واحد مذکر حاضر، وَجْهَكَ (وَجْهَ. كَ) چہرہ، اپنا، شَطْرَ کسی چیز کے نصف یا وسط کو کہتے ہیں اور یہاں اس سے مراد جہت اور سمت ہے۔ (مفردات القرآن) الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، مسجد حرام (خانہ کعبہ) حرام کے معنی ممنوع چیز کے ہیں، حرم کو اس لیے حرم کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس میں بہت سی باتیں ممنوع ہیں جن کی پابندی لازم ہے۔ (مفردات القرآن) گویا کہ ان ممنوعات کی وجہ سے یہ عزت والی جگہ ہوگئی، المسجد الحرام کے معنی، عزت وحرمت والی مسجد کے بھی ہیں۔

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾

اور جہاں کہیں (بھی) تم ہو تو پھیر لو اپنا چہرہ اس کی طرف۔

وَحَیْثُ اور جہاں کہیں حَیْثُ ظرف مکان کے لیے آتا ہے اور جب اس کے بعد مَا آتا ہے تو شرط اور جزا کے معنی ہوتے ہیں، فَوَلُّوْا، پس تم پھیر لو، فعل امر جمع مذکر، وُجُوْهَكُمْ (وُجُوْهَ. كُمْ) چہرے، اپنے، وَجْهٌ کی جمع وُجُوْهٌ، شَطْرَهٗ (شَطْرَ. هٗ) طرف، اس کے هٗ کی ضمیر مسجد کی طرف جاتی ہے، اب صراحت کے ساتھ دنیا بھر کے مسلمانوں کو حکم ہو رہا ہے کہ حالت نماز میں مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف رخ کیا کرو۔

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾

اور بلاشبہ، وہ لوگ جنہیں دی گئی ہے کتاب (یعنی اہل کتاب) ضرور بضرور جانتے ہیں کہ بے شک یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔

اِنَّ کلمۂ تحقیق کلام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ الَّذِيْنَ، اسم موصول وہ لوگ اُوْتُوْا جو دیئے گئے فعل ماضی مجہول (اٰتٰی، يُؤْتِيْ، اِيْتَاءٌ) دینا، عطا کرنا، الْكِتٰبَ، خاص کتاب، اس سے مراد تورات، انجیل ہے، لَيَعْلَمُوْنَ وہ ضرور بضرور جانتے ہیں، لام تاکید کے لیے آتا ہے (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، اَنَّهٗ (اَنَّ. هٗ) بے شک، وہی (بات) هٗ کی ضمیر تحویل قبلہ کی طرف جاتی ہے، مِنْ رَّبِّهِمْ، ان کے رب کی طرف سے یعنی یہ حکم تحویل قبلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی طرف سے نہیں بلکہ سراسر حکم ربانی ہے: ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ﴾ اور نہیں، اللہ تعالیٰ، بے خبر اس بات سے جو وہ کرتے ہیں، وَمَا اور نہیں، ما نافیہ ہے، بِغَافِلٍ، غافل، بے خبر، عَمَّا (عَنْ. مَا) اس بات سے، جو يَعْمَلُوْنَ وہ عمل کرتے ہیں مضارع جمع مذکر غائب (عَمِلَ، يَعْمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا۔ جو بھی وہ حق وصداقت کو چھپا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ لکھتے ہیں:

''کیونکہ ان کی کتابوں میں مذکور ہے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں پیدا ہوں گے، ابراہیم علیہ السلام کے طریق پر ہوں گے اور کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں گے۔'' (تیسیر القرآن)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز کے قیام سے مقصود لوگوں میں نظم وضبط پیدا کرنا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جدھر بھی رخ کریں، ادھر اللہ تعالیٰ ملتا ہے۔

۲) قبلہ پرستی کا نہیں بلکہ رب کائنات کی پرستش کا حکم ہے، وہ جدھر بھی حکم دے، سر آنکھوں پر، اگر کچھ عرصہ کے لیے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم تھا، تو اطاعت کے لیے سر تسلیم خم تھا اور اب اگر بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم آ گیا تو اسی وقت بلا چون و چرا ادھر رخ کر دیا۔

۳) پس ''مسلم'' وہی شخص ہوتا ہے جو خالق و مالک کا ہر حکم ہر وقت ماننے کے لیے تیار ہوتا ہے، فتنہ و فساد پھیلانا اس کی زندگی سے باہر ہے۔

وَلَئِنۡ اَتَيۡتَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوۡا قِبۡلَتَكَ، وَمَاۤ اَنۡتَ بِتَابِعٍ قِبۡلَتَهُمۡ، وَمَا بَعۡضُهُمۡ بِتَابِعٍ قِبۡلَةَ بَعۡضٍ، وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ، اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ (۱۴۵)	اور اگر آپ اہل کتاب کے لیے دنیا جہاں کی ساری دلیلیں بھی پیش کر دیں جب بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں، نہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے لگیں اور ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا قبلہ ماننے والا نہیں، اور اگر آپ نے اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً آپ کا شمار ظالموں میں ہوگا۔

﴿وَلَئِنۡ اَتَيۡتَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوۡا قِبۡلَتَكَ﴾

اور اگر آپ اہل کتاب کے لیے دنیا جہاں کی ساری دلیلیں بھی پیش کر دیں جب بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں۔

(لَ. اِنْ) لام تاکید کے لیے، اِنْ، اگر، اَتَیْتَ لائیں آپ (اَتٰی. یَاْتِیْ) آنا اور چونکہ اس کے بعد 'ب' استعمال ہو رہا ہے اس لیے اس کے معنیٰ 'لانا' ہوگا، 'ب' لازم کو متعدی بنا دیتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ، اسم موصول، وہ

لوگ جو، اس کا مفرد اَلَّذِی (Relative Pronoun) اُوْتُوا، دیے گئے فعل ماضی مجہول جمع مذکر (اَتٰی، یُؤْتِیْ، اِیْتَاءٌ) عطا کرنا، دینا، اَلْکِتٰبَ خاص کتاب، ال معرفہ بنا دیتا ہے یہاں اَلْکِتٰبَ سے مراد تورات ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اصطلاح میں یہود و نصاریٰ اہل کتاب کہلاتے ہیں، یہاں پر اشارہ یہود مدینہ کی طرف ہے بِکُلِّ اٰیَةٍ، ہر دلیل، ہر نشانی، مَا تَبِعُوْا، نہیں وہ پیروی کریں گے فعل ماضی جمع مذکر غائب مَا نافیہ ہے، تَبِعُوْا (تَبِعَ، یَتْبَعُ، تَبْعًا) پیروی کرنا قِبْلَتَکَ (قِبْلَةَ. کَ) آپ کا قبلہ، یعنی بیت اللہ (خانہ کعبہ)۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''اہل کتاب جس مخالفت وعناد میں گرفتار ہیں اسے ہوائے نفس، مفاد پرستی اور خود غرضی نے پیدا کیا ہے، بہت سے خوش فہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ اسلام سے اس لیے دور ہیں کہ وہ اسلام کو نہیں جانتے ہیں یا ان کے سامنے اسلام کی دعوت اطمینان بخش انداز سے پیش نہیں کی گئی، یہ سراسر وہم ہے وہ اسلام کو اس لیے نہیں قبول کر رہے کہ وہ اسے خوب جانتے ہیں، وہ جانتے بوجھتے اسے اس لیے رد کر رہے ہیں کہ انہیں اپنے مفادات اور اقتدار کے نقصان کا خطرہ ہے، اسی لیے وہ اسلام کے خلاف مختلف طریقوں اور مختلف ذرائع و وسائل سے براہ راست اور بالواسطہ مسلسل سازشوں میں مصروف رہتے ہیں، جن میں کبھی کمی نہیں آتی، کبھی وہ کھلم کھلا اور برملا اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کبھی در پردہ برسر پیکار ہوتے ہیں، کبھی تو وہ خود جنگ کرتے ہیں اور کبھی اسلام کے ماننے والوں میں سے کسی کو اکسا دیتے ہیں کہ وہ اسلام کے خلاف کسی پردے کے پیچھے سے ان کے لیے جنگ کرے۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ﴾ اور نہیں آپ پیروی کرنے والے ان کے قبلہ کی۔

مَا نہیں (مَا یہاں پر نفی کا معنی دیتا ہے) اَنْتَ تو، آپ ضمیر منفصل واحد مذکر مخاطب (الگ استعمال ہوتی ہے) بِتَابِعٍ پیروی کرنے والا، اسم فاعل ہے قِبْلَتَهُمْ، (قِبْلَةَ. هُمْ) ان کا قبلہ، یعنی بیت المقدس۔

اب جبکہ اللہ کا حکم آچکا ہے کہ مسلمان بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں تمہارا کام یہ نہیں ہے کہ تم (محض ان کی خوشی کے لیے) ان کے قبلے کو اختیار کرو، یہاں جملہ اسمیہ منفیہ استعمال ہوا ہے، یہ زیادہ بلیغ انداز بیان ہے، یہ واضح کرنے کے لیے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی اور مستقل رویہ ہے، اس میں

امت مسلمہ کے لیے بھی زبردست ہدایت ہے کہ وہ اپنے رسول کے قبلے کے سوا..... جوان کے رب نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے اسی کو قبلہ بنا کر وہ راضی وخوش ہوتا کہ رسول راضی وخوش ہو..... کوئی اور قبلہ اختیار نہ کرے! اللہ کے پرچم کے سوا..... جو اس کی نسبت اس کے رب سے کرتا ہے..... کوئی پرچم بلند نہ کرے اور اللہ ہی کے عطا کردہ نظام حیات کے سوا..... جس کی ایک رمز قبلہ ہے..... کسی اور طریق زندگی کی پیروی نہ کرے، جب تک وہ امت مسلمہ ہے، اس کا یہی رویہ ہونا چاہیے، اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اس کا، اسلام کا دعویٰ صرف زبانی جمع خرچ ہے۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

قرآن قبلے کے سلسلے میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے درمیان اختلاف بیان کرتا ہے، اس معاملے میں ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے اور خواہشاتِ نفس نے انہیں آپس میں پارہ پارہ کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ﴾

اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں۔

ان کا باہم خیال یہ ہے کہ یہود کا قبلہ ہیکل بیت المقدس ہے اور نصاریٰ کا قبلہ کوئی خاص نہیں پوری سمتِ مشرق ان کا قبلہ ہے۔

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآئَكَ مِنَ الْعِلْمِ، اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾

اور اگر پیروی کی آپ نے خواہشات ان کی، اس کے بعد کہ آیا آپ کے پاس علم تو یقیناً آپ ظالموں میں سے ہوں گے۔

وَلَئِنِ اور اگر، لام زائد ہے اِنْ شرطیہ ہے (ل، اِن) اتَّبَعْتَ آپ نے پیروی کی (اِتَّبَعَ، يَتَّبِعُ، اِتِّبَاعًا) باب افتعال، پیروی کرنا، أَهْوَآءَ هُمْ (اَهْوَاءَ.هُمْ) خواہشات، ان کی۔ هَوٰی کی جمع، باطل آرزو، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مِّنْۢ بَعْدِ اس کے بعد جَآئَكَ (جَاءَ.كَ) آیا، آپ کے پاس (جَاءَ، يَجِيْءُ) آنا، الْعِلْمِ، خاص علم، وہ علم جس کی تائید وحی الٰہی سے ہو اِنَّكَ (اِنَّ.كَ) بلاشبہ آپ، اِذًا، اس وقت لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ، (ل.من) ضرور۔ سے، لام تاکید کو ظاہر کرتا ہے، ظَالِمٌ کی جمع ظَالِمُوْنَ، مِنْ کی وجہ سے ظَالِمُوْنَ ظَالِمِيْنَ ہوا۔

حافظ عبدالرحمٰن کیلانیؒ لکھتے ہیں:

''رسول ہونے کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کام نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو راضی کرتے پھریں اور کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر سمجھوتہ کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام یہ ہے کہ جو علم ہم نے آپ کو دیا ہے، اس پر سختی سے کاربند رہیں اور ظالم ہونے کا خطاب دراصل امت کو ہے، رسول کے ذریعہ اللہ کا حکم جو تمہیں مل رہا ہے، اس پر پورا پورا یقین رکھو اور اس کے مطابق عمل کرو اور اگر تم نے یہود کو خوش کرنے کی کوشش کی تو تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔'' (تیسیر القرآن)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) مسلمانوں کے کبھی دوست نہیں ہو سکتے ہیں اور محض ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر یہود بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان کے سامنے ہر نقلی وعقلی دلیل پیش کرنا فضول اور عبث ہے۔

۲) مسلمانوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ وہ بلا خوف وخطر حق بات پر ثابت قدم رہیں اور اہل کتاب کے شبہات اور اعتراضات پر مطلق توجہ نہ دیں۔

۳) اللہ کی طرف سے واضح ہدایت ملنے کے بعد اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کے خیالات اور خواہشات کی پیروی کرنا ظالموں کے زمرے میں شامل ہونا ہے، آیت کا خطاب گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، لیکن مراد عام مسلمان ہی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو ہر عمل اور ہر گفتگو رضائے الٰہی کے تابع تھی۔

۴) مسلمانوں کو اس قرآنی حکم اور سیرت رسول ﷺ کو حرز جاں بنانا چاہیے تھا، مگر افسوس کہ انہوں نے دھن دولت کے سمیٹنے میں احکام الٰہی کو نظر انداز کر دیا اور یہود ونصاریٰ کی دشمنی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا ہے ماضی قریب میں امریکہ نے نہتے افغان باشندوں پر جو ظلم وستم ڈھایا اور اسرائیل فلسطینیوں پر جس درندگی کا مظاہرہ کر رہا ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے پھر بھی ہمارے خوشامدی حکمران انہی ظالموں کے گیت گاتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ زندگی عارضی ہے اور آخرت کا عذاب دائمی اور ابدی ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَ ہُمۡ، وَاِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡہُمۡ لَیَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ (۱۴۶) اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ (۱۴۷)	جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو، مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپا رہا ہے (حالانکہ) حق وہی ہے جو آپ کا رب فرمائے، پس آپ ہرگز شک و شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔

﴿اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَ ہُمۡ﴾

جو لوگ (کہ) دی ہم نے انہیں کتاب (تورات) پہچانتے ہیں اسے جیسا کہ وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو۔

اَلَّذِیۡنَ، اسم موصول اس کا مفرد اَلَّذِی ہے (جو لوگ) اٰتَیۡنَا، دی ہم نے، (اٰتٰی، یُؤۡتِی، اِیۡتَاءٌ) عطا کرنا، ہُمۡ ضمیر جمع غائب (انہیں) الۡکِتٰبَ، 'ال' خاص کر دیتا ہے اس سے مراد تورات ہے، یَعۡرِفُوۡنَہٗ وہ اسے پہچانتے ہیں (عَرَفَ، یَعۡرِفُ، عُرۡفًا) جاننا، پہچاننا، ہٗ کی ضمیر خاتم النبیّن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے اور بعض کا خیال ہے کہ ضمیر کا مرجع علم، قرآن یا تحویل قبلہ ہے، کَمَا جیسا کہ، کلمہ تشبیہ ہے یَعۡرِفُوۡنَ، وہ پہچانتے ہیں مضارع جمع مذکر غائب، اَبۡنَآءَ ہُمۡ، (اَبۡنَآءَ. ہُمۡ) بیٹوں، اپنوں کو اِبۡنٌ کی جمع اَبۡنَاءٌ، ہُمۡ ضمیر جمع مذکر غائب، اس سے مراد قوم یہود ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''عربوں میں یہ محاورہ ہے کہ جس چیز کے متعلق انہیں کسی طرح کا شک وشبہ نہ ہو اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں: وہ اس بات کو یوں پہچانتا ہے جیسے اپنے بیٹے کو، علمائے یہود و نصاریٰ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ جن کی امت اور ملت ہونے کا یہ دم بھرتے ہیں، نے خانہ کعبہ تعمیر کیا اور اسے ہی قبلہ مقرر کیا تھا اور بیت المقدس تو تیرہ سو سال بعد حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کیا تھا، پھر بیت المقدس کو قبلہ قرار

دینے کا ذکر نہ کہیں تورات میں موجود ہے اور نہ ہی انجیل میں، اس تاریخی واقعہ میں ان کے لیے کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی اور وہ یہ بات بھی خوب جانتے ہیں کہ قبلہ اول اور حقیقی قبلہ، کعبہ ہی ہے لیکن وہ یہ بات عوام کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔'' (تیسیر القرآن، جلد اول)

محمد جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں:

''کہ اہل کتاب (یہود ونصاری) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح جانتے پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو، کہ بہت سے لوگوں کے درمیان بھی انہیں ان کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں آتی ہے، اس بات کی شہادت ان کی کتاب (تورات وانجیل) سے بھی ملتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ''یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ'' (الاعراف ۷:۱۵۷)

اس مکمل آیہ مبارکہ کا ترجمہ اس طرح ہے:

''وہ لوگ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو نبی اُمّی ہے، جس کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں اس (نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان یہ ہے کہ وہ ان کو نیک کاموں کا حکم فرماتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں اور سب پاک چیزیں ان کے لیے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق (حدود وقیود) جو ان پر (ان کی نافرمانیوں کے باعث) لگائے گئے تھے، اتار دیتے ہیں پس جو لوگ ان پر ایمان لے آئے اور ان کی تعظیم کی اور (نشر واشاعت دین میں) ان کی مدد کی اور اس نور ہدایت (قرآن) کی اتباع کی جو ان کے ساتھ اترا تھا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ساحل مراد سے ہمکنار ہوئے۔'' (تفسیر القاسمی، جلد اول)

﴿وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ﴾

اور تحقیق ایک فریق (گروہ) ان میں سے ہے جو ضرور بضرور حق کو چھپاتا ہے اور وہ جانتے ہیں۔

اِنَّ تحقیق کلام کے لیے استعمال ہوتا ہے، فَرِیْقًا، گروہ، فریق، مِّنْهُمْ (مِنْ. هُمْ) سے، ان یعنی ان میں سے لَیَكْتُمُوْنَ وہ ضرور چھپاتے ہیں (كَتَمَ، یَكْتُمُ، كِتْمَانٌ) چھپانا، کتمان حق، حق بات کو چھپانا، اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے لام زبر والا فعل کے شروع میں آجائے تو تاکیدی معنی پیدا ہوتے ہیں الْحَقَّ، سچ بات، قطعی دلائل سے ثابت شدہ بات کو حق کہتے ہیں وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ اور وہ جانتے ہیں، یعنی اہل

کتاب (یہود) میں سے ایک گروہ نے خاتم النبیّن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جان پہچان لیا اور تحویل قبلہ کی حقیقت کو بھی سمجھ لیا، مگر محض مخالفت اور ضد کی وجہ سے حق بات قبول کرنے سے انکار کرتے رہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''یہود اور دوسرے معاندین کا یہ اخفائے حق دانستہ اور ارادۃً تھا، اَلْحَقُّ، سے مراد یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مفصل و مکمل تعارف ہے جو تورات اور دوسرے الہامی نوشتوں میں موجود ہے، وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ اور وہ جانتے ہیں۔ اس ٹکڑے سے بھی واضح ہو گیا کہ یہ انکار کرنے والے عوام اور جہلاء یہود نہیں، ان کے علماء و اکابر تھے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ﴾

حق تیرے رب کی طرف سے ہے، پس نہ ہونا تم شک کرنے والوں میں سے۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ہو یا تحویل قبلہ کا معاملہ، یہ سب امور تیرے رب کی طرف سے حق ور درست ہیں فَلَا تَکُوْنَنَّ، (فَ.لَا) پس، نہ، تَکُوْنَنَّ، ہونا تم (کَانَ، یَکُوْنُ، کَوْنًا) ہونا، تَکُوْنُ، تم ہو، تشدید والی نون کو نون ثقیلہ کہتے ہیں اس سے جملے میں تاکید کے معنی پیدا ہوتے ہیں فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ۔ کے معنی یوں ہوئے کہ تم ہرگز ہرگز شک وشبہ میں نہ پڑنا، مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ شک کرنے والوں میں سے (اِمْتَرٰی، یَمْتَرِیْ، اِمْتِرَاءً) باب افتعال شک کرنا تردد میں پڑنا۔ اسم فاعل اَلْمُمْتَرِیْ اور اس کی جمع اَلْمُمْتَرُوْنَ مِنْ آنے کی وجہ سے ''اَلْمُمْتَرِیْنَ، ہو گیا۔

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) کتمانِ حق یعنی جانتے بوجھتے حق بات کو چھپانا بہت بڑا جرم ہے، ارشاد ہوتا ہے:

''جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں درآں حالیکہ ہم انہیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور (اس کی مخلوق میں) تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔'' (البقرہ ۲:۱۵۹)

۲) کتمانِ حق کے مرتکب بالعموم عوام نہیں بلکہ علماء ہوتے ہیں، اس لیے، ان کی سزا بھی انہیں زبردست ملتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''حق یہ ہے کہ جو لوگ ان احکام کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں

نازل کیے ہیں اور تھوڑے سے دنیوی فائدوں پر انہیں بھینٹ چڑھاتے ہیں، وہ دراصل اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں، قیامت کے روز، اللہ ہرگز ان سے بات نہ کرے گا، نہ انہیں پاکیزہ ٹھہرائے گا اور ان کے لیے دردناک سزا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے ضلالت خریدی اور مغفرت کے بدلے عذاب مول لے لیا، کیسا عجیب ہے ان کا حوصلہ کہ جہنم کا عذاب برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں'' (البقرہ:۱۷۴،۱۷۵)

۳) حق بات، رب کائنات کی طرف سے ہوتی ہے، لہٰذا اس پر جم جانا ہی سعادت مندی اور کامیابی کی راہ ہے، اور ادھر ادھر کسی تردد اور شک میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔

۴) یہ آیات موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے زبردست لمحہ فکریہ مہیا کرتی ہیں، خاص طور پر اسلامی حکومتوں کے سربراہ ان پر غور کریں، وہ قرآن کی واضح اور روشن تعلیمات کو چھوڑ کر کسی مداہنت اور چاپلوسی کا شکار نہ ہوں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قوت اور طاقت کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کا سہارا سب سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا، فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا، يَأْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۴۸) وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ، وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۱۴۹)	اور ہر ایک کے لیے ایک جہت ہے جس کی طرف وہ رخ کرتا ہے، سو تم نیک کاموں میں پیش قدمی کرو، تم جہاں بھی ہو گے، اللہ تم سب کو اکٹھا کر لائے گا، بلاشبہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور آپ کا گزر جس مقام سے بھی ہو، وہاں اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام (کعبہ) کی طرف پھیر لیجئے، کیونکہ یہ آپ کے رب کا بالکل برحق فیصلہ ہے اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾

اور واسطے ہر کسی کے ایک جہت ہے وہ رخ کرتا ہے اس کی طرف۔

وَلِكُلٍّ اور ہر ایک کے لیے۔ یہاں پر ہر ایک قوم یا امت مراد ہے، وِّجْهَةٌ وہ جگہ ہوتی ہے جس کی طرف ہم کسی مقصد کے لیے توجہ کرتے ہیں۔ (مفردات القرآن)

﴿هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾ وہ منہ پھیرتا ہے طرف اس کی۔

هُوَ، وہ ضمیر منفصل واحد مذکر غائب، مُوَلِّيْهَا (مُوَلِّیْ.هَا) منہ پھیرنے والا طرف اس کی۔ اس کی طرف، یہاں پر ھا کی ضمیر (جِهَةٌ) رخ کی طرف جاتی ہے۔

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ پس تم سبقت کرو، بھلائیوں (نیکیوں) کی طرف۔

فَاسْتَبِقُوْا۔ پس سبقت کرو (فَ، اِسْتَبِقُوْا) اِسْتَبَقَ، يَسْتَبِقُ (باب افتعال) فعل امر جمع مذکر حاضر افتعال کی وجہ سے اہتمام کا معنی پیدا ہوا (کسی چیز میں سبقت لے جانے میں اہتمام کرنا)۔

﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا﴾

جہاں کہیں (بھی) تم ہو گے، لے آئے گا تم کو اللہ تعالیٰ سب کے سب کو۔

اَيْنَ کلمہ استفہام، جگہ کو ظاہر کرتا ہے مَا کبھی جملہ کو مکمل کرنے کے لیے لایا جاتا ہے، تَكُوْنُوْا، تم ہو گے، اس کا مادہ (Root Word) (ک ون) ہے (كَانَ يَكُوْنُ كَوْنٌ) ہونا، فعل مضارع جمع مذکر حاضر، اصل میں تَكُوْنُوْنَ تھا، اس سے پہلے حرف شرط اَيْنَمَا استعمال ہوا ہے، اس لیے حالت جزم میں ہونے کی وجہ سے نون اعرابی گر گیا ہے، يَاْتِ (أَ،ت،ی) (أَتٰی، يَأْتِیْ، اِتْيَانٌ) آنا اور جب اس کے بعد 'ب' آ جائے تو معنی ہو جاتے ہیں 'لانا' يَأْتِیْ جواب شرط ہے، حالت جزم میں ہونے کی وجہ سے آخر سے حرف علت ''ی'' گر گیا اور يَاتِیْ کی بجائے يَاْتِ رہ گیا، بِكُمُ اللّٰهُ، تمہیں اللہ تعالیٰ (اکٹھا کر لائے گا)، جَمِيْعًا، سب کے سب، خواہ کسی بھی امت اور جماعت سے اس کا تعلق ہو، ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''اہل کتاب کی جتھے بندی اور خودغرضی بیان کرنے کے بعد قرآن مجید نے انہیں سیدھی راہ کی تلقین کی ہے اور بتایا ہے کہ سچائی ایک ہی ہے جو سب کو دی گئی تھی مگر گزشتہ امتوں نے اسے گم کر دیا، قبلہ کا مقرر ہونا دین کے بنیادی مسائل میں سے نہیں ہے کہ اسے حق و باطل کا معیار سمجھ لیا جائے، ہر امت کے لیے اپنا اپنا قبلہ ہے اور وہ (امت) اسی کی طرف رخ کر کے عبادت کرتی ہے، اصل چیز جو سمجھنے اور کرنے کی ہے، وہ ہے ''خیرات'' یعنی نیک کام، اس لیے اس میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرو اور اسے ہی دینداری کی اصل بنیاد سمجھو۔'' (درس قرآن، جلد اول)

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾

اور جہاں سے تو نکلے پس تو اپنے منہ کو مسجد حرام (کعبہ) کی طرف پھیر لے۔

حَيْثُ طرف مکان، خَرَجْتَ، ماضی واحد مذکر حاضر (خَرَجَ، يَخْرُجُ، خُرُوْجًا) نکلنا، فَوَلِّ (فَ.وَلِّ) پس تو پھیر لے فعل امر صیغہ واحد مذکر (وَلّٰى، يُوَلِّيْ، تَوْلِيَةٌ) باب تفعیل، پھیرنا، وَجْهَكَ (وَجْهَ.كَ) چہرہ، اپنا شَطْرَ سمت، طرف الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، حرمت والی مسجد (خانہ کعبہ) ﴿وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ اور وہ ضرور حق ہے تیرے رب کی طرف سے، لَلْحَقُّ اس پر لام تاکید ہے یعنی یہ بات ثابت شدہ ہے، اس میں نسخ اور تبدیلی کا امکان نہیں ہے اِنَّهٗ میں ضمیر حکم استقبال کعبہ کی طرف ہے۔ (تفسیر ماجدی)

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ اور اللہ غافل نہیں اس چیز سے جو تم کرتے ہو۔

وَمَا اللّٰهُ اور نہیں اللہ تعالیٰ بِغَافِلٍ، غافل 'ما' نافیہ کے بعد 'ب' استعمال ہوا ہے عربی زبان میں 'ما' نافیہ کے بعد 'ب' کا استعمال نفی میں شدت پیدا کر دیتا ہے عَمَّا (عَنْ. مَا) اس سے۔ جو، تَعْمَلُوْنَ تم عمل کرتے ہو۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) اسلام ابدی اور حقیقی صداقتوں کی طرف توجہ دلاتا ہے..... اور وہ نیکیاں اور بھلائیاں ہیں جن کی طرف بڑھنا اور دوڑ لگانا ہے اور نماز پڑھنے کا بھی اصل مقصد برائیوں سے بچ کر زندگی کی پاکیزہ شاہراہ پر چلنا ہے۔

۲) اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) تعصب اور ضد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، حق کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے تھے، ہمیشہ مسلمانوں کے دلوں میں شک ڈالتے، شرارتوں اور سازشوں میں پیش پیش رہتے، یہ لوگ اپنے دین کی تعلیمات سے غافل ہو کر معمولی معمولی مسائل میں الجھنیں پیدا کرتے اور کچھ نہیں تو وہ قبلے کا سوال ہی لے بیٹھتے، حالانکہ وہ ایسا اہم نہیں کہ اس بحث میں اپنے عزیز وقت کو ضائع کیا جائے اور زندگی کے اصل مقصد سے توجہ ہٹالی جائے۔

۳) قبلہ کی طرف رخ کرنا اصل کام نہیں ہے، اصل کام تو اعمال صالحہ میں آگے بڑھنا ہے، اگر امت کا اجتماع نیکی پر ہوگا اور وہ زندگی میں نیکی کو شامل کرلیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سب کو ایک مرکز پر جمع کردے گا، اختلافات ختم ہو جائیں گے اور مخالفین مٹ جائیں گے۔

۴) امت مسلمہ بھی فروعی مسائل سے صرف نظر کر کے دین کی اصل کی طرف لوٹے اور اسے غالب کرنے کے لیے اپنی تمام مساعی بروئے کار لائے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ، اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ، فَلَا تَخْشَوْهُمْ، وَاخْشَوْنِيْ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۱۵۰)	اور (اے رسول ﷺ) آپ جس جگہ بھی تشریف لے جائیں (بوقت نماز) اپنا رخ مسجد الحرام (کعبہ) کی طرف کر لیجئے اور (اے مسلمانو!) جس جگہ بھی تم ہوا کرو تم بھی اسی سمت (بوقت نماز) اپنا منہ پھیر لیا کرو تا کہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ ملے۔ ہاں ان میں سے جو ظالم ہیں، ان کی زبان کسی حال میں بند نہ ہوگی، تو ان سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو..... اور اس لیے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کردوں اور تا کہ تم راہِ حق پا جاؤ۔

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾

اور جہاں سے آپ نکلیں تو پھیر لیں چہرہ اپنا طرف مسجد حرام کی۔

حَيْثُ، ظرف مکان، خَرَجْتَ آپ نکلیں (خَرَجَ، يَخْرُجُ، خُرُوْجًا) نکلنا، فَوَلِّ، پس پھیر لیجئے فعل امر، واحد مذکر حاضر (وَلّٰى، يُوَلِّيْ، تَوْلِيَةٌ) پھیرنا، وَجْهَكَ (وجه.ک) چہرہ اپنا، شَطْرَ سمت، طرف، الْمَسْجِدِ الْحَرامِ (حرمت والی مسجد، خانہ کعبہ)۔

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾

اور جہاں کہیں بھی تم ہو پھیر لو اپنے چہروں کو اس (مسجد حرام) کی طرف۔

وَحَيْثُ مَا، جس جگہ، ظرف مکان، كُنْتُمْ ہو تم، ماضی جمع مذکر مخاطب (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا فَوَلُّوْا فعل امر جمع مذکر تم پھیر لو (وَلّٰى، يُوَلِّيْ، تَوْلِيَةٌ) پھیرنا، وُجُوْهَكُمْ (وُجُوْهَ.كُمْ) چہرے اپنے، شَطْرَهٗ طرف اس کی، هٗ کی ضمیر مسجد حرام کی طرف جاتی ہے۔

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ﴾ تا کہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی حجت نہ ملے۔

لِئَلَّا (لِ.اَنْ.لَّا) تا کہ یہ، نہ (يَكُوْنَ) ہونا (كَانَ يَكُوْنُ كَوْنًا) لِلنَّاسِ (لِ.النَّاسِ) لوگوں کے لیے عَلَيْكُمْ (عَلٰى.كُمْ) تمہارے خلاف حُجَّةٌ، (حجت اور دلیل)۔

سید مودودی لکھتے ہیں:

''یعنی ہمارے اس حکم کی پوری پابندی کرو، کبھی ایسا نہ ہو کہ تم میں سے کوئی شخص مقررہ سمت کے سوا کسی دوسری سمت کی طرف نماز پڑھتے دیکھا جائے، ورنہ تمہارے دشمنوں کو تم پر یہ اعتراض کرنے کا موقع مل جائے گا کہ کیا خوب امت وسط ہے کیسے اچھے حق پرستی کے گواہ بنے ہیں۔ جو یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ یہ حکم ہمارے رب کی طرف سے آیا ہے اور پھر اس کی خلاف ورزی بھی کیے جاتے ہیں۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''اس شد و مد اور اس تاکید و تنبیہ کے ساتھ اندر اور باہر، سفر اور حضر، ہر جگہ اور ہر صورت میں بیت اللہ

ہی کی طرف رخ کرنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے، یہ کوئی سرسری اور سطحی حکم نہیں ہے، بلکہ نہایت عظیم مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی حکم ہے اگر اس کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھنے میں تم نے ذرا بھی سہل انگاری سے کام لیا اور اس سہل انگاری کے سبب سے ایک قدم بھی غلط اٹھ گیا تو تمہارا سارا سفر ہی ایک غلط سمت میں ہو جائے گا۔ اس وجہ سے ان کا پورا پورا اہتمام کرو اور ان کی حکمتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لو وہ حکمتیں آیہ مبارکہ کے بقیہ حصہ میں بیان ہوئی ہیں۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِیۡ وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکُمۡ وَلَعَلَّکُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ﴾

مگر جنہوں نے ظلم کیا تو ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو تا کہ تم پر میں اپنی نعمتیں پوری کروں اور تا کہ تم ہدایت پا لو۔

اِلَّا کلمہ استثنا، الَّذِیۡنَ اسم موصول وہ لوگ، ظَلَمُوۡا فعل ماضی صیغہ جمع مذکر غائب (ظَلَمَ، یَظۡلِمُ، ظُلۡمًا) ظلم کرنا، ظلم کرنے والے لوگ کون تھے؟ وہ جنہوں نے دعوتِ اسلام کو ٹھکرا دیا اور حق کو پس پشت ڈال دیا (ایسے لوگ ہر وقت مسلمانوں کو تکلیف دینے اور زک پہنچانے پر کمر بستہ رہتے ہیں) فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ، ان سے مت ڈرو، فعل نہی جمع مذکر مخاطب (خَشِیَ، یَخۡشٰی، خَشۡیَةً) ڈرنا، خوف کھانا وَاخۡشَوۡنِیۡ پس صرف مجھ سے ڈرو، فعل امر، جمع مذکر وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکُمۡ ، وَ۔ اور (لِ. اُتِمَّ) تا کہ میں پوری کروں (اَتَمَّ، یُتِمُّ، اِتۡمَامًا) پورا کرنا، لام کی وجہ سے اُتِمَّ آیا ہے نِعۡمَتِیۡ اپنی نعمت (عَلٰی. کُمۡ) اوپر تمہارے، وَ (لَعَلَّ. کُمۡ) اور تا کہ۔ تم، تَهۡتَدُوۡنَ تم ہدایت پا جاؤ (اِهۡتَدٰی، یَهۡتَدِی، اِهۡتِدَاءٌ) ہدایت پانا، راہ یاب ہونا، باب افتعال ہے، قطع حجت سے مراد یہ ہے کہ اہل کتاب بالخصوص یہود کے لیے بات بات میں تمہارے اوپر گرفت کرنے اور تمہارے خلاف بدگمانی پھیلانے کے لیے کوئی موقع باقی نہ رہ جائے۔

مولانا امینؒ احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

''اِتمامِ نعمت سے مراد تکمیلِ دین کی وہ نعمت ہے جس کی پیش گوئی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے اس امت کے بارے میں فرمائی تھی اور جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے اس وقت فرمایا تھا جب وہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے، اس وقت ان سے یہ وعدہ کیا

گیا تھا کہ اس بیٹے کی نسل سے ایک عظیم امت پیدا ہوگی جس سے تمام دنیا کی قومیں دین کی برکت پائیں گی چنانچہ ان ہی کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لیے آخری ہادی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا جن کا قبلہ وہ بیت اللہ قرار پایا جو تمام عالم کے لیے سرچشمۂ خیر و برکت اور تکمیل دین کا مرکز ٹھہرایا گیا تھا۔ راہ یابی سے مراد ہے، اس صراط مستقیم کی راہ یابی جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والی سیدھی اور فطری راہ ہے جس کے متعلق فرمایا گیا:

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (الانعام:۱۶۱)

''کہہ دیجئے کہ میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی ہے فطری دین۔ ملت ابراہیم کی طرف جو بالکل یکسو تھا'' (تدبر قرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) بیت اللہ کو قبلہ بنانا اس لیے ہے کہ ایک عالمگیر اخوت (International Brotherhood) قائم کر کے اسے عالمی مرکز قرار دیا جائے کہ مقصد کی یکسانیت کے لیے مرکز کا ہونا لازمی امر ہے، اس سے نہ صرف نظم و ضبط کا مظاہرہ ہوتا ہے بلکہ اقوام عالم کے مسلمان (اپنے نمائندہ کے ذریعے) وہاں جمع ہو کر اپنے معاشی، معاشرتی، ملی اور سیاسی مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ (مگر افسوس کہ ہماری بے حسی کی وجہ سے ایسا ہو نہیں رہا)۔

۲) مگر اصل اور بنیادی بات وہی ہے جس کی ترغیب آیت ۱۴۸ میں دلائی گئی ہے کہ اعمال خیر میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی جدوجہد کرو کہ یہی زادراہ تمہاری کامیابی کی ضمانت بنے گا۔

۳) مسلمانوں کو تحویل قبلہ کے حکم پر عمل کرنے کے لیے سختی سے کہا جا رہا ہے تاکہ کہیں ان سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہو جائے جو اسلام کے دشمنوں یہود و نصاریٰ کو ان کے خلاف بطور دلیل ہاتھ آ جائے اور وہ ان کی دعویداری اور عملی صورتِ حال کو موردِ الزام ٹھہرا کر پراپیگنڈے کا ایک اور طوفان کھڑا کر دیں۔

۴) لیکن کچھ زبانیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جن کو بند نہیں کیا جا سکتا مگر ان سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، خوف صرف اللہ تعالیٰ سے ہونا چاہیے۔

۵) اللہ کے ان احکام کی بجا آوری کا صلہ اللہ کی طرف سے یہ ملے گا کہ وہ مسلمانوں پر اپنی نعمتوں کی تکمیل فرمائے گا اور انہیں ہدایت سے نوازے گا اور یہ کس قدر خوش بختی کی بات ہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۱۵۱)	جیسے کہ ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول (خاتم النبیّن) بھیجا جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے، تمہیں تزکیہ نفس کی تربیت دیتا ہے اور کتاب وحکمت سکھلاتا ہے اور وہ کچھ سکھلاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ﴾

جیسے کہ ہم نے بھیجا تم ہی میں سے ایک رسول (خاتم النبیّن محمد ﷺ)۔

كَمَآ کا تعلق ماقبل آیت لِاُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ (تاکہ میں اپنی نعمت تم پر مکمل کردوں) سے ہے، جس طرح کعبہ کا قبلہ مقرر کیا جانا، اللہ کی طرف سے ایک انعام تھا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اس نعمت کی تکمیل کردی گئی۔ اس کا ذکر قرآن حکیم کی اس آیہ مبارکہ میں بھی ہوا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (ال عمران:۱۶۴) ''در حقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر بھیجا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے۔ ان کا تزکیہ نفس فرماتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔''

اَرْسَلْنَا ہم نے بھیجا، فعل ماضی جمع متکلم (اَرْسَلَ، يُرْسِلُ، اِرْسَالًا) باب افعال، فِيْكُمْ (فِي. كُمْ) تم میں، رَسُوْلًا رسول، مِّنْكُمْ (مِنْ. كُمْ) تم، سے یعنی تمہاری قوم اور قبیلے میں سے، مراد جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق بنو ہاشم سے تھا۔

﴿يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ﴾

جو تلاوت کرتا ہے تمہارے اوپر ہماری آیات اور تمہارا تزکیہ فرماتا ہے۔

(تَلَا، یَتْلُوْا، تِلَاوَۃً) پیچھے پیچھے آنا، تلاوت کرنا، قرآن حکیم کو اس طرح پڑھنا کہ اس کے معنی پیچھے پیچھے چلے آئیں، محض پڑھنے کو قرأت کہتے ہیں، تلاوت پورے فہم وشعور سے پڑھنے اور احکام کو حرز جاں بنانے کا نام ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ (البقرہ:۱۲۱) ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اسے یوں پڑھتے ہیں جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے (حقیقت میں) یہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں''۔

عَلَیْکُمْ (عَلٰی. کُمْ) اوپر۔ تمہارے، اٰیٰتِنَا (اٰیات.نا) ہماری آیات، وَ یُزَکِّیْکُمْ (یُزَکِّیْ. کُمْ) تزکیہ کرتا ہے تمہارا فعل مضارع واحد مذکر غائب (زَکّٰی، یُزَکِّیْ، تَزْکِیَۃً) تزکیہ کرنا باب تفعیل ہے۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: ''اور تزکیہ نفس ہی سے انسان دنیا میں اوصاف حمیدہ کا مستحق ہوتا ہے اور آخرت میں اجر وثواب بھی اسی کی بدولت حاصل ہوگا اور تزکیہ نفس کا طریق یہ ہے کہ انسان ان باتوں کی کوشش میں لگ جائے جن سے طہارت نفس حاصل ہوتی ہے۔

فعل تزکیہ کی نسبت کبھی تو انسان کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وہ اسے کوشش سے حاصل کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا (الشّمس۹۱:۹،۱۰) ''کامیاب ہوا، جس نے نفس کا تزکیہ کیا (اچھے اخلاق سے سنوار لیا) اور نامراد ہوا وہ جس نے (برے اخلاق سے) اسے گھٹیا بنایا''۔

کبھی یہ اللہ کی طرف منسوب ہوتا ہے کیونکہ فی الحقیقت وہی اس کا فاعل ہے، ارشاد ہوتا ہے: بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ (النساء۴:۴۹) ''بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پاکیزہ بناتا ہے''۔

اور کبھی اس کی نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے جیسا کہ اوپر کی آیہ مبارکہ میں ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی انسان کوشش کر کے سنت کی پیروی میں دین کی طرف بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں ڈھانپ کر اسے برکت عطا فرماتا ہے۔ (مفردات القرآن)

﴿وَ یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ﴾

اور وہ کتاب وحکمت سکھلاتا ہے۔

(عَلَّمَ، یُعَلِّمُ، تَعْلِیْمًا) باب تفعیل، تعلیم دینا، اَلْکِتٰبَ (القرآن) اَلْ خاص کتاب کی طرف اشارہ

ہے، وَالْحِكْمَةَ دانائی کی باتیں، مفسرین نے اس کے معانی علم، نبوت اور سنت کے لیے ہیں، ﴿وَيُعَلِّمُكُمْ﴾ اور وہ تمہیں سکھاتا ہے۔ ﴿مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾ جو تم نہیں جانتے تھے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے زندگی کو نیا رخ ملا، ایمان اور اسلام کی دولت سے زندگی پستیوں سے ابھر کر بلندیوں سے ہمکنار ہوئی۔ بقول سید قطبؒ شہید: ''اسلام زندگی کو ظلم وستم، سرکشی اور زیادتی سے پاک کرتا ہے اور صاف ستھرے انصاف کو سماج میں عام کرتا ہے، ایسے صاف ستھرے اور عام انصاف سے انسان کبھی اس طرح فیض یاب نہیں ہوا جس طرح وہ اسلام کے زیر سایہ اور اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے تحت متمتع اور فیض یاب ہوتا ہے۔''

۲) یہ علم وبصیرت، یہ حکمت ودانش، یہ تزکیہ وطہارت اور دنیا وآخرت کی فلاح و بہبود کو چھوڑ کر آج مسلمان ذلیل وخوار ہو رہا ہے، اسے تو ''خیر امت'' کے لقب سے نوازا گیا تھا کیونکہ اس کے ذمہ عالم انسانیت کی رہبری ورہنمائی تھی، مگر یہ خود خواہشات کی پیروی میں بھٹک رہا ہے، دوسروں کی رہنمائی تو کجا خود ہی گم گشتہ راہ ہے، اسے عظمت رفتہ صرف قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی سے مل سکتی ہے۔

فَاذْكُرُونِيٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (۱۵۲)	(رب کریم کا ارشاد ہے) تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرتے رہو اور کفران نعمت نہ کرو

فَاذْكُرُوْنِيٓ (فَ. اذْكُرُوْ. نِيْ) پس، یاد کرو، مجھے، (ذَكَرَ، يَذْكُرُ، ذِكْرًا) ذکر کرنا، یاد رکھنا، اس سے فعل امر اُذْكُرْ اور جمع کا صیغہ اُذْكُرُوْا تم سب یاد رکھو۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

''ذکر حفظ کے ہم معنی ہے مگر حفظ کا لفظ اِحراز (بچائے رکھنا) کے لحاظ سے بولا جاتا ہے جبکہ ذکر اِستِحضَار (یاد، یادداشت) کے معنوں میں آتا ہے۔'' (مفردات القرآن)

قرآن حکیم میں ذکر کا استعمال اس طرح ہوا ہے:

۱- اطاعت:- جیسا کہ مندرجہ بالا آیۂ مبارکہ میں ارشاد ہوا:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (پس تم میری یاد کرو، میں تمہاری یاد کروں گا) "ایْ اُذْكُرُوْنِي بِالطَّاعَةِ وَاَطِيْعُوْنِ اَذْكُرْكُمْ بِخَيْرٍ" یعنی تم میری اطاعت اور فرمانبرداری سے مجھے یاد رکھو، میں تمہیں خیر و فلاح عنایت کر کے تمہیں یاد رکھوں گا۔

۲- ذکر باللسان:- (زبان سے ذکر) جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (الاعراف ۷:۲۰۵) ''(اے نبی ﷺ) اپنے رب کو صبح شام یاد کیا کرو، دل ہی دل میں عاجزی وانکساری کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ اور تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں''۔

۳- ذکر بالقلب:- (دل سے ذکر) جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ، فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ (ال عمران ۳:۱۳۵) ''(اللہ والوں) کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو فوراً اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنی خطاؤں کی معافی چاہتے ہیں کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو''۔

۴- تذکرہ:- (کسی کی یاد) جیسا کہ فرمایا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ، اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (مریم ۱۹:۴۱) ''اور اس کتاب (قرآن) میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کیجئے بلاشبہ وہ ایک راست رو انسان اور ایک سچے نبی تھے۔''

۵- حفظ:- (حفاظت ونگہبانی)

خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الاعراف ۷:۱۷۱)

''جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی سے تھامو اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو، توقع ہے کہ تم پرہیزگار بن جاؤ گے۔''

۶- ذکر: بمعنی نصیحت: جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (قٓ ۵۰:۴۵)

''تو آپ اس قرآن کے ذریعے سے ہر اس شخص کو نصیحت کیجئے جو میری تنبیہ سے ڈرے''۔

۷- ذکر بمعنی شرف: (عزت وشرف)

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (الانبیاء ۲۱:۱۰)

''لوگو! ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو''۔

۸- ذکر بمعنی خبر: (خبر اور اطلاع) فرمایا:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ، قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا (الکھف ۱۸:۸۳)

''(اے نبی ﷺ) یہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں، ان سے کہئے میں اس کا کچھ حال تمہیں سناتا ہوں''۔

۹- ذکر بمعنی وحی: سورۃ الصّٰفّٰت میں ارشاد ہوتا ہے:

فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا (الصّٰفّٰت ۳۷:۳) ''پھر (وہ فرشتے) جو (قرآن) پڑھتے ہیں''۔

۱۰- ذکر بمعنی قرآن:

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ (الانبیاء ۲۱:۵۰)

''اور یہ بابرکت ذکر (قرآن حکیم) ہم نے نازل کیا۔''

اسی طرح 'تورات' (جو کہ آسمان سے نازل ہوئی نہ کہ اس تحریف شدہ نسخہ) کو بھی ذکر کہا گیا ہے۔

۱۱- ذکر بمعنی صلوۃ: (نماز) سورۃ طٰہٰ میں ارشاد ہوا:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِى (طٰہٰ ۲۰:۱۴) ''اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔''

پھر ارشاد ہوا: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (النور ۲۴:۳۷) ''(ایسے پاکباز بھی ہیں) جنہیں تجارت اور خرید وفروخت یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرتی (بلکہ نمازوں کے اوقات میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی جبینِ نیاز رب کریم کی چوکھٹ پر جھکا دیتے ہیں)''۔

معلوم ہوا کہ دل اور زبان سے تلاوتِ قرآن اور اقامتِ صلوٰۃ سے احکام الٰہی کی اطاعت اور فرمانبرداری ذکر کی ادائیگی کی مختلف شکلیں ہیں، اس کا ثمرہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سے کیا ملتا ہے، فرمایا:

﴿اَذْکُرْکُمْ﴾ (اَذْکُرْ. کُمْ) یاد کروں گا میں تم کو (سبحان اللہ!) رب کریم کا اپنے بندوں پر کیا لطف واحسان ہے وہ اپنے ان بندوں کی ہر طرح حفاظت فرماتا ہے اور انہیں دنیا وآخرت کی کامیابیوں سے ہمکنار فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ کی یاد کا لازمی نتیجہ شکر سے ظاہر ہونا چاہیے، حکم ہوتا ہے:

﴿وَاشْکُرُوْا لِیْ﴾ اور شکر کرو میرے لیے فعل امر جمع مذکر (شَکَرَ، یَشْکُرُ، شُکْرًا) شکر ادا کرنا، احسان مند ہونا، وَلَا تَکْفُرُوْنَ مضارع جمع مذکر مخاطب فعل نہی اور تم کفر نہ کرو میرا (کَفَرَ، یَکْفُرُ، کُفْرًا) چھپانا، پردہ ڈالنا، نعمتوں کو فراموش کرنا، ناشکری کرنا۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی یاد ہی سے دنیا وآخرت کی فوز وفلاح ممکن ہے، اور یاد کا بہترین طریقہ نماز کو پابندی اور خشوع وخضوع سے ادا کرنا، تلاوت قرآن (غور وفکر کے ساتھ) احکام الٰہی کی ادائیگی دل وجان سے اور فرائض کو پورا کرنا، ہوش وحواس سے۔

۲) یاد الٰہی سے نہ صرف کوئی شخص نفس کی خباثتوں اور شرارتوں سے بچ جاتا ہے بلکہ شیطان اور اس کے لاؤ لشکر سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ رب کریم کا فرمان ''اَذْکُرْکُمْ'' میں تمھیں یاد رکھوں گا، ہمیں مژدہ جانفزا سنا رہا ہے کہ وہ ہمیں اپنے سایۂ رحمت میں یقیناً چھپا لے گا اور کوئی بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔

۳) نعمتوں پر شکر مزید انعامات کا باعث بنتا ہے، ارشاد ہوتا ہے: لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (ابراہیم:۷) ''اگر تم شکر کرو گے تو میں اور زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو (جان رکھو) میرا عذاب سخت ہے''۔

۴) ذکر وشکر کی توفیق بھی اسی سے طلب کیجئے، رسول اللہ ﷺ کی یہ دعا ہر فرض نماز کے بعد پڑھتے رہیے: رَبِّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَ شُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ ''اے پروردگار مجھے توفیق عطا فرما اپنے ذکر، شکر اور اچھی (خوبصورت) بندگی کی''۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۵۳)	اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے (اللہ تعالیٰ کی) مدد چاہو (یاد رکھو) اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا، اے وہ (لوگو!) حرف ندا، الَّذِيْنَ، جو، اٰمَنُوْا ایمان لائے، منادیٰ (جسے بلایا جائے) اسْتَعِيْنُوا تم سب مدد چاہو، فعل امر جمع مذکر (اِسْتَعَانَ، يَسْتَعِيْنُ اِسْتِعَانَةً) باب استفعال مدد طلب کرنا، بِالصَّبْرِ (بِ. الصَّبْرِ) ساتھ، صبر کے، وَالصَّلٰوةِ، اور نماز (کے) اِنَّ اللّٰهَ بلاشبہ اللہ تعالیٰ، مَعَ، ساتھ ہے الصّٰبِرِيْنَ صبر کرنے والے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مدد صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''منصب امامت پر مامور کرنے کے بعد اب اس امت کو ضروری ہدایات دی جا رہی ہیں، مگر تمام دوسری باتوں سے پہلے انہیں جس بات پر متنبہ کیا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ کوئی پھولوں کا بستر نہیں ہے، جس پر آپ حضرات لٹائے جا رہے ہوں یہ تو ایک عظیم الشان اور پر خطر خدمت ہے، جس کا بار اٹھانے کے ساتھ ہی تم پر ہر قسم کے مصائب کی بارش ہوگی، سخت آزمائشوں میں ڈالے جاؤ گے، طرح طرح کے نقصانات اٹھانے پڑیں گے اور جب صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کی راہ میں بڑھے چلے جاؤ گے، تب تم پر عنایات کی بارش ہوگی۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''قرآن مجید میں 'صبر' کا ذکر بار بار اور بہت زیادہ آیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہے کہ مختلف میلانات و محرکات کی کشاکش کے درمیان راہ حق پر استقامت کے لیے عظیم جدوجہد درکار ہے، اسی طرح مصائب و آلام اور دشوار گزار مراحل کے درمیان دعوت الی اللہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا صبر آزما اور بہت زیادہ سعی و عمل کا طالب ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ مومن کے اعصاب مضبوط اور اس کے قویٰ مجتمع اور محکم ہوں اور مومن مختلف وادیوں میں داخل ہونے اور باہر آنے کی سب راہوں سے اچھی طرح

آگاہ اور ہوشیار و بیدار ہو، ان سب امور کے سلسلے میں 'صبر' درکار ہے۔ اطاعاتِ الٰہی پر صبر، معصیتوں سے اجتناب پر صبر، اللہ کے باغیوں سے جہاد پر صبر، حق کے خلاف مختلف سازشوں کے سلسلے میں صبر! حامیانِ حق کی قلتِ تعداد پر صبر، پرخطر و پرخار راستے کی درازی پر صبر اور نفوس کی کجی، قلوب کی گمراہی، مخالفت و عناد اور حق سے روگردانی کی تلخی پر صبر۔

لیکن جب یہ مدت طویل اور اس کی جدوجہد زیادہ پر مشقت ہو جاتی ہے تو صبر ختم ہونے یا کمزور پڑنے لگتا ہے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب زادِ راہ نہ ہو یا انسان کو مدد نہ ملے، اسی لیے 'صبر' کے ساتھ نماز کو جوڑ دیا گیا۔ نماز وہ چشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا، اور یہ وہ زادراہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا، وہ چشمہ ہے جس سے انسان کو از سرِ نو توانائی میسر آتی ہے اور وہ زادراہ ہے جو دل کو غذا اور تقویت بخشتا ہے اس طرح صبر کی رسی دراز ہوتی ہے اور ٹوٹنے نہیں پاتی، یہی نہیں بلکہ نماز کے ذریعہ مومن کو صبر کے علاوہ بشاشت، طمانیت، اعتماد اور یقین کی نعمتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔

فانی، ضعیف اور محدود قوت کے حامل انسان کے لیے ناگزیر ہے کہ عظیم ترین اور لازوال قوت (اللہ تعالیٰ) سے ربط و تعلق قائم کرے، اور جب حق کے لیے جدوجہد اور محنت و مشقت اس کی محدود قوت سے متجاوز ہو جائے تو اس (ذات حق) سے مدد حاصل کرنے میں لگ جائے۔ یہ استعانت اس وقت ضروری ہوتی ہے جب مومن کو شر کی کھلی اور چھپی تمام طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ جب خواہشات کی تحریک اور مفادات کی طمع کے درمیان راہ حق پر استقامت کی جدوجہد اس کے لیے ایک بوجھل کام بن جائے، جب شر اور طغیان کی شدید طاقتوں سے جہاد اس کے لیے گراں ہو جائے، جب اسے اپنی محدود عمر کے پیش نظر راہ حق طویل اور سفر دشوار نظر آئے، جب وہ دیکھے کہ وہ موت کے قریب آ لگا ہے مگر وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکا ہے، اس کی عمر کا آفتاب غروب ہوا چاہتا ہے مگر وہ کچھ بھی حاصل نہ کر سکا، جب وہ دیکھتا ہے کہ شر پھل پھول رہا ہے اور خیر اس کے برعکس لاچار و ناتواں ہے اور افق میں روشنی کی کوئی کرن اور کوئی نشانِ راہ نظر نہیں آتا.....تب نماز کی قدر و قیمت واضح ہوتی ہے، نماز فانی انسان اور باقی رہنے والی قوت (رب العالمین) کے مابین براہ راست تعلق ہے۔ یہ وہ سرچشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا اور مومن کے لیے سیراب ہونے کا بہترین موقع ہے۔ یہ اس خزانے کی کنجی ہے جس کی دولت اور جس کے بے پناہ فیضان سے انسان ہمہ وقت مالا مال ہوتا ہے۔ یہ حقیر ارضی حدود سے اوپر اٹھ کر عظیم

کائناتی اور آفاقی حدود سے انسان کا ربط و تعلق ہے، یہ دوپہر کی شدید تمازت میں ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا، ٹھنڈک اور آرام دہ سایہ کی مانند ہے، یہ غمگین اور تھکے دل کے لیے محبت و رحمت کا جھونکا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدتِ حالات سے دوچار ہوتے تو فرماتے ''اے بلالؓ! نماز سے ہمیں راحت و آرام پہنچاؤ۔''

جب آپ ﷺ کسی پریشانی میں مبتلا ہوتے تو کثرت سے نمازیں پڑھتے تاکہ اللہ سے آپ ﷺ کا زیادہ سے زیادہ قرب ہو اور اس کی رحمت سے بہرہ ور ہو سکیں۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) اسلامی نظام حقیقۃً نظام عبادت ہے، یہ صرف صوم و صلوٰۃ تک محدود نہیں، بلکہ زندگی کے ہر معاملہ اور ہر میدان میں رب کائنات کی بندگی اور اطاعت کا نام ہے۔ یہی بندہ مومن کے لیے زادراہ ہے اور جب بھی اس پر کوئی ذمہ داری اور تکلیف آتی ہے، عبادت اس کے دل کی کلید بنتی ہے تاکہ وہ اس دکھ اور تکلیف کے لمحات میں حلاوت اور شیرینی، آسانی اور خوشگواری کا مزہ پالے۔ اس کو مثال سے یوں سمجھئے کہ موسم گرما کی شدت میں روزہ دار نے صبر کے ساتھ پورے حزم و احتیاط سے اپنا روزہ پورا کیا اور بوقت افطار ٹھنڈے میٹھے مشروبات اس کے لیے راحت جان بنتے ہیں۔

۲) اسلام کی زریں تعلیمات ہمیں بتاتی ہیں کہ ہجوم مشکلات کے وقت ثابت قدم رہیں اور کسی گھبراہٹ اور پریشانی کو قریب بھی نہ پھٹکنے دیں۔ صبر اور نماز ہمارے دلوں کو مضبوط اور توانا بنادیں گے۔ صبر ایک سلبی کیفیت ہے اور صلوٰۃ ایک ایجابی عمل۔ ان دو کلیدی لفظوں (صبر و نماز) سے اشارہ ہو گیا کہ انفرادی اصلاح اور اجتماعی فلاح ان دونوں کی کامیابی کا راز (مشکلات کے وقت) انہی دو باتوں میں مضمر ہے۔ کیا امت مسلمہ (جس پر اس وقت نکبت و ادبار کی گھٹائیں چھا رہی ہیں) ان سنہری اصولوں پر توجہ دے گی؟

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ، بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۱۵۴)	''اور جولوگ اللہ کی راہ میں قتل کردیے جائیں، انہیں مردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔''

وَلَا تَقُوْلُوْا، اور نہ کہو تم، فعل نہی جمع مذکر مخاطب (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، **لِمَنْ** (لِ. مَنْ) واسطے، ان کے یعنی ان لوگوں کو، **يُّقْتَلُ**، جو قتل کردیے جائیں (شہید کردیے جائیں) مضارع مجہول صیغہ واحد مذکر غائب (قَتَلَ، يَقْتُلُ، قَتْلًا) قتل کرنا، اس سے مجہول کا صیغہ يُقْتَلُ قتل کیا جائے، شہید کیا جائے، **فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ**، اللہ کی راہ میں، یعنی جو اپنی جانیں اور اپنا مال اللہ کی راہ میں لٹادیں، **اَمْوَاتٌ**، بے جان، مردہ یعنی اللہ کی راہ میں شہادت پانے والوں کے لیے 'مرے ہوئے' یا 'مردہ' کے الفاظ استعمال نہ کرو، **بَلْ اَحْيَآءٌ**، بلکہ وہ زندہ ہیں **وَّلٰكِنْ** اور لیکن، **لَّا**، نہیں، **تَشْعُرُوْنَ**، تم شعور رکھتے ہو، صیغہ جمع مذکر مخاطب (شَعَرَ، يَشْعُرُ، شُعُوْرًا) سمجھنا، جاننا، غور کرنا، بذریعہ حواس جاننے کو شعور کہتے ہیں۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''موت کا لفظ اور اس کا تصور انسان کے ذہن پر ایک ہمت شکن اثر ڈالتا ہے، اس لیے اس بات سے منع کیا گیا کہ شہداء فی سبیل اللہ کو مردہ کہا جائے، کیونکہ اس سے جماعت کے لوگوں میں جذبۂ جہاد وقتال اور روح جاں فروشی کے سرد پڑ جانے کا اندیشہ ہے، اس کی بجائے ہدایت کی گئی کہ اہل ایمان اپنے ذہن میں یہ تصور جمائے رکھیں کہ جو شخص خدا کی راہ میں جان دیتا ہے وہ حقیقت میں حیاتِ جاوداں پاتا ہے، یہ تصور مطابقِ واقعہ بھی ہے اور اس سے روحِ شجاعت بھی تازہ ہوتی اور تازہ رہتی ہے''۔ (تفہیم القرآن، جلد اول)

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''اب جبکہ مدینہ میں امت مسلمہ اللہ کے بھیجے ہوئے نظامِ زندگی کو زمین میں قائم و برپا کرنے، اپنے رول کو، جو اس کے لیے اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے ضروری ہے، اس کے نفاذ میں اور پرچم اسلامی کو بلند کرنے اور اسے اٹھائے ہوئے ایک پر مشقت اور طویل راہ کا سفر جس کے لیے پیہم اور مسلسل جدوجہد جاری وساری ہے، قرآن اس (امت) کی روحانی تربیت کرتا ہے۔ اس جہاد کے دوران جو کشمکش ہوگی، جو

قربانیاں دینی ہوں گی اور جو مصائب و آلام پیش آئیں گے، ان کے اس سلسلے میں اس کے تصورات کو درست کرتا ہے۔ اسے صحیح پیمانے بخشتا ہے تاکہ وہ اس طویل معرکۂ حق و باطل میں مختلف امور کی ٹھیک اور درست قدر و قیمت کا اندازہ کر سکے۔

''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیے جائیں، انہیں مردہ نہ کہو! وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں''۔

یہ لوگ مقتول ہیں! یہ معرکۂ حق میں شہید ہوئے ہیں! یہ اللہ کی راہ کے شہید ہیں، یہ محبوب اور معزز مقتولین ہیں، یہ بزرگ اور پاکیزہ مقتولین ہیں۔ جو اللہ کی راہ میں نکلتے اور معرکہ حق میں اپنی جانیں قربان کرتے ہیں وہ بزرگ دل، پاکیزہ روح اور پاک نفوس کے حامل ہیں، یہ، جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیے جاتے ہیں، مردہ نہیں ہیں، وہ زندہ ہیں، انہیں مردہ کہنا جائز نہیں ہے۔ نہ احساس و شعور سے انہیں مردہ تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ زبان و قلم سے انہیں مردہ کہنا چاہیے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی گواہی ہے کہ وہ زندہ ہیں۔''

(فی ظلال القرآن، جلد اول)

شہداء کا اجر بے پناہ ہے، اس سلسلہ میں ان احادیث پر غور کیجئے ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' کوئی شخص جو جنت میں داخل ہو چکا ہو، یہ نہ چاہے گا کہ دنیا میں واپس آئے اور دنیا کی اشیاء و اموال کا مالک بنے، بجز شہید کے، وہ تمنا کرے گا کہ وہ دنیا میں واپس آئے اور دس بار (راہِ خدا میں) شہید ہو، کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ شہید کے لیے (خدا کے یہاں) کتنا اعزاز و اکرام ہے۔ (بخاری، مسلم بحوالہ فی ظلال القرآن، جلد اول)

''شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹوں (اندرون) میں رہتی ہیں یہ پرندے، جنت میں گھوم پھر کر جہاں چاہتے کھاتے پیتے ہیں، پھر وہ عرش کے نیچے لٹکی ہوئی قندیلوں میں بسیرا کرتے ہیں ایک بار تمہارے رب نے ان (شہداء) سے پوچھا'' تم کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا، ہم کیا چاہیں، تو نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جو تو نے اپنی مخلوقات میں سے کسی کو نہیں دیا، اللہ تعالیٰ نے ان سے پھر یہی سوال کیا، جب انہوں نے دیکھا کہ انہیں (جواب کے بغیر) چھوڑا نہیں جا رہا ہے تو انہوں نے کہا'' ہم چاہتے ہیں کہ تو ہمیں پھر دنیا کی طرف لوٹا دے، تاکہ ہم تیری راہ میں جنگ کریں اور تیری راہ میں ایک بار پھر شہید ہوں۔'' یہ درخواست انہوں نے اس لیے کی کہ انہوں نے دیکھا کہ شہادت کا بہت زیادہ اجر ہے۔ اس پر اللہ ﷻ نے ارشاد فرمایا:

میں نے طے کر دیا ہے کہ وہ (شہدا) دنیا میں واپس نہ ہوں گے۔'' (بحوالہ فی ظلال القرآن)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) شہادت کا رتبہ اس قدر بلند و بالا کیوں ہے؟ اس لیے کہ شہید کلمۂ حق بلند کر کے یہ ثابت کرتا ہے کہ رب کائنات کی رضا میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا سب سے بڑی سعادتمندی ہے اور خالق کائنات کی طرف سے بھی اسے سب سے بڑا اعزاز دیا جاتا ہے کہ اس مادی زندگی سے محروم ہوتے ہی حیات جاوداں کی نعمت کبریٰ سے نوازا جاتا ہے۔

۲) بندۂ مومن کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا اور سب سے بڑی آرزو راہِ حق میں اپنی جان قربان کر دینا ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

۳) قوموں کی زندگی شہداء کے خون کی مرہون ہے جس طرح کھیتی پکنے کے لیے پانی اور آفتاب کی حرارت ضروری ہے ایسے ہی آزادی کے حصول کے لیے قوموں کی کھیتی کو خون سے سینچا جاتا ہے۔

۴) کسی بھی محکوم اور غلام قوم کو غلامانہ تسلط سے چھٹکارا پانے کے لیے ضروری ہے کہ قوم کا ہر فرد جذبہ شہادت سے سرشار ہو جائے۔

۵) آج امت مسلمہ پر نکبت وادبار کا سبب یہ ہے کہ جذبہ شہادت کی بجائے بزدلی اور مداہنت نے راہ پالی ہے، اگر عالم اسلام کے مسلمان اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر لیں اور مشکلات ومصائب میں ایک دوسرے کی مدد کو پہنچیں اور جان ومال سے مددگار بنیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کی سپر پاور یہی امت ہو اور پھر کوئی دشمن میلی آنکھ سے ان کی طرف نہ دیکھ سکے گا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ، وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (۱۵۵) الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ، قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۱۵۶) اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (۱۵۷)	ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کچھ خوف وخطر سے، کچھ بھوک سے اور کچھ مال، جان اور پیداوار کے نقصان سے اور خوش خبری دیجئے، ان لوگوں کو جو (ہر حال میں) صابر و ثابت قدم رہتے ہیں، جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو (فوراً ان کی زبان پر) اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْن کے کلمات جاری و ساری ہو جاتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایات اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ، وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ﴾

ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کچھ خوف وخطر سے، کچھ بھوک سے اور کچھ مال، جان اور پیداوار کے نقصان سے اور خوش خبری دیجئے، ان لوگوں کو جو (ہر حال میں) صابر و ثابت قدم رہتے ہیں۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ (وَ–لَ–نَبْلُوَ–نَّ–كُمْ) اور، البتہ، ہم آزمائیں گے، تمہیں، ضرور، فعل مضارع جمع متکلم موکّد بنون ثقیلہ (بَلٰی، يَبْلُوْ، بَلَاءً) آزمانا، زندگی کی آزمائش و ابتلا سے گزارنا، بِشَيْءٍ (بِ–شَيْءٍ) ساتھ۔ کچھ بات یعنی تھوڑی سی آزمائش، بِشَيْءٍ کہہ کر واضح کیا گیا کہ آزمائش انسان کی طاقت سے ماوراء نہیں ہوگی۔ مِّنَ الْخَوْفِ خوف وخطر سے، 'الخوف' کا لفظ جامع ہے، جان، مال، عزت وعظمت ہر چیز سے متعلق اندیشہ و ہراس اِس کے اندر آ گیا۔ وَالْجُوْعِ اور بھوک سے، بھوک کا امتحان یہ ہے کہ کسی حاجت کے باوجود ہر مالِ حرام سے بچے اور نہ روزہ (صوم) سے ہچکچائے، نہ فقر و فاقہ سے ڈرے، وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ، مال، جان اور پیداوار کے نقصان سے، اَمْوَال مال کی جمع

ہے، مال و دولت کے حصول کے لیے، رشوت، سود، خیانت بیع فاسد، ہر غیر شرعی معاملت سے دستبردار ہو جائے اور جو مالی نقصان تکوینی طور پر واقع ہوں، چوری ہو جائے، آگ لگ جائے ان سب پر صبر سے کام لے۔ وَالْاَنْفُسِ، نفس کی جمع، جان، یعنی موت، بیماری، جہاد کے حادثوں (سواریوں کے حادثات) وغیرہ ان سب پر صبر سے کام لے، وَالثَّمَرٰتِ، ثمرۃ کی جمع پھل اجناس وغیرہ، اس سے اولاد بھی مراد ہو سکتی ہے اور تجارت، زراعت وغیرہ کے منافع بھی (تفسیر ماجدی، جلد اول) وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ اور خوشخبری دیجئے صبر کرنے والوں کو (بَشَّرَ، یُبَشِّرُ، تَبْشِیْرًا) بشارت اور خوشخبری سنانا، الصّٰبِرِیْنَ، صبر کرنے والے اس کا مفرد، صابر ہے، جو مصائب اور مشکلات کے وقت ثابت قدم رہتے ہیں اور رب کریم سے ہمت اور مدد تلاش کرتے ہیں اور اپنی جبینِ نیاز کو اس کی چوکھٹ پر جھکائے رکھتے ہیں۔

﴿الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ﴾

یہ وہ لوگ ہیں کہ انہیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے۔

الَّذِیْنَ واحد الَّذِی جو، اسم موصول (Relative Pronoun) اِذَآ ظرفِ زمان، جب اور جس وقت اَصَابَتْهُمْ (اَصَابَتْ. هُمْ) پہنچتی ہے، انہیں (اَصَابَ، یُصِیْبُ، اِصَابَةً) باب افعال ہے اس سے اسم فاعل مُصِیْبَةٌ، (مصیبت، تکلیف) ''ہر وہ چیز جو مومن کو اذیت پہنچائے اور اس کے جانی و مالی نقصان کا باعث ہو، اسے مصیبت کہا جاتا ہے۔''

﴿قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾

تو وہ کہہ اٹھتے ہیں: بے شک ہم اللہ کے ہیں اور بلاشبہ ہمیں لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔

اِنَّا (اِنَّ. نَا) بے شک ہم، ثقالت کی وجہ سے ایک نون رہ گیا، لِلّٰهِ (لِ. اللّٰهِ) واسطے، اللہ کے، لام تخصیص کے لیے ہے، یعنی ہم اور ہمارا سب کچھ، زندگی اور موت سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن اور بلاشبہ ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں رَاجِعُوْنَ (رَجَعَ، یَرْجِعُ، رَجْعًا) لوٹنا، اسم فاعل راجِعٌ، لوٹنے والا اور اس کی جمع رَاجِعُوْن، اصل میں رَاجِعُوْنَ اِلَیْهِ ہے، یہاں اِلَیْهِ کو مقدم کرنے کی وجہ کلام میں زور پیدا کرنا ہے۔

مسند احمد میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی مسلمان کو کوئی رنج یا مصیبت پہنچے اور اس پر زیادہ وقت گزر جائے پھر اسے یاد آئے اور وہ اِنَّا لِلّٰہِ پڑھے تو مصیبت کے صبر کے وقت جو اجر ملا تھا، وہی اب بھی ملے گا۔ ابن ماجہ میں ہے حضرت ابوسنانؒ فرماتے ہیں، میں نے اپنے ایک بچے کو دفن کیا، ابھی میں اس کی قبر سے باہر نہ نکلا تھا کہ ابوطلحہ خولانیؒ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے نکالا اور کہا سنو، میں تمہیں ایک خوشخبری سناؤں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملک الموت سے دریافت فرماتا ہے کہ تو نے میرے بندے کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اس کے کلیجہ کا ٹکڑا چھین لیا تو بتاؤ اس نے کیا کہا۔ فرشتہ جواب دیتا ہے کہ اے اللہ تیری تعریف کی اور اِنَّا لِلّٰہِ (آخر تک) پڑھا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اس کے لیے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام ''بیت الحمد'' رکھو۔ (بحوالہ: تفسیر ابن کثیر، جلد اول)

﴿اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَرَحۡمَۃٌ ۟ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ﴾

یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایات اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

اُولٰٓئِکَ اسم اشارہ جمع مذکر، یہی وہ لوگ (ہیں) عَلَیۡہِمۡ (عَلٰی. ہِمۡ) اوپر، ان کے، صَلَوٰتٌ، صَلٰوۃٌ کی جمع ہے (دعا کرنا، دعا دینا) یعنی اللہ کی مخلوق خصوصاً اللہ کے نیک بندے اور فرشتے ان کے لیے دعا گو رہتے ہیں اور صَلَوٰت کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو رحمتیں نازل کرنا مراد ہوتا ہے، یعنی ایسے بندوں کو اللہ تعالیٰ اپنے انعامات سے نوازتا ہے اور انہیں اپنے فضل و کرم میں ڈھانپ لیتا ہے۔ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ کے بعد وَرَحۡمَۃٌ کا اشارہ اس طرف ہے کہ، مزید رحمت کی نظر کرم فرماتا ہے، وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''الٰہی کتب کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ انسان کو کشاکش ہائے حیات کے لیے پوری طرح تیار کر دے یعنی اس کے دل و دماغ کو اتنا بلند اور آمادۂ صبر کر دے کہ وہ سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی مرکزِ عقل و دانش سے نہ ہٹے۔ قرآن حکیم نے اس مقصد کو جس خوبی سے پورا کیا ہے، دنیا کی کوئی

کتاب اس میں اس کی شریک و سہیم نہیں۔ قرآن حکیم کا نظریۂ حیات یہ ہے کہ دنیا میں مصائب و حوادث کا وقوع فطری اور ناگزیر ہے۔ کبھی خوف و ہراس سے دل دہل جاتے ہیں اور کبھی فاقہ و افلاس سے چہروں پر پژمردگی طاری ہو جاتی ہے اور پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عزیز جانوں کا ضیاع ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ غرضیکہ جب تک اس دنیا میں ہیں، ان مصائب سے خلاصی نہیں، البتہ امتحان کا یہ خارستان بھی گل کدۂ عیش ہے کیونکہ وہ اپنے ذہنی افق کو اس درجہ بلند و بالا کر لیتے ہیں کہ وہاں مصائب کا کوئی خیال تکدّر پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہماری زندگی اور موت سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے اگر سکھی ہیں تو بہر حال انہیں اپنے فرائض عبودیت سے غافل نہیں ہونا چاہیے..... اس ایمان کے بعد کوئی بڑے سے بڑا دکھ بھی تکلیف دہ نہیں ہو سکتا حقیقت یہ ہے کہ غم والم کا تعلق ہونے والے واقعات سے نہیں، بلکہ احساسات سے ہے قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ اس قسم کے لوگ ہی راہ راست پر ہیں اور یہی وہ ہیں جو اللہ کی رحمتوں کے سزاوار اور مستحق ہیں۔''

۲) ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ'' کتنے پیارے کلمات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سکھلائے ہیں، یہ مشکل ترین لمحات میں ہمت اور حوصلہ، تسکین اور تسلی کا باعث ہوتے ہیں، یہ اس منزل کا پتہ دیتے ہیں جہاں ہر انسان نے جلد یا بدیر پہنچنا ہے اور یہ اس سفر کی نشاندہی کرتے ہیں جس سے کسی بھی فرد بشر کو مفر نہیں ہے۔

۳) یہ کلمات کی ادا کرنے سے اس ایمان و یقین میں تازگی پیدا ہوتی ہے کہ ہمارے نقصان اور خسارے کو پورا کرنے والا بھی ہمارا خالق و مالک ہی ہے۔

۴) اس بات کا احساس بھی اجاگر ہوتا ہے کہ یہ دنیا عارضی اور فانی ہے اور سب کو بالآخر اسی رب کائنات کی طرف لوٹنا ہے، تو پہنچنے سے پہلے کوئی عمل کی پونجی بھی جمع کر لیں۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ، فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا، وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا، فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ(۱۵۸)	یقیناً صفا اور مروہ (پہاڑیاں) اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں لہٰذا جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لیے ان دونوں کے درمیان سعی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جو برضا و رغبت کوئی بھلائی کا کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ جاننے والا، قدر شناس ہے۔

﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ﴾ بلاشبہ صفا اور مروہ۔

الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ، دو پہاڑیاں ہیں، صفا بیت اللہ کے جنوب مشرق میں اور مروہ، صفا کے بالمقابل شمال کی طرف ہے اور ان کے درمیان سات سو ساٹھ (۷۶۰) ذراع کا فاصلہ ہے۔ (ایسر التفاسیر)

یہ بات ذہن میں رہے کہ ذراع عربی میں کہنی سے درمیانی انگلی کے پورتک کے فاصلے کو کہتے ہیں، اور صفا و مروہ کے درمیان ڈیڑھ فرلانگ کے قریب مسافت بنتی ہے، ان کے درمیان دوڑنا (سعی کرنا) زائرین بیت اللہ (حج اور عمرہ کرنے والوں) کے لیے ضروری ہے، اور یہ اسی خلوص اور للّٰہیت کا اظہار ہے جس کا مظاہرہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کی وفا شعار اہلیہ بی بی ھاجرہؓ نے کیا تھا، حضرت ابراہیمؑ بی بی ہاجرہ اور شیر خوار فرزند سیدنا اسماعیلؑ کو وادیِ فاران میں چھوڑ گئے تھے۔ جب ماں بیٹے کے پاس کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا اور بچہ پیاس کے مارے تڑپنے لگا تو ماں انتہائی بے چینی اور بے قراری کی حالت میں انہی دو پہاڑیوں پر اِدھر سے اُدھر دوڑتی تھی تاکہ کسی آنے والے قافلہ سے تھوڑا بہت پانی میسر آ سکے، ان کی یہ سعی (دوڑ دھوپ) اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی، اور اسماعیلؑ کی ایڑیوں سے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ جاری فرما دیا اور ادھر بیت اللہ جانے والے ہر اس شخص کے لیے (جو حج اور عمرہ کرے) سعی کو لازمی قرار دیا۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''عرب جاہلیت نے ان دونوں پہاڑیوں پر، جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے، دو بت رکھ دیئے تھے اور ان بتوں کے لیے سعی و طواف کرنے لگے تھے، جس کے سبب سے ان شعائر کا نہ صرف شعائر ابراہیمی

میں سے ہونا مشتبہ ہو گیا تھا بلکہ یہ علانیہ شرک و بت پرستی کے مظہر بھی بن گئے تھے، قرآن نے اوپر کی آیات میں جس طرح بیت اللہ کو، تمام مشرکانہ آلودگیوں سے پاک صاف کر کے، اس کے اصل ابراہیمی جمال میں پیش کیا، اسی طرح یہاں صفا اور مروہ کی اصل تاریخ بیان فرمائی کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے شعائر اللہ میں سے ہیں اور ان کی سعی وطواف کی سنت حضرت ابراہیمؑ کی سعی وطواف کی یادگار ہے لیکن مشرکین نے جس طرح توحید کے مرکز بیت اللہ میں سینکڑوں بت لا کر رکھ دیے، اسی طرح ان شعائر کو بھی بت پرستی سے ملوث کیا۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم گندگی کے اس ڈھیر کو ہٹا کر ان شعائر کو از سر نو اجاگر کرو اور ان کے سعی وطواف کو صرف اللہ ہی کے لیے خاص کر دو۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

شَعَآئِرِ شعیرہ کی جمع ہے، ویسے تو انفس وآفاق میں ہر چیز اور ہر شے میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں موجود ہیں اور اس کی کاریگری اور عظمت کے نشان ہویدا ہیں۔ آیہ مبارکہ میں شَعَآئِرِ اللّٰهِ سے وہ نشانیاں مراد ہیں جو حج کرتے وقت سامنے آتی ہیں، مثلاً بیت اللہ، صفا اور مروہ کی پہاڑیاں، حجر اسود، قربانی کے جانور وغیرہ، ان کا دل سے احترام کرنا اور انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنا تقوی اور پرہیزگاری کی نشانی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج ۲۲:۳۲) ''اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقوی سے ہے۔''

﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ﴾ پس جو کوئی حج کرے (بیت اللہ) کا یا عمرہ کرے۔

فَمَنْ (فَ.مَنْ) پس، جو کوئی، حَجَّ (حَجَّ، يَحُجُّ، حَجَّةٌ) قصد کرنا، ارادہ کرنا، یہ لُغوی معنی ہیں اور اصطلاحی معنی، ذوالحجہ کے مہینے میں بیت اللہ جا کر مناسکِ حج ادا کرنا ہے، اَوِ اعْتَمَرَ یا عمرہ کرے (اِعْتَمَرَ يَعْتَمِرُ، اِعْتِمَارًا) لفظی معنی، آباد کرنا، اصطلاح میں عمرہ کرنا یعنی بیت اللہ جا کر طواف کرنا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف اور سعی فرمائی۔ حج تو صرف ذوالحجہ کے مہینے میں مخصوص ایام میں ہوتا ہے جبکہ عمرہ سال کے کسی بھی مہینے میں ہو سکتا ہے۔

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾

پس نہیں، حرج اس پر کہ وہ طواف کرے ان دونوں کا۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''اس اسلوب بیان سے بظاہر یہ بات نکلتی ہے کہ اس سعی کے لیے شریعت میں صرف اجازت ہے، اگر کوئی شخص یہ نہ کرے یا نہ کر سکے تو اس میں بھی کوئی خاص قباحت نہیں، لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے، اگر مراد یہ ہوتی تو اسلوب کلام جیسا کہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا کے بجائے اَنْ لَا يَطَّوَّفَ بِهِمَا ہوتا، دوسری بات یہ ہے کہ یہ فرمانے کے بعد کہ صفا اور مروہ دونوں شعائر اللہ میں سے ہیں، یہ کہنا کچھ ناموزوں اور بے جوڑ سا ہو جاتا ہے کہ ان کا طواف کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہیں، پہلی بات کے بعد ان کے ہم وزن اور اس سے ہم آہنگ بات تو یہی ہو سکتی ہے کہ ان کا طواف ضروری قرار دیا جائے، رہا یہ سوال کہ یہ کس درجہ میں ضروری ہے اس کی حیثیت فرض کی ہے یا واجب کی یا مستحب کی، اس میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن یہ خیال کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس قدر شاندار تمہید کے بعد اصل بات اتنے کمزور درجہ کی ہو، اس وجہ سے ہمارا خیال یہی ہے کہ یہاں سعی کا حکم ہے اور یہ حکم وجوب کے درجہ میں ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا، فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ﴾

اور جو کوئی برضا و رغبت نیکی کرے تو اللہ تعالیٰ جاننے والا، قدر شناس ہے۔

وَمَنْ اور جو کوئی، مَنْ اسم موصول، تَطَوَّعَ، خوشی سے کوئی عمل کرنا فعل ماضی صیغہ واحد مذکر غائب (تَطَوَّعَ، يَتَطَوَّعُ، تَطَوُّعًا) باب تفعل، اس کا مادہ (ط و ع) یعنی خوشی اور رغبت سے کوئی عمل کرنا، اردو زبان میں طوعاً و کرہاً، (چار و ناچار) محاورہ استعمال ہوتا ہے، خَيْرًا، اسم نکرہ ہے اس سے مراد ہر قسم کی بھلائی اور نیکی ہے، شَاكِرٌ، قدر دان، اسم فاعل، (شَكَرَ، يَشْكُرُ، شُكْرًا) احسان ماننا، نیکی کا بدلہ دینا عَلِيْمٌ، جاننے والا (ظاہر اور چھپی باتیں سب کو جانتا ہے بلکہ ارادوں اور نیتوں سے بھی وہ آگاہ ہے اور وہ اس کا صلہ اور بدلہ عطا فرماتا ہے)۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) مناسک حج اور عمرہ کی ادائیگی میں اسوۂ ابراہیمی کو دھندلایا گیا تھا اور مشرکین عرب نے بیت اللہ اور صفا ومروہ پر بت نصب کر دیے تھے، خاتم النبیّین محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ان مقامات کو بتوں سے پاک وصاف کر دیا گیا۔ اس طرح شعائر اللہ کی عزت وعظمت بحال ہوگئی اور مسلمانوں کو حکم کہ مناسک حج اور عمرہ کو اسوۂ ابراہیمی کی پیروی میں ادا کریں۔

۲) حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں خلوص اور للّٰہیت کی بڑی قدر و قیمت ہے، سیدنا ابراہیم اور ان کے اہل وعیال نے جس وفاداری اور ایثار کا ثبوت فراہم کیا، اللہ تعالیٰ نے اسے قبول فرمایا، بیت اللہ کو تا قیامت منبع رشد و ہدایت قرار دیا، انہی کی نسل سے خاتم النبیّین محمد رسول اللہ ﷺ کو شہر مکہ میں مبعوث فرمایا اور ان کی رسالت اور پیغام کو نسل انسانی کی ہدایت وکامیابی کا ذریعہ ٹھہرایا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَ الۡہُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰہُ وَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰعِنُوۡنَ (۱۵۹) اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا وَ بَیَّنُوۡا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوۡبُ عَلَیۡہِمۡ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ (۱۶۰)	جو لوگ ہمارے نازل کردہ واضح دلائل اور ہدایات کو چھپاتے ہیں جبکہ ہم انہیں اپنی کتاب میں سب لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر چکے ہیں تو ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں، البتہ جو اِس روش سے باز آ جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں، اور جو حق چھپاتے تھے اسے بیان کرنے لگیں، انہیں میں معاف کر دوں گا اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَ الۡہُدٰی﴾

بے شک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کیا ہم نے دلائل سے اور ہدایات سے۔

اِنَّ کلمہ تحقیق کلام، الَّذِیۡنَ، اسم موصول (وہ لوگ جو) اس کا مفرد اَلَّذِی ہے، یَکۡتُمُوۡنَ، چھپاتے ہیں فعل مضارع جمع مذکر غائب (کَتَمَ، یَکۡتُمُ، کِتۡمَانٌ) چھپانا، کتمانِ حق، حق بات کو چھپانا اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، مَاۤ اَنۡزَلۡنَا، جو نازل کیا ہم نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) مَا موصولہ ہے (اَنۡزَلَ، یُنۡزِلُ، اِنۡزَالٌ) باب افعال ہے مِنَ الۡبَیِّنٰتِ واضح دلائل سے، اس کا مفرد بَیِّنَۃٌ، واضح اور روشن نشان ہے، وَالۡہُدٰی، اور ہدایت، (ھَدٰی، یَھۡدِیۡ، ھِدَایَۃٌ) وہ اصول اور باتیں جنہیں اختیار کر کے انسان دنیا اور آخرت میں کامیاب اور بامراد ہوں، اور یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایات ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کا سچا دین، دین اسلام ہے جو روزِ اول سے بنی نوع انسان کے لیے روشنی کا سامان رہا ہے۔

﴿مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ﴾

اس کے بعد (کہ) ہم انہیں بیان کر چکے ہیں لوگوں کے لیے کتاب میں (تورات، انجیل، زبور، قرآن، یا کسی اور نازل کردہ کتاب یا صحیفہ میں)

مِنۡۢ بَعۡدِ، اس کے بعد، مَا جو، موصولہ، بَیَّنّٰہُ (بَیَّنَّا.ہُ) ہم بیان کر چکے۔ اسے، ہٗ کی ضمیر اس بات اور اس ہدایت کی طرف جاتی ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں لوگوں کی کامیابی کے لیے ارشاد فرما دی (بَیَّنَ، یُبَیِّنُ، تَبۡیِیۡنًا) بیان کرنا، لِلنَّاسِ (لِ.النَّاسِ) لیے، لوگوں کے النّاس سے مراد بنی نوع انسان ہیں، الۡکِتٰبِ، سے مراد تمام آسمانی کتابیں اور صحیفے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے۔

﴿اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰہُ وَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰعِنُوۡنَ﴾

یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''اہل کتاب، کتاب الٰہی سے، جو ان کے پاس موجود تھی، اس بات کا بخوبی علم رکھتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت حق ہے اور جن احکام کی وہ تبلیغ کر رہے ہیں وہ صحیح اور برحق ہیں مگر وہ ان تعلیمات کو

جواللہ نے ان کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر دی تھیں، لوگوں سے چھپاتے تھے۔ یہ لوگ اور اسی قسم کے دوسرے لوگ جو کتمان حق کے بہت سے اسباب و وجوہ میں سے کسی بھی سبب کے تحت اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حق کو چھپاتے ہوں اور اس طرح کے لوگ مختلف زمانوں اور مختلف مقامات پر دیکھے جا سکتے ہیں..... جو حق کو جانتے ہوں مگر اسے ظاہر کرنے کے بجائے اس کے سلسلے میں سکوت اختیار کرتے ہوں۔ جو ان اقوال پر، جن سے حق کی تائید ہوتی ہو، یقین رکھنے کے باوجود انہیں چھپاتے ہوں، جو کتاب اللہ کی آیات کو بیان کرنے کے بجائے انہیں مخفی رکھتے اور ان کے سلسلے میں مہر بہ لب رہتے ہوں تا کہ ان آیات میں جن حقیقتوں کا بیان ہے انہیں لوگوں کے کانوں اور ان کے احساسات سے دور اور پوشیدہ رکھا جا سکے، اور یہ سب کچھ محض کسی دنیوی غرض کے لیے ہوتا ہے..... اس طرح کے رویے کا مشاہدہ بہت سے مواقع پر اور دین کے بہت سے حقائق کے سلسلے میں ہوتا ہے..... ایسے تمام لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ ''ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔''

لعنت کے معنی ہیں: غصہ اور سختی سے دھتکار دینا۔ یہ وہ مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے دور پھینک دیتا ہے اور جسے مخلوق میں سے بھی دھتکار اور پھٹکار (کی بددعا) ملتی ہے۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا، وَ اَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا، فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ﴾

مگر وہ لوگ جو توبہ کریں اور (اپنی) اصلاح کریں اور (حق بات) بیان کرنے لگیں، تو میں انہیں معاف کر دوں گا اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

اِلَّا کلمہ استثناء (مگر) الَّذِیْنَ، اسم موصول (وہ لوگ) تَابُوْا، انہوں نے توبہ کی، فعل ماضی جمع مذکر غائب، (تَابَ، یَتُوْبُ، تَوْبَۃً) رجوع کرنا، ندامت اور شرمساری سے اپنی خطاؤں کا احساس ہونا اور پھر سیدھی اور پاکیزہ راہ اختیار کر لینا، اور وہ یقیناً اسلام کی راہ ہے۔ وَ اَصْلَحُوْا اور انہوں نے اصلاح کر لی، فعل ماضی جمع مذکر غائب (اَصْلَحَ، یُصْلِحُ، اِصْلَاحًا) اصلاح کرنا، درست راہ اختیار کر لینا، وَبَیَّنُوْا، انہوں نے بیان کی (حق بات) فعل ماضی جمع مذکر غائب (بَیَّنَ، یُبَیِّنُ، تَبْیِیْنٌ) باب تفعیل، بیان کرنا،

وضاحت کرنا، حق بات کہنا، سچائی کا اظہار کرنا، فَاُولٰٓئِکَ، اسم اشارہ، تو یہی وہ لوگ ہیں۔ اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ میں توبہ قبول کرتا ہوں، ان کی، اسلام قبول کرنے اور اپنے نفس کی اصلاح کرنے کے بعد مومنین کے لیے اللہ تعالیٰ کی دیگر بہت سی بشارتوں میں سے یہ عظیم بشارت ہے: قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا، اِنَّه هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (الزمر ۳۹:۵۳) ''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجئے ''اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفورٌ رحیم ہے۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اَلتَّائِبُ مِنْ ذَنْبِهٖ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ (سنن ابن ماجہ) ''گناہوں سے (سچی) توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا کہ اس کے ذمہ کوئی گناہ نہ ہو۔''

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی صفت التواب (بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا) اور الرّحیم (سایہ رحمت میں چھپا لینے والا) ہے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) حق کو چھپانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ بات ہے، جو لوگ یہ روش اختیار کریں وہ رحمت الٰہی سے دور ہو جاتے ہیں اور اللہ کی مخلوق کی بددعا بھی لیتے ہیں۔

۲) اسلام ہی ایسا دین رحمت ہے، جہاں لوگوں کے لیے صلاح وفلاح کی راہیں ہر وقت کھلی رہتی ہیں، جہاں بشارتیں اور خوشخبریاں ہیں، دنیا وآخرت کی بھلائیاں ہیں، لازوال اور ابدی خوشیوں کا پیغام ہے، یہ کن کے لیے ہے ارشاد ہوتا ہے: وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ، اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ (ال عمران ۳:۱۳۳) ''(لوگو!) دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور وہ پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا، وَمَاتُوۡا وَهُمۡ کُفَّارٌ، اُولٰٓئِکَ عَلَیۡهِمۡ لَعۡنَةُ اللّٰهِ وَالۡمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ (۱۶۱) خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا، لَا یُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ (۱۶۲)	جن لوگوں نے کفر (کا راستہ اختیار) کیا اور کفر کی حالت میں مر گئے ایسے لوگوں پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، وہ ہمیشہ اسی (لعنت) میں مبتلا رہیں گے، نہ تو ان کے عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ انہیں ڈھیل ہی دی جائے گی۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا، وَمَاتُوۡا وَهُمۡ کُفَّارٌ﴾

بے شک جنہوں نے کفر کیا اور وہ مر گئے (جبکہ) وہ کافر ہی رہے۔

اِنَّ کلمہ تحقیق کلام، الَّذِیۡنَ وہ جنہوں نے، اسم موصول، کَفَرُوۡا، کفر کیا، فعل ماضی جمع مذکر غائب (کَفَرَ، یَکۡفُرُ، کُفۡرًا) کفر کرنا، حق بات کا انکار کرنا، وَمَاتُوۡا اور وہ مر گئے فعل ماضی جمع مذکر غائب (مَاتَ، یَمُوۡتُ، مَوۡتًا) مرنا، دنیا سے رخصت ہونا وَهُمۡ کُفَّارٌ، اور وہ کافر رہے اَیۡ مَاتُوۡا وَهُمۡ عَلٰی حَالَةِ الۡکُفۡرِ یعنی کفر کی حالت میں ان کی موت واقع ہوئی۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''کفر'' کے اصل معنی چھپانے کے ہیں، اسی سے انکار کا مفہوم پیدا ہوا اور یہی لفظ ایمان کے مقابلے میں بولا جانے لگا، ایمان کے معنی ہیں ماننا، قبول کرنا، تسلیم کر لینا، اس کے برعکس کفر کے معنی ہیں نہ ماننا، رد کر دینا، انکار کرنا، قرآن کی رو سے کفر کے رویہ کی مختلف صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ انسان سرے سے اللہ تعالیٰ ہی کو نہ مانے، یا اس کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرے اور اس کو اپنا اور ساری کائنات کا مالک اور معبود ماننے سے انکار کر دے یا اسے واحد مالک اور معبود نہ مانے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اس کے احکام اور اس کی ہدایت کو واحد منبع علم و قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

تیسرے یہ کہ اصولاً اس بات کو بھی تسلیم کرے کہ اسے اللہ ہی کی ہدایت پر چلنا چاہیے، مگر اللہ اپنی

ہدایات اور اپنے احکام پہنچانے کے لیے جن پیغمبروں کو واسطہ بناتا ہے انہیں تسلیم نہ کرے۔

چوتھے یہ کہ پیغمبروں کے درمیان تفریق کرے اور اپنی پسند یا اپنے تعصّبات کی بنا پر ان میں سے کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے۔

پانچویں یہ کہ پیغمبروں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عقائد، اخلاق اور قوانین حیات کے متعلق جو تعلیمات بیان کی ہیں، ان کو یا ان میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرے۔

چھٹے یہ کہ نظریے کے طور پر تو ان سب چیزوں کو مان لے مگر عملاً احکام الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے اور دنیوی زندگی میں اپنے رویے کی بنا اطاعت پر نہیں بلکہ نافرمانی ہی پر رکھے۔

یہ سب طرزِ فکر و عمل اللہ کے مقابلے میں باغیانہ ہیں اور ان میں سے ہر ایک رویے کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے، اس کے علاوہ بعض مقامات پر قرآن میں کفر کا لفظ کفرانِ نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور شکر کے مقابلے میں بولا گیا ہے، شکر کے معنیٰ یہ ہیں کہ نعمت جس نے دی ہے انسان اسی کا احسان مند ہو، اس کے احسان کی قدر کرے، اسی کی دی ہوئی نعمت کو اسی کی رضا کے مطابق استعمال کرے، اور اس کا دِل اپنے محسن کے لیے وفاداری کے جذبے سے لبریز ہو، اس کے مقابلے میں کفرانِ نعمت یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنے محسن کا احسان ہی نہ مانے اور اسے اپنی قابلیت یا کسی غیر کی عنایت یا سفارش کا نتیجہ سمجھے، یا اس کی دی ہوئی نعمت کی ناقدری کرے اور اسے ضائع کر دے، یا اس کی نعمت کو اس کی رضا کے خلاف استعمال کرے، یا اس کے احسانات کے باوجود اس کے ساتھ عذر اور بے وفائی کرے، اس نوع کے کفر کو ہماری زبان میں بالعموم اِحسان فراموشی، نمک حرامی، غداری اور ناشکرے پن کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ لَعۡنَۃُ اللّٰہِ وَالۡمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴾

یہی لوگ ہیں (کہ) ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی۔

اُولٰٓئِکَ اسم اشارہ جمع بعید، عَلَیۡہِمۡ (عَلٰی. ہِمۡ) ان پر، لَعۡنَۃُ اللّٰہِ اللہ کی لعنت یعنی وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو گئے، وَالۡمَلٰٓئِکَۃِ، فرشتے، مَلَکٌ اس کا مفرد ہے وَالنَّاسِ اور لوگ، اَجۡمَعِیۡنَ، سب کے

سب، فرشتے اور لوگ (جو کفر سے بچے ہوئے ہیں) ان کفار پر لعنت بھیجتے ہیں یعنی ان کے لیے بددعا کرتے ہیں اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ان گنت انعامات کی ناقدری کی اور دوسروں کے لیے ضلالت اور گمراہی کا سبب بن رہے ہیں۔

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا، لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ﴾

ہمیشہ رہیں گے اس کیفیت میں، نہیں ہلکا کیا جائے گا، ان سے عذاب اور نہ انہیں ڈھیل دی جائے گی۔

خٰلِدِيْنَ (خ ل د) خَلَدَ، يَخْلُدُ، خُلُوْدٌ ہمیشہ رہنا (to live for ever) خلد بریں (بمعنی بہشت) اردو میں استعمال ہوتا ہے، فِيْهَا اسی میں، هَا کی ضمیر اس دنیا میں ملعون ہونے کی کیفیت اور حالت کی طرف بھی جاتی ہے اور آخرت میں جہنم کی طرف بھی، کیونکہ آیت کا اگلا حصہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے لَا يُخَفَّفُ نہ ہلکا کیا جائے گا، فعل نفی، مضارع مجہول (خَفَّفَ، يُخَفِّفُ، تَخْفِيْفٌ) باب تفعیل، ہلکا کرنا، تخفیف کرنا، اردو میں استعمال ہوتا ہے، عَنْهُمُ الْعَذَابُ، ان سے عذاب، دنیا و آخرت کا عذاب وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی يُنْظَرُوْنَ. مضارع مجہول جمع مذکر غائب (اَنْظَرَ، يُنْظِرُ، اِنْظَارٌ) باب افعال، مہلت دینا، ڈھیل دینا، یعنی وہ اسی رسوائی اور ذلت میں رہیں گے (العیاذ باللہ)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) انسان ذرا عقل و فکر سے کام لے تو یقیناً وہ اس بات کو جان لے گا کہ جسم و جان سے لے کر انفس و آفاق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنے مادی اور روحانی انعامات ہیں جن کے لیے اسے شکر گزار بندہ بن کر رہنا چاہیے.....اور وہ شخص کتنا ناشکرا اور ناقدرا ہے جو ان سب نعمتوں کو فراموش کر دے بلکہ اللہ کی اس زمین پر بغاوت اور سرکشی کرتا پھرے، کیا اسے اس کی سزا نہ ملنی چاہیے؟

۲) دنیا سے رخصت ہونے کے بعد عملاً اعمالِ صالحہ کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، زندگی میں یا تو اعمال صالحہ سے ابدی جنت کمائی جا سکتی ہے یا اعمال خبیثہ سے ابدی جہنم! اب یہ انسان پر ہے کہ کونسی چیز حاصل کرتا ہے! لیکن یہ مسلمہ حقیقت پیش نظر رہے کہ یہ زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ، لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۱۶۳)	اورتم سب کا معبود ایک (اللہ) ہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے وہ انتہائی مہربان اور ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔

وَ اِلٰهُكُمْ، وَ، اور (اِلٰـهُ. كُمْ) معبود، تمہارا، اِلٰـه، مضاف، وہ ذات جو عبادت کی مستحق ہو اس کی جمع اٰلِهَةٌ (بہت سے معبود) آتی ہے، كُمْ ضمیر مخاطب جمع مذکر کے لیے (تم سب) اور یہ ضمیر مضاف الیہ ہے، تم سب کا معبود، اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ، معبود ہے، اکیلا (اللہ تعالیٰ)، لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ، نہیں ہے معبود (کوئی) اس کے سوا، لَآ، نہیں لَا نافیہ ہے، قطعی نفی کرتا ہے لَآ اِلٰـهَ، ہرگز کوئی معبود نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے، اِلَّا، مگر، کلمہ استثناء (Except) هُوَ، وہ (اللہ) الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ، بے حد مہربان اور ہمہ وقت رحم کرنے والا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں، الرَّحْمٰنُ (رح م) اس کا مادہ (Root Word) ہے (رَحِمَ، يَرْحَمُ) رحم کرنا الرَّحْمٰنُ، بروزن فعلان، اس وزن پر جو لفظ آئے گا اس میں شدت پائی جائے گی جیسا کہ غَضْبَانُ (انتہائی غصہ میں) عَطْشَانُ (سخت پیاسا) الرَّحْمٰنُ کے معنی ہیں انتہائی مہربان، جس کی رحمت ہر وقت ٹھاٹھیں مارتی ہے، یہ صفت اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ الرَّحِيْمُ بروزن فعیل یہ بھی مبالغہ کا صیغہ ہے اور یہ صفت دوام (ہمیشگی) کو ظاہر کرتی ہے یعنی اس کی رحمت ہمیشہ جاری وساری رہتی ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''یہ خطاب دراصل مشرکین مکہ سے ہے جنہوں نے کئی اِلٰہ بنا رکھے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اتنی بڑی کائنات کا نظام سارے کا سارا تنہا اللہ کیسے سنبھال سکتا ہے؟ ان کی عقل میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی لہٰذا انہوں نے مختلف امور کے لیے مختلف اِلٰہ تجویز کر رکھے تھے اور جتنی پرانی تہذیبیں پائی جاتی ہیں، مثلاً ہندی، رومی، مصری، یونانی ان سب لوگوں نے دیوی، دیوتاؤں کا ایسا ہی نظام تجویز کر رکھا تھا اور (دور حاضر میں کم علم، اور جاہل) مسلمانوں میں بھی گو زبانی نہیں مگر عملاً ایسے ہی اعتقادات وافعال رائج ہو چکے ہیں (قبور پرستی اور پیر پرستی وغیرہ) یہ سب لوگ ہی اس آیت کے مخاطب ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب نہیں ہوتی، قرآن میں یہ مضمون متعدد مقامات میں آیا ہے۔'' (تیسیر القرآن، جلد اول)

سب سے پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ رب کائنات کا نظامِ ربوبیت پوری کائنات پر محیط ہے، کتاب الٰہی کے آغاز ہی میں اعلان ہوتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الفاتحہ ۱:۲) ''حمد وستائش کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہے جو تمام کائنات کا رب ہے۔'' یعنی فرش سے عرش تک بلکہ اس سے ماورا جو کچھ بھی ہے سب کا خالق و مالک تنہا اللہ تعالیٰ ہے، اس کی تخلیق میں کوئی بھی اس کا ساجھی اور شریک نہیں ہے، وہی اس کا نظام چلا رہا ہے، قرآن حکیم نے اس مضمون پر کئی مقامات پر عقلی اور نقلی دلائل پیش کئے ہیں، ایک مقام پر فرمایا:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیا ۲۱:۲۲) ''اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین اور آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔''

اس آیت پر حافظ عتیق الرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہر انسان کو واسطہ پڑتا ہے اور وہ اس کی حقیقت کو سمجھتا ہے، ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں ہو سکتے، ایک سکول کے ہیڈ ماسٹر اور سیکنڈ ماسٹر بھی اگر ایک ہی قسم کے اختیارات میں شریک ہو جائیں تو اقتدار کی خاموش جنگ چھڑ جاتی ہے جو کہ سکول کو تباہی تک پہنچا دیتی ہے۔ اس کائنات کے دو مالک کیسے ہو سکتے تھے؟ اس کے انتظامات میں نظم و نسق ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مالک اور منتظم ایک ہی ہے۔

یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے، مشرکین یہ کہتے ہیں کہ جیسے ایک بادشاہ کو کئی وزیروں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ انتظامات میں اس کا ہاتھ بٹائیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی یہ اِلٰہ مقرر کر رکھے ہیں، یہ شبہ اللہ کی عدم معرفت کی وجہ سے ہوا ہے، اللہ تعالیٰ خود قادر مطلق ہے، وہ اکیلا بخوبی اس کائنات کا انتظام چلا سکتا ہے، اس کے علاوہ باقی سب اس کی مخلوق ہیں اور اسے کسی کی احتیاج نہیں جبکہ باقی سب اس کے محتاج ہیں۔'' (تیسیر القرآن)

ایک جگہ اسی حقیقت کو یوں بیان کیا:

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل ۱۷:۴۲)

''کہیے کہ ''اگر اللہ کے ساتھ اور بھی اِلٰہ ہوتے جیسے مشرک کہتے ہیں، تو وہ صاحب عرش (اللہ تعالیٰ) تک پہنچنے کے لیے ضرور راہ تلاش کرتے''۔ (ہوس اقتدار کے نشے میں کوئی اِلٰہ چین سے نہ بیٹھتا)

کائنات میں نظم و نسق، لیل و نہار کی آمد و رفت، موسموں کا تغیر و تبدل اور سیاروں کی گردش رب کائنات

کی یکتائی پر بہت بڑی دلیل ہے: لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ، وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسین ۳۶:۴۰) ''نہ آفتاب کے بس میں ہے کہ ماہتاب کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن پر سبقت لے جاسکتی ہے (یہ سب رب قدیر کے حکم کے پابند ہیں) اور یہ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔''

موت اِنسان کے لیے ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کا انکار سخت ترین باغی اور سرکش شخص بھی نہیں کر سکتا، کوئی بھی انسان یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کب اور کہاں اِس حیات مستعار سے تہی دامن ہو جائے گا، یہ بات صرف اور صرف ربّ قدیر کے علم میں ہے: وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ م بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (لقمان ۳۱:۳۴) ''اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اسے موت آنی ہے۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔''

زمین پر بسوں اور ریلوں کے تصادم میں اور فضا میں ہوائی جہازوں کی فنی خرابیوں کے باعث آئے دن سیکڑوں افراد لقمۂ اجل بنتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سفر سے پہلے اگر موت کی خبر ہو جاتی تو وہ ہرگز ہرگز سفر نہ کرتے۔ سائنسی کمالات کے باوجود آج تک کوئی سائنس دان اور ڈاکٹر موت کا تریاق تلاش نہ کر سکا اور قرآن کی یہ آیہ مبارکہ قیامت تک پیغام حق رہے گی:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، وَ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن ۵۵:۲۷) ''ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب جلیل و کریم کی ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جو دوسروں کو پکارتے ہیں، وہ معبودانِ باطل مدد تو کیا کر سکتے ہیں؟ اُن کی اپنی بے بسی کی قرآن حکیم نے اس طرح نقشہ کشی کی ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِاجْتَمَعُوْا لَهٗ، وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (الحج ۲۲:۷۳) ''(سنو) جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ اگر سارے اکٹھے بھی ہو جائیں تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اس سے چھڑا بھی نہیں سکتے (ان سے مدد) طلب کرنے والا بھی عاجز اور بے بس اور جن سے (مدد) طلب کی جا رہی ہے وہ بھی عاجز اور بے بس۔''

پس جان لو، وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَاحِدٌ، لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ

''تم سب کا معبود ایک اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے''۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اس وسیع وعریض کائنات کا حسنِ نظم اور ترتیبِ جمال، رب کائنات کی یکتائی پر سب سے بڑی دلیل ہے جو حسن وجمال کا عظیم مرقع ہے۔

۲) آیہ مبارکہ سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ جس طرح خالق کائنات کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے، اسی طرح اس کا رحم وکرم بھی بے کراں اور بے پایاں ہے، وہ رحمٰن ورحیم ہے، وہ گنہگاروں کو بھی معاف کر دیتا ہے جو سچے دل سے اس کے حضور ندامت کے آنسو بہائیں نہ صرف معاف فرماتا ہے بلکہ اپنی وسیع رحمتوں کا ان پر سایہ بھی فرماتا ہے۔

۳) ظاہری بینائی کے علاوہ، دل کی آنکھ بینا ہو تو قدرت الٰہی کے مظاہر، کائنات میں ہر طرف بکھرے ہوئے نظر آئیں گے خود انسان کا اپنا جسم اس کی قدرت کا شاہکار ہے۔ ہر عضو اور اس کی افادیت اور قدر وقیمت کو شمار کیجئے اور حساب لگائیے کہ یہ کتنی قیمتی چیزیں ہیں۔

۴) یہ انفس وآفاق کے تمام انعامات کس نے عطا کیے؟ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہے جو تمام ان گنت نعمتوں سے نوازتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو غیر اللہ کی عبادت کا کیا جواز ہے؟

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ، وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ، فَاَحۡیَا	آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، لیل و نہار کی آمد و رفت میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے تو

اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ، فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ، وَّتَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ(۱۶۴)	اس سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، نیز ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو ارض و سما کے درمیان تابع فرمان ہیں، اہل عقل کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں۔

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ بلاشبہ، آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔

اِنَّ کلمہ تحقیق کلام، فِیۡ (میں) حروف جارہ میں سے ہے جو بعد والے حرف کو زیر دیتے ہیں، خَلۡقِ، پیدائش، تخلیق (مصدر) السَّمٰوٰتِ، اس کا مفرد سَمَاءٌ، آسمان۔

﴿وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ﴾ اور رات اور دن کے آنے جانے میں۔

وَاخۡتِلَافِ (خ ل ف) اس کا مادہ (Root word) ہے۔ اِخۡتَلَفَ يَخۡتَلِفُ، اِخۡتِلَافٌ باب افتعال ہے، کسی چیز کا کسی کے پیچھے آنا۔ اِخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ، کے معنی رات دِن کا آگے پیچھے آنا یا لیل و نہار کی آمد و رفت۔

﴿وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا يَنۡفَعُ النَّاسَ﴾

اور کشتیاں (جو کہ) چلتی ہیں، سمندر میں ساتھ اس چیز کے جو نفع دیتی ہے لوگوں کو۔

وَالۡفُلۡكِ، کشتی یا بحری جہاز، مفرد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے تَجۡرِیۡ (ج ری) جَرَیٰ يَجۡرِیۡ، جَرۡيَانٌ، چلنا، کسی چیز کو لے کر تیز چلنا یا بہنا، فِی الۡبَحۡرِ، سمندر میں، بَحۡر، سمندر اور بڑے دریا کے لیے استعمال ہوتا ہے، بِمَا (بِ. مَا) ساتھ اس کے جو، يَنۡفَعُ (نَفَعَ، يَنۡفَعُ، نَفۡعًا) نفع دینا، فائدہ پہنچانا۔

﴿وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ﴾
اور جو کچھ اتارا ہے، اللہ نے آسمان سے، پانی میں سے۔
اَنْزَلَ، یُنْزِلُ اِنْزَالًا، نازل کرنا، اتارنا، مِنَ السَّمَآءِ آسمان سے مِنْ مَّآءٍ، پانی سے۔

﴿فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ تو اس سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے۔
تو زندہ کیا (بِ.ہ) اس کے ساتھ، ہ کی ضمیر ماء (پانی) کی طرف جاتی ہے، اَلْاَرْضَ، زمین (Earth) بَعْدَ مَوْتِهَا، اس کے مردہ ہونے کے بعد، یعنی آسمان سے بارش نازل فرما کر، خشک اور مردہ زمین کو شاداب بنا دیا۔

﴿وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ اور پھیلائے ہر قسم کے حیوانات۔
بَثَّ، یَبُثُّ، بَثًّا، پھیلانا، منتشر کرنا، (فِیْ.هَا) اس میں هَا کی ضمیر زمین کی طرف جاتی ہے، مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ، ہر قسم کے حیوانات کو دَآبَّة کہتے ہیں، دَآبَّةٍ جانور (دَبَّ یَدِبُّ، دَبِیْبًا) سست رفتاری سے چلنا، ہر طرح کے جانور (جو اپنی اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں)۔

﴿وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ﴾ "اور پھیرنا (چلانا) ہواؤں کا۔"
تَصْرِیْفُ۔ مصدر (صَرَّفَ، یُصَرِّفُ، تَصْرِیْفًا) باب تفعیل، ایک حالت سے دوسری حالت میں پھیرنے کو تصریف کہتے ہیں۔ الرِّیٰحِ، ہوائیں، رِیْحٌ اس کا مفرد ہے، قرآن حکیم میں رِیْحٌ مفرد عام طور پر عذاب کے لیے (آندھی اور طوفان کے لیے) آیا ہے جبکہ جمع کا صیغہ خوشخبری اور رحمت کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسا کہ:
وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ (الذّٰریات ۵۱:۴۱)
"اور قصہ عاد (قوم) بھی ایک نشانی (عبرت) ہے جب ہم نے ان پر تباہ کن آندھی چھوڑ دی"۔
وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ "وہی (اللہ) تو ہے جو اپنی رحمت (بارش)

سے قبل (ٹھنڈی) ہواؤں کو خوشخبری کے طور پر بھیجتا ہے"۔

﴿وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾

اور بادل (کہ) حکم بردار ہیں زمین وآسمان کے درمیان تابع فرمان ہیں، اہل عقل کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں۔

اس کا مشاہدہ موسم برسات میں ہر شخص کرسکتا ہے، شہر کے ایک حصہ میں موسلا دھار بارش ہوجاتی ہے کہ بادل کو وہاں برسنے کا حکم ہوتا ہے جبکہ دوسرا حصہ خشک رہتا ہے۔ اَلْمُسَخَّرُ (سَخَّرَ، یُسَخِّرُ، تَسْخِیْرًا) باب تفعیل مسخر کرنا، تابع فرمان بنانا، خدمت پر مامور کرنا، (لَ. اٰیاتٍ) ضرور بضرور نشانیاں ہیں، لَ (زبر کے ساتھ) تاکید کے لیے آتا ہے، اٰیَۃٌ کی جمع آیات، نشانیاں، انفس وآفاق میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہر طرف بکھری پڑی ہیں، آنکھ بینا ہو تو اسے ہر جگہ نظر آجاتی ہیں، یہ کن کے لیے ہیں، لِقَوْمٍ یَعْقِلُوْنَ ان کے لیے جو عقل وشعور سے کام لیتے ہیں۔

مولانا محمد حنیفؒ ندوی لکھتے ہیں:

"قرآن کا طرز استدلال اس قدر جاذب، فطری اور سادہ ہے کہ منطق ہزار جان سے بلائیں لیتی ہے، وہ مصنوعی اصطلاحات کے گورکھ دھندوں میں ہمیں نہیں پھنساتا بلکہ روزمرہ کے اصولی مشاہدات اس طور پر ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے کہ غور وفکر کی تمام قوتیں بیدار ہوجائیں اور معارف وحکم کے دریا بہنے لگیں، اس طرز استدلال کی مثال یہ ہے کہ وہ سمندر ایک بہت بڑا ذخیرہ آب ہے وہ اس کی جغرافیائی اصطلاحات میں نہیں الجھاتا بلکہ براہ راست طالب کو ساحل سمندر پر لا کھڑا کرتا ہے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے سمندر کے تلاطم وتموّج کو دیکھے، طریقِ تفہیم اس درجہ کامیاب وصحیح ہے کہ شک وشبہ نہیں رہتا۔ مثلاً ان آیات میں اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات کا اظہار اور ثبوت بتاتا ہے کہ وہ صرف ایک ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق کا ایک مقصد ہے اور نظام حشر وقیامت ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ تو وہ الگ موضوع قائم نہیں کرتا، دلائل کی مصنوعی تحلیل وترکیب میں نہیں الجھتا بلکہ مشاہدات کو اس طرح نظروں کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ مضراب عقل میں خود بخود تحریک پیدا ہوجاتی ہے اور ذہن انسانی ان تمام باتوں کو خود بخود جان جاتا ہے اور

اس کے بعد بھی غور وفکر کی وسعتیں ختم نہیں ہوتیں یعنی وہ کہتا ہے کہ رات دن کے اختلاف میں، جہاز وکشتی کے چلنے میں، ابر وباراں کے حیات بخش اثرات میں، زمین پر مختلف النوع حیوانات کے رہنے سہنے میں، ہواؤں کے ادھر ادھر جانے میں اور ابر کی تسخیر میں عقلمندوں کے لیے دلائل ہیں۔ دیکھئے کس سادگی سے قرآنِ حکیم نے کلام وفلسفہ کے تمام مدارج طے کرا دیے ہیں۔ اس حیثیت سے کہ یہ ساری چیزیں ایک افادہ ونظام کے ماتحت ہیں ایک باشعور وبا ارادہ ذات کو چاہتی ہیں، یہ اثباتِ باری ہے۔ اس حیثیت سے کہ ان میں ایک وحدت پس پردہ کارفرما ہے، توحید کی متقاضی ہیں اور پھر اس لیے کہ ان سب میں ایک نفع ہے، مقصد ومنتہا کو چاہتی ہیں، اثبات حشر ونشر ہے، کیا کوئی کتاب اتنا بلیغ، واقعی اور جاذب غور وفکر نہج استدلال اپنے طرز وتفہیم میں رکھتی ہے؟'' (تفسیر سراج البیان، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) قرآن حکیم کا طرز استدلال سادہ، فطری اور عقل وشعور کے عین مطابق ہے۔

۲) وہ ہر انسانی دل پر دستک دیتا ہے کہ وہ عقل وفکر سے کام لے، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ آنکھوں کو کھول کر دیکھے، تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس پھیلی ہوئی کائنات میں نظم وضبط، ترتیب اور ہم آہنگی ہے اور کہیں بھی تضاد اور انتشار، بگاڑ اور فساد نہیں ہے، آفتاب وماہتاب وقت پر طلوع وغروب ہوتے ہیں، موسم اپنے وقت پر ادلتے بدلتے ہیں، درختوں پر پھل پھول اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں اور خود انسان کی پیدائش، بچپن، جوانی اور بڑھاپا اس کی قدرت پر شاہد ہیں اور موت وحیات بھی اسی کی طاقت اور قدرت کا پتہ دیتے ہیں، یہ وہ دلائل ہیں جو پس پردہ نہیں ہیں بلکہ ہر شہری اور دیہاتی، پڑھا لکھا اور ان پڑھ اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ، وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا، اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ، اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ (۱۶۵)	اور کچھ لوگ (ایسے بھی ہیں) جو اللہ کے سوا (دوسروں کو اس کا) شریک و ہمسر ٹھہراتے ہیں اور ان سے محبت رکھتے ہیں جیسی کہ اللہ سے رکھنی چاہیے۔ اور ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔ کاش وہ لوگ جنہوں نے (شرک کر کے اپنے اوپر) ظلم کیا، اس حقیقت کو (آج اس دنیا میں) دیکھ لیتے۔ جسے وہ اس وقت دیکھیں گے جب عذاب ان کے سامنے ہوگا۔ (تو انہیں پتہ چلے گا) کہ قوت تمام تر اللہ کے لیے ہے اور اللہ بہت سخت عذاب دینے والا ہے۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا﴾

اور لوگوں میں سے ہیں جو بناتے ہیں شریک، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر۔

وَمِنَ النَّاسِ اور لوگوں میں سے، مَنْ۔ موصولہ (جو) يَتَّخِذُ بناتے ہیں (اِتَّخَذَ، يَتَّخِذُ، اِتِّخَاذٌ) بنانا، پکڑنا، مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سوائے اللہ کے، دُوْنِ، سوائے، یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر (دوسروں) کو معبود بناتے ہیں، اَنْدَادًا، شریک، اس کا مفرد نِدٌّ ہے۔

﴿يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ وہ ان سے محبت رکھتے ہیں جیسی کہ اللہ سے رکھنی چاہیے۔

يُحِبُّوْنَهُمْ (يُحِبُّوْنَ. هُمْ) وہ محبت رکھتے ہیں، اُن سے (معبودان باطل سے) (كَ. حُبِّ) جیسے کہ، محبت (ہوتی ہے) اللہ تعالیٰ سے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

"(اَنفُس و آفاق میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و قوت کے واضح نشانات دیکھنے کے باوجود) وہ لوگ ہیں جو

اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو اس کا شریک بنا لیتے ہیں اور ان سے اسی طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ سے کرنی چاہیے، بعثتِ محمدی ﷺ کے وقت ہی ایسا نہیں تھا، شرک کے یہ مظاہر آج بھی عام ہیں بلکہ اسلام کے نام لیواؤں کے اندر بھی یہ بیماری گھر کر گئی ہے، انہوں نے بھی نہ صرف غیر اللہ اور پیروں، فقیروں اور سجادہ نشینوں کو اپنا ماویٰ و ملجاء اور قبلہ حاجات بنا رکھا ہے بلکہ اُن سے اُن کی محبت، اللہ سے بھی زیادہ ہے اور توحید کا وعظ ان کو بھی اِسی طرح کھلتا ہے جس طرح مشرکین مکہ کو اِس سے تکلیف ہوتی تھی، جس کا نقشہ اللہ نے اِس آیہ مبارکہ میں کھینچا ہے:

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ، وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (الزمر۳۹:۴۵) اور جب تنہا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے، ان کے دِل منقبض ہو جاتے ہیں اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو خوش ہو جاتے ہیں۔''

(تفسیر احسن البیان)

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں شدید ہے (ان کی محبت) اللہ کے لیے۔

اَشَدُّ (زیادہ شدید) شَدِیْدٌ کا اسم تفضیل (Superlative Degree) اَشَدُّ ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کے متعدد مقامات پر اس مضمون کو کئی طرح سے ادا کیا گیا ہے، ایک مقام پر ارشاد ہوا:

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ، وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (الانعام۶:۱۴) ''کہئے، مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سرِ تسلیم خم کروں (یعنی اس کی فرمانبرداری اور اس کا حکم سب پر حاوی رہے) اور تم کسی حال میں بھی (نافرمانی کر کے) مشرکوں میں شامل نہ ہونا۔''

ایک اور مقام پر اس طرح آیا ہے:

اَتَخْشَوْنَهُمْ، فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (التوبہ۹:۱۳) ''کیا تم (کفار، منافقین) سے ڈرتے ہو، اگر تم مومن ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔''

گویا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور خوف، اس کی حیثیت اور محبت سب پر فوق رہے جبکہ عبادت و

ریاضت تو خالصۃً اسی کی ہو،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی تھی:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَالْعَمَلَ الَّذِیْ یُبَلِّغُنِیْ حُبَّکَ، اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِن نَفْسِیْ وَمَالِیْ وَاَھْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ (مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

''اے اللہ مجھے آپ کی محبت اور اس کی محبت جس سے آپ کی محبت ہو درکار ہے اور ایسے عمل کی توفیق جو مجھے آپ کی محبت تک پہنچا دے، اے اللہ! اپنی محبت کو مجھے اپنے نفس اور جان، مال ومتاع، اہل وعیال اور آب خنک سے زیادہ محبوب بنا دیجئے۔''

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبت الٰہی میں ہر وقت سرشار رہتے تھے۔ صحیح روایات میں ہے کہ آپ راتوں کو اتنی دیر تک نماز میں کھڑے رہتے تھے کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا تھا، یہ دیکھ کر بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ ''اللہ کے رسول ﷺ! آپ کی مغفرت تو اللہ کر چکا ہے آپ یہ زحمت کیوں اٹھاتے ہیں'' جواب ملا ''اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا- کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟'' پھر یہ بھی آتا ہے کہ اگر کسی وقت کاشانۂ نبوت میں ازواج مطہرات کے ساتھ محو گفتگو ہوتے اور جونہی موذن کی صدائے دلنواز گوش مبارک میں پڑتی، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے اور ازواج مطہرات کا بیان ہے کہ یوں محسوس ہوتا گویا ہم سے جان پہچان جاتی رہی ہے۔ بلاشبہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔

﴿وَلَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا، اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ، اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا، وَّاَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ﴾

اور کاش کہ دیکھیں وہ لوگ (جو) کہ ظالم ہیں جب دیکھیں گے (آخرت میں) عذاب کو (تو پکار اٹھیں گے) کہ بلاشبہ قوت تمام تر اللہ کے لیے ہے اور بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

وَلَوْ اور کاش کہ، لَوْ شرطیہ ہے یَرَی، دیکھیں (رَاٰی، یَرٰی، رُؤْیَۃٌ) دیکھنا، جاننا الَّذِیْنَ، وہ لوگ، اسم موصول ہے اس کا مفرد الَّذی ہے، ظَلَمُوْا انہوں نے ظلم کیا، صیغہ جمع مذکر غائب (ظَلَمَ، یَظْلِمُ، ظُلْمًا)

ظلم کرنا قرآن حکیم نے، اللہ تعالیٰ وَحدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، کی ذات وصفات میں شرک کرنے کو ظلم عظیم کہا ہے، "اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ" (لقمان ۳۱:۱۳) "بلاشبہ شرک ظلم عظیم ہے۔"

اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ، جب دیکھیں گے عذاب کو (آخرت میں تو پکار اٹھیں گے) اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا، بلاشبہ قوت کا سرچشمہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے وَأَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ اور اللہ تو سخت عذاب دینے والا ہے۔

آیہ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اہل ایمان کی محبت، اپنے خالق ومالک کے ساتھ سب سے بڑھ کر ہونی چاہیے اور وہ اس پر کسی قسم کی کوئی آنچ نہ آنے دیں، یہی ایمان کا تقاضا ہے۔

۲) وہ رحمٰن ورحیم کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتا، ہر گناہ کو بخش سکتا ہے، مگر شرک کو نہیں، اس میں اس کی عظمت وکبریائی کی توہین ہے، اس کا غضب جوش میں آجاتا ہے، وہ کہتا ہے مشرکین روز قیامت سخت ترین عذاب میں ہوں گے اور اس دن انہیں یہ احساس ہوگا کہ آج قوت واختیار کے تمام خزانے صرف رب قدیر کے ہاتھ میں ہیں اور وہاں ہر شخص اضطراب وپریشانی میں ہوگا، قرآن حکیم نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ، وَاُمِّہٖ وَ اَبِیْہِ وَ صَاحِبَتِہٖ وَ بَنِیْہِ، لِکُلِّ امْرِئٍ مِّنْھُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْہِ (عبس ۸۰:۳۴، ۳۷) "اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا ایک دوسرے کے کام نہ آسکیں گے" جب قریب ترین رشتوں کا حال یہ ہوگا تو دور کا کیا پوچھنا؟ عقلمندی یہی ہے کہ اس دن کی رسوائی اور عذاب سے بچنے کے لیے اس دنیا میں ایمان کا راستہ اختیار کرلیا جائے اور رب کریم کی رحمت اور اس کا فضل تلاش کیا جائے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ (۱۶۶) وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ، وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ (۱۶۷)	(روز قیامت حال یہ ہوگا) کہ وہی (جھوٹے اور غلط) پیشوا اور رہنما جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی عذاب کو دیکھیں گے تو اپنے پیروؤں (مریدوں) سے بیزار ہو جائیں گیا وران کے باہمی تعلقات منقطع ہو جائیں گے اور جو لوگ پیروی کرتے رہے (یعنی مرید) وہ بول اٹھیں گے، کاش! ہمیں (دنیا میں جانے کا) پھر ایک موقع ملے تو ہم بھی ان سے ایسے ہی بیزار ہو جائیں جیسے یہ آج ہم سے بیزار ہو گئے ہیں، اللہ تعالی انہیں ان کے اعمال اس طرح دکھلائے گا کہ وہ ان پر حسرتوں کا مرقع بن جائیں گے اور وہ آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔

﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا﴾

جس وقت بیزار ہوں گے وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی ان سے جنہوں نے پیروی کی۔

اِذْ، جب ظرف زمان، وقت کو ظاہر کرتا ہے، تَبَرَّاَ، بیزار ہوں گے (ب رء) تَبَرَّاَ، یَتَبَرَّءُ، تَبَرُّءً ا باب تفعل، تبرّاً کے معنی ہیں ناپسندیدہ چیز سے الگ ہو جانا، اظہار برأت کرنا، بیزاری ظاہر کرنا، بیماری سے صحت یاب ہونا اتُّبِعُوْا، جن کی پیروی کی گئی (ت ب ع) اِتَّبَعَ یَتَّبِعُ اِتِّبَاعًا، باب افتعال، پیچھے چلنا، اتباع کرنا، اتُّبِعُوْ ماضی مجہول جمع مذکر غائب، جن کی پیروی کی گئی (یعنی پیر) مِنَ الَّذِیْنَ اُن لوگوں سے اتَّبَعُوْا، جنہوں نے پیروی کی (یعنی مرید)۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''(قیامت میں) یہاں اس منظر کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جب آخرت میں مشرکین کے خواص، علماء و امراء اپنے عوام، اپنے مقلدین اور رعایا سے علیحدگی کا اعلان کر دیں گے اور انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیں

گے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ﴾

اور (

جب) دیکھا انہوں نے عذاب اور منقطع ہو جائیں گے اُن سے تمام اسباب۔

وَرَاَوُا، اور دیکھا انہوں (رَاٰی، یَرٰی، رُؤْیَۃٌ) دیکھنا، وَ تَقَطَّعَتْ واحد مؤنث غائب، منقطع ہو گے (ق ط ع) تَقَطَّعَ، یَتَقَطَّعُ، تَقَطُّعًا، باب تفعل، کٹ جانا، منقطع ہونا، رَأَوُا اور تَقَطَّعَتْ دونوں ماضی کے صیغے ہیں لیکن آیت کے شروع میں آنے والے اِذَا کی وجہ سے ان کا ترجمہ ماضی میں نہیں بلکہ مضارع میں کیا گیا ہے۔

''اَلْاَسْبَابُ ''السبّب کی جمع ہے۔ حصول مقصد کے لیے اختیار کیا جانے والا کوئی ذریعہ مثلاً بلندی تک پہنچنے کے لیے رسی، سیڑھی وغیرہ یا ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز تک رسائی کا ذریعہ ہو، اس کے مفہوم میں وسعت پیدا کی جائے تو تعلقات اور روابط کے معنی پیدا ہوں گے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''اہل باطل کے جتنے بھی باہمی تعلقات اور رابطے ہیں..... استادی اور شاگردی کے، ہم نسبی و قرابت کے، ہم وطنی اور دوستی کے، یہ سب اسی دنیا تک محدود ہیں، آخرت میں جو حقائق کے مشاہدہ و معائنہ کا وقت ہوگا سب ایک دوسرے سے بے تعلق بلکہ آپس میں مخالف نظر آئیں گے، یہ قرآن ہی کی نص ہے:

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ (الزخرف:۶۷) ''وہ دن جب آئے گا تو متقین (پرہیزگاروں) کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے''۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا﴾

اور کہا ان لوگوں نے جو پیروی کرتے تھے کاش کہ ہو ہمارے لیے ایک بار لوٹنا (دنیا میں) پس ہم بھی بیزاری کریں ان (پیروں سے) جیسا کہ انہوں نے بیزاری کی ہم سے (آج میدان محشر میں)

وَقَالَ، اور کہا (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، اَلَّذِیْنَ (وہ لوگ جو) اسم موصول، اس کا مفرد اَلَّذِی ہے،

اِتَّبَعُوْا پیروی کرتے تھے یعنی مرید (اِتَّبَعَ، یَتَّبِعُ، اِتِّبَاعًا) پیروی کرنا، لَوْ کلمہ شرط، کاش، اَنَّ لَنَا کَرَّۃً کہ ہو واسطے ہمارے ایک بار لوٹنا، اَنَّ کہ ہو، تاکید کے لیے آتا ہے، لَنَا ہمارے لیے، کَرَّۃً ایک بار لوٹنا (ک رر) کَرَّ یَکُرُّ اصل میں کَرَرَ، یَکْرُرُ تھا، یہاں ادغام کا قاعدہ استعمال کیا گیا ہے یعنی ثقالت دور کرنے کے لیے کَرَرَ کو کَرَّ یَکُرُّ کر دیا گیا، واپس پلٹا، کوئی کام کرنے کے بعد اسے دوبارہ کرنا۔ فَنَتَبَرَّ اَمِنْھُمْ پس ہم بیزاری کریں ان سے کَمَا (کَ.مَا) جیسے کہ تَبَرَّءُ وْا انہوں نے بیزاری کا (اظہار کیا) مِنَّا (مِنْ.نا) ہم۔ سے، یعنی قیامت کا عذاب دیکھ کر جس طرح ان جھوٹے اور مکار پیروں نے ہم سے بیزاری کا مظاہرہ کیا ہے، ہمیں بھی ایک بار دنیا میں لوٹنے کا موقع دیا جائے تو ہم بھی ان کے ساتھ اسی طرح نفرت اور بیزاری کا برملا اعلان کریں گے۔

﴿کَذٰلِکَ یُرِیْھِمُ اللّٰہُ اَعْمَالَھُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْھِمْ، وَمَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ﴾

اس طرح دکھائے گا انہیں اللہ، ان کے اعمال کو حسرت اور افسوس بنا کر، اور نہ وہ نکلنے والے ہوں گے آگ سے۔

کَذٰلِکَ اسی طرح، کلمہ تشبیہ، یُرِیھِمُ اللّٰہُ، دکھائے گا انہیں اللہ تعالیٰ (اَرَی، یُرِی، اِرَاءَۃً) دکھانا، بتانا، اَعْمَالَھُمْ (اَعْمَالَ.ھُمْ) اعمال، ان کے، اعمال کا مفرد عمل ہے، وہ کام جسے ارادۃً کیا جائے۔ آخرت میں کامیابی یا ناکامی کا دارومدار اس دنیا میں اچھے یا برے اعمال پر موقوف ہے، اچھے اعمال مسرت اور شادمانی کا سامان ہیں جبکہ برے اعمال ندامت اور حسرت کا پیغام ہیں، حَسَرٰتٍ اس کا مفرد حَسْرَۃٌ ہے (ندامت، پشیمانی) کسی چیز کے ضائع ہو جانے اور ہاتھ سے جاتے رہنے کو حسرت کہتے ہیں، وَمَا ھُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ اور وہ نہیں نکلنے والے ہوں گے آگ سے (خَرَجَ، یَخْرُجُ، خُرُوْجًا) نکلنا، اس سے اسم فاعل خَارِجٌ اور جمع خَارِجُوْنَ، نکلنے والے خَارِجُونَ سے پہلے بِ آنے سے خَارِجِیْنَ ہوا۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ایام حیات بڑے ہی قیمتی ہیں اس لیے زندگی کو انتہائی ہوشمندی وعقلمندی، فہم وبصیرت اور دانش وبینش سے گزارنے کی ضرورت ہے، یہ اس دنیا میں ایک ہی بار ملتی ہے۔

۲) پیشوا اور رہنما کا انتخاب، ساتھی اور رفیق کا چناؤ حق وصداقت کی بنیاد پر ہونا چاہیے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بصیرت کو بروئے کار لایا جائے، نماز کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی جاتی ہے، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ، اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے پر چلا، ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام کیا، وہ انعام یافتہ لوگ کون ہیں؟ قرآن کہتا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ، وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (النساء۴:۶۸) ''اور جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔

۳) آیت ۱۶۶، ۱۶۷ کا تعلق صرف کفار کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ان میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو شرک وکفر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہ لکھتے ہیں:

''ایسی آیات کے تحت بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ کفار کے ساتھ مخصوص ہیں، افسوس مسلمانوں نے غلط سمجھ لیا ہے کہ ان کے لیے کوئی فکر ووعید نہیں ہے اور ان کے لیے کلمہ توحید کا صرف زبانی اقرار ہی کافی ہو جائے گا، باقی جو کچھ شرکیہ اعمال سے وہ کام لیتے ہیں ان پر ان سے باز پرس نہیں ہوگی، حالانکہ یہ بات سراسر قرآن وسنت کے خلاف ہے۔'' (المنار)

۴) قرآن حکیم کے نزدیک نجات کا دارومدار اعمال صالحہ پر ہے اور اہل ایمان کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـُٔيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ، وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ۲:۶۲) ''یقین جانو کہ نبی عربی کو ماننے والے (مومن) ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی (ان میں سے جس کا) اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان ہوگا اور وہ نیک عمل کرے گا (صرف اسی کا) اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔''

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلاً طَيِّبًا وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۱۶۸) اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۶۹)	لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، وہ تمہیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے نیز اس بات کا کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ نے فرمائی ہیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلاً طَيِّبًا﴾

اے لوگو! کھاؤ اس میں سے (جو) زمین میں ہے حلال اور طیب۔

يٰٓاَيُّهَا، حرف ندا (اے) النَّاسُ (لوگو) منادی، كُلُوْا فعل امر جمع مذکر، کھاؤ (اَكَلَ، يَاْكُلُ، اَكْلًا) کھانا، مِمَّا (مِنْ.مَا) اس چیز سے (جو) مِنْ سے، یہ خاص کر دیتا ہے، فِى الْاَرْضِ زمین میں سے، حَلٰلاً طَيِّبًا حلال اور پاکیزہ، دونوں لفظ اسم حال ہونے کی وجہ سے منصوب (زبر والے) ہیں یعنی اس حال میں کہ وہ اشیاء حلال ہونے کے ساتھ ساتھ طیب (پاکیزہ) بھی ہوں، قرآن کی فصاحت و بلاغت بے مثال ہے، کھانے پینے کے سلسلہ میں حلال اور طیب کے الفاظ کتنے معنی خیز ہیں، جس مال سے تم روزمرہ کے استعمال کی اشیاء خوردنی خریدتے ہو وہ محنت مزدوری اور جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو اور جو چیزیں تم خریدو وہ بھی حلال اور شریعت کی نظر میں جائز ہوں۔ مثلاً گائے بکری کا گوشت فی نفسہٖ حلال ہے مگر جب اسے غیر اللہ کے لیے وقف کر دیا جائے تو حرام ہو جائے گا۔ جبکہ خنزیر کا گوشت نہ حلال ہے اور نہ طیب۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''حلت و حرمت کا مسئلہ اس لیے قابل لحاظ ہے کہ خوراک کا مسئلہ براہ راست ہمارے اخلاق سے تعلق رکھتا ہے، اباحتِ مطلقہ (ہر بات کی کھلی چھٹی) جہاں صحت کے لیے مضر ہے، وہاں اخلاق کے لیے بھی مفید نہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ خاص خاص قسم کی غذائیں خاص خاص نوع کے اخلاق و عادات پیدا کرنے میں

ممد ومعاون ہوتی ہیں، اس لیے وہ دین جو اصلاحِ اخلاق کا مدعی ہے ضروری ہے کہ خوراک کے مسئلہ سے شدید تعرّض کرے۔ ماکولات ومشروبات میں آزادی، آزادی نہیں، بد پرہیزی ہے، حرمت کے سلسلے میں چند چیزیں اسلام نے ملحوظ رکھی ہیں:-

(الف) فطرت عام کا خیال یعنی وہ چیزیں جنہیں عام فطرت انسانی بطور ماکول ومشروب استعمال نہیں کرتی اور ذوقِ سلیم گوارا نہیں کرتا۔

(ب) وہ چیزیں جو سخت مضر ہیں وہ بھی حرام ہیں۔

(ج) وہ اشیاء جو اخلاق وعادات کو بگاڑیں ان کا استعمال بھی ممنوع قرار دیا۔

(د) وہ جن کے استعمال سے شرک پھیلنے کا اندیشہ ہو۔

ان کے علاوہ ہر چیز جو پاکیزہ ہو، ذوقِ سلیم پر اس کا کھانا گراں نہ ہو، حلال ہے۔ طیب کے معنی یہ ہیں کہ اسے جائز وسائل سے حاصل کیا گیا ہو یعنی ایک چیز حلال ہے لیکن اسے چوری سے حاصل کیا گیا ہو تو اس کا کھانا درست نہیں۔'' (تفسیر سراج البیان، جلد اول)

اکل حلال (پاکیزہ رزق) اور صدق مقال (سچی گفتگو) زندگی گزارنے کے وہ سنہری اصول ہیں جس کی اسلام نے سختی سے تاکید کی ہے، حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ناجائز ذرائع سے کمایا ہوا مال دعا کی قبولیت میں مانع ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسافر کی مثال بیان فرمائی جو پراگندہ بال اور خستہ حال ہے (اس کی دعا اِس حال میں ضرور قبول ہونی چاہیے) اور وہ گریہ وزاری سے رب تعالیٰ کے حضور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر مناجات کرتا ہے اور کہتا ہے یَا رَبِّ یَا رَبِّ ''اے میرے رب اے میرے رب'' مگر اُس کی دعا کیسے قبول ہو؟ ''وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِیَ بِالْحَرَامِ .....جبکہ اس کا کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا حرام کا ہے اور مالِ حرام سے ہی اس نے نشوونما پائی ہے'' (صحیح مسلم)

حدیث مبارک میں یہ بھی آیا کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جس وقت مندرجہ بالا آیہ مبارکہ کی تلاوت ہوئی تو سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا ''اے اللہ کے رسول! میرے لیے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری دعاؤں کو قبول فرمایا کرے''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے سعدؓ پاکیزہ چیزیں اور حلال لقمہ کھاتے رہو، اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں قبول فرماتا رہے گا، قسم ہے اس اللہ کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے حرام لقمہ جو انسان اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے اس کی نحوست کی وجہ سے چالیس دن تک اس کی

عبادت قبول نہیں ہوتی اور جو گوشت پوست حرام سے پلا وہ جہنمی ہے۔'' (تفسیر ابن کثیر، جلد اول)

﴿وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾

اور نہ تم پیروی کرو قدموں شیطان کی، تحقیق وہ تمہارے لیے دشمن ہے ظاہر میں (کھلم کھلا)۔

وَّ لَا تَتَّبِعُوْا، اور نہ پیروی کرو، فعل نہی جمع مذکر حاضر (اِتَّبَعَ، يَتَّبِعُ، اِتِّبَاعًا) پیروی کرنا، اہتمام سے پیچھے چلنا، باب افتعال کی وجہ سے اس میں اہتمام کا معنی پیدا ہو گیا، خُطُوٰتِ، قدم، اس کا مفرد خُطْوَةٌ ہے، خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، اِنَّهٗ (اِنَّ. هٗ) بلاشبہ، وہ لَكُمْ (لَ. كُمْ) واسطے، تمہارے عَدُوٌّ، دشمن ہے مُّبِيْنٌ ظاہر (کھلا)، یعنی اس کی دشمنی تمہارے حق میں کوئی پوشیدہ امر نہیں، وہ ڈنکے کی چوٹ تمہاری دشمنی کا اعلان کرتا ہے۔ لہٰذا تم بھی اس کے ساتھ دشمنی کرتے ہوئے اس کی بات ہرگز قبول نہ کرنا۔

﴿اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

وہ تو تمہیں حکم کرتا ہے برائی اور بے حیائی کا اور یہ کہ کہو اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے۔

اِنَّمَا، کلمہ حصر، کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے يَاْمُرُكُمْ تمہیں حکم دیتا ہے (يَاْمُرُ. كُمْ) اَمَرَ، يَاْمُرُ، اَمْرًا حکم دینا، بِالسُّوْٓءِ، (بِ. سُّوْءِ) ساتھ، برائی کے یعنی برائی کا، اس میں ہر قسم کی برائی آ جاتی ہے (دھوکہ، جھوٹ، مکر و فریب، شرک وغیرہ) وَالْفَحْشَآءِ اور بے حیائی کا، اس سے مراد وہ برے کام ہیں جو انسان کو قعر مذلت میں گرا دیتے ہیں جیسا کہ بدکاری، شراب نوشی وغیرہ۔ وَاَنْ تَقُوْلُوْا، اور یہ کہ تم کہو، عَلَى اللّٰهِ، اللہ پر، یعنی اللہ تعالیٰ کے بارے میں، مَا لَا جو کہ نہیں، تَعْلَمُوْنَ، تم جانتے ہو (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، پہچاننا۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) مسلمان کے لیے رزق حلال اور رزق طیب کا حصول زندگی کا جزو لاینفک ہے، اس کے بغیر اعمال صالحہ کی توفیق نصیب نہیں ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا

(المومنون۲۳:۵۱) ''پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو''۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے رزق حلال کے لیے دعا گو رہتے تھے: **اَللّٰھُمَّ اکْفِنِی بِحَلَالِکَ عَنْ حَرَامِکَ وَاَغْنِنِی بِفَضْلِکَ عَمَّنْ سِوَاکَ**، اے اللہ! حرام سے بچا کر حلال روزی میرے لیے کافی بنادے اور اپنے فضل کے ساتھ اپنے سوا غیر سے مجھے بے نیاز بنادے۔''

۲) شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے تم بھی اس سے دشمنی کرو: **اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا** (فاطر۳۵:۶) ''شیطان تمہارا دشمن ہے اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو''

اور دشمن کبھی وفادار نہیں ہوسکتا، وہ تمہیں برائی اور بے حیائی کی طرف بلاتا ہے اور دنیا و آخرت کو تباہ و برباد کر ڈالتا ہے جبکہ رب کریم ہمارا محسن اور مہربان ہے اور وہ ہمیں سلامتی اور ابدی راحت کی طرف بلاتا ہے: **وَاللّٰهُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ** (یونس۱۰:۲۵) ''اللہ تعالیٰ تمہیں سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔'' اب یہ تمہارے اوپر ہے کہ کس کا کہا مانتے ہو؟

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ، قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا، اَوَ لَوْ کَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ (۱۷۰)	اور اُن سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں اُن کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے، اچھا اگر اُن کے آباء واجداد نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو (تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے)؟

﴿وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾

اور جب کہا جاتا ہے اُن سے کہ پیروی کرو، اس چیز کی (جو) اللہ نے نازل کی۔

وَاِذَا، اور جب، اِذَا، ظرف زمان، وقت کو ظاہر کرتا ہے، قِیْلَ، کہا جاتا ہے ماضی مجہول واحد مذکر غائب (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، لَھُمْ (لَ. ھُمْ) واسطے، اُن کے یعنی اُن سے، اتَّبِعُوْا تم سب پیروی کرو، فعل امر جمع مذکر (اتَّبَعَ، یَتَّبِعُ، اِتِّبَاعًا) باب افتعال، پیچھے چلنا، پیروی کرنا، مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ، جو اللہ نے نازل کیا (اَنْزَلَ، یُنْزِلُ، اِنْزَالًا) نازل کرنا، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر کتابیں نازل فرمائیں۔ مختلف ادوار میں مختلف اقوام کی طرف اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے پیغمبر اور رسول بھیجتا رہا اور ان پر کتابیں اور صحیفے نازل فرماتا رہا، سب سے آخر میں خاتم النبیّین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نسل انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لیے قرآن حکیم کو نازل فرمایا۔

﴿قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَ نَا﴾

(تو جاہل لوگوں نے کہا) بلکہ ہم پیروی کریں گے اس چیز کی کہ پایا ہم نے اوپر جس کے اپنے آباء و اجداد کو۔

قَالُوْا انہوں نے کہا ماضی جمع مذکر غائب (قَالَ، یَقُوْل، قَوْلًا) کہنا، بَلْ، بلکہ نَتَّبِعُ ہم پیروی کریں گے، فعل مضارع جمع متکلم، مَآ (جو جس پر) اسم موصول، اَلْفَیْنَا اَیْ وَجَدْنَا یعنی ہم نے پایا اس کا مادہ ہے (ل ف ی) اَلْفٰی یُلْفِیْ، پانا، دیکھنا، وَجَدَ یَجِدُ، کا مترادف ہے، اس کے معنی بھی پانے کے ہیں، بعض اہل لغت کے نزدیک اَلْفٰی یُلْفِیْ کے معنی عقائد و عبادات پر کسی کو کاربند پانے کے ہیں، عَلَیْهِ، اس پر (عَلٰی. ہٖ) یعنی اس طور طریقے پر، اٰبَآءَ نَا، (اٰبَآءَ. نَا) (جس پر) اپنے آباء و اجداد کو (پایا) یعنی جب انہیں حکم دیا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتاب کی پیروی کرو تو جاہل اور اجڈ لوگ کہتے کہ ہم تو صرف اپنے آباء و اجداد کے طور طریقوں کو ہی اپنائیں گے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''گویا طریق آبائی میں خطا و غلطی کا امکان ہی اُن کے نزدیک نہیں اور یہی جمود عین جہالت و ضلالت ہے، آج مشرک قوموں اور مبتدع فرقوں کا بھی یہی حال ہے، جب انہیں اتباعِ حق کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ جواب میں اپنے آباء و اجداد کے رسوم پیش کر دیتے ہیں۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

اَوَ لَوْ کیا، اگرچہ، کلمہ استفہام، تنبیہ اور تعجب کے لیے استعمال ہوتا ہے، کَانَ، ہوں، فعل ناقص،

اٰبَآؤُهُمْ (اٰبَآءٌ.هُمْ) آباء واجداد، اُن کے، اَبٌ کی جمع اٰبَاءٌ ہے، لَا يَعْقِلُوْنَ، نہ سمجھتے ہوں، نہ عقل رکھتے ہوں (عَقَلَ، يَعْقِلُ، عَقْلًا) عقل رکھنا سوجھ بوجھ رکھنا، شَيْئًا، نکرہ۔ کچھ بھی، وَّلَا يَهْتَدُوْنَ اور نہ ہدایت پاتے ہوں (اِهْتَدَى، يَهْتَدِي، اِهْتِدَاءٌ) باب افتعال، ہدایت پانا، اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا یعنی اگر آباء واجداد غلط راستے پر تھے تو کیا بغیر سوچے سمجھے یہ بھی اسی پر چلتے رہیں گے؟

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اسلام اندھی تقلید کا مخالف ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ عقل وفکر سے کام لو، مجرد یہ چیز کہ ایک بات باپ دادا سے چلی آرہی ہے اس کی صحت وصداقت ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر اس کو رکھ کر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ بات اگر مجرد عقل ورائے سے تعلق رکھنے والی ہے تو وہ عقل کی میزان پر پوری اترتی ہے یا نہیں اور اگر دین سے تعلق رکھنے والی ہے تو اس کی کوئی مضبوط اور قابل اعتماد سند ہے یا نہیں؟

۲) 'لکیر کا فقیر ہونا' افراد اور قوموں کی زندگی میں نقصان کا باعث ہوتا ہے، ضد اور ہٹ دھرمی شرفِ انسانیت کے منافی ہے، مصیبت اور معصیت راہ حق پانے میں مانع رہتا ہے، جہالت اور لاعلمی فکر وشعور کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً، صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۷۱)	وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے (اس طرح یہ کافر بھی) بہرے، گونگے اور اندھے ہیں جو (حق بات) سمجھ نہیں سکتے۔

﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ اور مثال ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا۔

مَثَلُ، مثال اس کی جمع اَمْثَال آتی ہے، یہ لفظ کسی صفت اور حالت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، الَّذِیْنَ وہ لوگ جو، اسم موصول ہے کَفَرُوْا، فعل ماضی جمع مذکر غائب (کَفَرَ، یَکْفُرُ، کُفْرًا) حق بات کا انکار کرنا۔

﴿کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ﴾

اس مثال کی طرح جو شخص پکارتا ہے (جانوروں کو) کہ وہ نہیں سنتے۔

کَمَثَلِ (کَ.مَثَلِ) مانند، اس مثال کے، الَّذِیْ جو شخص یَنْعِقُ (نَعَقَ، یَنْعِقُ، نَعْقًا) چلّا کر پکارنا، زور زور سے آواز لگانا، جیسا کہ کہتے ہیں نَعَقَ الْمُؤَذِّنُ، موذن نے اذان دی یا نَعَقَ الرَّاعِی بِغَنَمِہٖ چرواہے نے اپنے گلے کو للکارا یا پکارا۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لینے کی بجائے اندھے بہرے ہو کر محض باپ دادا کی تقلید پر اڑ گئے ہیں ان کی تشبیہ بھیڑ بکریوں کے گلے سے دی گئی ہے جو عقل و ادراک سے بالکل عاری اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہوتا ہے۔ چرواہے کی آواز بے شک اس کے کانوں سے جا ٹکراتی ہے لیکن اس سے آگے اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ چرواہا کس کام کے لیے پکار رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

قرآن حکیم نے ایسے لوگوں کو جو عقل و بصیرت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں جانوروں سے پست تر قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا، وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا، وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا، اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ، بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف ۷:۱۷۹) ''ان کے دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں مگر بصیرت سے محروم ہیں، ان کے کان ہیں مگر وہ ان سے (حق بات) سننے کا کام نہیں لیتے، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔''

اور وہ لوگ جو جانتے بوجھتے کتاب الٰہی پر عمل نہیں کرتے ہیں، قرآن حکیم نے ان کی مثال یوں دی ہے: مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (الجمعۃ ۶۲:۵) ''جن لوگوں کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا اور انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں

لدی ہوئی ہوں، اس سے بھی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا ہے، ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔''

﴿اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً﴾

مگر وہ (جانور) ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے۔

اِلَّا کلمہ استثنا، مگر دُعَآءً، بلانا وَّ نِدَآءً، اور پکارنا، دعا اور ندا میں فرق یہ ہے کہ دعا محض پکارنے اور ندا آواز بلند کرنے کو کہتے ہیں، اَلدُّعَاءُ لِلْقَرِیْبِ وَالنِّدَاءُ لِلْبَعِیْدِ (قرطبی) دعا قریب سے اور ندا دور سے بلانے کو کہتے ہیں۔ کافر اور گمراہ میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر حق وصداقت کو دیکھتا ہے اور پھر اس سے پہلو تہی کرتا ہے تو یہ حیوان کی مانند ہے اور دوسرا خواہشات نفس کا شکار ہوتا ہے اور سیدھی راہ سے ہٹ جاتا ہے، اس میں کبھی تعصب اور ضد شامل ہوتی ہے اور کبھی پندار اور غرور معاون بنتا ہے، بہر حال کافر اور گمراہ دونوں جادۂ حق سے دور ہو جاتے ہیں۔

﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾

(ایسے لوگ) بہرے، گونگے اندھے ہیں پس وہ نہیں سمجھتے۔

صُمٌّ، اَصَمُّ کی جمع ہے یعنی ظاہری طور پر کان رکھتے ہوئے بھی حق بات کو سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، بُکْمٌ، اَبْکَمُ کی جمع ہے یعنی ظاہری طور پر زبان رکھتے ہوئے بھی حق کا اظہار نہیں کر پاتے، عُمْیٌ، اَعْمٰی کی جمع ہے یعنی بصارت رکھتے ہوئے بھی بصیرت سے محروم ہیں۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) کوئی شخص اس وقت تک راہ حق کو نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ ضد اور تعصب کو بالائے طاق نہ رکھ دے، حقیقت کو پانے کے لیے جہاں حقیقی علم کی ضرورت ہے وہاں فہم وشعور اور عقل وبصیرت بھی لازم ہے۔ قرآن حکیم انسانوں کو تدبر وتفکر کی دعوت دیتا ہے: اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ کے الفاظ اسی حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔

۲) سچ تو یہ ہے کہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھا ہوتا ہے جو ہر انسان کے پہلو میں موجود ہے، قرآن اعلان کرتا ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ (الحج ۲۲:۴۶)

''حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں''۔

اور دل کا اندھا پن انسانی شرف و کمال پر ضرب کاری ہے اس سے نہ صرف افراد بلکہ قومیں تباہی و بربادی کے عمیق غار میں جا گرتی ہیں۔ العیاذ باللہ!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۱۷۲) اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ، فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۷۳)	اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا کی ہیں ان میں سے کھاؤ اور اللہ کے شکرگزار بنو، اگر (فی الحقیقت) تم اسی کی بندگی کرتے ہو۔ اللہ نے تو تم پر مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور اس چیز کو جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو، حرام کیا ہے، ہاں جو شخص مجبور ہو، بغیر اس کے کہ وہ (نافرمانی کا) خواہش مند یا حدّ (ضرورت) سے بڑھنے والا ہو، تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اللہ مغفرت فرمانے والا، بہت مہربان ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾

اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزوں میں سے جو کہ ہم نے رزق دیا تم کو۔

يٰٓاَيُّهَا (اے) حرف ندا، الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وہ لوگ جو ایمان لائے، مُنادیٰ (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا)

ایمان لانا، دعوت اسلام قبول کرنا کُلُوْا، تم سب کھاؤ فعل امر جمع مذکر (اَکَلَ، یَأْکُلُ، اَکْلًا) مِنْ طَیِّبٰتِ، پاکیزہ چیزوں میں سے مَا، جو کہ، موصول، رَزَقْنٰکُمْ، (رَزَقْنَا. کُمْ،) رزق دیا ہم نے۔ تمہیں (رَزَقَ، یَرْزُقُ، رِزْقًا) رزق دینا، کھلانا پلانا۔

اس آیہ مبارکہ میں خطاب مومنوں سے ہے کہ وہ اپنی روز مرہ زندگی میں پاکیزہ اور حلال چیزیں استعمال کیا کریں، کھانے کمانے کے ذرائع بھی جائز ہوں اور فی نفسہ بھی وہ چیز حلال ہو، اس سے عبادت و ریاضت میں حلاوت پیدا ہوگی اور ذہن وفکر پاکیزہ رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے شکر کی توفیق نصیب ہوگی۔ اس سے قبل آیت ۱۶۹ر میں یہی خطاب عوام الناس سے تھا۔

﴿وَاشْکُرُوْا لِلّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ﴾

اور شکر کرو اللہ تعالیٰ کا اگر تم خاص اُسی کی عبادت کرتے ہو۔

وَاشْکُرُوْا لِلّٰہِ اور تم سب اس کا شکر ادا کرو فعل امر جمع مذکر (شَکَرَ، یَشْکُرُ، شُکْرًا) اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں پر اس کا ممنون اور احسان مند ہونا اور اپنی جبین نیاز اس کی چوکھٹ پر جھکا دینا، نیز اس کے احکام کی پیروی کرنا اور اسی کی رضا کے لیے اس کے بندوں کی خدمت کرنا اور زندگی عجز وخاکساری سے گزارنا شکر کا حق ادا کرنا ہے، اِنْ کُنْتُمْ اگر ہو تم، اِنْ، شرطیہ کُنْتُمْ، تم ہو (کَانَ، یَکُوْنُ، کَوْنًا) ہونا، اِیَّاہُ (اِیَّا. ہُ) خاص اسی کے لیے تَعْبُدُوْنَ، تم عبادت کرتے ہو (عَبَدَ یَعْبُدُ، عُبُوْدِیَۃٌ، وَعِبَادَۃٌ) عبادت کرنا، زندگی کے ہر معاملہ میں احکام الٰہی کو بجالانا، یہ صرف صوم وصلوٰۃ تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ سیاسی، معاشی، معاشرتی، ملکی اور بین الاقوامی تمام کے تمام امور میں شریعت اسلامیہ کو سامنے رکھنا ہے۔ اِیَّاہُ مفعول ہے، مفعول کو فعل سے پہلے ذکر کرنے کی وجہ سے حصر (زور بیان) کا معنیٰ پیدا ہوگیا ہے۔

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ﴾

بلاشبہ اس نے حرام کیا تم پر مردار اور لہو اور خنزیر کا گوشت۔

اِنَّمَا (اِنَّ. مَا) بلاشبہ۔ جو، اِنَّمَا، کلمہ حصر کلام ہے یعنی جملہ کے شروع میں زور پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، حَرَّمَ، اس نے حرام کیا (ہمارے خالق و مالک نے) فعل ماضی صیغہ واحد مذکر غائب

عَلَیْکُمْ (عَلٰی. کُمْ) پر، تم یعنی تم پر اَلْمَیْتَۃَ۔ مردار یہاں پر اس مردار کا ذکر نہیں ہو رہا ہے جس کا کھانا پہلے ہی حرام ہو جیسا کہ گدھا، گھوڑا بلکہ اس حلال جانور کا ذکر ہے جو طبعی موت سے یا کہیں گر کر یا لاٹھی لگنے سے یا کسی دوسرے جانور کے سینگ کی ضرب سے مر گیا ہو مثلاً بکرا، گائے، ان سب صورتوں میں حرام ہے، طبی نقطہ نظر سے بھی حلال جانور کو ذبح کرنے سے فاسد مادے خون کے ذریعہ خارج ہو جاتے ہیں اور یہ گوشت کھانے سے انسان بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ یاد رہے کہ شریعت کا ہر حکم انسان کے فائدے کے لیے ہے، وَالدَّمَ، اور خون، جانور کو ذبح کرتے وقت بہتا ہوا خون زہریلے مادوں سے لبریز ہوتا ہے جو انسانی معدے کو فوری نقصان پہنچاتا ہے، اور اس کے اثرات دل و دماغ پر پڑتے ہیں، اعضائے رئیسہ کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور انسان عقل سلیم سے عاری ہو جاتا ہے وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ، اور خنزیر کا گوشت، اس میں مضر صحت جراثیم کثرت سے ہوتے ہیں، اطبا کا کہنا ہے کہ اس کا گوشت کھانے سے انسانی دل کے اردگرد چربی پیدا ہوتی ہے اور حرکت قلب میں خلل پیدا ہوتا ہے، سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس وحشی جانور کا گوشت طبیعت کو بے غیرتی کی طرف مائل کرتا ہے۔

﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔

وَمَآ اور جس پر، مَا موصولہ ہے اُهِلَّ، نام لیا جائے، پکارا جائے، فعل ماضی مجہول واحد مذکر غائب (اَهَلَّ، یُهِلُّ اِهْلَالٌ) نام پکارنا، نامزد کرنا، اصل میں ''ھلال'' نئے چاند کو کہتے ہیں، اَهَلَّ الْهِلَالُ کے معنی چاند نظر آنے کے ہیں اور اِسْتَهَلَّ کے معنی رؤیت ہلال کے ہیں اور اِجَابَةُ الْاِهْلَال کے معنی چاند نظر آنے پر آواز بلند کرنے کے ہیں پھر یہ لفظ عام آواز بلند کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ (مفردات القرآن)

وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں وہ سب چیزیں داخل ہیں جنہیں اللہ کا نام چھوڑ کر دوسروں کے ناموں پر تبرکاً مشہور کیا جائے، مثلاً یہ فلاں بزرگ کے نام پر بکرا ذبح کیا جا رہا ہے وغیرہ، ایسی چیزیں گو فی نفسہٖ حلال ہیں مگر پھر بھی شرک پھیلانے کا موجب بنتی ہیں اور شرک تو سب سے بڑا ظلم ہے۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾

پس جو مجبور ہو نہ تو حد سے نکل جانے والا ہو اور نہ زیادتی کرنے والا ہو تو اس پر گناہ نہیں ہے۔

فَمَنِ (فَ. مَنْ) پس جو، اضْطُرَّ، مجبور اور بے بس ہو (اِضْطَرَّ، یَضْطَرُّ، اِضْطِرَارٌ) باب افتعال،

کسی ایسی چیز کے لیے مجبور کر دیا جانا جو کسی شخص کے لیے ناپسند اور نقصان دہ ہو غَيْرَ بَاغٍ نہ حد سے نکل جانے والا ہو، یعنی وہ اپنے نفس میں اُن (حرام اشیاء) کی خواہش نہیں پاتا، (بَغٰی، یَبْغِیُ) خواہش رکھنا، چاہنا، وَلَا عَادٍ اور نہ زیادتی کرنے والا یہ لفظ عَدْوٌ سے نکلا ہے جس کے معنی ظلم کرنے اور حد سے بڑھ جانے کے ہیں، فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ، پس نہیں گناہ اس پر، ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''مخصوص حالات میں جبکہ ہم مجبور ہو جائیں اور ہمارے سامنے موت وحیات کا سوال درپیش ہو، بقدر ضرورت ان (حرام اشیا) کے استعمال کی اجازت مرحمت فرمائی ہے کہ مسلمان کی جان بہرحال عزت و احترام کے قابل ہے، لیکن یہ وہ وقت ہوگا جبکہ ایک طرف کامل اضطرار ہو مثلاً سخت بھوک اور سوائے ان محرمات کے کوئی چیز میسر نہ ہو اور موت کا خدشہ بلکہ یقین ہو دوسری طرف اس کا یقین ہو کہ اُن کے استعمال سے میں بچ سکتا ہوں۔ ان کے علاوہ معمولی حالات میں جبکہ ان کا بدل مل سکے اور شفا قطعی نہ ہو، استعمال ممنوع ہے۔'' (سراج البیان، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

(۱) ایک مسلمان جس نے اپنی ہر چیز اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کے نام پر قربان کر دی ہو وہ لذت طعام وشراب کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں بنا سکتا، رب کریم تو اتنا مہربان ہے کہ بندوں کے لیے انواع واقسام کے سینکڑوں پھل پھول پیدا فرما دیے ہیں جنہیں وہ ذوق وشوق سے استعمال میں لائیں اور حلال اشیاء کھانے پینے ہی میں خیر وبرکت ہے۔

(۲) انسان بالطبع آزاد پیدا کیا گیا ہے، حرام اشیاء کا استعمال کرنا اور غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا، نذر و نیاز دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی دوسرے کی خاطر بیچ رہا ہے حالانکہ یہ حق صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے، اللہ تعالیٰ غیور ہے، وہ کبھی اس بات کو پسند نہیں کر سکتا کہ اس کا بندہ کسی اور سے بھی اس طرح کا تعلق رکھے جس طرح کا تعلق عابد اور معبود کے درمیان ہوتا ہے کیونکہ فرش سے عرش تک سب کچھ رب کائنات کا ہے، اس لیے حمد وثنا اور عبادت وریاضت صرف اور صرف اسی کی ہونی چاہیے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَیَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیۡہِمۡ ۪ وَلَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (۱۷۴) اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالۡہُدٰی وَالۡعَذَابَ بِالۡمَغۡفِرَۃِ ۚ فَمَاۤ اَصۡبَرَہُمۡ عَلَی النَّارِ (۱۷۵)	'جولوگ ان باتوں کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل فرمائی ہیں اور اس کے بدلے تھوڑا سا دنیوی فائدہ اٹھا لیتے ہیں یہ لوگ دراصل اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، روز قیامت اللہ نہ تو ان سے کلام کرے گا اور نہ انہیں پاکیزہ ہی قرار دے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور مغفرت کے بدلے عذاب خریدا، کیسا عجیب ہے ان کا حوصلہ کہ دوزخ کا عذاب برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ﴾

بلاشبہ جولوگ چھپاتے ہیں اُسے جو نازل کیا، اللہ نے کتاب میں سے۔

اِنَّ، حرف تحقیق کلام کے لیے آتا ہے، الَّذِیۡنَ، جولوگ اسم موصول یَکۡتُمُوۡنَ، چھپاتے ہیں فعل مضارع جمع مذکر غائب (کَتَمَ، یَکۡتُمُ، کِتۡمَانٌ) پردہ ڈالنا، چھپانا، مَاۤ، جوموصول، اَنۡزَلَ، نازل کیا فعل ماضی واحد مذکر غائب (اَنۡزَلَ، یُنۡزِلُ، اِنۡزَالٌ) نازل کرنا، اتارنا مِنَ الۡکِتٰبِ، کتاب سے، الۡکِتَاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب، توراۃ، زبور، انجیل، قرآن یا دیگر صحف ربانی۔

﴿وَیَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا﴾ اور خریدتے ہیں ساتھ اس کے قیمت تھوڑی سی۔

وَیَشۡتَرُوۡنَ فعل مضارع جمع مذکر غائب (اِشۡتَرٰی، یَشۡتَرِی، اِشۡتِرَاءً) باب افتعال اِشۡتَرَاء کا

لفظ، خرید وفروخت دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے، سودا کرنا (To Bargain) بِهٖ (بِ.ہٖ) ساتھ، اس کے (کتمان حق کے) ثَمَنًا قَلِيْلًا، تھوڑی پونجی (قیمت) اس سے مراد ہے دنیاوی مال ومتاع یا حقیر چمکتے ہوئے سکے، مطلب یہ ہے کہ ان سکوں کے عوض وہ حق بات کو چھپا لیتے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ﴾

یہ وہ لوگ ہیں نہیں کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں مگر آگ۔

اُولٰٓئِکَ، وہ سب، اسم اشارہ جمع بعید، مَا نہیں نافیہ ہے، یَاۡکُلُوۡنَ، وہ کھاتے ہیں، مضارع جمع مذکر غائب (اَکَلَ، یَاۡکُلُ، اَکْلًا) کھانا، فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ، اپنے پیٹوں میں، بَطَنٌ، کی جمع بُطُون، اِلَّا النَّارَ مگر آگ، مراد جہنم کی آگ، یعنی جو لوگ دنیا کے حقیر مال ومتاع کی خاطر حق بات چھپاتے ہیں وہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں فائدے اٹھالیں انہیں بالآخر جہنم کی دہکتی ہوئی آگ پھانکنی پڑے گی۔

﴿وَلَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیۡہِمۡ﴾

اور نہ بات کرے گا اللہ ان سے قیامت کے روز اور نہ انہیں پاکیزہ ہی قرار دے گا۔

وَلَا اور نہ، یُکَلِّمُہُمُ وہ بات کرے گا ان سے مضارع واحد مذکر غائب (کَلَّمَ، یُکَلِّمُ تَکْلِیْمًا) کلام کرنا، یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ، روز قیامت، وَلَا اور نہ یُزَکِّیۡہِمۡ، وہ تزکیہ فرمائے گا، ان کا (زَکّٰی، یُزَکِّی، تَزْکِیَۃً) پاک کرنا، تزکیہ کرنا، اللہ تعالیٰ انہیں گناہوں سے پاک نہیں کرے گا۔

﴿وَلَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ﴾ اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''اللہ کے نازل کردہ احکام کے چھپانے پر اس شدید تنقید کا اولین ہدف اگرچہ اہل کتاب ہیں لیکن آیت کا مفہوم عام ہے اور ہر ملت کے ان تمام افراد پر منطبق ہوتا ہے جو حق کو..... جسے وہ جانتے ہیں..... چھپاتے اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت لیتے ہوں!..... ''تھوڑی سی قیمت'' سے مراد وہ خاص فوائد ہیں جن کے حصول کے لیے وہ کتمان حق کرتے تھے اور وہ مخصوص مصالح ہیں جو اس کتمانِ حق کے محرک تھے

اور حق واضح کر دینے سے جنہیں نقصان پہنچ جانے کا ڈر تھا! یا ''ثمن قلیل''.....تھوڑی سی قیمت..... سے مراد پوری دنیا ہے! کیونکہ وہ اللہ کی رضا اور اجر آخرت کے مقابلے میں.....جس سے وہ محروم رہیں گے بہرحال ثمن قلیل ہے۔ کھانے کی حلال وحرام چیزوں کو بیان کرتے ہوئے قرآن ان کے بارے میں اعلان کرتا ہے: اُولٰٓئِکَ مَا یَأکُلُوْنَ فِی بُطُوْنِھِمْ اِلَّا النَّار ''وہ اپنے پیٹوں میں کچھ اور نہیں، صرف آگ کھاتے ہیں۔''

یہ گزشتہ منظر سے، جو کھانے کا ہے، پوری طرح ہم آہنگ ہے گویا کہ کتمانِ حق اور بہتان تراشی کی جو قیمت وہ وصول کرتے اور کھاتے ہیں، وہ آگ ہے جس سے وہ اپنے پیٹ بھر رہے ہیں گویا کہ وہ سچ مچ آگ کھا رہے ہیں! اور یہ مجاز نہیں، حقیقت ہے کیونکہ آخرت میں جب یہ لوگ جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے تو آگ ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگی اور آگ ہی ان کا کھانا!

آیات الٰہی کو چھپانے کی انہیں یہ سزا ملے گی کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دِن انہیں نظر انداز کر دے گا اور انہیں ذلیل وخوار کرنے کے لیے قرآن کریم کی تعبیر یہ ہے: وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ، قیامت کے روز اللہ ان سے کلام نہ کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا (کہ وہ جنت میں جاسکیں)

یہ نظر انداز کرنے کی ایک حسی تصویر ہے جو انسانی احساسات اور فہم وادراک سے بہت قریب ہے، نہ کلام! نہ اہتمام! نہ تطہیر! نہ مغفرت! وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ یہ ان کی حالت کی ایک اور تعبیر ہے جو دردناک عذاب کی صورت میں ہوگی۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَۃِ﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خریدا گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو بخشش کے عوض۔

الضَّلٰلَۃَ، گمراہی (ضَلَّ، یَضِلُّ، ضَلَالَۃٌ) گمراہ ہونا، دین حق یا راہ حق سے دور ہونا۔ بِالْھُدٰی (بِ. الْھُدٰی) بدلے، ہدایت کے ''ب'' کے معنی کبھی ساتھ کے ہوتے ہیں مگر یہاں معنی بدلے اور عوض کے ہیں، یعنی ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی، وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَۃِ، اور بخشش کے عوض عذاب لے لیا۔

﴿فَمَآ اَصْبَرَھُمْ عَلَی النَّار﴾ پس کیسا صبر ہے اُن کا آگ پر۔

فَمَآ (فَ.مَآ) پس کیسا ہے، یہاں پر مَا کا کلمہ تعجب کے لیے ہے، صبر کے معنی اپنے آپ کو روکنے کے ہیں (مصائب اور مشکلات میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنا) اور بعض اوقات یہ لفظ جرأت کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی آگ میں اپنے آپ کو ڈالنے کی تدبیر کر کے انہوں نے کس جرأت کا مظاہرہ کیا ہے؟

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''کتنی حماقت اور غباوت کا ہے یہ سودا! اور کتنی بری ہے وہ خرید وفروخت جو انہوں نے کی!.....اور یہ مجاز نہیں سرتاسر حقیقت ہے! ہدایت انہیں بخشی گئی تھی۔ انہوں نے اسے چھوڑ کر گمراہی کو اختیار کر لیا! مغفرت ان کی دست رس میں تھی انہوں نے اسے ترک کر کے عذاب کو اپنا لیا فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ، کتنے صبر کرنے والے ہیں (دیدہ دلیر ہیں) یہ لوگ دوزخ کی آگ پر۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) بنی اسرائیل کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اُن کے علماء اور مشائخ تک کتمانِ حق میں ملوث تھے اور دنیا کے چند سکوں کے عوض حق بات کو چھپاتے تھے۔ اس کا انجام ان کے لیے اچھا نہ ہوا۔ امت مسلمہ کے ہر فرد کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ ایسا کرنے سے اجتناب کرے، بلکہ حق بات کو اقصائے عالم میں پہنچانا ان کی زندگی کا اہم فریضہ قرار دیا گیا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ''(اے مسلمانو!) تم بہترین امت ہو تمھیں لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکیوں کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو جبکہ تمہارا اپنا ایمان بھی اللہ تعالیٰ پر مضبوط ہے۔''

۲) یہ زندگی عارضی اور فانی ہے، دعوت حق کے ثمرات باقی اور جاودانی ہیں جبکہ کتمان حق کا انجام برا اور عبرتناک ہے، عقلمند ہمیشہ انجام پر نظر رکھتے ہیں جبکہ خواہشات نفسانی کے شکار عارضی بات کو ترجیح دیتے ہیں۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ، وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْکِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍۢ بَعِیْدٍ (۱۷۶) لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ، وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ، وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ، وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّکٰوةَ، وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا، وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ، اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا، وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (۱۷۷)	(اہل کتاب جادہ حق سے دور کیوں جا پڑے) یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ نے تو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق کتاب نازل کی تھی تو جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا وہ محض ضد میں آ کر (راہ حق سے) بہت دور نکل گئے، نیکی صرف یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ (حقیقت میں) نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر، روزِ قیامت پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور انبیاء پر (صدق دِل سے) ایمان لائے اور اللہ سے محبت کی خاطر اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں مسکینوں، مسافروں، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں اور غلامی سے نجات دلانے کے لیے خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے نیز (نیک لوگ وہ ہیں) کہ جب عہد کر لیں تو اسے وفا کریں اور ابتلاء و آزمائش اور جنگ کے دوران صبر سے کام لیں، یہ ہیں راستباز اور یہی ہیں پرہیزگار۔

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾

یہ (بات) اس لیے ہوئی کہ بلاشبہ اللہ نے اتاری کتاب حق کے ساتھ۔

ذٰلِکَ اسم اشارہ مذکر بعید بِاَنَّ (بِ. اَنَّ) کہ، بلاشبہ، ُب ٗ سبب کو اور اَنَّ، تحقیق کلام کو ظاہر کرتا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ کتاب اتارنے کا مقصد بلاشبہ (حق بات کو ظاہر کرنا ہے) اللّٰہَ نَزَّلَ الْکِتٰبَ اللہ نے نازل کیا کتاب کو بِالْحَقِّ، (بِ. الْحَقِّ) ساتھ، حق کے، تمام آسمانی کتب کے نزول کا مقصد حق بات کو ظاہر کرنا تھا۔

﴿وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْکِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍۢ بَعِیْدٍ﴾

اور بے شک جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا وہ محض اپنی ضد میں آ کر (راہ حق سے) بہت دور نکل گئے۔

وَاِنَّ اور بے شک تحقیق کلام کے لیے، الَّذِیْنَ، وہ لوگ جنہوں نے، اسم موصول اخْتَلَفُوْا، اختلاف کیا فعل ماضی جمع مذکر غائب (اِخْتَلَفَ، یَخْتَلِفُ، اِخْتِلَافًا) اختلاف کرنا، فِی الْکِتٰبِ، کتاب میں الْکِتٰبِ، کتاب الٰہی، تورات، انجیل، زبور اور قرآن حکیم، لَفِیْ (لَ. فِیْ) ضرور ہیں لام زبر کے ساتھ بھی جملے میں تاکید پیدا کرتا ہے، شِقَاقٍ، مصدر ہے اس کے معنی ضد اور مخالفت کے ہیں اس کا مادہ (ش، ق، ق) شَاقَّ یُشَاقُّ، سے فِعَالٌ کے وزن پر شِقَاقٌ مصدر ہے بَعِیْدٍ، دور شِقَاقٌ کی صفت ہے، یعنی کتاب الٰہی میں اختلاف کرنے والے محض ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے راہ حق سے دور جا پڑے ہیں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ کتاب اللہ تو روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے۔

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾

نہیں ہے نیکی (صرف یہ) کہ تم پھیر لو، اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف۔

لَیْسَ، نہیں، فعل ناقص، ماضی واحد مذکر غائب، الْبِرَّ مصدر ہے، نیکی اور بھلائی، پسندیدہ عمل۔ بِرّ ایسا جامع لفظ ہے جو ہر اس نیکی پر بولا جاتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی مطلوب ہو، اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ، کہ تم پھیر لو اپنے چہروں کو، اَنْ، کہ حروف ناصبہ میں سے ہے جو اپنے بعد والے فعل کو زبر دیتے ہیں اور اگر نون جمع کا ہو تو وہ گر جاتا ہے، تُوَلُّوْن تھا، اَنْ کی وجہ سے تُوَلُّوْا رہ گیا، وُجُوْهَکُمْ (وُجُوْهَ. کُمْ) چہرے، اپنے، وَجْهٌ، اس کا مفرد ہے، قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، طرف مشرق اور مغرب کے۔

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ﴾

بلکہ نیکی (یہ ہے) جو ایمان لایا اللہ پر، روزِ قیامت پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور انبیاء پر۔

وَلٰكِنَّ، کلمۂ استدراک، کلام سابق سے پیدا ہونے والے اشکال کو دور کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اَلْبِرَّ، نیکی، مَنْ، جو کلمہ موصولہ اٰمَنَ (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا) ایمان لانا، بِاللّٰهِ، اللہ تعالیٰ پر، بِرّ (نیکی) کی پہلی بنیاد ایمان باللہ ہے اس کے بغیر "بِرّ" کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرُ اور آخرت کا دن، جس دن ہر شخص کا حساب کتاب ہوگا وَالْمَلٰٓئِكَةِ اور فرشتوں (پر) اس کا مفرد مَلَكٌ (لام کی زبر کے ساتھ) یہ بھی اللہ کے بندے ہیں جو اس کے احکام کو بجالاتے ہیں وَالْكِتٰبِ، 'ال' نے خاص کر دیا، اس سے مراد وہ تمام کتابیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں وَالنَّبِيّٖنَ، نَبِيٌّ اس کا مفرد ہے، نبوت صرف اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہوتی ہے، ذات صلاحیت سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔

﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ، وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ﴾

اور (اس نے) دیا مال اللہ سے محبت کی خاطر قرابت والوں کو، اور یتامیٰ کو اور مساکین کو اور مسافروں کو اور سائلین کو اور غلامی سے نجات دلانے کے لیے۔

وَاٰتَى اور دیا (اٰتَى، يُؤْتِيْ، اِيْتَاءٌ) دینا، عطا کرنا۔ اَلْمَالَ، مال و دولت، عَلٰى حُبِّهٖ، اس کی محبت کی خاطر (حُبِّ.ہٖ) رضامندی، اس کی، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے، ذَوِي الْقُرْبٰى، قرابت دار، رشتے میں قریب، فی سبیل اللہ خرچ کرنے میں سب سے اولین حقدار رشتہ دار ہیں، وَالْيَتٰمٰى، اس کا مفرد یتیم ہے، بالغ ہونے سے پہلے جن بچوں کے والدین وفات پا جائیں، یتامیٰ کہلاتے ہیں، وَالْمَسٰكِيْنَ اس کا مفرد مسکین ہے، مسکین وہ شخص ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو، یہ فقیر سے بھی زیادہ نادار اور مفلوک الحال ہوتا ہے (مفردات القرآن) وَالسَّآئِلِيْنَ اس کا مفرد سائل ہے اس سے مراد وہ شخص ہے جو مدد کے لیے ہاتھ پھیلائے۔ ان میں سے بعض تو مجبور ہوتے ہیں اور بعض عادی سائل ہوتے ہیں۔ جو عادی سائل ہوں انہیں نرمی سے سمجھا دینا چاہیے کہ وہ محنت مزدوری کر کے روزی کمائیں، وَفِي الرِّقَابِ، اس کا مفرد رقبہ ہے اس کا معنی گردن کے ہیں محاورۃً ایسے غلام اور قیدی مراد ہیں جنہیں بلا جواز قید و بند اور غلامی میں رکھا گیا ہو۔

﴿وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ، وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا، وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ﴾

اور (جو) نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے (نیز نیک لوگ وہ ہیں) کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور صبر کرنے والے تنگ دستی اور مصیبت میں اور بیماری کے دوران اور جنگ کے وقت۔

وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ اور نماز کو قائم کرے (اَقَامَ، یُقِیْمُ، اِقَامَۃً) قائم کرنا، نماز کو پابندی کے ساتھ با جماعت خشوع خضوع کے ساتھ ادا کرنا، وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ، دی زکوٰۃ، زکوٰۃ مال کا وہ حصہ ہے جو غرباء و مساکین کو نصاب پورا ہونے پر دیا جاتا ہے۔ وَالْمُوْفُوْنَ اور پورا کرنے والے، اسم فاعل جمع مذکر ہے (اَوفٰی، یُوْفِیْ، اِیْفَاءٌ) پورا کرنا، وفا کرنا، بِعَھْدِھِمْ (ب. عَھْدِھِمْ) ساتھ، اپنے وعدوں کو یعنی اپنے عہد و پیمان کو، اِذَا جب ظرفِ زمان، زمانے اور وقت کے لیے آتا ہے، عَاھَدُوْا، وہ وعدہ کریں، فعل ماضی جمع مذکر غائب (عَاھَدَ، یُعَاھِدُ، مُعَاھَدَۃً) باب مفاعلہ، وعدہ کرنا، یعنی کبھی وہ وعدہ شکنی نہیں کرتے بلکہ وعدہ پورا کرتے ہیں، وَالصّٰبِرِیْنَ اور صبر کرنے والے (ص ب ر) (صَبَرَ، یَصْبِرُ، صَبْرًا) صبر کرنا۔ اس سے اسم فاعل صَابِرٌ اور جمع صَابِرُوْنَ ہے یہاں پر حالت نصبی میں صَابِرِیْنَ لایا گیا ہے اور اس میں مزید صبر کی کیفیت اجاگر ہوگئی ہے، الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ، تکلیف اور اذیت بَاْسَاءِ عموماً کسی جسمانی تکلیف اور ضَرَّآءِ عموماً ذہنی اذیت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور حِیْنَ الْبَاْسِ، جنگ کے وقت۔ بَاْسٌ ان پریشانیوں کو کہتے ہیں جو جنگ کے مواقع پر جسم و جان اور ذہن و فکر کو لاحق ہوتی ہیں۔

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا، وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

تو لوگ یہی ہیں جنہوں نے سچ بولا اور یہی ہیں وہ جو پرہیزگار ہیں۔

اُولٰٓئِکَ، اسم اشارہ بعید (جمع کے لیے) الَّذِیْنَ اسم موصول، صَدَقُوْا، سچ بولا، ماضی جمع مذکر غائب (صَدَقَ، یَصْدُقُ، صِدْقًا) سچ بولنا، وَاُولٰٓئِکَ، اور یہی وہ لوگ ہیں، ھُمُ، وہ جو، الْمُتَّقُوْنَ پرہیزگار ہیں اسم فاعل جمع مذکر، اس کا مفرد مُتَّقِیْ ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''عام لوگ رسوم ظاہری تک ہی تقویٰ کا مفہوم محدود رکھتے ہیں اور دیگر حالات پر غور نہیں کرتے اور یہ

اُس وقت ہوتا ہے جب دین کی روح باقی نہ رہے اور محض ظاہر پرستی سے عمل ہو، جب کسی قوم کی یہ حالت ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ حقائق دین سے قطعاً محروم اور برائے نام مسائل پر محض رکھ رکھاؤ کے لیے عامل ہے، نزولِ قرآن کے وقت یہودیوں اور عیسائیوں کی بالکل یہی کیفیت تھی، فسق و فجور میں ہر وقت سرشاری کے باوجود ایک دوسرے کو کافر کہتے، چھوٹے چھوٹے مسائل پر جھگڑتے، معمولی اختلافات ڈالتے یہ اختلافِ عمل ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا، لیکن عملی زندگی میں بڑی سے بڑی بدمعاشی نہ صرف گوارا ہوتی بلکہ راحتِ جان ہوتی۔ تحویل قبلہ کے موقع پر ان لوگوں نے شور مچا دیا کہ دیکھئے مسلمان بدل گئے۔ انبیاء کے مسلمہ قبلہ کے روگردان ہو گئے اور الحاد و زندقہ میں مبتلا ہو گئے، قرآن حکیم نے اس اعتراض کے متعدد جواب دیئے اور آخری جواب وہ دیا جو ان آیات میں مذکور ہے کہ مدارِ مذاہب ظاہر شعائر و رسوم نہیں، اُن کا مغز اصل ہے بیت اللہ یا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ ان کے لیے ضروری ہے کہ لوازم کا بھی خیال رہے، کیا تم سمجھتے ہو کہ بیت المقدس کو قبلہ مان کر تم شریعت کی ہر ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ جب تک مشرق و مغرب کی تعیین نہ ہو نیکی کا مفہوم ہی غلط رہتا ہے؟ نہیں، کعبہ ہو یا بیت المقدس ان کو قبلہ بنانے کا مقصد یہ نہیں جو تم سمجھتے ہو کہ ظاہر پر اکتفا کر دیا جائے اور بس! بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے دل میں شریعت کا پورا پورا احترام ہو، ظاہر کے ساتھ باطن کی باریکیوں پر بھی تمہاری نظر ہو، جذبہ عمل پورے جوش کے ساتھ کارفرما ہو۔ جہاں دل کی گہرائیاں ایمان باللہ کی روشنی سے روشن ہوں، وہاں اس کے نتائج بھی عیاں ہونے چاہئیں۔'' (سراج البیان، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) اللہ تعالیٰ کا دین فطرت کی آواز ہے، لوگ محض ذاتی خواہشات اور ہوائے نفس سے اختلافات پیدا کرتے ہیں یا پھر ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر راہ حق سے دور جا پڑتے ہیں۔

۲) نیکی کی اساس اور بنیاد ''ایمان باللہ'' اللہ پر ایمان ہے، اس کے بغیر کسی نیکی کا اجر ثبت نہیں ہو سکتا ہے۔

۳) تصور آخرت اور تمام اعمال کے لیے جوابدہی کے احساس سے انسان کو نیک اعمال کرنے اور برے اعمال سے بچنے کا احساس دامن گیر رہتا ہے۔

۴) ملائکہ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے ان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ یہ براہ

راست اللہ تعالیٰ سے وحی اخذ کر سکتے ہیں، انبیاء علیہم السلام پر جبریل امین وحی لاتے رہے، اور اللہ کے احکام بلاکم وکاست ان تک پہنچاتے رہے، ملائکہ ہمہ وقت اپنے رب کی حمد وثنا میں مصروف رہتے ہیں۔

۵) **ایمان بالکتب** کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام جبریل امین کے ذریعہ بشکل وحی نازل فرمائے۔ جنہیں کتابی شکل میں ترتیب دیا گیا گویا **ایمان بالملئکۃ، ایمان بالکتاب اور ایمان بالانبیاء** سب ایک دوسری سے متصل کڑیاں ہیں، ان سب کو سچا جاننا ایمان کا تقاضا ہے۔

۶) جان و مال اللہ تعالیٰ نے عطا کیا، اس لیے اسے اس کی راہ میں لٹانا سعادتمندی کی دلیل ہے، اِن صدقات وخیرات کے اولین مستحق عزیز واقارب ہیں، اور ان کی عزت وحفاظت کا خیال رکھنا ہماری سب سے اہم ذمہ داری ہے۔ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ مسکین کو خیرات دینا صرف صدقہ ہی ہوگا مگر رشتہ دار کو خیرات دینے میں دو حیثیتوں سے ثواب ملے گا، ایک صدقہ کے اعتبار سے، دوسرے صلہ رحمی کی بنا پر۔

۷) یتامیٰ کی نگہبانی سے معاشرے کو مضبوط اور توانا بنانا مقصود ہے۔ اگر ان کی تعلیم اور بود و باش کا خیال نہ کیا گیا تو غیر تربیت یافتہ افراد کی کثرت قوم کو برباد کر دے گی لیکن ان کی تھوڑی سی مدد بھی نہایت مفید نتائج برآمد کرے گی۔

۸) مساکین وہ لوگ ہیں جو فقر اور تنگدستی میں گھرے ہوئے ہوں اور عزت نفس کی وجہ سے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں۔ ان کا خیال رکھنا اور ان کی مدد کو پہنچنا، گویا معاشرے کو اطمینان وسکون عطا کرنا ہے۔

۹) مسافر جن کا زادراہ ختم ہو جائے یا لٹ جائے بڑی پریشانی میں ہوتا ہے، ایسی بے سروسامانی میں عزت وآبرو کا خیال رکھنے والے مسافر سخت غم زدہ ہو جاتے ہیں، ان کی مدد کرنا بہت بڑا اجر ہے۔

۱۰) ایسے سائل جو واقعی مجبور ہو کر دست سوال دراز کرتے ہیں اور فقر وفاقہ انہیں مجبور کر دیتا ہے، انہیں بھی اللہ کے دیے ہوئے مال سے دینا اجر وثواب کا باعث ہے۔

۱۱) گردنیں آزاد کرنے میں اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا مال لٹانا بھی اجر عظیم کا باعث ہے، جو مظلوم بے قصور قید و بند میں پڑے ہیں انہیں آزادی دلوانا اور پھر دنیا کی ہر غلام ومحکوم قوم کو آزاد کرانے کے لیے ہر قسم کی جانی ومالی قربانی دینا بھی اہل حق کا فریضہ ہے۔

۱۲) اس کے ساتھ اقامت صلوۃ اور ادائے زکوٰۃ کا فریضہ بھی سرانجام دینا ہے۔ بندہ مومن کو دن میں پانچ وقت اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے، پھر اس کے بندوں کی خدمت سے مزید اس مولا و مالک کی رضامندی ملتی ہے۔

۱۳) پھر یہ وفادار بندے اپنے تمام عہد و پیمان کو جو وہ اپنے رب سے باندھتے ہیں یا آپس میں کرتے ہیں انہیں پورا کرتے اور ان کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔

۱۴) زندگی کے ان تمام مراحل میں عزم و یقین اور صبر و ثبات کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں ہر جسمانی تکلیف اور ذہنی کرب کو برداشت کرتے ہوئے اپنے خالق و مالک کی مدد کو تلاش کرتے ہیں، یہاں تک کہ جنگ کے ایام میں ہر قسم کے خطرات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں۔

۱۵) مندرجہ بالا باتوں پر دوام اور ثبات سے انہیں اہل تقوی کے زمرہ میں شمولیت کا مژدہ جانفزا سنایا جا رہا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۷۸)	اے ایمان والو! تم پر (مقتولوں کا) قصاص فرض کر دیا گیا ہے، آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے، ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی (مقتول کا وارث) قصاص معاف کر دے تو معروف طریقے سے خون بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل یہ رقم بہتر طریقے سے مقتول کے وارثوں کو ادا کرے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے تو جو کوئی اس کے بعد حد سے تجاوز کرے، اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، (لازم کیا گیا) تمہارے لیے قصاص مقتولوں کے بارے میں۔

یٰۤاَیُّهَا کلمہ ندا، الَّذِیْنَ وہ لوگ، اسم موصول، اٰمَنُوْا (جو) ایمان لائے (اٰمَنَ، یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا) ایمان لانا، دعوتِ اسلام کو انشراحِ صدر سے قبول کرنا۔ کُتِب لکھا گیا، فرض قرار دیا گیا، ماضی مجہول صیغہ واحد مذکر غائب (کَتَبَ، یَکْتُبُ، کِتَابًا) لکھنا، لازم قرار دینا الْقِصَاصُ، (ق،ص،ص) قَصَّ یَقُصُّ، کے لغوی معنی پیچھا کرنا اور نقش قدم پر چلنا کے ہیں، قتل کرنے یا کسی کو زخمی کرنے کے بعد جو سزا مجرم کا پیچھا کرتی ہے اسے "الْقِصَاصُ" کہا جاتا ہے، فِی الْقَتْلٰی مقتولوں کے بارے میں، اَلْقَتْلٰی، مقتولین القتیل کی جمع ہے اور بعض اوقات عربی زبان میں فَعِیْلٌ کا وزن مَفْعُوْلٌ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہاں بھی قتیل بمعنی مَقْتُوْلٌ ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''اس حال میں کہ جب تم اپنی حکومت رکھتے ہو اور سزاؤں کے نفاذ پر باقاعدہ قدرت رکھتے ہو، اسلام اپنے ماننے والوں سے دنیاوی سربلندی کی بھی توقع رکھتا ہے اور اسے بطور ایک مسلّمہ کے فرض کئے رہتا ہے کہ امت (مسلمہ) دنیاوی اقتدار کی بھی مالک ہوگی، مسلمانوں کا صدیوں تک مسلسل کافروں کے تسلط اور اقتدار میں رہنا اسلام کے مفروضاتِ اولین میں گویا داخل ہی نہیں۔ قانونِ فوجداری اور قانونِ دیوانی دونوں کی اکثر دفعات کا نفاذ نظامِ حکومت کے اسلامی ہونے پر معلّق ہے یعنی امت کو اِن قوانین الٰہی کی تنفیذ کی باقاعدہ قدرت بھی تو ہو اور قصاص یہ انتقام محض کا مترادف نہیں کہ ہر فرد دوسرے فرد سے از خود لینا شروع کردے بلکہ قانونِ فوجداری کے ماتحت سزا کی منظّم، مہذب، منضبط ترین شکل کا نام ہے، امت کا ایک قانونی واجتماعی حق ہے، اس کے اجرا کی ذمہ داری حکومت یا اہل حل وعقد پر عائد ہوتی ہے اور یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں مومنین سے خطاب اجتماعی حیثیت سے ہے۔ انفرادی حیثیت سے نہیں، اور قَتْلٰی، قتل عمد کی سزا دنیا کے ہر قانون میں عموماً قتل ہی ہے۔ البتہ خود قتل عمد کی تعریف میں بہت کچھ اختلافات ہیں، شریعت اسلامی کی اصطلاح میں قتل عمد وہ ہے کہ کوئی کسی کو ارادہ کر کے کسی آہنی سلاخ سے یا کسی اور حربہ سے جس سے گوشت پوست کٹ کر خون بہہ سکے، قتل کرے اور فقہا نے تصریح کر دی ہے کہ قصاص یعنی سزائے قتل اسی قتل کے

ساتھ خاص ہے۔'' (تفسیر ماجدی)

﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی﴾

آزاد کے بدلے آزاد، اور غلام کے بدلے غلام، اور عورت کے بدلے عورت۔

اَلْحُرّ، آزاد، اس کی جمع احرار آتی ہے، بِالْحُر، بدلے آزاد کے یہاں ''ب'' کا معنی بدلے کے ہیں، وَالْعَبْدُ، اور غلام بِالْعَبْد، بدلے غلام کے، وَالْاُنْثٰی، اور عورت، بِالْاُنْثٰی، بدلے عورت کے۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''اسلام سے پہلے قصاص وانتقام کا مفہوم بھی صاف نہیں تھا، یہودی قاتل اگر امیر ہوتا تو چھوڑ دیتے اور اگر غریب ہوتا تو کچھ روپیہ لے کر معاف کر دیتے اگر غلام ہوتا تو پھر ان کی شریعت نوازی جوش میں آجاتی جس کے معنی یہ ہیں کہ تعزیرات کا باب صرف غرباء کے لیے ہے اور روپیہ پیسہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں نرمی پیدا کرسکتا ہے۔ قریش مکہ بھی اس مذموم ذہنیت سے آلودہ تھے، ان کے سردار وصنادید بھی محض سرمایہ داری کے بل پر ہر تعزیر سے بچ جاتے، قرآنِ حکیم جو عدل وانصاف کا اعلان ہے بھلا کب اِس ظلم اور جنبہ داری کو برداشت کرسکتا تھا، چنانچہ اس نے فرمایا کہ قصاص کے معاملہ میں کوئی رعایت نہیں، آزاد کے بدلے آزاد مارا جائے اور عزت وسرمایہ کو کوئی درجہ نہ دیا جائے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب کا درجہ یکساں ہے۔ اس کے کسی ایک بندے کو حقوقِ زندگی سے محروم کر دینا بہر حال سزاوارِ تعزیر ہے۔ (سراج البیان، جلد اول)

﴿فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

پس جو کوئی معاف کیا گیا، اپنے بھائی کی طرف سے کچھ، تو اتباع کرنا ہے ساتھ معروف طریقے کے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''مقتول کے وارث کو قاتل کا بھائی کہہ کر نہایت لطیف طریقے سے اس سے نرمی اختیار کرنے کی سفارش بھی کر دی گئی ہے۔ یعنی وہ قصاص معاف کر دے اور دیت قبول کر لے۔ اگلی امتوں میں سے یہود پر اللہ تعالیٰ نے قصاص فرض کیا تھا، ان میں عفو کا قانون نہیں تھا اور نصاریٰ میں صرف عفو کا حکم تھا، قصاص کا نہیں تھا۔ اس امت (محمدیہ) پر اللہ تعالیٰ نے آسانی اور مہربانی فرمائی اور دونوں باتوں کی اجازت دی،

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مقتول کے وارثوں کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے خواہ وہ فدیہ لے لیں یا قصاص۔'' (تیسیر القرآن، جلد اول)

﴿وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ﴾ اور ادا کرنا ہے اسے، یعنی احسان کے ساتھ۔

وَاَدَآءٌ اور ادا کرنا ہے اِلَيْهِ، (اِلیٰ ہِ) طرف اس کے، یہاں پر ''ہٖ'' ضمیر کا اشارہ اَخ (بھائی) کی طرف ہے یعنی مقتول کے وارث کو دیت کی مقررہ رقم نہایت خوش اسلوبی اور عمدہ طریق پر پہنچائی جائے اور اسے مزید کسی قسم کی ذہنی تکلیف اور گزند نہ پہنچائی جائے کیونکہ اس کا دل مقتول کے صدمہ سے پہلے ہی مجروح ہو چکا ہے۔

﴿ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ﴾

یہ (بات) کمی ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت ہے۔

ذٰلِكَ، یہ، اسم اشارہ بعید، یعنی قصاص کی جگہ دیت کا حکم، تَخْفِيْفٌ، کمی، آسانی اور سہولت، مِنْ رَّبِّكُمْ، تمہارے رب کی طرف سے، وَرَحْمَةٌ، اور رحمت، اس نے اپنے فضل اور رحمت سے تمہارے لیے یہ اصول وضع فرمائے ہیں۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

پس جو کوئی زیادتی کرے اس کے بعد تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔

فَمَنْ (فَ، مَنْ) پس، جو کوئی، اعْتَدٰى، زیادتی کرے، حد سے بڑھے (اِعْتَدَى، يَعْتَدِى، اِعْتِدَاءً) زیادتی کرنا۔ بَعْدَ ذٰلِكَ، اس دیت اور قصاص کے حکم کے بعد فَلَهٗ (فَ، لَهٗ) پس، اس کے لیے ہے عَذَابٌ اَلِيْمٌ. عذاب، دردناک۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) قانون معاشرتی زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرتا ہے، اور وہ سلامتی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ نیز سچا اور اچھا قانون بے لاگ ہوتا ہے۔ اس کا اطلاق ہر شہری پر ہوتا ہے..... آزاد، غلام، امیر غریب، شہری اور

دیہاتی سب کے سب اس کی زد میں آتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر ہر زبردست زیردست کو دبانے لگے۔ ہر طاقتور کمزور کا جینا تنگ کر دے، اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ قانون عدل وانصاف پر مبنی ہے، وہ ہر چھوٹے بڑے، اپنے پرائے کو انصاف فراہم کرتا ہے یہی اصول صداقت ہے۔

۲) اس میں اگر کہیں نرمی اور لچک ہے تو وہ بھی انصاف اور مروت پر مبنی ہے۔ ظلم وستم کا کہیں بھی، دور دور تک نام ونشان نہیں ہے۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی: ''ایک طرف قصاص کی بظاہر سختی، دوسری طرف دیت اور عفو کی نرمی، یہ حسن امتزاج اور اعتدال وتوازن کا یہ مکمل قوام اسی قانون کا حصہ ہوسکتا ہے جو بشری دماغ سے نہیں، حکمت مطلق سے نکلا ہو۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۷۹)	اور اے اہل دانش! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے، شاید تم پرہیز گار ہو جاؤ۔

وَلَكُمْ (وَلَ. كُمْ) اور لیے، تمہارے، فِي الْقِصَاصِ، قصاص میں، (قَصَّ، يَقُصُّ) کے لغوی معنی پیچھا کرنا اور نقش قدم پر چلنے کے ہیں، کسی شخص کو ناحق قتل کرنے یا کسی کو زخمی کرنے کے بعد جو سزا مجرم کا پیچھا کرتی ہے اسے ''القِصَاص'' کہا جاتا ہے، حَيٰوةٌ، زندگی (ہے) يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ اے عقل والو!، اَلْبَاب لُبّ کی جمع ہے لُبّ کے معنی، عقل وشعور اور فہم وفراست کے ہیں، یعنی قانونِ قصاص کے نفاذ سے معاشرتی زندگی امن وسلامتی سے ہمکنار ہو جائے گی۔ (لَعَلَّ. كُمْ) تا کہ۔ تم، تَتَّقُوْنَ تقویٰ اختیار کر لو (اِتَّقٰى، يَتَّقِيْ، اِتِّقَاءٌ) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس کی نافرمانی سے بچنا، جب تم قانونِ قصاص کا نفاذ کرو گے تو تمہارے اندر آخرت میں جوابدہی کا خوف پیدا ہوگا اور ایک دوسرے کے حقوق کی تلفیوں سے بچ جاؤ گے۔

مولانا امین احسنؒ اصلاحی لکھتے ہیں:

''یہ معاشرہ کو تلقین ہے کہ قصاص کے معاملہ میں کسی سہل انگاری، کسی جانبداری، کسی چشم پوشی اور کسی بے جا رحم ومروت کو حائل نہیں ہونے دینا چاہیے، جو کسی کو قتل کر دیتا ہے وہ صرف ایک شخص ہی کو قتل نہیں کرتا

بلکہ ایک قانون کو قتل کرتا ہے جو سب کی جان کا ضامن ہے اس وجہ سے وہ گویا سب ہی کو قتل کر دیتا ہے، اس وجہ سے یہ سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا قصاص لے کر اس ضمانت کو بحال کریں جس میں سب کی زندگی ہے، معاشرے کا جو شخص کسی قاتل کو پکڑتا ہے یا اس کا سراغ لگاتا ہے یا اس کے جرم کے ثبوت فراہم کرتا ہے اور اس طرح مقتول سے قصاص کی راہ کھولتا ہے وہ گویا اس مقتول کو بھی زندہ کرتا ہے اور ساتھ ہی پورے معاشرے کو بھی زندگی بخشتا ہے کیونکہ وہ اپنی اس خدمت سے اس قانون کو زندہ کرتا ہے جو سب کے لیے زندگی ہے، قرآن نے اس حقیقت کی طرف سورہ مائدہ میں یوں اشارہ فرمایا ہے:

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا، وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدۃ:۳۲) ''یہ کہ جس نے قتل کر دیا کسی جان کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی جان کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سب کو قتل کر دیا، اور جس نے اس کو زندہ کیا تو گویا اس نے سب ہی کو زندہ کیا۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

سید قطبؒ شہید لکھتے ہیں:

''قصاص انتقام نہیں ہے! وہ کینہ کی پیاس بجھانا بھی نہیں ہے! وہ اس سے بلند تر شے ہے! وہ زندگی کے لیے ہے! وہ زندگی کی راہ میں ہے! وہ بذات خود زندگی ہے! یہ حکم اس لیے بھی ہے کہ اس کی حکمت پر غور و فکر کرنے کے لیے ذہن آمادہ ہوں! دِل زندہ ہوں اور ان میں تقویٰ پیدا ہو! پھر قرآن اللہ (کے احکام) کی حکمت پر غور و فکر اور تقویٰ اللہ کے لیے انسانی شعور کو زندہ و بیدار کرتا ہے کہ یہی چیز زندگی کے تحفظ کے سلسلے میں سب سے اہم، سب سے اول اور سب سے مؤثر عامل ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ''امید ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو گے۔''

یہی وہ مضبوط رسی ہے جو انسانی نفوس کو ظلم و زیادتی سے روکے رکھتی ہے! ظلم و زیادتی قتل کے اقدام کی صورت میں! ظلم و زیادتی اور قتل کا بدلہ لینے کی صورت میں! یہ تقوی کیا ہے؟ دلوں کا احساس ذمہ داری! اللہ کا خوف! اللہ کے غضب سے بچنے کی فکر! اور اس کی رضا کی طلب! تقویٰ کے بغیر کوئی شریعت قائم نہیں رہ سکتی! کوئی قانون کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا! کوئی پرہیزگار، پرہیزگاری کی راہ اختیار نہیں کر سکتا! اور اجتماعی قوانین اور ادارے، جو احساس ذمہ داری اور خوف اور طمع کے جذبات سے عاری ہوں، انسان کی قوت سے زیادہ قوت کے حامل نہیں ہو سکتے۔

اس سے ہم اس بات کی توجیہ کر سکتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں جرائم، جن میں مجرمین پر حد قائم کی گئی ہو شاذ و نادر ہی ہوئے اور جو چند جرائم ہوئے ان میں سے اکثر و بیشتر میں جرائم کا ارتکاب کرنے والوں نے برضا و رغبت اقبال جرم کیا! یہ دراصل تقوی تھا جو اُن کے ضمیر کے اندرون اور دِل کے عمیق گوشوں میں ایک بیدار محافظ کی حیثیت سے موجود تھا۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) ''قصاص'' انسانی معاشرے میں زندگی اور زندہ رہنے کی حقیقت کو تابندگی عطا کرتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو ظالم لوگ بے دردی سے انسانوں کو ختم کرنے کے درپے ہو جائیں، کیونکہ انہیں معلوم ہوگا کہ وہ تھوڑا سا جرمانہ بھرنے یا قید بھگتنے کے بعد رہا ہو جائیں گے۔ اس طرح انسانی جان بہت سستی ہو جائے گی اور اس کا عزو وقار جاتا رہے گا۔

۲) ''قانون قصاص'' کسی معاشرے میں نظام عدل کا علمبردار ہے، اس کی بقا ہی سے معاشرتی زندگی میں امن و سلامتی کی فضا برقرار رہ سکتی ہے اور اس کے اٹھ جانے سے نظام امن تہ و بالا ہو جاتا ہے۔

۳) عالمگیر قانون وہی ہو سکتا ہے جو ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، بادشاہ و فقیر سب پر لاگو ہو، اور وہ صرف اور صرف اسلام کا نظام عدل ہے۔

۴) قانون کی حکمرانی تقویٰ اور پرہیز گاری کی طرف قدم ہے اور حصول تقویٰ کے بعد کسی بھی گناہ اور خطا کا ارتکاب کسی شخص کو اطمینان اور سکون سے نہیں رہنے دیتا جب تک کہ وہ اس سے توبہ کر کے اپنے نفس کو بری نہ کر لے۔ مولانا ابوالحسن علیؒ ندوی دور صحابہؓ کو اس طرح بیان کرتے ہیں: ''اگر کسی وقت صفت بہیمی زور کرتی اور انسان سے غلطی سرزد ہو جاتی اور یہ ایسا موقع ہوتا جب کوئی آنکھ دیکھنے والی نہ ہوتی اور وہ شخص قانون کی دسترس سے باہر ہوتا تو یہی ایمان نفسِ لوامہ بن جاتا دِل کی پھانس چین نہ لینے دیتی، پریشان کن خیالات کا سیلاب امڈنے لگتا، اس گناہ کی یاد میں چین حرام ہو جاتا، حتیٰ کہ وہ شخص خود قانون کے سامنے اقرار جرم کرتا، سخت سے سخت سزا کے لیے اپنے کو پیش کر دیتا اور پھر اس سزا کو برضا و رغبت جھیلتا تا کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ سکے اور آخرت کی سزا کی جگہ دنیا کی سزا لے لے۔''
(دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر)۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (۱۸۰) فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۸۱)	مسلمانو! یہ بات بھی تم پر فرض کر دی گئی ہے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی محسوس کرے کہ اس کے مرنے کی گھڑی آ گئی ہے اور وہ اپنے بعد مال و متاع میں سے کچھ چھوڑ جانے والا ہو تو چاہیے کہ وہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے دستور کے مطابق اچھے طریقے سے وصیت کر جائے اور جو متقی انسان ہیں، ان کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے، پھر جو لوگ وصیت کو سننے کے بعد اسے بدل ڈالیں تو اس کا گناہ ان ہی لوگوں پر ہو گا جو اسے بدل ڈالیں، یقین رکھو، اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾

لکھا گیا تم پر، جس وقت حاضر ہو تم میں سے کسی شخص پر موت۔

كُتِبَ ماضی مجہول واحد مذکر غائب (كَتَبَ، يَكْتُبُ، كِتَابًا) لکھنا، فرض قرار دینا۔ عَلَيْكُمْ (عَلٰى. كُمْ) تم پر، اِذَا جب، حرف ہے، وقت کو ظاہر کرتا ہے، حَضَرَ حاضر ہو، (حَضَرَ، يَحْضُرُ، حُضُوْرًا) حاضر ہونا، موجود ہونا، اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ، موت، اردو میں بھی جانا پہچانا لفظ ہے، موت یہاں پر فاعل ہے یعنی تم میں سے کسی کے لیے موت آ موجود ہو، کسی شخص کو محسوس ہونے لگے کہ اب وہ دنیا سے جانے والا ہے۔

﴿اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾

اگر چھوڑا ہے اس نے مال و متاع تو وصیت کرنا اپنے ماں باپ کے لیے اور قریبی رشتہ داروں کے

لیے، ساتھ دستور کے اور جو متقی انسان ہیں ان کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔

اِنْ، حرف شرط، اگر تَرَکَ (تَرَکَ، یَتْرُکُ، تَرْکًا) چھوڑنا، خَیْرَاً لفظی طور پر خیر وہ ہے جو سب کو مرغوب ہو مثلاً عقل، عدل اور تمام مفید چیزیں اور بعض علماء نے کہا ہے کہ مال پر خیر کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ مال کثیر ہو اور حلال ذرائع سے جمع کیا گیا ہو، جیسا کہ مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ایک غلام کے پاس گئے تو اس نے دریافت کیا کہ اے امیر المومنین میں کچھ وصیت نہ کر جاؤں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وصیت کے لیے ''اِنْ تَرَکَ خَیْرًا'' فرمایا ہے اور خیر مال کثیر کو کہا جاتا ہے اور آیہ مبارکہ: وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (العٰدیٰت ۱۰۰:۸) ''وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے۔''

اس میں بھی خیر کے معنی مال کثیر کے ہیں، اِس میں باریک نکتہ یہ بھی ہے کہ وصیت صرف اس مال میں بہتر ہے جو جائز اور اچھے طریقے سے جمع کیا گیا ہو یعنی اس کا حصول خیر ہو۔ (مفردات القرآن)

اَلْوَصِیَّةُ وصیت کرنا (اَوْصٰی، یُوْصِیْ، اِیصَاءٌ) تاکید کرنا، (to Bequeath) لِلْوَالِدَیْنِ ماں باپ کے لیے، وَالْاَقْرَبِیْنَ اور قریبی رشتہ داروں کے لیے، بِالْمَعْرُوْفِ، معروف طریقے سے، یہ لفظ عرف سے ہے، وہ پسندیدہ اور اچھا طریقہ جو شرعاً اور عقلاً درست ہو، اس کی ضد ''منکر'' ہے۔ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ، یہ حق ہے (لازم ہے، ضروری ہے) پرہیزگاروں کے لیے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ حکم اس زمانے میں دیا گیا تھا جبکہ وراثت کی تقسیم کے لیے ابھی کوئی قانون مقرر نہیں ہوا تھا، اس وقت ہر شخص پر لازم کیا گیا کہ وہ اپنے وارثوں کے حصے بذریعہ وصیت مقرر کر جائے تاکہ اس کے مرنے کے بعد نہ تو خاندان میں جھگڑے ہوں اور نہ کسی حقدار کی حق تلفی ہونے پائے، بعد میں جب تقسیم وراثت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود ایک ضابطہ بنا دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام وصیت اور احکام میراث کی توضیح میں حسب ذیل دو قاعدے بیان فرمائے۔

ایک یہ کہ اب کوئی شخص کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کر سکتا، یعنی جن رشتہ داروں کے حصے قرآن میں مقرر کر دیے گئے ہیں ان کے حصوں میں نہ تو وصیت کے ذریعے سے کوئی کمی یا بیشی کی جا سکتی ہے نہ کسی وارث کو میراث سے محروم کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی وارث کو اس قانونی حصے کے علاوہ کوئی چیز بذریعہ وصیت

دی جاسکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ وصیت کل جائیداد کے صرف ایک تہائی حصے کی حد تک کی جاسکتی ہے۔

ان دو تشریحی ہدایات کے بعد اب اس آیت کا منشا یہ قرار پاتا ہے کہ آدمی اپنا کم از کم دو تہائی مال تو اس لیے چھوڑ دے کہ اس کے مرنے کے بعد وہ حسبِ قاعدہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی حد تک اسے اپنے ان غیر وارث رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرنی چاہیے۔ جو اس کے اپنے گھر میں یا اس کے خاندان میں مدد کے مستحق ہیں یا جنہیں وہ خاندان کے باہر محتاجِ اعانت پاتا ہو، یا رفاہ عام کے کاموں میں سے جس کی بھی وہ مدد کرنا چاہے۔ بعد کے لوگوں نے وصیت کے اس حکم کو محض ایک سفارشی حکم قرار دے دیا یہاں تک کہ بالعموم وصیت کا طریقہ منسوخ ہی ہو کر رہ گیا، لیکن قرآن مجید میں اسے ایک حق قرار دیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے متقی لوگوں پر عائد ہوتا ہے، اگر اس حق کو ادا کرنا شروع کر دیا جائے تو بہت سے وہ سوالات خود ہی حل ہو جائیں جو میراث کے بارے میں لوگوں کو الجھن میں ڈالتے ہیں مثلاً ان پوتوں اور نواسوں کا معاملہ جن کے ماں باپ دادا اور نانا کی زندگی میں مر جاتے ہیں۔''

(تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿فَمَنۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ﴾

پس جو کوئی بدل ڈالے اسے اس کے بعد کہ اس نے سنا اسے، تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جو اسے بدل ڈالتے ہیں۔

فَمَنْ، (فَ. مَنْ) پس جو کوئی، مَنْ، اسم موصول ہے، بَدَّلَهٗ اس نے تبدیل کیا، اسے، هٗ کی ضمیر وصیت کی طرف جاتی ہے (بَدَّلَ، يُبَدِّلُ، تَبْدِيْلًا) بدلنا، تبدیل کرنا، بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ، اس کے بعد کہ جو اس نے سنا تھا یعنی جو شخص فوت ہونے سے پہلے وصیت کر رہا تھا اور اس کے پاس جو کوئی بھی موجود تھا اور وہ اس کی وصیت کو سن رہا تھا، (سَمِعَ. هٗ) سنا، اس وصیت کو، هٗ کی ضمیر پھر وصیت کی طرف جا رہی ہے۔ فَاِنَّمَاۤ (فَ. اِنَّمَا) تو لازماً جو اِثْمُهٗ اس کا گناہ ہے یعنی وصیت کو تبدیل کرنے کا گناہ اسے تبدیل کرنے والوں پر ہو گا، هٗ کی ضمیر پھر وصیت کی طرف جاتی ہے۔ عَلَى الَّذِيْنَ ان لوگوں پر جو يُبَدِّلُوْنَهٗ، تبدیل کرتے ہیں اسے هٗ کی ضمیر وصیت کی طرف ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''چونکہ اس قانون کے ٹھیک ٹھیک نفاذ کا تمام تر انحصار شاہدوں اور گواہوں کی امانت و دیانت ہی پر تھا، شریعت میں وارثوں کے حقوق کا ابھی تعین نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے شاہدوں کی عظیم ذمہ داری واضح فرما دی کہ اگر وہ صاحب وصیت کی وصیت میں کوئی ردو بدل کریں گے تو اس کا سارا بار گناہ انہی کے سر ہوگا، اس کی کوئی ذمہ داری نہ تو صاحب وصیت پر ہوگی نہ اس کو نافذ کرنے والوں پر۔ سمیع و علیم کی صفات کے حوالہ میں تبدیلی کی جسارت کرنے والوں کے لیے تنبیہ اور دھمکی ہے کہ وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے اور وہ اس جرم عظیم کی سزا دیے بغیر نہ رہے گا۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) وصیت، شریعت کی اصطلاح میں وہ ہدایتیں ہوتی ہیں جو دنیا سے رخصت ہونے والا اپنے پیچھے رہنے والوں کو کر جاتا ہے جو اس کی موت کے بعد پوری کی جاتی ہیں۔ انہیں غور سے سننا اور من وعن وارثوں تک پہنچانا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً کسی قرض یا امانت کی ادائیگی۔ جسے پورا کرنا فرض ہوتا ہے تاکہ مرنے والے کے ذمے کوئی حساب کتاب نہ رہ جائے۔ یا کسی نیک کام کی انجام دہی (کنواں، ہسپتال وغیرہ بنانے میں مدد) کہ جسے کل جائیداد کے صرف ایک تہائی حصہ کی حد تک صرف کیا جا سکتا ہے۔

۲) وصیت کی شرعی حدود کو قائم رکھتے ہوئے نگرانی کرنا بڑا ثواب ہے اور اس سے بہت سے معاشرتی مسائل سلجھتے ہیں، جبکہ اس میں خرابی پیدا کرنے والے، گنہگار ہوتے ہیں اور انہیں اس خیانت پر اللہ تعالیٰ کے یہاں گرفت ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس نے کتمانِ حق سے کسی خاندان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے خاص طور پر جبکہ فوت ہونے والا شخص اس کا رفیق سفر تھا، یا اس کے چھوٹے چھوٹے ناسمجھ بچے تھے، ذرا غور کیجئے کہ اسلام کی پاکیزہ تعلیمات تدبیر منزل کی کس طرح حفاظت کرتی ہیں!

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا، فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ(۱۸۲)	اگر کسی شخص کو وصیت کرنے والے سے بے جا رعایت یا کسی معصیت کا اندیشہ ہو اور وہ ان میں مصالحت کرادے، تو ایسا کرنے میں کوئی گناہ نہیں بلاشبہ اللہ بخشنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا﴾

پس جو کوئی خوف کھائے کسی وصیت کرنے والے سے کسی ایک طرف جھکاؤ یا معصیت کا۔

فَمَنْ (فَ.مَنْ) پس، جو کوئی خَافَ، خوف کھائے (خَافَ، يَخَافُ، خَوْفًا) اس کے اصل معنی خوف کھانے کے ہیں اور کبھی یہ اندیشہ کا مفہوم بھی دیتا ہے۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

''خوف'' اہل لغت نے عام طور پر اس کے معنی ڈر، اندیشہ، احتیاط اور گھبراہٹ کے لیے ہیں، علامہ راغبؒ نے اس کے معنی کسی متوقع خطرے یا اندیشے کے کئے ہیں، مکافات عمل کے قانون سے ڈرنا بھی اس میں شامل ہے، قرآن میں اس کا اطلاق ایسے اندیشہ وفکر پر بھی ہے جس کا تعلق رضائے الٰہی کی مخالفت سے ہے۔'' (لسان القرآن، جلد اول)

مِنْ مُّوْصٍ، کسی وصیت کرنے والے سے، (اَوْصٰی، يُوْصِيْ اِيْصَاءٌ) وصیت کرنا، اس سے اسم فاعل مُوْصٍ ہوا جَنَفًا (جَنَفَ، يَجْنِفُ، جَنَفًا) مائل ہونا، جانبداری کرنا، ایک طرف جھکنا، بے جا رعایت کرنا۔ جنف کہتے ہیں نادانستہ غلطی یا بے ضابطگی کو۔ (تفسیر ماجدی)

اَوْ اِثْمًا یا گناہ (اَثِمَ، يَأْثِمُ، اِثْمًا) گناہ کرنا، جانتے بوجھتے ہوئے خطا کرنا، دانستہ غلطی، کھلی ہوئی حق تلفی جس پر گناہ کا اطلاق ہو سکے، گویا کہ جَنف اور اِثم میں یوں فرق کر سکتے ہیں کہ جَنَفٌ بیجا رعایت (غیر دانستہ طور پر) اور اثمٌ معصیت (جانتے بوجھتے ہوئے گناہ)۔

﴿فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾

اور وہ مصالحت کرادے ان کے درمیان تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

فَاَصْلَحَ (فَ.اَصْلَحَ) پس، اس نے صلح کرادی (اَصْلَحَ، یُصْلِحُ، اِصْلَاحًا) اس نے اصلاح کی، مصالحت کرادی۔ بَیْنَھُمْ (بَیْنَ.ھُمْ) ان کے درمیان یعنی وارثوں کے درمیان فَلَآ اِثْمَ، پس نہیں ہے گناہ (مؤاخذہ) عَلَیْہِ (عَلٰی.ہِ) اس پر، ایسے شخص پر جو نیک نیتی سے یہ خدمت سرانجام دیتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''وصیت اگر بے ضابطہ ہے یا خلاف قاعدۂ شرعی ہے اور کوئی شخص وارثوں کے درمیان وقوعِ نزاع یا احتمالِ نزاع ہی دیکھ کر مضمونِ وصیت میں ایسی ترمیم کر دے جس سے حق تلفیوں کی اصلاح ہو جائے اور وارثوں میں باہم مصالحت ہو جائے (تو یہ باعث اجر ہے)۔''

﴿اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ بلاشبہ اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

وہ اپنے بندوں کی خطاؤں سے درگزر کرتا ہے اور اپنی رحمتوں سے انہیں نوازتا ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) کوئی شخص وصیت میں تغیر وتبدل کرنے کا مجاز نہیں، البتہ اگر وصیت کرنے والے نے حق تلفی کی ہو اور جائز وارثوں کو محروم کر دیا ہو تو خاندان کا کوئی بزرگ اخلاصِ نیت سے اس میں مناسب اور جائز تبدیلی کر دے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں ثبت ہو جاتا ہے۔

[یہ گزشتہ بحث کی آخری آیت تھی اب آگے موضوع بدل رہا ہے اور فرض روزوں کا بیان شروع ہو رہا ہے]

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۸۳)	اے ایمان والو! تم پر روزے اسی طرح فرض گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ شعار بن جاؤ۔

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ﴾

اے ایمان والو! لکھے گئے تمہارے اوپر روزے۔

یٰۤاَیُّهَا، اے! کلمہ ندا (خطاب کرنے کے لیے آتا ہے) الَّذِیْنَ، اسم موصول، (وہ لوگ جو) اٰمَنُوْا، ایمان لائے (اٰمَنَ، یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا) دِل اور زبان سے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرنا اور اس کے احکام کو دل و جان سے تسلیم کرنا کُتِبَ، لکھے گئے، فرض کئے گئے، فعل ماضی مجہول واحد مذکر غائب (کَتَبَ، یَکْتُبُ، کِتَابًا) لکھنا، عَلَیْكُمُ (عَلَی. كُمْ) تم، پر الصِّیَامُ روزے، (صَامَ، یَصُوْمُ، صَوْمًا، صِیَامًا) مصدر صَومٌ اور صِیَامٌ دونوں طرح سے آتا ہے، اس کے لفظی معنی چلنے پھرنے، گفتگو کرنے، کھانے پینے یا کسی کام کرنے سے رک جانے کے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں مفہوم اس طرح ہے:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''صیام جمع ہے صوم کی، صوم یا روزہ اصطلاحِ شریعت میں اسے کہتے ہیں کہ انسان طلوعِ فجر سے غروب آفتاب تک اپنے آپ کو کھانے پینے اور عملِ زوجیت سے روکے رہے، جو روزے فرض ہیں وہ ماہ رمضان کے ہیں، غیبت، فحش، بدزبانی وغیرہ زبان کے تمام گناہوں سے روزہ میں بچے رہنے کی سخت تاکیدیں حدیث میں آئی ہیں، جدید وقدیم سب طبّیں اس پر متفق ہیں کہ روزہ جسمانی بیماریوں کے دور کرنے کا بہترین علاج اور جسم انسانی کے لیے ایک بہترین مصلح ہے، پھر اس سے سپاہیانہ ہمت اور ضبط نفس کی روح جو ساری امت میں تازہ ہو جاتی ہے۔ اُس کے لحاظ سے بھی مہینہ بھر کی یہ سالانہ مشق ایک بہترین نسخہ ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾

جیسے کہ لکھے گئے تھے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے۔

كَمَا جیسا کہ کلمہ تشبیہ، كُتِبَ فعل ماضی مجہول، لکھے گئے، عَلَى الَّذِيْنَ ان لوگوں پر مِنْ قَبْلِكُمْ جو تم سے پہلے تھے، یعنی یہ نصاب تربیت امت سابقہ کو بھی دیا گیا، لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ (وق ی) اِتَّقٰی، یَتَّقِیْ، اِتِّقَاءٌ، باب افتعال تقویٰ اس صلاحیت کا نام ہے جو انسان کے اندر اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس پیدا کر کے اس کی نافرمانی سے اسے بچاتا ہے، اور وہ انسان ظاہر اور چھپے، ہر وقت اور ہر حال میں اپنے رب سے ڈرتا ہے۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

''روزہ تم میں تقویٰ وصلاح کی مخفی قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے فرض کیا گیا ہے، اسلامی علم الاخلاق میں تقویٰ اور روزہ کی حیثیت ایک ہے، تقویٰ کے معنی تمام ممکن محاسن کا حصول اور تمام برائیوں سے احتراز ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ روزہ اخلاق وروح کی آخری معراج ہے، دیکھئے تو کامل ایک ماہ تک ضبطِ خواہش کتنا مشکل کام ہے لیکن مسلمان صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔

خالص روحانی اور اصلاحی تدبیر سے کھانے پینے کی بے اعتدالیوں اور بے ضابطگیوں پر ایک ناقدانہ نظر اور ان کا مکمل مداوا، روزہ دار اور غیر روزہ دار میں ایک محسوس اور بیّن فرق ہوتا ہے، حدیث میں آیا ہے ''روزہ دار وہ ہے جو گالی گلوچ سے پرہیز کرے اور اگر اُسے کوئی مجبور کرے تو کہہ دے کہ ''میں صائم ہوں۔'' روزہ خالص اللہ کے لیے ہے، اس لیے اللہ فرماتا ہے ''اَلصَّومُ لِیْ وَ اَنَا اَجْزِی بِہٖ'' یعنی روزہ دار بھوک اور پیاس کی تلخیوں کو صرف میرے لیے برداشت کرتا ہے، اس لیے میں اسے مخصوص اجر سے نوازوں گا، غور کیجئے ایک مسلمان گرمیوں کے موسم میں جس کے ہونٹ سوکھ رہے ہوں، پیاس کی شدت بے چین کر رہی ہو اور اس کی طاقت ووسعت میں ہو کہ برفاب کے کوزے منہ سے لگالے مگر اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور پیاس ہی کو آبِ سرد سمجھ کر پی جاتا ہے اور کامل ایک ماہ تک اس ریاضت کو جاری رکھتا ہے، تاکہ اللہ کے لیے بھوک اور پیاس کی سختیوں کو برداشت کیا جاسکے، پھر غور کیجئے کہ روزہ امیر اور غریب کو ایک ماہ کے لیے ایک سطح پر لے آتا ہے، سب اللہ کی راہ میں بھوک اور پیاس کو برداشت کرتے ہیں، سحری سے افطاری تک سب بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں، گویا روزہ مساواتِ انسانی کا عظیم مظاہرہ ہے اور خالص تربیت ہے جس سے مقصود سال بھر کی تیاری ہے کہ روزہ دار غریبوں کی بھوک اور پیاس کا خیال رکھے۔'' (سراج البیان، جلد: اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) معاشرتی زندگی کو صحت مند بنانے کے لیے امت مسلمہ کو ماہ رمضان میں روزے رکھنے کا پروگرام دیا جا رہا ہے تاکہ ان میں ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کا خوف رہے اور معاشرے میں رہتے ہوئے آپس کی حق تلفیوں سے محفوظ رہیں اور زندگی نظم وضبط سے ہمکنار ہوجائے۔

۲) روزہ جذبات وخواہشات پر کنٹرول کرنے کی سال میں ایک ماہ مسلسل اور پیہم تربیت کرتا ہے۔ روزہ

دار جب اللہ کے حکم سے جائز، حلال، پاکیزہ اور پسندیدہ خواہشات کو چھوڑنے کا اپنے آپ کو عادی بنا لیتا ہے تو حرام، ناجائز، مکروہ اور ناروا عادات کو چھوڑنے میں اسے دقت محسوس نہیں ہوتی۔

۳) روزہ شکم سیروں اور فاقہ مستوں کو ایک سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ بلکہ اول الذکر لوگوں میں موخر الذکر لوگوں کے ساتھ ہمدردی کے جذبات ابھارتا ہے کہ آئندہ ان کی اللہ کے دیے ہوئے مال سے مدد کرتے رہیں تاکہ وہ بھی باعزت زندگی گزار سکیں۔

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ، فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ، فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ، وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۸۴)	یہ (روزے) تو چند گنتی کے دن ہیں، پھر اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرے، اور جو لوگ ایسے ہوں کہ ان کے لیے روزہ رکھنا ناقابل برداشت ہو تو ان کے لیے روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے، پھر اگر کوئی اپنی خوشی سے کچھ زیادہ کرے تو یہ اُس کے لیے مزید اجر کا موجب ہوگا، لیکن اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو، تو جان لو کہ روزہ رکھنا تمہارے لیے (بہرحال) بہتر ہے۔

﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ چند گنے ہوئے دن ہیں۔

اَيَّامًا (دن) اس کا مفرد یَوْم ہے، مَّعْدُوْدٰتٍ گنتی (کے) اس کا مادہ (ع د د) اس سے فعل عَدَّ يَعُدُّ ہے، گننا، شمار کرنا۔ اسم مفعول مَعْدُوْدٌ، شمار کردہ، اس سے مؤنث کا صیغہ مَّعْدُوْدَةٌ اور اُس کی جمع مَعْدُوْدَاتٌ ہے، یہ جمع اَيَّامًا کے لیے استعمال ہوئی ہے اور اس میں بڑی شفقت اور تسلی ہے، کہ دیکھو! مطلق نہ گھبراؤ، یہ

گنتی کے چند دن ہی تو ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یعنی فرض روزوں کی ایک متعین تعداد ہے جیسا کہ ڈسپلن کا اقتضا ہے، یہ نہیں کہ جب جس کا جی چاہے جتنے دنوں کے لیے چاہے رکھ ڈالے وحدت امت کے لحاظ سے لازمی تھا کہ ایک متعین زمانہ، متعین حدود کے ساتھ، ساری امت کے لیے مقرر ہو، ضمناً یہ پہلو بھی نکل آیا کہ اِن فرض روزوں کی تعداد کچھ بہت بڑی نہیں۔ یہ نہیں کہ سال بھر روزے رکھتے ہی جاؤ، چھ مہینے بلکہ تین مہینے بھی نہیں، سال بھر میں کل ۲۹ یا ۳۰ دن۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾

پس جو کوئی ہو تم میں سے مریض یا سفر میں تو گنتی ہے دوسرے دنوں میں۔

فَمَنْ (فَ.مَنْ) پس، جو کوئی، مَنْ اسم موصول ہے۔ كَانَ، ہو فعل ناقص کہلاتا ہے، (كَانَ، يَكُوْنُ) ہونا۔ مَّرِيْضًا، اس کا مادہ مرض ہے، ایسی بیماری جس کی وجہ سے روزہ رکھنے میں دشواری ہو، اطبا اور ڈاکٹر کسی کو روزہ رکھنے سے منع کر دیں، اَوْ عَلٰى سَفَرٍ یا وہ شخص سفر پر ہو، سفر کا اندازہ بھی ہر شخص خود لگا سکتا ہے، ایک طویل سفر بس یا ریل کے ذریعہ ہے، مثلاً لاہور سے کراچی کا سفر، جس میں مشقت اور تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ یہی سفر ہوائی جہاز کے ذریعہ آرام سے دو گھنٹہ میں طے ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی ہے، اس آرام دہ سفر میں روزہ رکھنا ہی بہتر ہے۔ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ، پس اُس کی گنتی ہے دوسرے دنوں میں یعنی بیماری سے صحت یاب ہونے یا سفر سے واپس آنے کے بعد ان روزوں کی گنتی پوری کر لو تا کہ تمہارے اجر و ثواب میں کمی نہ رہ جائے، زندگی کے سفر کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کے یہاں پورا پورا انعام پاؤ۔

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾

اور وہ لوگ جو طاقت نہ رکھتے ہوں تو اس کا فدیہ (بدلہ) ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ اور ان لوگوں پر يُطِيْقُوْنَ فعل مضارع جمع مذکر غائب (اَطَاقَ، يُطِيْقُ، اِطَاقَةً) اس کا مادہ (طوق) ہے اور اس مقدرت اور قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام بہ مشقت اور مشکل سے کیا جا سکے جیسے

کسی نے اس کی گردن میں طوق (حلقہ) ڈال دیا ہو۔ (مفردات القرآن)

یُطِیْقُوْنَ کے معنی ہیں ایسے لوگ جو روزہ کی استطاعت نہ رکھتے ہوں مگر شدید مشقت کے ساتھ (المنار) ظاہر ہے کہ یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ چکے ہوں اور جن کا ضُعف اور کمزوری اس قدر بڑھ چکی ہو کہ پیاس اور بھوک ناقابل برداشت ہو جائے تو وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، یُطِیْقُوْنَهٗ میں هٗ کی ضمیر الصوم (روزہ) کی طرف جاتی ہے نہ کہ فدیہ یا طعام کی طرف، اس حسن سلوک سے اللہ تعالیٰ اُن کے اجر کو بھی ضائع نہیں فرمائے گا، سبحان اللہ! وہ مالک کتنا مہربان ہے۔

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ﴾

پھر اگر کوئی اپنی خوشی سے کچھ زیادہ کرے تو یہ اس کے لیے مزید اجر کا موجب ہے۔

فَمَنْ (ف.من) پس، جو کوئی تَطَوَّعَ (ط و ع) اس کا مادہ ہے (تَطَوَّعَ، يَتَطَوَّعُ، تَطَوُّعًا) دل کی رغبت سے نیکی کرنا، خَيْرًا، نیکی اور بھلائی، فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ، تو یہ بہتر ہے، اس کے لیے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''(اسی ادائے فدیہ کے باب میں) یعنی اس قدر مقدار (ایک مسکین کو کھانا کھلانا) تو بہرحال واجب ہے، اب اس میں کوئی اضافہ کرنا چاہے یعنی ایک شخص کی بجائے دو شخصوں کو کھلا دے، کھانے کی تعداد بڑھا دے، کھانے کی قسم بہتر کر دے، فدیہ کے ساتھ روزہ کو بھی جمع کر لے تو اور بہتر ہے، خیر، خیرات، فیاضی و سیر چشمی، حسن سلوک و حسن معاشرت کی تاکید تو اسلام میں ہمیشہ اور ہر حال کے لیے موجود ہے، لیکن رمضان المبارک میں اس کی اہمیت اور زیادہ ہے، چنانچہ ماہ مبارک کے ختم پر یا ختم سے ذرا قبل جو صدقہ فطر واجب بتایا گیا ہے، کہ آس پاس کا کوئی کلمہ گو بھوکا نہ رہنے پائے، وہ اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فیاضی، سخاوت، جود و کرم میں اپنی نظیر آپ تھے۔ تاہم متعدد حدیثوں میں آتا ہے کہ اس ماہ مبارک میں آپ کا جوش کرم اور بڑھ جاتا تھا اور آپ ﷺ فیاض سے فیاض تر ہو جاتے تھے۔''

(تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

اور یہ کہ تم روزہ رکھو تو یہ بہتر ہے تمہارے واسطے اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو۔

وَاَنْ اور یہ کہ، اَنْ مصدر یہ ہے، تَصُوْمُوْا، تم روزہ رکھتے ہو، فعل مضارع جمع مذکر حاضر (صَامَ، یَصُوْمُ، صَوْمًا) روزہ رکھنا خَيْرٌ لَّكُمْ، بہتر ہے تمہارے لیے۔ اِنْ كُنْتُمْ اگر ہو تم، اِنْ اگر شرطیہ ہے كُنْتُمْ تم ہو فعل ماضی جمع مذکر حاضر (كَانَ يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، تَعْلَمُوْنَ تم جانتے ہو عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا، جاننا، پہچاننا، یعنی تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ روزہ رکھنے کے فوائد و انعامات بہت سے ہیں ہاں بامر مجبوری اسے چھوڑا جاسکتا ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اسلام کی پاکیزہ تعلیمات جسم وروح کی حفاظت کرتی ہیں، اُن میں روزہ ایسی پاکیزہ عبادت بھی ہے جو تقویٰ وطہارت، صحت وصفائی اور توبہ وانابت الی اللہ کا ذریعہ ہے جس سے زندگی میں عزم واستقلال صبر وتحمل، ثابت قدمی اور وقت کی پابندی ایسی صفات پیدا ہوتی ہیں اور کامیاب زندگی گزارنے کے یہ سنہری اصول ہیں۔

۲) سال بھر میں گنتی کے یہ چند دن امت مسلمہ کو نظم وضبط کی ایک لڑی میں پرو دیتے ہیں اور جہاد زندگانی کا بہترین موقع فراہم کرتے ہیں۔

۳) مسافروں اور مریضوں کو (جن میں حاملہ ومرضعہ خواتین بھی شامل ہیں) یہ رخصت دی گئی ہے کہ وہ اس ماہ مبارک کے چھوٹ جانے والے روزوں کی گنتی سہولت ملنے پر پوری کرلیں۔ یہ قانون کی نرمی اور خوبصورتی ہے۔

۴) وہ بزرگ خواتین وحضرات جن کی قوت جواب دے چکی ہو، وہ اپنے اجر وثواب کو غربا ومساکین کو کھانا کھلا کر حاصل کرسکتے ہیں۔ ان کا یہ عمل معاشرتی زندگی کو صلاح وفلاح سے بھی ہمکنار کرے گا اور خود اس کے اجر وثواب کو بھی محفوظ بنادے گا اور اگر ایسے لوگ خود ہی قلاش اور نادار ہوں تو یہ کھانا کھلانے کا فرض ان سے ساقط ہوجاتا ہے، دیکھیے رب کریم کا یہ کتنا بڑا فضل واحسان ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ، هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ، فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ، وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ، یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ، وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۸۵)	یہ رمضان کا (بابرکت) مہینہ ہے جس میں قرآن کا نزول (شروع ہوا) جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور (جس میں) راہ حق پانے اور (حق و باطل کے) امتیاز کی روشن نشانیاں ہیں، پس تم میں سے جو کوئی یہ مہینہ پائے (رمضان میں زندہ ہو) تو وہ اس ماہ کے پورے روزے رکھے، ہاں جو کوئی بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو، تو اس کے لیے یہ حکم ہے کہ دوسرے دنوں میں چھوٹے ہوئے روزوں کی گنتی پوری کرے، اللہ تمہارے لیے سہولت چاہتا ہے تمہیں دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتا، (وہ چاہتا ہے) کہ تم (روزوں کی) تعداد پوری کرلو، (تاکہ آخرت کے لازوال اجر سے محروم نہ ہو جاؤ) (اور یہ کہ تم) اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعتراف کرو، اس بات پر کہ اس نے تمہیں ہدایت سے نوازا اور اس لیے بھی کہ تم اس کے شکرگزار بن کر رہو۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾

(یہ) رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن کا نزول (شروع) ہوا۔

شَهْر، مہینہ اس کی جمع شُهُور اور اَشْهُرْ بھی آتی ہے۔ رَمَضَانَ اس کا مادہ رمض ہے، اس کے معنی شدت گرما اور سوزش کے ہیں اور قمری مہینوں میں سال کا نواں مہینہ ہے، الَّذِیْ وہ جو اُنْزِلَ اتارا گیا اُنْزِلَ سے مراد، اترنا شروع ہوا اَیْ اِبْتَدٰی فِیْهِ اِنْزَالُهٗ (روح المعانی) ماضی مجہول واحد مذکر غائب، فِیْهِ (فی.ہ) اس میں یعنی اس ماہ میں، الْقُرْاٰنُ، (قرآن حکیم، کتاب الٰہی جسے خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کے قلبِ اطہر پر اتارا گیا۔ جبریل امین آپ ﷺ کی خدمت میں لے کر آتے رہے)۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''کُل قرآن مجید کا نزول تو بڑی تدریج کے ساتھ کوئی اکیس بائیس سال کی مدت میں ہوا ہے، یہاں مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ قرآن کی ابتدا ماہ رمضان میں ہوئی، وحی قرآن کی سب سے پہلی آیات سورۃ العلق کا ابتدائی حصہ ہے اور وہ غار حرا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی مہینہ میں نازل ہوئی تھیں۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

''القرآن'' (قَرَء، یَقْرَءُ) پڑھنا، القرآن وہ کتاب جس کو بہت زیادہ پڑھا جائے اسم با مسمّٰی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اقصائے عالم میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی یہ کتاب الٰہی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''جس طرح ارض (زمین) کا اطلاق سارے روئے زمین پر بھی ہوتا ہے اور زمین کے ہر ہر ٹکڑے پر بھی، اسی طرح قرآن کا اطلاق تیس پاروں والی مکمل کتاب پر بھی ہوتا ہے اور اس کے ہر جزو پر بھی''۔

(حوالہ: ایضاً)

﴿هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾

ہدایت ہے لوگوں کے لیے اور واضح نشانیاں ہیں ہدایت کی، (ایسی ہدایت) جو حق و باطل میں فرق کرنے والی ہے۔

هُدًى ہدایت، راست روی، مصدر ہے (هَدَى، يَهْدِى، هُدًى) ہدایت دینا، رہنمائی کرنا، لِّلنَّاسِ (لِ. النَّاسِ) لیے، لوگوں کے، یعنی یہ قرآن تمام نسل انسانی کے لیے ہدایت ہے۔ وَبَيِّنٰتٍ، اور روشن نشانیاں (جمع) اس کا مفرد بَيِّنَةٌ (نشانی) ہے مِّنَ الْهُدٰى، ہدایت کی۔ قرآن حکیم کی آیات مضبوط اور روشن نشانیاں یعنی ہدایت کے مضبوط اور واضح دلائل ہیں جو ہر صاحب بصیرت کو دعوت فکر دیتے ہیں، وَالْفُرْقَانِ اور (یہ دلائل) حق و باطل میں فرق کرتے ہیں، گویا کہ قرآن حکیم کو سرچشمہ ہدایت کہنے کے بعد مزید یہ بتلایا گیا کہ یہ ''الفرقان'' بھی ہے کہ تبدیل شدہ پہلی کتب سماویہ کی تعلیمات کو قرآن نے الگ تھلگ کر دیا ہے، حق و باطل اور توحید و شرک کے درمیان ٹھوس دلائل و شواہد کے ذریعے واضح خط کھینچ دیا ہے اور جس طرح کہ دن اور رات کو پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی ہے اسی طرح سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے میں قطعاً کوئی

دشواری نہیں رہی ہے: قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (البقرہ:۲۵۶) ''صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔''

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾

پس جو کوئی پائے (حاضر ہو) تم میں سے اس مہینہ میں پس چاہیے کہ وہ روزے رکھے اس ماہ میں۔

فَمَنْ (فَ. مَنْ) پس جو کوئی مَنْ موصول ہے شَهِدَ حاضر ہو، (شَهِدَ، يَشْهَدُ، شَهُوْدٌ) حاضر ہونا، موجود ہونا، اردو زبان میں شہادت وہ (گواہی) ہے جو کسی کے روبرو دی جاتی ہے، مِنْكُمُ (مِنْ. كُم) تم میں سے فَلْيَصُمْهُ (فَ. لْ. يَصُمْ. هُ) پس، چاہیے، روزہ رکھے، اس کا (اس ماہ یعنی رمضان المبارک کا) لام زبر کے ساتھ تاکید کو ظاہر کرتا ہے، هُ کی ضمیر (الشَّهْرَ) کی طرف جاتی ہے۔

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾

اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو، پس گنتی (پورا کرنا ہے اُس کے لیے) دوسرے ایام میں۔

اس سے قبل آیت ۱۸۴ میں بھی مریض اور مسافر کے لیے رخصت کا بیان تھا کہ مریض صحت ملنے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر روزوں کی گنتی پوری کر لیں، دوبارہ اس رعایت کو بیان فرما کر انتہائی شفقت و محبت سے جہاں اس رخصت کی توثیق کی جا رہی ہے وہاں رمضان المبارک کی فضیلت اور روزوں کی اہمیت کا احساس بھی دلایا جا رہا ہے کہ دیکھو ''رمضان وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں قرآن ایسی عظیم کتاب خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے جلیل القدر پیغمبر کے قلب اطہر پر نازل کی گئی، یہ تو نسل انسانی کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی روشن نشانیاں ہیں کہ ان کے بعد حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے میں کوئی مشکل اور دشواری پیش نہیں آتی ہے اس کا ہر ہر لفظ روز روشن کی طرح واضح ہے، لہٰذا جو مومن بھی اس خیر و برکت سے بھرپور مہینہ کو اپنی زندگی میں پاتا ہے، اسے چاہیے کہ رب کریم کے احسان عظیم کا اقرار کرتے ہوئے بطور شکرانے کے روزے رکھے، مسافر اور مریض چونکہ مشقت اور تکلیف میں ہوتے ہیں اس لیے وہ ایام سہولت میں اس کی گنتی کو پورا کر لیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و ثواب سے محروم نہ رہیں۔'' رب کریم تو اپنے بندوں پر انتہائی مہربان ہے، اس کے بے پایاں لطف و کرم کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟

ارشاد ہوتا ہے:

﴿یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ﴾

''اللہ ارادہ کرتا ہے تمہارے ساتھ آسانی کا اور نہیں ارادہ کرتا تمہارے ساتھ تنگی کا۔''

(اَرَادَ، یُرِیۡدُ، اِرَادَۃً) ارادہ کرنا، اَلۡیُسۡرَ آسانی، سہولت، اَلۡعُسۡرَ تنگی، تکلیف۔

اور یہی دین اسلام (دین فطرت) کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ لوگوں کو آسانی فراہم کرتا ہے مشکلات میں نہیں ڈالتا۔

﴿وَلِتُکۡمِلُوا الۡعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ہَدٰىکُمۡ وَلَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ﴾

اور چاہیے کہ تم پورا کرو (روزوں) کی گنتی اور ضروری ہے کہ بڑائی بیان کرو اللہ کی اس بات پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تا کہ تم شکر گزار (بندے) بن جاؤ۔

وَلِتُکۡمِلُوۡا اور چاہیے کہ پوری کرو (لِ. تُکۡمِلُوۡا) اَکۡمَلَ، یُکۡمِلُ، اِکۡمَالٌ، باب افعال ہے، پورا کرنا۔ تکمیل اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے، لام، زیر کے ساتھ تاکیدی معنی پیدا کرتا ہے اور اِس لام کی وجہ سے 'نون' جمع کا بھی ساقط ہو جاتا ہے، اصل میں تُکۡمِلُوۡنَ تھا، لام کی وجہ سے نون اعرابی گر گیا، اَلۡعِدَّۃَ، گنتی، عدد، ہندسہ اردو میں استعمال ہوتا ہے، مَعۡدُوۡدٰت، گنے چنے اَیَّامًا مَعۡدُوۡدَات (رمضان کے گنے چنے دن ہیں) پہلے گزر چکا ہے۔ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ اور چاہیے کہ بڑائی بیان کرو، اللہ کی (کَبَّرَ، یُکَبِّرُ، تَکۡبِیۡرًا) بڑائی بیان کرنا، اللہ اکبر (یقیناً اللہ ہی سب سے بڑا ہے) کہنا، تُکَبِّرُوۡنَ، لام کی وجہ سے لِتُکَبِّرُوۡا رہ گیا (نون اعرابی ساقط ہو گیا) وَلَعَلَّکُمۡ (لَعَلَّ. کُمۡ) اور، تا کہ، تم، لَعَلَّ، امید اور توقع کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ''لَعَلَّ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو اس کے معنی میں قطعیت آ جاتی ہے''۔ (مفردات القرآن) تَشۡکُرُوۡنَ تم شکر گزار بن جاؤ (شَکَرَ، یَشۡکُرُ، شُکۡرًا) شکر کرنا، منعم حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کے ان گنت انعامات پر اس کا احسان مند رہنا اور دل و جان سے اس کے احکامات کو بجا لانا ہی حقیقت میں شکر ہے، لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ کے معنی یہ ہوئے کہ امید ہے کہ

روزوں کی گنتی پوری کرنے سے تم اس کے شکر گزار بندے بن جاؤ گے اور تم یقیناً اس کی رحمت کے حقدار ٹھہرو گے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) رمضان المبارک کی قدر ومنزلت نزولِ قرآن سے ہے یہاں تک کہ وہ رات بھی جس میں اس کے نزول کی ابتدا ہوئی بڑی قیمتی ہوگئی، شب قدر کی عبادت ہزاروں مہینوں کی عبادت پر سبقت لے گئی، سبحان اللہ! کیا شانِ کریمی ہے۔

۲) اس ماہ مبارک میں نسل انسانیت کو سرچشمہ رشد وہدایت ملا جس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا، دنیا اور آخرت کی فوز وفلاح ہے۔

۳) قرآن کی تعلیمات آفتابِ نصف النہار سے بھی زیادہ روشن ہیں جنہیں سمجھنے میں قطعاً کوئی مشکل نہیں ہے۔

۴) ہر مسلمان جو زندہ ہو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے روزہ رکھے اور قرآنی تعلیمات پر غور وفکر کرے تاکہ اس کی زندگی احکام الٰہی کے سانچے میں ڈھل جائے۔

۵) رمضان المبارک دنیا بھر کے مسلمانوں کو نظم وضبط کی لڑی میں پرو دیتا ہے، زندگی میں صبر وتحمل کا سلیقہ ملتا ہے، احسان ومروت کا خوگر بنایا جاتا ہے، اوقات کی پابندی کی تربیت حاصل ہوتی ہے، ریاضت و عبادت کا قرینہ ہاتھ آتا ہے اور جینے کا مقصد محض کھانا پینا ہی نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں ''ارفع واعلیٰ قدر حیات'' ٹھہرتا ہے ''اسے تقویٰ'' کا نام دیتے ہیں، یہی وہ صفت ہے جو روزہ پیدا کرتا ہے، کہ زندگی کا ہر قدم اٹھاتے ہوئے رب کائنات کی رضا کا طالب ہونا اور ہر لمحہ اور ہر گھڑی اس کی نافرمانی سے بچنا ہی کامیاب زندگی کا راز ہے۔

وَاِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ، اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ، فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ (۱۸۶)	اور (اے نبیؐ) جب میرے بندے آپؐ سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں کہہ دیجئے کہ میں (ان کے) قریب ہوں، میں تو دعا مانگنے والے کی التجاؤں کو جب بھی وہ مجھ سے دعا مانگے سنتا اور قبول کرتا ہوں، پس (بندوں کو بھی) چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تا کہ نیک راہ پالیں۔

﴿وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ﴾

اور جب سوال کریں آپؐ سے، میرے بندے، میرے بارے میں تو بے شک میں قریب ہوں۔

وَاِذَا، کلمہ شرط ہے اور وقت کو ظاہر کرتا ہے، جب، جس وقت (When) سَاَلَکَ (سَاَلَ.کَ) سوال کریں، آپ سے (سَاَلَ، یَسْأَلُ سُؤَالًا) سوال کرنا، پوچھنا، عِبَادِیْ (عِبَاد.ی) میرے بندے عَبْدٌ، بندہ اور اس کی جمع عِبَادٌ ہے، عَنِّیْ (عَنْ.ی) میرے بارے میں، عَنْ (About) حروف جَرْ میں سے ہے، فَاِنِّیْ (فَ.اِنِّیْ) پس، بے شک میں، قَرِیْبٌ قریب ہوں، خالق کائنات اپنی مخلوق میں سے ہر چھوٹی بڑی چیز کو جانتا ہے اور بیک وقت ہر ذی روح کی پکار کو سنتا اور جواب دیتا ہے پھر انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔

﴿اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾

میں جواب دیتا ہوں پکارنے والے کی پکار کا، جب وہ مجھے پکارتا ہے۔

اُجِیْبُ، میں جواب دیتا ہوں یعنی میں قبول کرتا ہوں، فعل مضارع واحد متکلم (اَجَابَ، یُجِیْبُ، اِجَابَةٌ) جواب دینا، قبول کرنا، دَعْوَةَ پکار، مصدر (دَعَا، یَدْعُوْا، دُعَاءً اور دَعْوَةٌ) پکارنا، بلانا، اِذَا، جب دَعَانِ، پکارتا ہے، مجھے، اللہ تعالیٰ نہ صرف اپنے بندے کی دعا سنتا ہے بلکہ اسے قبول بھی فرماتا ہے۔

﴿فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾

پس چاہیے کہ قبول کریں (میرے احکام) اور ایمان لائیں مجھ پر تا کہ وہ رشد و ہدایت کو پالیں۔

فَلْيَسْتَجِيبُوْا (فَ.لْ.يَسْتَجِيْبُوْا) پس، ضرور چاہئے کہ وہ قبول کریں، لام، تاکیدی معنی پیدا کرتا ہے (اِسْتَجَابَ، يَسْتَجِيْبُ، اِسْتِجَابَةٌ) قبول کرنا، وَلْيُؤْمِنُوْا (وَ.لْ.يُؤْمِنُوْا) اور چاہیے کہ وہ ایمان لائیں مجھ پر (اٰمَنَ يُؤْمِنُ اِيْمَانًا) ایمان لانا، اللہ تعالیٰ کو مان کر اس کے احکام پر عمل کرنا، لَعَلَّهُمْ (لَعَلَّ.هُمْ) تا کہ، وہ، يَرْشُدُوْنَ رشد و ہدایت پالیں، (رَشَدَ، يَرْشُدُ، رُشْدًا) ہدایت پانا۔

اس سے قبل کی آیاتِ مبارکہ میں رمضان المبارک اور روزوں کا ذکر تھا اور اس کے بعد بھی احکام رمضان بیان ہوئے ہیں۔ اس پر حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں: ''رمضان المبارک کے احکام و مسائل کے درمیان دعا کا مسئلہ بیان کر کے یہ واضح کر دیا گیا کہ رمضان میں دعا کی بھی بڑی فضیلت ہے، جس کا خوب اہتمام کرنا چاہیے، خصوصاً افطاری کے وقت کو قبولیتِ دعا کا خاص وقت بتلایا گیا ہے۔ تاہم قبولیتِ دعا کے لیے ضروری ہے کہ ان آداب و شرائط کو ملحوظ رکھا جائے جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئے ہیں جن میں سے دو یہاں بیان کئے گئے ہیں۔ ایک اللہ پر صحیح معنوں میں ایمان اور دوسرا اس کی اطاعت و فرمانبرداری۔''

(تفسیر احسن البیان)

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ لکھتے ہیں:

''دعا کی قبولیت کے کچھ آداب ہیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ حرام خور کی دعا قبول نہیں ہوتی اور اس بات کی صراحت احادیثِ صحیح میں موجود ہے۔ دوسری یہ کہ وہ دعا ممکنات سے ہو مثلاً ایک غریب آدمی جسے امور سیاست کی خبر تک نہ ہو یہ دعا کرنے لگے کہ یا اللہ! مجھے اس ملک کا بادشاہ بنا دے تو ظاہر ہے کہ ایسی دعا قبول نہ ہوگی اور نہ ہی کوئی ایسی دعا کرنی چاہیے جس کا تعلق قطع رحم یا کسی گناہ کے کام سے ہو، تیسری یہ کہ دعا کی قبولیت کا بھی اللہ کے ہاں ایک مقرر وقت ہوتا ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں انسان کو نہ جلد بازی کرنی چاہیے اور نہ مایوس ہونا چاہیے کیونکہ بعض دفعہ دعا کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس سے کوئی نازل ہونے والی مصیبت دور کر دی جاتی ہے اور چوتھی یہ کہ جو دعا کی جائے پورے خلوصِ نیت اور تہہِ دل سے کی جائے، بے توجہی سے اور عادتاً دعا کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا اور پانچویں یہ کہ دعا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے بعد اپنی حاجت کے لیے دعا کی جائے اور چھٹے یہ کہ اگر اسے اپنی دعا قبول ہوتی نظر نہ آ رہی ہو تو بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے کیونکہ صرف اللہ سے دعا کرنے

اور کرتے رہنے کا حکم ہے اس کی قبولیت بسا اوقات اللہ تعالیٰ کی اپنی حکمتوں کے تابع ہوتی ہے، ایسی دعا کا یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ اس کے نامۂ اعمال میں دعا مانگنے کی نیکی لکھی جائے گی اور اس کا اجر اسے آخرت میں مل جائے گا یا اس پر آنے والی کوئی بیماری یا مصیبت اٹھالی جاتی ہے۔

پھر بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں جن میں دعا جلد قبول ہوتی ہے۔ مثلاً لیلۃ القدر میں یا سجدہ کے وقت یا جمعۃ المبارک کے دن اور ان کی تفصیل کتب احادیث میں موجود ہے، پھر کچھ حالات بھی ایسے ہوتے ہیں جن میں دعا فوراً قبول ہوتی ہے۔ مثلاً مضطر اور مصیبت کے مارے کی دعا یا مظلوم کی ظالم کے حق میں بددعا یا والدین کی اپنی اولاد کے حق میں بددعا (والدین کو کوشش کرنی چاہیے کہ اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ کلمہ خیر ہی منہ سے نکالیں)۔'' (تیسیر القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض لوگوں نے پوچھا تھا کہ ہمارا پروردگار اگر دور ہے تو ہم اسے بلند آواز سے پکارا کریں اور اگر قریب ہے تو آہستہ آواز سے پکارا کریں، اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو بتلا دیا کہ میں تمہارے بالکل قریب ہوں حتیٰ کہ تمہاری رگِ جان سے بھی قریب ہوں، تم زبان سے پکارو یا دل سے، میں تمہاری فریادوں کو ہر حال میں اور ہر وقت سنتا اور قبول کرتا ہوں۔

۲) دین کی روح وحقیقت یہ ہے کہ انسان سب سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو رہے، اسی سے اپنی ہر مراد مانگے، اسی کے آگے دست سوال دراز کرے، اسی کے در پر اپنی جبین نیاز جھکائے اور اسی سے ہر وقت لو لگائے رکھے۔

۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدُّعَاءُ مُخُّ العِبَادَةِ ''دعا عبادت کا مغز ہے۔'' نیز فرمایا: الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَة ''دعا ہی اصل عبادت ہے۔'' اس لیے اس سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیے۔

۴) دعا کی قبولیت کے لیے جہاں صدقِ مقال اور رزقِ حلال لازمی امر ہے، وہاں خلوص وللّٰہیت اور تقویٰ وطہارت بھی ضروری چیزیں ہیں۔

۵) دعا پوری توجہ اور انہماک سے کی جائے، اس یقین سے کی جائے کہ اللہ ہی ہماری التجاؤں کو قبول کرتا ہے۔ اُس کے در کے سوا اور کوئی در نہیں ہے، میں فقیر ہوں اور وہ غنی ہے، اس کے یہاں کسی چیز کی قطعاً

کوئی کمی نہیں ہے، اس آیہ مبارکہ پر پھر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے ہر ہر حرف سے رحمت وشفقت ٹپک رہی ہے۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ، هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ، عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ، فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ، وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ، ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ، وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ، تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۱۸۷)	(مسلمانو!) روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں سے مقاربت کی تمہیں اجازت دی جاتی ہے، وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس (تم ایک دوسرے کی عزت وناموس کے محافظ اور محرم راز حیات ہو) اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت فرمائی اور تمہیں معاف کر دیا، اب تمہیں اجازت ہے کہ تم روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے مقاربت کر سکتے ہو اور اللہ نے تمہارے لیے جو کچھ مقدر کر دیا ہے اس کے طالب بنو (نیک اور صالح اولاد کی تمنا رکھو) اور کھاؤ اور پیو اُس وقت تک جبکہ صبح کی سفید دھاری (افقِ مشرق پر) سیاہ دھاری سے تمہارے لیے نمایاں ہو جائے، پھر رات (کے آنے) تک روزہ پورا کرو (افطاری غروب آفتاب پر کرو) اور تمہیں اپنی بیویوں سے اختلاط منع ہے جبکہ تم مساجد میں معتکف ہو، یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدود ہیں تو تم ان کے قریب نہ جاؤ، اس طرح اللہ اپنی آیات لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے، امید ہے کہ وہ (اس کی نافرمانی سے) بچیں گے۔

﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾

حلال کیا گیا ہے (جائز ہے) تمہارے لیے روزے کی رات مقاربت اپنی عورتوں سے۔

اُحِلَّ، جائز کیا گیا ہے ماضی مجہول واحد مذکر غائب (ح ل ل) اس کا مادہ (Root Word) ہے۔ اَحَلَّ، یُحِلُّ، اِحْلَالٌ باب افعال، حلال کرنا، جائز قرار دینا، لَكُمْ، تمہارے لیے لَيْلَةَ الصِّيَامِ، روزوں کی رات، مرکب اضافی الرَّفَثُ (ر ف ث) رفَثَ، یَرْفُثُ، رَفْثًا (جنسی گفتگو کرنا) جب اس کے ساتھ ''اِلٰى'' آجائے تو اس کے معنی ازدواجی تعلقات کے ہوتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یہ اجازت شروع میں نہ تھی، ابتداءً روزہ کی حالت میں، رات میں بھی دن ہی کی طرح بیویوں سے علیحدگی کا حکم تھا، شریعت اسلامی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ رسالت میں بتدریج نازل ہوئی، کہیں تو ایسا ہوا کہ احکام شروع میں نرم تھے رفتہ رفتہ سخت کئے گئے مثلاً شراب نوشی، کہ پہلے صرف ناپسند کی گئی اور پھر ہوتے ہوتے اس کی حرمت کا حکم آ گیا اور کہیں اس کے برعکس ہوا ہے یعنی ابتداءً قانون سخت تھا، رفتہ رفتہ اس میں سہولتیں اور رعایتیں زیادہ ہوتی گئیں، چنانچہ یہی روزہ کا معاملہ ہے کہ پہلے صحبت رات میں حرام تھی، بعد کو، جائز کر دی گئی (حکیم مطلق اپنے بندوں کے لیے جیسے مناسب سمجھتا ہے احکام صادر فرماتا ہے)''

(تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾

وہ (عورتیں) لباس ہیں تمہارے لیے اور تم ہو لباس ان (عورتوں) کے لیے۔

هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب، لِبَاسٌ پہناوا جو ستر پوشی کرے، لَّكُمْ تمہارے لیے (یعنی مردوں کے لیے) وَاَنْتُمْ اور تم ہو (یعنی مرد) لِبَاسٌ، لباس لَّهُنَّ، ان کے لیے (یعنی عورتوں کے لیے)۔

اس میں کتنے خوبصورت انداز میں میاں بیوی کے باہمی تعلقات کو لباس سے تشبیہ دی گئی ہے، جس طرح لباس جسم کے ستر کو چھپاتا اور اس کی خوبیوں کو اجاگر کرتا ہے اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کی پردہ پوشی کرتے ہیں، برائی سے رکاوٹ اور آڑ بنتے ہیں اور معاشرتی زندگی امن وسکون کا گہوارہ بن جاتی ہے، اسلام نکاح کو خوشگواری اور سلامتی کا راستہ بتاتا ہے جبکہ زنا کو معاشرتی فساد اور بربادی کی راہ بتاتا ہے۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾

جانا اللہ نے، بے شک تم خیانت کرتے تھے اپنے نفسوں کے ساتھ۔

عَلِمَ جانا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (عَلِمَ، یَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا پہچاننا، عَلِمَ اللّٰهُ، اللہ نے جان لیا اَنَّكُمْ (اَنَّ. كُمْ) بے شک، تم، كُنْتُمْ، تم تھے، (كُم) ضمیر جمع مذکر مخاطب (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) تَخْتَانُوْنَ، تم خیانت کرتے فعل مضارع جمع مذکر مخاطب (اِخْتَانَ، يَخْتَانُ، اِختِيَانٌ) باب افتعال خیانت کرنا، اردو میں بھی خیانت (بددیانتی) کے لیے استعمال ہوتا ہے اَنْفُسَكُمْ، (اَنْفُسَ. كُمْ) اپنی جانوں پر، نفس کی جمع انفس، یعنی تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''ابتدا میں اگرچہ اس قسم کا کوئی صاف حکم موجود نہ تھا کہ رمضان کی راتوں میں کوئی شخص اپنی بیوی سے مباشرت نہ کرے، لیکن لوگ اپنی جگہ یہی سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ پھر اس کے ناجائز یا مکروہ ہونے کا خیال دل میں لیے ہوئے بسا اوقات اپنی بیویوں کے پاس چلے جاتے تھے یہ گویا اپنے ضمیر کے ساتھ خیانت کا ارتکاب تھا اور اس سے اندیشہ تھا کہ ایک مجرمانہ اور گناہ گارانہ ذہنیت ان کے اندر پرورش پاتی رہے گی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے اس خیانت پر تنبیہ فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ فعل تمہارے لیے جائز ہے۔ لہٰذا اب اسے برا فعل سمجھتے ہوئے نہ کرو، بلکہ اللہ کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قلب وضمیر کی پوری طہارت کے ساتھ کرو۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ﴾

پس اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور تم سے درگزر فرمایا۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ، اُس نے تمہیں بخش دیا، معاف کیا (تَابَ، يَتُوْبُ، تَوْبَةً) اُس نے رحمت سے تم پر رجوع کیا یعنی بخش دیا۔

﴿فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ، وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾

پس اب مباشرت کرو ان سے اور طلب کرو جو لکھا ہے اللہ نے تمہارے واسطے (صالح اولاد)۔

فَالْئٰنَ پس اب، اس وقت، بَاشِرُوْهُنَّ، (بَاشِرُوْ. هُنَّ) مباشرت کرو، ان سے (اپنی بیویوں سے) بَاشَر، يُبَاشِرُ، مُبَاشَرَةً، (مباشرت کرنا) وَابْتَغُوْا اور طلب کرو، فعل امر جمع مذکر (اِبْتَغٰی، يَبْتَغِی، اِبْتِغَاءً) باب افتعال چاہنا، تلاش کرنا، مَا (جو) كَتَبَ اللّٰهُ لکھا ہے اللہ نے لَكُمْ (تمہارے لیے) (اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو کہ وہ تمہیں صالح اور نیک اولاد سے نوازے)۔

﴿وَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾

اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لیے دھاگہ (دھاری) سفید، سیاہ دھاگے (دھاری) سے، فجر (کے وقت)۔

وَ كُلُوْا فعل امر جمع مذکر اور کھاؤ (اَكَلَ، يَاْكُلُ، اَكْلًا) کھانا، وَاشْرَبُوْا فعل امر جمع مذکر، اور پیو (شَرِبَ، يَشْرَبُ، شُرْبًا) پینا، حَتّٰى، یہاں تک يَتَبَيَّنَ، ظاہر ہو فعل مضارع واحد مذکر غائب (ب ی ن) اس کا مادہ ہے، اردو زبان میں بیان، اظہار خیال کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے (تَبَيَّنَ، يَتَبَيَّنُ، تَبَيُّنًا) ظاہر ہونا، واضح ہونا، لَكُمُ (لَ. كُمُ) تمہارے لیے، الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ دھاگہ (دھاری) سفید، قرطاسِ ابیض (White Paper) اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے مِنَ (سے) الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ سیاہ دھاگہ (دھاری) اَسْوَد. کے معنی سیاہ، ابیض (سفید) کی ضد ہے مِنَ الْفَجْرِ، (فجر کے وقت) یعنی بوقت فجر افقِ مشرق پر رات کی سیاہی پر سفید دھاری نمایاں ہونے لگے تو یہ سحری کھانے کا اختتام ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''یہاں رمضان میں سحری کے اختتام کا ذکر ہے کہ جب تک پَو نہ پھٹے اور سفیدۂ صبح واضح نہ ہو جائے کھانے پینے کی اجازت ہے، احادیث مبارکہ میں سحری میں تاخیر اور افطاری میں تعجیل کی فضیلت آئی ہے، سفید دھاگے کا سیاہ دھاگے سے ممیز ہونا بطور استعارہ کے ہے، (اس سے) مقصد سپیدۂ صبح کا ظہور ہے، عدی بن حاتم کہتے ہیں، میں نے سچ مچ دو دھاگے لیے، ایک سیاہ اور ایک سفید اور دیکھتا رہا کہ ان میں کب امتیاز رونما ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو میری اس سادہ لوحی پر ہنسے، آپ ﷺ نے فرمایا، اس سے

مرادنور کا تڑکا ہے (جوافقِ مشرق پر ظاہر ہوتا ہے)۔'' (لسان القرآن، جلد دوم)

﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ پھر پورا کرو روزہ کو رات (کے آنے) تک۔

ثُمَّ (پھر) then حرف عطف ہے اور جملہ میں ترتیب کو ظاہر کرتا ہے، اَتِمُّوْا، پورا کرو، فعل امر جمع مذکر، (اَتَمَّ، يُتِمُّ، اِتمَامٌ) پورا کرنا، الصِّيَامَ، روزے اِلَى الَّيْلِ، رات تک۔ عربی زبان میں لیل کا اطلاق غروب آفتاب پر ہوتا ہے۔ "اَلَّيْلُ مِنْ مَّغْرِبِ الشَّمْسِ اِلٰى طَلُوعِ الْفَجْرِ الصَّادِقِ" ..... ''لیل'' کا وقت غروب آفتاب سے صبح صادق تک ہوتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"اِلَى الَّيْلِ" یعنی جب سے رات داخل ہونے لگے، یہ مطلب نہیں کہ رات کی تاریکی چھا جانے کے وقت تک روزہ رکھے رہو، روزہ رات کے آتے ہی ختم ہو جانا چاہیے، یہ نہ ہو کہ رات کا کوئی جز و روزہ میں شامل و داخل ہو۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ﴾

اور نہ مباشرت کرو ان سے (اپنی بیویوں سے) اور تم معتکف ہو مساجد میں۔

لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ اور نہ مباشرت کرو، ان سے (اپنی بیویوں سے) فعل نہی جمع مذکر، هُنَّ کی ضمیر بیویوں کی طرف جاتی ہے (بَاشَرَ، يُبَاشِرُ، مُبَاشَرَةٌ) مباشرت کرنا، وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ، (اس حالت میں) کہ تم معتکف ہو مساجد میں۔ عٰكِفُوْنَ (عَكَفَ، يَعْكِفُ، عَكْفًا) روکے رکھنا، اس سے عٰكِفُوْنَ، روکنے والے یعنی مساجد کے اندر اپنے آپ کو پابند بنانے والے، اسم فاعل جمع مذکر اس کا مفرد عاکف ہے اور اسی سے لفظ اعتکاف ہے، اس کے معنی عبادت کی نیت سے مسجد میں رہنا اور اس سے باہر نہ نکلنا (مفردات القرآن)۔ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ اعتکاف مسجد کے علاوہ اور کسی جگہ پر نہیں ہو سکتا ہے۔ (تفسیر قرطبی)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اعتکاف کے لیے مسجد ضروری ہے چاہے مرد ہو یا عورت، ازواجِ مطہرات نے بھی مسجد میں

اعتکاف کیا ہے، اس لیے عورتوں کا اپنے گھروں میں اعتکاف بیٹھنا صحیح نہیں ہے، البتہ مسجد میں ان کے لیے ہر چیز کا مردوں سے الگ انتظام کرنا ضروری ہے تاکہ مردوں سے کسی طرح کا اختلاط نہ ہو، جب تک مسجد میں معقول، محفوظ اور مردوں سے بالکل الگ انتظام نہ ہو۔ عورتوں کو مسجد میں اعتکاف بیٹھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے اور عورتوں کو بھی اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیے، یہ ایک نفلی عبادت ہی ہے، جب تک پوری طرح تحفظ نہ ہو، اس نفلی عبادت سے گریز بہتر ہے۔'' (تفسیر احسن البیان)

﴿تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾

یہ اللہ کی (قائم کردہ) حدیں ہیں، پس ان کے قریب نہ جاؤ۔

تِلْکَ، یہ، اسم اشارہ مؤنث کے لیے ہے۔ حُدُوْدُ اللّٰهِ، اللہ کی حدیں (یعنی وہ قوانین جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے فائدے کے لیے بنائے ہیں) فَلَا تَقْرَبُوْهَا، پس تم ان کے قریب نہ جاؤ (یعنی ان قوانین سے تجاوز مت کرو) (قَرُبَ، یَقْرُبُ، قُرْبًا) نزدیک ہونا، قریب ہونا، قریب (نزدیک) اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ 'ھا' کی ضمیر حدود کی طرف جاتی ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾

اس طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں، لوگوں کے لیے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

كَذٰلِكَ، اس طرح (Thus) يُبَيِّنُ بیان کرتا ہے (بَيَّنَ، يُبَيِّنُ، تَبْيِيْنٌ) وضاحت سے بیان کرنا باب تفعیل ہے۔ اٰيٰتِهٖ (اٰيَات.هٖ) نشانیاں، اپنی، آیات کا مفرد اٰيَةٌ (نشانی) ہے، آیات سے مراد انفس و آفاق کی نشانیاں بھی ہیں اور قرآن حکیم کے دلائل بھی اُس کی نشانیاں ہیں، لِلنَّاسِ لوگوں کے لیے لَعَلَّهُمْ (لَعَلَّ.هُمْ) امید ہے، وہ، یہ واضح رہے کہ جب لَعَلَّ کا استعمال اللہ کی طرف سے ہو تو اس کے معنی یقین کے ہوتے ہیں، يَتَّقُوْنَ، (وہ نافرمانی) سے بچیں گے، اللہ تعالیٰ کی حدود کی نگرانی کرنے والے اُس کی رحمت سے تقویٰ کی راہ پر آجائیں گے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرنا شرفِ انسانی ہے اور اسلام کی مصفّٰی تعلیمات اسی بات کا خوگر بناتی ہیں۔

۲) رمضان کا پورا مہینہ جدوجہد اور نظم وضبط کی تربیت ہے۔ نمازوں کی پابندی، آیات قرآنی پر تدبر وتفکر، کھانے پینے کا سلیقہ، زبان وبیان کی حفاظت، عبادت وریاضت کا قرینہ، آپس میں ہمدردی وغمخواری کے جذبات زندگی کو ارفع واعلیٰ مقام پر لا کھڑا کرتے ہیں یہ شعور پیدا ہوتا ہے کہ جینے کا مقصد محض کھانا پینا اور خواہشاتِ نفسانی کو پورا کرنا ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر خالق ومالک کی رضا کو پانا ہے۔

۳) اسلام روح اور نفس میں اعتدال اور توازن پیدا کرتا ہے اور یہی ایک اچھے قانون کی خوبی ہے، وہ قرب الٰہی کے لیے رہبانیت کا سبق نہیں دیتا کہ جنگلوں اور غاروں کی راہ لو، بلکہ شہری زندگی ہی میں اعتدال کی راہ پر لا کر بلندیوں پر فائز کر دیتا ہے، معاشرتی زندگی اس طرح سنوارتا اور نکھارتا ہے کہ ایک طرف بندگی رب کا جذبہ ابھرتا ہے تو دوسری طرف رب کے بندوں کی خدمت کا شوق اور ولولہ پیدا ہوتا ہے حقوق اللہ کی حفاظت اور حقوق العباد کی نگرانی ہی دنیا وآخرت میں کامیابی کا راز ہے۔

۴) مسلمان اس روئے زمین پر حق کا داعی ہے، اسے دنیا میں طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما ہونا ہے، اس لیے روزہ اور رمضان کا مہینہ اسے مکمل تربیت (Training) سے صیقل کرتا ہے، کاش کہ دور حاضر کے مسلمان ماہ رمضان سے تربیت لیں!

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۸۸)	اور دیکھو! ایسا نہ کرو کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے کھاؤ اور نہ اپنے اس (مال کو بطور رشوت) حاکموں کے پاس لے جاؤ کہ (اس طرح) لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طور پر کھاتے رہو اور تم جانتے ہو کہ حقیقت حال کیا ہے۔

﴿وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے باطل (ناجائز) طریقے سے۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اور نہ کھاؤ، (اَكَلَ، يَاْكُلُ، اَكْلًا) کھانا، اَکل وشُرب (کھانا پینا) اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے وَلَا تَاْكُلُوْٓا فعل نہی، جمع مذکر حاضر۔ اَمْوَالَكُمْ (اَمْوَالَ. كُمْ) مال، اپنے، بَيْنَكُمْ (بَيْنَ. كُمْ) درمیان۔ اپنے، بِالْبَاطِلِ (بِ. الْبَاطِلِ) ساتھ باطل کے (ناجائز طور پر)۔

﴿وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ﴾

اور (نہ) پہنچاؤ تم ساتھ اس (مال) کو حاکموں کے پاس تاکہ کھاؤ کچھ حصہ لوگوں کے مال میں سے گناہ کے ساتھ۔

وَتُدْلُوْا اور پہنچاؤ تم فعل مضارع جمع مذکر حاضر (اَدْلٰى، يُدْلِيْ، اِدْلَاءٌ) باب افعال ہے اس کے لغوی معنی کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں، اِسی سے بطور اِستعارہ اَدْلٰی کے معنی کسی چیز تک پہنچنے کے لیے ذریعہ بنانا بھی آ جاتے ہیں، اَلْاِدْلَاءُ اُسْتَعِيْرَ لِلتَّوَسُّلِ اِلَى الشَّيْءِ (مفردات القرآن) وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ کا مفہوم یہ ہوا کہ ان اموال کے ذریعے (رشوت دے کر) حکام تک رسائی حاصل نہ کرو۔ تُدْلُوا سے پہلے وہی لا پوشیدہ ہے جو تَاْكُلُوا سے پہلے آیا ہے یہی وجہ ہے کہ تُدْلُوْا کا ترجمہ 'نہ پہنچاؤ' کیا گیا ہے۔

لِتَاْكُلُوْا (لِ. تَاْكُلُوْا) تاکہ۔ کھاؤ، لام زیر کے ساتھ وجہ بتاتا ہے، تَاْكُلُوْن تھا، لام کی وجہ سے نون اعرابی گر گیا ہے، فَرِيْقًا حصہ یا جزو، یہ مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے، مِنْ اَمْوَالِ النَّاسِ، لوگوں کے مال میں سے، بِالْاِثْمِ (بِ. الْاِثْمِ) ساتھ، گناہ کے یعنی ظلم وزیادتی سے وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اور تم جانتے ہو (عَلِمَ، يَعْلَمُ عِلْمًا) جاننا، پہچاننا، یعنی تمہارا دل اس بات پر گواہ ہے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو یہ سب ناجائز اور حرام کام ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''باطل طریقوں سے دوسروں کا مال ہضم کرنے کی کئی صورتیں ہیں مثلاً چوری، خیانت، دغا بازی، ڈاکہ، جوا، سود اور تمام ناجائز قسم کی تجارتیں اور سودے بازیاں ہیں اور اِس آیت میں بالخصوص اُس ناجائز طریقہ کا ذکر ہے جو حکام کی وساطت سے حاصل ہو، اُس کی ایک عام صورت تو رشوت ہے کہ حاکم (یا جج) کو رشوت دے کر مقدمہ اپنے حق میں کرا لے اور اس طرح دوسرے کا مال ہضم کر جائے اور دوسری یہ کہ مثلاً

تمہیں معلوم ہے کہ فلاں جائیداد یا فلاں چیز زید کی ہے لیکن اس کی ملکیت کا کوئی ثبوت اس کے پاس موجود نہیں ہے اور تم مقدمہ کی صورت میں ایچ پیچ کے ذریعے وہ چیز زید سے ہتھیا سکتے ہو تو اس طرح عدالت کے ذریعے تم اُس چیز کے مالک بن سکتے ہو، اس طرح بھی دوسرے کا مال ہضم کرنا حرام ہے۔ (تیسیر القرآن)
چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں ایک انساں ہی ہوں، تم میرے پاس جھگڑے لے کر آتے ہو، ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک دوسرے کی نسبت اپنی دلیل اچھی طرح پیش کرتا ہو اور میں جو کچھ سنوں اسی کے مطابق فیصلہ کر دوں اور اگر میں کسی کو اس کے بھائی کے حق میں سے کچھ دینے کا فیصلہ کر دوں تو اُسے چاہیے کہ نہ لے، کیونکہ میں اُسے آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں۔'' (بخاری، کتاب الاحکام بحوالہ تیسیر القرآن)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) روزہ اگر انسانوں میں تقویٰ کی راہ پیدا کرتا ہے تو زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی اسی تقویٰ اور پرہیز گاری کی ضرورت ہے، سید قطبؒ نے کتنی خوبصورت بات کہی ہے: ''حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے تمام امور ایسے ہی مربوط ہیں جیسا کہ جسم کے تمام اعضا آپس میں مضبوط و مربوط ہیں اور یہ سب ایک ہی رشتے تقویٰ سے مربوط ہیں، اسی طرح اللہ کا عطا کردہ نظام وحدت کی شکل اختیار کر لیتا ہے (ہر شعبہ حیات میں صرف خالق و مالک کا خوف پیش نظر رہتا ہے) اور اُن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے، ان میں سے کسی ایک جزو کو ترک کر دینا اور دوسرے جزو پر عمل کرنا کتاب الٰہی کے ایک حصہ پر ایمان اور دوسرے حصے کے انکار کے مترادف ہے اور انجام کے لحاظ سے یہ کفر ہی ہے، العیاذ باللہ!'' (فی ظلال القرآن)

۲) اس آیہ مبارکہ میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مشقتِ نفس کی عبادتیں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں اگر ایک شخص بندوں کے حقوق سے بے پروا ہے اور مالِ حرام، مکر و فریب، کذب و دروغ، خیانت اور بد دیانتی سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتا تو یہ جان لو نیکی صرف اسی میں نہیں ہے کہ چند دنوں کے لیے تم نے جائز غذا ترک کر دی، نیکی کی راہ یہ ہے کہ ہمیشہ کے لیے ناجائز غذا ترک کر دو۔

۳) اگر ہم اس آیہ مبارکہ پر عمل پیرا ہو جائیں تو ہماری معاشرتی زندگی کتنی پر سکون ہو جائے، عدالتیں جھوٹے مقدمات کے غائب ہونے سے خالی خالی نظر آنے لگیں گی، اس سلامتی سے ہماری

صلاحیتیں زندگی کے کارآمد امور پر صرف ہونے لگیں، دنیا بھی اچھی بن جائے اور آخرت بھی سنور جائے۔

۴) مسلمانو! غور کرو قرآن حکیم تمہیں خوشی اور خوشحال زندگی کی ضمانت دیتا ہے مگر افسوس کہ تم نے اپنے لیے عذاب اور پریشانی مول لینے کا عہد کر رکھا ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے اِحساسِ زیاں جاتا رہا

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ، قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ، وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى، وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۱۸۹)	(اے رسولؐ) آپ سے لوگ نئے چاند کے متعلق دریافت کرتے ہیں (کہ یہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے؟) آپ کہہ دیجیے کہ لوگوں کے لیے یہ پیمانہ وقت و زمان ہے اور اس سے حج کے مہینے کا تعین ہو جاتا ہے نیکی و حق شناسی یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں اُن کے پچھواڑوں سے داخل ہو، بلکہ نیکی تو اُس کے لیے ہے جس نے راہِ تقویٰ کو اپنایا، لہٰذا گھروں میں دروازے ہی کی راہ سے آؤ، اور (دیکھو!) اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، امید ہے کہ تم فوز و فلاح سے ہمکنار ہو گے۔

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾

سوال کرتے ہیں آپ سے (لوگ) نئے چاند کے بارے میں۔

يَسْئَلُوْنَكَ (يَسْئَلُوْنَ. كَ) وہ سوال کرتے ہیں، آپ سے (سَاَلَ، يَسْأَلُ، سُؤَالًا) سوال

کرنا، پوچھنا، ک ضمیر مخاطب کے لیے ہوتی ہے، عَنِ، سے، بارے میں، اَلْاَهِلَّةِ، نیا چاند (New Moon) اَلْهِلَال اس کا مفرد ہے، یعنی یہ چاند کے مہینوں کے متعلق پوچھتے ہیں، کہ چاند ان دنوں گھٹتا بڑھتا کیوں ہے؟

﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾

کہہ دیجیے کہ وہ (چاند) پیمانہ وقت و زمان ہے، لوگوں کے لیے اور اوقاتِ حج (کے تعین کا ذریعہ) ہے۔

قُلْ، کہیے، فعل امر واحد مذکر (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، هِيَ، وہ ضمیر واحد مؤنث (چاند کی طرف اشارہ ہے)، مَوَاقِيْتُ (وقت مقرر کرنے یا بتانے کا ذریعہ) اسم آلہ ہے اس کا مفرد مِيْقَاتٌ ہے یعنی چاند سے وقت کا تعین ہوتا ہے اور قمری، مہینوں سے رمضان، حج، عیدین اور دوسرے مہینوں کا پتہ چلتا ہے۔ لِلنَّاسِ لوگوں کے لیے وَالْحَجِّ، اور حج کے لیے بھی حج کا لغوی معنی قصد و زیارت اور اصطلاحی مفہوم ایام حج میں مناسک حج کی ادائیگی ہے، حج کا خصوصی طور پر ذکر اس لیے آیا ہے کہ اس کی اہمیت اہل عرب کے ہاں نمایاں اور مسلّمہ تھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''قرآن کا ایک ایک فقرہ توحید کے اعلان اور شرک کی تردید میں ہے، دنیا میں مشرک قومیں کثرت سے قمر پرستی میں مبتلا رہی ہیں اور بعض ہلال پرستی میں بھی، نئے چاند کو دیوتا مان کر اُس کی پوجا کثرت سے کی گئی ہے اور بڑھتے چاند کو مبارک اور اترتے چاند کو منحوس سمجھنے کا رواج تو آج خدا معلوم کتنے مسلمان گھرانوں میں بھی موجود ہے اور ہندوستان میں چھپی ہوئی جس جنتری کو چاہے آج اٹھا کر دیکھ لیجیے، اس کے کتنے خانے اس سے بھرے نظر آئیں گے کہ فلاں تاریخ فلاں کام کے لیے سعد (مبارک) ہے اور فلاح تاریخ نحس (منحوس) ہے، قرآن مجید نے عروج و زوال قمر کی یہ غایت بتا کر کہ وہ انسان کے کام آنے والی چیز ہے۔ ''هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاس'' ہلال پرستی اور اس کے ماتحت سارے خرافات کی جڑ ہی کاٹ دی۔ احمق انسان! تُو چاند کی کیا پوجا کر رہا ہے، چاند تو خود تیری خدمت کے لیے ہے۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾

اور نیکی یہ نہیں کہ تم گھروں میں آؤ ان کے پچھواڑوں سے۔

وَلَيْسَ اور نہیں، اَلْبِرُّ ہر نیکی، بھلائی (Virtue) کے لیے استعمال ہوتا ہے بِاَنْ، یہ کہ، تَاْتُوْا، تم آؤ فعل مضارع جمع مذکر حاضر (اَتٰی، یَاْتِیْ، اِتْیَانٌ) آنا، اَلْبُيُوْتَ، گھروں۔ اس کا مفرد بَيْتٌ ہے، ظُهُوْرِهَا، (ظُهُوْر.ھا) پشتوں، پچھواڑوں اُن کی، ھا کی ضمیر بیوت (گھروں) کی طرف جاتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''جاہلی عرب جب احرام حج کی حالت میں ہوتے تو گھر میں جانے کے لیے دروازے سے داخل ہونے کو نحوست اور بدشگونی سمجھتے، بلکہ پشت کی دیوار میں ایک بڑا سا روزن پیدا کر دیتے اور اس کے اندر سے مکان میں داخل ہوتے یا پیچھے کی طرف سے چھت پر چڑھ جاتے اور اس سے اندر پھاندتے اور اسے اپنے نزدیک کوئی بڑی عبادت اور خانہ کعبہ کی تعظیم سمجھتے، اور قبائل کے نومسلم صحابی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، اسی کی اصلاح خیال کے لیے آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى﴾ بلکہ نیکی یہ ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔

وَلٰكِنَّ اور لیکن اَلْبِرَّ نیکی (یہ ہے) مَن جو اسم موصول، اتَّقٰی، تقویٰ اختیار کرے، (اِتَّقٰی، یَتَّقِی، اِتِّقَاءً) اللہ تعالیٰ کا خوف دِل میں پیدا کرنا، ہر وقت اور ہر حال میں اس سے ڈرنا، تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی منع کی ہوئی اور حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں سے ڈرا اور بچا جائے۔

﴿وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ اور گھروں میں آؤ اس کے دروازوں سے۔

وَاْتُوْا، اور آؤ، اَلْبُيُوْتَ، گھروں کو مِنْ اَبْوَابِهَا، اس کے دروازوں سے، ھا کی ضمیر بیوت کی طرف جاتی ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اسلام تمام شکوک وشبہات، توہم پرستی اور جہالت کے طور طریقوں سے بالا، مہذب اور پاکیزہ دستور حیات ہے۔

۲) اسلام نے حج، صوم اور دیگر ضروریات دین کے لیے قمری مہینوں کو پسند فرمایا ہے حالانکہ شمسی مہینے زیادہ واضح اور متعین ہوتے ہیں اس کی متعدد وجوہ ہیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

(الف) اسلام دین فطرت ہے جس میں اہل حضر سے لے کر اہل بادیہ تک سب لوگوں کی رعایت رکھی گئی ہے، شمسی مہینے شہر کے متمدن لوگوں کو تو معلوم ہو سکتے ہیں لیکن خانہ بدوش اور غیر شہری نہیں جان سکتے ہیں۔

(ب) اسلام کا مقصد صرف تعیین وتقرر ہی نہیں بلکہ تشویق وترغیب بھی ہے (شوق اور رغبت دلانا بھی ہے) مثلاً رمضان اگر شمسی تاریخوں میں ہوتا تو بلا کسی انتظار کے کھٹ سے آموجود ہوتا اور اس وجہ سے دلوں میں پہلے سے کوئی شوق واضطراب نہ ہوتا لیکن اب لوگ ماہ صیام کا چاند دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں اور اس طرح طبائع میں ماہ صیام کے لیے زبردست شوق پیدا ہو جاتا ہے یعنی مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے اور خود بخود تحریک بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

(ج) قمری مہینوں میں موسم بدلتے رہتے ہیں، شمسی مہینوں میں رمضان ہمیشہ ایک ہی موسم میں ہوا کرتا ہے، یا گرما میں یا سرما میں، اس طریق سے مختلف موسموں میں موقع ملتا ہے اور تنوع قائم رہتا ہے (زندگی کی بہار رنگا رنگی سے ہے)۔

(د) صوم (روزہ) ہو یا حج اس سے مقصود دلوں میں تقویٰ پیدا کرنا ہے اور یہی کامیابی اور سلامتی کا راستہ ہے، اسلام دنیا اور آخرت دونوں کو سنوارتا ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا، اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۱۹۰)	اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں (مگر یہ امر ملحوظ رہے کہ) زیادتی نہ کرنا کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

وَقَاتِلُوْا اور لڑو، فعل امر جمع مذکر (قَاتَلَ یُقَاتِلُ، مُقَاتَلَةٌ) باب مفاعلۃ، لڑائی کرنا، فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، اللہ کی راہ میں۔ قِتَال کے ساتھ فی سبیل اللہ کی قید لگا کر بتا دیا ہے کہ قِتَال اور جنگ کی غرض و غایت دنیاوی جاہ و جلال اور سطوت و شوکت نہیں ہے بلکہ محض کلمہ حق کو بلند و بالا کرنا ہے۔ یعنی جَاهِدُوْا لِاِعْلَاءِ كَلِمَتِهٖ وَ دِیْنِهٖ (بیضاوی) الَّذِیْنَ، ان سے جو، اسم موصول ہے یُقَاتِلُوْنَكُمْ (یُقَاتِلُوْنَ. كُمْ) لڑتے ہیں (جنگ کرتے ہیں) تم سے یُقَاتِلُوْنَ، فعل مضارع جمع مذکر غائب، اس سے صاف ظاہر ہے کہ قِتال صرف انہی کے ساتھ ہے جو مسلمانوں سے جنگ کر رہے ہیں، دوسرے معنوں میں مسلمان پہل نہیں کرتا بلکہ دفاعی جنگ لڑتا ہے۔ وَلَا تَعْتَدُوْا اور زیادتی نہ کرو۔ فعل نہی جمع مذکر حاضر (اِعْتَدَی، یَعْتَدِی، اِعْتِدَاءٌ) راہ حق اور احکام الٰہی کی حدود سے تجاوز کرنا، الْمُعْتَدِیْنَ زیادتی کرنے والوں کو۔

خواجہ عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''قَاتِلُوْا'' لڑو، لفظ قتال سے ہے جس کے معنی جنگ کرنا، لڑنا ہیں۔ یہ حکم مسلمانوں کو اِس حالت میں مل رہا ہے، جبکہ اُن پر اُن کے دشمن اور مخالفین اسلام (قریش مکہ) ظلم ڈھا چکے ہیں، یہ ظلم چند دن کے لیے نہیں بلکہ تیرہ برس تک مکہ میں قیام کے دوران ہوتا رہا ہے، کافروں کی زیادتی اور بے رحمی کے جواب میں صبر کرتے ہوئے مسلمان جب وطن اور گھر بار چھوڑ کر بے وطن ہوئے، مدینہ میں جا بسے تو اس قدر لمبے اور سخت امتحان کے بعد دشمنوں سے مدافعت کے لیے جنگ کی اجازت ہوئی، وہ بھی ظالموں کے بار بار چھیڑ چھاڑ اور حملے کرنے پر ''فی سبیل اللہ'' (اللہ کی راہ میں) یعنی ذاتی غرض کے لیے نہیں، شرک مٹانے اور دین حق کی حمایت اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ''اَلَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ'' (جو لوگ تم سے لڑتے ہیں) یعنی وہ جنہوں نے تم پر ہتھیار اٹھائے، ان الفاظ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۱- ایک یہ کہ جنگ میں پہل کرنے والے مسلمان نہ تھے اور نہ انہیں ہونا چاہیے تھا، رسول اللہ ﷺ کی تمام

جنگیں حفاظت اور مدافعت کے لیے تھیں۔

۲- دوسری یہ کہ جنگ صرف ان لوگوں کے خلاف کی جائے جو عملی طور پر لڑائی میں حصہ لے رہے ہوں، اس حکم کی رو سے تمام بوڑھے بچے، عورتیں، بیمار، غیر جانبدار لوگ مستثنیٰ ہو جاتے ہیں، اسلام میں ان سے جنگ کرنا جائز نہیں، البتہ ''اَلَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ'' میں وہ تمام دشمن شامل ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہوں اور کسی صورت میں لڑنے والوں کی مدد کر رہے ہوں ''لَا تَعْتَدُوْا'' (زیادتی نہ کرو) یہ لفظ اِعْتِدَا سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں حق سے بڑھنا اور حد سے آگے نکل جانا، اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) حد سے مراد شریعت کی حد ہو سکتی ہے مثلاً یہ کہ انتقام اور غصہ کے جوش میں دشمن قوم کے ایسے لوگوں کو بھی قتل کر دینا جو لڑائی میں شامل نہ ہوں، اُن کے کھیتوں، باغوں اور پھلدار درختوں کو آگ لگا دینا، ان کے بے زبان جانوروں کو مار دینا۔ (۲) حد سے مراد معاہدہ کی حد بھی ہو سکتی ہے مثلاً یہ کہ دوسری قوموں کی تقلید کر کے خود بھی معاہدوں کی پروانہ کرنا اور حد شکنی کی ابتدا کر کے ہلہ بول دینا۔ (۳) حد سے زیادتی کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فی سبیل اللہ کے علاوہ کسی اور مقصد اور غرض کے لیے جنگ کی جائے۔ (درس قرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) امن کی حالت ہو یا جنگ کا موقع، اسلام کی بلند تعلیمات پر غور و فکر کیجیے کہ وہ ظلم و زیادتی کو کسی طرح بھی پسند نہیں کرتا ہے، وہ عین انتہائی جوش و غضب کے موقع پر بھی اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور بار بار تقویٰ و طہارت اور عفو و درگزر کی تعلیم دیتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو جنگ میں بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے حکماً منع فرما دیا: ''نَهیٰ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰه وَسَلَّمِ عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ'' (بخاری، مسلم بحوالہ فی ظلال القرآن، جلد اول)

اسی طرح چہرے پر مارنا اور اسے مسخ کرنا، جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے (مثلہ کرنے) آگ میں جلانے سے بھی منع فرمایا، بہت سی احادیث اس سلسلہ میں موجود ہیں، اس کے برعکس یہودیوں میں بچے، عورتیں اور بوڑھے سب کے سب تہ تیغ کر دیے جاتے بلکہ جانوروں تک کو مار ڈالتے، کھیت باغات اور گھروں کا تمام مال و متاع آگ کی نذر ہوتا، یہود کے اس ظلم و ستم کا ہم آج بھی مشاہدہ

کرتے ہیں، روزانہ فلسطینیوں کے مردوں، بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے بلکہ ان کے گھروں کو گولہ اور بارود سے مسمار کر دیا جاتا ہے اور یہود کے نقش قدم پر نصاریٰ بھی چل پڑے ہیں، امریکہ نے گزشتہ برسوں افغانستان پر جو ناحق ستم ڈھایا اور بمباری کی وہ تاریخ کا شرمناک باب ہے۔ پھر بلا جواز عراق کے کئی شہروں پر مسلسل کئی روز بارود گرایا اور ہزاروں بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور جوانوں نے جام شہادت نوش کیا، جو تاریخ انسانیت کا انتہائی کربناک باب ہے۔

۲) مسلمان یا تو دفاعی جنگ لڑتا ہے یا پھر جہاں لوگوں پر ظلم ہو رہا ہو انہیں ظالموں کے پنجۂ استبداد سے بچانے کے لیے ان کی مدد کو پہنچتا ہے اور عدل و انصاف کی حکمرانی قائم کرنا اور اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اس کا مقصد حیات ہوتا ہے، اس راہ میں اپنی جان کا نذرانہ تک پیش کر دیتا ہے۔

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ، وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ، وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ، فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ، كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ (۱۹۱) فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۹۲)	اوران (کفار و مشرکین) سے لڑو جہاں بھی تمہارا ان سے مقابلہ پیش آئے (اور دیکھو! پیٹھ نہ دکھلاؤ) اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے (قتل و غارت گری اگرچہ بری بات ہے) مگر فتنہ و فساد اس سے بھی زیادہ برا ہے اور جب تک وہ خود مسجد حرام کی حدود میں تم سے لڑائی نہ کریں تم بھی اس جگہ ان سے لڑائی نہ کرو پھر اگر ایسا ہوا کہ انہوں نے لڑائی کی، تو تمہارے لیے بھی یہی ہوگا کہ ان سے لڑو، منکرین حق (کی ظالمانہ پیش قدمیوں) کا یہی بدلہ ہے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو جان لو کہ اللہ انصاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ اورلڑو ان سے جہاں پاؤتم،انہیں۔

وَاقْتُلُوْهُم لڑوتم سب ان سے۔فعل امر جمع مذکر(قَتَلَ، يَقْتُلُ، قَتْلًا)لڑنا قتال کرنا هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ان لوگوں کی طرف جاتی ہے جو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلیں، حَيْثُ، جہاں کہیں، اسم ظرف مکان کے لیے آتا ہے ثَقِفْتُمُوْهُمْ ، پاؤتم انہیں (لڑنے کے لیے)ثَقِفَ، يَثْقَفُ، ثَقْفاً، مقابلے کی غرض سے کسی کو سامنے پانا۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''اِس سے مراد وہی لوگ ہیں (جو مسلمانوں کے خلاف) لڑائی کے لیے نکلے ہوں، یہ حکم حالت جنگ کا ہے، ہر وقت کا نہیں ہے۔'' (درس قرآن)

﴿وَاَخْرِجُوْهُمْ مِنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾

اور نکالو انہیں اس جگہ سے جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے۔

وَاَخْرِجُوْهُمْ (وَاَخْرِجُو – هُمْ) اور نکالو انہیں (اَخْرَجَ، يُخْرِجُ، اِخْرَاجًا) نکالنا، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مشرکین کی طرف جاتی ہے جنہوں نے مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھا کر انہیں سرزمین مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا، مِنْ سے حَيْثُ جہاں یعنی جہاں سے، أَخْرَجُوْكُمْ (اَخْرَجُوْ – كُمْ) نکالا انہوں نے تمہیں، كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مسلمانوں کی طرف جاتی ہے۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''بیت اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اس لیے تعمیر کیا تھا کہ تمام روئے زمین کے لوگ وہاں آ کر خالص طور پر اللہ کے لیے عبادت کریں اس کے اصلی وارث مسلمان تھے اس لیے کہ مسلمان ہی تمام اقوام میں دین ابراہیمی کے نام لیوا تھے اور اللہ تعالیٰ کی شریعت اور دین حق کے پابند تھے۔ مسلمانوں نے اسے نئے سرے سے دین اسلام کا مرکز بنانا چاہا، لیکن کفار اور مشرکین مکہ نے مسلمانوں کی مخالفت کی، ان کے راستے میں روڑے اٹکائے، انہیں کلمہ حق کہنے سے روکا اور ان پر ظلم اور سختیاں کیں حتیٰ کہ مسلمانوں کو مکہ ہی سے نکال دیا، مظلوم مسلمان اپنے آبائی وطن اور مرکز کو چھوڑ کر مدینہ چلے آئے، وہاں بھی کفار نے

انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا مختلف قسم کی سازشیں کیں، برابر چھیڑ چھاڑ اور مخالفت جاری رکھی، مسلمانوں کو حج کرنے سے روکا، دعوت اسلامی میں ایک بڑی رکاوٹ بن گئے، مدینہ پر حملے شروع کر دیے ان حالات میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ایسے کافر دشمنوں سے قتال کرو اور اپنے آبائی وطن اور روحانی مرکز کو واپس لینے کے لیے انہیں وہاں سے نکال دو۔'' (درس قرآن، جلد اول)

﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ اور فتنہ وفساد زیادہ شدید ہے قتل (وغارتگری) سے۔

فِتْنَہ، فتنہ وفساد معاشرتی زندگی کو امن وسکون سے محروم کرنا اور اس کی جگہ بدامنی اور بے چینی پھیلانا، اَشَدُّ شدید سے ہے اَشَدُّ کے معنی شدید تر مِنَ الْقَتْلِ، قتل سے یعنی فتنہ وفساد پھیلانا کہ جس سے لوگ روحانی طور پر کرب وتکلیف میں مبتلا ہو جائیں وہ تو قتل وغارتگری سے بھی بڑا عذاب ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''فتنہ کے معنی یہاں کسی کو جبر وظلم سے اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں، انگریزی میں اس کو Persecution کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ (البروج ۸۵:۱۰) ''جن لوگوں نے ایمان لانے والے مردوں اور عورتوں کو دین سے پھیرنے کے لیے اذیتیں پہنچائیں ان کے لیے عذابِ جہنم ہے اور جلنے کا عذاب ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ﴾

اور نہ قتال کرو ان سے مسجد حرام (خانہ کعبہ) کے پاس یہاں تک کہ وہ لڑائی کریں تم سے اس میں۔

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ اور تم قتال نہ کرو، فعل نہی صیغہ جمع مذکر حاضر (قٰتَلَ، يُقٰتِلُ، مُقَاتَلَةٌ) باب مفاعلۃ، یہ حکم مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے، هُمْ کی ضمیر کفار کی طرف ہے، عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حرمت والی مسجد کے آس پاس، عِنْدَ کے معنی قرب وجوار اور آس پاس کے ہیں، مسجد حرام کے اردگرد کئی میل کا علاقہ ''حرم'' کہلاتا ہے، حتّٰی یہاں تک، يُقٰتِلُوْكُمْ کہ وہ (کفار) لڑائی کریں تم سے (يُقٰتِلُوْ-كُمْ) لڑیں۔ تم سے كُمْ، ضمیر جمع مذکر حاضر (مسلمانوں کی طرف ہے) فِيْهِ (فِيْ.هِ) اس میں (یعنی سرزمین حرم میں)۔

﴿فَاِنۡ قٰتَلُوۡكُمۡ فَاقۡتُلُوۡهُمۡ، كَذٰلِكَ جَزَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ﴾

پس اگر وہ تم سے قتال کریں تو تم بھی ان سے قتال کرو تو اس طرح یہ سزا ہے کفار (کے لیے)۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''اس چھوٹے سے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ ہر چند حدودِ حرم اور اشہرِ حرم میں قتل وقتال بڑی سنگین بات ہے لیکن جس گھر میں اللہ کے بندوں اور بندیوں کو اس بنا پر ظلم وستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان کیوں لائے، یہ ظلم وستم اس قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے، اس سنگین تر فتنہ کو مٹانے کے لیے تمہیں یہ اجازت دی جاتی ہے کہ اگر نوبتِ جنگ آ جائے تو تم کفار کو تر کی بہ تر کی جواب دو اور جہاں کہیں وہ تمہارے مقابل میں آئیں تو انہیں قتل کرو، یہ چیز نہ احترامِ حرم کے منافی ہے نہ حرمتِ اشہرِ حرم کے۔''

(تدبر قرآن، جلد اول)

﴿فَاِنِ انۡتَهَوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ﴾

پھر اگر وہ باز آ جائیں تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا، رحیم ہے۔

فَاِنۡ (فَ.اِنۡ) پس، اگر، اِنۡتَهَوۡا، ماضی جمع مذکر غائب وہ رک جائیں، باز آ جائیں (اِنتَهٰی، يَنتَهِيۡ، اِنتِهَاء) رکنا، باز آنا محض جنگ سے نہیں، جسے انہوں نے شروع کیا تھا بلکہ عقائد کفر وشرک سے جو محرک اور باعث بنے ہوئے تھے جنگ وقتال کے (تفسیر ماجدی) فَاِنِ انۡتَعَوۡا عَنِ الشِّرکِ وَ القِتال (تفسیر مدارک) یعنی شرک اور قتال سے رک جائیں۔

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ تو بے شک اللہ بڑا ہی بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''(شرک وکفر سے تائب ہونے پر اور صلح وصفائی کی راہ چلنے پر) اُن کی توبہ قبول کر لی جائے گی انہیں دائرہ اسلام میں داخل سمجھا جائے گا، آیہ مبارکہ کے اس جزو ''فان انتھوا'' کے اس مفہوم کو خود قرآن ہی سے واضح کر دیا کہ مراد کفر وشرک سے باز آ جانا ہے نہ کہ محض جنگ وقتال سے۔ صفاتِ مغفرت ورحمت کا ترتب کفر ہی سے تائب ہونے پر ہو سکتا ہے نہ کہ محض ترکِ جنگ پر۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

(۱) ایک مسلمان کی ہستی انسانیت کا صحیح نمونہ ہے وہ دین فطرت اسلام پر عمل پیرا ہے وہ اپنے قول وفعل سے اخلاقِ حسنہ کا داعی ہوتا ہے کامل انسانیت کا نمونہ ہونے کی حیثیت میں اسے پوری آزادی سے زندہ رہنے کا حق ملنا چاہیے۔ اسلام نہ کسی کی آزادی چھینتا ہے، نہ اپنی آزادی قربان کرسکتا ہے، نہ کسی ایسے دستور، طریق کار اور نظام کو برداشت کرسکتا ہے جو امن سوز، باطل پرست، اللہ سے بغاوت کا علمبردار، حیا اور ایمان سے خالی اور شرافت وانسانیت کے لیے باعث عار ہو۔

(۲) دین سے لوگوں کو ہٹانا، انسانی زندگی کی مقدس ترین شے پر حملہ آور ہونا ہے اس لیے یہ جرمِ قتل۔ انسان کی جان لینے اور اس کی زندگی کو ختم کرنے سے زیادہ شدید ہے۔ یہ فساد اور بگاڑ کئی طرح سے ہوتا ہے یہ کوشش تہدید اور عملی ایذا رسانی کی صورت میں ہو یا ایسے فاسد نظاموں کے قائم کرنے کی شکل میں جن کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو گمراہ کریں، انہیں بگاڑ کے راستے پر لگائیں، اللہ کے بھیجے ہوئے نظام زندگی سے انہیں دور کریں اور ان کے لیے دین حق کے انکار اور اس سے روگردانی کو حسین وخوشنما بنائیں اس سلسلے کی سب سے قریبی مثال اشتراکی نظام کی ہے، یہ نظام دینی تعلیم کو ممنوع قرار دیتا ہے اور الحاد کی تعلیم کو جائز ٹھہراتا ہے، اپنے قوانین کے ذریعہ حرام چیزوں۔ مثلاً زنا اور شراب کو مباح قرار دیتا ہے اور پروپیگنڈہ کے مختلف ذرائع اختیار کرکے انہیں لوگوں کے لیے مرغوب ومحبوب بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام میں جو اعمال مطلوب ومحمود ہیں ان کے اتباع کو قبیح قرار دیتا ہے اور ایسے بہت سے کام انسانوں پر لازم وعائد کردیتا ہے جن سے بچنا ان کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہوتا، ایسے تمام فاسد نظام ہائے زندگی کے خلاف جہاد وقتال کرنا مسلمانوں پر فرض ہوجاتا ہے۔ یہ باطل نظام خواہ نام نہاد اسلامی ریاستوں میں ہو یا دنیا کے کسی اور خطے میں لوگوں کو امن اور سلامتی کا راستہ دینا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ (فی ظلال القرآن کی روشنی میں)

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ، فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۹۳) اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ، فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۱۹۴)	اور اِن (کفار ومشرکین) سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ وفساد باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ ہی کے لیے ہو جائے پھر اگر ایسا ہو کہ یہ لوگ لڑائی سے باز آ جائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں، اگر (ان کی طرف سے) حرمت کے مہینوں کا پاس ولحاظ رکھا جائے تو تمہاری طرف سے بھی ہونا چاہیے اور حرمتوں میں برابر کا بدلہ ہے تو جو تم پر (ان مہینوں میں) دست درازی کرے تم بھی اس پر ویسی ہی دست درازی کرو جیسی اس نے تم پر کی اور اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو اور جان لو کہ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی نافرمانی سے بچتے ہیں۔

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾

اور لڑو اُن (کفار ومشرکین) سے یہاں تک کہ فتنہ وفساد نابود ہو جائے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ اور ان سے لڑو (وَقٰتِلُوْ. هُمْ) لڑو (جنگ کرو ان سے) فعل امر جمع مذکر هُمْ ضمیر جمع مذکر کفار ومشرکین کے لیے استعمال ہوئی ہے، حَتّٰى (till) غایت (منتہا) کے لیے استعمال ہوتا ہے، اردو میں اس کا مفہوم ہے یہاں تک کہ، لَا تَكُوْنَ نہ رہے، نابود ہو جائے (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) رہنا، ہونا فِتْنَةٌ، فتنہ وفساد۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"قَاتِلُوْهُمْ" میں هُمْ کی ضمیر کس کی طرف ہے؟ جنگ جاری رکھنے کا حکم کس کے مقابلہ میں دیا جا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ روئے زمین کے عام کفار بھی مراد ہو سکتے ہیں اور مشرکین عرب بھی سمجھے جا سکتے ہیں لیکن

فقہا حنفیہ اور بہ کثرت تابعین نے مراد مشرکین مکہ ہی لی ہے، لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ، یعنی حدود حرم اور حدود عرب کے اندر شرک وکفر باقی نہ رہنے پائے، فتنہ سے مراد یہاں کفر وشرک ہے کہ اس مفہوم پر محققین امت کا اجماع ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ اور ہو جائے دین اللہ تعالیٰ کے لیے۔

وَيَكُوْنَ اور ہو جائے (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا وَيَكُوْنَ ،مضارع واحد مذکر غائب، الدِّيْنُ، اللہ کا دین اور وہ اسلام ہے، اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (ال عمران ۳:۱۹) بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک (ہمیشہ) دین اسلام رہا ہے، الدِّيْنُ، زندگی گزارنے کا منشور، لائحہ عمل، لِلّٰهِ، اللہ تعالیٰ کے لیے یعنی ہر ہر شعبہ حیات میں اسلام کا نفاذ ہو جائے اور لوگ اسلام کے نظام عدل میں امن وسکون پالیں۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''ان آیات کا رخ، نزول کے وقت، جزیرہ نمائے عرب میں مشرکین کی قوت کی طرف تھا کیونکہ یہی قوت لوگوں کو مصائب وآلام میں مبتلا کر رہی تھی اور اس بات میں مانع بنی ہوئی تھی کہ دین اللہ کے لیے ہو جائے، لیکن آیات کا مفہوم عام ہے اور اس کی رہنمائی دائمی ہے، جہاد قیامت تک جاری رہنے والا ہے، کیونکہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی ظالم قوت موجود رہے گی جو لوگوں کو اللہ کے دین سے روکے گی اور اُن کے اور دعوت اِلی اللہ کے سننے، مطمئن ہو جانے کے بعد اسے قبول کرنے اور امن وامان کے ساتھ اُس پر قائم رہنے کی راہ میں حائل ہوگی، اِس لیے امت مسلمہ اس بات کی مکلّف ہے کہ وہ ایسی ظالم قوتوں کو کچل دے اور لوگوں کو ان کے غلبہ وتسلط سے آزاد کرے تاکہ وہ آزادانہ دعوتِ حق کو سنیں، اختیار کریں اور اللہ کی طرف ہدایت کی راہ پائیں۔

''فتنہ'' کی شناعت وقباحت کو واضح کرنے اور اُسے قتل سے شدید تر قرار دینے کے بعد اُسے روکنے کے دو، دو بار حکم سے (آیت:۱۹۱، آیت:۱۹۳) یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ معاملہ کس قدر اہم ہے۔ اسی سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ یہ ایک عظیم آغاز ہے..... اسلام کے ہاتھوں فی الحقیقت انسان کی نئی پیدائش! ایسی پیدائش جس میں انسان کی قدر و قیمت اُس کے عقیدے کی قدر و قیمت پر منحصر ہوتی ہے..... اُس کی زندگی ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی جاتی ہے اور اُس کا عقیدہ دوسرے پلڑے میں اور عقیدے کا پلڑا

زندگی کے پلڑے کے مقابلہ میں جھک جاتا ہے۔ اِس طرح یہ بات بھی طے ہو جاتی ہے کہ کون لوگ ''انسان'' کے دشمن ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مومن کو اُس کے دین سے ہٹاتے اور مسلمانوں کو اسلام کے سبب ایذا پہنچاتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو انسانیت کو سب سے بڑے خیر سے محروم کرتے اور اُن کے اور اللہ تعالیٰ کے نظام کے مابین حائل ہو جاتے ہیں، انہی لوگوں کے سلسلے میں امت مسلمہ کا فرض ہے کہ وہ اُن سے جنگ کرے اور مقاتلہ جاری رکھے یہاں تک کہ فتنہ وفساد نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔

قتال کے سلسلے میں نازل ہونے والی ان اولین آیات میں اسلام نے جس عظیم امر کا آغاز کیا ہے وہ ہمیشہ قائم اور جاری رہنے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عقیدہ ایسے افراد سے مسلسل دوچار ہوتا رہے گا جو اُس پر اور اُس کے ماننے والوں پر مختلف صورتوں میں ظلم وزیادتی کرتے رہیں گے اور نہ صرف مومن افراد اور جماعتیں بلکہ بعض اوقات پوری کی پوری مسلمان قومیں ایذا رسانی اور مصائب وآلام کا شکار ہوتی رہیں گی، پھر جس شخص یا گروہ کو اُس کے دین کے سلسلے میں فتنہ انگیزی اور اُس کے عقیدے کے سلسلے میں ایذا رسانی سے کسی بھی صورت اور کسی بھی شکل میں دوچار ہونا پڑے۔ اس پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے جنگ اور قتال کرے اور اس عظیم آغاز کو پھر جاری اور متحقق کرے جسے اسلام نے شروع کر کے انسان کو نئی پیدائش اور نئی زندگی بخشی ہے! (فی ظلال القران، جلد اول)

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾

پس اگر یہ (کفار ومشرکین) باز رہیں تو نہیں ہے زیادتی مگر ظالموں پر۔

فَاِنِ انْتَهَوْا، فَ کلمہ تعقیب کلام کے لیے ہے، اِنْ شرطیہ ہے، انْتَهَوْا، رک جائیں، باز آئیں ماضی جمع مذکر غائب (اِنْتَهٰى، يَنْتَهِيْ، اِنْتِهَاءٌ) رکنا، باز آنا، فَلَا عُدْوَانَ، پس نہیں ہے زیادتی، اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ مگر ظالموں پر، یعنی جو لوگ فتنہ وفساد پھیلانے سے رک جائیں انہیں معاف کر دیا جائے اور ظالموں کی سرکوبی کی جائے تاکہ شر اور شریر لوگ ماحول کو خراب نہ کرنے پائیں۔

﴿اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ﴾

حرمت والا مہینہ، حرمت والے مہینہ کے بدلے ہے اور حرمتوں کا بدلہ ہے۔

اَلشَّهْرُ مہینہ، اس کی جمع أَشْهُر اور شُهُور آتی ہے اَلْحَرَامُ حرمت والا، عظمت والا، اور اَلْحَرَامِ، کے معنی ممنوع اور ناجائز بات کے بھی ہوتے ہیں اَلشَّهْرِ اَلْحَرَامِ، حرمت والا مہینہ یعنی ایسا مہینہ جس میں لڑائی جھگڑا ناجائز اور ممنوع ہے۔ اہل عرب حج کے مہینوں کو اشہر حرم کہتے تھے یعنی ان میں لڑنا جھگڑنا، ناجائز اور ممنوع سمجھتے تھے گویا کہ یہ مہینے حرمت والے تھے۔ مَسْجِدُ اَلْحَرَام، بیت اللہ کو کہتے ہیں، حرمت اور عزت والی مسجد اس لیے کہ اس میں بہت سی باتیں ممنوع ہیں۔ اَلْحُرُمٰت اس کا مفرد حُرْمَةٌ ہے، قِصَاص، بدلہ۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''سن چھ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو صحابہ کرامؓ کو ساتھ لے کر عمرہ کے لیے گئے تھے، لیکن کفار مکہ نے انہیں مکہ نہیں جانے دیا اور یہ طے پایا کہ آئندہ سال مسلمان تین دن کے لیے عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ آسکیں گے، یہ ذوالقعدہ کا مہینہ تھا جو حرمت والے مہینوں میں سے ایک ہے، جب دوسرے سال مسلمان حسب معاہدہ اسی مہینے میں عمرہ کرنے کے لیے جانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں، مطلب یہ ہے کہ اس دفعہ بھی اگر کفار مکہ اس مہینے کی حرمت پامال کر کے (گزشتہ سال کی طرح) تمہیں مکہ جانے سے روکیں تو تم بھی اُس کی حرمت کو نظر انداز کر کے ان سے بھرپور مقابلہ کرو، حرمتوں کو ملحوظ رکھنے میں بدلہ ہے یعنی وہ حرمت کا خیال رکھیں تو تم بھی رکھو، بصورت دیگر تم بھی حرمت کو نظر انداز کر کے کفار کو عبرت ناک سبق سکھاؤ۔'' (احسن البیان بحوالہ ابن کثیر)

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾

پس جو کوئی زیادتی کرے تمہارے اوپر تو تم بھی زیادتی کرو (بدلہ لو) اُس سے جیسا کہ اُس نے زیادتی کی تمہارے ساتھ (اوپر)۔

فَمَنِ (فَ.مَنْ) پس۔ جو کوئی، اِعْتَدٰى زیادتی کرے، ماضی واحد مذکر غائب (اِعْتَدٰى، يَعْتَدِى، اِعْتِدَاءٌ) حد سے بڑھنا، زیادتی کرنا، عَلَيْكُمْ (عَلٰى.كُمْ) اوپر، تمہارے، فَاعْتَدُوْا، فعل امر جمع مذکر تم بھی زیادتی کرو، عَلَيْهِ (عَلٰى.هِ) اوپر، اس کے (زیادتی کرنے والے کے ساتھ) بِمِثْلِ (بِ.مِثْلِ) ساتھ۔ مثل (کے) یعنی اس جیسی، مَا اعْتَدٰى جیسا کہ زیادتی کی (اس نے) عَلَيْكُمْ

(عَلَیۡ. کُمۡ)اوپر تمہارے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ﴾

اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ متقین کے ساتھ ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ سے ڈرتے رہو(اس کا تقویٰ اختیار کرو)اِتَّقٰی یَتَّقِیْ، اِتِّقَاءً، تقوی اختیار کرنا اُس کے احکام کا ہر وقت خیال رکھنا،وَاعۡلَمُوۡۤا اور جان لو،فعل امر جمع مذکر(عَلِمَ، یَعۡلَمُ، عِلۡمًا) جاننا، پہچاننا،اِنَّ اللّٰهَ بلاشبہ اللہ تعالیٰ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ ساتھ ہے متقین کے۔(ڈرنے والوں کے)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) امن وسلامتی کو برقرار رکھنا اور فتنہ وفساد کو مٹانا مسلمانوں کا فریضہ حیات ہے، یہاں تک کہ بیت اللہ اور اس کے آس پاس کا علاقہ دارِامن ہے۔وہاں لڑائی جھگڑا تو بہت بڑی بات ہے پرندوں تک کو ایذا دینا ممنوع ہے، وہاں بھی اگر دشمن فتنہ فساد کھڑا کردے تو اس کی سرکوبی لازمی امر ہے،اس کے علاوہ دنیا میں جہاں کہیں فساد پھیل رہا ہو اور لوگوں کا جینا محال ہو چکا ہو، اُن لوگوں کو ظالموں کے پنجۂ استبداد سے نکالنا بھی بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کا فرض بنتا ہے۔

۲) اس وقت امریکہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ مسلمانوں کے درپے آزار ہے یہ آیات مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کر رہی ہیں کہ وہ اٹھیں اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں، اپنی عددی اور حربی قوت کو اکٹھا کریں اور ان ظالموں کو اُن کے ظلم کا مزا چکھائیں،اللہ تعالیٰ کی مدد یقیناً ان کے ساتھ ہوگی۔

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۹۵)	اوراللہ کی راہ میں خرچ کیا کرواوراپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالواوراحسان کا طریقہ اختیار کیا کرو، بلاشبہ اللہ احسان کرنے والوں کودوست رکھتا ہے۔

﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ اورخرچ کرواللہ کی راہ میں۔

وَاَنْفِقُوْا اورخرچ کرو۔فعل امر جمع مذکر (اَنْفَقَ، یُنْفِقُ، اِنْفَاقًا) خرچ کرنا اردو زبان میں نان نفقہ استعمال ہوتا ہے،فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، اللہ کی راہ میں۔

''مسلمانوں اور دین اسلام کے دفاع کے لیے مال و دولت کوصرف کرو، اور جدید جنگی ساز و سامان سے اپنے آپ کولیس کرو، ایسا ہی ساز وسامان جوتمہارے دشمن کے پاس ہے، کہ وہ تمہارے اوپر غلبہ نہ پاسکے۔'' (المراغی)

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ اورنہ ڈالواپنے آپ کواپنے ہاتھوں ہلاکت میں۔

وَلَا تُلْقُوْا اور نہ ڈالوفعل نہی جمع مذکر حاضر (اَلْقٰی، یُلْقِیْ اِلْقَاءٌ) ڈالنا، پھینکنا بِاَیْدِیْكُمْ (بِ.اَیْدِیْ.كُمْ) ساتھ ہاتھوں اپنے کے یعنی اپنے آپ کو،اِلَى التَّهْلُكَةِ طرف ہلاکت کے۔''یعنی تم نے اگراللہ کی راہ میں خرچ نہ کیااور دشمن کے مقابلے میں ساز وسامان سے اپنے آپ کو تیار نہ کیا تو گویا کہ اپنے لیے ہلاکت وبربادی کا خودہی سامان فراہم کیا۔'' (المراغی)

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''قرآن مجید میں جب صیغہ جمع حاضر آتا ہے تو کبھی تو افراد مخاطب ہوتے ہیں اور کبھی جماعت، یہاں اصل مخاطبت امت سے بہ حیثیت مجموعی ہے اور بیان یہ حقیقت ہورہی ہے کہ افراد امت نے اگر جہاد وقتال سے جان چرائی اور مجاہدین کو مالی امداد دینے میں بخل کیا تو نتیجہ لازمی طور پر ساری امت کی تباہی و بربادی اور ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔'' (تفسیر ماجدی، جلداول)

﴿وَاَحْسِنُوْا﴾ اوراحسان کرو۔

وَاَحْسِنُوْا اوراحسان کیا کرو، فعل امر جمع مذکر (اَحْسَنَ، یُحْسِنُ، اِحْسَانًا) نیکی کرنا، احسان کرنا۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''احسان یعنی بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے اور اس لیے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا جس سے اُس کا دِل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔'' (سیرت النبیؐ، جلد ششم)

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے محسنین کو۔

یُحِبُّ (اَحَبَّ، یُحِبُّ، حُبًّا) محبوب رکھنا، اَلْمُحْسِنِیْنَ احسان کرنے والا اس کا مفرد مُحْسِن ہے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرنا فرد کے لیے موجب ہلاکت ہے کیونکہ اُس کے اندر حرص و بخل کی مذموم صفات پروان چڑھتی ہیں اور عدم اِنفاق جماعت کے لیے موجب ہلاکت ہے کیونکہ اس صورت میں جہاد اور دفاع کے سلسلے میں وہ عاجز و ناتواں ثابت ہوگی خصوصاً ایسے نظام میں جو بہ رضا و رغبت اطاعت پر قائم ہو، جیسا کہ اسلام ہے، اس کے بعد قرآن انہیں جہاد اور انفاق کے درجہ سے اوپر اٹھا کر احسان کے درجے تک لے جاتا ہے۔

﴿وَأَحْسِنُوا، اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾

اور احسان کرتے رہو۔ بلاشبہ اللہ، احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

اِحسان کا مقام اسلام میں سب سے بلند ہے۔ احسان کی تعریف کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ'' تم اللہ کی بندگی کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اسے دیکھ نہیں رہے ہو تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

جب کوئی انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ احکام الٰہی کی خوشی خوشی تعمیل کرتا ہے، تمام معاصی سے اجتناب کرتا ہے اور چھوٹے بڑے، خفیہ اور علانیہ ہر کام میں اللہ کو پیش نظر رکھتا ہے۔ (فی ظلال القرآن)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) حق و باطل کا معرکہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد اہل حق کے ساتھ رہتی ہے، مگر داعیان حق کے لیے یہی حکم ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو ہمیشہ اکٹھا رکھیں اور دنیاوی ساز وسامان کی تیاری سے کبھی غافل نہ ہوں، افرادی قوت (Man Power) اور حربی قوت (Weapon Power) کو بھی پوری طرح بروئے کار لائیں، مگر فتح ونصرت کے لیے ان اشیاء پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھیں۔

۲) ظاہر ہے کہ جہاد کے لیے ایمانی قوت کے ساتھ ساتھ ظاہری طور پر آلاتِ حرب اور فوج کے لیے سامانِ رسد کے سلسلہ میں مال کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے اس آیہ مبارکہ میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں مال لٹانے میں کسی قسم کا دریغ نہ کرو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، نے غزوات کے مواقع پر جس کشادہ دلی اور سخاوت کا مظاہرہ کیا وہ قابل ستائش اور لائق رشک ہے، ان نفوس قدسیہ میں بعض ایسے غریب ومسکین تھے جن کی جیب خالی تھی مگر جہاد میں مالی طور پر حصہ ڈالنے کے لیے ان کا دل تڑپتا تھا تو ایک صاحب کو رات بھر کسی کے کھیت میں پانی لگانے پر جو مزدوری ملی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں لاکر پیش کردی، **فجزاهم الله احسن الجزاء**

۳) اگرچہ اس آیہ مبارکہ کے سیاق وسباق سے جہاد میں مال خرچ کرنے کا حکم مل رہا ہے تاہم انفاق فی سبیل اللہ کا حکم عام ہے، اس کے متعلق متعدد آیات اور احادیث موجود ہیں، اسلام کا یہ باب انتہائی وسیع ہے اور خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت بے مثل اور بے مثال ہے۔

۴) یہ آیہ مبارکہ مسلمانوں کو متنبہ کر رہی ہے، کہ دیکھو امریکہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ مسلمانوں کو مٹانے کے لیے تلا ہوا ہے، اس کے اشارہ پر یہودی فلسطین کے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھا رہے ہیں اور اُسی کے اشارہ پر ہندو کشمیر میں سالہا سال سے مسلمانوں کو ستم کا نشانہ بنا رہے ہیں، اُسی کی شہہ پر روس نے چیچن مسلمانوں پر بارود گرایا اور اس نے خود گزشتہ سال افغانستان کے نہتے مسلمانوں پر ظلم وستم کی انتہا کردی اور پھر عراق پر جو ظلم ڈھایا ہے وہ تاریخ کا الم ناک باب ہے، کیا ملت اسلامیہ کی رگوں میں خون سرد ہو چکا ہے، اسے قرآن تو عزت اور سربلندی دینا چاہتا ہے مگر افسوس کہ وہ اپنے ہاتھوں خود ہی اپنی بربادی کا سامان کر رہی ہے۔

۵) مسلمانوں کے پاس نہ تو اس وقت مال کی کمی ہے نہ افراد ہی کی اگر یہ افرادی اور مالی قوتوں کو اکٹھا کریں تو دنیا کی سپر طاقت بن سکتے ہیں۔فاعتبِرُوْا یا اولی الابصار.

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ، فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ، وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ، فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ، فَاِذَآ اَمِنْتُمْ، فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ، فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ، تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ، ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۱۹۶)	''اور حج اور عمرے کو اللہ کے لیے پورا کرو، پھر اگر تم راستے میں روکے جاؤ تو جو قربانی تمہیں میسر آ سکے وہی کر ڈالو (جہاں رکاوٹ آئے) (اور ایام حج) میں اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے مگر جو شخص مریض ہو یا اُس کے سر میں کچھ تکلیف ہو (تو سر منڈوا سکتا ہے بشرطیکہ) روزوں سے یا صدقہ سے یا قربانی سے اس کا فدیہ ادا کر دے، پھر جب تمہیں امن نصیب ہو جائے (اور تم حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) تو جو شخص حج کا زمانہ آنے تک عمرہ کرنے کا فائدہ اٹھانا چاہے، وہ حسب مقدور قربانی کرے، اگر قربانی میسر نہ ہو تو پھر تین روزے تو ایام حج میں رکھے اور سات گھر پہنچ کر، یہ کل دس روزے ہو جائیں گے، یہ رعایت ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر مسجد حرام کے آس پاس نہ ہوں، اللہ کے ان احکام کی خلاف ورزی سے بچو اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ اور پورا کرو حج اور عمرہ کو اللہ (کی رضا) کے لیے۔

وَاَتِمُّوا، اور پورا کرو فعل امر جمع مذکر (اَتَمَّ، یُتِمُّ، اِتْمَامٌ) پورا کرنا، مکمل کرنا، اَلْحَجَّ، حج کے لغوی معنی قصد و زیارت کے ہیں جبکہ اصطلاح شریعت میں مناسک حج کے ارادہ سے بیت اللہ میں قیام اور حاضری ہے اور یہ صرف ذوالحجہ ہی میں ہوسکتا ہے۔ (مفردات القرآن)

عُمْرَة کے لغوی معنی ملاقات کے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں حج کے علاوہ بیت اللہ کی زیارت، طواف اور سعی کو عمرہ کہا جاتا ہے (مفردات القرآن) اور یہ سال کے کسی حصے میں ہوسکتا ہے۔ لِلّٰهِ، خالص اللہ کے لیے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''جب یہ عبادتیں بجالاؤ، تو اللہ کی رضا جوئی ہی کے لیے بجالاؤ، اخلاصِ نیت کے ساتھ اور اللہ کے مقرر کئے ہوئے قاعدوں اور ضابطوں کے ساتھ تمام ممنوعات سے محترز رہ کر، یہ نہ ہو کہ کسی طرح الٹے سیدھے ادا کر کے ان عبادتوں کو بھی ناقص و فاسد بنادو..... اس دوران میں کوئی ایسی چیز نہ کرو کہ جو اِن عبادتوں کے غیر شایان ہو۔ اَلَّا تَفْعَلُوْا فِيْهَا مَا لَا يَنْبَغِي لَكُم (قرطبی)

گویا اس امر کی تنبیہ کی جارہی ہے کہ حج و عمرہ کا قصد، میلہ ٹھیلہ سمجھ کر نہ ہو، تفاخر کی راہ سے نہ ہو، تجارتی ضروریات سے نہ ہو، بلکہ اِخلاصِ محض کے ساتھ، قرب و رضائے الٰہی کی نیت سے ہو۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾

پس اگر گھیر لیے جاؤ تم (روک لیے جاؤ) تو جو کچھ میسر ہو قربانی سے (اسی جگہ دے ڈالو)۔

فَاِنْ (فَ. اِنْ) پس، اگر اُحْصِرْتُمْ ماضی مجہول جمع مذکر حاضر، (ح ص ر) (اَحْصَرَ، یُحْصِرُ، اِحْصَارٌ) باب افعال، روکنا، رکاوٹ ڈالنا، بند کرنا، گھیر لینا۔ اَلْحَصْرُ وَالْاِحْصَارُ دونوں کے معنیٰ حج سے روک دینے کے ہیں مگر اِحْصَار ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی رکاوٹ پر بولا جاتا ہے جیسا کہ ظاہری طور پر دشمن کا آڑے آنا اور باطنی طور پر مرض اور بیماری سے رکنا۔ فَمَا (فَ. مَا) پس، جو کچھ، اسْتَيْسَرَ میسر ہو (اِسْتَيْسَر، يَسْتَيْسِرُ، اِسْتِيْسَارٌ) آسانی سے میسر آنا، باب استفعال ہے، مِنَ الْهَدْيِ، قربانی سے،

اَلْهَدی کا لفظ خاص ہے جو قربانی کے اس جانور پر بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کی طرف ذبح کے لیے بھیجا جائے۔(مفردات القرآن)

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ، ہاں اگر تم روک لیے جاؤ تو جو قربانی میسر ہو اسے کر ڈالو۔

اس پر حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''(حج اور عمرہ کی غرض سے گھر سے نکلو) مگر راستے میں دشمن یا شدید بیماری کی وجہ سے رکاوٹ ہو جائے تو ایک جانور (هَدْی) بکری، گائے یا اونٹ جو بھی میسر ہو، وہیں ذبح کر کے سر منڈا لو اور حلال ہو جاؤ جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے وہیں حدیبیہ میں قربانیاں ذبح کی تھیں اور حدیبیہ حرم سے باہر ہے اور آئندہ سال اس کی قضا دو، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ ہجری والے عمرے کی قضا سات ہجری میں دی۔(احسن البیان)

﴿وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ﴾

اور نہ منڈواؤ اپنے سروں کو یہاں تک کہ پہنچ جائے قربانی حلال (ذبح) ہونے کی جگہ پر۔

وَلَا تَحْلِقُوْا اور نہ منڈواؤ فعل نہی جمع مذکر حاضر (حَلَقَ، يَحْلِقُ، حَلْقًا) سر منڈوانا، بال ترشوانا، رُءُوْسَكُمْ (رُءُ.وْسَ. كُمْ) سروں، اپنے یعنی اپنے سروں کو رأسٌ، سر، اس کا مفرد ہے۔ حَتّٰى یہاں تک (till) يَبْلُغَ پہنچ جائے واحد مذکر غائب (بَلَغَ، يَبْلُغُ، بَلَاغًا) پہنچنا، اَلْهَدْی، قربانی، مَحِلَّهٗ، حلال ہونے کی جگہ (مِنٰی میں) حَلَّ، يَحِلُّ، حَلًّا، حلال ہونا۔ مَحِلُّ الْهَدْيِ قربان گاہ مِنٰی میں یوم النحر (قربانی کا دن) کہلاتا ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اس کا عطف وَاَتِمُّوا الْحَجَّ پر ہے اور اس کا تعلق حالتِ امن سے ہے یعنی امن کی حالت میں اُس وقت تک سر نہ منڈاؤ (احرام کھول کر حلال نہ ہو جاؤ) جب تک تمام مناسک حج پورے نہ کر لو۔'' (احسن البیان)

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾

پس جو کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو اُس پر فدیہ ہے خواہ وہ روزے رکھ لے، خواہ صدقہ دے، خواہ قربانی کرے (جیسے سہولت میسر ہو)۔

فَمَنْ (فَ. مَنْ) پس، جو کوئی، کَانَ، ہو (کَانَ یَکُوْنُ) ہونا، مِنْکُمْ (مِنْ. کُمْ) سے، تم، یعنی تم میں سے، مَّرِیْضًا، بیمار، اَوْ یا، بِہٖٓ (بِ. ہٖ) ساتھ اس کے، یعنی اسے اَذًی، اذیت، تکلیف، مِنْ رَّاْسِہٖ اُس کے سر میں، فَفِدْیَۃٌ (فَ. فِدْیَۃٌ) پس، فدیہ ہے۔ مِّنْ صِیَامٍ روزوں سے، صَوْمٌ اس کا مفرد ہے، اَوْ صَدَقَۃٍ یا صدقہ سے، اَوْ نُسُکٍ، یا قربانی۔

ڈاکٹر محمد لقمان السلفی لکھتے ہیں:

''یہ آیت کعب بن عجرہ انصاری کے بارے میں اتری تھی، ان کے بال گھنے اور لمبے تھے۔ عمرۃ الحدیبیہ کے موقع پر ان کے سر میں اتنی جوئیں ہوگئیں کہ ان کے چہرے پر گرنے لگیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ بال منڈالو اور ایک بکری ذبح کر دو یا چھ مساکین کو کھانا کھلا دو یا تین روزے رکھ لو۔ (صحیحین، بحوالہ تیسیر الرحمٰن، لبیان القرآن)

﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ، فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَۃِ اِلَی الْحَجِّ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْھَدْیِ﴾

پس جب تم امن میں ہو تو جو کوئی تمتع کرے تو اسے قربانی کا جو جانور میسر ہو ذبح کر دے۔

فَاِذَا (فَ. اِذَا) پس۔ جب اَمِنْتُمْ تم امن میں ہو فعل ماضی جمع مذکر حاضر (اَمِنَ، یَأْمَنُ، اَمْنًا) امن اور سلامتی میں ہونا۔ اَلْاَمْنُ طَمَانِیَّۃُ النَّفْسِ و زَوَالُ الخوفِ (مفردات القرآن) طمانیت نفس اور خوف کے زائل ہونے کا نام امن ہے۔

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَۃِ اور جو کوئی تَمَتُّع کرے عمرہ کا یعنی فائدہ اٹھائے اس طرح کہ عمرہ کی ادائیگی کے بعد احرام کھول دے اور دوبارہ ایام حج میں حج کے لیے احرام باندھے، اسے تمتّع اس لیے کہا جاتا ہے کہ حج کے ساتھ عمرہ کو ملا کر نفع اور فائدہ حاصل کیا جاتا ہے، پاکستان اور دور دراز سے آنے والے حجاج کرام اسی کو ترجیح دیتے ہیں، فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْھَدْیِ، تو جو کچھ میسر ہو قربانی سے یعنی جو قربانی آسانی سے میسر ہو سکے وہ کر دی جائے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

’’حج کی ادائیگی تین طرح سے ہوتی ہے..... پہلا اِفراد کہ اس میں صرف حج کی نیت سے احرام باندھنا، دوسرا قِرانْ (ق کی زیر کے ساتھ) حج اور عمرہ دونوں کا ایک ساتھ نیت کر کے احرام باندھنا، ان دونوں صورتوں میں تمام مناسکِ حج کی ادائیگی سے پہلے احرام کھولنا جائز نہیں۔ تیسرا حج تمتُّع.....اس میں بھی حج وعمرہ دونوں کی نیت ہوتی ہے لیکن پہلے صرف عمرہ کی نیت سے احرام باندھا جاتا ہے اور عمرہ کر کے پھر احرام کھول دیا جاتا ہے اور پھر آٹھ ذوالحجہ کو حج کے لیے مکہ سے ہی دوبارہ احرام باندھا جاتا ہے، تمتّع کے معنی فائدہ اٹھانے کے ہیں، گویا کہ درمیان میں احرام کھول کر فائدہ اٹھالیا جاتا ہے، حجِ قِران اور حجِ تمتّع دونوں میں ایک ھدی (جانور) کی بھی قربانی دینی پڑتی ہے، اِس آیت میں اِسی حج تمتّع کا حکم بیان کیا گیا ہے کہ مُتَمَتِّع حسب طاقت دس ذوالحجہ کو ایک جانور کی قربانی دے، اگر قربانی کی طاقت نہ ہو تو تین روزے ایام حج میں اور سات روزے گھر جا کر رکھے، ایام حج، جن میں روزے رکھتے ہیں 9 ذی الحجہ (یوم عرفات) سے پہلے یا پھر ایام تشریق میں۔‘‘ (احسن البیان)

﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ، تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾

پس جو کوئی نہ پائے (قربانی) پس وہ تین روزے رکھے حج کے دنوں میں اور سات روزے جب تم (گھروں کو) واپس لوٹو اس طرح یہ دس روزوں کی گنتی پوری کرو۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ پس جو نہ پائے، (وَجَدَ، يَجِدُ، وَجْدٌ) پانا، یعنی جس میں قربانی کرنے کی سکت اور طاقت نہ ہو، فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ تو روزے ہیں اس پر تین دن کے موسم حج میں، وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ، اور سات روزے جب تم واپس آؤ (گھر پہنچ جاؤ) (رَجَعَ، يَرْجِعُ، رَجْعًا) لوٹنا، واپس ہونا۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ، یہ دس روزے ہوئے پورے، جو خالق و مالک کا حکم ہے اور اسے بجالانا، ضروری ہے۔

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾

یہ رعایت ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر مسجد حرام (بیت اللہ) کے آس پاس نہ ہوں۔

ذٰلِكَ اسم اشارہ مذکر بعید کے لیے، یعنی عمرے کا حج کے ساتھ تمتع (فائدہ حاصل کرنا)، لِمَنْ

(لِ. مَنْ) لیے، اس شخص کے لَّمْ یَکُنْ نہ ہوں، اَھْلُهٗ (اَھْلُ. ہٗ) اہل وعیال۔ اس کے، حَاضِرِی موجود، (حَضَرُ، یَحْضُرُ) حاضر ہونا، اس سے اسم فاعل حَاضِرٌ اور جمع حاضِرُوْن ہے۔ لَّمْ یَکُنْ کی خبر ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں حاضرین ہوا اور مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے 'ن' ساقط ہوگیا (حاضر رہنے والے یعنی باشندے)۔

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

''تمتّع یا قِران (ق کی زیر کے ساتھ) کی قربانی ان حاجیوں پر واجب ہے جو اہل حرم میں سے نہ ہوں، کیونکہ اہل حرم کے لیے حج تمتّع نہیں ہے، اہل حرم سے مراد مکہ میں رہنے والے اور وہ لوگ ہیں جو حرم سے اتنی مسافت پر رہتے ہوں جس پر سفر کا اطلاق نہ ہو۔'' (تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن)

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ﴾

اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

وَاتَّقُوْا اللّٰهَ اور اللہ سے ڈرتے رہو (اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچو) فعل امر جمع مذکر (اِتَّقٰی، یَتَّقِیْ، اِتِّقَاءٌ) ڈرنا، بچنا، وَاعْلَمُوْٓا اور جان لو، فعل امر جمع مذکر (عَلِمَ، یَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، پہچاننا، اَنَّ اللّٰهَ بلاشبہ اللہ تعالیٰ، شَدِیْدُ الْعِقَابِ سخت عذاب دینے والا ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اسلام نے تمام اعمال کی اصل اور بنیاد رضائے الٰہی کو ٹھہرایا ہے، مشرکین مکہ حج اور عمرہ کے بعض اعمال کے ذریعے اپنے بتوں کا تقرب حاصل کرتے تھے، اس لیے اس آیہ مبارکہ میں خاص طور پر بتایا جارہا ہے کہ حج وعمرہ کے تمام اعمال صرف اللہ کی رضا کے لیے ہونے چاہییں۔

۲) غور کیجئے کہ اسلامی احکام میں کس قدر نرمی اور لچک ہے، حج اور عمرہ کے دورانِ سفر کوئی تکلیف اور بیماری لاحق ہوجائے یا دشمن راستہ روک لے تو رب رحیم تمہارے اجر وثواب میں کمی نہیں لاتا، حکم ہوتا ہے کہ اسی جگہ قربانی کر کے گھروں کو لوٹ جاؤ، اِس کے علاوہ مریض کے لیے کتنی سہولتیں فراہم کردی گئی ہیں؟ بار بار غور کیجئے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ، فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ، وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى، وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ(۱۹۷)	حج کے مہینے معلوم ومعروف ہیں جو کوئی ان مقررہ مہینوں میں حج کا عزم کرلے وہ اس دوران نہ کوئی شہوانی بات کرے اور نہ کوئی (اللہ تعالیٰ کی) نافرمانی اور لڑائی جھگڑا ہونے پائے اور تم نیکی کا جو کام بھی کرو گے، اللہ کو اس کا علم ہوگا اور (سفرِ حج کے لیے) زادراہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زادراہ تو پرہیز گاری ہے، اور میری نافرمانی سے بچو! اے دانش مندو!

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ﴾ حج کے مہینے معلوم ہیں۔

(سب جانتے ہیں کہ سفرِ حج شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ پر مشتمل ہوتا ہے) اَشْهُرٌ اس کا مفرد شَهْرٌ، مہینہ۔ مَعْلُوْمٰتٌ جانے پہچانے، اس کا مفرد مَعْلُوْمَةٌ ہے۔

﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ﴾ تو جو کوئی ان مہینوں میں حج کا عزم کرے۔

فَمَنْ (فَ.مَنْ) پس، جو کوئی فَرَضَ فرض کرلے، لازم کرے، ارادہ اور عزم کرے، فِيْهِنَّ (فِيْ هِنَّ) فِي میں، هِنَّ کی ضمیر اَشْهُرٌ (مہینوں) کی طرف جاتی ہے۔ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ، فَمَنْ اَلْزَمَهٗ نَفْسَهٗ (کشّاف) یعنی اپنے لیے، لازم کرے (حج کرنے کا فیصلہ کرے)۔

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾

پس نہ کوئی شہوانی بات چیت، نہ گناہ اور نہ جھگڑنا ہے حج میں۔

فَلَا رَفَثَ، پس نہیں ہے کوئی شہوانی بات چیت، اَلرَّفَثُ وہ فحش باتیں جن کا ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ (مفردات القرآن) وَلَا فُسُوْقَ اور نہ گناہ، جَمِيْعُ الْمَعَاصِيْ كُلِّهَا (القرطبی) تمام گناہ اس میں شامل ہیں۔ پھر معاصی (گناہ) میں وہ تمام باتیں آجاتی ہیں جنہیں شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے، وَلَا جِدَالَ

اور نہ لڑائی جھگڑا، اَلْجِدَالَ (مفاعلہ) کے معنی پر ایسی گفتگو کرنا کے ہیں جس میں طرفین ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ (مفردات القرآن) حج کے موسم میں چونکہ دنیا بھر کے لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اس لیے اس جم غفیر میں اس بات کے امکانات ہوتے ہیں کہ لوگ آپس میں الجھ نہ پڑیں اس لیے خصوصی طور پر ہدایت مل رہی ہے کہ ضبط وتحمل کا مظاہرہ کرو اور لڑائی جھگڑوں سے بچو اور اپنے ارفع واعلیٰ مشن کو سامنے رکھو۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''(بلکہ اس سارے زمانے میں اپنے آپ کو عبادت وذکر الٰہی میں مشغول رکھو) ایام صوم کی طرح حج کو بھی اعمال خیر کے ساتھ مناسبتِ خاص حاصل ہے اور جو چیزیں حرام ہیں وہ تو خیر ہمیشہ ہی حرام ہیں، باقی جو امور جائز ومباح ہیں۔ ان میں بھی بہت سی چیزوں سے زمانہ صیام کی طرح حالت احرام میں دستبردار ہونا چاہیے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ اور نیکی کا جو کام بھی کرو گے اللہ کو اس کا علم ہوگا۔

وَمَا ، اور جو، ما موصولہ ہے تَفْعَلُوْا، تم کرو گے مضارع جمع مذکر حاضر (فَعَلَ، يَفْعَلُ) کام کرنا، يَعْلَمْهُ (يَعْلَمُ.ہ) جانتا ہے۔ اسے یعنی (نیکی یا عمل کو) اللہ تعالیٰ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''حاجیوں کے اعمال خیر کی تشویق (شوق دلانے) اور رغبت افزائی کے لیے یہ بہترین وموثر ترین یاد دہانی ہے اللہ کے عَالِم کُلّ وعَالِم جزئیات ہونے کا پورا اِسْتِحْضار رکھو، اہل جاہلیت کی طرح کہیں اس تذبذب میں نہ پڑ جاؤ کہ ہمارے فلاں فلاں عمل خیر کا صلہ ملے نہ ملے، علم الٰہی میں وہ آئے بھی، یا آنے سے رہ جائے، جب کہ مومن کے لیے خفی سے خفی باریک سے باریک نیکی بھی عالم الغیب کی نظر سے مخفی نہیں۔ اطباء یونانی موسم بہار میں مصفّیات پلاتے ہیں اور جاڑے کے زمانہ میں مقویات استعمال کراتے ہیں کہ ان موسموں کو ان دواؤں کے ساتھ خاص مناسبت ہے۔ رمضان کا مہینہ اور حج کا موسم بھی روحانیت کے عالم میں اپنی صحت بخش آب وہوا کے لیے ممتاز ہیں، تو طبیب حقیقی ان موسموں میں اعمال خیر کی طرف توجہ کیسے نہ دلاتا۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾

اور (سفرحج) کے لیے زادراہ ساتھ لے جاؤ اور (بلاشبہ) سب سے بہتر زادراہ تو پرہیزگاری ہے، اور میری نافرمانی سے بچوائے دانشمندو۔

وَتَزَوَّدُوْا اور زادِراہ لو، (**تَزَوَّدَ، يَتَزَوَّدُ، تَزَوُّدًا**) زادِراہ لینا، اس کا مادہ زود ہے، توشہ، زادراہ، ضروریات واخراجات سفر، راشن، پھر اس کا معنی ذخیرہ عمل بھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ سفرحج کے لیے زادِراہ لو اور یادرکھو پرہیزگاری کا توشہ تو سب سے اچھا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''اس ہدایت کی قدر اس وقت ہوگی جب جاہل قوموں کے زائرین کی ذہنیت پر نظر ہو خصوصاً جاہلیت عرب کی تاریخ پر، آج بھی ہندوستان میں کتنی ہی قومیں ایسی ہیں جو میرٹھ یا ترا کے وقت گھر سے مفلس وتہی دست نکلنا ہی اپنی روحانیت کا کمال سمجھتے ہیں، راستہ میں مانگتے ہوئے جائیں گے کوئی دوسرا انہیں کھلا پلا دیا کرے گا، یہ اپنے فقیر ہونے پر فخر کریں گے، اس قسم کے سارے تخیلات واوہام اسلام نے مٹا دیے اور حکم دیا کہ جب گھر سے حج وزیارت کے لیے نکلو تو ضرورت بھر کا روپیہ پیسہ لے کر نکلو، راستہ میں دوسروں پر بار بننے کی کوشش نہ کرو۔ عرب جاہلیت میں یہ مرض اور زیادہ پھیلا ہوا تھا، بلکہ بعض گروہوں کو تو یہ غلو تھا کہ احرام پہننے کے بعد جو کچھ سرمایہ بھی ہوتا اسے بھی پھینک دیتے۔ اسلام ایسے دستور کا جو جھوٹی اور نمائشی روحانیت پر مبنی تھا اور ایک طرف شخصی غیرت وخودداری کے بھی منافی تھا اور دوسری طرف معاشیات اجتماعی پر ایک خواہ مخواہ کا بار تھا کیسے روادار ہوسکتا تھا اور اسے کیونکر باقی رہنے دیتا۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

اس میں جو خوبی کی بات بتائی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ ظاہری طور کے زادراہ کے ساتھ ساتھ باطنی طور پر توشۂ پرہیزگاری کو فراموش نہ کرنا، کہ حج وعمرہ کی اصل روح یہی ہے۔ سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''تقویٰ دلوں اور روحوں کا زادراہ ہے، اس سے دلوں اور روحوں کو غذا، قوت، حرکت اور روشنی ملتی ہے۔'' یہی وصول الی اللہ اور نجات کا ذریعہ ہے اور ''اولی الالباب'' دانشمند وہ ہیں جو تقویٰ کی اس تلقین کو سب سے پہلے قبول کرلیں اور اس زادراہ سے بہترین فائدہ اٹھائیں۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) رمضان کی طرح حج بھی دنیا بھر کے مسلمانوں کی تربیت کا بہترین موسم ہے، اس میں جہاں سفر اور

مناسک حج کی ادائیگی میں اخراجات کے علاوہ، محنت ومشقت اٹھانا پڑتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ زبان وبیان پر قابو اور خواہشات وجذبات پر کنٹرول کا شاندار مظاہرہ بھی ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ ایک صاف ستھرے معاشرے کی داغ بیل انہی باتوں سے پڑتی ہے اور زندگی کے سفر میں تربیت کتنی سود مند ثابت ہوتی ہے۔

۲) حج دنیا بھر کے مسلمانوں کا روح پرور اجتماع ہے جو انہیں ایک لڑی میں پرو دیتا ہے اس طرح ان کے درمیان الفت ومحبت کے جذبات پرورش پاتے ہیں، گو وہ مختلف زبانیں بولتے ہیں ان کے قومی اور ملکی لباس میں فرق ہوتا ہے اور رنگ ونسل کے اعتبار سے بھی الگ الگ ہوتے ہیں تاہم یہاں پہنچ کر سب کا لباس یکساں ہو جاتا ہے اور سب کی زبانوں پر اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کا ایک ترانہ رواں ہو جاتا ہے، اسلام انہیں معاشرتی اور معاشی، سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے مضبوط اور توانا بنانے کا زریں موقع فراہم کرتا ہے۔ اقوام عالم کے مسلمانوں کو مل بیٹھنے کا سنہری موقع ہاتھ آتا ہے انہیں مل کر اپنے تمام مسائل حل کرنے چاہئیں۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ، فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ، وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ، وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ(۱۹۸) ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ(۱۹۹)﴾	تم پہ کوئی گناہ نہیں جو تم (ایام حج میں) اپنے رب کا کچھ فضل (رزق حلال) بھی تلاش کر لو! پھر جب عرفات سے چلو، تو مشعرِ حرام (مُزدلفہ) کے پاس (ٹھہر کر) اللہ کو یاد کرو اُس طرح جس طرح اُس نے تمہیں سکھایا ہے ورنہ اِس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے، پھر جہاں سے اور لوگ واپس ہوں، وہیں سے تم بھی واپس ہو جاؤ اور اللہ سے بخشش مانگو، بلاشبہ اللہ بخشنے والا اور (ہر حال میں) رحم کرنے والا ہے۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾

نہیں ہے اوپر تمہارے گناہ یہ کہ تلاش کرو فضل (رزقِ حلال) اپنے رب کا۔

لَيْسَ، زمانہ حال میں نفی کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، عَلَيْكُمْ (عَلٰى. كُمْ) اوپر، تمہارے جُنَاحٌ، گناہ، اَنْ، یہ کہ، حروف ناصبہ میں سے ہے، تَبْتَغُوْا، تم تلاش کرو، مضارع جمع مذکر مخاطب (اِبْتَغٰى، يَبْتَغِيْ، اِبْتِغَاءً) تلاش کرنا، جستجو کرنا، فَضْلٌ، روزی، رزق، فضل کے معنی احسان اور مہربانی کے بھی آتے ہیں جیسا کہ فَضْلُ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کا احسان، مِّنْ رَّبِّكُمْ، اپنے رب کی طرف سے۔ درحقیقت رزق کا ملنا بھی اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کا احسان ہی ہوتا ہے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''جو شخص بھی تجارت کرے یا اُجرت پر کام کرے اور روزی کے اسباب و وسائل تلاش کرے، اُسے یہ سب کچھ کرتے ہوئے اس بات کا شعور رکھنا چاہیے کہ وہ اللہ کا فضل تلاش کر رہا ہے، وہ اپنی جدوجہد سے اپنے لیے رزق فراہم نہیں کر رہا ہے بلکہ اللہ کا فضل تلاش کر رہا ہے اور اس تلاش کے نتیجہ میں اللہ اسے اپنا فضل عطا فرمائے گا۔ یہ احساس مومن کے دل میں جاگزیں ہو جائے تو وہ فی الواقع اللہ کی عبادت میں لگا ہوتا ہے، اس لیے اس کا یہ عمل حج کی عبادت کے..... جس میں توجہ اِلی اللہ ہوتی ہے..... منافی نہیں ہوتا، اسلام مومن کے دل میں یہ احساس پیدا کرنے کے بعد اسے آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے عمل کرے اور اپنی سرگرمیاں جاری رکھے، کیونکہ اس احساس کے نتیجہ میں اُس کی ہر حرکت عبادت ہو جاتی ہے۔

(فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾

پس جب واپس آؤ عرفات سے تو یاد کرو اللہ تعالیٰ کو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس۔

فَاِذَآ (فَ. اِذَآ) پس، جب اَفَضْتُمْ، پھر و تم، لوٹو تم ماضی جمع مذکر حاضر، (اَفَاضَ، يَفِيْضُ، اِفَاضَةٌ) افاض کے معنی گروہ در گروہ چلنا، دراصل فَاضَ الْمَاءُ کے معنی پانی زور سے جاری ہوا اور اصطلاح میں عرفات سے مزدلفہ جانے کو کہتے ہیں، فَاذْكُرُوا اللّٰهَ، پس یاد کرو اللہ تعالیٰ کو (ذَكَرَ، يَذْكُرُ، ذِكْرًا) یاد کرنا، عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ، مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''عرفات، مکہ معظّمہ سے جو سڑک مشرق کی جانب طائف کو جاتی ہے، اس پر مکہ سے کوئی بارہ میل کے فاصلہ پر کئی میل کے رقبہ کا ایک لمبا چوڑا میدان پڑتا ہے اور اس کا نام عرفات ہے، اسی نام کی پہاڑی اِس میدان میں ہے جسے ''جبل عرفات'' یا ''جبل رحمت'' بھی کہا جاتا ہے۔ اَلْمَشْعَرِ الْحرَامُ، مَشْعَرُ کے لفظی معنی نشانی یا علامت کے ہیں اور حرام یعنی محرم یا مقدس اس کی تعظیمی صفت ہے، یہ نام اُس خاص مقام کا بھی ہے جو مزدلفہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان ہے اور خود سارے مزدلفہ کو بھی مشعر الحرام کہتے ہیں، مزدلفہ مکہ سے کوئی چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''9 ذوالحجہ کو زوالِ آفتاب سے غروبِ شمس تک میدان عرفات میں وقوف (ٹھہرنا) حج کا سب سے اہم رکن ہے جس کی بابت حدیث میں کہا گیا ہے ''اَلحَجُّ عَرفَةُ'' عرفات میں وقوف ہی حج ہے (مسجد نمرہ میں ظہر اور عصر کی نماز اکٹھی ادا کی جاتی ہے، اور حاجی خطبہ حج سننے کی سعادت حاصل کرتے ہیں) یہاں مغرب کی نماز نہیں پڑھی جاتی بلکہ مزدلفہ پہنچ کر مغرب کی تین رکعات اور عشاء کی دو رکعت (نماز قصر) جمع کر کے ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ پڑھی جائے گی، مزدلفہ ہی کو مشعر الحرام کہا گیا ہے کیونکہ یہ حرم کے اندر ہے، یہاں ذکر الٰہی کی تاکید ہے، یہاں رات گزارنی ہے، فجر کی نماز غلس (اندھیرے) یعنی اول وقت میں پڑھ کر طلوع آفتاب تک ذکر میں مشغول رہا جائے، طلوع آفتاب کے بعد منیٰ جایا جائے۔''

(تفسیر احسن البیان)

میدانِ عرفات اور مزدلفہ میں تمام تر وقت توبہ و استغفار، عبادت و انابت میں صرف ہوتا ہے اور مشرقی اور مغربی، کالے اور گورے باشندے ایک ہی طرح کے لباس میں ملبوس دکھائی دیتے ہیں اور ان کی زبانوں پر یکساں نغمہ توحید جاری و ساری ہو جاتا ہے ''اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ''

﴿وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ﴾

اور یاد کرو، اس کو (اس طرح) جیسا کہ ہدایت کی اُس نے تم کو۔

وَاذْكُرُوْهُ، ہٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے (ذَکَرَ، یَذْکُرُ، ذِکْرًا) یاد کرنا، ذکر کرنا۔ کَمَا، جیسا کہ (ھَدٰی۔ کُمْ) ہدایت دی، تمہیں یعنی حج کی ادائیگی اور عبادت و ریاضت کے طور طریقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر ادا ہونے چاہییں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''وَاذْكُرُوا اللّٰهَ'' نے یاد دلا دیا کہ (موسم حج) رنگ رلیاں منانے کے لیے نہیں، جاہلی قوموں کے میلوں ٹھیلوں کی طرح روشنی و آتشبازی کے لیے نہیں، خواب غفلت میں پڑے رہنے کے لیے نہیں، فخریہ قصیدوں اور شعروشاعری میں صرف کرنے کے لیے نہیں بلکہ ذکروعبادت الٰہی کے لیے ہے۔''

(تفسیر ماجدی، جلداول)

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ﴾ اور اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے۔

وَاِنْ ورنہ، اِنْ کا اصل معنی تو ''اگر'' ہے لیکن یہاں ''ورنہ'' یا ''جبکہ'' ہوگا، كُنْتُمْ تم تھے، مِّنْ قَبْلِهٖ، اس سے پہلے (قَبْلِ. ہ) اول ہدایت اور نزول اسلام سے پہلے، ہ کی ضمیر ہدایت اور اسلام کی طرف جاتی ہے۔ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ البتہ (ضرور) گمراہوں سے لَمِنْ (لَ. مِنْ) ضرور۔ سے، لام تاکید کے لیے استعمال ہوتا ہے، ضالٌّ کی جمع ضَالِّيْن، بھٹکے ہوئے، گمراہ۔ یعنی خاتم النبیین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے تم لوگ جہالت اور تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں تھے۔

﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ پھر واپس ہو جاؤ جہاں سے واپس ہوں لوگ۔

ثُمَّ، پھر، ترتیب کلام کے لیے استعمال ہوا ہے، اَفِيْضُوْا، چلو، نکلو، فعل امر جمع مذکر فَاضَ الماءُ کے معنی پانی کا جاری ہونا، یہاں معنی، نکلنا، واپس ہونا، مِنْ حَيْثُ جہاں سے، اَفَاضَ النَّاسُ، واپس ہوں لوگ۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''قریش کے گھڑے ہوئے عقیدوں میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ ہمیں حج میں عرفات کی حاضری کی کیا ضرورت ہے، وہاں تک سب کے ساتھ جانا ہماری علوِّ شان کے منافی ہے، ہمارے لیے مزدلفہ تک جانا کافی ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلداول)

﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

اور بخشش مانگو، اللہ تعالیٰ سے یقیناً اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔

وَاسْتَغْفِرُوا، اور بخشش طلب کیا کرو (اِسْتَغْفَرَ، يَسْتَغْفِرُ، اِسْتِغْفَار) اللہ سے گناہوں کی معافی چاہنا، اِنَّ اللّٰهَ، بلاشبہ اللہ تعالیٰ، غَفُوْرٌ، بخشنے والا، رَّحِيْمٌ، رحم کرنے والا، مہربان۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اگر زادِراہ کے بغیر حج کرنے سے منع کیا گیا ہے تو ایام حج میں رزق حلال اور پاکیزہ روزی کمانے پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔

۲) مناسک حج ادا کرتے وقت جہاں صبر وتحمل اور احسان ومروت کا درس دیا جارہا ہے وہاں ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر، توبہ واستغفار کرنے کی تلقین کی جارہی ہے تاکہ حج کرنے والا کتاب زندگی کا نیا ورق الٹ کر، سفر آخرت کے لیے زادراہ مہیا کرے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا، فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲۰۰) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲۰۱) اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا، وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۲۰۲)	پھر جب تم حج کے تمام ارکان پورے کر چکو، تو اللہ تعالیٰ کو ایسے یاد کرو جیسے تم اپنے آباء واجداد کو یاد کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر، اُن (یاد کرنے والوں) میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جو کہتے ہیں ''اے ہمارے رب! ہمیں جو کچھ دینا ہے، دنیا ہی میں دے دے،'' ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں ''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی اچھی زندگی عطا کر اور آخرت میں بھی اچھی زندگی سے بہرہ ور فرما اور ہمیں عذاب دوزخ سے بچالے،'' (تو یقین کرو) یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے عمل کے مطابق (دنیا وآخرت کی) فلاح میں حصہ ملنا ہے اور اللہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے۔

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ﴾ پس جب تم پورا کر چکو مناسک حج کو۔

فَاِذَا (ف. اِذَا) پس، جب قَضَيْتُمْ تم پورا کر چکو، ماضی جمع مذکر حاضر (قَضٰی، يَقْضِیْ، قَضَاءً) پورا کرنا، مکمل کرنا مَّنَاسِكَكُمْ (مَّنَاسِکَ. كُمْ) مناسک، ارکانِ حج، كُم اپنے مناسک کا مفرد مَنْسَکٌ، یہ لفظ النّسک سے ہے جس کے معنی عبادت کے ہیں اور نَاسِکٌ، عابد (عبادت گزار) کو کہتے ہیں، مگر یہ لفظ ارکان حج کے ادا کرنے کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔ (مفردات القرآن)

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾

پس یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جیسا کہ یاد کرنا تمہارا اپنے آباء واجداد کو۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ یاد کرو اللہ تعالیٰ کو (ف. اذْكُرُوا) پس یاد کرو فعل امر جمع مذکر (ذَكَرَ، يَذْكُرُ، ذِكْرًا) یاد کرنا، اس سے فعل امر اُذْكُرْ اور جمع کا صیغہ اُذْكُرُوْا، تم سب یاد کرو، كَذِكْرِكُمْ (كَ. ذِكْرِ كُمْ) ک کا معنی جیسا کہ..... یاد کرنا تمہارا، اٰبَآءَكُمْ (اٰبَآءَ. كُمْ) آباء واجداد۔ اپنے (کو) اَوْ یا، اَشَدَّ، زیادہ شدت سے، زیادہ جوش سے ذِكْرًا، یاد کرنا۔

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اعمالِ حج سے فراغت کے بعد ذکر کا حکم دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ عظیم عبادت پوری ہوگئی تو اس کا شکر بجالانا چاہیے، اہل جاہلیت کا دستور تھا کہ مزدلفہ سے منیٰ واپسی کے بعد جمرات کے پاس میلہ لگاتے اور اپنے آباء واجداد کی شان میں قصیدے پڑھتے، حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اللہ کو یاد کرتے، اسی لیے اللہ نے مسلمانوں کے فکری دھارے کی اصلاح کی اور انہیں تعلیم دی کہ وہ اللہ کی یاد کریں اس لیے کہ ذکر وشکر کا وہی اکیلا حقدار ہے، اس لیے کنکری مارنے کے بعد جب حجاج قربانی، بال منڈانے، طواف وزیارت اور صفا ومروہ کی سعی سے فارغ ہو کر منیٰ میں قیام پذیر ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہیں۔ (تیسیر الرحمٰن، لبیان القرآن)

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا﴾

پس لوگوں میں سے (وہ بھی) ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! دے ہمیں دنیا میں۔

فَمِنَ (فَ. مِنَ) پس۔ سے، النَّاسِ لوگ، پس لوگوں میں سے، مَنْ، جو، اسم موصول، یَّقُوْلُ کہتا ہے مضارع واحد مذکر غائب (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، رَبَّنَآ، اے ہمارے رب اٰتِنَا ہمیں عطا کر، فِی الدُّنْیَا، دنیا میں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''دنیا میں ایسی بھی قومیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قائل ہوتی ہیں، اُسے معبود اعظم سمجھتی ہیں لیکن حشر ونشر، جزا وسزا کی قائل نہیں، ایسے لوگوں کی دعائیں، التجائیں، تمنائیں قدرۃً اِسی مادی دنیا کی ترقیوں تک محدود رہتی ہیں، مشرکین عرب کے عقیدے بھی اِسی قسم کے تھے اور یہ لوگ جب بھی دعا مانگتے تھے تو تمام تر سامانِ دنیوی اور دشمن پر فتح ونصرت کی۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

محمد بن احمد الانصاری القرطبی لکھتے ہیں:

"كَانَتِ الْعَرَبُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ تَدْعُوْا فِي مَصَالِحِ الدُّنْيَا فَقَطْ، فَكَانُوْا يَسْأَلُوْنَ الْإِبِلَ وَالْغَنَمَ وَالظَّفَرَ بِالْعَدُوِّ، وَ لَا يَطْلُبُوْنَ الْآخِرَةَ، إِذْ كَانُوْا لَا يَعْرِفُوْنَهَا، وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا (تفسیر القرطبی)

جاہلیت میں عرب صرف دنیا کی بہتری کے لیے دعائیں مانگتے تھے وہ اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی کثرت اور دشمن پر فتح ونصرت کی دعائیں کرتے اور آخرت کی طلب نہ رکھتے، اس لیے کہ آخرت پر اُن کا یقین نہ تھا اور نہ وہ اس کی حقیقت ہی سے آشنا تھے۔

﴿وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ اور نہیں ہے اُس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ۔

وَمَا، اور نہیں، لَهٗ، اس کے لیے، فِي الْاٰخِرَةِ آخرت میں، مِنْ خَلَاقٍ کچھ حصہ۔ یعنی جو شخص صرف دنیا ہی کا طالب ہو اس کے آخرت میں کچھ نہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

اور کچھ ایسے ہیں جو وہ کہتے ہیں ''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی اچھی زندگی عطا کر اور آخرت

میں بھی اچھی زندگی سے بہرہ ور فرما اور ہمیں عذاب دوزخ سے بچالے۔''

وَمِنْهُمْ (مِنْ.هُمْ) سے، اُن.....یعنی اُن میں سے مَّنْ، جو، يَّقُوْلُ کہتا ہے۔ حَسَنَةً، بھلائی، نیکی، وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً اور آخرت میں بھی بھلائی، نیکی، وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے، (وَقٰی، يَقِيْ، وِقَايَةٌ) بچانا، محفوظ رکھنا، عَذَابَ النَّارِ عذاب آگ کا۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا، وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾

یہی لوگ ہیں، واسطے اُن کے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا (نیک اعمال کے ذریعہ) اور اللہ تعالیٰ جلد لینے والا ہے حساب کا۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں:

''مومنوں کی دعائیں دونوں جہان کی بھلائیوں کے لیے ہوتی تھیں۔ اس لیے ان کی تعریفیں کی گئیں.....اس دعا میں (جس میں دنیا اور آخرت، دونوں کی بھلائیاں طلب کی گئی ہیں) دین و دنیا کی تمام بھلائیاں جمع کر دی ہیں اور تمام برائیوں سے بچاؤ ہے، اِس لیے کہ دنیا کی بھلائی میں عافیت، راحت، آسانی، تندرستی، گھر بار، بیوی بچے، روزی، علم و عمل، اچھی سواریاں نوکر چاکر، لونڈی، غلام، عزت و آبرو وغیرہ تمام چیزیں آ گئیں اور آخرت کی بھلائی میں حساب کا آسان ہونا، گھبراہٹ سے نجات پانا، نامۂ اعمال کا دائیں ہاتھ میں ملنا سرخ رو ہونا، بالآخر عزت کے ساتھ جنت میں داخل ہونا سب آ گیا، پھر اس کے بعد عذاب جہنم سے نجات چاہنا، اِس سے یہ مطلب ہے کہ ایسے اسباب اللہ تعالیٰ مہیا فرما دے کہ بندہ حرام کاریوں اور گناہوں کو ترک کر کے راہ ہدایت پالے۔ قاسمؒ فرماتے ہیں کہ جسے شکر گزاروں میں شمولیت، ذکر کرنے والی زبان اور صبر کرنے والا جسم مل گیا، اسے دانائی اور آخرت کی بھلائی مل گئی اور وہ عذاب سے نجات پا گیا۔'' (تفسیر ابن کثیر، جلد اول)

آیات مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) بعض لوگ صرف طالب دنیا ہوتے ہیں کہ انہیں سیم و زر کے انبار صرف اس چند روزہ دنیا میں مل جائیں اور وہ کرّ و فرّ اور شان و شوکت سے یہ عارضی دنیا کی زندگی گزار لیں، انہیں آخرت، ابدی اور دائمی زندگی کی اہمیت کا کچھ پتہ نہیں ہے اور نہ وہ اس کے لیے کوئی نیک اعمال ہی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس

مومنوں کی آرزو اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس دنیا میں بھی ہر قسم کی بھلائیوں اور خوشحالیوں سے ہمکنار فرمائے اور آخرت میں بھی دائمی مسرتوں اور راحتوں سے بہرہ ور فرمائے اور اس کے لیے وہ ہمہ وقت نیک اعمال کرنے میں کوشاں رہتے ہیں اور یہی زندگی کا ارفع و اعلیٰ نصب العین ہے۔

۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دعا کو کثرت سے پڑھا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ کسی مسلمان بیمار کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، دیکھا کہ وہ بالکل دبلا پتلا ہو رہا ہے، صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے، آپ نے پوچھا کیا تم کوئی دعا بھی اللہ تعالیٰ سے مانگا کرتے تھے؟ اُس نے کہا ہاں میری یہ دعا تھی کہ اللہ تعالیٰ جو عذاب تو مجھے آخرت میں کرنا چاہتا ہے وہ دنیا میں ہی کر ڈال، آپ نے فرمایا سبحان اللہ! کسی میں اُن کی برداشت کی طاقت بھی ہے؟ تو نے یہ رَبَّنَا اٰتِنَا (آخر تک) کیوں نہ پڑھی؟ چنانچہ بیمار نے اس اسی دعا کو پڑھنا شروع کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے شفا دے دی۔

(احمد، بحوالہ ابن کثیر، جلد اول)

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ، فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ، وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ، لِمَنِ اتَّقٰى، وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۲۰۳)	(ایام حج) گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہییں، پھر جو کوئی (منیٰ سے) دو ہی دن میں (بارہ ذوالحجہ کی شام تک) واپس ہو گیا، تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے تاخیر کی (یعنی تیرہ ذوالحجہ کو بھی قیام کر لیا) تو اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ یہ دن اُس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں۔ اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو اور خوب جان رکھو کہ ایک روز اُس کے حضور میں تمہاری پیشی ہونے والی ہے (اس دن سب باتیں آشکارا ہو جائیں گی)۔

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کو گنتی کے چند دنوں میں۔

وَاذْ كُرُوْا اور یاد کرو، فعل امر جمع مذکر (ذَكَرَ، يَذْكُرُ، ذِكْرًا) یاد کرو، وَاذْكُرُوْا اللّٰهَ اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، فِيْ اَيَّامٍ، (حج کے) دنوں میں (کثرت سے) ایّام کا مفرد يَوْمٌ ہے (دن) مَّعْدُوْدٰتٍ، (عَدَّ، يَعُدُّ، عَدًّا) گننا، شمار کرنا، اَلْعَدَد، گنتی، معدود، شمار کیا ہوا، تعداد، یہ الفاظ اردو زبان میں بھی استعمال ہوتے ہیں، اَلْمَعْدُوْدٰت، معدود، گنتی کے، اَلْاَيَّامُ الْمَعْدُوْدَات، گنتی کے چند دن۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''ایام معدودات سے مراد ماہ ذی الحجہ کی گیارہ، بارہ اور تیرہ تاریخ ہے، اِن دنوں بکثرت اللہ کو یاد کرتے رہنا چاہیے (کہ اس سے دلوں کا زنگ اتر جائے) رمی جمار (شیاطین کو کنکریاں مارتے وقت) بھی بآوازِ بلند تکبیرات کہی جائیں اور تمام حالات میں بھی بازاروں میں چلتے پھرتے وقت بھی اور ہر نماز کے بعد (بلکہ دنیا بھر کے مسلمان فرض نمازوں کے بعد اِن تکبیرات کو بآواز بلند ادا کرتے ہیں) الفاظ یہ ہیں ''اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْد''، عیدین کی تکبیریں بھی یہی ہیں اور ایام تشریق میں بھی، یہی بآواز بلند کہتے رہنا چاہیے، ایام تشریق (عیدالاضحیٰ (یوم النحر) کے بعد تین دن، جن میں گوشت خشک کیا جاتا ہے) کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ یہ کھانے پینے اور ذکر الٰہی کے دن ہیں، یہ تکبیرات ذی الحجہ کی 9 تاریخ (عرفہ یا حج کے دن) کی صبح شروع کر کے تیرہ تاریخ کی عصر کو ختم کی جائیں، اِس طرح یہ کل تیئیس 23 نمازیں بنتی ہیں، ہر نماز کے بعد کم از کم تین بار اور زیادہ سے زیادہ جتنی اللہ توفیق دے، بآواز بلند تکبیرات کہنا چاہیے۔ (تیسیر القرآن)

﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾

پس جو کوئی جلدی کرے دو دن میں (منیٰ سے بارہ ذوالحجہ کی شام تک) واپس ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ (حرج) کی بات نہیں ہے۔

فَمَنْ (فَ.مَنْ) پس، جو کوئی، تَعَجَّلَ جلدی کرے، واحد مذکر غائب (تَعَجَّلَ، يَتَعَجَّلُ، تَعَجُّلًا) باب تفعل، جلدی کرنا، عجلت سے کام لینا، عجلت (جلد بازی) اردو میں استعمال ہوتا ہے، فِيْ يَوْمَيْنِ، دو دن میں، يَوْم، مفرد، يَوْمَيْنِ، تثنیہ اور اَيَّام اس کی جمع ہے، فَلَآ (فَ.لَا) پس، نہیں، اِثْمَ، گناہ (حرج)، عَلَيْهِ (عَلٰى.هِ) اوپر، اُس کے۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

''مکہ والے تعجیل (منیٰ سے جلدی واپسی) کو برا جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو رعایت بخشی کہ اگر وہ جلد فارغ ہوسکیں تو کوئی مضائقہ نہیں اور اس طرح اگر تیسرے دن پر اٹھا رکھیں تو بھی حرج نہیں، دونوں صورتیں جائز اور مباح ہیں۔ مکہ والے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر اصرار کرتے تھے اور بڑی بڑی چیزوں کو فراموش کر دیتے تھے۔ وہ تعجیل و تاخیر کو تو بڑی اہمیت دیتے تھے لیکن توحید ان کے نزدیک بے وقعت چیز تھی۔ اہتمام بالصغائر اور تساہل عن الکبائر (چھوٹے گناہوں کی اہمیت اور بڑے گناہوں سے غفلت) یہ وہ مرض ہے جو مردہ اور بے حس قوموں میں پیدا ہو جاتا ہے وہ مقاصد و اصول کو پس پشت ڈال دینے میں کوئی باک نہیں سمجھتے اور غیر اہم جزئیات کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کو دین و مذہب کا نام دینے لگتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان جزئیات کو بالخصوص بیان فرمایا اور بتایا کہ ان کا درجہ بہر حال جزئیات سے زیادہ نہیں۔ اصل شے تقویٰ و صلاح ہے جو تم میں نہیں اور جس کے حصول کے لیے تمہیں کوشاں رہنا چاہیے۔''

(تفسیر سراج البیان، جلد اول)

﴿وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى﴾

اور جو کوئی تاخیر کرے (۱۳ ذوالحجہ تک منیٰ میں ٹھہرے) تو اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے جس نے تقویٰ اختیار کیے رکھا۔

وَمَنْ اور جو کوئی، تَاَخَّرَ تاخیر کرے فعل ماضی واحد مذکر غائب (تَاَخَّرَ، يَتَاَخَّرُ، تَاَخُّرًا) باب تفعل، دیر کرنا، پیچھے رہنا، موخر ہونا اردو میں استعمال ہوتا ہے، فَلَآ اِثْمَ پس نہیں گناہ (حرج)، عَلَيْهِ، (عَلٰى. هِ) اوپر اس کے۔ لِمَنِ اتَّقٰى، (یہ بات اس کے لیے) جو پرہیزگاری کرے، لِمَنِ (لِ. مَنِ) واسطے، لیے اس کے، جو، اِتَّقٰى، ڈرے، پرہیزگاری کرے (اتَّقٰى، يَتَّقِيْ، اِتِّقَاءٌ) ڈرنا، پرہیزگاری اختیار کرنا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یہ سب احکام نافع اُسی کے حق میں ہو سکتے ہیں جو دِل میں اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتا ہو، تقویٰ الٰہی کی اِس شد و مد سے تاکید یوں ہی اور بے کار نہیں، مومن کے دل پر تقویٰ کی اہمیت نقش کرنے کے لیے ہے، وہ مومن ہی کیا جو متقی نہ ہو۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا، اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾

اور ڈرتے رہو، اللہ سے، اور جان لو کہ بے شک تم اس کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے۔

وَاتَّقُوْا اور ڈرتے رہو (اِتِّقٰی، یَتِّقِیْ، اِتِّقَاءً) ڈرنا، خوف رکھنا، وَاتَّقُوْا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور کوئی کام ایسا نہ کرو جو اُس کی ناراضی کا سبب ہو، اَنَّكُمْ (اَنَّ. كُمْ) بے شک۔ تم، اَنَّ، زور کلام کے لیے آتا ہے، كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، اِلَيْهِ (اِلَیْ. ہِ) طرف، اُس کے، ہٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ تُحْشَرُوْنَ، مضارع مجہول جمع مذکر مخاطب تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے (حَشَرَ، یَحْشُرُ، حَشْرًا) اکٹھا کرنا، جمع کرنا یعنی بالآخر اللہ کے حضور تمہیں پیش کیا جائے گا اور زندگی کے ہر معاملہ کا حساب کتاب دینا ہوگا۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) حج اور اس کے احکام کا بیان شروع ہوا، تو ذکر الٰہی کی خاص طور پر تاکید کی گئی کہ نہ صرف اس سے دلوں کے زنگ اترتے ہیں بلکہ سکون روح کا ذریعہ بھی صرف ذکر الٰہی ہے اور حج کے ساتھ تو اس کی خاص مناسبت ہے، دنیا کے تمام گوشوں سے مختلف نسل اور مختلف مزاج کے لوگ یہاں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں، سفر کی مشکلات، پردیس کی تکالیف، وطن کی یاد، اہل وعیال سے دوری یہ تمام ایسی باتیں ہیں جن سے ہر انسان کا پریشان ہو جانا لازمی امر ہے، ایسے اجتماعات میں ایک دوسرے سے الجھ جانا، سخت کلامی، نرمی گرمی اور کش مکش کا ظہور ہونا معمولی بات ہے، اس لیے توجہ جب ذکر وفکر کی طرف لگ جائے تو ایسی باتوں سے بچاؤ رہتا ہے۔

۲) پھر غور کیجئے کہ ادھر حجاج کرام کی زبانوں پر اللہ تعالیٰ کی یکتائی وکبریائی زبانوں پر جاری وساری ہوتی ہے اور نغمہ توحید "اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، اللّٰهُ اَكْبَرُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْد" سے فضا معمور ہوتی ہے۔ ادھر دنیا کے کونے کونے سے مساجد کے اندر فرض نمازوں کے بعد یہی کلمات ہر نمازی کے وردِ زبان ہوتے ہیں، اس سے امت مسلمہ کا ایمان ویقین کتنا گہرا اور مضبوط ہو جاتا ہے، عقیدہ کی یکسانی پوری امت کو ایک لڑی میں پرو دیتی ہے، افرادِ امت اگر ایک دوسرے کے دست وبازو بن جائیں تو دنیا کی سپر پاور یہی لوگ ہو سکتے ہیں، کاش کہ مسلمان اس حقیقت کو پالیں اسلام تو انہیں، پانچ وقت کی نمازوں، عیدین اور حج کے اجتماعات کے ذریعہ جوڑتا

ہے مگر یہ آپس میں مل کر قوت کا مظاہرہ کیوں نہیں کرتے اور آج دشمن انہیں پریشان کیوں کر رہا ہے اس پر بھی غور وفکر کی اشد ضرورت ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ، وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲۰۴) وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ، وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲۰۵) وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ، وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ (۲۰۶)	اور لوگوں میں سے کوئی شخص ایسا بھی ہے جس کی بات آپ کو دنیا کی زندگی میں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنی نیک نیتی پر بار بار اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے مگر حقیقت میں وہ بدترین جھگڑالو ہوتا ہے اور جب (یہ منافق بات کر کے) لوٹتا ہے تو عملاً اُس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے، کھیتیاں برباد کرے اور نسل انسانی و حیوانی کو تباہ و برباد کر ڈالے..... حالانکہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا..... اور (اس پر طرّہ یہ کہ) جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو اس کا غرور اسے گناہ پر جما دیتا ہے، ایسے شخص کے لیے تو بس جہنم ہی کافی ہے اور وہ بہت برا گہوارہ ہے۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾

اور لوگوں میں سے وہ شخص بھی ہے تعجب میں ڈالتی ہے آپ کو بات اس کی دنیا کی زندگی میں۔

وَمِنَ النَّاسِ اور لوگوں میں سے، ضروری نہیں کہ ''بعض'' سے صرف ایک آدمی ہی مراد ہے، ایک بھی

ہوسکتا ہے اور اُسی فطرت کے بہت سے آدمی بھی مراد ہو سکتے ہیں، انگریزی میں اس کی وضاحت اس طرح کر سکتے ہیں "There is the type of man." مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُهٗ کہ تعجب میں ڈالتی ہے آپ کو، بات اس کی، مَنْ، جس کی، اسم موصول یُّعْجِبُکَ (یُعْجِبُ.کَ) تعجب میں ڈالتی ہے، آپ کو (اَعْجَبَ، یُعْجِبُ، اِعْجَابٌ) تعجب میں ڈالنا، حیرانی میں ڈالنا، اردو میں عجیب وغریب، تعجب وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں، قَوْلُهٗ اس کا قول، اس کی بات، فِی، میں، الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا، دنیا کی زندگانی۔

﴿وَ یُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِی قَلْبِهٖ، وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾

اور وہ گواہ ٹھہراتا ہے اللہ کو اوپر اس کے جو اس کے دل میں ہے اور وہ سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''یہ اشارہ ہے منافقین کی طرف، جن لوگوں کے کردار کمزور ہوتے ہیں، عموماً وہ گفتگو کے بڑے غازی ہوتے ہیں، یہ اپنی عملی کمزوریوں پر اپنی چرب زبانی اور خوش گفتاری سے پردے ڈالنے اور مخاطب کی نیک نیتی اور کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر اس کو اپنے طرز عمل کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مدینہ کے منافقین میں بھی ایک گروہ ایسے لوگوں کا تھا، یہ لوگ کھاتے پیتے، سہل پسند، تن آسان اور چرب زبان تھے، شکلیں اچھی، لباس صاف ستھرے مجلسی آداب میں مشّاق لیکن دل کے بودے اور عمل کے چور تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اسلام کی حمایت میں آسمان وزمین کے قلابے ملاتے لیکن جب وہاں سے ہٹتے تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اسلام کی مخالفت کی راہ میں ہوتی، انہی لوگوں کی تصویر سورۂ منافقون میں ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے:

وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُکَ اَجْسَامُهُمْ، وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ، کَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ، یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ، هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ، قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ، اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ (۴)

''اور جب تم اُن کو دیکھتے ہو تو ان کی شکلیں تمہیں اچھی لگتی ہیں اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو ان کی چرب زبانی کی وجہ سے تم ان کی باتیں سنتے ہو (لیکن حقیقت میں یہ) لکڑی کے کندوں کے مانند ہیں جن کو ٹیک لگا دی گئی ہو، یہ ہر خطرے کو اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں، اصلی دشمن یہی ہیں، پس ان سے بچ کر رہو اللہ انہیں ہلاک کرے، یہ کس طرح اوندھے ہوئے جاتے ہیں۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

وَ یُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِهٖ، اللہ کو گواہ ٹھہرانے کے معنیٰ، اللہ کی قسم کھانے کے ہیں، یہ منافقین اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں اور قسموں کو اپنی ڈھال بناتے ہیں، سورۃ منافقون میں، اُن کی اِن جھوٹی قسموں کا ذکر اس طرح آتا ہے:

اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ، وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (۱) اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، اِنَّهُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۲)

"(اے نبیؐ) جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسولؐ ہیں" ہاں اللہ جانتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ یہ بھی گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعی جھوٹے ہیں، انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اس طرح یہ اللہ کے راستے سے خود رُکتے، اور دنیا کو روکتے ہیں، کیسی بری حرکتیں ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔"

﴿وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾ اور وہ بدترین جھگڑالو ہے۔

وَهُوَ اور وہ ہے، هُوَ ضمیر واحد مذکر غائب، اَلَدُّ (ل دد) لَدَّ یَلُدُّ، اسم تفضیل اَفْعَلُ کے وزن پر اَلْدَدُ ہے، (اَلْدَدُ، کی ادائیگی میں ثقالت تھی) ادغام کے قاعدہ کی بنا پر اَلَدُّ ہو گیا اس کے معنی میں سخت جھگڑا کرنا اور کسی کی بات نہ ماننا، الْخِصَامِ (خَصَمَ، یَخْصَمُ، خَصْمًا وَخِصَامًا) جھگڑنے میں ماہر ہونا گویا کہ اَلَدُّ الْخِصَامِ کے معنی ہوئے۔(The most contentious of enemies)

محمد بن احمد الانصاری القرطبی لکھتے ہیں:

اَیْ هُوَ ذُوْ جَدَالٍ، اِذَا کَلَّمَکَ وَرَاجَعَکَ رَاَیْتَ لِکَلَامِهٖ طَلَاوَةً وَ بَاطِنَهٗ بَاطِلٌ (تفسیر القرطبی)

اَلَدُّ الْخِصَامِ "وہ جھگڑالو شخص ہے، جب تم سے بحث مباحثہ اور بات چیت کرے تو ظاہری طور پر اس کی گفتگو چکنی چپڑی ہوگی جبکہ اس کا باطن دھوکہ اور فریب کا غماز ہوگا۔"

اور صحیح مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اَبْغَضَ الرِّجَالِ اِلَی اللّٰهِ الْاَلَدُّ الْخَصِیْمُ (القرطبی)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت شخص کٹر قسم کا جھگڑالو ہے۔

﴿وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ، وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ﴾

اور جب یہ لوٹتا ہے تو کوشش کرتا ہے زمین میں، تاکہ فساد برپا کرے اس میں (یعنی زمین پر) ہلاک کرے کھیتی باڑی اور نسل کو، اور اللہ نہیں پسند فرماتا فساد کو۔

وَاِذَا، اور جب، تَوَلّٰی لوٹتا ہے، سَعٰی وہ کوشش کرتا ہے فعل ماضی واحد مذکر غائب (سَعٰی، یَسْعٰی، سَعْیًا) جدوجہد اور کوشش کرنا، دوڑ دھوپ کرنا، سرگرم عمل ہونا، سعی و کوشش کی ترکیب اردو میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ فِی الْاَرْضِ زمین میں لِیُفْسِدَ (لِ.یُفْسِدَ) تاکہ فساد برپا کرے (اَفْسَدَ، یُفْسِدُ، اِفْسَادٌ) بگاڑ اور فساد پیدا کرنا۔ وَیُهْلِکَ الْحَرْثَ اور ہلاک کرے (اَهْلَکَ، یُهْلِکُ، اِهْلَاکٌ) ہلاک کرنا، الْحَرْثَ کے معنی زمین میں بیج ڈالنے اور اسے زراعت کے لیے تیار کرنے کے ہیں اور کھیتی کو بھی حرث کہا جاتا ہے۔ (مفردات القرآن)

وَالنَّسْلَ، اور نسل سے مراد نسل انسانی اور نسل حیوانی دونوں شامل ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ اور اللہ نہیں پسند فرماتا، فساد کو۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''تمہارے سامنے تو ان (منافقین) کی باتیں بڑی دل لبھانے والی ہوتی ہیں، لیکن تمہارے پاس سے ہٹنے کے بعد ان کی ساری بھاگ دوڑ فساد فی الارض کی راہ ہوتی ہے۔ یہ اللہ کی بندگی اور اطاعت کی اور اس کی طرف دعوت کی مزاحمت اور مخالفت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے، زمین کے تمام امن و عدل کا انحصار اس بات پر ہے کہ اللہ کے بندے اللہ ہی کی بندگی اور اُسی کی اطاعت میں داخل ہو جائیں جیسا کہ آگے ارشاد ہو رہا ہے: اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ (اللہ کی اطاعت میں سب کے سب داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو)۔ اس بندگی و اطاعت میں داخل ہو جانے کے بعد شیطان کے لیے دراندازیوں اور فساد کی تمام راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ بصورت دیگر تمام نسلِ انسانی شیطان کی فساد انگیزیوں کی آماجگاہ بنی رہتی ہے اور وہ برابر بغض و عداوت کی آگ بھڑکاتا رہتا ہے جو

حرث ونسل دونوں کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ، وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾

اور جب اُس (منافق سے) سے کہا جاتا ہے کہ ڈرو، اللہ سے تو پکڑ لیتی ہے اس کو عزت (غرور) ساتھ گناہ کے، پس کافی ہے اس کو جہنم اور وہ برا گہوارہ ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ اور جب کہا جاتا ہے قِيْلَ ماضی مجہول واحد مذکر غائب (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، اتَّقِ اللّٰهَ ڈرو، اللہ سے، ڈرنا، تقویٰ اختیار کرنا، اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ پکڑتی ہے اس کو عزت، اَخَذَتْ، فعل ماضی واحد مؤنث غائب (اَخَذَ، يَأْخُذُ، اَخْذًا) پکڑنا، آمادہ کرنا الْعِزَّةُ، عزت (غرور) بِالْاِثْمِ (بِ.الْاِثْمِ) ساتھ گناہ کے، فَحَسْبُهٗ (فَ.حَسْبُهٗ) پس، کافی ہے، اُس کے لیے، جَهَنَّمُ، جہنم، دوزخ، وَلَبِئْسَ (وَلَ.بِئْسَ) اور ضرور، برا ہے، الْمِهَادُ، گہوارہ۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''(اس طرح کے منافق) کا پندار اُسے نہ حق پر جماتا اور نہ عدل وانصاف پر اور نہ ہی خیر وصلاح پر، اس کے برعکس وہ اسے حق تلفی وگناہ پر جماتا ہے، وہ جرم، گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر فخر کرتا ہے، اسے حق کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے مگر وہ اس سے سرتابی کرتا ہے اور پوری ڈھٹائی سے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتا ہے۔ حالانکہ یہی شخص اپنی قلبی کیفیت پر اللہ تعالیٰ کو گواہ ٹھہرا رہا تھا اور خیر، نیکی، حق کے لیے اخلاص، یکسوئی، تقویٰ و پرہیزگاری کا مظاہرہ کر رہا تھا، اس آخری ٹچ سے تصویر کے خدوخال کی تکمیل اور اس کے نقوش میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے امتیازی پہلو ابھر جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ نمونہ ایک زندہ ومتحرک انسان کا روپ اختیار کر لیتا ہے اور تم کسی تردد کے بغیر بے اختیار کہہ اٹھو گے! یہ ہے وہ! یہ ہے وہ جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے! اور تم اس طرح کے افراد کو اب اور ہر آن چلتا پھرتا دیکھو گے! گناہ پر اس فخر وغرور، خصومت میں اس شدت، فساد میں اِس قساوت اور فساد پھیلانے میں اس دیدہ دلیری کے جواب میں قرآن اُس کے منہ پر ایک ایسا تھپڑ مارتا ہے جو اس پست اور ذلیل خصلت کے مناسب حال ہے۔

﴿فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ اس کے لیے جہنم کافی ہے! اور وہ بہت برا گہوارہ ہے!

ہاں! ہاں! جہنم اس کے لیے کافی ہے! جہنم جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں! وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (البقرہ۲:۲۴) جہنم جس میں گمراہ اور شیطان کے سب لشکر اوندھے منہ جھونک دیے جائیں گے! فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ، وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ (الشعراء۲۶:۹۴،۹۵) جہنم جو چور چور کر دینے والی ہے! اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ، جس کی لپٹیں دل تک پہنچ جاتی ہیں! وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ، نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ، الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (الھمزہ۱۰۴:۵تا۷) جہنم جو کسی کو نہ باقی رکھتی ہے، نہ چھوڑتی ہے! لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ (مدثر۷۴:۲۸) جہنم جو جوش اور غیظ وغضب کے مارے پھٹی پڑتی ہے! تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (الملک۶۷:۸) ہاں، ہاں! یہی جہنم اُس کے لیے کافی ہے! اور وہ بہت برا گہوارہ ہے! فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ، وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ، کس قدر شدید تمسخر ہے ''مِهَاد'' گہوارہ، بچھونا کے لفظ میں اور کتنی مصیبت اور تباہی ہے اس شخص کے لیے جس کا گہوارہ اور بچھونا جہنم ہو جبکہ وہ اس سے قبل فخر، ناز اور تکبر سے پھولا نہ سماتا تھا!'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) شریعت اسلام کے مقاصد تو یہ ہیں کہ دنیا میں عدل وانصاف کا سکہ رواں ہو، ہر شخص اطمینان اور سکھ کا سانس لے اور وہ زندگی کے حق سے پوری طرح بہرہ ور ہو، اس لیے بندہ مومن کی ذمہ داری ہے کہ وہ امن اور سلامتی کا داعی بن کر پیغام حق کو پھیلائے۔

۲) اس کے برعکس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں امن کی فضا اچھی نہیں لگتی، وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں، ظاہری طور پر ان کی باتوں میں ہمدردی اور مٹھاس نظر آتی اور اپنے آپ کو نسل انسانی کا بڑا ہمدرد اور خیر خواہ ظاہر کرتے ہیں لیکن دل میں انتقام اور فساد کی آگ بھڑک رہی ہوتی ہے، اس کی مثال آج ٹھیک امریکہ پر چسپاں ہوتی ہے جس نے افغانستان میں بے تحاشا بارود گرا کر فصلوں اور نسلوں کو تباہ کر ڈالا ہے اور ابھی اس کا انتقام ٹھنڈا نہیں ہوا، اس نے بے گناہ عراقیوں کو بھی بھون ڈالا اور ان کے تیل کے چشموں پر قبضہ جما لیا، مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ ایسے کٹر دشمن کو مل کر سزا دیں۔ جس کے اشاروں پر نہ معلوم کہاں کہاں ظلم وستم ہو رہا ہے۔ اگر مسلمان دنیا سے شر اور فساد کو نہ روکیں گے تو وہ روز قیامت اللہ تعالیٰ کے یہاں کبھی سرخرو نہیں ہو سکتے ہیں اور فساد برپا

کرنے والوں کا ساتھ دینا ایسا ہی بڑا جرم ہے جیسا کہ فساد برپا کرنے والوں کا اور فسادیوں کو کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی حمایت نہیں مل سکتی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (۲۰۷) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً، وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ، اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۲۰۸)	(دوسری طرف) لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے، اور اللہ (ایسے) بندوں پر بہت مہربان ہے۔ اے ایمان لانے والو! پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، بلاشبہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾

اور لوگوں میں سے (ایسا شخص بھی ہے) جو بیچتا (کھپاتا) ہے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی چاہنے کے لیے۔

وَمِنَ النَّاسِ اور لوگوں میں سے (وہ شخص بھی ہے) ضروری نہیں کہ ''بعض'' سے صرف ایک آدمی ہی مراد ہو، ایک بھی ہو سکتا ہے اور اسی فطرت کے بہت سے آدمی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ مَنْ يَّشْرِيْ جو بیچتا ہے، واحد مذکر غائب (شَرَی، يَشْرِي، شِرَاءً) بیچنا، نَفْسَهُ (نَفْسَ.هُ) نفس (جان) اپنی کو، اِبْتِغَآءَ (ب غ ی) مادہ ہے (اِبْتَغٰی، يَبْتَغِيْ، اِبْتِغَاءً) باب افتعال، چاہنا، کوشش سے کسی چیز کی طلب کرنا، حالت نصب میں مفعول لَهٗ ہونے کی وجہ سے ہے، مَرْضَاتِ اللّٰهِ، رضامندی اللہ کی مَرْضَاتِ کا مفرد مَرْضِيَّةٌ ہے۔ گویا ایسا شخص زندگی کے ہر ہر معاملے میں اپنے خالق و مالک کی رضا کو پیش نظر رکھتا ہے اور کوئی بات ایسی

نہیں کرتا جو سے اس کی ناراضی کا سبب بنے۔

اس کرہ ارض پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رضائے الٰہی میں سب کچھ لٹا دیا جس کی قرآن شہادت دیتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ۹:۱۱۱) ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔''

اور یہی وہ گروہ ہے جس نے اللہ کی رضا کے لیے اپنی تمام خواہشات کو قربان کر دیا اور اس کی رضامندی کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا:

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (المجادلہ:۵۸/۲۲)

''اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔''

﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ اور اللہ مہربان ہے بندوں پر۔

رَءُوْفٌ شفقت، مہربانی اس کا مادہ رافتٌ ہے اور یہ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے، بہت زیادہ شفقت دینے والا، بِالْعِبَادِ (بِ. الْعِبَادِ) ساتھ، اپنے بندوں کو، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انتہائی شفیق اور مہربان ہے۔ اس کے انعامات و احسانات کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ فرش سے عرش تک بے شمار اور لا تعداد نعمتیں ہیں:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم۱۴:۳۴)

''اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو ہرگز نہیں کر سکتے ہو۔''

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾

اے لوگوں جو ایمان لائے ہو داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے طور پر۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا يٰۤاَ، کلمۂ ندا، قاعدہ یہ ہے کہ اگر منادیٰ پر (جسے پکارا جا رہا ہے) الف لام داخل ہو تو مذکر میں اَيُّهَا اور مؤنث میں اَيَّتُهَا کا اضافہ کیا جاتا ہے الَّذِيْنَ، اسم موصول وہ لوگ جو، اٰمَنُوا، ایمان لائے۔ ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ، داخل ہو جاؤ اسلام میں ادْخُلُوْا فعل امر جمع مذکر (دَخَلَ، يَدْخُلُ، مُدْخَلًا) داخل ہونا، فِي السِّلْمِ، اسلام میں دراصل اس کا مادہ (س ل م) ہے، سَلِمَ کا معنی آفات وغیرہ سے محفوظ

رہنا، السِّلْم کے معنی، صلح، امن۔ قرآن حکیم میں آتا ہے: وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ''(اے نبیؐ) اگر دشمن صلح وسلامتی کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی اس کے لیے آمادہ ہو جائیں۔'' السِّلْم بمعنی اسلام کے بھی ہیں کیونکہ وہ امن اور سلامتی کا دین ہے اور مسلمان کی تعریف حدیث مبارکہ میں اس طرح آتی ہے: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔'' اور مومن کی تعریف یوں آتی ہے: اَلْمُومِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ (جامع ترمذی) مومن وہ ہے جس سے نسل انسانی امن اور عافیت پا جائے۔

كَآفَّةً مکمل طور پر، اَیْ فِی اَحْكَامِهٖ كُلِّهَا، پوری طرح اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع بن جاؤ (المراغی)، داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے یعنی تمہاری زندگی کا ہر شعبہ سماجی ہو یا معاشی، سیاسی ہو یا اجتماعی اسلامی تعلیمات کی عکاسی کرتا ہو۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا اور اتّباع نہ کرو فعل نہی صیغہ جمع مذکر حاضر (اِتَّبَعَ، يَتَّبِعُ، اِتِّبَاعٌ) پیروی کرنا، پیچھے چلنا، خُطُوٰتِ قدموں، اس کا مفرد خُطْوَةٌ، قدم، الشَّيْطٰنِ، انسان کا ازلی اور ابدی دشمن، بہکا ہوا اور بھٹکا ہوا۔

﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اِنَّهٗ (اِنَّ. هٗ) بے شک۔ وہ، اِنَّ کلام میں زور اور پختگی پیدا کرتا ہے، هٗ کی ضمیر واحد مذکر غائب شیطان کی طرف جاتی ہے۔ لَكُمْ (لَ. كُمْ) واسطے تمہارے، یعنی تم سب انسانوں کے لیے، كُمْ کی ضمیر جمع مذکر حاضر انسانوں کی طرف جاتی ہے، عَدُوٌّ دشمن، مُّبِيْنٌ ظاہر، کھلا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''الشیطان'' وہ ہے جو خیر اور رحمت سے دور ہو گیا، اس کا اصلی نام ابلیس ہے، شیطان وصفی نام ہے، نافرمانی کی پاداش میں وہ جنت سے نکالا جا چکا ہے اور بنی آدم سے شدید حسد رکھتے ہوئے اب اس کا نام شیطان ہے، اس کے پاس اور کوئی قوت نہیں، انسان کو مجبور ذرا بھی نہیں کر سکتا ہے، البتہ پروپیگنڈے کے فن کا وہ امام ہے، ترغیب خوب دے سکتا ہے، سیاہ کو سفید کر کے خوب دکھا سکتا ہے اور وسوسہ اندازی کی طاقت

غضب کی رکھتا ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلداول)

یہ ابلیس (شیطان) جنوں میں سے تھا، اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی پر بارگاہ الٰہی سے دھتکارا گیا، اس نے اس ذلت وخواری پر لوگوں کو راہ راست سے بہکانے کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ سے تا قیامت مہلت مانگی، جو اسے دے دی گئی: قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ○ قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ○ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ○ قَالَ فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ ○ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ○ [صٓ ۳۸: ۷۹-۸۳] وہ بولا ''اے میرے رب، یہ بات ہے تو پھر اُس وقت تک کے لیے مجھے مہلت دے دے جب یہ لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے، فرمایا ''اچھا تجھے اُس روز (قیامت) تک مہلت ہے جس کا وقت مجھے معلوم ہے۔'' اُس نے کہا تیری عزت کی قسم، ان سب لوگوں کہ بہکا کر رہوں گا بجز تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے خالص کرلیا ہے۔''

اس ابلیس (شیطان) نے جنوں اور انسانوں میں سے اپنے بہت سے ہمنوا اور ساتھی بنا لیے جن کا ہر وقت اور ہر لمحہ یہی کام ہے کہ لوگوں کے درمیان وسوسوں اور گمراہ کن خیالات سے فتنہ وفساد پیدا کریں، انہیں آپس میں لڑائیں بھڑائیں، مگر ان کا زور اُن لوگوں پر ہی چلتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتے ہیں، اس لیے ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلاً (بنی اسرائیل ۱۷:۶۵) ''یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا اور توکل کے لیے تیرا رب کافی ہے۔'' جو احکام الٰہی کی پیروی کرتے ہیں اور ہر وقت اس کی مدد تلاش کرتے ہیں، شیطان اور اس کا لاؤلشکر ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا ہے، رب کریم نے شیطان اور اس کے لشکر سے بچنے کے لیے دعا بھی سکھلا دی ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنْ ھَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ، وَ اَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ (المومنون ۲۳:۹۷، ۹۸) ''اور کہو اے پروردگار میں شیطان کے وسوسوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے پروردگار اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آموجود ہوں۔''

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) بعض لوگوں کے سامنے زندگی گزارنے کا ارفع واعلیٰ مقصد ہوتا ہے، وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس نیلگوں آسمان کے نیچے صحابہ کرام وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جنہوں نے اخلاص و

صداقت کی ایسی مثالیں رقم کیں جو تا قیامت لوگوں کے لیے روشنی بہم پہنچاتی رہیں گی۔

۲) احکام الٰہی کو اسوہ حسنہ کی روشنی میں سرانجام دینے کا نام اسلام ہے اور یہ زندگی کے ہر دائرہ پر محیط ہے۔ یہی سلامتی کا بے خطا راستہ ہے۔

۳) یہ زندگی مسلسل اور پیہم امتحان ہے، انسان کا ازلی وابدی دشمن شیطان ہے، اس کو اپنا دشمن سمجھتے ہوئے اس سے جنگ ضروری ہے: ''شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے دشمن ہی سمجھو۔'' (فاطر ۳۵:۶)

۴) شیطان سے بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ ہے، یعنی احکام الٰہی کی پیروی کرتے ہوئے خالق کائنات کی مدد اور رحمت تلاش کرنا۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۰۹) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ، وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۲۱۰)	پھر اگر تم روشن دلائل آجانے کے بعد بھی (راہ حق) سے پھسل گئے تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب اور حکمت والا ہے، یہ (یہود) کسی بات کے منتظر نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادلوں کے سایہ میں ان کے پاس آئیں اور معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے (عذاب الٰہی ان پر مسلط ہو جائے) اور تمام معاملات تو اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔

﴿فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾

پس اگر تم پھسل گئے اس کے بعد کہ آئے تمہارے پاس روشن دلائل، پس جان لو بلاشبہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

فَاِنْ (ف.اِنْ) پس۔ اگر، زَلَلْتُمْ، تم نے لغزش کی (پھسل گئے) فعل ماضی جمع مذکر حاضر (ز ل ل)

(زَلَّ یَزِلُّ، زَلًّا) پاؤں کا پھسلنا،لغزش صادر ہونا بہکنا اور گمراہ ہونا، مِّنۢ بَعۡدِ، اس کے بعد کہ جَآءَتۡکُمُ (جَآءَ ثْ. کُمُ) آئے،تمہارے پاس، (جَاءَ یَجِیءُ) آنا، الۡبَیِّنٰتُ، روشن دلائل اس کا مفرد بَیِّنَۃٌ ہے۔ فَاعۡلَمُوۡۤا (فَ. اعۡلَمُوۡا) پس۔جان لو،'فَ' یہاں پر جواب کے لیے آیا ہے۔اِعۡلَمُوۡا، جان لو فعل امر جمع مذکر (عَلِمَ، یَعۡلَمُ، عِلۡمًا) جاننا، اَنَّ اللّٰہَ بلاشبہ،اللہ تعالیٰ عَزِیۡزٌ، غالب وقادر، حَکِیۡمٌ، حکیم اور دانا، اس کا کوئی کام حکمت اور دانائی سے خالی نہیں ہے۔مخالفینِ دین کو سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے، حکیم ہے، اس کا بدلہ حکمت پر مبنی ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''یعنی اسلام کے انسانی زندگی کے ہر پہلو میں واضح احکام آجانے کے بعد تم اسلام میں پوری طرح داخل نہ ہوئے اور دوغلی پالیسی اختیار کی اور جن احکام پر چاہا عمل کرلیا اور جہاں کوئی بات طبیعت کو ناگوار محسوس ہوئی یا کسی نقصان کا خطرہ محسوس ہوا۔وہاں اپنی مرضی کرلی اور اسلام کے احکام کو پس پشت ڈال دیا تو خوب سمجھ لو کہ اللہ بڑا زبردست حکمت والا ہے، وہ تمہیں سزا بھی دے سکتا ہے، ذلیل وخوار بھی کرسکتا ہے اور دنیا کی حکمرانی تمہارے سوا کسی دوسرے کو بھی دے سکتا ہے۔'' (تیسیر القرآن)

ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی لکھتے ہیں:

''اَلۡبَیِّنٰتِ، سے مراد آیات قرآنی بھی ہیں اور وہ معجزات بھی (جو انفس وآفاق میں پھیلے ہوئے ہیں) اور یہ خطاب جہاں مسلمانوں کو ہے وہاں اہل کتاب کو بھی ہے، کیونکہ ان کی کتب (تورات، انجیل) میں خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف آچکی ہے، اس آیہ مبارکہ سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ حقائق جاننے والوں کی سزا، نہ جاننے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔'' (تفسیر القرطبی)

﴿هَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ وَالۡمَلٰٓئِکَةُ وَقُضِیَ الۡاَمۡرُ، وَاِلَی اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ﴾

(وہ یہود) تو کسی بات کے منتظر نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادلوں کے سایۂ میں ان کے پاس آئیں اور معاملہ کا فیصلہ کردیا جائے۔

هَلۡ یہاں پر استفہامیہ نہیں بلکہ جب اِلَّا کے ساتھ آتا ہے تو نفی کا معنی دیتا ہے، یَنۡظُرُوۡنَ وہ انتظار

کرتے ہیں وہ دیکھتے ہیں مضارع جمع مذکر غائب (نَظَرَ، یَنْظُرُ، نَظْرًا) انتظار کرنا، دیکھنا، اِلّآ، مگر، وہ نہیں انتظار کرتے ہیں مگر اس بات کا، اَنْ، یہ کہ یَّاْتِیَهُمُ (یَّاْتِیَ.هُمْ) آئے، اُن کے پاس (اَتٰی، یَاْتِیْ) آنا، اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ کہ آئے ان کے پاس اللہ تعالیٰ، فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ سایہ میں بادلوں کے، ظُلَلٌ جمع ظِلَّةٌ مفرد، وہ شے جس سے سایہ حاصل کیا جاسکتا ہے، سائبان (انوار القرآن) الْغَمَامِ اس کا مفرد، غَمَامَةٌ، ابر، بادل، جب بادل بہت گھنا (Thick) ہو تو وہ سائبان کی طرح ہو جاتا ہے۔ (حوالہ ایضاً) ظِلَّةٌ کا قرآن حکیم میں زیادہ تر استعمال عذاب کے لیے آیا ہے جیسا کہ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ (الشعراء ۲۶:۱۸۹) سائے والے دن، عذاب نے انہیں آ پکڑا۔

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ (الزمر ۳۹:۱۶) اُن (اہل جہنم) کے اوپر بھی آگ کے سائبان ہوں گے اور نیچے بھی۔ (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ)

وَالْمَلٰٓئِكَةُ اور فرشتے (بھی آئیں) وَقُضِیَ الْاَمْرُ، اور پورا کر دیا جائے، معاملہ (عذاب) (قَضٰی، یَقْضِیْ، قَضَاءً) پورا کرنا، کسی حکم کا فیصلہ کرنا، الْاَمْرُ، فیصلہ، حکم وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْر اور طرف اللہ کے، لوٹائے جاتے ہیں۔ سب معاملات، یعنی تمام امور کے فیصلے بارگاہ الٰہی سے جاری ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے آنے سے مراد اللہ تعالیٰ کا حکم اور عذاب کا آنا ہے جیسا کہ: فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا (الحشر ۵۹:۲) ''پس اللہ نے ایسے رخ سے انہیں آن لیا جس کا انہیں خیال بھی نہ تھا۔''

پھر ایک اور مقام پر ارشاد ہوا: هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ یَاْتِیَ اَمْرُ رَبِّكَ (النحل ۱۶:۳۳) ''وہ سوائے اس کے اور کچھ انتظار نہیں کرتے کہ ان پر فرشتے آجائیں یا تیرے رب کا حکم آجائے۔''

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''یعنی ایسی نشانی کے انتظار میں جس سے انہیں قطعی اور حتمی طور پر بات کا یقین آجائے، ایسا یقین جیسے ہر انسان کو یہ یقین ہے کہ اُسے موت آکے رہے گی تو اسے خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جب ایسی نشانی آجائے گی تو پھر ایمان لانے کی کچھ قدر و قیمت نہ ہوگی، ایمان لانے کی قدر و قیمت تو صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ امور غیب حواس ظاہری سے پوشیدہ ہیں۔'' (تیسیر القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) راہِ حق کو جان پہچان کر اِس سے روگردانی کرنا ناقابل معافی جرم ہے، یہ بغاوت اور سرکشی کا راستہ ہے۔

۲) راہ حق کو پانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو روشن دلائل کے ساتھ مختلف قوموں اور علاقوں میں بھیجا اور خاتم النبیّین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو الفرقان دے کر نسل انسانی کے لیے مبعوث فرمایا: اس کتاب کے اندر روشن آیات ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اُن آیات کا عملی نمونہ ہے، اِس صداقت کو اہل کتاب نے بھی پہچان لیا تھا۔ مگر محض تعصّب اور ہٹ دھرمی سے منہ موڑا جو یقیناً غلط روش ہے۔

۳) اِنسان کا شرف اِسی میں ہے کہ فکری ونظری، عقلی ونقلی دلائل دیکھ کر حقیقت کو قبول کرے اور فرعونیت کی راہ ترک کر دے کہ جس نے زندگی میں ''اَنَا رَبُّکُمُ الاعْلٰی'' کا اعلان کیا مگر جب وہ عذاب الٰہی کا شکار ہوا اور رب قدیر کے حکم سے پانی میں غوطے کھانے لگا تو بول اٹھا ''اٰمَنْتُ'' صرف وہی ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اور میں اس کا فرمانبردار بنتا ہوں'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''(اب تو ایمان لاتا ہے؟) جبکہ پہلے نافرمانی کرتا رہا اور مُفسِد بنا رہا۔ آج تو ہم تیری لاش کو بچائیں گے تاکہ تو بعد میں آنے والوں کے لیے نشانِ عبرت بنے۔'' (یونس ۱۰:۹۰،۹۱) معلوم ہوا کہ ایمان وہی فائدہ دیتا ہے جو صحت وعافیت اور امن وسلامتی میں قبول کیا جائے نہ کہ دم اکھڑنے پر قبول کیا جائے۔

۴) اِنسان کے غور وفکر کے لیے موت وحیات، جوانی اور بڑھاپا قابل غور باتیں ہیں، اگر کوئی حیات (زندگی) کا منکر ہے کہ یہ رب کائنات کا عطیہ ہے تو موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے، جس کا انکار کٹر سے کٹر منکر بھی نہیں کر سکتا لازماً اسے ماننا پڑے گا کہ یہ عظیم وبرتر مالک کے ہاتھ میں ہے، اسی طرح کوئی جوانی میں دیوانگی کا شکار ہو جائے اور عقل وشعور سے کام نہ لے تو یہ اس کا لا اُبالی پن ہے مگر بڑھاپے سے کون انکار کر سکتا ہے؟ اِس کمزوری اور بے بسی کی حالت میں کس ذات نے اسے پہنچایا ہے؟ پس اللہ تعالیٰ کی یہ بنائی ہوئی کائنات سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے اور کامیاب ہوتے ہیں جو عقل وفکر سے کام لیتے ہیں اور جو خواہشات کا شکار ہو جاتے ہیں اور غفلت میں زندگی گزارتے ہیں، ناکام ہو جاتے ہیں۔

سَلۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ کَمۡ اٰتَیۡنٰہُمۡ مِّنۡ اٰیَۃٍۭ بَیِّنَۃٍ ؕ وَمَنۡ یُّبَدِّلۡ نِعۡمَۃَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ (۲۱۱) زُیِّنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا وَ یَسۡخَرُوۡنَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۘ وَالَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا فَوۡقَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ وَاللّٰہُ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ (۲۱۲)	آپؐ بنی اسرائیل سے پوچھ لیجئے کہ ہم نے انہیں (علم وبصیرت کی) کتنی روشن نشانیاں دی تھیں، اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو پا لینے کے بعد (محرومی و شقاوت سے) اسے بدل ڈالے، تو یاد رکھو (اللہ کا قانون مکافات) بھی سزا دینے میں بہت سخت ہے، منکرین حق کی نگاہوں میں تو صرف دنیا کی زندگی سمائی ہوئی ہے، وہ اہل ایمان کی (موجودہ بے سروسامانی دیکھ کر) ہنسی اڑاتے ہیں، حالانکہ قیامت کے دن یہی پرہیزگار لوگ ان سے بالاتر ہوں گے (رہی دنیا کی زندگی تو یہاں) اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔

﴿سَلۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ کَمۡ اٰتَیۡنٰہُمۡ مِّنۡ اٰیَۃٍۭ بَیِّنَۃٍ ؕ﴾

سوال کیجئے (پوچھیے) بنی اسرائیل سے (کہ) کتنی دیں ہم نے انہیں نشانیاں واضح۔

سَلۡ پوچھئے فعل امر مذکر (سَأَلَ، یَسۡئَلُ، سُؤَالًا) سوال کرنا، پوچھنا، بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ، سیدنا یعقوب علیہ السلام کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی، کَمۡ کلمۂ استفہام، کتنی؟ اٰتَیۡنٰہُمۡ (اٰتَیۡنَاھُمۡ) ہم نے عطا کیں، انہیں، یعنی رب کریم نے انہیں علم وبصیرت کی کتنی روشن نشانیاں دیں، اٰیَۃٍۭ، نشانی اس کی جمع آیات ہے، بَیِّنَۃٍ، بیّن، واضح روشن۔

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے انبیاء ورسل بھیجے اور ان کے ساتھ بہت سی کھلی نشانیاں اور واضح دلائل بھیجے تاکہ انہیں دیکھ کر ایمان لے آئیں۔ یدِ بیضاء، عصائے موسیٰ، شقِ سمندر، پتھروں سے چشموں کا

جاری ہونا، میدانِ تیہ میں بادل کا سایہ (کہ دن آرام سے گزرے) من وسلویٰ اور اسی قسم کے اور بھی دلائل اللہ تعالیٰ نے انہیں راہ راست پر لانے کے لیے بھیجے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اور ایمان کے بدلے کفر کو قبول کر لیا اور حرمانِ ثواب اور عذاب نار کے مستحق بنے۔" (تیسیر الرحمٰن، جلد اول)

﴿وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَاجَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾

اور جو کوئی تبدیل کرے اللہ کی نعمت کو، بعد اس کے (کہ) آئی (وہ نعمت) اُس کے پاس، پس بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

وَمَنْ، اور جو کوئی يُّبَدِّلْ تبدیل کرتا ہے، فعل مضارع واحد مذکر غائب (بَدَّلَ، يُبَدِّلُ، تَبْدِيْلًا) بدلنا، تبدیل کرنا یعنی کلام میں تحریف اور تغیر پیدا کرنا۔ نِعْمَةَ اللّٰهِ، اللہ کی نعمت، اِس سے مراد اللہ کے احکام اور اس کا دین ہے، جیسا کہ اسلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ ۵:۳) "آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے بحیثیت دین (زندگی گزارنے کا منشور) اسلام کو پسند کیا ہے۔"

مِنْۢ بَعْدِ، اس کے بعد، مَا جَآءَتْهُ جو آئی اُس کے پاس (وہ نعمت) (جَآءَ تْ.هُ) آئی (نعمت) اُس کے پاس، یعنی ہدایت اور دین کی روشنی پانے کے بعد کوئی شخص خواہشاتِ نفسانی کا شکار ہو جائے اور کفر کا راستہ اختیار کرے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم ہے، اس لیے فرمایا: فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ، پس، بلاشبہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے، دنیاوی طور پر بھی اسلام قبول کرنے کے بعد کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کی سزا (یعنی مرتدین کی سزا) قتل ہے اور آخرت کے عذاب کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ (العیاذ باللہ)

﴿زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾

زینت دی گئی اُن لوگوں کے واسطے جو کافر ہوئے دنیا کی زندگی اور وہ تمسخر کرتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے۔

زُيِّنَ فعل ماضی مجہول واحد مذکر غائب، زینت دی گئی (زَيَّنَ يُزَيِّنُ، تَزْيِيْنٌ) زینت دینا، آراستہ کرنا پسندیدہ اور خوشنما بنانا باب تفعیل، لِلَّذِيْنَ (لِ.لَّذِيْنَ) لیے، ان لوگوں کے، كَفَرُوا جنہوں نے کفر کیا ماضی جمع مذکر غائب (كَفَرَ، يَكْفُرُ، كُفْرًا) کفر کرنا، بغاوت کا راستہ اختیار کرنا، الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا، زندگی، دنیا کی

یعنی کفار کے لیے دنیاوی زندگی ہی کو خوشنما بنا دیا گیا ہے۔ کفار کی پست خواہشات و سفلی جذبات کی وجہ سے انہیں ادھر دھکیل دیا گیا ہے یعنی اپنی کرتوتوں کی وجہ ہی سے وہ نیچے گرے جا رہے ہیں۔ قرآن حکیم میں اچھی چیزوں کی زینت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات ۴۹:۷)

''مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا۔''

اور بری باتوں کی زینت دینے کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الانعام ۶:۴۳)

''اور شیطان نے انہیں اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔''

وَ يَسْخَرُوْنَ اور وہ تمسخر کرتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں، جمع مذکر غائب (سَخِرَ، يَسْخَرُ، سَخْرًا) کسی کو ذلیل و حقیر سمجھ کر اس کا مذاق اڑانا، مِنَ الَّذِيْنَ، ان لوگوں سے اٰمَنُوْا، جو ایمان لائے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''چونکہ مسلمانوں کی اکثریت غرباء پر مشتمل تھی جو دنیاوی آسائشوں اور سہولتوں سے محروم تھے، اِس لیے کافر یعنی قریش مکہ اُن کا مذاق اڑاتے تھے جیسا کہ اہل ثروت کا ہر دور میں شیوہ رہا ہے۔'' (تفسیر احسن البیان)

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾

اور جو لوگ پرہیزگار ہیں، اُن سے بالاتر ہوں گے، روزِ قیامت۔

وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا اور وہ لوگ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں (اِتَّقَى يَتَّقِى، اِتِّقَاءً) تقوی اختیار کرنا، پرہیزگار بننا، فَوْقَهُمْ (فَوْقَ. هُمْ) بلندتر، بالاتر، اُن سے، يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، دن قیامت کے، اہل ایمان اور متقی قیامت کے روز بلندترین درجات میں ہوں گے جبکہ کفار و مشرکین پست ترین احوال میں ہوں گے، اول الذکر نے چند روزہ زندگی کو با مقصد بنا لیا اور اسے حق و صداقت سے آراستہ و پیراستہ کیا اور غربت میں رہ کر بھی سچائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جبکہ ثانی الذکر نے دھن دولت کو مقصد حیات ٹھہرا لیا اور زندگی کو خواہشات نفسانی سے گزارا، پھر دولت کے نشے میں چور ہو کر اہل ایمان کا مذاق بھی اڑایا۔

﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾

اور اللہ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے۔

وَاللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ يَرْزُقُ، رزق دیتا ہے (رَزَقَ، يَرْزُقُ، رِزْقًا) رزق دینا مَنْ يَّشَآءُ جسے چاہتا ہے، مَنْ موصول، جسے يَشَاءُ وہ چاہتا ہے مضارع واحد مذکر غائب (شَاءَ، يَشَاءُ، شَيْئًا) چاہنا، بِغَيْرِ (بِ. غَيْرِ) بغیر حِسَابٍ، حساب کے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''رزق، تعبیر ہے اللہ تعالیٰ کے فضل کی اور اِس فضل کے بابت ارشاد ہوا ہے کہ بے حساب ہوگا یعنی توقعات اور اندازوں و قیاسوں اور گمانوں کے تمام پیمانے اُس کے ناپنے سے قاصر رہ جائیں گے۔''

(تدبر قرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) انبیاء و رسل اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لیے روشن ہدایات لے کر تشریف لاتے رہے اور ان پاکبازوں کی اپنی زندگیاں بھی ان ہدایات کا عملی نمونہ تھیں، بنی اسرائیل میں انبیاء کرام کا سلسلہ دیر تک جاری رہا جو اللہ کا سب سے بڑا انعام ہے، اس کے علاوہ اس قوم پر مادی انعامات کی بارش بھی ہوئی، مگر اس کے باوجود انہوں نے کفر اور سرکشی کی راہ اختیار کی، جس کے سبب ذلت و مسکنت کا شکار ہوگئی اور جو لوگ بھی نعمتیں ملنے کے بعد یہ راستہ اختیار کرتے ہیں وہ رحمت الٰہی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

۲) ہدایت الٰہی سے منہ موڑنا اور دین کی نعمت کو نظر انداز کرنا اُخروی خسارے کا باعث ہوتا ہے تو دنیاوی نعمتوں مثلاً دولت، صحت، سلطنت کی ناقدری اور غلط استعمال سے بیماری، ناکامی، ذلت و افلاس کی شکل میں خمیازہ اٹھانا بھی مشاہدہ کی بات ہے۔

۳) یہ آیاتِ مبارکہ آج امت مسلمہ کے کس قدر حسب حال اور کس درجہ قابل غور ہیں! اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہر دینی اور دنیاوی نعمت کے ساتھ آج ہمارا کیا معاملہ ہے؟ کس نعمت کا حق ہم ادا کر رہے ہیں؟ اور کونسی نعمت ایسی ہے جس کی روح ہم نے بدل نہیں ڈالی ہے؟ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج، ہمارے صدقات و خیرات غرضیکہ ہماری سب عبادتیں مغز و روح سے خالی ہو چکی ہیں اور ان عبادتوں کے خالی ڈھانچے رہ گئے ہیں، اخلاق و اتحاد کی دولت ہم نے الگ برباد کر ڈالی ہے۔

رہ گئی رسم اذاں، روح بلالی نہ رہی فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی

۴) دنیاوی زندگی کو مقصود ٹھہرانا مومن کا نہیں کافر کا شیوہ ہے مومن کی تمام تر کدو کاوش آخرت کو بنانے کے لیے ہوتی ہے جبکہ کافر محض دنیا کو بنانے اور سنوارنے میں لگ جاتا ہے اور اُس کے حصول کے لیے تمام جائز ناجائز حربے استعمال میں لاتا ہے۔

۵) قرآن حکیم کی زریں تعلیمات سے غفلت کے سبب ہماری پریشانیوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار .

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً، فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ، وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ، وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ، فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ، وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ(۲۱۳)	(ابتدا میں) سب لوگ ایک ہی طریق (دین) پر تھے (پھر وہ خواہشات کا شکار ہو کر اختلافات کرنے لگے) تب اللہ نے نبی بھیجے (جو راست روی پر لوگوں کو) بشارت دینے والے (اور کج روی کے نتائج پر) ڈرانے والے تھے، اور انہیں کتاب حق سے بھی نوازا، تاکہ سچائی کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے، ان کا فیصلہ کریں اور واضح دلائل آ جانے کے بعد ان لوگوں نے اختلاف کیا (اس کی وجہ یہ تھی کہ) ان میں ضد بازی اور انا کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا، پھر جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے اِذن (رحمت سے) سے اختلافی امور میں انہیں حق کا راستہ دکھا دیا اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ تھے (ابتدا میں سب) لوگ ایک ہی امت۔

كَانَ، تھے، النَّاسُ لوگ، اُمَّةً وَّاحِدَةً، ایک امت، اُمَّةً موصوف، وَّاحِدَةٌ، صفت، مرکب توصیفی۔

امام شوکانی لکھتے ہیں: اَیْ كَانُوْا كُلُّهُمْ عَلٰى دِيْنٍ هُوَالْاِسْلَام (فتح القدیر) ''یعنی وہ سب کے سب ایک ہی دین پر تھے اور وہ دین اسلام ہے۔''

اُمَّةٌ، کا لفظ قرآن حکیم میں حسب ذیل معنوں میں استعمال ہوا ہے:

گروہ: وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ (الاعراف ۷:۱۵۹)

''موسیٰؑ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو حق کے مطابق ہدایت کرتا۔''

ملت (دستور): كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (البقرہ ۲:۲۱۳)

''(ابتدا میں سب) لوگ ایک ہی امت تھے۔''

ملت اس دستور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی زبان پر بندوں کے لیے مقرر فرمایا، تاکہ اس کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکیں، ابتداء میں یعنی آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد ایک ہی دستور اور طریقہ پر تھے جو انہیں اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا تھا اور وہ اسلام ہے۔

مدت: وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ (ھود ۱۱:۸)

''اور اگر ہم ایک خاص مدت تک ان کی سزا کو ٹالتے ہیں (تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ آخر کس بات نے اسے روک رکھا ہے؟)

اِمام: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا (النحل ۱۶:۱۲۰)

''ابراہیم اپنی ذات میں فرمانبردار امت تھے (فضائل و کمالات کا مجموعہ اور امام تھے اور قابل تقلید تھے اور عزیمت اور بلندی کے کام جو ایک جماعت سرانجام دیتی ہے، وہ سب ان میں جمع تھے)۔''

نوع: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (الانعام ۶:۳۸)

''اور زمین میں جو چلنے پھرنے والا یا پیروں سے اڑنے والا جانور ہے ان کی بھی تم لوگوں کی طرح جماعتیں ہیں۔''

مبدأ اور اصل: وَاِنَّهٗ فِىْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ (الزخرف ۴۳:۴)

''اور یہ قرآن، اصل کتاب یعنی لوح محفوظ میں (مرقوم) ہے۔''

مرجع و مآل: وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (القارعۃ ۱۰۱:۸،۹)

''(قیامت کے روز) جس کے وزن ہلکے نکلے، اس کا مرجع ہاویہ ہے۔''

(ہاویہ، جہنم کا ایک طبقہ ہے)۔''

ماں، والدہ: وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ (النجم ۵۳:۳۲)

''اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں ابھی جنین تھے (رب قدیر کے علم میں سب کچھ ہے)''

امتِ محمدﷺ: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (ال عمران ۳:۱۱۰)

''(مسلمانو!) تم بہترین امت ہو جنہیں انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔''

﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ﴾

پس بھیجا اللہ نے نبیوں کو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر۔

فَبَعَثَ (ف. بَعَثَ) پس۔ بھیجا (بَعَثَ، يَبْعَثُ، بَعْثًا) بھیجنا، النَّبِيّٖنَ، انبیاء کرام۔ اس کا مفرد نَبِيٌّ، مُبَشِّرِيْنَ اس کا مفرد مُبَشِّرٌ، اسم فاعل خوشخبری سنانے والے، مُنْذِرِيْنَ، اور ڈرانے والے، اسم فاعل، اس کا مفرد مُنْذِر ہے یعنی انبیاء علیہم السلام فرمانبرداروں کو ثواب اور کامیابی کی بشارت دینے والے اور گناہگاروں کو عذاب سے ڈرانے والے تھے۔

﴿وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾

اور نازل کیا ان پر کتاب کو حق کے ساتھ تاکہ حکم کریں لوگوں کے درمیان اس بات میں جس میں کہ وہ اختلاف کرتے تھے۔

وَاَنْزَلَ اور نازل کیا اللہ تعالیٰ نے، مَعَهُمُ (مَعَ. هُمْ) ساتھ۔ ان کے (یعنی ان پر) (اَنْزَلَ، يُنْزِلُ، اِنْزَالًا) اتارنا، نازل کرنا، الْكِتٰبَ ''ال'' معرفہ کے لیے ہے خاص کتاب، کتاب اللہ، اس سے مراد تمام کتب سماوی ہیں، اسم جنس بمعنی الکتب (القرطبی) الکتب اسم جنس ہر آسمانی کتاب کے لیے آیا ہے۔ بِالْحَقِّ (بِ. الْحَقِّ) ساتھ۔ حق کے لِيَحْكُمَ (لِ. يَحْكُمَ) تاکہ، فیصلہ کریں، (حَكَمَ، يَحْكُمُ، حُكْمًا) حکم

کرنا، فیصلہ کرنا (لوگوں کے درمیان احکام الٰہی نافذ کرنا) بَيْنَ النَّاسِ لوگوں کے درمیان، فِيْمَا (فِيْ.مَا) میں (اس چیز کے)، جو یعنی ان باتوں میں جن میں وہ، اخْتَلَفُوْا، اختلاف کرتے تھے وہ ، فِيْهِ (فِيْ.هِ) اُس، میں، یعنی احکام کی وہ باتیں جنہیں انہوں نے خواہشاتِ نفسانی سے ردو بدل کر دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر کتابیں نازل فرما کر انہیں واضح کر دیا، خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی روشن اور مضبوط کتاب عطا فرمائی اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ فرما دیا۔ اس کتاب میں عقائد، معاملات، عبادات، معاشرتی اور تمدنی مبادیات کو نکھار کر رکھ دیا اور تمام باتوں کو روشن کر دیا جن کو سابق کتب میں دھندلا دیا گیا تھا۔

﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ﴾

اور نہیں اختلاف کیا اس میں مگر ان لوگوں نے جنہیں دی گئی تھی وہ (کتاب) یعنی اس کے بعد کہ ان کے پاس روشن دلائل پہنچ گئے، اپنی ضد اور سرکشی کے سبب، (جو ان میں موجود تھی)

وَمَا اخْتَلَفَ اور انہیں اختلاف کیا، مَا یہاں پر نفی کے معنی دیتا ہے (مَا، نافیہ کہلاتا ہے) اِخْتَلَفَ، اختلاف کیا فعل ماضی واحد مذکر غائب (اِخْتَلَفَ، يَخْتَلِفُ، اِخْتِلَافًا) اختلاف کرنا، فِيْهِ (فِيْ.هِ) میں، اس، یعنی اس کتاب میں، هِ کی ضمیر دین یا کتاب کی طرف جاتی ہے، اِلَّا الَّذِيْنَ مگر ان لوگوں نے اُوْتُوْهُ (اُوْتُوْ.هُ) جو دیے گئے تھے، اسے هُ کی ضمیر دِیْن یا کتاب کی طرف جاتی ہے، یہاں پر الَّذِيْنَ کا اشارہ یہود و نصاریٰ اور اُن تمام لوگوں کی طرف ہے جو ضد اور سرکشی میں آ کر حق و صداقت کو ٹھکرا دیتے ہیں، مِنْۢ بَعْدِ، اس کے بعد، مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ کہ آ گئے ان کے پاس روشن دلائل۔ جَآءَتْهُمُ (جَآءَ تْ.هُمُ) آئے، ان کے پاس، الْبَيِّنٰتُ، دلائل، اس کا مفرد بَيِّنَةٍ، دلیل بَغْيًۢا، بَيْنَهُمْ، سرکشی (کے سبب) جو ان کے درمیان تھی۔ بَغْيًۢا مصدر (بَغَى، يَبْغِيْ، بَغْيًا) سرکشی اختیار کرنا، گویا احکام الٰہی میں کوئی مشکل اور پیچیدگی نہ تھی، مگر حسد اور حرص جو ان میں پنپ رہے تھے ان روحانی امراض نے انہیں فکر مستقیم سے دور لے جا پھینکا تھا۔

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ﴾

پس ہدایت دی اللہ نے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے (انبیاء پر) اور اپنے اِذن (فضل) سے ان اختلافی امور میں انہیں حق کا راستہ دکھا دیا۔

فَهَدَى اللّٰهُ، پس اللہ نے ہدایت دی، فَهَدَى (فَ.هَدَى) پس، اس نے ہدایت دی (هَدَى، يَهْدِي، هِدَايَةً) ہدایت دینا، الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ان لوگوں کو جو ایمان لائے۔ لِمَا اخْتَلَفُوْا اس بات میں جس میں انہوں نے اختلاف کیا۔ لِمَا (لِ.مَا) اس کے لیے جس میں، اخْتَلَفُوْا انہوں نے اختلاف کیا، فِيْهِ (فِيْ.هِ) میں۔ اُس، اس کتاب یا دین میں، هِ کی ضمیر کتاب یا دین کی طرف جاتی ہے۔ مِنَ الْحَقِّ حق سے، صداقت سے، بِاِذْنِهٖ، (ب. اذن.هِ) ساتھ، حکم، اپنے کے، اذن کے لفظی معنی حکم، اجازت، مراد یہاں پر فضل اور رحمت ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل اور اپنی رحمت سے اہل ایمان کو سیدھے راستے کی ہدایت سے بہرہ ور فرمایا۔

﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

اور اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف۔

سید مودودی لکھتے ہیں: ''ناواقف لوگ جب اپنے قیاس وگمان کی بنیاد پر ''مذہب'' کی تاریخ مرتب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرک کی تاریکیوں سے کی، پھر تدریجی اِرتقا کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی اور روشنی بڑھتی گئی یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ قرآن اِس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا اس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کون سا ہے، اس کے بعد ایک مدت تک نسل آدم راہ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی رہی، پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے، اس وجہ سے نہیں کہ ان کو حقیقت نہیں بتائی گئی تھی، بلکہ اس وجہ سے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر اختیارات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے پر ظلم، سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہشمند تھے، اس خرابی کو دور کرنے کے لیے، اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا، یہ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بنا ڈالے اور اپنی ایک نئی امت بنالے بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اس کھوئی ہوئی راہ حق کو واضح کر کے انہیں پھر سے ایک امت بنا دیں۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) نسل انسانی آغاز فطرت میں دینی حیثیت سے ایک ہی امت تھی، مُرورِ زمانہ اور آبادی کے پھلنے

پھولنے سے ان کے درمیان حسد و رقابت، انانیت اور غرور نے جنم لیا اور شیطانی وساوس کو ان کے اندر نفوذ کرنے کا موقع مل گیا اس چیز نے انہیں راہ حق سے دور کر دیا۔

۲) انبیائے کرام وہ نفوس قدسیہ ہیں جو بھٹکے ہوئے انسانوں کو ان کا کھویا ہوا شرف دلانے کے لیے ہر دور اور ہر علاقے میں تشریف لاتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں کتاب ہدایت بھی عطا کی جاتی رہی کہ بھٹکے ہوئے انسانوں کو حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔ تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو سنوار سکیں تا آنکہ خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری اور ابدی کتابِ ہدایت ''قرآن حکیم'' کی شکل میں عطا کی گئی، جس نے حق وصداقت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

۳) لوگوں میں اختلاف اور نزاع کا باعث آپس کی ضد اور نفسانیت رہی نہ کہ احکام الٰہی جو کہ روز روشن کی طرح واضح تھے۔

۴) رب کریم کی مشیتِ ہدایت ہمیشہ ان لوگوں سے متعلق ہو جاتی ہے جو اُس کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں اور ضد و تعصب کو چھوڑ کر تلاش حق کا جذبہ رکھتے ہیں، انہیں رحمت الٰہی کا مضبوط سہارا مل جاتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ، مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ، اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (۲۱۴)	پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ (محض ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے جبکہ ابھی تمھیں وہ مصائب پیش ہی نہیں آئے جو تم سے پہلے ایمان والوں کو پیش آئے تھے، ان پر اس قدر سختیاں اور مصیبتیں آئیں کہ انہیں ہلا کے رکھ دیا گیا حتی کہ (اس وقت) رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے سب پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں! اللہ کی مدد قریب ہے۔

﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ﴾ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو گے۔

اَمۡ، کیا، کلمہ استفہام، حَسِبۡتُمۡ، گمان کیا تم نے (سمجھا تم نے) ماضی جمع مذکر مخاطب (حَسِبَ، یَحۡسِبُ، حِسۡبَانٌ) گمان کرنا، خیال کرنا، اَنۡ، کہ، تَدۡخُلُوا، تم داخل ہو گے، مضارع جمع مذکر مخاطب (دَخَلَ، یَدۡخُلُ، دَخۡوۡلًا) داخل ہونا، الۡجَنَّةَ جنت میں، خطاب اہل ایمان سے (کہ بغیر مشقت اور بغیر امتحان، اے گروہ مومنین!) تم جنت میں کیسے جا سکتے ہو؟

﴿وَلَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ﴾

اور ابھی نہیں آئی تم پر مثال ان لوگوں کی جو گزرے تم سے پہلے۔

وَلَمَّا (وَ. لَمَّا) لام تاکید کے لیے اور مانفی کے لیے، ابھی تک نہیں، یَاۡتِکُمۡ (یَاۡتِ. کُمۡ) آئی، تم پر، مَّثَلُ، مثال (حالت)، الَّذِیۡنَ ان لوگوں کی، اسم موصول، یعنی اہل ایمان کی، خَلَوۡا (کہ) گزرے، ماضی جمع مذکر غائب (خَلَا، یَخۡلُوۡا، خُلُوٌّ) گزرنا، مِنۡ قَبۡلِکُمۡ، تم سے قبل (قَبۡلِ. کُمۡ) قبل۔ تم سے یعنی جیسے تم سے پہلے اہل ایمان پر جو مصائب اور تکالیف آئیں، ابھی تک ویسی تکالیف اور مصائب تم پر نہیں آئے۔

﴿مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ﴾ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف۔

مَسَّتۡهُمُ (مَسَّتۡ. هُمۡ) پہنچی، انہیں (مومنوں کو) الۡبَاۡسَآءُ اس کا مادہ بُؤۡسٌ ہے۔

امام راغب لکھتے ہیں:

''بُؤۡسٌ یہ لفظ زیادہ تر فقر و فاقہ اور لڑائی کی سختی پر بولا جاتا ہے، الۡبَأۡسُ وَالۡبَأۡسَاءُ جسمانی زخم اور نقصان کے لیے آتا ہے۔'' (مفردات القرآن)

وَالضَّرَّآءُ (ضرر) تکلیف، نقصان، قحط اور جان و مال کا نقصان ہے۔ ضرر کا لفظ اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ گویا کہ الۡبَاۡسَآءُ و الضَّرَّآءُ دونوں لفظوں میں زندگی کی سختیوں اور تلخیوں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے، یہ زندگی پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں سے عبارت ہے۔

﴿وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ﴾

اور وہ ہلا ڈالے گئے یہاں تک کہ کہا رسول نے اور ان لوگوں نے جو ایمان لائے ساتھ اس (رسول) کے کب آئے گی اللہ کی مدد؟

وَزُلْزِلُوْا، اور وہ ہلا ڈالے گئے، ماضی مجہول جمع مذکر غائب (زَلْزَلَ، يُزَلْزِلُ، زِلْزَالًا) ہلا ڈالنا، جھٹکے دینا، اردو میں بھی زلزلہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، حَتّٰى یہاں تک کہ يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ کہا رسول نے، اس وقت کے رسول نے، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور جو لوگ ایمان لائے تھے، اللہ کے رسول پر مَتٰى کب (ہوگی)؟ کلمہ استفہام، نَصْرُ اللّٰهِ، اللہ کی مدد۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"انبیاء و مومنین کا یہ قول حالتِ اضطرار میں دعا و مناجات کے طور پر تھا نہ کہ یہ بطور اعتراض و شکوہ، آیت میں اشارہ ہے کہ امت محمدی کو بھی ہر قسم کی بلائیں پیش آئیں گی، جیسی اگلی امتوں کو آ چکی ہیں۔"

(تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾ سن لو بلاشبہ اللہ کی مدد قریب ہے۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

"غزوہ احزاب میں جب مسلمانوں کے خلاف عرب کی تمام قومیں جمع ہو کر چڑھ آئیں اور اسلام کفر کے عین درمیان گھر گیا تو اس وقت بعض کمزور دل مسلمان گھبرا گئے، منافقین کو موقع ملا اور انہوں نے ان کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی ٹھانی اور کہا کہ دیکھو، اگر محمد ﷺ سچے ہوتے تو آج اس طرح کیونکر کفار کے نرغے میں پھنس جاتے، اس پر یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی جس سے دِل مضبوط ہو گئے اور نورِ یقین سے جگمگا اٹھے اور منافقین کا پھیلایا ہوا ہر نگِ زمیں جال تار تار ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اتنی سی آزمائش میں گھبرا گئے ہو، ہم تک پہنچنے کے لیے کس قدر مصائب جھیلنا پڑتے ہیں، تم سے پہلی قوموں نے کیا کیا دکھ اٹھائے؟ کیا کیا سختیاں برداشت کیں؟ جانتے ہو ان پر مصائب و حوادث کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، انہیں دار پر کھینچا گیا، انہیں زندہ جلایا گیا، انہیں تنگدستی و افلاس کے ہولناک ادوار سے گزرنا پڑا، پھر بھی ایمان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، مصیبتیں اس قدر آئیں کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے، ابتلا و آزمائش کی سخت گھڑیوں میں ان کے پاؤں نہیں جمتے تھے، رسول جو پیکر صبر و عزیمت ہوتے ہیں، چلا اٹھے کہ متٰی

نَصْرُ اللّٰہِ؟ اے اللہ! کب مدد پہنچے گی؟ جب جا کر اللہ نے ان کی سنی اور نصرت واعانت سے انہیں نوازا اور تم ہو کہ یونہی گھبرا گئے ہو۔

یہ قاعدہ ہے کہ مقصد یا نصب العین جس قدر بلند اور عظیم ہوگا، اس کا حصول اسی قدر کٹھن ہوگا، اللہ کی رضا، اس کی خوشی جس پر ہماری تمہاری مسرتیں قربان ہیں، کتنا بلند مقصد ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کا حصول بھی مشکل ہو، اس آیہ مبارکہ میں یہی بتایا گیا ہے کہ راہ کی دشواریوں سے سالک (اِس راہ پر چلنے والا) گھبرا نہ جائے، راستے میں قدم قدم پر ابتلاء و آزمائش کے کانٹے بچھے ہیں، سب سے الجھنا ہوگا، چپہ چپہ اور گوشے گوشے میں حرص و آز کے جال بچھے ہیں جن سے ایک دم دامن بچا کے نکل جانا ہوگا اور یہ کہنا ہوگا:

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

(سراج البیان، جلد اول)

آیہ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) راہ حق کے مسافروں کا مصائب و آلام سے گزرنا لازمی امر ہے، اس کے لیے ہر قسم کی جانی و مالی قربانیاں دینی ہوں گی، اسی کے صلہ میں اللہ تعالیٰ کی جنت ہے۔

۲) اس آیہ مبارکہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حق کی سربلندی کے لیے ایمان کے ساتھ مسلسل اور پیہم جدوجہد ضروری ہے، اس سلسلہ میں کٹھن اور مشکل مراحل بھی پیش آئیں گے جیسا کہ سورہ عنکبوت میں فرمایا: ''کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ''ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب اہل ایمان کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں، اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں۔'' (عنکبوت ۲۹:۲، ۳)

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ، وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲۱۵) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ، وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ، وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۱۶)	لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ اُن سے کہیے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو، وہ والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے۔ اور بھلائی کا جو کام بھی تم کرو گے، اللہ اسے خوب جانتا ہے، تم پر قتال فرض کر دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے، اور یہ عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی چیز کو تم پسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بُری ہو اور (یہ حقیقت ہے) کہ اللہ بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔

﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ سوال کرتے ہیں آپؐ سے کہ وہ کیا خرچ کریں۔

يَسْئَلُوْنَكَ (يَسْئَلُوْنَ.كَ) وہ سوال کرتے۔ آپؐ سے (سَاَلَ، يَسْأَلُ، سُؤَالًا) سوال کرنا، پوچھنا، مَاذَا، کیا، يُنْفِقُوْنَ، وہ خرچ کریں، فعل مضارع جمع مذکر غائب (اَنْفَقَ، يُنْفِقُ، اِنْفَاقٌ) خرچ، انفاق فی سبیل اللہ، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''سوال مسلمانوں کی طرف سے تھا اور اس باب میں تھا کہ اپنی حسبِ ہمت وحیثیت اور خوشدلی سے کب خرچ کریں، باقی خرچ جو کہ فرض ہو چکا تھا یعنی زکوٰۃ، اس کا حساب کھلا ہوا تھا سوال اس کی بابت نہ تھا۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾

کہہ دیجئے جو خرچ کرو مال میں سے تو وہ ہے والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے۔

قُلْ کہہ دیجئے فعل امر واحد مذکر (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا مَا، جو، موصول، اَنْفَقْتُمْ خرچ کیا تم نے فعل ماضی جمع مذکر حاضر، مِّنْ خَيْرٍ، مال میں سے، خیر کے لفظی معنی نیکی اور بھلائی کے ہیں، پاکیزہ مال کو بھی خیر کہا جاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''مصارف خیر کی یہ فہرست کیسی جامع اور اس کی ترتیب کس قدر حکیمانہ ہے سب سے بڑھا ہوا اور اہم ترین حق انسان کے ماں باپ کا ہے، جتنی بھی مالی خدمت ہو سکے ان کی کی جائے، پھر دوسرے عزیزوں (رشتہ داروں) کا نمبر ہے اور اس میں بھائی بہن چچا پھوپھی وغیرہ سب آ گئے۔ شریعت نے اپنے نظام میں خاندان کو جو مرکزی اہمیت دی ہے، اس پر یہ ایک اور دلیل ہے..... پھر امت کے وہ فرزند ہیں، جو معاش کے سب سے بڑے ظاہری سہارے یعنی شفیق باپ کے سائے سے محروم ہو چکے ہیں، پھر وہ اللہ کے بندے ہیں، جن پر کسی طبعی معذوری کی وجہ سے یا اور کسی خارجی سبب سے معاش کے عام ذریعے بند یا قریباً بند ہو چکے ہیں اور اپنی ضرورتوں کے پوری ہونے کے لیے بیرونی امداد کے محتاج ہیں اور آخر میں وہ عام انسان آتے ہیں جو اپنے وطن سے علیحدہ ہونے کے باعث عارضی طور پر احتیاج یا تنگدستی میں مبتلا ہیں۔ قریبی اور دور کے حقدار اور ملی رشتہ رکھنے والے سب کے سب اپنی اپنی جگہ کس خوبصورتی سے ایک فریم کے اندر ''فٹ'' ہو گئے، مقصود شریعت کا یہ ہرگز نہیں کہ پڑوس میں ہمارا بھائی بھوک سے تڑپ رہا ہو اور ہم اس سے بے خبر چندہ لکھوا رہے ہوں چینی ریلیف فنڈ میں!'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾

اور جو کچھ تم کرو گے بھلائی سے تو اللہ تعالیٰ اُسے خوب جانتا ہے۔

وَمَا اور جو کچھ تَفْعَلُوْا تم کرو گے، مضارع جمع مذکر حاضر (فَعَلَ، يَفْعَلُ، فِعْلًا) کرنا، مِنْ خَيْرٍ، خیر

سے (مالی خدمت سے) فَاِنَّ اللّٰهَ، تو یقیناً اللہ تعالیٰ بِهٖ، ساتھ اُس خیر کے عَلِيْمٌ (علم رکھنے والا) یعنی اس نیکی کے کام کو جاننے والا ہے۔ اس کا علم اس قدر وسیع اور احاطہ کیے ہوئے ہے کہ ذرہ بھر نیکی بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزِّلزال:۹۹/۷،۸) ''پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔''

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾

فرض کر دیا گیا تمہارے لیے قتال اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔

كُتِبَ، فعل ماضی مجہول (كَتَبَ، يَكْتُبُ، كِتَابًا) لکھنا، فرض قرار دینا، اَلْقِتَالُ اللہ کی راہ میں لڑنا (قَتَلَ، يَقْتُلُ، قِتَالًا)، مسلمان صرف رضائے الٰہی کے لیے لڑتا ہے کہ اللہ کے دین کو سربلند کر کے نظام حق کو قائم کرے اور فتنہ وفساد کو ختم کرے۔ وَهُوَ اور وہ یعنی قِتَال (جہاد) كُرْهٌ، ناگوار، ناپسند لَكُمْ(لَ. كُمْ) لیے، تمہارے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''جیسا کہ بالکل قدرتی اور طبعی ہے، اپنی جان کس کو عزیز نہیں ہوتی اور اپنی جان خطرہ میں ڈالتے ہوئے ہر جاندار قدرتاً ہچکچاتا ہے، پھر مکہ کے غریب مہاجرین جو ابھی ترک وطن کر کے مدینہ میں آ کر پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے، روپیہ پیسہ میں، ساز وسامان میں، تعداد میں، غرض مادی اعتبار سے کسی معنی میں بھی اپنے حریفوں کے مدمقابل نہ تھے، ان شکستہ دلوں، شکستہ بازوؤں کو حکم جنگ وقتال پا کر اگر طبعی گرانی محسوس ہوئی تو یہ ان کے مرتبۂ اِخلاص اور قوتِ ایمان کے ذرا بھی منافی نہیں۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾

اور شاید کہ تم ناپسند کرو کسی چیز کو اور وہ بہتر ہو تمہارے واسطے۔

وَعَسٰٓى اور شاید کہ (ممکن ہے کہ) اَنْ، یہ کہ تَكْرَهُوْا تم نہ پسند کرو، فعل مضارع جمع مذکر حاضر (كَرَهَ، يَكْرَهُ، كُرْهًا) نفرت کرنا، ناپسند کرنا، کراہت، ناپسندیدگی، اردو میں استعمال ہوتا ہے، شَيْـًٔا کسی

چیز کو، کسی بات کو، وَ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ، اور وہ بہتر ہو تمہارے لیے۔

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ﴾

اور ممکن ہے کہ تم پسند کرو کسی چیز کو اور وہ بُری ہو تمہارے واسطے۔

وَعَسٰی اور شاید، اَنْ، یہ کہ، تُحِبُّوْا، پسند کرو (اَحَبَّ، یُحِبُّ، حُبًّا) پسند کرنا، چاہنا، وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ، اور وہ تمہارے لیے شرّ ہو (باعث خرابی ہو)

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔

''اللہ ہی کا علم کامل اور ظاہر و باطن ہر پہلو کو محیط ہے اس لیے اُس کے احکام، ہمیشہ بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں، انسانی علم اس کے برخلاف کسی چیز کا بھی کامل و جامع نہیں ہوتا، اس لیے خود انسان کی واقفیت و مصلحت اسی میں ہے کہ احکام الٰہی کی تعمیل بے چون و چرا کر لیا کرے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

آیات مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو مال و دولت سے نوازا ہو، تو وہ خالق و مالک کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اس مال میں سے والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرے، اس سے اُس کے دِل میں ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات پیدا ہوں گے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار بن جائے گا جس سے وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ابدی جنت کا حقدار ٹھہرے گا۔

(۲) ظلم و ستم اور فتنہ و فساد کو نابود کرنا مسلمان کی زندگی کا اہم مشن ہے اس راہ میں وہ اپنے جان و مال کو کھپاتا ہے، بظاہر جان و مال کا نقصان نظر آتا ہے، مگر اس کے نتیجہ میں جو امن اور انصاف قائم ہوتا ہے اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں جو اجر و ثواب ثبت ہو جاتا ہے وہ تو ابدی ہوتا ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ، قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ، وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ، وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ، وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا، وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ، هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۱۷)

''لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہیے کہ اس میں لڑنا بہت برا ہے (مگر) اللہ کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام میں نہ جانے دینا اور مکہ میں بسنے والوں کو وہاں سے نکالنا اس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ انگیزی تو قتل وخونریزی سے بھی بدتر چیز ہے، اور یہ لوگ تو ہمیشہ تم سے لڑتے ہی رہیں گے حتیٰ کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں (اور یہ خوب سمجھ لو کہ) تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا، اس کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے، ایسے ہی لوگ ہیں جن کا گروہ دوزخی گروہ ہے، ہمیشہ عذاب میں رہنے والا ہے۔''

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ﴾

سوال کرتے ہیں آپؐ سے کہ حرمت والے مہینے میں لڑنا کیسا ہے؟

يَسْئَلُوْنَكَ آپؐ سے پوچھتے ہیں، (يَسْئَلُوْنَ.كَ) وہ سوال کرتے ہیں آپؐ سے، مضارع جمع مذکر غائب، ک، ضمیر واحد مذکر مخاطب، عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ، حرمت والے مہینے کے بارے میں، قِتَالٍ فِيْهِ، لڑنا، قتال کرنا اس میں (کیسا ہے؟) فِيْ.هِ، اس میں (هٖ) کی ضمیر مہینے کی طرف جاتی ہے۔ رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم حرمت والے مہینے ہیں جمادی الثانی ۲ ہجری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلومات

کی غرض سے ایک دستہ وادی نخلہ کی طرف بھیجا (مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام ہے) انہوں نے ایک تجارتی قافلہ پر حملہ کر کے ایک شخص کو قتل کر دیا اور باقی لوگوں کو گرفتار کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ یہ قتل ۲ رجب کو ہوا جبکہ انہیں غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے ۳۰ جمادی الثانی سمجھا (اس جھڑپ میں جو کچھ ہوا وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر ہوا اور اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اسلامی جماعت کے چند آدمیوں سے ایک غیر ذمہ دارانہ فعل کا ارتکاب ہو گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مسلمانوں نے اس حرکت کی سخت مذمت فرمائی) اس کے باوجود مشرکین نے طوفان کھڑا کر دیا کہ یہ بڑے اللہ والے بنتے ہیں مگر حرمت والے مہینوں میں بھی خون خرابے سے باز نہیں آتے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جواب دیا کہ حرمت والے مہینہ میں قتل یقیناً گناہ ہے مگر تمہارے کرتوت تو اس سے بھی بڑھ کر ہیں، کفر و شرک بذاتِ خود بہت بڑا گناہ ہے۔ (تیسیر القرآن)

﴿قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ﴾ کہیے کہ لڑائی کرنا اس (مہینے) میں بڑا گناہ ہے۔

قُلْ کہیے فعل امر واحد مذکر (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، قِتَالٌ، مصدر، لڑائی، فِيْهِ (فِيْ.هِ) اِس، میں ہ کی ضمیر مہینے کی طرف جاتی ہے یعنی شھر الحرام میں، كَبِيْرٌ، بڑا گناہ ہے۔

﴿وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ ۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾

اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام (سے روکنا) اور وہاں کے رہنے والوں کو نکالنا اُس سے بھی بڑا گناہ ہے اللہ کے نزدیک۔

وَصَدٌّ، روکنا مصدر ہے اس سے فعل (صَدَّ، يَصُدُّ، صَدًّا) روکنا، آڑے آنا، عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اللہ کی راہ سے، وَكُفْرٌ ۢ بِهٖ اور کفر کرنا ساتھ اُس کے، بِهٖ (بِ.هٖ) ساتھ، اُس کے ہٖ کی ضمیر اللہ کی طرف جاتی ہے۔ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور مسجد حرام (حرمت والے گھر میں جانے سے منع کرنا) وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ اور نکالنا اس کے باسیوں کو، اِخْرَاجٌ، مصدر (اَخْرَجَ، يُخْرِجُ، اِخْرَاجًا) نکالنا، اَهْلِهٖ (اَهْلِ.هٖ) رہنے والے، اس جگہ کے اہل ایمان کو مسجد الحرام کا 'اہل' کہا گیا ہے، اس لیے کہ فی الحقیقت اہل ایمان ہی اس کے

حقوق کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہٖ کی ضمیر مسجد الحرام کی طرف جاتی ہے۔ مِنْهُ (مِنْ. هُ) اُس۔ سے یعنی مسجد الحرام سے، یہاں بھی ہ کی ضمیر مسجد الحرام کی طرف ہے، اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ، اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے (یعنی شہر الحرام میں قتال سے بھی بڑا جرم ہے) اور کفار مکہ نے مسلمانوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا اس میں یہ ساری باتیں آجاتی ہیں۔

﴿وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ اور فتنہ انگیزی تو قتل وخونریزی سے بھی بدتر چیز ہے۔

وَالْفِتْنَةُ اور فتنہ وفساد (پیدا کرنا) بڑا گناہ ہے، مِنَ الْقَتْلِ، قتل وخون ریزی سے، اس لیے کہ یہ معاشرتی زندگی کے امن وسکون کو برباد کرڈالتا ہے۔

﴿وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا﴾

اور نہیں رکیں گے وہ تم سے لڑنے میں یہاں تک کہ پھیر دیں تم کو، تمہارے دین سے اگر ان کا بس چلے۔

وَلَا يَزَالُوْنَ اور وہ نہیں زائل ہوں گے، نہیں رکیں گے، لَا کلمہ نفی، يَزَالُوْنَ، زائل ہوں گے مضارع جمع مذکر غائب (زَالَ، يَزَالُ، زَوَالًا) زائل ہونا دور ہونا، کم ہونا جیسا کہ کہتے ہیں کہ بخار کے اثرات زائل ہورہے ہیں یہ لفظ اردو میں استعمال ہوتا ہے، يُقَاتِلُوْنَكُمْ (يُقَاتِلُوْنَ. كُمْ) لڑائی کرتے رہیں گے۔ تم سے (قَاتَلَ، يُقَاتِلُ، مُقَاتَلَةٌ) جنگ کرنا، حَتّٰى یہاں تک کہ، يَرُدُّوْكُمْ (يَرُدُّوْ. كُمْ) لوٹائیں۔ تمہیں، (رَدَّ، يَرُدُّ، رَدًّا) لوٹانا، واپس کرنا، عَنْ دِيْنِكُمْ، عَنْ۔ سے (دِيْنِ. كُمْ) دین تمہارا۔ اِنِ اسْتَطَاعُوْا، اگر وہ استطاعت رکھیں (اگر ان کا بس چلے) اِنْ اگر، شرطیہ ہے، اِسْتَطَاعُوْا، وہ استطاعت رکھیں، فعل ماضی جمع مذکر غائب، (اِسْتَطَاعَ، يَسْتَطِيْعُ، اِسْتِطَاعَةٌ) باب استفعال، کوئی کام کرنے کی استطاعت رکھنا، طاقت رکھنا۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

"مکہ کے مشرک مسلمانوں کی دشمنی میں بڑھے ہوئے تھے، وہ اس بات پر مصر تھے کہ جہاں تک ان کا بس چلے، ہر ممکن طاقت اور ہر تدبیر استعمال کر کے مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیر دیں، انہیں اسلام قبول

کرنے سے روکیں، انہیں پرانے اور باطل عقیدوں کے ماننے پر مجبور کریں اور بت پرستی پر قائم رکھیں۔''

(درس قرآن، جلد اول)

﴿وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ، هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

(اور یہ خوب سمجھ لو کہ) تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں مر جائے گا، اس کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے، ایسے ہی لوگ ہیں جن کا گروہ دوزخی گروہ ہے، وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والا ہے۔

وَمَنْ اور جو کوئی، مَنْ، اسم موصول يَرْتَدِدْ مرتد ہو جائے گا (اپنے دین سے پھر جائے گا) مضارع واحد مذکر غائب (اِرْتَدَّ، يَرْتَدُّ، اِرْتِدَادٌ) باب افتعال مرتد ہونا، اپنے دین کو چھوڑنا، اسلام قبول کر کے کفر کی طرف پلٹنا، مِنْكُمْ، تم میں سے، یعنی مسلمانوں میں سے، عَنْ دِيْنِهٖ اپنے دین سے (دِيْنٌ۔ہ) دین اپنے سے یعنی دین اسلام سے، فَيَمُتْ (فَ۔يَمُتْ) پس، وہ مرتا ہے (اِس حال میں) وَهُوَ اور وہ ہے كَافِرٌ کافر، کفر کی حالت میں ہے، فَاُولٰٓئِكَ تو یہی لوگ ہیں، اسم اشارہ جمع مذکر بعید، حَبِطَتْ، ضائع ہو گئے، اَعْمَالُهُمْ (اَعْمَالُ۔هُمْ) اعمال، ان کے، فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، دنیا اور آخرت میں، وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ، پس، یہی لوگ ہیں، ساتھی آگ کے، وَاُولٰٓئِكَ یہی لوگ ہیں اسم اشارہ بعید جمع مذکر، اَصْحٰبُ النَّارِ، ساتھی آگ کے (آگ والے) اَصْحَابُ مفرد صَاحِبٌ ساتھی، النَّارِ، آگ۔ هُمْ وہ (کافر، ارتداد کا شکار ہونے والے) فِيْهَا (فِيْ۔هَا) اس میں هَا کی ضمیر آگ کی طرف جاتی ہے، خٰلِدُوْنَ (اسم فاعل جمع مذکر، ہمیشہ رہنے والے (خَلَدَ، يَخْلُدُ، خُلُوْدٌ) ہمیشہ رہنا سہنا، اسم فاعل خَالِدٌ اس کی جمع خالِدُوْن ہے۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''اس آیت میں تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر کوئی مسلمان، کافروں کے زیر اثر خواہ ڈر کر خواہ کسی لالچ میں آ کر اسلام چھوڑ کر کفر کی طرف لوٹ جائے گا اور مرتے دم تک کفر ہی پر اڑا رہے گا، تو اس کے تمام عمل ضائع ہو جائیں گے، اُسے دنیا میں بھی سزا بھگتنی پڑے گی اور قیامت میں بھی۔'' (درس قرآن)

اسلام سے پھر کر کفر کی طرف لوٹ جانے والے کی سزا دنیا میں یہ ہوگی کہ اس کا جان و مال محفوظ نہ رہے گا۔ مسلمان بیوی سے اس کا نکاح قائم نہ رہ سکے گا، مسلمان کی میراث سے اسے حصہ نہ مل سکے گا، بلکہ یہاں تک کہ اگر حکومت اسلامی ہو تو ایسے بدعہد، باغی اور مرتد کو زندہ رہنے کا بھی حق باقی نہیں رہتا۔

آخرت میں اسے یہ سزا ملے گی، کہ وہ اپنے اجر و ثواب سے محروم رہے گا، جس قدر نیکیاں اور عبادتیں دنیا میں کی ہوں گی ان کا بدلہ نہیں ملے گا، دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ اُسی میں ہمیشہ جلتا رہے گا اور ہر طرح سے نقصان اٹھائے گا۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) قتل و خونریزی یقیناً بُرا عمل ہے اور فتنہ و فساد پھیلانا، امن اور سلامتی کو تہ و بالا کرنا اور لوگوں کو راہِ حق سے روکنا، اس سے بھی برا عمل ہے۔

۲) مخالفین اسلام ہمیشہ بغض و عداوت کا اظہار کرتے رہیں گے اور ان کی برابر یہ کوشش رہے گی کہ تم کو دین حق سے برگشتہ کر دیں، اس لیے مسلمانوں کو ایسے لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر قسم کے جہاد کے لیے کمر بستہ رہنا ضروری ہے..... قلم اور زبان کے ذریعہ جہاد، مال اور جان سے جہاد، شیطان اور نفس سے جہاد، یہی کامیابی کا راز ہے اور اللہ کی رحمت واسعہ کے صرف وہی لوگ امیدوار ہو سکتے ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ کو اپنی زندگی کا مقصد وحید بنالیں۔

۳) اسلام قبول کرنے کے بعد ارتداد کی راہ اختیار کرنا سراسر نقصان کا سودا ہے، اس سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور سزا یقینی بن جاتی ہے۔

۴) ارتداد کے بعد بھی دین حق کی طرف لوٹنے کی مہلت ہے، سزا تو صرف اُسی کے لیے ہے جو کفر کی حالت میں دنیا سے جائے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (۲۱۸)	جولوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی اللہ کی رحمتِ بے پایاں کے امیدوار ہیں اور اللہ اُن کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انہیں نوازنے والا ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ بلاشبہ جولوگ ایمان لائے۔

اِنَّ، کلمہ تحقیق کلام، بلاشبہ، بے شک، اسم کو نصبْ (زبر) اور خبر کو رفع (پیش) دیتا ہے جیسا کہ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَحِیۡمٌ۔ الَّذِیۡنَ جولوگ اسم موصول اس کا مفرد الَّذیْ ہے۔ اٰمَنُوۡا ایمان لائے، فعل ماضی جمع مذکر غائب (اٰمَنَ، یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا) ایمان لانا، تصدیق کرنا، ماننا۔ اصطلاحی معنوں میں اسلامی عقائد اور اسلامی ارکان کو دِل سے تسلیم کرنا اور زبان سے اس کا اظہار کرنا ہے۔

قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیہ مبارکہ سے ایمان کی بنیادی باتوں کا پتہ چلتا ہے:

لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓئِکَةِ وَالۡکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ (البقرہ۲:۱۷۷) ''نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کو قبلہ سمجھ کر ان کی طرف منہ کرلو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور روز آخرت پر اور فرشتوں پر اور اللہ کی کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائیں۔''

یہ پانچ بنیادی باتیں ہیں:

(۱) ایمان باللہ، (۲) ایمان بالآخرہ، (۳) ایمان بالملائکہ،
(۴) ایمان بالکتب، (۵) ایمان بالنبیّین۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

''جب ہم اللہ پر ایمان لے آئے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم زندگی کے مطمح نظر کو پا گئے اور اللہ بزرگ و برتر سے اپنا رشتہ جوڑ لیا جو تمام اقدارِ حیات کا منبع و سرچشمہ ہے، جو ہمہ خیر، ہمہ حسن اور ہمہ خوبی ہے، اس

طرح گویا زندگی کو ایک سانچہ ملا اور ایک راہ متعین ہوئی جو نیکی، جمال اور حسن کی راہ ہے۔

اللّٰہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے یہ معنی بھی ہیں کہ ہمارا احساسِ تنہائی و بیچارگی ختم ہوا اور ہم نے ایک ایسا مضبوط سہارا ڈھونڈ لیا جو نشیب و فرازِ حیات میں ہماری مدد کر سکتا ہے، یہی نہیں جو ہماری ضرورتوں سے آگاہ ہے اور ہماری دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے، جو دکھ درد میں ہمارے زخموں پر پھاہا رکھتا ہے اور مصائب و مشکلات میں ہماری راہنمائی کرتا اور نجات و مخلصی کی راہ سجھاتا ہے۔

ایمان بالآخرت نے ہمیں موت کے ڈر سے آزادی بخشی اور زندگی کے بارے میں یقین دلایا کہ یہ رواں دواں جاودانی ہے، اس عقیدے سے ہم میں احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے کیونکہ اگر آخرت کا تصور صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دن ہمیں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونا اور اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں جواب دہی کرنا ہے۔

ایمان بالملئکۃ کو ماننے سے ہم علت و معلول کے میکانکی چکر سے رہائی حاصل کر لیتے اور یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ دراصل کائنات میں ارادۂ الٰہی کی حکمرانی ہے (اور اس کی اطاعت و بندگی میں لاتعداد مخلوق ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے)

ایمان بالکتٰب سے ہمیں یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ قانون فطرت جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ ہمیں الفاظ و حروف کی صورت میں ایک مدون اور مرتب شکل میں مل جاتا ہے۔

ایمان بالنبیّن کو تسلیم کرنے سے دانش و حکمت کے ان نہایت ہی قیمتی خزائن سے ہم آشنا ہو جاتے ہیں جن سے ہزاروں انبیاء و رسل اپنے اپنے دور میں بہرہ مند رہے۔

ایمان بالرّسُل کے یہ معنی بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے کسی دور میں بھی انسان کو رشد و ہدایت کی برکات سے غافل نہیں رکھا ہے۔'' (لسان القرآن، جلد اول)

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾

اور جنہوں نے ہجرت کی، اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں۔

وَالَّذِيْنَ اور جن لوگوں نے، اسم موصول، **هَاجَرُوْا**، فعل ماضی جمع مذکر غائب (هَاجَرَ، يُهَاجِرُ، مُهَاجَرَةً) ہجرت کرنا، دارالکفر سے دارالایمان میں آنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجر کی تعریف

یوں بھی فرمائی ہے: اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ (صحیح بخاری) جس نے اللہ تعالیٰ کی منع کردہ باتوں کو چھوڑا حقیقی مہاجر وہی ہے۔ وَجٰهَدُوْا اور جہاد کیا ماضی جمع مذکر غائب (جَاهَدَ، يُجَاهِدُ، مُجَاهَدَةً) جہاد کرنا، اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے اس کی راہ میں لڑنا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''جہاد کے معنی ہیں کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دینا، یہ محض جنگ کا ہم معنی نہیں ہے، جنگ کے لیے تو ''قتال'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے، مجاہد وہ شخص ہے جو ہر وقت اپنے مقصد کی دھن میں لگا ہو، دماغ سے اسی کے لیے تدبیریں سوچے، زبان و قلم سے اسی کی تبلیغ کرے، ہاتھ پاؤں سے اسی کے لیے دوڑ دھوپ اور محنت کرے اپنے تمام امکانی وسائل اس کو فروغ دینے میں صرف کر دے اور ہر اس مزاحمت کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آئے حتیٰ کہ جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کرے، اس کا نام ہے ''جہاد'' اور ''جہاد فی سبیل اللہ'' یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے اور اس غرض کے لیے کیا جائے کہ اللہ کا دین اس کی زمین پر قائم ہو اور اللہ کا کلمہ سارے کلموں پر غالب ہو جائے، اس کے سوا اور کوئی غرض مجاہد کے پیش نظر نہ ہو۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ﴾ یہ ہیں وہ لوگ جو امیدوار ہیں اللہ کی رحمت کے۔

اُولٰٓئِكَ اسم اشارہ جمع مذکر، یہی لوگ، يَرْجُوْنَ امیدوار ہیں، فعل مضارع جمع مذکر غائب (رَجَا، يَرْجُوْ، رَجَاء) امید رکھنا، رَحْمَتَ اللّٰهِ، اللہ کی رحمت یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اُس کے فضل کے صرف یہی لوگ امیدوار ہو سکتے ہیں جنہوں نے سربلندیِ دین کے لیے مسلسل اور پیہم جدوجہد جاری رکھی۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

اور اللہ (لغزشوں اور خطاؤں کو) معاف کرنے والا اور (اپنے بندوں کو اپنی) رحمت سے نوازنے والا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''ان صفات کے اثبات سے مقصود مومنین کی مزید تشفّی و بشارت ہے، غَفُوْرٌ، سو وہ اپنی صفت غفوریت

کے تقاضا سے اس سہو وخطا کو معاف کرے گا۔ رَحِیْمٌ سو اپنی صفت رحیمیت کے تقاضا سے اجر بھی مرحمت کرے گا۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) مومن کی پوری زندگی مجاہدہ ہے..... وہ زندگی میں ہر قسم کے جہاد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے..... دینی احکام کے سامنے اپنی خواہشات کو پامال کرنا، قوم اور برادری کی غلط رسومات سے ٹکرانا، شیطانی قوتوں سے نبرد آزما ہونا، حکام وقت کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا یہاں تک کہ اپنی جان ایسی متاع عزیز کو کفار کے مقابلہ میں میدان جہاد میں اللہ تعالیٰ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے پیش کر دینا۔

۲) مسلمانوں کی زندگی کی بقا کا راز صرف ہجرت اور جہاد ہے جب تک وہ اس پر کاربند رہے دنیا میں سرفرازی اور سربلندی ان کے حصے میں آئی اور جب سے انہوں نے اسے چھوڑا ہے، ذلت وخواری ان کا مقدر ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ، قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ، وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا، وَ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، قُلِ الْعَفْوَ، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (۲۱۹)	وہ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں، آپ ان سے کہیے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، (ہاں) لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں، لیکن ان کا گناہ فوائد سے کہیں بڑا ہے نیز آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں، ان سے کہیے جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو (وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دو) اس طرح اللہ تمہارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔

﴿يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾

سوال کرتے ہیں آپ ﷺ سے شراب اور جوئے کے بارے میں۔

يَسْئَلُوْنَکَ (يَسْئَلُوْنَ. کَ) وہ سوال کرتے ہیں۔ آپ ﷺ سے يَسْئَلُوْنَ فعل مضارع جمع مذکر غائب، 'ک'' ضمیر واحد مذکر مخاطب کے لیے استعمال ہوتی ہے، عَنِ الْخَمْرِ شراب کے بارے میں، خمر کے اصلی معنی کسی چیز کو ڈھانپ دینے کے ہیں، عربی میں خِمَارٌ کے معنی اوڑھنی کے ہیں کہ وہ جسم کو ڈھانپ دیتی ہے، اسی سے ہر وہ مشروب جو عقل وفکر کو معطل کر دے اور اس پر پردہ ڈال دے خمر کہلاتا ہے۔

(مفردات القرآن)

وَالْمَيْسِرِ، بھی ایسے ہی وسیع معنی میں ہے اور جوئے کی تمام اقسام پر شامل ہے، كُلُّ شَيءٍ فِيهِ قُمَارٌ فَهُوَ مِنَ الْمَيْسرِ (تاج العروس)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''شراب اور جوا، جس طرح آج فرنگی تہذیب میں جائز ہی نہیں بلکہ عین اس تہذیب کا جزو بنے ہوئے ہیں اور دلیلِ عزت وشرافت ہیں، اسی طرح قدیم عربی تہذیب کا بھی جزو تھے اور لوازمِ شائستگی میں سے سمجھے جاتے تھے اور اکیلے عرب ہی پر موقوف نہیں یہ مشغلے سارے روئے زمین پر پھیلے ہوئے تھے اور ہندی تہذیب، مصری تہذیب، یونانی تہذیب، رومی تہذیب تو خیر خود ہی جاہلی تہذیبیں تھیں، اسرائیلی اور مسیحی تہذیبیں تک، جو شرف رسالت کے تعلق سے مشرف تھیں، ان کی روک تھام نہ کر سکی تھیں۔ شریعت اسلامی ہی دنیا کا وہ قانون ہے جس نے آ کر ان کی قطعی حرمت کا اعلان کیا۔ یہ آیت سلسلہ حرمت کی سب سے پہلی آیت ہے، قطعی حکم بعد کو نازل ہوا، علامہ آلوسی بغدادی صاحب تفسیر روح المعانی نے اس مقام پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ کے فاسقوں نے نشیلے مشروبات کے لیے طرح طرح کے خوشنما نام اور لقب رکھ لیے ہیں، عرق عنبری، ماءالاکسیر وغیرہ، لیکن نام کے بدل دینے سے حقیقت اور حکم شرعی نہیں بدل جایا کرتا، نشہ آور چیزیں بہر حال حرام ہیں۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿قُلْ فِيهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ﴾ کہیے کہ ان دونوں میں گناہ ہے بہت بڑا۔

قُلْ، کہیے فعل امر (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، فِیْهِمَآ (فِیْ.هِمَا) میں، ان دونوں یعنی ان دونوں چیزوں (خمر اور میسر) میں اِثْمٌ، گناہ نیکی میں رکاوٹ پیدا کرنے والے افعال کو اِثْمٌ کہا جاتا ہے۔
(مفردات القرآن)

ان سے نہ صرف صحت اور اخلاق برباد ہوتے ہیں بلکہ بہت سی تباہ کن معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں۔
مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''معاشرہ میں آج تک جتنے فسادات شراب نوشی سے پیدا ہو چکے ہیں، اظہر من الشمس ہیں..... گالیاں یہ بکوائے، بے حیائی یہ پھیلائے، حرام کاری کی طرف یہ لائے، بلوے، دنگے یہ کرادے، چوری ٹھگی پر یہ آمادہ کردے، قتل کی نوبت یہ لے آئے، ہر عبادت سے، طہارت سے، پاکیزہ منشی سے یہ روک دے اور اسراف تو اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں اور قمار بازی (جوئے) کی لائی ہوئی مصیبتیں کچھ کم ہیں؟ فرنگستان کے سب سے بڑے قمار خانہ مونٹے کارلو (Monte Carlu) میں ہر سال کتنی بے شمار دولت تلف ہوتی رہتی ہے، دیوالی اور جمگھٹ کی راتوں کو ہندوستان میں [اور جشن بہاراں اور نئے سال کی آمد پر پاکستان میں] کیا کچھ نہیں ہوتا؟
اور پھر جوئے کی جدید ترین شکلوں، بیمہ کمپنیوں کے جوئے، گھڑ دوڑ کے جوئے، چھٹیوں [لاٹریوں] کے جوئے، [پرائز بانڈز] کے جوئے، سٹے وغیرہ کو کوئی کہاں تک شمار کرے؟'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ اور کچھ منافع بھی ہیں لوگوں کے لیے۔

کاروباری لحاظ سے عارضی دنیا میں چند حقیر سکے مل جاتے ہیں۔ شراب نوشی سے عارضی طور پر بدن میں چستی اور مستعدی پیدا ہو جاتی اور جواء کھیلنے سے کبھی جیتنے کی شکل میں یک دم مال ہاتھ آ جاتا ہے مگر انجام کار ان چیزوں کے صحت اور اخلاق پر جو برے اثرات پڑتے ہیں ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، اس لیے فرمایا:

﴿وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾

اور ان دونوں کا گناہ کہیں بڑا ہے ان دونوں کے فائدے اور نفع سے۔

وَاِثْمُهُمَآ (وَاِثْمُ.هُمَآ) گناہ، ان دونوں کا، هُمَا کی ضمیر خمر اور میسر کی طرف جاتی ہے، اَكْبَرُ زیادہ

بڑا ہے مِنْ سے نَّفْعِهِمَا، (نَّفْعِ.هِمَا) نفع۔ان دونوں کا هُما کی ضمیر خمر اور میسر کی طرف جاتی ہے۔اس لیے شرف انسانیت کا تقاضا ہے کہ گناہ اور نقصان سے بچا جائے۔

﴿وَ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾

اور وہ سوال کرتے ہیں آپ ﷺ سے، کیا خرچ کریں۔

وَ يَسْئَلُوْنَكَ (يَسْئَلُوْنَ.كَ) وہ سوال کرتے ہیں۔آپ سے يَسْئَلُوْنَ مضارع جمع مذکر غائب، ک ضمیر واحد مذکر حاضر، مَاذَا. کیا، کلمۂ استفہام، يُنْفِقُوْنَ، خرچ کریں، فعل مضارع جمع مذکر غائب (اَنْفَقَ، يُنْفِقُ، اِنْفَاقٌ) خرچ کرنا، اِنْفَاق فی سبیل اللہ، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

فرض زکوٰۃ کی تو شرح متعین تھی، یہ سوال اس کے علاوہ دوسرے نیک کاموں سے متعلق تھا۔

﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ فرما دیجئے، حاجت سے زائد مال (خرچ کر سکتے ہو)

قُلْ کہہ دیجئے فعل امر واحد مذکر (قَالَ، يَقُوْل، قَوْلًا) کہنا الْعَفْوَ، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

الْعَفْوَ مَا يَسْهَلُ اِنْفَاقُهٗ (مفردات القرآن) ''عفو' ایسے مال کو کہتے ہیں جس کا خرچ کرنا آسان ہو (اور انسان کسی طرح تنگدست نہ ہو)۔''

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ﴾

اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لیے نشانیاں تا کہ تم غور و فکر کرو۔

كَذٰلِكَ اسی طرح، يُبَيِّنُ اللّٰهُ بیان کرتا ہے، اللہ تعالیٰ، لَكُمْ واسطے تمہارے، الْاٰيٰتِ نشانیاں ہے، اس کا مفرد آيَةٌ، نشانی لَعَلَّكُمْ (لَعَلَّ.كُمْ) شاید، تم تَتَفَكَّرُوْنَ تم غور و فکر کرو (تَفَكَّر، يَتَفَكَّرُ، تَفَكُّراً) غور کرنا۔

احکامِ الٰہی اور آیاتِ الٰہی پر غور و فکر کیا کرو، وہ احکم الحاکمین کتنا ہمدرد، مہربان، مشفق اور محسن ہے۔وہ ہمیشہ تمہارے بھلے اور فائدے کے لیے تمہیں ہدایات سے نوازتا رہتا ہے اور وہ تمہاری دنیا و آخرت کو سنوارنا چاہتا ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اسلام ایک پاکیزہ معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے، روحانی واخلاقی اقدار کا پابند بناتا ہے اور جن باتوں سے صحت واخلاق میں بگاڑ پیدا ہو اُن سے منع کرتا ہے۔

۲) شراب سے عقل ماؤف ہوتی ہے اور جوئے سے مال برباد ہوتا ہے، ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ جو قوم عقل وفکر سے عاری اور مال ودولت سے تہی دامن ہو جائے کیا وہ شرف انسانیت کو ضائع نہ کر دے گی؟ اس وقت ذرا مغربی اقوام خاص طور امریکہ کے ہوش وحواس کا اندازہ لگائیے کہ اپنے جنون میں ناحق مسلمانوں کا خون بہا رہا ہے۔ اس میں بڑا دخل بادہ نوشی کو بھی ہے۔

۳) اسلام نے سکون وسلامتی سے ہمکنار ہونے کے لیے انفاق فی سبیل اللہ کی راہ بتائی ہے، غربا و مساکین، بیوگان اور یتامیٰ کی مدد اور ہمدردی دنیا وآخرت کی فلاح کا راستہ ہے اور اس خرچ میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ جب اور جتنا کوئی چاہے خرچ کر سکتا ہے۔ البتہ اپنی ضروریات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ فاقوں اور بھیک مانگنے سے بچا جا سکے۔

۴) قرآن حکیم کی آیات پیغام غور وفکر دیتی ہیں اور اس سے عقلمند ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ، وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡیَتٰمٰی، قُلۡ اِصۡلَاحٌ لَّهُمۡ خَیۡرٌ، وَاِنۡ تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ، وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ، وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعۡنَتَکُمۡ، اِنَّ اللّٰهَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ (۲۲۰)	(اللہ اپنے احکام کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم) دنیا اور آخرت کے معاملہ میں غور وفکر کرو۔ اور وہ آپ سے یتامیٰ کے بارے میں پوچھتے ہیں، اُن سے کہیے کہ اُن کی اصلاح (کو پیش نظر رکھنا) بہتر ہے، اور اگر تم ان سے مل جل کر رہو سہو تو آخر وہ تمہارے بھائی بند ہی تو ہیں، اور اللہ فساد کرنے والے کو بھی جانتا ہے اور اصلاح کرنے والے کو بھی، اللہ چاہتا تو (یتامیٰ کے) اس معاملے میں تم پر سختی کرتا، کیونکہ اللہ صاحبِ اختیار بھی ہے صاحبِ حکمت بھی ہے۔

﴿فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ﴾ دنیااور آخرت میں۔
یعنی احکام الٰہی پر عمل کرنا تمہیں دنیا میں سربلند اور آخرت میں سرخرو کرے گا۔

﴿وَ یَسۡئَلُوۡنَکَ عَنِ الۡیَتٰمٰی﴾ اور سوال کرتے ہیں آپ سے یتامیٰ کے بارے میں۔
وَ یَسۡئَلُوۡنَکَ (یَسۡئَلُوۡنَ. کَ) وہ سوال کرتے ہیں آپ سے یَسۡئَلُوۡنَ، مضارع جمع مذکر غائب (سَأَلَ، یَسۡأَلُ، سُؤَالًا) سوال کرنا، ک ضمیر واحد مذکر حاضر آپ سے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، عَنِ الۡیَتٰمٰی یتامیٰ کے بارے میں، الۡیتامٰی یتیم کی جمع ہے۔ اَلیَتیم کا مصدر الۡیُتۡم ہے جس کے معنی نابالغ بچہ کے شفقت پدری سے محروم ہوجانے کے ہیں، انسان کے علاوہ دیگر حیوانات میں یتم کا اعتبار ماں کی طرف سے ہوتا ہے اور جانور کے چھوٹے بچے کے بن ماں کے رہ جانے کو یُتَمٌ کہا جاتا ہے۔ (مفردات القرآن)
مولانا عبدالماجد دریابادیؔ لکھتے ہیں:
''یہ سوال کرنے والے یتیموں کے اولیاء تھے جن کی ولایت وسرپرستی میں یتیم بچے پل رہے تھے، یہ تھی صحابہ رضی اللہ عنھم کی احتیاط اور مرتبۂ تقویٰ! صراحت کے ساتھ آکر سوال کیا کہ یتیموں کی جائیدادوں میں انتفاع کی آیا کوئی شکل بھی اولیاء اور سرپرستوں تک کے لیے جائز ہے؟ جائیداد کی طمع بھی بری ہوتی ہے، عرب جاہلی معاشرے میں بہت سے لوگ اس لیے یتیموں کو اپنی ولدیت وسرپرستی میں لیتے تھے کہ ان کی جائیداد میں خورد برد کا موقع مل جائے گا، بلکہ کوئی یتیم لڑکی اگر مالدار نظر آتی تو اس سے اپنے لڑکے کی شادی بھی اسی طمع میں کردیا کرتے تھے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿قُلۡ اِصۡلَاحٌ لَّھُمۡ خَیۡرٌ﴾ کہہ دیجئے کہ ان کی اصلاح بہتر ہے۔
قُلۡ، کہہ دیجئے فعل امر واحد مذکر (قَالَ، یَقُوۡلُ، قَوۡلًا) کہنا، اس سے امر قُلۡ، اِصۡلَاحٌ، اصلاح، بھلائی (اَصۡلَحَ، یُصۡلِحُ، اِصۡلَاحًا) بھلا چاہنا، اصلاح کرنا، کسی کے لیے خیر اور بہتری طلب کرنا۔
لفظ اصلاح بڑا جامع ہے، اس میں یتامیٰ کی نگرانی، ان کی اعانت، ان کی اخلاقی طور پر نگہداشت اور ان کے مال کی حفاظت شامل ہے، اس کا اجر وثواب بہت زیادہ ہے، ان کی دیکھ بھال سے معاشرہ

صحت وسلامتی سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جو اجر ثبت ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس حدیث مبارکہ سے لگائیے:

حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے (جس طرح ہاتھ کی دو انگلیاں) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی میں کچھ فرق رکھ کر بتایا کہ اس طرح۔ (مسلم، ریاض الصالحین، باب ملاطفۃ الیتیم)

قرآن وحدیث کی اخلاقی تعلیمات پر غور کیجئے تو غربا و مساکین، مظلوموں اور بے کسوں اور معاشرے میں بے دست و پا لوگوں میں یتامیٰ کی سرپرستی اور ان کی مدد پر بھی بڑا زور دیا گیا ہے۔

سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم وشفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے..... اس مظلوم فرقہ کی اصلی دادرسی کا وقت اُس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دینِ کامل کی شریعت لے کر دنیا میں آیا، وحی الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے یاد دلایا: اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ..... فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ (الضحیٰ ۹۳:۶-۸) ''کیا آپ ﷺ کو اللہ نے یتیم نہیں پایا، تو اس نے پناہ دی..... تو آپ بھی یتیم پر سختی نہ کیجئے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں بے بسی کے عالم میں رہے، یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بے کس گروہ پر رحم و کرم کی دعوت دیتے رہے، چنانچہ مکی آیتوں میں یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں، دولتمندوں کو غریبوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے، اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کر سکتے ہو؟ ظلم وستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے۔

اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (البلد ۹۰:۱۴،۱۵)

''یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔''

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا کہ یہ وہ ہیں جو:

وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا (الدھر ۷۶:۸)

''اور اللہ کی محبت میں مسکین یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔''

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی، سورہ نساء میں اس بے کس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے، ان کو وراثت کا حق دلایا گیا اور متولّی جو جاہلیت میں طرح طرح کی بد دیانتی کرتے تھے، ان سے کہا گیا:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ، وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ، اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا (النساء۴:۲) ''اور یتیموں کو اُن کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دے دو، اور ان کے اچھے مال کو اپنے بُرے مال سے بدلا نہ کرو اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر ان کا مال کھا جاؤ، یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔''

یہ متولی اور سرپرست یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلد جلد خرچ کر کے برابر کر دیتے تھے کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا نہ کر دیں۔

اس بد دیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی: وَلَا يَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا (النساء۴:۶) ''اور اڑا کر اور جلدی کر کے ان کا مال نہ کھا جاؤ کہ کہیں یہ بڑے ہو جائیں گے (اور وہ اپنے حق کا مطالبہ کریں گے)۔''

صاحب جائیداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں تو ان کے لیے ان یتیموں کی جائیداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلاف اخلاق قرار دیا گیا اور اگر تنگدست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی۔

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ، وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا، فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء۴:۶) ''اور جو (متولی) بے نیاز ہے، اُس کو چاہیے کہ بچتا رہے اور جو محتاج ہے تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔''

(سیرت النبی، جلد دوم)

غرضیکہ ان سے ہر طرح کی مروت اور احسان کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ﴾

اور اگر تم ان سے مل جل کر رہو سہو تو آخر وہ تمہارے بھائی ہیں۔

وَاِنْ، اور اگر، اِنْ شرطیہ ہے، تُخَالِطُوْا تم مل جل کر رہو (خَالَطَ، يُخَالِطُ، مُخَالَطَةٌ) ایک دوسرے

کے ساتھ ملنا ملانا، خلط ملط، اختلاط وغیرہ الفاظ اردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ''تخالطُوا، خلط سے ہے جس کے معنی دو یا زیادہ چیزوں کے اجزاء کو باہم ملا دینا، دوست، پڑوسی یا کاروبار میں شریک شخص کو خلیطٌ کہتے ہیں تو مخالطت سے مراد شرکت یا باہم مل کر رہنا سہنا ہوئے۔'' (مفردات القرآن)

هُم، اُن کو، یہ اشارہ یتامیٰ کی طرف ہے، فَاِخْوَانُكُمْ، پس بھائی ہیں وہ تمہارے (فَ. اِخْوَانُ. كُمْ) پس، بھائی ہیں (وہ) تمہارے، یعنی وہ تمہارے دینی بھائی ہیں جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ''کہ مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔'' لہٰذا انہیں ایک دوسرے کا خیر خواہ ہونا چاہیے اور خاص طور پر یتامیٰ تو کمزور اور بے سہارا بھائی ہیں ان سے ہمدردی اور غمخواری تو کہیں زیادہ ضروری اور جزوِ ایمان ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾

اور اللہ جانتا ہے برائی کرنے والے کو بھی اور بھلائی کرنے والے کو بھی۔

مُفْسِدَ (فسادی کو) مُصْلِحِ، (اصلاح کرنے والے) سے یعنی اسے معلوم ہے، کہ کون بگاڑ پیدا کرتا ہے اور کون اصلاح کا خواہشمند ہے، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اور اللہ جانتا ہے (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، خبر رکھنا، الْمُفْسِد فساد پیدا کرنے والا اسم فاعل (اَفْسَدَ، يُفْسِدُ، اِفْسَادٌ) فساد پیدا کرنا، یہ اردو میں استعمال ہوتا ہے، الْمُصْلِحِ، اسم فاعل، اصلاح کرنے والا (اَصْلَحَ، يُصْلِحُ، اِصْلَاحًا) اصلاح کرنا، کسی کا بھلا چاہنا یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ کون یتامیٰ کا خیر خواہ اور ہمدرد ہے اور کون محض ظاہری ہمدردی کے پردے میں انہیں نقصان دینا چاہتا ہے اور وہ اسی پر جزا و سزا دے گا۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ﴾ اور اگر اللہ چاہتا تو مشکل میں ڈالتا تمہیں۔

(اَعْنَتَ، يُعْنِتُ، اِعْنَاتًا) ایسی مشقت میں ڈالنا جس میں ضائع اور برباد ہونے کا خطرہ ہو، ایسی تکلیف جس میں خوف اور ہلاکت ہو۔ (مفردات القرآن) یعنی یتامیٰ کے بارے میں تھوڑی سی بھی بھول چوک تمہارے لیے بہت بڑے خسارے کا باعث بن سکتی تھی، اس رب کریم نے تو یہ دین تمہارے لیے بڑا آسان اور اجر و ثواب کے لحاظ سے نعمتِ لازوال بنایا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ﴾ بلاشبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔
وہ قانون بنانے میں صاحب اختیار ہے اور اس کا بنایا ہوا قانون یقیناً حکمت و دانش پر مبنی ہوتا ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) اسلام نے یتامیٰ کی حفاظت وصیانت اور تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا ہے۔ اِس لیے کہ یہ قوم کے بچے ہوتے ہیں اور کوئی قوم اس وقت تک خوددار قوم نہیں کہلا سکتی ہے جب تک وہ اپنے یتیم بچوں کی پرورش نہ کرے بقول شاعر

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

نہ معلوم صحیح خطوط پر ان کی تعلیم و تربیت کسی قوم کو کتنا مضبوط اور توانا بنا دے، نہ معلوم ان میں سے کتنے بچے روشن دماغ اور ہونہار بن کر قوم کے لیے روشنی فراہم کریں اور اسے بام عروج پر پہنچا دیں۔

۲) یتامیٰ کی پرورش اور نگہبانی کا سروسامان حکومتی سطح پر ہونا چاہیے اور اتنا مضبوط اور فعال ہونا چاہیے کہ یتامیٰ کو اپنے کمزور ہونے کا احساس تک جاتا رہے اور خاص طور پر اسلام کے نام پر قائم ہونے والی حکومتوں کو تو ایسے کمزور طبقے پر فوری توجہ دینی چاہیے اور ایسے پرورش اور تربیت کرنے والے اداروں کے نام دارالیتامیٰ اور دارالمساکین کے بجائے دارالسلامۃ اور دارالشفقۃ وغیرہ ہونے چاہئیں تاکہ وہاں تربیت حاصل کرنے والے بچے احساس کمتری کا شکار نہ ہوں نیز ان کے مال اور جائیداد کی اتنے اچھے طریق پر نگہداشت ہو کہ حکومت مختلف صنعتوں میں ان کی سرمایہ کاری کرے، اس سے نہ صرف ملک صنعتی لحاظ سے مضبوط ہوتا ہے، بلکہ بیروزگاری کا خاتمہ ہوتا ہے اور خوشحال فلاحی مملکت وجود میں آتی ہے اور یتامیٰ کا سرمایہ بھی پروان چڑھتا رہتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نظام حکومت میں ایسی کوشش کی گئی ہے، ملاحظہ ہو شبلی نعمانی کی تصنیف ''الفاروق''۔ اللہ کرے کہ ہمارے وطن پاکستان میں بھی اسلامی قانون جاری وساری ہو جائے اور ہر شخص امن اور سلامتی کی راہ پر آ جائے۔

وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ، وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّلَوۡاَعۡجَبَتۡكُمۡ، وَلَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا، وَ لَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ، اُولٰٓئِكَ يَدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ، وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡٓا اِلَى الۡجَنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ بِاِذۡنِهٖ، وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ (۲۲۱)	اور مشرک عورتوں سے اُس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، ایک مومنہ لونڈی آزاد مشرکہ بی بی سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں (شکل وصورت) میں اچھی لگے اور مشرک مردوں سے بھی (اپنی عورتوں کا) نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، ایک مومن غلام، آزاد مشرک مرد سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں (شکل وصورت) میں اچھا لگے، مشرک لوگ تو تمہیں دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور وہ اپنے احکام کھول کھول کر لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔

﴿وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ﴾

اور نہ نکاح کرو مشرکہ عورتوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں۔

وَلَا تَنۡكِحُوا فعل نہی جمع مذکر حاضر (نَکَحَ، یَنۡکِحُ، نِکَاحًا) نکاح کرنا الۡمُشۡرِكٰتِ مشرکہ عورتیں، اس کا مفرد مُشۡرِكَةٌ ہے، حَتّٰى یہاں تک، يُؤۡمِنَّ، وہ ایمان لائیں، مضارع جمع مؤنث غائب (اٰمَنَ، یُؤۡمِنُ، اِیۡماناً) ایمان لانا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''میاں بیوی کا رشتہ انتہائی الفت ورفق کا اور باہمی مناسبت اور موانست کا ہوتا ہے، بیوی کو اگر شوہر

سے اس درجہ نا مناسبت ہے کہ وہ اس کی ساری شعوری اور اختیاری زندگی کے اصل اصول یعنی توحید و رسالت ہی کی منکر ہے تو معلوم ہوا کہ دونوں میں باہمی مناسبت کی بنیاد درجہ ضعیف میں بھی موجود نہیں۔ مرد کو ایسی عورت کے ساتھ نباہ کرنے کا خیال ہی چھوڑ دینا چاہیے، موافقت کامل کے دوسرے اجزاء وعناصر موجود نہ ہوں، نہ سہی کم از کم وہ بنیادی عقیدہ تو مشترک ہو، جس کے تابع و ماتحت چھوٹا بڑا، زندگی کا ہر معاملہ ہے، فطرتِ بشری خود ایسے بے جوڑ ازدواج سے اِبا کرتی ہے، دین فطرت اسے کیونکر جائز رکھ سکتا تھا، پھر نکاح اسلام میں ایک دینی اور مذہبی عمل ہے، یہ محض دیوانی معاہدہ (Civil Contract) نہیں، جب ایک فریق دین و مذہب کی بنیادوں ہی سے منحرف ہو تو اس کے ساتھ معاہدہ ممکن کیونکر ہے؟ لفظ مشرکہ یہاں اپنے عام و وسیع معنی میں ہے، ہر قسم کی کافر یا غیر مسلم عورت اس حکمِ ممانعت میں داخل ہوگئی، اس کا بت پرست ہونا لازمی نہیں، قولِ محقق یہی ہے۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

''حَتّٰی یُؤْمِنَّ'' پر غور کیجئے کہ مشرکہ عورتیں جب تک ایمان نہ لے آئیں ان سے نکاح نہ کرو، یہ حکم مسلمان مردوں کو ہو رہا ہے۔

اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ماں کی گود سے پرورش پانے والے بچوں کے اذہان وقلوب پر مامتا کی تعلیم وتربیت کی چھاپ لگتی ہے، اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ کسی مسلمان کے گھر شرک اور بت پرستی کے افکار پروان چڑھیں۔

سورہ مائدہ کی آیت ۵ میں ارشاد ہے: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ. ''اور ان لوگوں کی عفیفہ عورتیں بھی جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی (ان سے نکاح کرنا تمہارے لیے جائز ہے)''

یہاں اہل کتاب سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔

(۱) نکاح کی اجازت صرف انہی عورتوں سے دی گئی جو پاکدامن اور عصمت مآب ہوں۔

(۲) ابن عباسؓ کے نزدیک یہ اہل کتاب وہ ہیں جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوں، رہے دارالحرب اور دارالکفر کے یہود و نصاریٰ تو ان کی عورتوں سے نکاح کرنا درست نہیں۔

(۳) اگر یہ عورتیں کھلم کھلا شرک کی مرتکب ہوں تو بھی ان سے نکاح کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

(۴) اگر نکاح سے انہیں اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود ہو تو یہ بات افضل اور بہتر ہے اور اگر خود ہی ان کے دین کی طرف مائل ہو جانے کا اندیشہ ہو تو یہ بات قطعی طور پر ناجائز ہوگی، اس لیے کتابیہ سے نکاح میں پرہیز

ہی اَولیٰ ہے۔

(۵) کسی مسلمان عورت کا نکاح کسی اہل کتاب مرد سے نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ اجماعِ امت ہے اور حضرت عمرؓ نے مصلحتاً اہل کتاب کی عورتوں سے بھی نکاح کو ناپسند کیا ہے۔ (بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

﴿وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ﴾

اور البتہ ایمان والی لونڈی بہتر ہے مشرک (آزاد) بی بی سے اگرچہ تعجب میں ڈالے تمہیں (اس کا حسن و جمال)

وَلَاَمَةٌ اور البتہ لونڈی (وَلَ. اَمَةٌ) لام زبر کے ساتھ تاکیدی معنی پیدا کرتا ہے، اردو میں ایسے موقع پر ''تک'' لاتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں: ''مطلب یہ ہوا کہ ہر مسلم عورت یہاں تک کہ نعمت آزادی سے محروم اور عرفاً حقیر و ذلیل سمجھی جانے والی باندی تک، آزاد، خوش حال، خوش جمال کافر عورت سے بہتر ہے۔'' (تفسیر ماجدی)

اَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ، لونڈی مومنہ، صفت موصوف ہیں اور عربی میں صفت اور موصوف کی اعرابی حالت یکساں ہوتی ہے، خَيْرٌ بہتر ہے مِنْ مُّشْرِكَةٍ، مشرکہ آزاد بی بی سے مِّنْ سے، حروف جارہ میں سے ہے، اپنے بعد والے اسم کو زیر دیتا ہے، وَلَوْ اور اگرچہ اَعْجَبَتْكُمْ، (اَعْجَبَتْ. كُمْ) تعجب میں ڈالے، تمہیں (حسن و جمال) اَعْجَبَتْ، فعل ماضی واحد مؤنث غائب (اَعْجَبَ يَعْجِبُ، اِعْجَابًا) حیرت میں ڈالنا، كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے۔ (اور پسندیدگی کی بنا خواہ یہ ہو کہ وہ مالدار ہے یا یہ کہ وہ حسین و جمیل ہے یا ان کے علاوہ کسی اور بنا پر) ''آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ کفر قرآن کی نظر میں کس قدر مبغوض ہے، کافر عورت میں جو بھی خوبیاں ہوں، کل ایک طرف اور اس کے کفر کی گندگی دوسری طرف۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾

اور نہ نکاح کرو (اپنی عورتوں کا) مشرک مردوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں۔

یہ تنبیہ مسلمانوں کو کی جارہی ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو مشرکوں کے ساتھ نہ بیاہیں۔ وَلَا تُنْكِحُوا، اور نہ نکاح کرو فعل نہی جمع مذکر حاضر (اَنْكَحَ، يُنْكِحُ، اِنْكَاحًا) کسی شخص کو اپنی بیٹی نکاح میں دینا، باب افعال

ہے، اَلْمُشْرِكِيْنَ اس کا مفرد مُشْرِكٌ ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں شریک ٹھہرانے والا، حَتّٰی یہاں تک کہ یُؤْمِنُوْا، وہ ایمان لے آئیں، مضارع جمع مذکر غائب (اٰمَنَ، یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا) ایمان لانا یعنی جب تک مشرک، شرک سے کلیۃً توبہ کر کے ایمان نہ لائیں اس وقت تک تم اپنی بیٹیوں کا ان سے نکاح نہ کرو۔

﴿وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ﴾

اور البتہ غلام مومن بہتر ہے مشرک (آزاد مرد) سے اگرچہ خوش لگے (شکل وصورت) کے لحاظ سے تمہیں۔

وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ اور غلام مومن عَبْدٌ، موصوف اور مُؤْمِنٌ ایمان والا اس کی صفت ہے، خَيْرٌ بہتر ہے، مِنْ مُّشْرِكٍ مشرک (آزاد مالدار سے) وَ لَوْ، اگرچہ اَعْجَبَكُمْ، (اَعْجَبَ. كُمْ) خوش لگے..... تمہیں مشرک مرد کی شکل وصورت خواہ تمہیں کتنی ہی پسند آئے مگر اس کا ایمان سے کیا مقابلہ ہوسکتا ہے، ایمانی حسن تو سب پر فوق ہے اور دنیا کا سب حسن وجمال اور مال ودولت اس کے سامنے ہیچ ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ یہ لوگ بلاتے ہیں (یعنی مشرکین) آگ کی طرف۔

اُولٰٓئِكَ، اسم اشارہ جمع مذکر یہی لوگ۔ يَدْعُوْنَ بلاتے ہیں فعل مضارع جمع مذکر غائب (دَعَا، يَدْعُوْ، دَعْوَةً) بلانا، دعوت دینا اِلٰی طرف۔ حروف جارہ میں سے ہے بعد والے اسم کو زیر دیتا ہے اِلَى النَّارِ، طرف آگ کے، یعنی ان کی دعوت ایسے اعمال کی طرف ہے جو جہنم میں لے جانے والے ہیں۔ اَی اِلَى الْاَعْمَالِ الْمُوجِبَةِ لِلنَّارِ "یعنی ایسے اعمال کی طرف جو باعث جہنم ہوں۔" (فتح القدیر) پس ان سے معاشرتی راہ رسم قائم کرنا نقصان عظیم ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ﴾

اور اللہ بلاتا ہے طرف جنت کے اور بخشش کے اپنے حکم کے ساتھ۔

وَاللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ يَدْعُوْا، بلاتا ہے فعل مضارع واحد مذکر غائب (دَعَا، يَدْعُو، دَعْوَةً) بلانا، دعوت دینا، اِلَى الْجَنَّةِ، طرف جنت کی، وَالْمَغْفِرَةِ اور بخشش کی (غَفَرَ، يَغْفِرُ، غُفْرَانٌ) بخشنا، بِاِذْنِهٖ

(بِ.اِذْنِ.ہٖ) ساتھ، اپنے، اِذْن یعنی ساتھ اپنے ارادہ اور توفیق سے، یعنی وہ تمہیں ایسے سلامتی کے احکام دیتا ہے جن پر عمل پیرا ہو کر تم جنت کے حقدار بن سکتے ہو۔

﴿وَ یُبَیِّنُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ﴾

اور وہ بیان کرتا ہے اپنی نشانیاں لوگوں کے لیے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

وَ یُبَیِّنُ وہ بیان کرتا ہے، فعل مضارع واحد مذکر غائب (بَیَّنَ، یُبَیِّنُ تَبْیِیْنٌ وَ تِبْیَانًا) بیان کرنا، کھولنا یہ اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے، اٰیٰتِہٖ (اٰیٰتِ.ہٖ) آیات، اپنی، آیت اس کا مفرد ہے، قرآن حکیم کی آیات جو رشد و ہدایت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور آیات (نشانیاں) انفس و آفاق میں ہر طرف اُس کی قدرت کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، لَعَلَّھُمْ (لَعَلَّ.ھُمْ) تاکہ وہ، یَتَذَکَّرُوْنَ وہ نصیحت حاصل کریں (تَذَکَّر، یَتَذَکَّرُ، تَذَکُّرًا) نصیحت حاصل کرنا اس کا مادہ ذِکْر ہے جس کے معنی نصیحت کے ہیں۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) اسلام نے نکاح کے سلسلہ میں ذات، نسل، قوم اور قبیلہ، رنگ وغیرہ کی قید نہیں لگائی بلکہ صرف ایماندار اور درست عقیدہ ہونے کی شرط لگائی ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ انتہائی الفت اور رفاقت کا ہوتا ہے، دونوں میں گہری مناسبت کا ہونا لازم اور ضروری ہے کیونکہ یہ، زندگی بھر کا ساتھ ہے اور یہ کہ بیوی کا ایک مسلمان خاوند کے لیے صحیح العقیدہ ہونا لازمی امر ہے، میاں اگر توحید پرست ہے اور بیوی مشرکہ ہے تو اولاد کی تربیت پر ان کے صحیح اور غلط اثرات مرتب ہوں گے، میاں انہیں صحیح عقیدہ کی طرف بلائے گا تو بیوی شرک کی دعوت دے گی، دونوں کے درمیان لڑائی اور جھگڑے سے بچوں پر برے اثرات پڑیں گے اور یہ نسل در نسل منتقل ہوتے رہیں گے۔

۲) قرآن کریم نے شرک کو تمام بدیوں کی جڑ قرار دیا ہے اور شرک کی تمام رسومات کی ایک ایک کر کے بیخ کنی کی ہے یہاں تک کہ ان کھانے کی چیزوں کو بھی حرام قرار دیا ہے جو دیوتاؤں اور بتوں کے نام پر مخصوص کی گئی ہوں۔ جب کھانے پینے میں یہ احتیاط سکھلائی گئی ہے تو شادی بیاہ میں کیوں نہ ہوتی، معاشرتی زندگی کو نکھارنا اور سنوارنا اسلامی آداب و اخلاق کا جزو لاینفک ہے۔

۳) حدیث میں آتا ہے عورتوں سے نکاح کرنے میں لوگ مال و دولت، خاندان، حسن و جمال اور عفت و پاکدامنی کو دیکھتے ہیں، تم صرف آخری بات یعنی عفت و پاکدامنی کو پیش نظر رکھو۔

۴) اسی طرح اپنی لڑکیوں کو مشرکین و معاندین اسلام کے نکاح میں نہ دو خواہ وہ تمہیں مال و دولت کے انبار ہی کیوں نہ پیش کر دیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں عام طور پر منفعل اور اثر پذیر ہوتی ہیں ان پر صحبت اور ہم نشینی کا اثر ہو کر رہے گا، ممکن ہے وہ بتدریج اسلام کو چھوڑ کر کفر و ارتداد قبول کر لیں اور اس کا وبال تمہارے سر ہوگا اور نہ معلوم اس کا دنیا اور آخرت میں کتنا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ، قُلْ هُوَ اَذًى، فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ، وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ، فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (۲۲۲) نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ، فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ، وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۲۳)	لوگ آپؐ سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دیجئے کہ وہ نجاست ہے، اس لیے ایام حیض میں اپنی بیویوں سے الگ رہو، اور جب تک وہ پاک و صاف نہ ہو جائیں اُن سے مقاربت نہ کرو، جب وہ پاک وصاف ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان کے پاس جاؤ، بلاشبہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک وصاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں لہٰذا جیسے چاہو اپنی کھیتی میں آؤ، اور اپنے لیے آگے کی تدبیر کرو (زادِ آخرت کا خیال رکھو) اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ روزِ حشر تمہیں اللہ کے روبرو حاضر ہونا ہے، اور اہل ایمان کو (کامیابی کی) خوشخبری سنا دیجئے۔

﴿وَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ﴾ اورسوال کرتے ہیں آپ سے حیض کے بارے میں۔

وَ یَسْئَلُوْنَکَ (یَسْئَلُوْنَ.کَ) وہ سوال کرتے ہیں۔ آپ سے فعل مضارع جمع مذکر غائب (سَأَلَ، یَسْأَلُ، سُؤَالًا) دریافت کرنا، سوال کرنا، ک ضمیر واحد مذکر حاضر، یہ ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، عَنِ الْمَحِیْضِ، حیض سے متعلق، مَحِیْضِ، بمعنی حیض، سیلان الدّم، خون کا جاری ہونا، وہ خون جو عورتوں کو ہر ماہ آتا ہے (ماہواری) جسے اذًی (نجاست) کہا گیا ہے، دنیا کی دوسری قوموں نے بھی حیض کے خون کو نجاست قرار دیا ہے، ماہرین طب کا کہنا ہے کہ اس میں حد درجہ گرمی ہوتی ہے۔

﴿قُلْ ھُوَ اَذًی﴾ کہہ دیجئے وہ نجاست ہے۔

قُلْ کہہ دیجئے فعل امر واحد مذکر حاضر (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، ھُوَ، وہ اَذًی (نجاست)۔

﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ﴾

پس الگ رہو عورتوں سے ایام حیض میں۔

فَاعْتَزِلُوا (فَ.اِعْتَزِلُوْا) پس الگ رہو، فعل امر جمع مذکر (اِعْتَزَلَ، یَعْتَزِلُ، اِعْتِزَالٌ) الگ رہنا، باب افتعال، عَزل اس کا مادہ ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''عورتوں سے الگ رہنے کا حکم صرف مباشرت کے عمل خاص تک محدود ہے۔ مجالست و مواکلت وغیرہ عام معاشرت سے اس کا تعلق نہیں ہے، بعض قوموں میں عورتیں اپنے اس زمانہ میں نہ دوسروں کے ساتھ کھا پی سکتی ہیں نہ قریب بیٹھ سکتی ہیں۔ بعض قوموں میں اس زمانہ میں عورت کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا ناپاک سمجھا جاتا ہے، بعض مشرک قوموں میں یہ دستور ہے کہ اس زمانہ میں عورت کو میلے کچیلے کپڑے پہنا کر گھر کے ایک الگ گوشہ میں اچھوت بنا کر بٹھا دیا جاتا ہے، غرض دوسری قوموں نے عام طور پر اس طبعی ناپاکی سے متعلق بہت مبالغہ آمیز تخیل قائم کر لیا ہے، شریعت اسلامی میں اس قسم کے کوئی امتناعی احکام موجود نہیں۔''

(تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾

اور نہ مقاربت کرو ان سے یہاں تک کہ وہ پاک وصاف ہولیں۔

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ، وَلَا اور نہ، (تَقْرَبُوْا. هُنَّ) هُنَّ کی ضمیر بیویوں کی طرف ہے۔ ان سے مقاربت کرو (قَرَبَ، يَقْرَبُ، قُرْبًا) حَتّٰى یہاں تک کہ يَطْهُرْنَ وہ پاک وصاف ہو جائیں یعنی ایام حیض سے طہارت حاصل کرلیں۔ مضارع جمع مؤنث غائب (طَهَرَ، يَطْهُرُ، طُهْرًا) طہارت حاصل کرنا۔

﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ﴾

پس جب وہ طہارت حاصل کرلیں، تو آؤ اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق۔

فَاِذَا (فَ. اِذَا) پس۔ جب تَطَهَّرْنَ وہ طہارت حاصل کرلیں ماضی جمع مؤنث غائب (تَطَهَّرَ، يَتَطَهَّرُ، تَطَهُّرًا) باب تفعل، پاک وصاف ہونا، حیض کا خون آنا بند ہو جائے اور غسل سے فراغت ہو جائے۔ فَاْتُوْهُنَّ تو آؤ ان کے پاس، (فَ. اْتُوْ. هُنَّ) پس، آؤ، اُن کے پاس، هُنَّ کی ضمیر عورتوں کی طرف ہے، یعنی جب تمہاری بیویاں حیض سے طہارت حاصل کرلیں تو ان سے مقاربت کرسکتے ہو، مِنْ حَيْثُ اس جگہ سے، (ظرفِ مکان) ہے۔ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ، اللہ نے تمہیں حکم کیا، (اَمَرَ. كُمْ) حکم کیا۔ تمہیں، کم کی ضمیر جمع مذکر مخاطب کے لیے ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ لکھتے ہیں:

"اس سے وہ طبعی حکم مراد ہے جو ہر جاندار کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور جس سے ہر متنفس بالطبع واقف ہوتا ہے۔ اس کے خلاف یعنی دبر (پشت) سے مباشرت جرم ہے۔" (تیسیر القرآن، جلد اول)

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾

بلاشبہ اللہ پسند کرتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور پسند کرتا ہے پاک رہنے والوں کو۔

اِنَّ بلاشبہ، جملے میں زور پیدا کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بلاشک وشبہ، اللہ تعالیٰ يُحِبُّ پسند کرتا (اَحَبَّ، يُحِبُّ، اِحْبَابٌ) پسند کرنا، چاہنا، التَّوَّابِيْنَ اس کا مفرد تَوَّاب ہے یہ فَعَّالٌ کے وزن پر ہے، بہت زیادہ توبہ کرنے والا وَ يُحِبُّ اور وہ پسند کرتا ہے، الْمُتَطَهِّرِيْنَ پاک وصاف رہنے والے کو، الْمُتَطَهِّرُ اس کا

مفرد ہے، اسم فاعل ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''صفائی وطہارت کی یہ روحِ قرآنی عام ہے اور اِس کے تحت میں جسمانی اور ظاہری صفائی پوری طرح آجاتی ہے، اسلام کی اس لطافت پسندی، نظافت پسندی، طہارت پسندی کے مقابلہ میں دوسرے سرے پر وہ مذاہب ہیں جن میں قربِ حق کا ذریعہ صفائی کو نہیں، عین جسمانی گندگی، کثافت وغلاظت کو قرار دیا گیا ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

پھر آیہ مبارکہ پر غور کیجئے کہ توّابین میں وہ لوگ آجاتے ہیں جو اپنے دلوں کے زنگ صاف کرتے رہتے ہیں، یعنی کہ وہ توبہ واستغفار کے ساتھ اپنے باطن کو بھی پاکیزہ بناتے رہتے ہیں اور مُتَطَهِّرِيْنَ کے اوصاف کے ساتھ اپنے ظاہر کو بھی نجاست اور گندگی سے پاک وصاف رکھتے ہیں۔

﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ، فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ﴾

تمہاری بیویاں کھیتی ہیں تمہارے لیے تو آؤ اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو تم۔

نِسَآؤُكُمْ (نِسَآءٌ. كُمْ) بیویاں، تمہاری اِمْرَأَةٌ کی جمع نِسَاءٌ ہے حَرْثٌ، کھیتی، لَّكُمْ، تمہارے لیے، فَأْتُوْا (فَ. اُتُوْا) پس، آؤ (اَتٰی، یأتِیْ، اِتْیَانٌ) آنا حَرْثَكُمْ (حَرْثٌ. كُمْ) کھیتی اپنی میں اَنّٰى جس طرح اور جیسے شِئْتُمْ تم چاہو یعنی بغیر کسی گھبراہٹ اور پریشانی کے یہ مقاربت ہے۔ اس لیے کہ صرف نکاح ہی زندگی میں جائز راہ ہے اور یہ حصولِ اولاد کا جائز راستہ ہے، اس کے علاوہ اور تمام راہیں ناجائز اور ممنوع ہیں۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رشتۂ ازدواج کے سلسلہ میں بیوی کی صحیح حیثیت واضح کردی ہے، یعنی یہ کہ بیوی مرد کی کھیتی ہے اور جس طرح کسان اپنی کھیتی کو اپنی بہت بڑی دولت سمجھ کر عزیز رکھتا ہے، اس کی نگرانی کرتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے، اس سے پیداوار حاصل کرتا ہے، اسی طرح شوہر کو چاہیے کہ اپنی بیوی کو بھی اپنی عزیز ترین دولت سمجھے، اس کی مناسب نگرانی کرے اور اس سے صالح اولاد کی توقع رکھے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے ایسے ہی جیسا کہ کسان بیج بونے کے بعد بارانِ رحمت کے لیے دعا کرتا ہے۔''

(درس قرآن، جلد اول)

﴿وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ، وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ تمہیں اُس کے روبرو حاضر ہونا ہے، اور ایمان والوں کو خوشخبری سنایئے۔

وَ قَدِّمُوْا، اور آگے بھیجو فعل امر جمع مذکر (قَدَّمَ، يُقَدِّمُ تَقْدِيْمٌ) آگے بھیجنا، آگے کی تدبیر کرنا، یعنی نیک اعمال کو روزِ جزا کے لیے اکٹھا کرو، لِاَنْفُسِكُمْ، (لِ. اَنْفُسِ. كُمْ) لیے جانوں، اپنی (کے) یعنی نیک اعمال کی پونجی تم اپنی جانوں کے لیے جمع کرو، وَاتَّقُوْا اللّٰهَ اور ڈرتے رہو، اللہ سے، وَاتَّقُوْا فعل امر جمع مذکر (اِتَّقٰى، يَتَّقِيْ، اِتِّقَاءً) ڈرنا، خوف کھانا، تقویٰ کا معنی ظاہر اور باطن، کھلے اور چھپے، ہر وقت اور ہر لحہ دِل سے اللہ کا خوف رکھنا، اور کوئی بھی ایسا کام نہ کرنا جو اس کی ناراضی کا سبب بنے، وَاعْلَمُوْٓا اور جان لو، فعل امر جمع مذکر (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، پہچاننا، اَنَّكُمْ (اَنَّ. كُمْ) بے شک۔تم، مُّلٰقُوْهُ (مُّلَاقُوْ. هُ) ملنے والے ہو۔اس سے (رب تعالیٰ احکم الحاکمین سے) جوابدہ ہونے والے ہو (زندگی اور اس کے اعمال کے متعلق) وَبَشِّرِ اور خوشخبری دیجئے (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) الْمُؤْمِنِيْنَ، مومنوں کو۔اس کا مفرد مُؤْمِنٌ ہے جنہوں نے صدق دل سے احکام الٰہی کی اطاعت وفرمانبرداری کی ہے، ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر عظیم ہے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) قرآن حکیم زندگی کا مکمل دستور العمل ہے، یہ ہر شعبۂ حیات کے متعلق روشن ہدایات دیتا ہے اور افراط و تفریط کی بجائے اعتدال کی راہ بتاتا ہے۔ اِسی مسئلہ میں دیکھئے کہ یہود ان مخصوص دنوں میں عورتوں کے قریب جانا، اُن سے بات چیت کرنا، ان کے پاس بیٹھنا اور ان کے ساتھ کھانے پینے کو حرام اور ممنوع سمجھتے تھے، جبکہ نصاریٰ اس کے برعکس ان دنوں میں صحبت سے بھی پرہیز نہ کرتے تھے، اسلام نے راہ اعتدال اختیار کی، اس نے اِن دنوں میں صرف ازدواجی تعلقات سے منع کیا کیونکہ وہ طبی نقطہ نظر سے نقصان دہ ہیں۔ باقی ہر طرح سے میل جول، بات چیت، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کی اجازت دی، اور یہی حقیقت پسندانہ طریق کار ہے۔

۲) مرد وعورت کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا حقیقی مقصد نسل انسانی کی بقا وحفاظت اور تعلیم و تربیت ہے، اور اس کے لیے کھیتی کا خوبصورت لفظ لایا گیا ہے، جس طرح ہر کسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی کھیتی پھلے پھولے اور ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رہے، وہ ایک قانون کے تحت خاص وقت میں بیج بوتا ہے، ہل چلاتا ہے، اس کی آبیاری کرتا ہے اور وقت پر فصل کاٹ لیتا ہے۔ بعینہٖ نکاح کے بعد ہر مرد کی یہ خواہش ہونی چاہیے کہ وہ اپنی کھیتی کی بتمام وکمال حفاظت کرے اور اُن تمام باتوں سے پرہیز کرے جن سے کھیتی کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے ہمیشہ خیر اور بھلائی کی توقع رکھے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ، وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ(۲۲۴)لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ(۲۲۵)	اور اپنی قسموں کے لیے اللہ کے نام کو ایسی ڈھال نہ بناؤ کہ تم فلاں نیکی کا کام نہ کرو گے اور فلاں برائی سے نہ بچو گے اور لوگوں کے درمیان صلح اور اصلاح کے کام نہ کرو گے اور اللہ تعالیٰ تو سمیع اور علیم ہے (وہ تمہاری ہر گفتگو کو سنتا ہے اور تمہارے ہر حال سے واقف ہے بلکہ دل کے ارادے تک کو جانتا ہے) اللہ تعالیٰ تمہاری لایعنی اور لغو قسموں پر تم سے مؤاخذہ نہیں کرے گا۔ البتہ ان قسموں پر گرفت ہوگی جو تم قصدِ دل سے کھاؤ گے اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بردبار ہے۔

﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ﴾ اور نہ بناؤ اللہ کو ڈھال اپنی قسموں کے لیے۔

وَلَا اور نہ، تَجْعَلُوْا تم بناؤ فعل نہی جمع مذکر حاضر (جَعَلَ، يَجْعَلُ، جَعْلًا) بنانا عُرْضَةً، ڈھال یا آڑ

لِّاَیۡمَانِکُمۡ (لِ. اَیۡمَانِ. کُمۡ) لیے قسموں اپنی کے، یعنی اپنی قسموں کے واسطے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا نام استعمال نہ کرو، اَیۡمَان، یَمِیۡنٌ کی جمع ہے دائیں ہاتھ کو کہتے ہیں اور استعارۃً قسم کو بھی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''عرب جاہلیت کے جاہلانہ دستوروں میں سے ایک دستور یہ تھا کہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ بیٹھتے کہ ہم فلاں اور فلاں کام نیکی کا، تقویٰ کا، اصلاح خلق کا نہ کریں گے اور جب کوئی کہتا تو یہی عذر پیش کر دیتے کہ ہم تو اس کی قسم کھا چکے ہیں، اِن اعمال خیر کا چھوڑنا یوں بھی ہر صورت میں مذموم تھا چہ جائیکہ حضرتِ حق کے اسم بزرگ اور اس کی قسم کو بجائے قربِ حق کے اس سے دوری کا ذریعہ بنالیا جائے!.....آیت اسی شعارِ جاہلی کی تردید میں ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿اَنۡ تَبَرُّوۡا وَ تَتَّقُوۡا وَتُصۡلِحُوۡا بَیۡنَ النَّاسِ﴾

یہ کہ نہ بھلائی کرو گے اور نہ پرہیزگاری اختیار کرو گے اور نہ صلح واصلاح کرو گے لوگوں کے درمیان۔

اَنۡ یہ کہ (نہ) تَبَرُّوۡا فعل مضارع جمع مذکر حاضر (ب ر ر) اس کا مادہ ہے (بَرَّ، یَبَرُّ، بَرًّا) نیکی کرنا، تَبَرُّوۡا اصل میں تَبَرُّوۡنَ تھا، اَنۡ کی وجہ سے نون اعرابی ساقط ہوگیا، اَنۡ تَبَرُّوۡا رہ گیا، وَتَتَّقُوۡا مضارع جمع مذکر حاضر (وق ی) اس کا مادہ ہے (اِتَّقٰی، یَتَّقِیۡ، اِتِّقَاء) تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرنا، وَتُصۡلِحُوۡا، مضارع جمع مذکر حاضر (اَصۡلَحَ، یُصۡلِحُ، اِصۡلَاحًا) اصلاح کرنا، بَیۡنَ النَّاسِ، لوگوں کے درمیان، وَاللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں اور یہ آیہ مبارکہ کی مناسبت سے لائے گئے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ قسم کھانے میں احتیاط سے کام لو، اللہ تعالیٰ تو تمہاری ہر گفتگو کو ہر وقت سنتا ہے اور تمہارے ہر عمل کو ہر لحہ جانتا ہے یہاں تک کہ تمہاری نیتوں اور ارادوں سے بھی باخبر ہے، لہٰذا کوئی ایسی بات نہ کرو جو اُس کی منشا کے خلاف ہو اور کوئی عمل ایسا نہ کرو جس میں اس کی رضامندی نہ ہو۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اللہ کی قسم سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ، یعنی اگر کسی اچھے کام کے نہ کرنے پر قسم کھالو تو اسے توڑ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی بات کے متعلق قسم کھالے اور اس کے بعد اسے محسوس ہو کہ اس نے غلطی کی ہے تو

قسم توڑ دے اور اس کا کفارہ دے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی حالت میں بھی مسلمان کو نیکی کے کام سے منع نہیں فرماتا ہے۔'' (سراج البیان، جلد اول)

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾

نہیں پکڑے گا تمہیں اللہ، تمہاری لایعنی اور لغو قسموں پر۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ نہیں مواخذہ کرے گا۔ تمہارا اللہ تعالیٰ (يُؤَاخِذُ. كُم) مواخذہ کرتا..... تمہارا، (اَخَذَ، يُؤَاخِذُ، مُؤَاخَذَةٌ) گرفت کرنا، مؤاخذہ کرنا۔ بِاللَّغْوِ، لغو (لایعنی) بات پر، لغو ایسا عمل یا کلام جس کا کوئی فائدہ نہ ہو، فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ، تمہاری قسموں میں اس کا مفرد یمینٌ ہے بمعنی دایاں اور استعارۃً قسم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

''لغو (بیہودہ) قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو ناواقفیت کی بنا پر یا بے خیالی میں یا محض عداوت کے طور پر بے ساختہ زبان سے نکل جاتی ہیں اور ان میں ارادہ کے بغیر بھی جھوٹ کی ملاوٹ ہو جاتی ہے، علماء نے بتایا ہے کہ لغو کی کئی قسمیں ہیں ان کا تعلق گزرے ہوئے واقعات سے بھی ہو سکتا ہے اور عادت سے بھی کہ آدمی یونہی بلاوجہ قسمیں کھاتا رہے، بات بات پر قسم کھائے، علماء نے اسے نہایت ناپسندیدہ امر قرار دیا ہے۔'' (درس قرآن، جلد اول)

﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾

اور بلکہ اللہ تمہیں پکڑے گا اُن (قسموں) پر جن کا ارادہ تمہارے دلوں نے کیا۔

وَلٰكِنْ اور لیکن، لٰكِن کلمہ استدراک، کلام سابق کی نفی کرتا ہے یا شک کو دور کرتا ہے، (يُّؤَاخِذُ. كُمْ) وہ گرفت کرتا ہے۔ تمہاری، بِمَا (بِ. مَا) ساتھ اس کے (قسم کے) كَسَبَتْ کمایا، ماضی واحد مؤنث غائب (كَسَبَ، يَكْسِبُ، كَسْبًا) کمانا، کوئی عمل زبان سے یا فعل سے سرانجام دینا قُلُوْبُكُمْ (قُلُوْبُ. كُمْ) تمہارے۔ دلوں نے قُلُوْبٌ کا مفرد قَلْبٌ ہے، قُلوب کے لیے كَسَبَتْ ماضی واحد مؤنث غائب کا صیغہ آیا ہے۔ یعنی جو غلط قسمیں تم نے دل کے ارادے سے کھائی ہیں اور اُن پر نہ تو ندامت

اور شرمساری ہوئی اور نہ ہی ان کا کفارہ ادا کیا تو ان پر تمہارا مؤاخذہ ہوگا۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ اور اللہ تو بہت بخشنے والا بردبار ہے، غَفُوْرٌ اور حَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں اور اس آیہ کریمہ میں بھی خوب مناسبت سے آئے ہیں۔ یعنی وہ غفور ہے (بڑا بخشنے والا ہے) اپنی اسی شان غفاری سے کام لیتے ہوئے اس نے بے ارادہ قسموں پر یعنی (لغو قسموں) پر معافی رکھی ہے اور وہ حلیمٌ (تحمل سے کام لینے والا) بڑا بردبار بھی ہے، اسی شانِ بردباری سے وہ فوری سزا بھی نہیں دیتا بلکہ سزا کو ملتوی کر دیتا ہے تاکہ انسان کو توبہ کا موقع مل جائے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ہر بات پر قسم کھانے سے بچنا ضروری ہے۔

۲) نیک سلوک، نیکوکاری، تقویٰ و پرہیز گاری اور لوگوں کے درمیان صلح وصفائی ایسے اچھے کاموں کے سلسلہ میں محض اللہ کے نام کو ڈھال نہ بناؤ مثلاً بعض لوگ کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ نہ اُن کے پاس جائیں گے اور نہ ان سے بولیں گے اور اگر ان کے درمیان لڑائی جھگڑا ہوا تو صلح وصفائی بھی نہ کرائیں گے اور نہ ان کے ساتھ مروت اور حسن سلوک ہی سے پیش آئیں گے وغیرہ وغیرہ۔ نیک کاموں کو چھوڑ دینا تو ویسے ہی برا ہے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ بزرگ وبرتر کا نام لے کر اعمال حسنہ سے بچنے کی صورت پیدا کی جائے، آیہ مبارکہ میں اسی بات کی تنبیہ کی جارہی ہے، اول تو کسی نیک کام کے سلسلہ میں ایسی ویسی قسم کھانی ہی نہیں چاہیے اور اگر ایسی کوئی قسم کھا بیٹھنے کا ارتکاب ہو جائے تو اس کا توڑنا اور کفارہ ادا کرنا لازم ہے۔

۳) قسم توڑنے کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا (حسب توفیق) یا انہیں کپڑے پہنانا یا ایک غلام آزاد کرنا یا تیس دن کے روزے رکھنا ہے (ملاحظہ ہو سورۃ مائدہ: ۸۹) اور اس کفارہ کو ادا کرنے سے آئندہ کے لیے نفس کو غلط طریقہ کار سے بچانا مقصود ہوتا ہے۔

۴) بسا اوقات ارادہ ونیت کے بغیر ہی انسان کی زبان پر قسم کے الفاظ آجاتے ہیں اور ان سے اس کی کوئی نیت نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ایسی قسموں پر کوئی مؤاخذہ نہیں فرماتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو غیر شعوری طور پر (لا، واللہ

بلیٰ، واللہِ) کہہ دیتے تھے۔ (بخاری، ابوداؤد)

۵) مفسرین نے لکھا ہے کہ (لغو قسم) ہر وہ قسم ہے جس میں الفاظ کے ساتھ دل کی نیت شامل نہ ہو، چاہے وہ کوئی بھی صورت اور کوئی بھی حالت ہو اور ایسی قسم پر مؤاخذہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآءِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ، فَاِنْ فَآءُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۲۶) وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۲۷)	جو لوگ اپنی بیویوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھالیں، اُن کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے (اس عرصہ میں) اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے، اگر وہ طلاق ہی کی ٹھان لیں تو اللہ تعالیٰ (ان کی باتوں کو) سنتا بھی ہے اور (ان کی نیتوں کو) جانتا بھی ہے۔

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآءِ هِمْ﴾

ان لوگوں کے لیے (جو) قسمیں کھاتے ہیں اپنی بیویوں سے (مقاربت نہ کرنے کی)۔

لِلَّذِيْنَ (لِ. لَّذِيْنَ) لیے، ان لوگوں کے (یہ حکم ہے) جو، يُؤْلُوْنَ، قسمیں کھاتے ہیں فعل مضارع جمع مذکر غائب (آلَی، يُوْلِیْ، اِيْلَاءً) قسم کھانا، ایلا ایسی قسم ہے کہ جس کی غرض کسی کام میں یا کسی حق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا ہو۔ اصطلاحِ شریعت میں اِیلا یہ ہے کہ کوئی مرد قسم کھالے کہ وہ اپنی بیوی سے مقاربت نہیں کرے گا۔ مِنْ نِّسَآءِ هِمْ، اپنی بیویوں سے، اِمْرأۃٌ عورت اور اس کی جمع نساءٌ ہے یعنی جو لوگ اپنی بیویوں سے قطع تعلق کرنے کی قسمیں کھالیتے ہیں۔

﴿تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ﴾ ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔

تَرَبُّصُ (تَرَبَّصَ، یَتَرَبَّصُ، تَرَبُّصًا) انتظار کرنا، مہلت ملنا، باب تفعل ہے، اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ، چار ماہ اَشْهُرٍ اس کا مفرد، شَهْرٌ ہے، مہینہ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

" اِیْلا عربِ جاہلی کا ایک شعار یہ بھی تھا کہ شوہر غصہ میں آ کر قسم کھا بیٹھتے تھے کہ اپنی بیویوں سے مقاربت نہ کریں گے، اصطلاح میں اس کو اِیلاء کہتے ہیں، شریعتِ اسلامی نے اس میں جو اصلاحات کیں اور اس باب میں جو احکام دیے، یہاں ان کا ذکر ہے۔

"تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ" (زیادہ سے زیادہ مدت اس علیحدگی کی چار ماہ ہے) عرب جاہلی ایلا کر لینے کے بعد جو ایک طرح کی طلاق ہی تھی، بیوی کے نان ونفقہ اور ہر قسم کی ادائے حقوق سے معاً دستبردار ہو جاتے تھے (عورت بے دست و پا اور معلقہ ہو کر رہ جاتی تھی) اسلام نے اس کی اصلاح یہ کی کہ اس کو خلع نکاح یا فسخ نکاح کا مترادف نہیں، بلکہ اس کی صرف تمہید قرار دے کر غور وفکر کے لیے ایک مدت مقرر کر دی اور پھر اس مدت کی میعاد چار مہینے رکھی جو اس کے لیے بالکل کافی ہے کہ سارے پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور کر لیا جائے۔" (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿فَاِنْ فَآءُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾

پس اگر وہ (اس مدت تک) رجوع کر لیں، تو اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

فَاِنْ (فَ. اِنْ) پس۔ اگر، اِنْ (شرطیہ) ہے فَآءُوْا رجوع کر لیں ماضی جمع مذکر غائب (فَاءَ، یَفِیْءُ، فَیْءٌ) خرابی سے اچھائی کی طرف لوٹنا، قطع تعلق سے صلح وصفائی کی طرف آنا، یعنی قسم کھانے والے مرد حضرات احساس ندامت کے ساتھ اپنی اس قسم کو توڑ ڈالیں اور اس مدت میں (کسی وقت بھی) اپنی بیویوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ مقاربت اور مراسم قائم کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرما دے گا، نہ صرف معاف فرمائے گا بلکہ انہیں اپنے سایہ رحمت میں ڈھانپ لے گا، سبحان اللہ! اس کی شان غفاری اور شانِ رحمت کا کیا ٹھکانہ ہے! بعض فقہا نے کہا ہے کہ قسم توڑنے کا کفارہ بھی ادا کرنا ہوگا جس کا ذکر سورۃ مائدہ ۵:۸۹ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا انہیں کپڑے پہنانا یا ایک غلام کو آزاد کرنا یا تیں دن کے روزے رکھنا ہے، بہر حال بندہ مومن کو خالق و مالک کی شان مغفرت و رحمت پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہیے۔

اگر چار ماہ کی مدت تک خاوند اور بیوی کے درمیان مقاربت اور موافقت نہ ہوئی تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ مدت گزرتے ہی خود بخود طلاق واقع ہو جائے گی اور عدت گزارنے کے بعد عورت کو اختیار ہوگا کہ دوسری جگہ نکاح کر لے جبکہ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اس مدت کے اختتام پر اس کا معاملہ قاضی (عدالت وقت) کے پاس پیش کیا جائے گا۔ قاضی (یا عدالت) رجوع یا طلاق کا حکم دے گا، اس کے بعد والی آیہ مبارکہ طلاق سے متعلق ہے۔

قرآن کے الفاظ سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ عورت کو طلاق حاصل کرنے کا یہ حق صرف اُس صورت میں حاصل ہوگا جب شوہر نے بر بنائے بغض ونفرت بیوی سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہو اور پیش نظر اس کو ذہنی کوفت میں مبتلا کر کے معلق بنا کر رکھنا ہو، اگر یہ صورت نہ ہو بلکہ علاج ومعالجہ کے سلسلے میں یا بتقاضائے صحت، ڈاکٹر اور طبیب کی ہدایت پر بیوی سے مخصوص ازدواجی تعلق منقطع رکھے تو یہ صورت اس حکم کے تحت نہیں آتی اگر چہ اس انقطاع کی مدت چار ماہ سے متجاوز ہی کیوں نہ ہو جائے، ظاہر ہے کہ اِن حالات میں گھر میں باہم اٹھنا بیٹھنا، ہنسی مذاق، کھانا پینا برقرار رہتا ہے اور کسی قسم کی ناخوشگواری پیش نہیں آتی۔

﴿وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ، فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾

اور اگر وہ (قسم کھانے والے مرد) طلاق ہی دینے کا پختہ ارادہ (عزم) کر لیں تو اللہ تعالیٰ سمیع اور علیم ہے۔

یعنی وہ بندوں کے درمیان جو سرگوشیاں اور باتیں ہوتی ہیں انہیں ہر وقت سنتا ہے اور ان کے دلوں کے خیالات اور ارادوں کو جانتا ہے۔ وَاِنْ اور اگر اِنْ (شرطیہ) ہے عَزَمُوْا انہوں نے ارادہ کر لیا فعل ماضی جمع مذکر غائب (عَزَم، يَعْزِمُ، عَزْمًا) پختہ ارادہ کرنا، اِسے انگریزی زبان میں (Determination) کہتے ہیں، الطَّلَاقَ، کے اصل معنی، بندش سے آزاد کرنا ہیں اور یہ لفظ معاہدۂ نکاح سے آزاد کرنے پر بالخصوص بولا جاتا ہے۔

اسلام سے قبل عربوں میں طلاق کے متعلق حد درجہ آزادی تھی۔ عورت اپنا عزو وقار اور قدر ومنزلت کھو چکی تھی، معاہدۂ نکاح کو کچھ بھی وقعت حاصل نہ تھی، جب چاہا عورتوں کو طلاق دے دی اور جب چاہا واپس لے لی، یہودیوں کی شریعت میں بھی نکاح وطلاق کے سلسلے میں ایسی ہی آزادی تھی۔ یہودیوں کے ہاں نہ کوئی قید طلاق پر عاید تھی نہ شوہر پر اس باب میں کوئی ذمہ داری تھی۔ اُس کا جب جی چاہتا، وجہ بلا وجہ، بس

ایک طلاق نامہ لکھ کر بیوی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا، بیوی اسی وقت دوسری شادی کر سکتی تھی۔ اس کے مقابلے میں ہندوؤں میں نکاح کا فسخ ہونا کسی حالت میں بھی جائز اور درست نہیں ہے، عیسائی مذہب کی جو بنیادی اینٹ طلاق کے مسئلہ میں ہے، وہ ایسا تنگ قانون ہے کہ آج عملاً عیسائی اقوام خود اسے ترک کر چکی ہیں، گویا کہ یہ لوگ طلاق کے معاملے میں افراط اور تفریط کا شکار رہے ہیں۔

اسلام ہی وہ دین فطرت ہے جس نے زندگی کے ہر معاملے میں اعتدال اور حسن پیدا کیا، نہ اس نے عربوں اور یہودیوں جیسی آزادی رکھی اور نہ ہندوؤں اور عیسائیوں جیسی تنگی اور سختی ہی، بلکہ ایسی میانہ روی جو عقل سلیم کے عین مطابق ہے، اگر طلاق کی اجازت دی ہے تو اسے بھی حدود و قیود کے دائرے سے وابستہ کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی کہ اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ، الطَّلَاقُ، یعنی تمام حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسند چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق ہے۔ یہ ارشاد اس کی کراہت کے لیے کافی ہے اور جب میاں بیوی کے درمیان نباہ اور سمجھوتے کی کسی طرح کوئی شکل سامنے نہ آ رہی ہو تو پھر آخری بات طلاق کو اس لیے جائز رکھا گیا ہے تاکہ معاشرے کو جھگڑے اور فساد سے بچایا جائے کیونکہ اسلام یقیناً امن اور سلامتی کا دین ہے۔

آیہ مبارکہ کا آخری حصہ لوگوں کو پھر متنبہ کر رہا ہے کہ دیکھو تمہارا خالق و مالک سمیع اور علیم ہے، تمہاری تمام باتوں کو خواہ کیسے ہی چپکے چپکے کرو، سنتا ہے اور تمہارے دلوں کے راز اور ارادوں کو بھی جانتا ہے۔ تمہارے تمام ارادے اور منصوبے اس مالک الملک کے سامنے ہیں، لہٰذا کوئی ایسی بات نہ کرو جو ایمان اور اخلاق سے گری ہوئی ہو۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) اسلام ہر جاہلانہ رسم کو رد کرنے کے بعد اعتدال اور انصاف کی راہ بتاتا ہے جیسا کہ ان آیات میں ایلا کو صحیح رخ دیا ہے۔

۲) اسلامی شریعت میں طلاق کو صرف ضرورت کے موقع پر علاج اور آخری تدبیر کے طور پر جائز رکھا گیا ہے۔

۳) لوگوں کو معاملات پر غور و فکر کے لیے مناسب وقت اور موقع دیا گیا ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ، ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ بچار کیا کریں۔

۴) معاشرتی زندگی میں عدل وانصاف اور سکون وسلامتی کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اور یہی دین فطرت کی حقانیت ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ، وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا، وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۲۸)	اور طلاق یافتہ عورتیں تین ماہواریوں تک اپنے آپ کو (نکاح ثانی سے) روکے رکھیں، اور اگر وہ اللہ اور قیامت کے دِن پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں کہ جو چیز اللہ نے ان کے پیٹ میں پیدا کر دی ہے اسے چھپائے رکھیں اور (طلاق دینے والے) اُن کے شوہر عدت کے اس مقررہ زمانے کے اندر انہیں اپنی زوجیت میں لینے کے زیادہ حق دار ہیں اور (دیکھو) عورتوں کے لیے بھی اسی طرح حقوق مردوں پر ہیں جس طرح کے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں، البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک خاص درجہ دیا گیا ہے اور (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ عزیز (طاقتور ہے، قانون سازی کا صرف اسے حق ہے) حکیم ہے (دانا ہے، اس کا ہر قانون حکمت پر مبنی ہے)

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾

اور طلاق یافتہ عورتیں روکے رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ وہ عورتیں جنہیں طلاق دی گئی ہو، اس کا مفرد مُطَلَّقَه ہے، یَتَرَبَّصْنَ انتظار کریں، فعل مضارع جمع مؤنث غائب (تَرَبَّصَ، یَتَرَبَّصُ، تَرَبُّصًا) انتظار کرنا، روکے رکھنا بِاَنْفُسِهِنَّ (بِ. اَنْفُسِهِنَّ) ساتھ، اپنی جانوں کے یعنی اپنے آپ کو، ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ، تین حیض (تک) قُرُوْءٍ، کا مفرد قَرْءٌ ہے بمعنی حیض۔ امام راغب لکھتے ہیں: اَلْقَرْءُ فِی الْحَقِیقَةِ اِسمٌ لِلدُّخُوْلِ فِی الْمَحِیضِ عَنِ الطُّهْرِ" اَلْقُرْءُ حقیقت میں طہر (پاکیزگی) سے حیض (کی حالت میں) داخل ہونے کا نام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امّ حبیبہؓ بنت جحش سے فرمایا تھا: اُقْعُدِیْ عَنِ الصَّلٰوةِ اَیَّامَ اَقْرَ ائِكَ "حیض کے دنوں میں نماز ترک کیے رکھ۔" (مفردات القرآن)

﴿وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾

اور نہیں جائز ان کے لیے یہ کہ چھپائیں (اس چیز کو) جو پیدا کی، اللہ تعالیٰ نے، اُن کے شکموں میں، اگر ان کا ایمان ہے اللہ پر اور آخرت پر۔

وَلَا یَحِلُّ اور نہیں حلال (جائز) فعل منفی مضارع واحد مذکر غائب، اور یہ بات جائز نہیں ہے (حَلَّ، یَحِلُّ، حِلًّا) حلال ہونا، جائز ہونا لَهُنَّ (لَ. هُنَّ) لیے، ان کے، اَنْ یہ کہ یَّكْتُمْنَ چھپائیں وہ، فعل مضارع جمع مؤنث غائب (كَتَمَ، یَكْتُمُ، كِتْمَانًا) چھپانا، کتمان حق، حق بات کو چھپانا، اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مَا، جو، مائے موصول کہلاتا ہے، خَلَقَ اللّٰهُ، پیدا کیا اللہ نے، فعل ماضی واحد مذکر غائب (خَلَقَ، یَخْلُقُ، خَلْقًا) تخلیق کیا، پیدا کیا، اللہ تعالیٰ کی صفت، خالق، پیدا کرنے والا، فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ ان کے شکموں میں (اَرْحَام. هِنّ) شکموں۔ ان کے، اِنْ كُنَّ اگر ہیں (كان، یكون كونًا) ہونا كُنَّ، جمع مؤنث غائب کا صیغہ ہے، یُؤْمِنَّ وہ ایمان رکھتی ہیں، جمع مؤنث غائب (اٰمَنَ، یُؤمِنُ، اِیْمَانًا) ایمان رکھنا، بِاللّٰهِ (بِ. اللّٰهِ) ساتھ، اللہ کے، وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ، اور روزِ آخرت پر (کہ اس دن سب کا حساب کتاب ہوگا)۔

مولانا عبدالحی فاروقی لکھتے ہیں:

اَلْمُطَلَّقٰتُ، ہر طلاق یافتہ عورت کو مطلقہ کہا جاتا ہے، فقہ کی رو سے صرف وہ بیویاں مراد ہیں جو آزاد

ہوں، بالغ ہوں اوران سے خلوتِ صحیحہ (مقاربت) ہوچکی ہو۔''

یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ (اپنے آپ کوانتظار میں رکھیں) یعنی یہ نہ ہو کہ اِدھر شوہر نے طلاق دی اور ادھر دوسرا شوہر کرلیا، اس طرح یہ تعلق ایک کھیل بن کر رہ جائے گا۔ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ، (تین حیض تک) قرءٍ کے لفظی معنی محض ایک مقررہ مدت کے ہیں لیکن یہاں اس کے معنی حیض کے ہیں۔

مَا خَلَقَ اللّٰهُ (جو اللہ نے پیدا کیا) رحم کے اندر جو چیز ہو یعنی اگر حمل سے ہوں تو اپنا حمل چھپائیں نہیں۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر شوہر عورت کو طلاق دے دے تو اُس عورت کو فوراً دوسرا شوہر نہیں کر لینا چاہیے، بلکہ تین حیض تک انتظار کرنا چاہیے، اِس انتظار کی مدت میں بہت سی مصلحتیں ہیں، مثلاً ایک تو شوہر کو ٹھنڈے دل سے غور وفکر کا پورا موقع مل جاتا ہے، دوسری طرف حمل کی بابت پورا یقین ہو جاتا ہے، اس طرح کسی شخص کی اولاد کسی دوسرے کو نہیں ملتی اس لیے عورت کا فرض ہے کہ اس کے پیٹ میں جو ہو، اسے ظاہر کر دے (یعنی وہ حاملہ ہے یا نہیں؟)۔ (درس قرآن، جلد اول)

﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾

اور خاوند اُن کے زیادہ حقدار ہیں انہیں واپس لینے کے اس مدت میں اگر وہ ارادہ کریں صلح کرنے کا۔

وَبُعُوْلَتُهُنَّ (وَبُعُوْلَةُ.هُنَّ) اور خاوند۔ ان کے (عورتوں کے) بَعْلٌ، شوہر، خاوند اس کی جمع بُعُوْلَةٌ آتی ہے، هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب، اَحَقُّ، زیادہ حقدار ہیں، اسم تفضیل، بِرَدِّهِنَّ (بِ.رَدِّ.هِنَّ) ساتھ۔ واپس لینے۔ ان کے یعنی انہیں اپنی زوجیت میں واپس لینے کے، (رَدَّ، يَرُدُّ، رَدًّا) لوٹانا، واپس لینا، فِيْ ذٰلِكَ، اِس امر میں یعنی طلاق دینے کے بعد (اور انتظار کی اس مدت میں) اِنْ اَرَادُوْٓا اگر وہ ارادہ کریں فعل ماضی جمع مذکر غائب (اَرَادَ، يُرِيْدُ، اِرَادَةً) ارادہ کرنا، اِصْلَاحًا، صلح صفائی کا، خیر خواہی کا، (اَصْلَحَ، يُصْلِحُ، اِصْلَاحًا) صلح وصفائی کا ارادہ کرنا، خیر اور بھلا چاہنا۔ دوران مدت ان کے خاوندوں کو جنہوں نے اپنی بیویوں کو طلاق دی ہے، رجوع کر لینے کا زیادہ حق ہے بشرطیکہ وہ خیر خواہی اور نیک نیتی سے ایسا چاہتے ہوں۔

﴿وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِی عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

اوران عورتوں کا بھی دستور کے موافق مردوں پر حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر۔

وَ لَهُنَّ، وَ اور (لَ. هُنَّ) واسطے، ان عورتوں کے (حقوق ہیں) جو مردوں پر لازم ہیں کہ وہ ادا کریں۔ مِثْلُ، مثل اس کے، مانند اس کے، الَّذِی جو، عَلَیْهِنَّ (عَلٰی. هِنَّ) اوپر، ان کے، هِنّ کی ضمیر عورتوں کی طرف جاتی ہے یعنی (ایسے ہی حقوق ہیں جو عورتوں پر لازم ہیں کہ وہ مردوں کے ادا کریں) یعنی دونوں ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے رہیں، بِالْمَعْرُوْفِ، (بِ. الْمَعْرُوْفِ) ساتھ (شرعی) دستور کے، یہ حقوق باہمی کا معیار بتایا جارہا ہے یعنی ان حقوق کی جزئیات وتفصیلات کو شریعت ہی کے اصول وکلیات کے ماتحت ہونا چاہیے، نیز اس میں معاشرتی عادات اور رواج کے لحاظ سے بھی تشدد اور زیادتی نہ ہو، اِسی میں معاشرتی زندگی کی صحت وسلامتی ہے۔

﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ اور واسطے مردوں کے ان پر کچھ فضیلت بھی ہے۔

وَلِلرِّجَالِ، وَ. اور (لِ. لرِّجَالِ) اور لیے، مردوں کے، عَلَیْهِنَّ (عَلٰی. هِنَّ) اوپر۔ ان کے یعنی عورتوں پر دَرَجَةٌ درجہ (یعنی فضیلت ہے) ظاہر ہے کہ مردوں کو کچھ اس لحاظ سے فضیلت ہے کہ وہ معاشی اور سیاسی میدان میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں، وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ اور اللہ تعالیٰ غالب، حکمت والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ احکام نازل کرنے میں حاکم اعلیٰ ہے اور اس کے تمام تر احکام سراسر حکمت اور انسانوں کی بھلائی پر مبنی ہوتے ہیں۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اسلامی شریعت میں طلاق انتہائی ناپسندیدہ بات ہے تاہم غیظ وغضب میں آکر جو لوگ اپنی عورتوں کو طلاق دے بیٹھتے ہیں، ان مطلقہ عورتوں کو ہدایت دی جارہی ہے کہ وہ تین حیض تک انتظار کریں اور دوسری شادی نہ کریں۔ اس کی کئی مصلحتیں ہیں:

(ا) اس مدت میں حمل کی پوری طرح شناخت ہو سکے گی۔ حاملہ ہونے کی صورت میں عورتوں کو واضح حکم دیا جارہا ہے کہ وہ اس کو ظاہر کریں اور کسی طرح بھی نہ چھپائیں، حاملہ کی عدت وضعِ حمل تک ہے

اور اِس عدت کے دوران نان ونفقہ اور رہائش خاوند کے ذمے ہوتے ہیں۔

(ب) ہوسکتا ہے کہ خاوند ٹھنڈے دل و دماغ سے غور وفکر کرے اور اِس مدت میں وہ اپنی اہلیہ کو اپنی رفاقت میں رکھنے کا ارادہ کرلے سمجھوتے کے بعد وہ دونوں ہنسی خوشی کے ساتھ رہنا سہنا شروع کردیں۔

(ج) حاملہ ہونے کی صورت میں عورت کے لیے دوسرا نکاح شرعی، قانونی، معاشرتی اور اخلاقی ہر لحاظ سے ناجائز ہے، اگر عورت حمل کو چھپاتی ہے اور دوران حمل کسی دوسرے مرد سے شادی کرلیتی ہے تو بچے کو اس کے غیر باپ کے ساتھ ملا دیتی ہے جس کے بدترین اور سنگین نتائج ظاہر ہوں گے، بچہ اپنے جائز حقِ وراثت سے محروم ہو جائے گا، محرم عورتیں اس سے پردہ کریں گی، بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی کسی محرم عورت سے شادی کرلے، اسی طرح وہ جس غیر باپ کی طرف منسوب کردیا جائے گا، اس کے مال کا ناجائز وارث ہوگا، اس سے شر اور فساد کی کئی راہیں کھلیں گی، یہ تو دنیا کی بدبختیاں اور شقاوتیں ہوں گی، رہا آخرت کا عذاب اور اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشھادۃ کا غضب تو وہ الگ رہا۔

(ر) مطلقہ اگر حاملہ ہو اور وہ نکاح کرلیتی ہے تو یہ گویا نکاح نہیں بلکہ زنا ہے۔

(د) طلاق دینے والے مردوں کو اِس مخصوص مدت کے اندر اپنی بیویوں سے رجوع کرلینے کا حق ضرور دیا گیا ہے، لیکن ''اِن اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا'' یعنی اگر وہ صلح وصفائی، آشتی اور محبت کے ساتھ رہنا چاہیں تو ایسا کریں، لفظ اِصلاح کے اندر بڑی خوبیاں پنہاں ہیں..... نیک سلوک، احسان ومروت، مٹھاس اور محبت سبھی باتیں اس میں آجاتی ہیں۔

(ی) وہ عورتیں جنہیں مقاربت سے پہلے ہی ان کے خاوندوں نے طلاق دے ڈالی ہو ان کے لیے کوئی عدت نہیں ہے۔

۲) مرد اور عورتیں دونوں ایک دوسرے کے حقوق کی نگہبانی کریں، یہ سنہری اصول صرف دین اسلام کی خوبی اور خصوصیت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور صحابہؓ کی تعلیم وتربیت سے عورتوں کے حقوق تاقیامت محفوظ کردیے گئے جبکہ وہ اس سے پہلے تمام اخلاقی وانسانی حقوق سے یکسر محروم تھیں۔

۳) اِس آیہ مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن حکیم نے زوجین کو اُن کے ذمہ عائد ہونے والے فرائض

بتلائے ہیں کہ مردوں کے ذمہ عورتوں کے حقوق ادا کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسے کہ عورتوں پر مردوں کے حقوق ادا کرنا فرض ہے، اس میں اشارہ ہے کہ ہر فریق کو اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے بجائے اپنے فرائض پر نظر رکھنی چاہیے اور اگر وہ ایسا کر لیں تو مطالبہ حقوق کا جھگڑا ہی درمیان میں نہیں آئے گا، ظاہر ہے کہ مرد کے فرائض عورت کے حقوق ہوں گے اور عورت کے فرائض مرد کے حقوق ہوں گے اور جب فرائض (Duties) کی ٹھیک ٹھیک بجا آوری ہوگی تو حقوق (Rights) خود بخود ادا ہو جائیں گے اور یہی اصول افراد اور قوموں، ملکوں اور حکومتوں کے درمیان امن اور سلامتی کا باعث ہو سکتا ہے۔

۴) مرد اور عورت کی مثال گاڑی کے دو پہیوں کی سی ہے اور دونوں کی صحت، سلامتی، اخلاق کی درستی اور اعمال کی اصلاح ہی سے معاشرتی زندگی کی گاڑی کامیابی سے منزل مقصود کی طرف رواں دواں رہ سکتی ہے، اسلام دونوں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتا ہے اور دونوں کو اعمال صالحہ پر خوشخبری بھی سناتا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِن ذَكَرٍ اَوْ اُنثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (النحل ۱۶:۹۷) ''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔''

بلکہ اعمال صالحہ کے سرانجام دینے میں عورتیں مردوں سے بھی سبقت لے جا سکتی ہیں مگر سیاسی اور معاشی تگ و دو اور دوڑ دھوپ میں مردوں کو فضیلت حاصل ہے مثلاً میدانِ جنگ میں دشمن کے خلاف مرد صف آرا ہوتے ہیں، حکومت کے معاملات کو مرد چلاتے ہیں، کھیتی باڑی اور عمارتوں کی تعمیر مرد کرتے ہیں جبکہ امور خانہ داری اور بچوں کی پرورش اور نگہداشت عورتوں کے ذمہ ہیں یہاں پر اصول مساوات کو نہیں بلکہ اصول تقسیم کار کو پیش نظر رکھا گیا ہے گویا کہ مردوں کو انتظامی امور میں نگرانی کی وجہ سے عورتوں پر قدرے فضیلت حاصل ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ، فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ، وَلَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ شَیۡئًا اِلَّاۤ اَنۡ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ، فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ، فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِمَا فِیۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ، تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ، فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا، وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ، فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ (۲۲۹)	طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو دستور (شرعی) کے مطابق (بیوی کو) روک لینا ہے یا (پھر) حسن سلوک کے ساتھ اسے الگ کر دینا ہے اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو، اِلّا یہ کہ زوجین کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حد بندیوں پر قائم نہ رہ سکیں گے، پس اگر تمہیں (واقعی) اندیشہ ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہیں رہ سکیں گے، تو ان کے لیے اس میں کچھ گناہ نہ ہوگا اگر بیوی (اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے) بطور معاوضہ کچھ دے دلا دے، یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں، سو اِن سے تجاوز نہ کرو، اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کریں تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ، فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ﴾

طلاق دو بار ہے، (اس کے بعد) روکنا ہے معروف (پسندیدہ) طریقے سے یا پھر چھوڑ دینا ہے، احسان و مروت کے ساتھ۔

اَلطَّلَاقُ، دراصل اس کے معنی کسی بندھن سے آزاد کرنے کے ہیں، محاورہ ہے اَطْلَقْتُ الْبَعِیْرَ مِن عِقَالِہٖ میں نے اونٹ کا پائے بند کھول دیا، طَالِقٌ وَ طَلَقٌ، وہ اونٹ جو مقید نہ ہو، اسی سے خَلَّیْتُهَا کی طرح طَلَّقْتُ الْمَرْأَةَ کا محاورہ مستعار ہے، میں نے اپنی بیوی کو نکاح کے بندھن سے آزاد کر دیا۔

(مفردات القرآن)

مَرَّتٰنِ، دو بار، تثنیہ ہے، اس کا مفرد مَرَّةٌ ہے، یکبار، فَاِمۡسَاکٌ (ف. اِمۡسَاکٌ) پس۔ روکنا ہے،

(اَمْسَکَ، یُمْسِکُ، اِمْسَاکٌ) روکنا، بِمَعْرُوْفٍ (بِ.مَعْرُوْفٍ) ساتھ۔ بھلائی کے (پسندیدہ طریقے سے) اَوْ تَسْرِیْحٌ یا چھوڑ دینا ہے (سَرَّحَ، یُسَرِّحُ، تَسْرِیْحٌ) کسی چیز کو کھلا اور آزاد چھوڑ دینا، مقصد یہ ہے کہ یا تو اپنی بیوی کو سلوک اور محبت سے رکھو، اگر ایسا نہیں کر سکتے ہو تو اسے تنگ اور پریشان مت کرو بلکہ خوش اسلوبی سے رخصت کر دو: وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا (البقرہ۲:۲۳۱) ''اور جب تم عورتوں کو (دو دفعہ) طلاق دے چکو اور اُن کی مدت پوری ہو جائے تو انہیں یا تو حسن سلوک سے نکاح میں رہنے دو یا بطریق شائستہ رخصت کر دو اور اس نیت سے ان کو نکاح میں نہ رکھو کہ انہیں تکلیف دو۔''

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ..... اِلی الآخر، کا شانِ نزول اس طرح ہے کہ ''زمانہ جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں دستور تھا کہ لوگ اپنی بیویوں کو بغیر تحدید عدد طلاق دیتے رہتے تھے، ایک طلاق کی مدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتے تھے اور پھر طلاق دے دیتے تھے اور مقصود عورتوں کو نقصان پہنچانا ہوتا تھا، اِس ظالمانہ فعل سے بہت سی عورتوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی تھی۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نہ تجھے الگ ہونے دوں گا اور نہ ہی تجھے پناہ دوں گا، عورت نے پوچھا کہ وہ کیسے؟ تو اس نے کہا کہ میں تجھے طلاق دوں گا اور ہر بار عدت گزرنے سے پہلے تم سے رجوع کر لونگا، وہ عورت بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئی اور انہیں یہ بات سنائی، تو حضرت عائشہؓ خاموش رہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ ﷺ کو ماجرا سنایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ شوہر دو بار طلاق دے دے گا، اس کے بعد عورت جہاں چاہے گی اور جس سے چاہے گی (عدت پوری ہونے پر) شادی کر لے گی، اب شوہر کو مزید طلاق در جوع کا حق نہیں ہوگا۔'' (تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن)

اسلام نے دور جاہلیت کے اس بے لگام قانون کی اصلاح فرمائی اور ارشاد ہوا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ، طلاق دو بار ہے، یعنی خاوند کو رجوع کا حق دو بار تو ہے جبکہ یہ عرصہ عدت پورا ہونے تک اُسے فیصلہ کن بات کرنا ہوگی یا تو خوش اسلوبی سے بسانا ہوگا یا پھر شائستگی سے رخصت کر دینا ہوگا۔

لفظ ''مَرَّتَانِ'' پر پھر غور کیجئے، امام شوکانی لکھتے ہیں:

مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ، لَا طَلْقَتَانِ دَفْعَةً وَّاحِدَةً ''ایک بار طلاق دینے کے بعد دوسری طلاق کچھ عرصہ بیت جانے پر ہوگی نہ کہ دو طلاقیں ایک ہی بار۔'' (فتح القدیر)

صاحب روح المعانی علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

''مَرَّتَانِ کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرمادیا گیا ہے کہ دوطلاق بیک لفظ و بیک وقت نہ ہوں بلکہ دو طہروں (یعنی حیض کے بعد حالت طہر) میں الگ الگ ہوں، الطّلاقُ طَلَاقان سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہوسکتی تھی، مگر مَرَّتَانِ ایک ترتیب وتراخی کی طرف مشیر ہے، جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں، مثال سے یوں سمجھئے کہ کوئی شخص کسی کو دو روپیہ ایک دفعہ دیدے تو اس کو دو مرتبہ نہیں کہتے، الفاظ قرآن میں دومرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہر میں دوطلاق دی جائیں۔''

(بحوالہ معارف القرآن، جلداول)

﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا﴾

اورنہیں ہے جائز تمہارے لیے، یہ کہ لوتم اُن سے کچھ بھی جوتم نے انہیں دیا ہے ہیں۔

وَلَا يَحِلُّ اورنہیں حلال (جائز) فعل مضارع منفی، واحد مذکر غائب، لَكُمْ (لَ. كُمْ) لیے، تمہارے، اَنْ، یہ کہ تَاْخُذُوْا تم لومضارع جمع مذکر حاضر (اَخَذَ، يَأْخُذُ، اَخْذًا) لینا، مِمَّا (مِنْ. مَا) اُس میں سے، جو۔ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ (اٰتَيْتُمُوْ. هُنَّ) دیا تم نے انہیں، هُنّ کی ضمیر بیویوں کی طرف جاتی ہے، شَيْئًا، کچھ بھی، اسم نکرہ ہے، اس سے مراد مہر کے علاوہ ہر وہ چھوٹی بڑی چیز ہے جو بیوی کو تحفۃً دی ہو، اسے واپس لینا مروت اور مردانگی کے خلاف ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''طلاق کے وقت، اکثر انسان جب غصہ میں آکر طلاق دیتے ہیں، تو یہ بھی کرگزرتے ہیں کہ اب تک بیویوں کو دیا لیا چھین لیتے ہیں، عرب جاہلیت میں یہ دستور اور زیادہ پھیلا ہوا تھا، یہاں اُسی ظالمانہ دستور کی ممانعت ہے اور بتایا ہے کہ مہر وغیرہ جو کچھ انہیں پہلے دے چکے ہو، اب اُس کے چھیننے اور واپس لینے کا کوئی محل اور موقع نہیں ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلداول)

قرآن حکیم کی اخلاقی تعلیمات کی بلندی پر نگاہ ڈالیے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ، وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا، فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا (النساء۴:۲۰) ''اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ارادہ ہی کرلو تو خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال (خزانہ) ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔''

﴿اِلَّآ اَنۡ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ﴾

(مگر) یہ کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ تعالیٰ کی مقررہ کردہ حدوں کو۔

اِلَّا، کلمہ استثنا (مگر) اَنۡ، کہ یَّخَافَآ، وہ دونوں ڈریں (میاں اور بیوی) مضارع تثنیہ مذکر غائب (خَافَ، یَخَافُ، خَوۡفًا) ڈرنا، اندیشہ ہونا اَلَّا (اَنۡ.لَا) یہ کہ، نہ، ان دونوں لفظوں یعنی ان اور لا کو ملا کر پڑھنے سے الَّا ہو گیا اور ادائیگی میں ثقالت دور ہو گئی، عربی میں یہ قاعدہ اِدغام کہلاتا ہے، یُقِیۡمَا، وہ دونوں قائم رکھیں گے، فعل مضارع تثنیہ مذکر غائب (اَقَامَ، یُقِیۡمُ، اِقَامَۃٌ) قائم رکھنا، حُدُوۡدَ اللّٰہِ، اللہ کی عائد کردہ پابندیاں۔

امام شوکانی لکھتے ہیں:

''اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ'' حُسۡنَ الۡعَشۡرَۃِ والطّاعۃ، فَاِن خَافَا ذَالِكَ

یعنی میاں اور بیوی کو اندیشہ ہو کہ وہ حسن معاشرت اور اطاعت و فرمابرداری سے زندگی گزار نہ سکیں گے، (تو پھر اِس صورتِ حال میں علیحدگی ضروری ہو جاتی ہے تا کہ معاشرتی زندگی میں مزید اور خرابی پیدا نہ ہو)۔

﴿فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ، فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَا فِیۡمَا افۡتَدَتۡ بِہٖ﴾

پس اگر تمہیں (واقعی) اندیشہ ہو کہ وہ دونوں (میاں اور بیوی) حدود الٰہی پر قائم نہیں رہ سکیں گے تو ان کے لیے اس میں کچھ گناہ نہ ہوگا، اگر بیوی (اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے) کچھ دے دلا دے۔

فَاِنۡ (فَ.اِنۡ) پس اگر، خِفۡتُمۡ ڈرو تم، اندیشہ ہو تمہیں اَلَّا (اَنۡ.لَا) کہ نہ، یُقِیۡمَا، وہ دونوں قائم رکھیں گے، حُدُوۡدَ اللّٰہِ، اللہ کی حدیں، فَلَا (فَ.لَا) پس۔نہیں، جُنَاحَ، گناہ، عَلَیۡہِمَا (عَلٰی.ھما) اوپر، ان دونوں کے، فِیۡمَا (فِیۡ.مَا) میں۔ اس چیز میں اِفۡتَدَتۡ کہ بدلہ دے عورت۔ بِہٖ، (ب.ہ) ساتھ۔اس کے (یعنی مال کے)۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''بیوی اگر قید نکاح سے مخلصی پانے اور شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے لیے اپنے مہر سے یا اس کے کچھ حصہ سے دستبردار ہو جانا چاہے، تو یہ بھی ایک جائز صورت علیحدگی کی ہے اور اُس مال کو قبول کر لینا شوہر کے لیے درست ہوگا، طلاق کی اس خاص صورت کا نام جس میں طلاق کی خواستگار عورت ہو، اصطلاحِ

شریعت میں خلع ہے۔''

﴿تِلْکَ حُدُوْدَ اللّٰهِ، فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ یہ (ہیں) حدوداللہ (اللہ کی حدیں)

فَلَا (فَ.لَا) پس۔نہ، تَعْتَدُوْهَا، (تَعْتَدُوْ.هَا) تجاوز کرو تم، ان سے هَا کی ضمیر حدود کی طرف جاتی ہے (اِعْتَدَی، یَعْتَدِی، اِعْتِدَاء) تجاوز کرنا، حد سے بڑھنا، اللہ تعالیٰ کے بتائے اصولوں کو توڑنا۔

﴿وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ، فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

اور جو کوئی تجاوز کرتا ہے حدوداللہ سے، پس یہی لوگ ظالم ہیں۔

وَمَنْ اور جو کوئی، مَنْ، موصول، یَتَعَدَّ تجاوز کرتا ہے (تَعَدَّی، یَتَعَدّٰی، تَعَدِّیٌ) حد سے بڑھنا، تجاوز کرنا، حُدُوْدَ اللّٰهِ، اللہ کی حدیں، فَاُولٰٓئِکَ (فَ.اُولٰٓئِکَ) پس۔ یہ لوگ ہیں، هُمُ، وہی الظّٰلِمُوْنَ ظالم لوگ، ظَالِمُون کا مفرد ظَالِمٌ، اُولٰئِکَ کے بعد هُم ضمیر جمع مذکر غائب لا کر ان کے ظالم ہونے کی تاکید کر دی گئی ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) پاکیزہ اور صالح معاشرہ کی بنیاد مرد اور عورت دونوں کی صحیح خطوط پر تعلیم وتربیت سے پڑتی ہے۔

۲) نکاح پاکیزگی کی طرف اہم قدم ہے، اسی سے معاشرتی زندگی نشوونما پاتی اور پھلتی پھولتی ہے، طبیعتوں اور مزاجوں کے فرق اور تعلیم وتربیت کے تفاوت کی وجہ سے گھرانوں میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور کبھی کبھار نوک جھونک بھی ہوتی رہتی ہے، قرآن وسنت کی پاکیزہ تعلیمات کے مطابق ایک دوسرے کو معاف کر دینا اور درگزر کرنا ہی بہتر ہے اور جو مزہ معاف کر دینے میں آتا ہے وہ انتقام لینے میں نہیں آتا اپنے غصے کو پی جانے والے اور درگزر کرنے والوں کا مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس طرح ہوتا ہے: ''جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں..... ایسے نیک اللہ کو بہت پسند ہیں'' (پھر ایسے ہی پسندیدہ لوگ فوز وفلاح سے ہمکنار ہوں گے) (ال عمران ۳:۲۴)

''انہیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے۔'' (النور ۲۴:۲۲)

۳) میاں بیوی کو حسن سلوک سے رہنے کی تاکید کی گئی ہے مردوں کو حکم ہوتا ہے: وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء۴:۹) ''اور اُن (بیویوں) کے ساتھ اچھی طرح رہو سہو۔''
اسی طرح نیک عورتوں کے بارے میں فرمایا: فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النساء:۴/۳۴) ''تو جو نیک بیبیاں ہیں وہ مردوں کے حکم پر چلتی ہیں اور خاوندوں کی عدم موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں (مال و آبرو) کی خبرداری کرتی ہیں۔''
پھر مردوں کو بتلایا گیا کہ: اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاق ''کہ مباح باتوں میں مبغوض ترین اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق ہے۔''
عورتوں کو یہ بھی سمجھایا گیا:
اَيُّمَا اِمْرَاَةٍ سَاَلَتْ زَوْجَهَا طَلَاقًا فِيْ غَيرِ مَا بَأسٍ، فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الجَنَّةِ (مشکوٰۃ، باب الخلع) ''جو عورت اپنے خاوند سے بلاضرورت طلاق مانگے اُس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔''
۴) لڑائی جھگڑے کو ختم کر کے ہمیشہ صلح و صفائی کی طرف قدم بڑھانا چاہیے، قرآن کی یہی تعلیم ہے فَالصُّلْحُ خَيرٌ صلح میں ہمیشہ بھلائی اور برکت ہے۔'' ازدواجی زندگی کو خوشگواری سے گزارنا ہی بہتر ہے، جب حالات کسی صورت اور کسی طرح سنورتے نظر نہ آ رہے ہوں تو مرد کے لیے طلاق اور عورت کے لیے خلع کا راستہ تجویز کیا گیا ہے تاکہ معاشرتی زندگی کا امن اور سکون تہہ و بالا نہ ہو۔
۵) اسلام سے قبل کے عربوں کی طرح سینکڑوں مرتبہ طلاق دینے کے بعد رجوع کر لینے کا ظالمانہ فعل یکسر ختم کر دیا گیا ہے، اس کی جگہ بڑا آسان اور سہل طریق کار اختیار کیا گیا ہے، قرآن حکیم کے الفاظ بڑے واضح ہیں اور فقہی موشگافیوں سے آزاد ہیں، مولانا مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:
(۱) ''اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ'' یعنی طلاق دو ہی مرتبہ ہے، پھر ان دونوں مرتبہ کی طلاقوں میں یہ لچک رکھ دی کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا، بلکہ عدت پوری ہونے تک مرد کو اختیار ہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر رجوع نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، عدت پوری ہونے پر نکاح کا تعلق ختم ہو جائے گا (اور عورت آزاد ہو جائے گی) اسی مضمون کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا: فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيحٌ بِاِحْسَانٍ۔ یعنی یا تو شرعی قاعدے کے مطابق رجعت کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے یا پھر خوبصورتی و خوش معاملگی کے ساتھ اس کی عدت پوری ہونے دے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔'' (معارف القرآن، جلد اول)

(ب) اپنی بیوی کو خوش اسلوبی اور اچھائی سے رخصت کرتے وقت مرد کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کا بھی مطالبہ کرے یہاں تک کہ مال و دولت کے انبار بھی اس نے اگر دے رکھے ہوں تو انہیں واپس لینا مردانگی اور مروت کے خلاف ہے۔

(ج) بیوی اگر شوہر کے ظلم و ستم، بے اعتنائی اور بے رخی سے تنگ آ چکی ہو، تو مال دے کر بھی اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ معاملہ عدالت کے ذریعہ طے ہوگا، اور جج اس کا فیصلہ دے گا، اس طرح طلاق حاصل کرنے کا نام خلع ہے۔

(د) آیت ۲۲۹ میں دو بار طلاق دینے کے بعد مرد کو عدت کے اندر اندر رجوع کرنے کی سہولت اور رعایت دی گئی ہے تا کہ وہ یکسوئی اور اطمینان سے حالات کا بغور جائزہ لے اور معاشرتی زندگی کا تانا بانا نہ توڑے، اگر وہ اس رعایت اور چھوٹ کو نظر انداز کر کے تیسری بار بھی طلاق دے ڈالتا ہے تو اس سے رجوع کرنے کا اختیار بھی سلب کر لیا جاتا ہے بلکہ اگر دونوں راضی ہو کر آپس میں دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو بغیر ایک مخصوص صورت کے جس کا ذکر آیت ۲۳۰ میں آتا ہے دوبارہ نکاح بھی آپس میں حلال نہیں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ، فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ، وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۲۳۰)	پھر اگر (تیسری بار) طلاق دے دی، تو وہ عورت اُس (شخص) کے لیے حلال نہ ہوگی اِلّا یہ کہ اُس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ بھی اُسے طلاق دیدے (یا فوت ہو جائے) تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت یقین رکھتے ہوں کہ وہ اللہ کی حدود کی پابندی کر سکیں گے (تو وہ نکاح کی صورت میں) رجوع کر سکتے ہیں اور ان پر کچھ گناہ نہ ہوگا، یہ ہیں اللہ کی حدود جنہیں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لیے بیان فرماتا ہے جو سمجھ بوجھ سے کام لیں۔

﴿فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ﴾

پھر اگر مرد (تیسری) طلاق بھی دے دے تو اس کے بعد وہ عورت اُس کے لیے حلال نہ رہے گی یہاں تک کہ وہ عورت نکاح کرے کسی دوسرے شخص سے۔

فَاِنۡ (فَ.اِنۡ) پس۔ اگر، لَا تَحِلُّ، نہیں ہے حلال فعل نہی واحد مؤنث غائب (حَلَّ، یَحِلُّ، حِلٌّ) جائز ہونا، حلال ہونا، لَهٗ اس کے لیے یعنی اس خاوند کے لیے جس نے اپنی بیوی کو تیسری بار بھی طلاق دے ڈالی ہو، مِنۡۢ بَعۡدُ، اس کے بعد (طلاق دینے کے بعد) حَتّٰى، یہاں تک (کہ) تَنۡكِحَ، وہ عورت نکاح کرے مضارع واحد مؤنث غائب (نَكَحَ، یَنۡكِحُ، نِكَاحًا) نکاح کرنا، زَوۡجًا، خاوند (سے) غَيۡرَهٗ (غَيۡرَ.هٗ) غیر، اس کے، یعنی پہلے خاوند کے سوا کسی اور سے نکاح کرے۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب نکاح کا معاملہ بالکلیہ ختم ہو گیا، اس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا اور چونکہ اس نے شرعی حدود سے تجاوز کیا کہ بلاوجہ تیسری طلاق دیدی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو وہ بھی نہیں کر سکتے (جبکہ دو بار طلاق دینے کے بعد ایسا ممکن تھا) اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لیے شرط یہ ہے کہ یہ عورت (عدت طلاق پوری کر کے) کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوقِ زوجیت ادا کر کے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے (یا فوت ہو جائے) تو اُس کی عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے۔ آیت کے آخری جملے فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يَّتَرَاجَعَاۤ کا یہی مطلب ہے۔'' (معارف القرآن، جلد اول)

﴿فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يَّتَرَاجَعَاۤ﴾

پس اگر اس (دوسرے خاوند) نے اسے طلاق دے دی، پس نہیں گناہ ان دونوں پر (پہلے خاوند اور مطلقہ عورت پر) کہ وہ دونوں رجوع کر لیں (نکاح کر لیں)۔

فَاِنۡ (فَ.اِنۡ) پس، اگر، طَلَّقَهَا (طَلَّقَ.هَا) اس نے طلاق دی، اُسے، هَا کی ضمیر عورت کی طرف

جاتی ہے (طَلَّق، یُطَلِّقُ، طَلَاقًا) طلاق دینا، نکاح کے بندھن سے آزاد کرنا، یعنی دوسرے خاوند نے بھی کسی وجہ سے اس عورت کو طلاق دے ڈالی (یا اتفاق سے وہ فوت ہو گیا)، فَلَا (ف. لا) پس نہیں ہے، جُنَاحَ، حرج اور گناہ، عَلَيْهِمَآ (عَلٰی. هِمَا) پر، اُن دونوں کے یعنی ان کے اوپر، اَنْ يَّتَرَاجَعَآ یہ کہ وہ دونوں رجوع کر لیں مضارع تثنیہ مذکر غائب (تَرَاجَعَ، يَتَرَاجَعُ تَرَاجُعًا) رجوع کرنا، پس اگر دوسرے نے اُسے طلاق دے دی (یا اتفاق سے وہ فوت ہو گیا) تو سابقہ میاں بیوی اگر رجوع کر لیں اور دوبارہ رشتۂ نکاح میں منسلک ہو جائیں تو کوئی گناہ کی بات نہیں۔ (اسلام تو ہر حال میں انسانوں کو جوڑتا ہے اور معاشرتی زندگی کو سنوارتا اور نکھارتا ہے)۔ مگر یہاں پر بھی انصاف کی بات کی جا رہی ہے، وہ یہ ہے:

﴿اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾

اگر وہ دونوں یقین رکھتے ہوں کہ وہ دونوں قائم رکھیں گے اللہ تعالیٰ کی حدود کو۔

اِنْ اگر، شرطیہ ہے، ظَنَّا، ان دونوں نے گمان کیا تثنیہ مذکر غائب (انہیں اس بات کا ظَنِ غالب ہو) اَنْ يُّقِيْمَا کہ وہ دونوں قائم رکھیں گے (اَقَامَ، يُقِيْمُ، اِقَامَةً) قائم رکھنا، حُدُوْدَ اللّٰهِ، اللہ کی حدیں، دونوں یہ سمجھتے ہوں کہ وہ دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش اسلوبی اور خوش اخلاقی سے نباہ کر سکیں گے تو دوبارہ نکاح کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ پہلے خاوند کے ساتھ نکاح کی یہ شکل صرف اسی صورت میں جائز ہو گی جبکہ دوسرا خاوند اتفاق سے فوت ہو جائے یا پھر کسی وجہ سے وہ خود ہی طلاق دے ڈالے اور اسے کسی طرح بھی مجبور نہ کیا گیا ہو۔

مگر افسوس کہ بعض لوگ حیلے اور بہانے کی ایک صورت پیدا کرتے ہیں یعنی جب پہلے خاوند نے طلاق دے دی پھر اس کو اپنی حرکت پر ندامت ہوئی اور اس نے دوبارہ نکاح کی آرزو کی، تو اس کی خاطر مطلقہ سے ایک شخص نے نکاح کر لیا اور دو چار روز کے بعد اسے طلاق دے ڈالی تا کہ وہ پھر پہلے خاوند سے نکاح کر سکے اور اس کے لیے حلال ہو سکے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض اپنی مطلقہ بیوی کو حلال کرنے کی خاطر کسی سے

اس کا اس شرط پر نکاح کرائے کہ وہ نکاح کے بعد دوسرے یا تیسرے دن اسے طلاق دے دے گا، تا کہ یہ عورت پھر اپنے پہلے خاوند کے لیے حلال ہو سکے (جسے شرعی اصطلاح میں حلالہ کہتے ہیں) تو یہ نکاح درست نہیں بلکہ یہ بدکاری ہوگی، اِس طرح کے سازشی نکاح وطلاق سے وہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے ہرگز حلال نہ ہوگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس طرح حلالہ نکالنے والے اور نکلوانے والے پر لعنت فرمائی اور حلالہ نکالنے والے کو تَیْسٌ مُسْتَعَارٌ (کرائے کا سانڈ) کہا ہے۔ (تیسیر القرآن بحوالہ ابوداؤد، کتاب النکاح) کرایہ کا سانڈ کہنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے وہ کام کیا ہے جو جانور کرتے ہیں اور یہ بات شرف انسانیت کے خلاف ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا کہ ایسے حلالہ کرنے والے اور کرانے والے دونوں کو زنا کی سزا دی جائے۔ (بیہقی، حوالہ ایضاً)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مرد لایا گیا، جس نے ایک عورت سے صرف اس لیے شادی کی تھی کہ اس کو پہلے شوہر کے لیے حلال کر دے، آپ نے ان دونوں میں تفریق کرا دی۔

(الفرقان فی معارف القرآن)

حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری قوم میں سے ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دیں اس پر وہ دونوں نادم ہوئے، میرا ارادہ ہے کہ اس عورت سے نکاح کر لوں، اس کا مہر ادا کروں، اور پھر جس طرح شوہر اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے، جاؤں اور اس کے بعد اسے طلاق دے دوں تا کہ وہ اپنے شوہر کے لیے حلال ہو جائے، حسن بصریؒ نے جواب دیا: اِتَّقِ اللّٰهَ يَا فَتٰى وَلَا تَكُوْنَنَّ مِسْمَارَ نَارٍ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ''اے نوجوان! اللہ سے ڈر اور اس کی حدود کے لیے آگ کی کھونٹی نہ بن۔''

اس قسم کے حلالہ کی کتنے ہی اکابر محدثین اور مفسرین نے مخالفت کی ہے اِن میں سعید بن المسیبؒ، حسن بصریؒ، ابراہیم نخعیؒ، عطا بنؒ ابی رباح، ابوالشعثاؒ، جابر بن یزید، شعبیؒ، قتادہؒ، بکرؒ بن عبداللہ المزنی، مالکؒ بن انسؒ، امام اوزاعیؒ، لیثؒ بن سعد، سفیانؒ ثوری، امام احمدؒ بن حنبل، اسحاقؒ بن راہویہ، سلیمانؒ بن داؤد الہاشمی، ابوخثیمہؒ، زہیرؒ بن حرب، ابوبکرؒ بن شیبہ اور ابواسحاقؒ الجوز جانی ایسے اصحابِ علم شامل ہیں۔ (حوالہ ایضاً)

﴿وَ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یُبَیِّنُهَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ﴾

اور یہ اللہ تعالیٰ کی (قائم کردہ) حدیں ہیں جو وہ بیان کرتا ہے اُس قوم کے لیے جو سمجھ بوجھ سے کام لے۔

وَ تِلْکَ، اسم اشارہ، اور یہ، حُدُوْدُ اللّٰهِ، مشارٌ اِلَیه، اللہ تعالیٰ کی حدیں (اس کے عطا کردہ قوانین)، حد کی جمع حدود ہے، یُبَیِّنُهَا (یُبَیِّنُ.هَا) وہ بیان کرتا ہے.....انہیں، هَا کی ضمیر واحد مؤنث غائب حدوداللہ کی طرف جاتی ہے (بَیَّنَ، یُبَیِّنُ، تَبیِیْنٌ) بیان کرنا، لِقَوْمٍ (لِ.قَوْمٍ) لیے، اس قوم کے یعنی (ان لوگوں کے لیے) یَّعْلَمُوْنَ جو سوچ بچار سے کام لیں، مضارع جمع مذکر غائب، قوانین کا فائدہ تو انہی لوگوں کو پہنچتا ہے جو اس کی پابندی کریں۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) مرد اور عورت کے نکاح سے ایک معاہدہ طے پاتا ہے، ایک مضبوط تعلق استوار ہوتا ہے۔ دو خاندان آپس میں جڑتے ہیں، دو گھرانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات پیدا ہوتے ہیں، جس سے معاشرتی زندگی پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے، یہ کوئی بازیچہ اطفال نہیں کہ جب جی چاہے اسے توڑ کر رکھ دیا جائے، اس میں خالقِ کائنات کو گواہ اور نگران بنایا جاتا ہے، لہٰذا اسی کا خوف اور ڈر ہمیشہ دامن گیر رہنا چاہیے، نکاح کے وقت قرآن حکیم کے یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں:

وَاتَّقُوْا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ، اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا (النساء۴:۱)

''(دیکھو) اس اللہ سے ڈرتے رہو، جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور قریبی رشتوں کے معاملے میں بھی اسی کا خوف کھاتے رہو، بلاشبہ اللہ تم پر ہر وقت نظر رکھے ہوئے ہے۔''

۲) مرد اور عورت کے نکاح کو مضبوط بنیادوں پر اٹھایا گیا ہے، اسے اصول اور ضابطہ کا پابند بنایا گیا ہے، کوشش یہ کی گئی ہے کہ نکاح کا یہ بندھن آسانی سے ٹوٹنے نہ پائے اور صلح وصفائی اور عفو ودرگزر کی تعلیم بار بار دی گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر یہ ممکن نہ ہو تو مرد کو طلاق دینے کی ترتیب سکھلائی گئی ہے، پہلے دو بار طلاق دینے پر عدت کے اندر رجوع کرنے کا مرد کو اختیار دیا گیا ہے اور ٹھنڈے دل ودماغ سے غور وفکر کرنے کا مناسب موقع فراہم کیا گیا ہے مگر تیسری بار طلاق دینے پر یہ حق چھین لیا گیا ہے اور

ایک ہی نشست میں تین بار طلاق دینے کو بھی سختی سے منع کر دیا گیا ہے، ذرا السانِ نبوت سے سنیے: أُخْبِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ اِمْرَأَتَهٗ ثَلَاثَ تَطْلِيقَاتٍ جَمِيْعًا فَقَام غَضْبَانًا، ثُمَّ قَالَ: أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَ اَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ حَتّٰى قَامَ رَجُلٌ وَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَا اَقْتُلُهٗ (نسائی، کتاب الطلاق بحوالہ معارف القرآن، جلد اول) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک آدمی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں، آپ ﷺ غصے میں آ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں، اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا، اے اللہ کے رسول ﷺ کیا میں اس کو قتل نہ کر دوں؟ (یعنی طلاق دینے والے کو)''

۳) حلالہ کی جائز شکل وہ ہے جس کا قرآن نے اس آیہ مبارکہ میں ذکر کر دیا ہے کہ مطلقہ کسی نئی جگہ نکاح کرے، اتفاقاً وہ شخص طلاق دے ڈالے یا فوت ہو جائے تو اس کا نکاح پہلے خاوند سے ہو سکتا ہے جبکہ وہ دونوں صدق دل سے حقوق کی پاسداری کرنے کا یقین رکھتے ہوں۔

۴) اور جن لوگوں نے جھٹکے سے اپنی طرف سے حلالہ کا جواز نکالا ہے وہ قطعی ناجائز اور حرام ہے، عورت پر ظلم اور زیادتی ہے، حیا اور غیرت کے منافی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حیا ہی نہ رہے تو ایمان کی حلاوت اور چاشنی کیسے آئے؟ اور اللہ تعالیٰ کی حدود کو تو وہی لوگ قائم رکھتے ہیں جو سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ	اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آ جائے تو پھر یا تو حسن سلوک سے انہیں اپنے پاس رکھو یا پھر بھلے طریقے سے رخصت کر دو، محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روکے رکھو اور جو ایسا کرے گا، وہ درحقیقت اپنے ہی اوپر ظلم کرے گا، (اور دیکھو) اللہ کی آیات کو کھیل نہ بناؤ اور بھول نہ

عَلَيْكُمْ وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۳۱)	جاؤ کہ اللہ نے کس نعمت عظمیٰ سے تمہیں سرفراز کیا ہے اور جو کتاب وحکمت اس نے تم پر نازل کی ہے جس کے ذریعہ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے (اس کا احترام ملحوظ رکھو) اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ کو ہر بات کا علم ہے۔

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾

اور جب طلاق دو تم، عورتوں کو، پس پہنچیں وہ اپنی عدت کو۔

وَاِذَا اور جب اِذَا کلمہ شرط ہے طَلَّقْتُمُ طلاق دو تم، فعل ماضی جمع مذکر حاضر (طَلَّقَ، يُطَلِّقُ، تَطْلِيقٌ) طلاق دینا، النِّسَآءَ، عورتیں اس کا مفرد اِمْرَاَةٌ (عورت) ہے، فَبَلَغْنَ (فَ. بَلَغْنَ) پس، وہ پہنچیں، فعل ماضی جمع مؤنث غائب (بَلَغَ، يَبْلُغُ، بُلُوْغًا) پہنچنا۔ بلاغ یا بلوغ اصل میں تو کسی مقصد کے انتہا کو پہنچ جانے کا نام ہے مگر کبھی اس کے قریب پہنچ جانے پر بھی بولا جاتا ہے (مفردات القرآن) یہاں اختتام میعاد کے قریب پہنچنا ہی مراد ہے کیونکہ اگر واقعی میعاد کو پورا کرلیں تو پھر ''اَمْسِكُوْهُنَّ'' یعنی روک رکھنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ اَجَلَهُنَّ (اَجَلَ. هُنَّ) وقت اپنے کو، اَجَلُ کسی چیز کے لیے جو وقت مقرر کردیا جائے، وہ اس کی اجل کہلاتا ہے، یہاں مراد عورت کی عدت ہے، یعنی عورت کی عدت پوری ہونے کو ہو (پوری نہ ہو چکی) یہ طلاق رجعی کے بارے میں بات ہو رہی ہے (جس میں رجوع کا اختیار ہوتا ہے)۔

﴿فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾

پھر یا تو حسن سلوک سے انہیں اپنے پاس رکھو یا پھر بھلے طریقے سے رخصت کردو۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ (فَ. اَمْسِكُوْ. هُنَّ) پس، روک لو، انہیں (اَمْسَكَ، يُمْسِكُ، اِمْسَاكًا) روکنا، رجوع کرنا، بِمَعْرُوْفٍ (بِ. مَعْرُوْفٍ) ساتھ، بھلائی کے یعنی حسن سلوک اور مروت کے ساتھ، اَوْ، یا، سَرِّحُوْهُنَّ (سَرِّحُوْ. هُنَّ) آزاد کرو۔ انہیں، هُنَّ کی ضمیر عورتوں کی طرف جاتی ہے (سَرَّحَ، يُسَرِّحُ،

تَسۡرِیۡحًا) آزاد کرنا، چھوڑ دینا، بِمَعۡرُوۡفٍ (بِ.مَعۡرُوۡفٍ) ساتھ، بھلائی کے یعنی یا تو بھلے طریق سے روک لو یا عزت وتکریم سے رخصت کردو۔

﴿وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا﴾

اور نہ روکو اُن (عورتوں) کو ضرر پہنچانے کے لیے تاکہ زیادتی کرو۔

(وَلَا تُمۡسِكُوۡ.هُنَّ) اور نہ روکو تم انہیں، فعل نہی جمع مذکر حاضر (اَمۡسَک، یُمۡسِکُ، اِمۡسَاکٌ) روکنا، هُنَّ، انہیں (عورتوں کو) هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب، ضِرَارًا، ضرر پہچانے کے لیے (ضَارَّ، یُضَارُّ، ضِرَارًا) تکلیف دینا، دکھ دینا، لِتَعۡتَدُوۡا (لِ.تَعۡتَدُوۡا) تاکہ۔ تم زیادتی کرو (اِعۡتَدَی، یَعۡتَدِی، اِعۡتِدَاءٌ) تعدی کرنا، زیادتی کرنا یعنی تم عورتوں کو ایذا رسانی کے لیے نہ روکو۔

﴿وَ مَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ﴾

اور جو کوئی کرے گا یہ کام، پس تحقیق ظلم کیا اس نے اپنے نفس پر۔

وَمَنۡ اور جو کوئی مَنۡ موصول ہے یَّفۡعَلۡ کرتا ہے یا کرے گا (فَعَلَ، یَفۡعَلُ، فِعۡلًا) کرنا، ذٰلِكَ، اسم اشارہ مذکر بعید، اس طرح، ایسے، فَقَدۡ (فَ.قَدۡ) پس تحقیق، ظَلَمَ، اس نے ظلم کیا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (ظَلَمَ، یَظۡلِمُ، ظُلۡمًا) ظلم کرنا نَفۡسَهٗ، (نفس.هٗ) نفس اپنے پر یعنی جو شخص ایذا رسانی کے لیے رجوع کرتا ہے وہ گویا اپنے اس عمل سے خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔

﴿وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ اور نہ بناؤ، اللہ کی آیات کو تمسخر (کھیل)۔

وَلَا تَتَّخِذُوۡا اور نہ بناؤ، فعل نہی جمع مذکر حاضر (اِتَّخَذَ، یَتَّخِذُ، اِتِّخَاذًا) پکڑنا۔ بنانا، اٰيٰتِ اللّٰهِ، اللہ کی آیات، اٰیاتٌ کا مفرد آیۃ ہے۔ قرآن حکیم میں ایک گول دائرہ سے دوسرے گول دائرہ تک کی عبارت آیت کہلاتی ہے، آیات، اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں، هُزُوًا، تمسخر (کھیل) کہ آیات الٰہی پر جیسے دل نے چاہا ویسے ہی عمل کرلیا۔

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ﴾

اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو اس نے تمہارے اوپر کی ہے اور جو اتارا ہے تمہارے اوپر کتاب سے اور حکمت سے کہ نصیحت کرتا ہے تم کو، ساتھ اس کے۔

وَاذْكُرُوْا، اور یاد کرو فعل امر جمع مذکر (ذَكَرَ، يَذْكُرُ، ذِكْرًا) یاد کرنا، نصیحت پکڑنا، نِعْمَتَ اللّٰهِ، اللہ کی نعمت، عَلَيْكُمْ (عَلٰى. كُمْ) اوپر۔ تمہارے۔ وَمَآ اَنْزَلَ اور جو اتارا، مَا، موصول ہے، اَنْزَلَ اتارا، ماضی واحد مذکر غائب (اَنْزَلَ، يُنْزِلُ، اِنْزَالاً) اتارنا، نازل کرنا، عَلَيْكُمْ (عَلٰى. كُمْ) اوپر۔ تمہارے، مِّنَ الْكِتٰبِ کتاب سے، اَلْكِتاب، ال (الف، لام) لگنے سے خاص کتاب (Proper Name) یعنی قرآن حکیم، وَالْحِكْمَةِ اور دانائی، حکمت سے مراد مفسرین نے سنت مطہرہ لیا ہے، يَعِظُكُمْ بِهٖ، وہ نصیحت کرتا ہے تمہیں ساتھ اس (کتاب کے)۔ ظاہر ہے اس کتاب کو سمجھنے کے لیے سنت مطہرہ لازمی ہے۔ يَعِظُكُمْ (يَعِظُ. كُمْ) وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے (وَعَظَ، يَعِظُ، وَعْظًا) نصیحت کرنا، وعظ و نصیحت اردو میں استعمال ہوتا ہے، بِهٖ (بِ. ہٖ) ساتھ، اس کتاب کے۔

اس نعمت کو دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ ۵:۳) "آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین (طریق زندگی) پسند کیا۔"

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾

اور ڈرو اللہ سے اور جان لو بے شک اللہ ہر بات کو جاننے والا ہے۔

وَاتَّقُوا، اور ڈرو، فعل امر جمع مذکر (اِتَّقٰى، يَتَّقِيْ، اِتِّقَاءٌ) ڈرنا، خوف کھانا، دراصل تقویٰ یہ ہے کہ ہر لمحہ اور ہر لحظہ اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں سمایا رہے۔ اور انسان برائیوں کو چھوڑ کر نیکیاں اختیار کرے۔ قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کا کئی مقامات پر حکم دیا ہے اور خاص طور پر اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم اس لیے ہو رہا ہے کہ کہیں حماقت اور نادانی سے تم عورتوں پر بے جا ظلم نہ کرنے لگو۔

وَاعْلَمُوْٓا اور جان لو، فعل امر جمع مذکر (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، کسی بات کو پہچاننا، اَنَّ اللّٰهَ، بے

شک اللہ تعالیٰ، اَنَّ کلمۂ تحقیقِ کلام ہے، بِکُلِّ (بِ. کُلِّ) ساتھ، ہر چیز عَلِیْمٌ، باخبر ہے (عَلِمَ، یَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، باخبر ہونا، اسے ظاہر اور چھپی ہوئی باتوں کا علم ہے لہٰذا تقویٰ کی بات یہی ہے کہ تم کوئی کام ایسا نہ کرو جو اُس کی رضامندی کے خلاف ہو کیونکہ تمہارا ظاہر اور باطن اسے خوب معلوم ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''ایک مطلقہ کے لیے انتظار کی جو مدت شریعت نے مقرر کی ہے وہ آیت ۲۲۸ میں بتا دی گئی ہے اور آیت ۲۲۹ میں طلاق کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ تیسرے طہر میں یا تو دستور کے مطابق بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لو اور اگر یہ منظور نہ ہو تو پھر حسن و خوبی کے ساتھ اس کو رخصت کر دو، اب اِس آیت میں اِس امر کی مزید وضاحت فرما دی کہ ''دستور کے مطابق روکنے'' سے شریعت کا کیا منشا ہے؟ اس منشا کی وضاحت یوں فرمائی کہ یہ روکنا ہرگز ہرگز اس ارادے کے ساتھ نہ ہو کہ اس طرح بیوی تمہارے پنجۂ ستم میں اسیر رہے اور تم اس کو اپنی خواہش کے مطابق اذیت پہنچا سکو، مثبت پہلو سے بات اوپر کہہ چکنے کے بعد منفی پہلو سے بھی اس کی وضاحت اس لیے کر دی گئی کہ ظالم لوگ طلاق اور طلاق کے بعد مراجعت کے شوہری حق کو اس ظلم کے لیے استعمال کر سکتے تھے حالانکہ یہ صریح اعتداء یعنی اللہ کے حدود سے تجاوز اور اس کی شریعت کو مذاق بنانا ہے، فرمایا جو ایسی جسارت کرتے ہیں بظاہر وہ ایک عورت کو نشانہ ظلم بناتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ سب سے بڑا ظلم اپنی جان پر کرتے ہیں کیونکہ اللہ کے حدود کو پھاندنے اور اس کی شریعت کو مذاق بنانے کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو کہ اس نے تمہیں ایک برگزیدہ امت کے منصب پر سرفراز فرمایا، تمہاری ہدایت کے لیے تمہارے اندر اپنا نبی بھیجا، تمہیں خیر و شر اور نیک و بد سے آگاہ کرنے کے لیے تمہارے اوپر اپنی کتاب اتاری جو قانون اور حکمت دونوں کا مجموعہ ہے، اللہ کی ایسی عظیم نعمتیں پانے کے بعد اگر تم نے ان کا یہی حق ادا کیا ہے کہ اللہ کے حدود کو توڑا اور اس کی شریعت کو مذاق بنایا تو سوچ لو کہ ایسے لوگوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے! پھر فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ وہ تمہاری ہر بات سے باخبر ہے، یعنی وہ لوگوں کی شرارتوں کے باوجود ان کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن جب وہ پکڑے گا تو اس کی پکڑ سے کوئی بھی چھوٹ نہ سکے گا۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ مذاق بنانے کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جائے

بلکہ اس کی ایک نہایت سنگین شکل یہ بھی ہے کہ ظاہری اعتبار سے تو کام ایسا کیا جائے کہ اس پر کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے لیکن مقصد و منشا کے لحاظ سے وہ کام شریعت کے مقصد کے بالکل خلاف ہو، مثلاً تیسرے طہر میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مراجعت کرے تو از روئے شریعت اس کو اس کا حق تو حاصل ہے لیکن اگر اس سے اس کا مقصد بیوی کو تنگ کرنا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اللہ کی آیات کے پردے میں اللہ ہی کی مخالفت کی، ظاہر ہے کہ یہ اللہ اور اس کی شریعت کے ساتھ صریح مذاق ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) غور کیجئے کہ اسلام اخلاقی اور قانونی طور پر حقوق کی حفاظت کس طرح کرتا ہے، مرد اگر طلاق دینے کے بعد عدت کے اندر صرف ایذا رسانی کے لیے بیوی سے رجوع کرتا ہے تو عورت ایسے مرد سے قانوناً بھی عدالت کے ذریعہ چھٹکارا حاصل کر سکتی ہے۔

۲) جو خاوند یہ کہہ کر عورتوں کو معلق چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم تمہیں طلاق دیں گے نہ بسائیں گے، یہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کے یہاں مجرم ہیں بلکہ یہ شریعت حق سے مذاق اور تمسخر بھی ہے اور اس سے ان کو مزید سزا ملے گی۔

۳) اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑانے والے دنیا اور آخرت میں خائب و خاسر ہوتے ہیں۔

۴) مسلمانوں کو دین اسلام کی جو اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے قدر کرنی چاہیے، قرآنی احکام کو حرز جاں بنانا چاہیے اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشعل راہ، اسی سے ہمارے اسلاف کامیاب ہوئے اور ہماری کامیابی کی بھی صرف اور صرف یہی راہ ہے، آج امت مسلمہ کی ذلت و خواری کا سبب اسی راہ سے دوری اور مہجوری ہے۔

۵) ''تقویٰ'' کی راہ زندگی گزارنے کا وہ بے خطا اور صحیح راستہ ہے جس سے کامیابی یقینی قرار پاتی ہے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۳۲)	اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی اور وہ اپنی (عدت کی) مدت پوری کر چکیں، تو انہیں معروف طریق پر اپنے (پہلے) خاوندوں (جبکہ انہوں نے طلاق رجعی دی ہو) سے نکاح کرنے سے نہ روکو، جو کوئی تم میں سے اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اُسے اس بات کی نصیحت کی جاتی ہے، یہ تمہارے لیے خوب تر اور پاکیزہ تر بات ہے اللہ تعالیٰ (تمہاری حسنِ معاشرت کے ان اسرار و رموز کو) جانتا ہے جسے تم نہیں جانتے ہو۔

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾

اور جب تم طلاق دے دو، عورتوں کو، پس وہ پہنچیں اپنی عدت کو۔

وَاِذَا، کلمۂ شرط طَلَّقْتُمْ تم نے طلاق دی، فعل ماضی جمع مذکر حاضر (طَلَّقَ، يُطَلِّقُ، تَطْلِيْقًا) طلاق دینا، النِّسَآءَ، عورتیں اس کا مفرد اِمْرَأَةٌ ہے، فَبَلَغْنَ (فَ. بَلَغْنَ) پس، پہنچیں (وہ) فعل ماضی جمع مؤنث غائب (بَلَغَ، يَبْلُغُ، بُلُوْغًا) پہنچنا، ذرائع ابلاغ اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ اَجَلَهُنَّ (اَجَلَ. هُنَّ) وقت، اپنے کو یعنی ان کی عدت پوری ہو جائے (اور عورت کی عدت تین دفعہ حیض کا آنا ہے، دیکھیے آیت ۲۲۸) اور حاملہ کی عدت وضع حمل ہے حکم ہے کہ اگر چار و ناچار طلاق دینی ہی پڑے تو حالت طہر میں دو۔

﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

پس مت روکو انہیں (اس بات سے) کہ وہ نکاح کر لیں اپنے خاوندوں سے (جنہوں نے طلاقِ رجعی طلاق دی ہو جبکہ وہ راضی ہوں آپس میں معروف طریقے سے۔

فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ (فَ.لَا) پس۔ نہ، تَعْضُلُوْهُنَّ (فَلَا تَعْضُلُوْا.هُنَّ) منع کرو۔ (عورتوں کو) (عَضَلَ، يَعْضَلُ، عَضْلًا) روکنا، رکاوٹ ڈالنا، هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب (وہ عورتیں جنہیں طلاق دی گئی ہو) العضل کے معنی منع کرنے اور رکاوٹ ڈالنے کے ہیں، عَضَلَ الْاَمْرُ، معاملہ سخت اور مشکل ہونا، اَنْ يَّنْكِحْنَ فعل مضارع جمع مؤنث غائب، یہ کہ نکاح کریں (نَكَحَ، يَنْكَحُ، نِكَاحًا) نکاح کرنا، اَزْوَاجَهُنَّ (اَزْوَاجَ.هُنَّ) خاوندوں، اپنے سے هُنَّ، ضمیر جمع مؤنث غائب ان عورتوں کی طرف جاتی ہے جنہیں طلاق دے دی گئی ہو، اَزْوَاجَهُنَّ (اَزْوَاجَ.هُنَّ) خاوندوں اپنے سے، ازواج کا مفرد زوج ہے، هُنَّ جمع مؤنث غائب، ان عورتوں کی طرف جاتی ہے جنہیں طلاق دی گئی ہو، یعنی یہ عورتیں اگر دوبارہ اپنے سابقہ خاوندوں سے چاہیں تو نکاح کرسکتی ہیں جبکہ طلاق رجعی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی نیت صاف اور پاکیزہ ہو، اِذَا تَرَاضَوْا جب راضی ہو، اِذَا، جب کلمۂ شرط ہے، تَرَاضَوْ فعل ماضی جمع مذکر غائب (تَرَاضَى، يَتَرَاضَى، تَرَاضِيٌ) باب تفاعل باہم راضی ہونا، ایک دوسرے سے متفق ہونا، بَيْنَهُمْ، باہم، آپس میں بِالْمَعْرُوْفِ (بِ.الْمَعْرُوْفِ) ساتھ، معروف طریقے سے، یعنی معاشرتی زندگی کے معروف طریق پر وہ زندگی گزارنا چاہیں تو دوبارہ نکاح کرسکتے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾

اس (بات) کی نصیحت کی جاتی ہے اُسے جو ہوتم میں سے ایمان رکھتا، اللہ اور قیامت کے دن پر۔

ذٰلِكَ، اسم اشارہ بعید، اس (بات) کی، زورِ بیان کے لیے، دور کا اشارہ نزدیک کے لیے استعمال ہوتا ہے، يُوْعَظُ فعل مضارع مجہول واحد مذکر غائب (وَعَظَ، يَعِظُ، وَعْظًا) وعظ و نصیحت کرنا، يَعِظُ سے يُوْعَظُ مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ بِهٖ (بِ.ہٖ) ساتھ۔ اس کے۔ یعنی ایک دوسرے کے ساتھ تم صلح و صفائی سے رہو سہو گے تو پھر نکاح کرنا ورنہ نہیں، یہ بات کسے سمجھائی جارہی ہے؟ مَنْ كَانَ، جو، ہو (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، مِنْكُمْ (مِنْ.كُمْ) سے۔ تم یعنی تم میں سے، يُؤْمِنُ، ایمان رکھنا (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا) ایمان رکھنا، بِاللّٰهِ (بِ.اللّٰهِ) ساتھ، اللہ کے وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اور قیامت کے دن پر۔

﴿ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ﴾

یہ (بات) بہت خوب تر ہے، تمہارے لیے اور پاکیزہ ہے۔

ذٰلِكُمْ، اسم اشارہ بعید، اَزْكٰى، ای اَنْمیٰ و اَنْفَعُ، ازکی کے معنی زیادہ برکت اور زیادہ نفع کا باعث وَاَطْهَرُ من الْاَدْنَا میں اور زیادہ اچھی بات ہے گندگی اور غلاظت سے بچنے کے لیے۔ (فتح القدیر)

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے ہو۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اور اللہ جانتا ہے (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، پہچاننا۔ اللہ تعالیٰ کا علم ماضی، حال، مستقبل، ظاہر، باطن پر محیط ہے، کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کی اسے خبر ہے کیونکہ وہی ہر شے کا خالق ہے، اُسے ہی ہر بات کے نفع نقصان کا علم ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں:

''اس آیہ مبارکہ میں اس ناروا ظالمانہ سلوک کا انسداد کیا گیا ہے جو عام طور پر مطلقہ کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اس کو دوسری شادی کرنے سے روکا جاتا ہے، پہلا شوہر بھی عموماً اپنی مطلقہ بیوی کو دوسرے شخص کے نکاح میں جانے سے روکتا اور اس کو اپنی عزت کے خلاف سمجھتا ہے اور بعض خاندانوں میں لڑکی کے اولیاء بھی اس کو دوسری شادی کرنے سے روکتے ہیں اور ان میں بعض اس طمع میں روکتے ہیں کہ اس کی شادی پر ہم کوئی رقم اپنے لیے حاصل کرلیں، بعض اوقات مطلقہ عورت پھر اپنے سابق شوہر سے نکاح پر راضی ہو جاتی ہے، مگر عورت کے اولیاء واقرباء کو طلاق دینے کی وجہ سے ایک قسم کی عداوت اس سے ہو جاتی ہے، وہ اب دونوں کے راضی ہونے کے بعد بھی ان کے باہمی نکاح سے مانع ہوتے ہیں۔ آزاد عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی سے بلا عذر شرعی روکنا خواہ پہلے شوہر کی طرف سے ہو یا لڑکی کے اولیاء کی طرف سے بڑا ظلم ہے، اس ظلم کا انسداد اس آیت میں فرمایا گیا ہے۔

اس آیت کا شان نزول بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کی شادی ایک شخص کے ساتھ کر دی تھی۔ اس نے طلاق دے دی اور عدت بھی گزر گئی، اس کے بعد یہ شخص اپنے فعل پر پشیمان ہوا اور چاہا کہ دوبارہ نکاح کرلیں اس کی بیوی یعنی معقلؓ بن یسار کی بہن

بھی اس پر آمادہ ہوگئی، لیکن جب اس شخص نے معقلؓ سے اس کا ذکر کیا تو ان کو طلاق دینے پر غصہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تمہارا اعزاز کیا، اپنی بہن تمہارے نکاح میں دے دی، تم نے اس کی یہ قدر کی کہ اس کو طلاق دے دی، اب پھر تم میرے پاس آئے ہو کہ دوبارہ نکاح کروں اللہ کی قسم! اب وہ تمہارے نکاح میں نہ لوٹے گی۔

اسی طرح ایک واقعہ جابر بن عبداللہؓ کی چچازاد بہن کا پیش آیا تھا، ان واقعات پر آیۂ مذکورہ نازل ہوئی جس میں معقلؓ اور جابرؓ کے اس رویہ کو ناپسند و ناجائز قرار دیا گیا۔

صحابہ کرامؓ، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے، آیہ کریمہ کے سنتے ہی معقل بن یسارؓ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہوگیا، اور خود جا کر اس شخص سے بہن کا نکاح کر دیا اور قسم کا کفارہ ادا کیا اسی طرح جابر بن عبداللہؓ نے بھی تعمیل فرمائی۔ (معارف القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) بار بار غور کیجئے کہ اسلام ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتا ہے اور جڑے ہوئے دلوں کو الفت و محبت کی لڑی میں پروتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ حدود و قیود کو ہر حال میں برقرار رکھتا ہے، اصول و ضوابط کی پابندیاں لگاتا ہے، ان اصولوں اور قوانین میں رکاوٹیں کھڑی ہوں تو انہیں دور کرتا ہے اور انسانی رویوں اور جذبوں کا پورا پورا خیال رکھتا ہے۔

۲) اگر کوئی مرد غیظ و غضب میں آ کر عورت کو طلاق دے ڈالتا ہے اور اس کی عدت کا زمانہ بھی ختم ہو جاتا ہے، تو وہ بے سہارا ہو جاتی ہے، اسلام اسے اختیار دیتا ہے کہ وہ جس جگہ چاہے نکاح کر سکتی ہے، خواہ پہلے شوہر سے کرے، خواہ کسی اور شخص سے، دونوں صورتوں میں کوئی شخص اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتا، ان رکاوٹیں کھڑی کرنے والوں کو شاید اپنی اَنا اور عزت کی فکر ہوتی ہے اور یہ خیال نہیں آتا کہ اگر مطلقہ عورت نکاح نہ کر سکی تو کئی اور خرابیوں کی مرتکب ہو سکتی ہے اور معاشرتی زندگی میں فساد پیدا ہو سکتا ہے جو بالآخر رکاوٹ ڈالنے والوں کی دنیا اور آخرت میں تباہی و بربادی کا باعث ہو سکتا ہے۔

۳) یہ آیہ مبارکہ اس بات کی دلیل ہے کہ نکاح کے لیے ولی کا ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اولیاء اور سرپرستوں کو منع فرمایا ہے کہ وہ عورتوں کو دوبارہ اپنے سابق شوہروں کے ساتھ نکاح کرنے سے روکیں اور روکنے کا حق اسی کو حاصل ہوگا جس کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا، اسی لیے حدیث مبارکہ میں آتا ہے، ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ ولی کے بغیر نکاح درست نہیں ہوتا۔ (ترمذی، ابواب النکاح)

۴) اس کے ساتھ ساتھ اسلام نکاح کے لیے عورت کی مرضی اور رائے کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیوہ یا مطلقہ عورت کا اس وقت تک نکاح نہ کیا جائے جب تک اس سے صاف صاف زبان سے اجازت نہ لی جائے، اسی طرح کنواری کا بھی نکاح نہ کیا جائے جب تک وہ اِذن نہ دے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کنواری اذن کس طرح دے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا چپ رہنا ہی اس کا اذن ہے۔

(بخاری، کتاب النکاح)

۵) کسی کنواری لڑکی کا، جبراً نکاح (بغیر اس کی مرضی) عدالت کالعدم قرار دے سکتی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک کنواری لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرے باپ نے میرا نکاح جبراً کر دیا ہے، میں اس پر راضی نہیں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اختیار دے دیا (کہ اسے قائم رکھے یا توڑ ڈالے)۔ [کتاب النکاح۔ ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ]

گویا کہ ایک طرف ولی اور سرپرست کے بغیر نکاح درست نہیں تو دوسری طرف نکاح کے سلسلہ میں عورت کی مرضی اور منشا معلوم کرنا بھی ایسا ہی ضروری ہے۔ اسلام کا عطا کردہ یہ وہ عادلانہ اور پروقار قانون ہے جس سے عورت کی عزت وعظمت اور عصمت وعفت کا پوری طرح دفاع ہوتا ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف اور صرف یہی وہ قانون ہے جو انسانوں کو راحت وآرام سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲۳۳)

(اور جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دیدے اور بیوی کی گود میں بچہ ہو اور وہ ماں سے بچے کو دودھ پلوانا چاہے) تو ایسی مائیں اپنے بچے کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اِس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں لباس و طعام مہیا کرنا ہوگا، یہ انتظام ہر شخص کی حالت اور حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے (تو یاد رکھو) نہ تو ماں کو اس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے (اگر باپ کا اس اثنا میں انتقال ہو جائے) تو اس کے وارث پر (عورت کا لباس وطعام) اسی طرح ہے (جس طرح باپ کے ذمہ تھا) اگر دونوں (یعنی ماں باپ) آپس کی رضامندی اور صلاح سے (قبل از مدت) دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں اور اگر تمہارا خیال اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کا جو کچھ معاوضہ طے کرو، وہ معروف طریقے پر ادا کرو، اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، سب اللہ کی نظر میں ہے۔

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾

اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو دو برس پورے، اس شخص کے لیے جو ارادہ رکھتا ہے کہ پوری کرے مدت دودھ پلانے کی مدت۔

وَالْوَالِدٰتُ اس کا مفرد والدہ ہے یعنی بچے کی ماں، یُرْضِعْنَ دودھ پلائیں، فعل مضارع جمع مؤنث غائب (اَرْضَعَ، یُرْضِعُ اِرْضَاعًا) دودھ پلانا، الْمُرضِعُ، دودھ پلانے والی ماں، دایہ، اَوْلَادَھُنَّ (اَوْلَادَ.ھُنَّ) اولاد اپنی کو۔ اولاد کا مفرد ولد ہے اور ھُنّ کی ضمیر والدات کی طرف جاتی ہے۔ حَوْلَیْنِ دو برس، تثنیہ کا صیغہ ہے اس کا مفرد حَوْلٌ ہے سال (year)، کَامِلَیْن پورے کے پورے (Complete) اس کا مفرد کامِلٌ ہے۔ لِمَنْ (لِ.مَنْ) واسطے، اس شخص کے، اَرَادَ جو ارادہ کرے، فعل ماضی واحد مذکر غائب (اَرَادَ، یُرِیْدُ، اِرَادَۃً) ارادہ کرنا، اَنْ یہ کہ، اَنْ مصدر یہ ہے، یُّتِمَّ پورا کرے گا، مضارع واحد مذکر غائب (اَتَمَّ، یُتِمُّ، اِتْمَامًا) پورا کرنا، مکمل کرانا، الرَّضَاعَۃَ، دودھ پلانے (کا عرصہ) یعنی جو شخص دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرانا چاہتا ہو، گویا کہ جو پورے دو سال کی مدت کا نصاب پورا نہ کرنا چاہے اس کے لیے کم مدت کی بھی اجازت ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

"رضاعت، اصلی حق ماں کا ہے اور ماں سے بہتر کوئی مُرضِعہ نہیں ہوسکتی، پرانے طبیبوں اور نئے ڈاکٹروں اور ڈاکٹرنیوں سب کو اس پر اتفاق کرنا پڑا ہے۔ الْوالِدات، (مائیں) خواہ ان ماؤں کا نکاح باقی ہو یا طلاق ہو چکی ہو، اولاد ھُنّ، اِس قید نے یہ صاف کر دیا کہ مراد مائیں ہی ہیں، نانیاں، دادیاں مراد نہیں۔"

﴿وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

اور اوپر (اس کے) بچہ ہے جس کا رزق ہے ان کا اور کپڑا دینا ہے ان کا معروف طریقے سے۔

وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ اور اوپر (اس کے) جس کا بچہ ہے، مَوْلُوْدِ کے معنی، چھوٹا بچہ، پیدا شدہ بچہ، عَلٰی۔ حرف جار، اس کا لفظی معنی پر (upon) ہے اس سے مراد ذمہ داری ہے یعنی جس والد کا بچہ ہو اس پر فرض (Duty) ہے۔ لَهٗ (لَ.ہٗ) اُس، کے لیے ہے (کہ پورا کرے) رِزْقُهُنَّ رزق، ان کا یعنی ان عورتوں کا رزق (خوراک) جو دودھ پلائیں، وَكِسْوَتُهُنَّ (كِسْوَتُ.ھُنَّ) اور کپڑا، ان کا یعنی ان کا لباس،

بِالْمَعْرُوْفِ (بِ.الْمَعْرُوْفِ) ساتھ۔اچھائی کے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دودھ پلانے والی بچے کی حقیقی ماں ہو یا کسی دودھ پلانے والی کو بچہ سپرد کیا جائے اول الذکر کو طعام ولباس کی ضروریات وقت کو سامنے رکھتے ہوئے حسب توفیق پوری کی جائیں اور ثانی الذکر کا مناسب معاوضہ ادا کیا جائے اور خرچ کے لحاظ سے انہیں کسی طرح بھی پریشان نہ کیا جائے۔

﴿لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا﴾

نہیں تکلیف دی جاتی کسی نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق۔

لَا تُكَلَّفُ نہیں تکلیف دی جاتی، فعل نہی مضارع مجہول واحد مؤنث غائب (كَلَّفَ، يُكَلِّفُ، تَكْلِيفًا) تکلیف دینا، نَفْسٌ کسی جان کو، اِلَّا مگر، وُسْعَهَا (وُسْعَ.هَا) طاقت۔اس کی۔یعنی اللہ تعالیٰ حکیم اور خبیر ہے وہ کسی پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ﴾

نہ ضرر پہنچایا جائے والدہ کو اس کے بچے کے سبب اور نہ بچے والے (یعنی والد) کو اس کے بچے کی وجہ سے۔

لَا تُضَآرَّ فعل مضارع مجہول منفی واحد مؤنث غائب، ضرر نہ پہنچایا جائے (ضَارَّ، يُضَارُّ، مُضَارَّةٌ) تکلیف دینا، نقصان پہنچانا وَالِدَةٌ، والدہ (Mother) بِوَلَدِهَا (بِ.وَلَدِ.هَا) ساتھ۔ بچے۔اس کے یعنی اس کے بچے کے ساتھ مراد اس سے یہ ہے کہ بچے کی سنبھال اور نگہداشت اور بود و باش کے لیے مناسب خرچہ فراہم کیا جائے اور اسے پریشان نہ رکھا جائے۔وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ اور نہ بچے والا (یعنی باپ کو) بِوَلَدِهٖ (بِ.وَلَدِ.هٖ) ساتھ بچے، اس کے، یعنی اس کے بچے کے سبب اسے ڈرایا دھمکایا نہ جائے اور نہ ہی اس سے اس کی ہمت سے بڑھ کر مال طلب کیا جائے۔

﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ اور وارث پر اُسی کی مثل (ذمہ داری) ہے۔

وَعَلَى الْوَارِثِ اور وارث کے اوپر، عَلَى ذمہ داری کا مفہوم دیتا ہے، مِثْلُ ذٰلِكَ مانند، اس کے،

یعنی اس طرح کا انتظام وارث کے ذمہ بھی ہے وارث سے مراد وہ قرابت دار محرم ہے جو بچہ کا شرعی وارث ہو۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''باپ کے فوت ہو جانے کی صورت میں یہی ذمہ داری وارثوں کی ہے کہ وہ بچے کی ماں کے حقوق صحیح طریقے سے ادا کریں تاکہ نہ عورت کو تکلیف ہو اور نہ بچے کی پرورش اور نگہداشت متاثر ہو۔'' (احسن البیان)

﴿فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا﴾

پس اگر وہ دونوں ارادہ کریں دودھ چھڑانے کا (قبل از مدت) رضامندی اور مشورہ کے ساتھ تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

فَاِنْ (فَ.اِنْ) پس اگر، اَرَادَا فعل ماضی تثنیہ مذکر غائب (اَرَادَ، یُرِیْدُ، اِرَادَۃً) ارادہ کرنا، فِصَالًا، فصل ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کرنا، اسی سے فِصَالًا بچے کا دودھ چھڑانا، یعنی اگر دونوں نے بچے کے دودھ چھڑانے کا ارادہ کر لیا ہے، عَنْ تَرَاضٍ باہم رضامندی سے (Agreement) مصدر، (تَرَاضَی، یَتَرَاضٰی، تَرَاضِیٌ) باہم رضامند ہونا، باب تفاعل مِّنْهُمَا (مِّنْ.هُمَا) سے، دونوں کے، یعنی دونوں کی رضامندی سے وَ تَشَاوُرٍ اور مشورہ سے (Consultation) (تَشَاوَرَ، یَتَشَاوَرُ، تَشَاوُرٌ) ایک دوسرے سے مشاورت کرنا، باب تفاعل ہے، جُنَاحٌ گناہ، عَلَيْهِمَا (عَلٰی.هِمَا) اوپر، ان دونوں کے یعنی والدین پر، اگر وہ دو سال کی مدت سے پہلے بچے کا دودھ چھڑانے پر رضامند ہو جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

اور اگر تم ارادہ کرو کہ دودھ پلواؤ اپنی اولاد کو (حقیقی ماں کے علاوہ کسی عورت سے) تو نہیں گناہ تم پر، بشرطیکہ اس کا جو معاوضہ طے کرو، وہ معروف طریقے پر ادا کر دو۔

وَاِنْ، شرطیہ اگر، اَرَدْتُّمْ فعل ماضی جمع مذکر حاضر (اَرَادَ، یُرِیْدُ، اِرَادَۃً) ارادہ کرنا، اَنْ یہ کہ، تَسْتَرْضِعُوْا، تم دودھ پلواؤ گے (بچوں کو دودھ پلانے کے لیے کسی عورت کی خدمات لو گے) فعل مضارع

جمع مذکر حاضر (اِسۡتَرۡضَعَ، یَسۡتَرۡضِعُ، اِسۡتِرۡضَاعٌ) باب استفعال، اس کی خاصیت کسی چیز کی طلب ہے، اَوۡلَادَکُمۡ (اَوۡلَادٌ. کُمۡ) اولاد، اپنی، اولاد کا مفرد ولد ہے، فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ پس اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے، اِذَا، کلمہ شرط، وقت کو ظاہر کرتا ہے، (When) سَلَّمۡتُمۡ دے ڈالو تم ماضی جمع مذکر حاضر (سَلَّمَ، یُسَلِّمُ، تَسۡلِیۡمًا) سونپنا، عطا کرنا، مَّاۤ اٰتَیۡتُمۡ جو تم نے دینا طے کیا، بِالۡمَعۡرُوۡفِ (بِ. الۡمَعۡرُوۡفِ) ساتھ۔ معروف کے، یعنی اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے لیے حقیقی ماں کے علاوہ کسی عورت کی خدمات حاصل کرتے ہو تو خوبصورتی کے ساتھ اس سے معاوضہ طے کر لو اور اسے کسی طرح پریشان نہ کرو۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ، وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ﴾

اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور ڈرو اللہ سے (اِتَّقٰی، یَتَّقِیۡ، اِتِّقَاءٌ) ڈرنا خوف کھانا، تَقۡوٰی، ہر حال اور ہر وقت، ظاہر اور باطن میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہے اور تقوی بندۂ مومن کا زادِ راہ ہے اور اِسی صفت کے ساتھ وہ گناہوں سے بچتا ہے، وَاعۡلَمُوۡۤا اور جان لو، فعل امر جمع مذکر (عَلِمَ، یَعۡلَمُ، عِلۡمًا) جاننا، یقین کرنا، اَنَّ اللّٰهَ بلاشبہ اللہ تعالیٰ، بِمَا (بِ. مَا) ساتھ اس کے، جو تَعۡمَلُوۡنَ تم عمل کرتے ہو فعل مضارع جمع مذکر مخاطب (عَمِلَ، یَعۡمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا، بَصِیۡرٌ، دیکھنے والا ہے، کوئی باریک سے باریک چیز بھی اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اس آیہ مبارکہ میں نومولود بچوں کی حفاظت ونگہداشت کی تمام ممکنہ تدابیر بتلائی گئی ہیں اور انہیں بے یارو مددگار نہیں چھوڑا گیا ہے، یہ دیکھا گیا ہے کہ عموماً طلاق کے بعد نومولود بچوں کی پرورش اور دودھ پلانے یا پلوانے کے معاملات زیر نزاع آجاتے ہیں اور ان میں جھگڑے فساد ہوتے ہیں، میاں بیوی میں نکاح کی صورت بحال رہے یا وہ طلاق دے چکا ہو، اِس مسئلہ کو بخیر وخوبی نپٹا دیا گیا ہے۔

۲) رضاعت کی عمر دو سال بتلائی گئی ہے اس میں بھی لچک رکھی گئی ہے اگر میاں بیوی دونوں چاہیں تو دو

سال سے پہلے دودھ چھڑا سکتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات عورت کی صحت اجازت نہیں دیتی ہے، اطبا اور ڈاکٹر بھی منع کر دیتے ہیں، اگر اس مسئلہ میں لچک نہ ہوتی تو خواتین کے لیے کتنی مشکلات پیدا ہو جاتیں؟ حقیقت میں دودھ پلانے سے جو حرمت رشتوں کی پیدا ہوتی ہے، یہ اس کی میعاد ہے اور یہ مدت قمری تقویم (چاند دیکھنے) کے حساب سے شمار ہوگی۔

۳) قرآن حکیم میں دوسری جگہ جو فرمایا: وَحَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (الاحقاف ۴۶:۱۵) جس میں حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت اڑھائی سال قرار دی گئی ہے تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ اس میں چھ ماہ حمل کے بھی شمار کیے گئے ہیں، اگرچہ یہ پیریڈ نو ماہ کا ہوتا ہے مگر تکلیف دہ وقت چھ ماہ کا ہی ہے، اس طرح حمل کی تکلیف چھ ماہ اور دودھ پلانا دو سال، کل اڑھائی سال ہوئے۔

۴) مطلقہ جو بچے کی بود و باش کو سنبھالے ہوئے ہے اس کا نان نفقہ مرد کے ذمہ ہے اور یہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق برداشت کرے گا، کسی طرح بھی بخل اور کنجوسی کا مظاہرہ نہ کرے گا۔ اِسی طرح مطلقہ جو بچے کی پرورش کر رہی ہے، بے جا مطالبات کا انبار نہ لگائے گی۔

۵) فریقین یعنی میاں بیوی یا ان کے لواحقین کسی طرح بھی ایک دوسرے کو پریشان نہ کریں۔ مثلاً ماں بلاوجہ دودھ پلانے سے انکار کر دے اور باپ کو پریشان کرے، اسی طرح وہ بچے کو ماں سے جدا کر کے کسی اور سے دودھ پلوائے اور اس طرح ماں کو پریشان کرے یا ان کے لواحقین ایک دوسرے کو پریشان اور تنگ کریں، کسی طرح بھی جائز اور مناسب نہیں ہے، یہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی ہوگی۔

۶) ''وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ'' کہہ کر قرآن حکیم نے اخلاق کے بہت بڑے مسئلے کو حل کر دیا ہے اور وہ تربیتِ اطفال کی پہلی درسگاہ ہے۔ یعنی ماں کی گود، وہ اپنے دودھ کے ذریعے سے بچے کی رگ رگ میں عادات و اخلاق غیر محسوس طریق پر داخل کر دیتی ہے اور شفقتِ مادری کے گہرے نقوش بچے کی لوحِ دماغ پر کندہ ہو جاتے ہیں، اس لیے عقلمند اور پڑھی لکھی عورتیں اپنے بچوں کو خود ہی سنبھالتی ہیں۔ اِلّا یہ کہ وہ مجبور اور بے بس ہوں۔

۷) اس آیہ مبارکہ کے آخر میں پورے معاملے کو اللہ تعالیٰ کی رسی 'تقویٰ' سے مربوط کر دیا گیا ہے کیونکہ اس پاکیزہ شعور کے بغیر ان معاملات کی ٹھیک ٹھیک بجا آوری کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲۳۴) وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (۲۳۵)

’’اور تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور ان کی بیویاں زندہ ہوں تو ایسی بیوائیں چار ماہ دس دن انتظار کریں، پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو وہ جو کچھ جائز طریقے پر اپنے لیے کریں (یعنی دوسرے نکاح کی تیاری) اس کا تمہارے سر کوئی الزام نہیں اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ ایسی بیواؤں کو اگر تم اشارے کنائے سے پیغام نکاح دے دو یا یہ بات اپنے دل میں چھپائے رکھو، دونوں صورتوں میں تم پر کوئی گناہ نہیں، اللہ جانتا ہے کہ تم انہیں (دل میں) یاد رکھتے ہو، لیکن ان سے کوئی خفیہ معاہدہ نہ کرنا، ہاں جو بات کرنی ہو اچھے طریقے سے کرو، مگر جب تک ان کی عدت گزر نہ جائے عقد نکاح کا عزم نہ کرو اور جان لو کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے، اللہ اسے جانتا ہے لہٰذا اس سے ڈرتے رہو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ (لغزشوں کو) معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ بردبار ہے۔‘‘

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا﴾

اور جولوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویاں (اپنی) وہ (بیویاں) انتظار کریں اپنے تئیں چار مہینے اور دس (دن)۔

وَالَّذِيْنَ اور جولوگ، اسم موصول، اس کا مفرد الَّذِیْ ہے اور جو مرد، يُتَوَفَّوْنَ وفات پا جاتے ہیں، فعل مضارع مجہول جمع مذکر غائب (تَوَفّٰی، يَتَوَفّٰی تَوَفِّیٌ) باب تفعل، فوت ہونا، اس دنیائے فانی سے رخصت ہونا، مِنْكُمْ (مِنْ. كُمْ) سے۔تم یعنی تم میں سے وَيَذَرُوْنَ اور چھوڑ جاتے ہیں، فعل مضارع جمع مذکر غائب (وَذَرَ، يَذَرُ) چھوڑنا، اَزْوَاجًا بیویاں، اس کا مفرد زَوْجٌ، بیوی ہے، دراصل زَوْجٌ عربی زبان میں ایک دوسرے کی ضد دو چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ تر اور خشک، نر اور مادہ، میاں اور بیوی، يَّتَرَبَّصْنَ وہ انتظار کریں فعل مضارع جمع مؤنث غائب (تَرَبَّصَ، يَتَرَبَّصُ، تَرَبُّصًا) باب تفعّل مہلت گزارنا، عدت گزارنا، بِاَنْفُسِهِنَّ (بِ. اَنْفُسِ. هِنَّ) ساتھ، نفسوں، اپنے کے، یعنی اپنے آپ کو روکے رکھیں عدت کی مدت تک اور نئی جگہ نکاح نہ کریں، اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ چار ماہ، اَشْهُر کا مفرد شَهْرٌ (ماہ) ہے، وَّ عَشْرًا اور دس (دن)۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''دنیا کے عمرانی اور معاشرتی مسائل میں طلاقِ (جسے طلاق دی گئی ہو) کے بعد بیوہ کا مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا، بیوہ کے ساتھ دنیا کے کسی دوسرے مذہب نے کوئی خاص اعتنا برتا ہی نہیں ہے، بلکہ بعض مذہبوں نے تو ستی وغیرہ کو جائز کر کے بیوہ کو زندہ ہی جلا دیا ہے۔اسلام نے بیوہ کو زندہ رہنے، پوری طرح زندہ رہنے کا، سہاگنوں کی طرح زندہ رہنے کا حق عطا کیا ہے اور یہ باب بھی جہاں تک دنیوی برکتوں کا تعلق ہے، اسلام کا ایک روشن ترین باب ہے تَرَبُّصُ، انتظار کی اس مدت کا اصطلاحی نام عدت ہے، طلاقِن کی عدت پورے تین ماہ کی تھی، بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن یا کل ایک سو تیس (۱۳۰) دن تجویز ہوئی ہے، اس زمانہ میں بیوہ کے لیے بناؤ سنگار سب ناجائز ہے، بیوہ اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت

تاوضع حمل ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلداول)

﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

پس جب وہ پہنچ جائیں (بیوہ عورتیں) اپنی میعاد کو تو تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں (اس بات میں) جو وہ (راہ اختیار) کرتی ہیں اپنے لیے اچھے طریقے سے۔

فَاِذَا بَلَغْنَ پس جب وہ پہنچیں فَاِذَا (فَ.اِذَا) پس، جب اِذَا حرف شرط ہے (وقت کو ظاہر کرتا ہے) بَلَغْنَ فعل ماضی جمع مؤنث غائب (بَلَغَ، يَبْلُغُ، بَلُوْغًا) پہنچنا، اَجَلَهُنَّ (اَجَلَ.هُنَّ) میعاد۔ اپنی کو، میعاد سے مراد عدت اور هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب بیوہ عورتوں کی طرف جاتی ہے، فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ، پس نہیں ہے گناہ تم پر، فِيْمَا (فِيْ.مَا) میں۔ اس چیز یعنی اس امر سے فَعَلْنَ کیا انہوں نے فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ اپنے نفسوں کے بارے میں (یعنی اپنے بارے میں) بِالْمَعْرُوْفِ (بِ.الْمَعْرُوْفِ) ساتھ معروف کے (شرافت اور شائستگی کے ساتھ)۔

مولانا عبدالماجدؒ دریابادی لکھتے ہیں:

''جب عدت ختم ہوگئی، تو اب نکاح کی تجویز وغیرہ میں کوئی مضائقہ نہیں، فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ، خطاب عام ہے اہل امت کو یعنی تم پر ایسی بات کے جائز رکھنے میں کوئی گناہ یا حرج نہیں (نیز اس میں ولی اور سرپرست بھی آجاتے ہیں)، اس طرزِ خطاب سے فقہا نے یہ استنباط کیا ہے کہ کوئی شخص اگر خلاف شرع کام کرے تو دوسروں پر واجب ہوتا ہے کہ بشرط قدرت وہ بہ قدرِ قدرت اس کو روکیں ورنہ یہ بھی گنہگار ہوں گے، بِالْمَعْرُوْفِ، جو بھی کارروائی ہو قانون شریعت و آئین اخلاق کے باہر نہ ہو۔'' (تفسیر ماجدی، جلداول)

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔

آیہ مبارکہ کا آخری حصہ بڑا معنی خیز ہے، بتایا یہ جارہا ہے کہ اگر خلاف شریعت کوئی کام خود کرو گے یا اسے ہونے دو گے تو اس کے ذمہ دار قرار پاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تو بڑا ہی باریک بین ہے، تمہارے ہر کام کی

اسے خبر ہے۔

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْ اَنْفُسِكُمْ﴾

اور نہیں گناہ تمہارے اوپر اس بات میں کہ تم اشارے کنائے میں پیغامِ نکاح دے دو یا یہ بات اپنے دل میں چھپائے رکھو۔

وَلَا جُنَاحَ اور نہیں گناہ عَلَيْكُمْ (عَلَیْ. كُمْ) پر، تم یعنی تم پر، فِيمَا (فِیْ. مَا) میں، اس بات یعنی اس بات میں عَرَّضْتُمْ اشارۃً تم نے کہا فعل ماضی جمع مذکر حاضر، بِهٖ (بِ. ہٖ) ساتھ، اس بات کو یعنی اس بات کو (نکاح کی بات کو) اشارۃً کہا (عَرَّضَ، يُعَرِّضُ، تَعْرِيْضٌ) باب تفعیل، عرض کا ایک معنی کنارہ بھی ہے چنانچہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بات کو ایک جانب رکھ کر محض اشارے کنائے میں مدعا بیان کرنا، مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ سے، منگنی عورتوں کی یعنی عورتوں کی منگنی (پیغام نکاح) سے متعلق، یعنی دوران عدت بیوہ کو اشارۃً پیغام نکاح دینا گناہ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں جیسے کہ کوئی مرد بیوہ سے کہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم جیسی کوئی صالح عورت عطا فرمائے، اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْ اَنْفُسِكُمْ، یا تم نے چھپا رکھا اپنے دلوں میں، اَوْ، یا اَكْنَنْتُمْ چھپائے رکھو (ک ن ن) اَكَنَّ يُكِنُّ اِكْنَانًا، باب افعال، کسی بات کو دل میں چھپانے کو کہتے ہیں، فِيْ اَنْفُسِكُمْ اپنے نفسوں میں۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾

جانتا ہے اللہ تعالیٰ یہ کہ تم انہیں (دل میں) یاد رکھتے ہو لیکن اُن سے کوئی خفیہ معاہدہ نہ کرنا، ہاں جو بات کرنی ہو، اچھے طریقے سے کرو۔

عَلِمَ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات ہے، اَنَّكُمْ (اَنَّ. كُمْ) بلاشبہ، تم، اَنَّ کلمۂ تحقیق کلام ہے اور كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ (سَ. تَذْكُرُوْنَ. هُنَّ) البتہ۔ ذکر کرو گے تم۔ ان کا یعنی ان بیوہ عورتوں کو جنہیں تم اپنے نکاح میں لانا چاہتے ہو تمہارے دل میں ان کی یاد رہے گی (ذَكَرَ، يَذْكُرُ،

ذِکْرًا) یادرکھنا، هُنّ کی ضمیر بیواؤں کی طرف جاتی ہے، وَلٰکِنْ اورلیکن، لَا تُوَاعِدُوْهُنَّ نہ وعدہ دوان کو (تُوَاعِدُوْ. هُنَّ) وعدہ دو۔ انہیں (بیواؤں کو) یعنی ان سے کوئی عہد و پیمان نہ کرو (وَاعَدَ، یُوَاعِدُ، مُوَاعَدَةٌ) باب مفاعلہ، آپس میں وعدہ کرنا، هُنّ، ضمیر جمع مؤنث غائب (بیواؤں کی طرف جاتی ہے)، سِرًّا پوشیدہ طور پر(Secretly)، اِلَّا کلمہ استثنا (مگر) اَنْ یہ کہ، تَقُوْلُوْا کہو تم، (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، مَّعْرُوْفًا اچھی طرح سے (شرافت سے) fairly، شرافت سے گفتگو وہی ہوتی ہے جس میں دل آزاری اور دل شکنی نہ ہو بلکہ نرمی اور لطافت ہو، مثلاً ایک بیوہ جس کا دل پہلے سے ہی خاوند کی وفات سے آزردہ ہوتا ہے اسے تسلی دیتے ہوئے یوں کہا جائے کہ آئندہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کوئی بہتر سروسامانی مہیا فرمادے تو ان دعائیہ کلمات کے ساتھ گویا پیغام بھی ہے۔

﴿وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ﴾

اور (بیوہ کے ساتھ) عقد نکاح کا عزم اس وقت تک نہ کرو جب تک میعاد مقرر اپنے اختتام کو نہ پہنچ جائے۔

وَلَا تَعْزِمُوْا اور عزم نہ کرو، فعل نہی جمع مذکر حاضر (عَزَمَ، یَعْزِمُ عَزْمًا) پختہ ارادہ کرنا، عُقْدَةَ النِّكَاحِ، نکاح کا عہد باندھنا۔ وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ (You must not determine the contract of marriage) حَتّٰى یہاں تک کہ، يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ، یہاں تک کہ پہنچے الْكِتابُ (اللہ کا لکھا ہوا حکم) (اَجَلَ. هٗ) اپنے وقت کو (اپنی میعاد کو) بَلَغَ، يَبْلُغُ، بُلُوْغًا، پہنچنا، یعنی جب تک بیوہ کی عدت پوری نہیں ہوتی معاہدہ نکاح پختہ کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ﴾

اور جان لو کہ تحقیق اللہ جانتا ہے ان باتوں کو جو تمہارے نفسوں میں ہیں، پس اس سے ڈرتے رہو۔

وَاعْلَمُوْٓا اور جان لو، فعل امر جمع مذکر، (عَلِمَ، یَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، اَنَّ اللّٰهَ یقیناً اللہ تعالیٰ، یَعْلَمُ، جانتا ہے، مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ جو کچھ کہ ہے تمہارے نفسوں میں، اَنْفُسِكُمْ (اَنْفُسِ. كُمْ) نفس۔ تمہارے

انفس کا مفرد، نفس ہے فَاحْذَرُوْهُ (فَ.احْذَرُوْ.هُ) پس، ڈرو، اس سے۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾ اور جان لو کہ تحقیق اللہ تعالیٰ بخشنے والا بردبار ہے۔
یعنی تمہاری خطاؤں اور غلطیوں کو دیکھتا ہے، پھر بھی تمہیں معاف فرماتا رہتا ہے اور تم سے درگزر کرتا ہے، یہ اس کی شان غفاری اور شان بردباری ہے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) شوہر کے فوت ہو جانے کی صورت میں عورت کی عدت چار ماہ دس دن ہے (جبکہ حمل ہونے کی صورت میں وضع حمل ہے) عام مطلقہ کی نسبت سے بیوہ کی عدت میں یہ اضافہ اس کے احساسات میں شدت اور جذبات میں نزاکت کی وجہ سے رکھا گیا ہے، وہ شوہر کے صدمہ کو محسوس بھی زیادہ کرتی ہے اور حالت بیوگی میں وہ ہمدردی اور دلجوئی کی زیادہ محتاج ہوتی ہے۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۲۴۰ میں اسی ہمدردی کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ رہے ہوں، وہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت کر جائیں کہ انہیں گھر سے نکالے بغیر ایک سال تک نان ونفقہ دیا جائے، اور اگر وہ خود نکلیں تو جو کچھ وہ اپنے معاملے میں دستور کے مطابق کریں، اس میں تم پر کوئی الزام نہیں اللہ غالب اور حکیم ہے۔''

۲) اسلامی معاشرے میں ایک دوسرے کے جذبات کے لحاظ و احترام کی بڑی اہمیت ہے، کسی عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور اس سے ہمدردی کی بجائے اس سے نکاح کی باتیں شروع کر دی جائیں تو یہ چیز یقیناً اس کے دل کو ٹھیس پہنچائے گی، اس لیے ہدایت کی جا رہی ہے کہ اگر تم کسی بیوہ سے نکاح کا ارادہ رکھتے ہو تو اشارے کنائے میں بات کی جائے یا پھر دل میں بات رکھی جائے اور کھل کر بات اسی وقت ہوگی جب ایام عدت پورے ہو جائیں گے۔

۳) اس میں حکمت یہ ہے کہ ایسے معاملات میں جلدی اچھی نہیں ہوتی، بیوہ کو موقع دینا چاہیے کہ وہ

اپنے حالات اور معاملات پر اچھی طرح غور وفکر کرے اور عدت کے اس عرصہ میں اسے سوچ بچار کا مناسب وقت مل جائے۔

۴) ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن حکیم نے نکاح کے معاملے میں عورت کے جذبات و خواہشات کو نظر انداز نہیں کیا ہے، البتہ ''معروف'' کو ہر حال میں پیش نظر رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ معروف ایک ایسا جامع لفظ ہے جو شرافت اور شائستگی، نیکی اور پاکیزگی کی ہر بات کو گھیر لیتا ہے۔

۵) نکاحِ بیوگان ایک ایسا قانون ہے جس کی صحت اب مخالف حلقوں میں بھی تسلیم کی جارہی ہے، اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس لیے اس نے آج سے کوئی سوا چودہ سو سال پہلے اجازت مرحمت فرمادی، اس طرح بہت سی معاشرتی خرابیوں کا ازالہ کر کے اسے امن و عافیت سے ہمکنار کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ جب نکاح ایک دفعہ درست ہے اور یہ کوئی معاشرتی عیب نہیں تو حسب ضرورت دوسری دفعہ کیوں درست نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ نکاحِ بیوگان کی مخالفت قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ جس سے بہت سی برائیاں پیدا ہونے کا امکان ہے اور اسلام تو سلامتی کا دین ہے اور اس کے پاکیزہ قوانین فرد اور معاشرے کی اصلاح کرتے ہیں، وہ کسی حال میں بھی معاشرتی زندگی کو اس کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑتا ہے، اصول وضوابط بناتا ہے، حدود وقیود عائد کرتا ہے، بے جا سختی اور ناروا سلوک کی مذمت کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر چند روزہ زندگی کو قانون اور قاعدے کے مطابق گزارنے پر ابدی راحت اور اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی دائمی جنت کی نوید سناتا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ (۲۳۶) وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲۳۷)	اگر ایسی حالت میں عورتوں کو طلاق دے دو کہ ان سے نہ تو مقاربت کی ہو اور نہ حق مہر ہی مقرر کیا ہو، تو تم پر کچھ گناہ نہیں، البتہ ایسی صورت میں اسے فائدہ پہنچاؤ، ایسا فائدہ جو دستور کے مطابق پہنچایا جائے، وسعت والا اپنی حیثیت کے مطابق دے اور تنگ دست اپنی حالت کے مطابق، نیک کردار آدمیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا کریں اور اگر ایسا ہو کہ تم نے مقاربت سے پہلے طلاق دے دی اور ان کے لیے حق مہر مقرر کر چکے تھے تو طے شدہ حق مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا اِلّا یہ کہ وہ عورتیں از خود معاف کر دیں، یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (یعنی مرد) درگزر کرے اور تم (مرد) درگزر کرو (حق مہر پورا دے ڈالو) تو یہ بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے (دیکھو!) آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ احسان اور بھلائی کو کبھی نظر انداز نہ کرو، (اور یاد رکھو) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کی نظر سے مخفی نہیں ہے۔

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾

نہیں گناہ تمہارے اوپر اگر طلاق دے دو تم عورتوں کو، کہ اُن سے نہ تو مقاربت کی ہو اور نہ حق مہر ہی مقرر کیا ہو۔

لَا جُنَاحَ،نہیں ہے گناہ، عَلَيْكُمْ (عَلَىٰ. كُمْ)اوپرتمہارے،اِنْ اگر،طَلَّقْتُمُ طلاق دے دوتم فعل ماضی جمع مذکر حاضر (طَلَّقَ، يُطَلِّقُ، تَطْلِيقٌ) طلاق دینا،عورت کوآزاد کرنا، النِّسَآءَ عورتیں اس کا مفرد اِمرأۃٌ،(عورت) ہے مَا لَمْ، جب تک نہ،تَمَسُّوْهُنَّ (تَمَسُّوْ. هُنَّ)تم نے ہاتھ لگایا،انہیں (مقاربت کی ہوان سے)مَسَّ، يَمَسُّ، مَسًّا، ہاتھ لگانا، کنایۃً مقاربت کرنا،اَوْ یا(or)،تَفْرِضُوْا مقرر کیا ہومضارع جمع مذکر حاضر(فَرَضَ، يَفْرِضُ، فَرْضًا) مقرر کرنا،لَهُنَّ (لَ. هُنَّ) لیے،ان کے فَرِيْضَةً (حق مہر)یعنی ایسی حالت میں طلاق دے ڈالی کہ نہ تو مقاربت ہوئی اور نہ حق مہر ہی متعین ہوا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق مہر کے بغیر نکاح تو ہو جاتا ہے البتہ مقاربت سے پہلے حق مہر کا طے پا جانا ضروری ہے اور اس کی ادائیگی مرد کے ذمہ واجب ہے۔

﴿وَّ مَتِّعُوْهُنَّ، عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ﴾

اور فائدہ دوانہیں، دولت منداپنی حیثیت کے مطابق دے اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق۔

وَّ مَتِّعُوْهُنَّ اور(مَتِّعُوْ. هُنَّ) فائدہ پہنچاؤ۔انہیں (ان عورتوں کوجنہیں طلاق دے رہے ہو) (مَتَّعَ، يُمَتِّعُ، تَمْتِيْعًا) فائدہ پہنچانا، وَالْمَتَاعُ، اَلشَّيْءُ الَّذِي تُمَتَّعُ بِهَا اور متاع وہ چیز ہوتی ہے جس سے فائدہ حاصل کیا جائے (مفردات القرآن) هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب یعنی وہ عورتیں جنہیں مقاربت اور مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے رہے ہو انہیں کچھ مال اور متاع دے دو، عَلَى الْمُوْسِعِ اسم فاعل اوپر وسعت والے کے (یعنی دولتمند کے ذمے) (اَوْسَعَ، يُوْسِعُ، اِيْسَاعًا) باب افعال، وسعت رکھنا اس سے اسم فاعل الْمُوْسِعِ، قَدَرُهٗ (قَدَرُ. هٗ) طاقت، اس کی یعنی اس کی طاقت کے مطابق وَ عَلَى الْمُقْتِرِ اور اوپر تنگدست (اَقْتَرَ، يُقْتِرُ، اِقْتَارٌ) تنگدست ہونا، مفلس ہونا، اس سے اسم فاعل الْمُقْتِرُ، تنگدست، مفلس، قَدَرُهٗ (قَدَرُ. هٗ) طاقت، اس کی یعنی تنگدست کے ذمے اس کی وسعت کے مطابق۔

﴿مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ﴾ فائدہ پہنچانا دستور کے مطابق۔

بِالْمَعْرُوْفِ، (بِ. الْمَعْرُوْفِ) ساتھ، اچھائی کے یعنی حسب حیثیت ایسی خواتین کو (جنہیں طلاق دی جارہی ہو) مال ومتاع سے فائدہ پہنچانا ضروری ہے۔

﴿حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ﴾ یہ بات لازم ہے، محسنین پر۔

حَقًّا ، مصدر، اس کے معنی امر ثابت شدہ اور لازم کے ہیں الْمُحْسِنِيْنَ اس کا مفرد الْمُحْسِن، احسان اور بھلائی کرنے والا، قرآن حکیم کی زبان میں محسنین اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہی لوگ آخرت میں کامیابی کے حقدار ہیں۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا: وَاَحْسِنُوْا، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (البقرہ۲:۱۹۵) ''اور احسان کیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ محسنوں کو پسند فرماتا ہے۔''

سید قطب شہیدؒ فرماتے ہیں:

''ایک حالت یہ ہے کہ عورت کے لیے کوئی مہر متعین نہ کیا گیا ہو..... حالانکہ مہر کا ہونا لازمی ہے..... اور مقاربت سے قبل ہی اسے طلاق ہو جائے، اس صورت میں شوہر پر لازم ہے کہ طلاق کے بعد اسے سامان اور اپنی استطاعت کے مطابق اسے تحفہ دے، اس عمل کی نفسیاتی قدر و قیمت ہے کیونکہ یہ ایک طرح کا معاوضہ ہے، آغاز ہونے سے پہلے ہی ازدواجی تعلق کے ٹوٹ جانے سے عورت کے دل میں تلخی اور بدمزگی پیدا ہو سکتی ہے اور جدائی دشمنی اور عداوت کا سبب بن سکتی ہے، عورت کو کچھ سامان دینے سے یہ گرد آلود اور مسموم فضا ختم ہو سکتی ہے، محبت اور معذرت کی بادِ نسیم کے جھونکے چل سکتے ہیں اور طلاق پر غم واندوہ اور غم خواری کی فضا چھا سکتی ہے، اس صورت میں طلاق کی حیثیت ایک ناکام کوشش کی ہو جاتی ہے نہ کہ ایک ایسی ضرب کی، جو سب کچھ ختم کر دے، اسی واسطے اللہ تعالیٰ تاکید فرماتا ہے کہ بیوی کو سامان دستور اور معروف کے مطابق دیا جائے تاکہ انسانی الفت و محبت برقرار اور خوشگوار یادیں محفوظ رہیں، اسی کے ساتھ شوہر پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالی گئی۔ چنانچہ ہدایت کی گئی ہے کہ صاحب ثروت اپنی مقدرت کے مطابق سامان دے گا اور تنگ دست اپنی استطاعت کے مطابق۔ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ، ''خوش حال اپنی مقدرت کے مطابق اور تنگ دست اپنی مقدرت کے مطابق۔''

اس کے بعد معروف اور احسان کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے تاکہ دلوں کی سختی اور فضا کی مسمومیت ختم اور تروتازگی اور شادابی پیدا ہو۔ مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ، حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ''معروف کے مطابق سامان دو، یہ حق ہے نیکی اور حسن سلوک کرنے والوں پر۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يَّعۡفُوۡنَ اَوۡ يَعۡفُوَا الَّذِىۡ بِيَدِهٖ عُقۡدَةُ النِّكَاحِ﴾

اور اگر تم طلاق دو انہیں مقاربت سے پہلے جبکہ تم ان کے لیے حق مہر مقرر کر چکے ہو تو طے شدہ حق مہر کا نصف ادا کرو اِلّا یہ کہ وہ عورتیں از خود معاف کر دیں یا وہ مرد جس کے اختیار میں عقد نکاح ہے، فراخدلی سے کام لے (اور وہ پورا حق مہر دے ڈالے)۔

وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ اور اگر تم نے طلاق دی انہیں هُنَّ کی ضمیر جمع مؤنث غائب عورتوں کی طرف جاتی ہے، یعنی وہ عورتیں جنہیں تم نے طلاق دی، مِنۡ قَبۡلِ اس سے قبل کہ تَمَسُّوۡهُنَّ (تَمَسُّوۡ.هُنَّ) کہ تم نے ہاتھ لگایا۔ انہیں یعنی ان سے مقاربت کرنے سے پہلے، وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ اور تم مقرر کر چکے تھے ان کے لیے هُنّ کی ضمیر عورتوں کی طرف جاتی ہے اور یہ ضمیر جمع مؤنث غائب کہلاتی ہے۔ فَرِيۡضَةً (حق مہر)، فَنِصۡفُ (فَ.نِصۡفُ) پس، آدھا ہے، مَا فَرَضۡتُمۡ جو تم نے مقرر کیا فعل ماضی جمع مذکر حاضر (فَرَضَ، يَفۡرِضُ، فَرۡضًا) مقرر کرنا، فرض کرنا، یعنی اگر عورت سے مقاربت سے پہلے ہی طلاق دے دی اور مہر مقرر ہو چکا تھا تو اس صورت میں نصف مہر ادا کرنا ہوگا، اِلَّاۤ اَنۡ يَّعۡفُوۡنَ مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں، اِلَّا کلمۂ استثناء مگر (Except) اَنۡ یہ کہ، يَّعۡفُوۡنَ معاف کر دیں وہ (عورتیں جنہیں طلاق دی جائے) جمع مؤنث غائب (عَفَا، يَعۡفُوۡ، عَفۡوًا) معاف کرنا، اَوۡ يَعۡفُوَا یا معاف کرے، الَّذِىۡ وہ شخص، بِيَدِهٖ (بِ.يَدِهٖ) ہے، اس کے ہاتھ میں، عُقۡدَةُ النِّكَاحِ گرہ، نکاح کی، عُقۡدَةٌ، اس کے لفظی معنیٰ گرہ کے ہیں اور محاورہ میں عہد و پیمان کو کہتے ہیں اور چونکہ طلاق دینے یا عقدۂ نکاح کو کھولنے کا مجاز خاوند ہے، اس لیے اس سے مراد خاوند ہی ہے۔

امام شوکانیؒ لکھتے ہیں:

"اَلۡمُرَادُ اَنۡ يَعۡفُوَ الزَّوۡجُ فَيُعۡطِيَهَا الۡمَهۡرَ كَامِلًا" اس سے مراد یہ ہے کہ خاوند پورے کا پورا مہر اسے دے ڈالے۔ (فتح القدیر)

﴿وَ اَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى﴾

اور یہ کہ معاف کرو تم تو یہ تقویٰ کے قریب تر ہے۔

وَ اَنۡ تَعۡفُوۡۤا اور یہ کہ معاف کرو تم (درگزر سے کام لیتے ہوئے، تمام کا تمام حق مہر دے دو) (عَفَا،

یَعْفُوْا، عَفْوًا) معاف کرنا، درگزر کرنا، اپنے حق سے دستبردار ہونا، احسان کرنا، اَقْرَبُ، اَفْعَلُ کے وزن پر ہے، زیادہ قریب بات ہے (قَرُبَ، یَقْرُبُ، قَرابَۃً و قُرْبًا) قریب ہونا، لِلتَّقْوٰی (لِ.تَقْوٰی) لیے پرہیزگاری کے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''قانون اور ضابطہ ابھی ابھی بیان ہو چکا ہے کہ شوہر طلاق کی اس صورت میں نصف مہر روک سکتا ہے، اب معاً اخلاق کے افضل و اعلیٰ مقام کی طرف رہنمائی کر دی گئی کہ حق وصول کرنے سے کہیں بہتر و برتر اس حق کا معاف کر دینا ہے، جائز و برتر، مباح و افضل، قانون و اخلاق کا یہ مسلسل امتزاج قرآن کے معنوی معجزات میں سے ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ﴾ (اور دیکھو!) نہ بھولو احسان و مروت کرنا، اپنے درمیان۔

وَلَا اور نہ، تَنْسَوُا، بھولو (نَسِی، یَنْسٰی، نِسْیانٌ) بھولنا، نسیان اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسی بات کو طاق نسیان پر رکھنا یعنی فراموش کر دینا، اَلْفَضْلَ لطف و احسان، بَیْنَکُمْ، آپس میں۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''چنانچہ طلاق کے موقع پر بھی، جو تعلقات کی بقا کا نہیں، اس کے اختتام و انقطاع کے اعلان کا نام ہے، باہمی حسن سلوک، مروت، رعایت سے نہ چوکو، آیت سے صاف اشارہ ادھر نکل رہا ہے کہ کسی ناخوشگوار واقعہ کے پیش آ جانے سے صحبت قدیم و محبت سابق کے حقوق زائل نہیں ہو جاتے بلکہ حالت طیش و ناگواری میں بھی لحاظ تقویٰ اور حسن اخلاق اور عفو و احسان کا برابر رکھنا چاہیے وَلَا تَنْسَوُا ، یہاں بھول کے معنی میں نہیں کہ وہ تو غیر اختیاری ہے بلکہ ترک کرنے اور نظر انداز کرنے کے معنی میں ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ (یاد رکھو) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کی نظر سے مخفی نہیں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بلاشبہ اللہ تعالیٰ، بِمَا (بِ.مَا) ساتھ اس کے، جو تَعْمَلُوْنَ عمل کرتے ہو، مضارع جمع مذکر حاضر (عَمِلَ، یَعْمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا، بَصِیْرٌ دیکھنے والا اسم فاعل، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے جو ہر ظاہر اور چھپی ہوئی بات کو جانتا اور دیکھتا ہے (بَصَرَ، یُبْصِرُ، بَصَرًا) دیکھنا۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) معاشرتی زندگی کی پاکیزگی کا راز نکاح میں ہے جو کہ جائز اور سیدھا راستہ ہے، اس راہ میں جو جو مشکلات اور رکاوٹیں آسکتی تھیں، قرآن وسنت میں ان کا مناسب اور آسان راستہ تجویز کر دیا گیا ہے اور ہر مشکل اور ہر بگاڑ کو سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔

۲) نکاح سے خوشگوار زندگی کی بنیاد پڑتی ہے اور میاں بیوی کو تلقین کی گئی ہے کہ ایک دوسرے کو معاف کرتے جائیں اور آپس میں نباہ کرنے کی ہر طرح کوشش کرتے رہیں اور جب کسی طرح سے بھی حالات موافق اور سازگار نہ رہیں تو پھر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور کسی طرح بھی معاشرتی زندگی کی فضا کو ناخوشگوار نہ بنائیں اور الگ ہوتے وقت بھی احسان ومروت کو نظر انداز نہ کریں۔

۳) نکاح کے بعد میاں بیوی کی مقاربت سے پہلے ہی کچھ حالات ایسے پیش آ گئے کہ میاں نے بیوی کو طلاق دے ڈالی، اور نکاح کے وقت مہر کا صراحت سے ذکر نہ ہوا تھا تو میاں کے لیے ضروری ہوگا کہ اپنی حیثیت کے مطابق بیوی کو دے دلا کر رخصت کرے۔

۴) اور اگر نکاح کے وقت مہر مقرر ہو چکا تھا اور مقاربت سے پہلے طلاق کی نوبت آ جائے تو خاوند کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ مہر کی نصف ادائیگی کرے اِلّا یہ کہ وہ عورت سب کچھ خود ہی چھوڑ دے۔

۵) تقویٰ اور پرہیزگاری کی علامت یہ ہے کہ طلاق دیتے وقت (اگر مہر مقرر ہوا تھا) تو وہ مقرر شدہ مہر دے ڈالو، نرمی اور شفقت کا سلوک کرو، اس سے اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں گداز اور محبت پیدا فرما دے گا، اگر طلاق رجعی دی ہے تو ہوسکتا ہے کہ تمہارے دلوں کو وہ پلٹا دے اور تمہارے درمیان تعلقات دوبارہ بحال ہو جائیں۔

۶) آیہ مبارکہ کے آخر میں فرمایا ''اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ'' کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہاری کوئی نیکی، کسی درجہ اور کسی موقع کی ہورائیگاں نہ جائے گی اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں تمہاری اُخروی نجات کا ذریعہ بن جائیں۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (۲۳۸) فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۲۳۹)	(مسلمانو!) سب نمازیں خصوصاً درمیانی نماز (یعنی نمازعصر) پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو، اور (نماز میں) اللہ تعالیٰ کے حضور باادب کھڑے رہا کرو، اگر تم (دورانِ جہاد) خوف میں ہو تو پیادہ یا سوار (ہر صورت) نماز پڑھ لیا کرو، پھر جب تم کو امن حاصل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کو اسی طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا ہے جس کا تمہیں قبل ازیں علم نہ تھا۔

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾

حفاظت کرو تمام نمازوں کی اور درمیانی نماز کی (اسے پڑھنا نہ بھولو)۔

حٰفِظُوْا، فعل امر جمع مذکر (حَافَظَ، يُحَافِظُ، مُحَافَظَةٌ) حفاظت کرنا، نگہداشت کرنا محافظہ باب مفاعلہ، اس باب کی خاصیت میں دوام اور تواتر ہے، عَلَى الصَّلَوٰتِ، اوپر تمام نمازوں کے، یعنی تمام نمازوں کو ترتیب اور تواتر سے ادا کرتے رہو الصَّلَوٰتِ اس کا مفرد صَلٰوة (نماز) ہے، وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى اور (خاص طور پر) درمیانی نماز کی، اَلْاَوسط (درمیان) اس کا مؤنث وسطیٰ ہے، الصَّلٰوة کے لیے صفت اَلْوُسْطٰى استعمال کی گئی ہے عربی زبان میں عموماً صفت اور موصوف ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں، موصوف مذکر ہو تو اس کی صفت بھی مذکر ہوگی، موصوف مؤنث ہو تو اس کی صفت بھی مؤنث ہوگی، ''وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى'' اس درمیانی نماز سے کیا مراد ہے؟

اکثر ائمہ تفاسیر نے نماز عصر مراد لی ہے اور یہی معنی ابن جریر میں حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو ہریرہؓ صحابیوں اور قتادہ وضحاک تابعین اور امام ابوحنیفہؒ اور امام نخعیؒ سے مروی ہوئے ہیں۔ (بحوالہ تفسیر ماجدی، جلد اول)

غزوہ خندق میں نماز عصر مصروفیت کی بنا پر قضا ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى صَلَاةِ الْعَصْرِ یعنی دشمنوں نے ہمیں صلاۃ وسطیٰ میں مصروف رکھا یعنی صلاۃ عصر سے پھر آپ نے (تاخیر سے) مغرب اور عشا کے درمیانی وقفہ میں اسے ادا فرمایا۔ (تفسیر قاسمی)

اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کاروباری چہل پہل کا انتہائی مصروف وقت ہوتا ہے اور بسا اوقات مال و دولت کی ہوس میں اکثر بندے یاد الٰہی سے غافل ہو جاتے ہیں، پھر یہ بات بھی ہے کہ عصر اور مغرب کے درمیان بہت تھوڑا وقت رہ جاتا ہے۔

﴿وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾ اور کھڑے ہو جاؤ اللہ تعالیٰ کے حضور ادب سے۔

وَقُوْمُوْا اور کھڑے ہو جاؤ فعل امر جمع مذکر (قَامَ، يَقُوْمُ، قِيَامًا) کھڑے ہونا لِلّٰهِ اللہ کے لیے (اس کی بندگی اور عبادت کے لیے) قٰنِتِيْنَ اس کا مفرد قَانِتٌ، اسم فاعل، عجز و خشوع اختیار کرنے والا کائنات کی ہر چیز خالق کائنات کی اطاعت و فرمانبرداری میں جھکی ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (الروم ۳۰:۲۶) ''تمام مخلوقاتِ ہستی اس کے حضور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اطاعت کا التزام کئے ہوئے ہیں۔''

انسان تو اشرف المخلوقات میں سے ہے اس کے لیے تو رب کائنات کے آگے عاجزی و خاکساری بدرجہ اولیٰ لازم ہے، اور نمازوں میں یہ عاجزی کرنے والے ہی فوز و فلاح سے ہمکنار ہوں گے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (المومنون: ۲۳/۱،۲)

''یقیناً فوز و فلاح سے ہمکنار ہوئے وہ ایمان والے جنہوں نے اپنی نماز میں خشوع و خضوع اختیار کیا۔''

اور نمازوں میں اس کیفیت سے وہی بہرہ ور ہو سکتے ہیں جو سنت نبوی ﷺ کے مطابق اسے ادا کریں اور نماز میں جو کچھ پڑھتے ہیں اس پر غور و فکر کرتے رہیں، پھر نمازوں کی حفاظت کے بارے میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ (النور ۲۴:۳۷) ''(یہ وہ لوگ ہیں) جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کی یاد، اقامتِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی ہے۔''

یعنی دورانِ تجارت بھی اللہ تعالیٰ کا خوف ان کے دلوں میں سمایا رہتا ہے اور جونہی موذن کی صدائے دلنواز اِن کے کانوں میں پڑتی ہے، سب کام چھوڑ چھاڑ کر لبیک کہتے ہوئے اپنے مولا و مالک کے در پر حاضر ہوجاتے ہیں اسی بات کو نمازوں کی حفاظت کہتے ہیں۔

اس آیہ مبارکہ سے پہلے نکاح وطلاق کے مسائل بیان ہورہے تھے کہ نمازوں کی حفاظت کا بیان شروع ہوگیا۔اس پر سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''قوانین تمدن ومعاشرت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس تقریر کو نماز کی تاکید پر ختم فرماتا ہے، کیونکہ نماز ہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف، نیکی و پاکیزگی کے جذبات اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کا مادّہ پیدا کرتی ہے اور اسے راستی پر قائم رکھتی ہے یہ چیز نہ ہو تو انسان کبھی الٰہی قوانین کی پابندی پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور آخر کار اسی نافرمانی کی رو میں بہہ نکلتا ہے جس پر یہودی بہہ نکلے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿فَاِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا اَوۡ رُكۡبَانًا﴾

پس اگر تمہیں ڈر ہو تو پیادہ یا سوار (جس حال میں بھی ہو، نماز ادا کرلو)۔

فَاِنۡ (فَ.اِنۡ) پس۔اگر، خِفۡتُمۡ، ڈرو تم فعل ماضی جمع مذکر حاضر (خَافَ، يَخَافُ، خَوۡفًا) ڈرنا، خوف کھانا، (جنگ کے خطرات ہوں) فَرِجَالًا (فَ.رِجَالًا) پس، پیادے، رِجَالًا، یہ لفظ رِجۡلٌ سے نکلا ہے، جس کے معنی ٹانگ (Leg, foot) کے ہیں، الرَّاجِلُ، پاپیادہ، پیدل (on foot)، اس کی جمع رِجَالًا پیدل چلنے والے آتی ہے، اَوۡ، یا، رُكۡبَانًا سوار، یہ لفظ (رَكِبَ، يَرۡكَبُ) سوار ہونا، سے اسم فاعل راكِبٌ (Rider) ہے اور اس کی جمع رُكۡبَانٌ ہے یعنی دشمن کا خوف ہو تو پیدل چلتے ہوئے یا سواری پر، قبلہ کا رخ معلوم ہوجائے یا نہ ہوسکے اشاروں سے نماز ادا کرو۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''فَاِنۡ خِفۡتُمۡ'' یعنی اگر عام قاعدہ کے مطابق نماز باجماعت میں کسی دشمن کی طرف سے خوف ہو، اسلام کی روزانہ پنج وقتہ یہ پریڈ یا دربار الٰہی میں حاضری اس درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ بالکل معاف عین حالت جنگ میں بھی نہیں ہوتی، محافظت صلوٰۃ کا حکم بہر حال قطعی اور دائمی ہے، ترکِ نماز کی اجازت اس خطرہ کے حال میں بھی نہیں، البتہ رعایتِ ماحول کی پوری گنجائش دوسرے موقعوں کی طرح اس محل میں بھی رکھ دی گئی

ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلداول)

اگر حالات کچھ نرم ہوں تو میدانِ جنگ میں جماعت کا اہتمام بھی کیا جاسکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جب کوئی پوچھتا کہ ہم نماز خوف کیسے پڑھیں؟ تو وہ کہتے کہ امام آگے بڑھے، کچھ لوگ اس کے ساتھ نماز ادا کریں، امام انہیں ایک رکعت پڑھائے، باقی لوگ ان کے اور دشمنوں کے درمیان کھڑے رہیں، نماز نہ پڑھیں، جب یہ لوگ امام کے ساتھ ایک رکعت نماز پڑھ چکیں تو سرک کر پیچھے چلے جائیں اور جنہوں نے نماز نہیں پڑھی، اب وہ لوگ آجائیں اور امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھیں، امام تو اپنی نماز (دو رکعت) سے فارغ ہوگیا، اب یہ دونوں گروہ باری باری باقی ایک ایک رکعت پوری کرلیں تو ان کی بھی دو رکعت ہوگئیں۔ اور اگر خوف اس سے زیادہ ہو تو پاؤں پر کھڑے پیدل یا سواری پر رہ کر نماز ادا کریں، منہ قبلہ رخ ہو یا کسی اور طرف، امام مالک کہتے ہیں کہ نافع نے کہا عبداللہ بن عمرؓ نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ (بخاری، کتاب التفسیر بحوالہ تیسیر القرآن)

﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ﴾

پس جب امن میں آجاؤ، تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرو (نماز پڑھو) جیسا کہ سکھلایا اُس نے تم کو۔

فَاِذَآ (فَ. اِذَآ) پس۔ جب، اِذَا کلمہ شرط ہے اَمِنْتُمْ امن میں ہوتم، فعل ماضی جمع مذکر حاضر (اَمَنْ، يَأْمَنُ، اَمْنٌ) امن میں ہونا، خوف جاتے رہنا اور حالت سکون میں ہونا، فَاذْكُرُوا اللّٰهَ یاد کرو، اللہ تعالیٰ کو (ذَكَرَ، يَذْكُرُ، ذِكْرًا) یاد کرنا، یہاں مراد ہے نماز قائم کرنا، جیسا کہ قرآن میں آتا ہے: وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ: ۱۴/۲۰) ''اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔'' كَمَا جیسا کہ عَلَّمَكُمْ (عَلَّمَ. كُمْ) اس نے سکھلایا، تمہیں (عَلَّمَ، يُعَلِّمُ، تَعْلِيمًا) سکھلانا، یعنی جس طرح اس نے خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نماز کو پڑھنا اور اسے قائم کرنا سکھلایا، اس طرح نماز کی ادائیگی کرو۔

﴿مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ جو کہ تم (اس سے قبل) نہیں جانتے تھے۔

مَّا، جو، موصولہ، لَمْ تَكُوْنُوْا، نہیں تھے تم (كَانَ، يَكُوْنُ، كَوْنًا) ہونا، تَعْلَمُوْنَ جانتے تم، مضارع جمع مذکر حاضر (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل تمہیں

ان باتوں کا علم نہ تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ، يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنَ (ال عمران:۳/۱۶۴) ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر بڑا ہی احسان فرمایا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیات پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے (عقل ونظر اور علم و عمل کی پاکیزگی عطا کرتا ہے) اور انہیں کتاب وحکمت (قرآن وسنت) کی تعلیم دیتا ہے اور (آپ کی تشریف آوری) سے قبل یہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔''

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) نماز اور معاملاتِ زندگی میں ایک گہرا ربط ہے، وہ لوگ جو نماز تو باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں مگر گھریلو معاملات میں ان کا رکھ رکھاؤ اچھا نہیں ہوتا وہ گویا کہ نماز کی حقیقت کو نہیں سمجھتے ہیں، نماز محض روحانی ریاضت ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہمارے اخلاق اور اعمال سے بھی ہے۔

۲) دن رات میں پانچ نمازوں کی حفاظت سے یعنی انہیں پورے سوز اور شعور سے ادا کرنے پر ہمارا نہ صرف اپنے خالق و مالک سے مضبوط رابطہ قائم رہتا ہے بلکہ اس کی رحمتوں اور نوازشوں کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے اس کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک کی توفیق بھی ملتی رہتی ہے۔

۳) بندۂ مومن کے لیے نماز اس کی روحانی غذا اور قلبی جِلا (روشنی) کا ذریعہ ہے، اس کی تاکید اس قدر ہے کہ حالت جنگ میں بھی اسے ترک نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اسے اپنی طاقت اور ساز وسامان پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قوت اور مدد پر ناز ہوتا ہے اور وہ حالتِ خوف میں بھی اسی کے سہارے کا متلاشی رہتا ہے۔

۴) قربان جایئے اسلام کی سہل اور پاکیزہ تعلیمات پر، کہ حالتِ خوف میں نماز کو کتنا آسان بنادیا گیا ہے پیدل یا سواری پر چند لمحات میں اپنے رب سے لو لگا لیجئے، آخر دو رکعت ادا کرنے میں کتنا وقت درکار ہے؟ مگر اس کا فائدہ بیکراں اور جزا لامحدود ہے، سبحان اللہ!

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۴۰) وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (۲۴۱) كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲۴۲)	تم میں سے جو لوگ وفات پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں، انہیں چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو نان ونفقہ دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں، پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے بارے میں شرع کے مطابق جو بہتر سمجھتی ہیں کریں اور (یاد رکھو) اللہ ہی صاحب اقتدار واختیار اور حکیم و دانا ہے، (اور حسنِ سلوک یہی ہے) کہ مطلقہ عورتوں کو معروف طریقے سے دے دلا کر رخصت کیا جائے، اور یہ بات پرہیز گاروں کے لیے انتہائی ضروری ہے، اسی طرح اللہ تم پر اپنی آیات واضح کر دیتا ہے تاکہ عقل وفکر سے کام لو اور سوچو سمجھو۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا﴾

اور جو لوگ فوت ہو جائیں تم میں سے اور چھوڑ جائیں بیویاں۔

وَالَّذِيْنَ اور جو لوگ اسم موصول اس کا مفرد وَالَّذی ہے، يُتَوَفَّوْنَ، وفات پا جائیں مضارع مجہول جمع مذکر غائب (تَوَفّٰی، يَتَوَفّٰی، تَوَفِّیٌ) وفات پانا، دنیا سے رخصت ہونا، مِنْكُمْ (مِنْ. كُمْ) سے، تم یعنی تم میں سے وَ يَذَرُوْنَ اور چھوڑ جائیں فعل مضارع جمع مذکر غائب اَزْوَاجًا، بیویاں، اس کا مفرد زوج ہے۔

﴿وَّ صِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ﴾

وصیت کر جائیں اپنی بیویوں کے لیے، فائدہ دینا انہیں (نان ونفقہ) ایک سال تک بغیر انہیں (گھر سے) نکالے۔

وَّصِيَّةً کسی بات کے لیے تاکید کرنا، وصیت کرنا، لِّاَزْوَاجِهِمْ (لِ.اَزْوَاجِ.هِمْ) لیے، بیویوں اپنی کے یعنی اپنی بیویوں کے لیے، مَّتَاعًا، وہ چیز جس سے نفع حاصل کیا جائے، اردو زبان میں مال ومتاع محاورۃً استعمال ہوتا ہے، اِلَى (تک) اِلَى الْحَوْلِ ایک سال تک، غَيْرَ بغیر اِخْرَاجٍ، نکالے (خَرَجَ، يَخْرُجُ، خُرُوجًا) نکلنا، باہر آنا، اور (أَخْرَجَ يُخْرِجُ اِخْرَاجًا) کے معنی نکالنے کے ہیں۔

﴿فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ﴾

پس اگر وہ خود ہی نکل جائیں تو تم پر گناہ نہیں کہ وہ اپنے بارے میں معروف طریقے سے جو بہتر سمجھتی ہوں، کریں۔

فَاِنْ خَرَجْنَ (ف.اِن) پس۔ اگر خَرَجْنَ فعل ماضی جمع مؤنث غائب وہ نکل جائیں (جن کے خاوند فوت ہو گئے ہوں، عدت کی مدت پوری کرنے کے بعد خاوند کے گھر کو خود ہی چھوڑ دیں) فَلَا جُنَاحَ پس نہیں ہے گناہ، عَلَيْكُمْ (عَلَىٰ.كُمْ) اوپر، تمہارے، فِيْ مَا، اس بات میں (جو) فَعَلْنَ کیا انہوں نے (جو فیصلہ کیا انہوں نے) فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ اپنی جانوں کے بارے میں (اَنْفُسِ.هِنَّ) جانوں۔ اپنی، هِنَّ کی ضمیر جمع مؤنث غائب ان عورتوں کی طرف جاتی ہے جن کے خاوند فوت ہو چکے ہیں۔ مِنْ مَّعْرُوْفٍ معروف طریقے سے، شرع کے مطابق، یعنی شرع اور شریعت کے مطابق وہ عدت گزارنے کے بعد اگر نکاح کرنا چاہیں تو انہیں ایسا کرنے کی اجازت دی جائے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

"بیوہ عورت کا یہ حق ہے کہ اس کا شوہر وصیت کرے کہ وہ پورے ایک سال اس کے گھر میں رہے گی اور اس کے مال پر، جو وہ چھوڑ جائے اس کی گزران ہوگی، نہ وہ نکلے گی اور نہ وہ شادی کرے گی بشرطیکہ اس کے احساسات وجذبات اور اس کے اور اس کے گرد وپیش کے حالات متقاضی ہوں کہ وہ سال بھر متوفی شوہر کے گھر رہے، اِس کے ساتھ اسے یہ آزادی بھی ہے کہ چار مہینے دس دن کے بعد وہ گھر سے نکل سکتی ہے جب کہ گزشتہ آیت (۲۳۴) میں بیان ہوا، بعضوں کا خیال ہے کہ یہ آیت یعنی (۲۴۰) اس آیت سے منسوخ ہے،

لیکن نسخ کے فرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ان دو آیات میں دو حکم دو مختلف پہلوؤں سے بیان ہوئے ہیں یہ آیت عورت کے حق کو بیان کرتی ہے، جسے اگر وہ چاہے تو استعمال کر سکتی ہے اور گزشتہ آیت میں اس چیز کا بیان ہے جو اس پر لازمی ہے اور جس سے اسے کوئی مفر نہیں ہے (یعنی عدت!)۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

پہلی آیت (۲۳۴) میں چار ماہ دس دن عدت گزارنے کا حکم تھا اور آیت (۲۴۰) میں ایک سال کی رعایت دی گئی ہے، یہ حکم بھلا پہلے حکم کو کیونکر منسوخ کر سکتا ہے؟

چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن کثیر وغیرہم کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے، منسوخ نہیں ہوئی ہے اور پہلی آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ چار ماہ دس دن عورت کی لازمی عدت ہے، جسے اسے بہر حال شوہر کے گھر میں گزارنا ہے اور یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ میت کے اولیاء کو چاہیے کہ اس کی دلجوئی کی خاطر اور میت کے ساتھ اظہارِ اخلاص و محبت کے طور پر اسے مزید سات ماہ بیس دن شوہر کے گھر میں رہنے دیں ہاں، اگر عورت چار ماہ دس دن یا وضع حمل کے بعد اپنی مرضی سے اس کے گھر سے منتقل ہونا چاہے تو اسے روکا نہ جائے۔ (بحوالہ تفسیر تیسیر الرحمٰن)

﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ غالب، حکمت والا ہے۔

وہ صاحب اختیار و اقتدار ہے، کائنات کے ہر ہر ذرہ کا مالک ہے، انسان کو اس نے اشرف بنایا، اور زندگی گزارنے کے لیے اصول و قوانین عطا کئے۔ اس کے عطا کردہ قوانین حکمت اور دانائی پر مبنی ہیں۔

﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾

اور مطلقہ عورتوں کو معروف طریقے سے کچھ دے دلا کر رخصت کیا جائے اور یہ بات پرہیزگاروں کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ (وَلِ. لْمُطَلَّقٰتِ) اور لیے۔ طلاق یافتہ کے یعنی وہ عورتیں جنہیں طلاق دی گئی ہے، مَتَاعٌ فائدہ دینا ہے، مال و متاع سے فیض پہچانا ہے، بِالْمَعْرُوْفِ (بِ. لْمَعْرُوْفِ) ساتھ۔ معروف کے (شرع اور حسن اخلاق سے)، حَقًّا، لازم ہے عَلَى الْمُتَّقِيْنَ پرہیزگاروں پر، مُتَّقِيْن اس کا مفرد مُتَّقِی ہے، وہ شخص جسے اپنے خالق و مالک کا خوف ہمہ وقت دامنگیر رہتا ہے اور جو روز آخرت اس کے حضور جوابدہ

ہونے سے ڈرتا ہے اور کوئی بھی ایسا کام نہیں کرتا جو اس کی رضامندی کے خلاف ہو، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا پورا پورا خیال رکھتا ہے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''مَتَاعٌ'' سامان، نان نفقہ سے مختلف چیز ہے، حقیقت یہ ہے کہ قرآنی ہدایات سے جو چیز میل کھاتی ہے، وہ یہی ہے کہ مطلقہ عورت کو سامان دیا جائے خواہ اس سے مقاربت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو اور اس کا مہر طے ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، سامان دینے سے طلاق کی فضا کی خشکی تری سے بدلے گی اور جدائی سے متوحش دل کچھ راضی وخوش ہوں گے۔ آیت میں خوف الٰہی کے جذبہ کو ابھارا گیا ہے اور معاملے کو تقویٰ سے وابستہ کیا گیا ہے جو احکام کی تعمیل کے سلسلے میں تنہا ضمانت ہے اور قوی ضمانت!'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

اس طرح اللہ تم پر اپنی آیات واضح کر دیتا ہے تاکہ تم عقل وفکر سے کام لو۔

كَذٰلِكَ، اس طرح، يُبَيِّنُ بیان کرتا ہے مضارع واحد مذکر غائب (بَيَّنَ، يُبَيِّنُ، تَبْيِيْنٌ) بیان کرنا، واضح کرنا يُبَيِّنُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ واضح کرتا ہے، اٰيٰتِهٖ (اٰيٰتٌ.ہ) آیات، اپنی، آیۃ کی جمع آیات، ایک گول دائرہ سے دوسرے گول دائرہ تک، ایک آیت کہلاتی ہے، آیات کے معنی اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بھی ہیں، جو انفس وآفاق میں، ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، خود انسان کا اپنا جسم رب العالمین کی قدرت کا بہت بڑا شاہکار ہے۔ لَعَلَّكُمْ تاکہ تم (لَعَلَّ. كُمْ) تاکہ۔ تم، تَعْقِلُوْنَ، مضارع جمع مذکر مخاطب (عَقَلَ، يَعْقِلُ، عَقْلًا) عقل سے کام لینا۔

مولانا تھانویؒ نے یہاں خوب لکھا ہے:

''ان احکامِ طلاق وغیرہ میں اِتَّقُوْا اللّٰه، اور حُدُوْدُ اللّٰه اور سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ اور عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ اور بَصِيْرٌ اور خَبِيْرٌ اور هُمُ الظّٰلِمُوْنَ اور فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وغیرہ کا اس کثرت سے آنا، جو سب مخالفت (کرنے پر) وعیدیں ہیں اس امر پر دلیل قطعی ہیں کہ یہ سب احکام شریعت میں مقصود اور واجب ہیں، محض مشورہ کے طور پر نہیں ہیں کہ ان میں ترمیم وتبدیلی کا ہمیں حق واختیار حاصل ہے۔ (بحوالہ تفسیر ماجدی، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اگرچہ شریعت نے اس عورت کے لیے جس کا خاوند فوت ہو جائے، چار ماہ دس روز کی عدت مقرر کی ہے، مگر مروت اور احسان کا تقاضا ہے کہ عدت گزرتے ہی اسے گھر سے نکال نہ دو، بلکہ ایک سال تک اس کے قیام وآرام اور لباس وطعام کا خیال رکھو، ہاں اگر عدت گزرنے کے بعد خود بخود چلی جائے، اپنے والدین کے ہاں یا کسی بھائی کے ہاں رہنا پسند کرے یا دوسری جگہ نکاح کر لے، تو اس کی اسے پوری طرح اجازت ہے، اس میں رکاوٹ نہ بنو۔ معلوم ہوا کہ ایام عدت کو پورا کرنا فرض ہے اور بقیہ ایام رخصت کے طور پر ہیں۔

۲) خورد ونوش کا جس قدر سامان دیا جائے گا اس کا وراثت سے کوئی تعلق نہیں، بود و باش اور کھانے پینے کا تعلق مروت واحسان سے ہے جبکہ خاوند کے مال میں سے حق وراثت ادا کرنا فرض اور لازمی امر ہے۔

۳) ایام جاہلیت میں دستور تھا کہ خاوند موت کے وقت وصیت کر جاتا اور ضروری ہوتا کہ اس کی بیوی سال بھر کسی جگہ نکاح نہ کر سکتی، بدترین کپڑے پہنتی، خوشبو وغیرہ سے الگ رہتی اور سال بھر تک ایسی ہی سڑی بسی رہتی تھی (تفسیر ابن کثیر، جلد اول) قرآن حکیم نے اس دستور کی اصلاح کی، چار ماہ دس دن عدت کے لیے ضروری (Obligatory) قرار دیے جبکہ بقیہ عرصہ اس کے اختیار (Option) پر چھوڑا۔

۴) اسلام نے خاوند کی وفات پر عورت کو صرف بناؤ سنگار اور زیب وزینت سے منع کیا، جہاں تک نظافت وطہارت کا تعلق ہے وہ تو ہر حال میں ضروری ہے کہ پاکیزگی ایمان کا جزو لاینفک ہے **اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَان** اسلام کا وہ بنیادی وصف ہے جو بندہ مومن کے لیے ہمہ وقت لازمی ہے۔

۵) خاوند کی وفات پر عورت کے لیے چار ماہ دس دن کی عدت کے وقفہ میں بڑی مصلحتیں ہیں، اس سے عورت کا حمل واضح ہو جاتا ہے، خاوند کی وفات پر غم کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں، غور وفکر کا پوری طرح موقع ملتا ہے اور آئندہ زندگی کا لائحہ عمل تیار کرنے اور دوسروں سے مشورہ کرنے کے لمحات میسر آتے ہیں۔

۶) اسلام کی روشن تعلیمات نے عورت کے جذبات واحساسات کو دبایا نہیں ہے بلکہ شرع اور اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے اسے نعمت آزادی سے ہمکنار کیا ہے۔

۷) اللہ تعالیٰ کی آیات مکمل غور وفکر اور سوچ بچار کے لیے ہیں اور یہی دین حق کی روشن دلیل ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ص فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ف ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (۲۴۳) وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۴۴) مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ط وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُطُ ص وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۴۵)	”کیا تم نے ان لوگوں (کے حال) پر غور نہیں کیا جو موت کے ڈر سے اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے، حالانکہ وہ ہزاروں تھے، اللہ نے اُن سے کہا کہ مَر جاؤ (چنانچہ وہ راستے ہی میں مر گئے) پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں (پیغمبر کی دعا سے) زندہ کر دیا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں پر بڑا ہی فضل فرمانے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے، اور (دیکھو!) اللہ کی راہ میں لڑو، اور خوب جان رکھو کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے، تم میں کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے، تو اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے اللہ ہی (رزق میں) تنگی کرتا اور وہی کشادگی عطا کرتا ہے (اور عنقریب) تم اسی کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔“

﴿اَلَمْ تَرَ﴾ کیا نہ دیکھا آپ نے۔

أَ (کیا) کلمۂ استفہام، تعجب کے لیے، لَمْ نہیں، تَرَ دیکھا تو نے فعل مضارع واحد مذکر حاضر (رَأی، یَرَیٰ، رُؤْیَۃٌ) دیکھنا ”رؤیت ہلال“ نئے چاند کو دیکھنا، اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، اَلَمْ تَرَ کیا تو نے نہیں

دیکھا، تعجب کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس واقعہ پر استعمال ہوتا ہے جو کمال شہرت حاصل کر چکا ہو اور مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ مخاطب اس امر پر غور کرے، امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ رؤیت کئی طرح پر ہے.....آنکھ سے، تخیل سے، فکر سے، عقل سے اور صلہ اگر اِلی ہو تو اس کے معنی ایسی نظر کے ہوتے ہیں جس پر غور کرنا مقصود ہو۔ (مفردات القرآن)

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''اَلَمْ تَرَ، عربی میں یہ طرز خطاب ایسے موقع پر آتا ہے جب مخاطب کو کسی بڑے اہم اور معروف واقعہ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے رؤیت سے ہمیشہ چشم بصارت سے دیکھنا مراد نہیں ہوتا بلکہ وہم و تخیل اور غور و فکر اور عقل کی راہ سے بھی مطالعہ و مشاہدہ مراد ہوتا ہے اور جب اس فعل کا صلہ اِلٰی کے ساتھ آتا ہے (جیسا کہ یہاں اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ ہے) تو مقصود کوئی نتیجہ نکالنا یا عبرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَ ھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ﴾

ان لوگوں کی طرف کہ وہ نکلے اپنے گھروں سے ہزاروں (کی تعداد میں) موت کے ڈر سے۔

یعنی ان لوگوں کے حال پر غور کیا خَرَجُوْا (کہ) نکلے وہ فعل ماضی جمع مذکر غائب (خَرَجَ، یَخْرُجُ، خُرُوجًا) نکلنا، مِنْ سے (دِیَارِ.ھِمْ) گھروں۔ اپنے یعنی اپنے گھروں سے دَارٌ (گھر) مفرد ہے اور اس کی جمع دِیَارٌ ہے، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب لوگوں کی طرف جاتی ہے، وَھُمْ اور وہ، اُلُوْفٌ ہزاروں (تھے) اس کا مفرد اَلْفٌ (ہزار) ہے، حَذَرَ الْمَوْتِ، ڈر۔ موت یعنی موت کے ڈر سے۔

﴿فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا، ثُمَّ اَحْیَا ھُمْ﴾

پس کہا، ان کے لیے، اللہ نے کہ مر جاؤ پھر اس (اللہ تعالیٰ) نے انہیں زندہ کر لیا۔

فَقَالَ (فَ.قَالَ) پس، کہا، قَالَ، ماضی واحد مذکر غائب (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، (لَ.ھُمْ) لیے، ان کے یعنی ان کے لیے، اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا، ھُم کی ضمیر جمع مذکر غائب ان لوگوں کے لیے جو گھر بار چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے، مُوْتُوْا، تم سب مر جاؤ، فعل امر جمع مذکر (مَاتَ، یَمُوْتُ، مَوْتاً) مرنا، ثُمَّ، پھر (یعنی اس واقعہ کے بعد) اَحْیَاھُمْ (اَحْیَا.ھُمْ) اس نے زندہ کیا۔ انہیں، (اَحْیَ یُحْیِیْ، اِحْیَاءً) زندہ کرنا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾

بے شک اللہ تعالیٰ انسانوں پر بڑا ہی فضل فرمانے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔

اِنَّ بلاشبہ، بے شک، کلمہ زور پیدا کرتا ہے، اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے ہی فضل والا ہے، لَذُو (لَ. ذُو) لام زبر والا، تاکیدی معنی دیتا ہے، ذُوْ کے معنی، والا لَذُوْ فَضْلٍ (فضل والا) یعنی اس کے فضل وکرم میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے (وہ یقیناً صاحب فضل عمیم ہے) عَلَى النَّاسِ (لوگوں پر) وَلٰكِنَّ اور لیکن، اَكْثَرَ النَّاسِ اکثر لوگ، لَا يَشْكُرُوْنَ، شکر ادا نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا دل سے احساس ہونا اور اس کے ان گنت انعامات پر بے ساختہ دل سے ممنون ہونا اور زبان سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا ورد کرنا، اکثر لوگ شکر نہیں کرتے بلکہ کفرانِ نعمت سے کام لیتے ہیں۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ سابقہ کسی امت کا ہے جس کی تفصیل کسی صحیح حدیث میں بیان نہیں کی گئی، تفسیری روایات میں اسے بنی اسرائیل کے زمانے کا واقعہ اور اس پیغمبر کا نام، جس کی دعا سے انہیں اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندہ فرمایا، حزقیلؑ بتلایا گیا ہے، (لوگ) جہاد میں قتل کے ڈر سے یا وبائی بیماری (طاعون) کے خوف سے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے تاکہ موت کے منہ میں جانے سے بچ جائیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں مار کر ایک تو یہ بتلا دیا کہ اللہ کی تقدیر سے تم بچ کر کہیں نہیں جا سکتے، دوسرا یہ کہ انسانوں کی آخری جائے پناہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے اور وہ تمام انسانوں کو اسی طرح زندہ فرمائے گا جس طرح اللہ نے ان کو مار کر زندہ کر دیا، اگلی آیت میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم دیا جا رہا ہے، اس سے پہلے اس واقعے کے بیان میں یہی حکمت ہے کہ جہاد سے جی مت چراؤ، موت وحیات تو اللہ کے قبضے میں ہے اور اس موت کا وقت بھی متعین ہے جسے جہاد سے گریز وفرار کر کے تم ٹال نہیں سکتے۔'' (تفسیر احسن البیان)

﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اور لڑائی کرو، اللہ کی راہ میں۔

وَقَاتِلُوْا، اور لڑائی کرو، فعل امر جمع مذکر (قَاتَلَ، يُقَاتِلُ، مُقَاتَلَةٌ)، لڑنا، فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، اللہ کی راہ میں (کفار سے جنگ کرو) اس سے پتہ چلا کہ مسلمانوں کے نزدیک لڑائی کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند

کرنا اور لوگوں کو ظلم وستم سے نجات دلانا ہوتا ہے۔ اس حدیث مبارکہ پر غور کیجئے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے آدمی کے متعلق پوچھا گیا جو شجاعت اور بہادری کے لیے جہاد کرے یا قومی حمیت وعصبیت کے لیے یا ریاکاری اور دکھلاوے کے لیے، اس میں اللہ کے راستے میں کونسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' ''اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے لڑنا ہی صرف اللہ کے راستے میں شمار ہوگا۔'' [متفق علیہ]

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور جان لو کہ اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

وَاعْلَمُوْا اور جان لو، فعل امر جمع مذکر (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا، سمجھنا، اَنَّ اللّٰهَ یقیناً اللہ تعالیٰ سَمِيْعٌ، سَمِعَ سے مبالغہ کا صیغہ، کائنات میں ہر شخص بلکہ ہر ذی روح کی بات کو سنتا ہے، عَلِيْمٌ، عَلِمَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے، ہر شخص کی نیت کو جانتا ہے، اس سے کوئی امر پوشیدہ نہیں ہے، اس لیے خلوص نیت کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾

تم میں کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے، تو اللہ اسے کئی گناہ بڑھا چڑھا کر واپس کرے۔

مَنْ (کون) استفہامیہ ہے، ذَا (وہ)، الَّذِيْ (جو)، يُقْرِضُ اللّٰهَ، قرض دے، اللہ کو (اَقْرَضَ، يُقْرِضُ، اِقْرَاضًا) قرض دینا، ادھار دینا۔ قرض وہ مال ہوتا ہے جو مدت معینہ میں واپسی کی شرط پر دیا جاتا ہے، قَرْضًا حَسَنًا قرضہ حسنہ، ایسا قرض ہوتا ہے جو کسی نفع یا تجارتی فائدہ کے بغیر دیا جائے، اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دینے کے معنی یہ ہوئے کہ اس کی راہ میں اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے، صرف اور صرف اسی کی رضامندی مقصود ہو، کوئی دنیاوی منفعت اور شہرت مقصود نہ ہو، فَيُضٰعِفَهٗ (ف. يُضٰعِفُ. هٗ) پس، وہ اضافہ کرے، اس میں، لَهٗ واسطے اس کے، اَضْعَافًا كَثِيْرَةً، کئی گنا، بہت ہی زیادہ (ضَاعَفَ، يُضَاعِفُ، مُضَاعَفَةً) کئی گنا اَضعافًا کے ساتھ اس کی صفت نے اور واضح کر دیا یعنی وہ اضافہ کیسا ہوگا مت پوچھو، وہ ہمارے شمار قطار سے کہیں زیادہ ہے، غور کیجئے کہ ہمارا جسم و جان اور مال ومنال سب کچھ اسی کی رحمت اور

بخشش ہے، وہ ہم سے قرضِ حسنہ طلب کرتا ہے (یعنی اخلاص سے ہم اس کی راہ میں مال لٹادیں) تو اس کے بدلے میں لامحدود عطا فرماتا ہے، سبحان اللہ! کیا شان ہے اس کی عظمت اور کبریائی کی!

﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾

اللہ ہی (رزق میں) تنگی کرتا اور وہی کشادگی عطا کرتا ہے (اور عنقریب) تم اُسی کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

وَاللّٰهُ يَقْبِضُ اور اللہ ہی تنگی کرتا ہے مضارع واحد مذکر غائب (قَبَضَ، يَقْبِضُ، قَبْضًا) روکنا، پکڑنا مراد ہے رزق کم کرنا، وَيَبْصُطُ اور کشادگی کرتا ہے مضارع واحد مذکر غائب (بَصَطَ، يَبْصُطُ، بَصْطًا) پھیلانا، فراخ کرنا، وسعت اور کشادگی پیدا کرنا، وَاِلَيْهِ اور اس کی طرف، تُرْجَعُوْنَ تم لوٹائے جاؤ گے مضارع مجہول جمع مذکر حاضر (رَجَعَ، يَرْجِعُ، رُجُوْعٌ) لوٹنا، واپس ہونا پھر روز جزاء۔ وہ لوگ جو یہاں پر رضائے الٰہی میں اپنا مال اور اپنی جان لگائے ہوئے ہیں وہ لازوال نعمتوں اور ان گنت سعادتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) موت وحیات کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی ہے، قرآن حکیم نے بتایا ہے ''(جہاد سے ڈرنے والو!) تم جہاں بھی ہو گے موت تو تمہیں آ کر رہے گی، خواہ بڑے بڑے (مضبوط) قلعوں میں رہو۔'' (النساء۴:۷۸)

کلبہ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

لہٰذا وہ موت کتنی اچھی ہے جو اس خالق و مالک کی رضامندی میں آئے۔

۲) زندگی مصائب وآلام، خطرات اور پریشانیوں سے عبارت ہے۔ بلند ہمت اہل ایمان اللہ کی عطا کردہ قوت سے اسی کے بھروسہ پر ان مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں اور وہ اس کی رحمت سے کامیاب ہو جاتے ہیں انہیں حیاتِ دوام مل جاتی ہے اور پست ہمت بزدلی اور کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ زندہ رہتے ہوئے بھی مردوں کی سی کیفیت میں ہوتے ہیں۔

۳) جہاد فی سبیل اللہ سے حیات جاودانی ملتی ہے اور شہداء اپنی قوم کو نئی زندگی عطا کرتے ہیں یعنی:ع

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

مسلمانوں نے جب تک جہاد کو اپنے اوپر لازم رکھا، انہیں اللہ تعالیٰ نے شوکت وعظمت سے بہرہ ور کیا اور جب سے انہوں نے جہاد کو ترک کیا ہے ذلت ونامرادی ان کے حصے میں آئی ہے۔

۴) مسلمانو! جب موت وحیات کسی انسان کے قبضہ میں نہیں اور جنگ میں بھی مرنا یقینی نہیں تو اٹھ کھڑے ہو، اللہ کا قانون بلند وبرتر کرنے کے لیے جہاد وقتال کرو کہ اسلام کو غلبہ واقتدار حاصل ہو اور کرہ ارض امن اور سلامتی کا گہوارہ بن جائے اور چونکہ تم محض اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے جنگ کرو گے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ تمہاری ہر دعا کو سنے، اس کو اجابت بخشے اور تمہیں مخالفین کے مقابلے میں کامیابی نصیب کرے اور تم اپنی عظمت رفتہ کو پھر سے بحال کر سکو، آج یہود ونصاریٰ تمہیں مٹانے کے لیے سر جوڑ چکے ہیں، تمہارے دیار وامصار پر قبضہ کر رہے ہیں صرف دو سال کے عرصہ میں عراق و افغانستان تمہارے ہاتھ سے جاتے رہے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں تمہارے بھائی بند شہید ہو چکے ہیں، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے ہیں، تم کب تک اس بزدلی کا شکار رہو گے؟ تمہارا آقا ومولیٰ بار بار تمہیں پکار رہا ہے: وَقَاتِلُوْا فِی سَبِیْلِ اللّٰہ!

۵) اے لوگو! مال سینت سینت کر نہ رکھو! اسے اللہ کی راہ میں لٹا دو، یہ سب کچھ اسی کا دیا ہوا ہے، وہ تمہیں اس کے عوض لامحدود عطا فرمائے گا۔ اس کی عطا اور بخشش کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا ؕ قَالُوۡا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ قَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِیَارِنَا وَ اَبۡنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡهِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡهُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ (۲۴۶) وَ قَالَ لَهُمۡ نَبِیُّهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ قَدۡ بَعَثَ لَکُمۡ طَالُوۡتَ مَلِکًا ؕ قَالُوۡۤا اَنّٰی یَکُوۡنُ لَهُ الۡمُلۡکُ عَلَیۡنَا وَ نَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡکِ مِنۡهُ وَ لَمۡ یُؤۡتَ سَعَةً مِّنَ الۡمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰىهُ عَلَیۡکُمۡ وَ زَادَهٗ بَسۡطَةً فِی الۡعِلۡمِ وَ الۡجِسۡمِ ؕ وَ اللّٰهُ یُؤۡتِیۡ مُلۡکَهٗ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ (۲۴۷)

کیا آپ نے موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کے معاملہ پر غور کیا؟ جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ''ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے، تاکہ (اس کی قیادت میں) ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں'' نبی نے ان سے کہا: ''کہیں ایسی بات نہ ہو کہ تم پر جہاد فرض کر دیا جائے اور تم لڑنے سے انکار کر دو'' وہ کہنے لگے: ''بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں؟ جبکہ ہمیں ہمارے گھروں سے نکال کر بال بچوں سے جدا کر دیا گیا ہے۔ پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے، اور اللہ (ایسے) ظالموں کو خوب جانتا ہے، ان کے نبی نے ان سے کہا: ''اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے'' وہ کہنے لگے: بھلا ہم پر حکومت کا حقدار وہ کیسے بن گیا؟ اس سے زیادہ تو ہم خود حکومت کے حقدار ہیں، اس کے پاس تو کچھ مال و دولت بھی نہیں، نبی نے کہا: ''اللہ نے تم پر حکومت کے لیے اسے ہی منتخب کیا ہے اور اسے دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی صلاحیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے عطا فرمائے، اللہ بڑی ہی وسعت والا اور بڑے ہی علم والا ہے۔

﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی﴾

کیا نہ دیکھا آپ نے اُن سرداروں کی طرف بنی اسرائیل میں سے، موسیٰؑ کے بعد۔

اَ، کیا، کلمہ استفہام، تعجب کے لیے استعمال ہوتا ہے، لَمۡ تَرَ نہ دیکھا آپ نے تَرَ، صیغہ واحد مذکر حاضر (رَاٰی، یَرَی: رُؤْیَۃٌ) دیکھنا، ''اَلَمۡ تَرَ'' عربی میں یہ طرز خطاب ایسے موقع پر آتا ہے جب مخاطب کو کسی بڑے اہم اور معروف واقعہ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے، رؤیت سے ہمیشہ چشم بصارت سے دیکھنا مراد نہیں ہوتا بلکہ غور وفکر اور عقل وتدبر کی راہ سے بھی مطالعہ ومشاہدہ مراد ہوتا ہے اور جب اس فعل کا صِلہ اِلٰی کے ساتھ آتا ہے تو اس سے مقصود کوئی نتیجہ نکالنا یا عبرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ (مفردات القرآن بحوالہ تفسیر ماجدی، جلد اول)

اِلَی الۡمَلَاِ طرف سرداروں کے، اَلۡمَلَاِ اسم جمع سرداروں کی جماعت ''اَلۡمَلَاِ'' کا اصل لغوی معنی بھرنا ہے، اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی قوم کے اشراف واعیان اور اکابر وسادات کے لیے استعمال ہونے لگا، اس کی وجہ یہ ہوئی ہوگی کہ قوم کے اعیان واشراف ہی ہوتے ہیں جو اس کی چوپالوں، پنچایتوں، مجلسوں کونسلوں اور اس کے درباروں کو پُر کرتے ہیں۔ (تدبر قرآن)

مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ، بنی اسرائیل سے (سیدنا یعقوب علیہ السلام کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی) مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی، موسیٰ علیہ السلام کے بعد (سیدنا موسیٰؑ بن عمران سلسلہ اسرائیل کے سب سے زیادہ مشہور اور جلیل القدر پیغمبر ہیں)۔

﴿اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ﴾

جب کہا انہوں نے اپنے نبی سے (کہ) مقرر کیجئے ہمارے لیے بادشاہ (تاکہ) ہم لڑیں، اللہ کی راہ میں۔

اِذۡ (جب، جس وقت) وقت کو ظاہر کرتا ہے، قَالُوۡا، کہا انہوں نے، فعل ماضی جمع مذکر غائب (قَالَ، یَقُوۡلُ، قَوۡلًا) کہنا، لِنَبِیٍّ (لِ.نَبِیٍّ) لیے، اپنے نبی یعنی اپنے نبی کو، لَّهُمُ (لَ.هُمُ) واسطے، اُن کے یعنی جو ان کے نبی تھے (ان سے کہا) اِبۡعَثۡ مقرر کیجئے فعل امر واحد مذکر (بَعَثَ، یَبۡعَثُ، بَعۡثًا) مبعوث کرنا متعین کرنا، لَنَا (لَ.نَا) لیے، ہمارے، مَلِكًا، بادشاہ یہاں سالارِ لشکر مراد ہے۔ نُّقَاتِلۡ ہم لڑیں مضارع جمع متکلم (قَاتَلَ، یُقَاتِلُ، مُقَاتَلَۃٌ) لڑنا، جنگ کرنا، فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اللہ کی راہ میں۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''بنی اسرائیل میں یہ دستور رہا ہے کہ اُن کے حکمران بھی انبیاء ہی ہوا کرتے تھے انہیں کے پاس مقدمات کے فیصلے ہوتے اور انہیں کی سرکردگی میں جہاد کیا جاتا تھا، گویا ان لوگوں میں صحیح نظام خلافت رائج تھا اور یہی وہ سیاسی نظام ہے جو اسلام کا جزو لاینفک ہے، مگر ان لوگوں نے دوسرے ممالک کی دیکھا دیکھی جن میں نظامِ ملوکیت رائج تھا، اپنے بوڑھے نبی سموئیلؑ سے مطالبہ کر دیا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اس کی قیادت میں جہاد کریں اور حقیقتاً ان کا یہ مطالبہ محض جہاد سے راہِ فرار کی ایک صورت تھی جو ان کی بزدلی پر دلالت کرتی تھی جسے انہوں نے اس رنگ میں پیش کیا کہ تم بوڑھے ہو گئے اور ہمیں ایک نوجوان قائد درکار ہے اور قائد ان کی مادہ پرست نظروں میں وہی ہو سکتا تھا جو بادشاہوں کی طرح ٹھاٹھ باٹھ رکھتا ہو۔'' (تیسیر القرآن)

﴿قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا﴾

نبی نے ان سے کہا ''کہیں ایسی بات نہ ہو کہ تم پر جہاد فرض کر دیا جائے اور تم لڑنے سے انکار کر دو۔''

قَالَ نبی نے کہا، واحد مذکر غائب (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، هَلْ کلمہ استفہام اور تاکید کلام کے لیے آتا ہے (آیا)، عَسَيْتُمْ قریب ہو تم (ع س ی) افعالِ مقاربہ میں سے ہے، کسی بات کے بہت قریب ہونا یعنی عین ممکن ہے کہ، اس فعل کا مضارع استعمال نہیں ہوتا ہے۔ هَلْ عَسَيْتُمْ کے معنی یوں ہوئے کہ کہیں ایسی بات نہ ہو، یا عین ممکن ہے کہ تم، اِنْ كُتِبَ اگر لکھا جائے (ضروری اور فرض قرار دیا جائے) فعل ماضی مجہول، عَلَيْكُمُ (عَلٰی. كُمْ) اوپر، تمہارے الْقِتَالُ، لڑنا، جنگ کرنا، یہاں قتال سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اَلَّا (اَنْ. لَا) یہ کہ نہ، تُقَاتِلُوْا، لڑو تم یعنی ان کے نبی نے کہا کہ اگر تم پر قتال (جہاد) کو ضروری اور فرض قرار دیا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم انکار کر دو۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یہ سب سموئیل علیہ السلام نے کچھ تو اپنی فراستِ ایمانی سے فرمایا اور کچھ اپنی قوم کی افتادِ طبیعت کے تجربوں کی بنا پر۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿قَالُوْا وَ مَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآئِنَا﴾

وہ کہنے لگے ''بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں حالانکہ ہمیں گھروں سے نکال کر

بال بچوں سے جدا کر دیا گیا ہے۔

قَالُوْا کہا انہوں نے ماضی جمع مذکر غائب (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، قول وقرار اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، وَ مَا اور کیا ہے (یہ بات کیسے ہے؟) مَا یہاں پر استفہامیہ ہے لَنَا (لَ.نَا) واسطے، ہمارے اَلَّا (اَنْ.لَا) یہ کہ، نہ نُقَاتِلُ ہم لڑیں، فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اللہ کی راہ میں، یعنی بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، وَ قَدْ اُخْرِجْنَا اور تحقیق نکالے گئے ہیں ہم، قَدْ تحقیق کلام کے لیے آتا ہے، اُخْرِجْنَا نکالے گئے ہم فعل ماضی مجہول جمع متکلم (اَخْرَجَ، یُخْرِجُ، اِخْرَاجًا) نکالنا، مِنْ دِیَارِنَا (دِیَارِ.نَا) اپنے گھروں سے دَارٌ اس کا مفرد ہے (گھر) وَ اَبْنَآئِنَا (اَبْنَآءِ.نَا) اپنے بیٹوں سے اِبْنٌ اس کا مفرد ہے (بیٹا)۔ یعنی کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے دشمنوں سے نہ لڑیں جبکہ ہمیں اپنے وطن سے نکالا گیا اور اپنے بال بچوں سے دور پھینک دیا گیا۔

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾

پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے، اور اللہ جاننے والا ہے ظالموں کو۔

فَلَمَّا (فَ.لَمَّا) پس، جب کُتِبَ لکھا گیا، (فرض کیا گیا) عَلَيْهِمُ (عَلٰی.هِمُ) اوپر، ان کے هِم کی ضمیر ان لوگوں کی طرف جاتی ہے جنہوں نے جہاد فی سبیل اللہ کرنے کا وعدہ کیا تھا، اَلْقِتَالُ، جنگ (جہاد) تَوَلَّوْا، منہ پھیر لیا انہوں نے فعل ماضی جمع مذکر غائب (تَوَلّٰی، یَتَوَلّٰی، تَوَلِّیًا) منہ پھیرنا، پیٹھ موڑنا، اِلَّا (مگر)، کلمہ استثناء، قَلِیْلًا تھوڑے، مِّنْهُمْ (مِّنْ.هُمْ) سے، اُن یعنی جب دشمن سے قتال (جہاد) ان کے لیے فرض کر دیا گیا تو اکثر نے قتال سے منہ پھیر لیا مگر تھوڑے ان میں سے ثابت قدم رہے۔ وَاللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ، عَلِیْمٌ (عَلِمَ، یَعْلَمُ، عِلْمًا) جاننا اور اس سے اسم صفت عَلِیْمٌ بہت زیادہ علم رکھنے والا، جس کا علم کائنات کی ہر چیز پر محیط ہے، جو ظاہر اور باطن بلکہ دلوں میں جو خیال گزرتا ہے اسے بھی جانتا ہے، بھلا ظالم اس سے بچ کر کہاں جاسکتے ہیں؟

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

''حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جب عنان نبوت حضرت سموئیلؑ کے ہاتھ میں آئی تو بنی اسرائیل

نے کہا ''ہمیں جہاد کرنے میں کوئی تامل نہیں، آپ ایک امیر (جرنیل) مقرر فرما دیجئے، اس پر کہا گیا کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم بالضرور جہاد پر آمادہ ہو جاؤ گے، ایسا تو نہیں کہ فرضیت جہاد کے بعد تمہاری ہمتیں جواب دے جائیں، انہوں نے کہا، ایسا کیونکر ممکن ہے؟ جبکہ ہم مظلوم ہیں اور مہاجر ہیں، مگر جب جہاد فرض کر دیا گیا اور حکم آ گیا کہ اب لڑو تو بجز چند بہادروں کے سب پھر گئے۔

اس سارے قصہ سے جو بہت طوالت کے ساتھ دہرایا گیا ہے مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر طرح سے جہاد کے لیے آمادہ اور تیار کر دیا جائے اور پہلے سے راہ کی مشکلات بتا دی جائیں تا کہ بعد میں وہ بھی بنی اسرائیل کی طرح عذر و معذور نہ کریں۔'' (سراج البیان، جلد اول)

﴿وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ﴾

ان کے نبی نے ان سے کہا: ''اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ (امیر لشکر) مقرر کیا ہے'' وہ کہنے لگے: بھلا ہم پر حکومت کا حقدار وہ کیسے بن گیا؟ اُس سے زیادہ تو ہم خود حکومت کے حقدار ہیں اس کے پاس تو مال و دولت کی وسعت نہیں ہے۔

وَ قَالَ اور کہا (سموئیل علیہ السلام نے) فعل ماضی واحد مذکر غائب، لَهُمْ (لَ.هُمْ) واسطے، ان کے، هُمْ کی ضمیر بنی اسرائیل کے ان لوگوں کی طرف جاتی ہے جنہوں نے مطالبہ کیا تھا، نَبِيُّهُمْ (نَبِيُّ.هُمْ) نبی، ان کے، ان کے نبی (حضرت سموئیل علیہ السلام) نے، اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ بے شک اللہ نے مقرر کیا، اِنَّ کلمہ تحقیق، قَدْ بھی جملے میں حصر پیدا کرتا ہے، بَعَثَ، بھیجنا، مبعوث کرنا، یہاں پر مقرر کرنے کے معنی میں ہے، لَكُمْ طَالُوْتَ تمہارے لیے طالوت کو، مَلِكًا، بادشاہ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''طالوت بن کش تاریخ میں قوم اسرائیل کے پہلے بادشاہ تسلیم کیے گئے ہیں یہ وہی ہیں جن کا ذکر توریت میں ساؤل (Saul) کے نام سے آیا ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

قَالُوْا انہوں نے کہا فعل ماضی جمع مذکر غائب (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، اَنّٰى کلمہ استفہام کیسے، کیونکر، يَكُوْنُ، ہوگی (كَانَ، يَكُوْنُ كَوْنًا) ہونا، الْمُلْكُ، بادشاہت، عَلَيْنَا (عَلٰى.نَا) اوپر۔ ہمارے وَ نَحْنُ اور ہم ہیں، اَحَقُّ زیادہ حقدار، بِالْمُلْكِ ساتھ بادشاہت کے، مِنْهُ اس سے، یعنی ہمارے پاس

مال و دولت کے ڈھیر ہیں اور وہ غریب و نادار ہے، وَ لَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ اور نہ دیا گیا وہ وسعت (فراخی) مال میں سے وَلَمْ اور نہ، یُؤْتَ دیا گیا، مضارع مجہول، سَعَةً، فراخی، کشائش (وَسِعَ، یَسَعُ، سَعَةً) کشادہ اور فراخ ہونا، وُسْعَتِ قلبی، دل کی فراخی اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

﴿قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾

کہا ''اللہ نے اسے ہی تم پر منتخب کیا ہے اور اسے دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی صلاحیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں۔''

قَالَ کہا (ان کے نبی نے جواب دیا) فعل ماضی واحد مذکر غائب، اِنَّ اللّٰهَ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اِصْطَفٰهُ (اِصْطَفٰی. ہُ) پسند کیا اسے (منتخب کیا اسے) (اِصْطَفٰی، یَصْطَفِیْ، اِصْطِفَاءً) چننا، منتخب کرنا، یعنی طالوت کو، عَلَيْكُمْ (عَلٰی. کُمْ) اوپر۔ تمہارے یعنی تم پر وَزَادَهٗ (زَادَ. ہٗ) اور، زیادہ کیا، اسے، بَسْطَةً کشادگی (بَسَطَ، یَبْسُطُ، بَسْطَةً) کشادگی دینا، عطا کرنا، فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ علم اور جسم میں یعنی وہ علم میں قوی اور جسم میں مضبوط ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾

اور اللہ عطا کرتا ہے اپنی بادشاہت جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ بڑی ہی وسعت والا اور بڑے ہی علم والا ہے۔

وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ اور اللہ عطا کرتا ہے (اٰتٰی، یُؤْتِیْ، اِیْتَاءً) عطا کرنا، دینا، مُلْكَهٗ (مُلْکَ. ہٗ) (ملک۔ اپنا) دنیا میں بادشاہت، مَنْ يَّشَآءُ جسے، وہ چاہتا ہے (شَاءَ، یَشَاءُ، مَشِیَّةً) چاہنا، پسند کرنا، مَشِیَتْ، چاہت، مرضی، مومن مَشیت الٰہی پر راضی رہتا ہے اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ اور اللہ بڑی ہی وسعت والا ہے، جس کے اختیار میں سب کچھ ہے، وہی ہر پست کو بلند اور ہر ادنیٰ کو سرفراز کرتا ہے۔ عَلِيْمٌ، وہ بڑے ہی علم والا ہے یعنی اس کا علم ہر بات پر محیط اور ہر طرح سے کامل ہے، وہی خوب جانتا ہے کہ کس میں ملک گیری و ملک داری کی صلاحیت ہے۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) کوئی قوم جذبہ جہاد کے بغیر سربلند اور سرخرو نہیں ہو سکتی ہے، مسلمان کے لیے جہاد اس لیے بھی ضروری

ہے کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر ظلم وستم کا قلع قمع کر کے عدل وانصاف کا قانون جاری وساری کرے، اس کے لیے وہ اپنی تمام تر قوتیں اور کوششیں بروئے کار لاتا ہے۔ (دیکھئے سورۃ الانفال:۶۰)

۲) ایمان اور بزدلی ایک دل میں اکٹھے نہیں ہو سکتے جب اللہ تعالیٰ پر ایمان قوی ہو، تو اس کا لازمی نتیجہ بہادری اور دلیری ہوتا ہے اور مومن اللہ تعالیٰ کا دین سربلند کرنے کے لیے جنگ کے شعلوں میں کود پڑتا ہے یا تو وہ رتبۂ شہادت سے سرخرو ہوتا ہے یا پھر غازی بن کر لوٹتا ہے، اگر ایمان کمزور ہو تو عین لڑائی کے وقت فرار کی راہ اختیار کرتا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کی اکثریت نے جنگ کے موقع پر منہ پھیر لیا۔

۳) بنی اسرائیل کو خیال تھا کہ حکومت وریاست کی نگہبانی اور فوجوں کی قیادت کے لیے وجہ انتخاب دولت و ثروت کی بنیاد پر ہونا چاہیے، انہیں اپنی فراخی وفارغ البالی پر ناز تھا، وہ طالوت جیسے غریب ومفلس شخص کو اپنا امیر کیسے دیکھ سکتے تھے اس لیے اعتراضات شروع کر دیے، ان کے نبی نے انہیں سمجھایا کہ امارت کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ (ا) علم میں رسوخ کہ اس کے ذریعہ قوم کا رہبر (لیڈر) ملک کا نظم و نسق قائم رکھ سکے، بہترین طریق سے حکومت کرنے کے قابل ہو، لوگوں کو بے لاگ عدل وانصاف مہیا کر سکے اور سیاسی مسائل کی پیچیدگیاں سلجھا سکے۔ (ب) اس کی ظاہری شکل وصورت سے رعب داب ٹپکتا ہو، اور فوجی تربیت سے پوری طرح آراستہ ہو، ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر گہری نظر رکھتا ہو، طالوت میں یہ دونوں خوبیاں موجود تھیں، اس لیے اللہ کی طرف سے اسے یہ عہدہ عطا کیا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں جب تک امیر کے انتخاب کا یہ اصول رہا دنیا پر انہی کی حکمرانی رہی اور جب وجہ انتخاب دولت قرار پائی تو سیادت کی بساط الٹ گئی، اس وقت عالم اسلام میں اسی بات کی کمی ہے جس کی وجہ سے مسلمان نقصان اٹھا رہے ہیں، افسوس کہ پاکستان کو معرض وجود میں آئے چھپن سال کا طویل عرصہ بیت چکا ہے اور ابھی تک یہاں کوئی صالح نظام قائم نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ بھی ٹھیک قیادت کا فقدان ہے اور جب تک یہ درست نہ ہو کبھی خیر کی توقع نہ رکھیے۔

۴) اسلام کے نزدیک انتخاب میں معیار مال ودولت اور رنگ ونسب نہیں بلکہ تقوی و پارسائی، علمی رسوخ اور جسمانی وجاہت ہے اور یہی وہ اصول ہے جس میں قوموں کی ترقی پنہاں ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲۴۸) فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۲۴۹)

(نیز) ان کے نبی نے ان کو یہ بھی بتایا: ”(طالوت کی) بادشاہی کی علامت یہ ہے کہ (ان کے عہد حکومت میں) وہ صندوق تمہیں واپس مل جائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں، اس صندوق کو فرشتے اٹھا لائیں گے۔ اگر تم مومن ہو، تو یہ تمہارے لیے بہت بڑی نشانی ہے، پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا تو وہ (لشکر) سے مخاطب ہوا ”(دیکھو!) اللہ ایک نہر کے ذریعہ تمہاری آزمائش کرنے والا ہے، جو کوئی اس نہر کا پانی (جی بھر کر) پیئے گا وہ میرا ساتھی نہیں، میرا ساتھی تو وہ ہے جو اسے نہ چکھے اِلّا یہ کہ چلو بھر پانی پی لے، (تو کوئی مضائقہ نہیں) جب وہ نہر پر پہنچے تو چند لوگوں کے سوا سب نے (جی بھر کر) پانی پیا، پھر جب طالوت اور ان کے مسلمان ساتھی نہر پار کر کے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے، البتہ ان میں سے وہ لوگ جو یہ یقین رکھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے کہنے لگے: ”بارہا ایسا ہوا ہے کہ تھوڑی سی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب رہی ہے اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ﴾

''اوران کے نبی نے ان کو یہ (بھی) بتایا کہ (طالوت کی) بادشاہی کی علامت یہ ہے کہ (ان کے عہد حکومت میں) وہ صندوق تمہیں واپس مل جائے گا۔

وَقَالَ اور کہا ماضی واحد مذکر غائب (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، لَهُمْ (لَ.هُمْ) لیے، ان کو، یعنی ان سے نَبِيُّهُمْ (نَبِيّ هُمْ) نبی، ان کے (نے) هُمْ کی ضمیر بنی اسرائیل کے ان لوگوں کی طرف جاتی ہے جنہوں نے نبی (سموئیلؑ) سے مطالبہ کیا تھا کہ اُن پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیں جس کی نگرانی میں وہ اپنے دشمنوں سے جنگ کریں، اِنَّ بلاشبہ اٰيَةَ نشانی مُلْكِهٖٓ (مُلْكِ.ہٖ) بادشاہی، اس کی، اَنْ، یہ کہ يَّاْتِيَكُمُ (يَّاتِيَ.كُمْ) آئے، تمہارے پاس، التَّابُوْتُ، صندوق۔

﴿فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾

جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے اور آل موسیٰ اور آل ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں، اس صندوق کو فرشتے اٹھا لائیں گے۔

فِيْهِ (فِيْ.ہِ) میں، اس یعنی اس میں، سَكِيْنَةٌ تسکین، طمانیت (ہے) مِّنْ رَّبِّكُمْ (رَّبِّ.كُمْ) رب۔تمہارا یعنی اس میں تمہارے رب کی طرف سے تسکین اور طمانیت ہے۔وَ بَقِيَّةٌ اور باقی ماندہ (بَقِيَ، يَبْقٰى، بَقَاءً) دیر پا ہونا، باقی رہنا، بَقِيَّةٌ وہ چیزیں جو محفوظ رہ گئی ہوں، اَلْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ، نیک کام جن کا ثواب باقی رہے، مِّمَّا (مِن.مَا) سے، جو یعنی اس چیز میں سے جو، تَرَكَ چھوڑا، (تَرَكَ، يَتْرُكُ، تَرْكًا) چھوڑنا، ترکہ میں چھوڑنا، اٰلُ مُوْسٰى (آل موسیٰ) وَ اٰلُ هٰرُوْنَ (آل ھارون) مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں: آل دراصل (اَلْاَهْل) ہے، اس کا اطلاق ایک طرح کے اختصاص یا خصوصی تعلق کی بنا پر ہوتا ہے، چاہے یہ تعلق ذاتی ہو چاہے قرابت یا موالات اور عقیدے و عمل کے قبیل سے ہو، آل النّبی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا اور وہ تمام مسلمان جو شریعت اسلامی پر عمل پیرا ہیں۔(لسان القرآن، جلد اول)

چنانچہ آل موسیٰ اور آل ہارون سے وہ لوگ مراد ہیں جو شریعت موسوی اور شریعت ہارونؑ کے پیروکار تھے، تَحْمِلُهُ (تَحْمِلُ.هُ) اٹھائیں گے۔اس کو اَلْمَلٰٓئِكَةُ، فرشتے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

اَلتَّابُوتُ، اس خاص صندوق کا اصطلاحی نام ''تابوت سکینہ'' ہے یہ بنی اسرائیل کا اہم ترین ملی وقومی ورثہ تھا۔ اس کے اندر اصل نسخہ توریت مع تبرکات انبیاء محفوظ تھا، اسرائیلی اس کو انتہائی برکت وتقدیس کی چیز سمجھتے تھے اور اس کے ساتھ برتاؤ انتہائی احترام کا رکھتے تھے سفر وحضر، جنگ وامن ہر حال میں اسے بڑی حفاظت سے اپنے ساتھ رکھتے، یہ کچھ ایسا بڑا نہ تھا، موجودہ علماءِ یہود کی تحقیق کے مطابق اس کا طول اڑھائی فٹ، بلندی ڈیڑھ فٹ اور عرض بھی ڈیڑھ فٹ تھا، بنی اسرائیل اپنی ساری خوش بختی اسی سے وابستہ سمجھتے تھے۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''سَكِيْنَةٌ'' کے معنی اطمینان، قرار اور حوصلہ کے ہیں، بالخصوص وہ اطمینان وحوصلہ جو پرخطر حالات اور جنگ کے مصائب میں آدمی کے عزم کو قائم رکھے مثلاً هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ (الفتح:۴) ''وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں عزم واطمینان اتارا تاکہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ (مزید) ایمان کا اضافہ کریں۔'' اس تابوت کے ساتھ بنی اسرائیل کو جو والہانہ عقیدت تھی (اور اس کا وہ عزت واحترام کرتے تھے) اس کا ایک خاص پہلو یہ بھی تھا کہ مصائب ومشکلات اور میدان جنگ میں ان کے حوصلے (Morale) کو قائم رکھنے میں اس کا سب سے زیادہ دخل تھا۔ (تدبر قرآن)

عاجز کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا نام اور اس کا کلام مسلمان کے لیے ہمیشہ رحمت اور سلامتی کا باعث ہوتا ہے بشرطیکہ ان کا ایمان ویقین قوی اور مضبوط ہو، اور وہ اللہ تعالیٰ کے کلام پر دل وجان سے عمل پیرا ہوں جیسا کہ قرآن حکیم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ، وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (یونس۱۰:۵۷) ''لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے، یہ وہ (نعمت) ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے۔''

اس طرح بنی اسرائیل کے لیے ''تابوت'' جس میں تورات (تختیوں پر لکھی ہوئی تھی) ان کے رب کی طرف سے سکینت وطمانیت کا باعث تھی۔ اور اس کی پاکیزہ تعلیمات کے صلہ میں جنگ کے وقت ان میں جوش وولولہ اور استقلال وثبات قدم پیدا ہوتا اور وہ اپنی تمام قوت جنگ میں صرف کر دیتے، پورے عزم و

ہمت سے لڑتے اور فتح یاب ہو کر لوٹتے۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یہ 'تابوت' ان کے دشمن ان سے چھین کر لے گئے تھے (جن سے وہ شکست خوردہ اور پست ہمت ہو گئے تھے)، اللہ تعالیٰ نے نشانی کے طور پر یہ 'تابوت' فرشتوں کے ذریعے سے حضرت طالوت کے دروازے پر پہنچا دیا، جسے دیکھ کر بنو اسرائیل خوش بھی ہوئے اور اسے طالوت کی بادشاہی کے لیے منجانب اللہ نشانی بھی سمجھا اور اللہ تعالیٰ نے بھی اسے ان کے لیے ایک اعجاز (اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً) اور فتح و سکینت کا سبب قرار دیا، سکینت کا مطلب ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص نصرت کا ایسا نزول ہے جو وہ اپنے خاص بندوں پر نازل فرماتا ہے اور جس کی وجہ سے جنگ کی خون ریز معرکہ آرائیوں میں جس سے بڑے بڑے شیر دل بھی کانپ اٹھتے ہیں، اہل ایمان کے دل دشمن کے خوف اور ہیبت سے خالی اور فتح و کامرانی کی امید سے لبریز ہوتے ہیں۔'' (احسن البیان)

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾

تحقیق اس میں تمہارے لیے نشانی ہے، اگر تم ایمان والے ہو۔

اِنَّ تحقیق، بلاشبہ، کلام میں زور پیدا کرتا ہے، فِیْ ذٰلِکَ اس بات میں، اس واقعہ میں یعنی تابوت کی واپسی میں، لَاٰیَۃً (لَ. اٰیَۃً) ضرور بضرور، نشانی ہے، لام تاکید کے لیے آتا ہے، اٰیَۃٌ، نشانی اس کی جمع آیات آتی ہے، اِنْ اگر، شرطیہ، کُنْتُمْ تم ہو ماضی جمع مذکر حاضر (کَانَ، یَکُوْنُ، کَوْنًا) ہونا مُّؤْمِنِیْنَ، مُؤْمِنٌ کی جمع ہے، اسم فاعل (اٰمَنَ، یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا) ایمان لانا، اس سے اسم فاعل مُؤْمِنٌ، ایمان لانے والا، یعنی تابوت (جس میں تورات ایسی قیمتی نعمت ہے) وہ تمہارے رب نے تمہیں واپس دلوا دی، تاکہ تمہارے لیے راحت اور سکون کا سامان بنے اور تم اس کی قیمتی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر دین و دنیا کی کامرانیوں سے ہمکنار ہو جاؤ۔

﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَهَرٍ﴾

پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا تو وہ (لشکر سے) مخاطب ہوا (دیکھو!) اللہ ایک نہر کے ذریعے تمہاری آزمائش کرنے والا ہے۔

فَلَمَّا (فَ. لَمَّا) پس، جب وقت کو ظاہر کرتا ہے، لَمَّا ظرف زمان کہلاتا ہے، فَصَلَ، جدا ہوا، چلا

(فَصَلَ، یَفصِلُ، فَصْلًا) نکلنا، وطن سے جدا ہونا، طَالُوْتُ، طالوت، وہ مسلمان جرنیل جو علمی طور پر توانا تھا اور جسے اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی سموئیلؑ نے بنی اسرائیل پر مقرر کیا تھا۔ بِالْجُنُوْدِ (بِ.الْجُنُوْدِ) ساتھ۔لشکروں (کے) جنود کا مفرد جُنْدٌ (Army) ہے یعنی جب طالوت ہزاروں نفوس پر مشتمل لشکر لے کر نکلے تو لشکریوں سے یوں مخاطب ہوئے: اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ بے شک اللہ تعالیٰ آزمانے والا ہے تمہیں ساتھ ایک نہر کے (اِبْتَلٰی، یَبْتَلِیْ، اِبْتِلَاءً) آزمائش کرنا، کُمْ، تمہیں ضمیر جمع مذکر مخاطب، لشکریوں کی طرف جاتی ہے۔بِنَهَرٍ (بِ.نَهَرٍ) ساتھ نہر کے یعنی تمہارے صبر اور اطاعت کا امتحان لینے والا ہے۔

﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ﴾

پس جو کوئی پی لے (پانی) اس سے پس نہیں ہے مجھ سے اور جو کوئی نہ چکھے اس کو بلاشبہ وہ مجھ سے ہے۔

فَمَنْ (فَ.مَنْ) پس، جو کوئی شَرِبَ پیئے، ماضی واحد مذکر غائب (شَرِبَ، یَشْرَبُ، شُرْبًا) پینا (فَ.لَيْسَ) پس نہیں (ہے)، مِنِّيْ (مِنِّ.ی) سے، مجھ یعنی مجھ سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہے، وہ میرے ساتھ جنگ میں شامل نہ ہوگا۔ وَمَنْ اور جو کوئی، لَّمْ يَطْعَمْهُ (لَّمْ.يَطْعَمْ.هُ) نہ چکھے، اسے (پانی کو) فَاِنَّهٗ (فَ.اِنَّ.هُ) پس، بے شک وہ (ہے) مِنِّيْ (مِنِّ.ی) سے، مجھ یعنی جس نے پانی کو نہ چکھا وہ مجھ سے ہے، یعنی وہ میرے ساتھ جنگ میں شامل ہوگا۔

﴿اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ﴾ مگر جو کوئی چلو بھر پانی پی لے (تو کوئی مضائقہ نہیں)۔

اِلَّا کلمۂ استثناءِ کلام (مگر) مَنِ اغْتَرَفَ جو کوئی بھرے، مَنْ، جو کوئی (اِغْتَرَفَ، یَغْتَرِفُ، اِغْتِرافًا) کسی چیز کا اٹھا لینا، غُرْفَةً، ایک چُلّو، بِيَدِهٖ (ب.يَدِ.هٖ) ساتھ، ہاتھ، اپنے (کے) یعنی وہ چلو بھر پانی منہ میں ڈال لے تو کوئی حرج نہیں ہے (گویا کہ جس سے ہونٹ اور حلق تر ہو جائیں)۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

''طالوت کا پانی پینے سے روک کر لوگوں کے صبر و ثبات اور اطاعت و انقیاد کا امتحان لینا اور ایک قلیل تعداد کے سوا سب کا نااہل ثابت ہونا اس راہ میں اصلی چیز صبر اور اطاعت ہے، جو لوگ ایک گھڑی کی پیاس ضبط نہیں کر سکتے، وہ میدان جنگ کی محنتیں کیونکر برداشت کریں گے۔'' (ترجمان القرآن، جلد اول)

﴿فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ﴾

تو چند لوگوں کے سوا سب نے اس سے (جی بھر کر) پانی پیا۔

فَشَرِبُوْا (فَ.شَرِبُوْا) پس، پیا انہوں نے (پانی) (شَرِبَ، يَشْرَبُ، شُرْبًا) پینا، مِنْهُ (مِنْ.هُ) سے، اس یعنی اس نہر سے، اِلَّا، مگر۔ قَلِيْلًا، تھوڑے۔ مِّنْهُمْ (مِّنْ.هُمْ) سے، اُن، مگر تھوڑے ان میں سے ثابت قدم رہے۔

﴿فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾

پھر جب طالوت اور ان کے مسلمان ساتھی نہر پار کر کے آگے بڑھے۔

فَلَمَّا (فَ.لَمَّا) پس، جب، (جَاوَزَ.هُ) آگے بڑھا، اس سے (یعنی اس نہر سے) هُوَ، وہ (طالُوت) وَالَّذِيْنَ اور جو لوگ اٰمَنُوْا ایمان لائے، مَعَهٗ (مَعَ.هُ) ساتھ، اس کے (یعنی طالوت کے)۔

﴿قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾

تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

قَالُوْا ماضی جمع مذکر غائب، کہا انہوں نے (قَالَ، يَقُوْلُ قَوْلًا) کہنا، لَا نہیں (نافیہ)، طَاقَةَ، قدرت، طاقت، لَنَا (لَ.نَا) لیے، ہمارے، یعنی ہمارے اندر، الْيَوْمَ، آج کے دن بِجَالُوْتَ (بِ.جَالُوْتَ) ساتھ، جالوت کے، وَجُنُوْدِهٖ (وَجُنُوْدِ.هٖ) اور لشکروں اس کے، یعنی ہمارے اندر جالوت اور اس کے لشکروں کے ساتھ لڑنے کی ہمت اور طاقت نہیں ہے۔ جَالُوْت عمالقہ کے لشکر کا مشہور سردار، بڑے تن و توش کا پہلوان تھا۔ (احسن البیان)

﴿قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾

(البتہ) ان میں سے وہ لوگ جو یہ یقین رکھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے، کہنے لگے "بارہا ایسا ہوا ہے کہ تھوڑی سی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب رہی ہے۔"

قَالَ کہا، فعل ماضی واحد مذکر غائب، الَّذِيْنَ وہ لوگ (جو) اسم موصول، يَظُنُّوْنَ یقین رکھتے تھے مضارع جمع مذکر غائب (ظَنَّ، يَظُنُّ، ظَنًّا) اعتقاد رکھنا، قوی امید رکھنا، اَنَّهُمْ (اَنَّ.هُمْ) بلاشبہ، وہ مُّلٰقُوْا

اللّٰہِ وہ ملنے والے ہیں اللہ تعالیٰ سے۔ یعنی طالوت کے لشکر میں سے وہ لوگ جنہیں اس بات کا یقین تھا کہ انہیں اللہ کے پاس جانا ہے بے ساختہ پکار اٹھے، کَمْ مِّنْ بارہا (ایسا ہوا ہے) کہ، کَمْ، خبر یہ ہے، کئی بار، فِئَةٍ جماعت اور گروہ، قَلِيْلَةٍ تھوڑی، فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ، صفت اور موصوف، ان کے اعراب یکساں ہوتے ہیں، فِئَةٍ موصوف اور قَلِيْلَةٍ، اس کی صفت ہے، غَلَبَتْ غالب آئی، فِئَةً كَثِيْرَةً، جماعت اور گروہ، بڑے (پر)، بِاِذْنِ اللّٰهِ، اللہ کے حکم سے۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

''جالوت کے لشکر جرار کو یہ دیکھ کر گھبرا گئے اور کہہ اٹھے کہ ہم میں تو جنگ کی ہمت نہیں، سوا ان قلیل نفوس کے جن کے دلوں میں صحیح ایمان جاگزین تھا اور وہ سوا اللہ کے اور کسی سے نہیں ڈرتے تھے، وہ ثابت قدم رہے، اسے لیے کہ وہ سمجھتے تھے، فتح کثرتِ تعداد یا ساز وسامان کی چمک دمک سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت سے ہے، بہت سی قلیل التعداد جماعتیں اپنے ایمان واستقلال کی وجہ سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں۔'' (سراج البیان، جلد اول)

﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ،﴾ اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

آیات مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اللہ کی کتاب ان کے لیے باعث طمانیت وسکینت ہوتی ہے، جو اس کی دل وجان سے قدر کرتے ہیں اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔

۲) صبر وثبات اور اطاعت وانقیاد ہی وہ شاندار اصول ہیں جن سے زندگی کے بلند مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

۳) کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب آ جاتی ہیں اور کتنی ہی بڑی جماعتیں ہیں جو چھوٹی جماعتوں سے شکست کھا جاتی ہیں، فتح وشکست کا دارومدار افراد کی کثرت وقلت پر نہیں بلکہ دلوں کی قوت پر ہے اور اللہ کی مدد انہی لوگوں کا ساتھ دیتی ہے جو صابر اور ثابت قدم ہوتے ہیں۔

۴) ایمان ہی سب سے بڑی قوت اور طاقت ہے جس کی اس وقت مسلمانوں میں شدت سے کمی ہے، انہیں چاہیے کہ اللہ کی مدد حاصل کرتے ہوئے قرآن حکیم کی تعلیمات کو حرز جاں بنائیں، پھر وہی دنیا میں سربلند اور سرخرو ہوں گے۔

وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲۵۰) فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۲۵۱) تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۵۲)	اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے میں نکلے، تو انہوں نے دعا کی ''اے ہمارے رب! ہم پر صبر (کے جام) انڈیل دے اور ہمارے قدم میدان جنگ میں جما دے اور پھر ہماری مدد فرما کہ ہم منکرین حق کے گروہ پر فتح مند ہو جائیں، چنانچہ (ایسا ہی ہوا) انہوں نے اللہ کے اِذن سے کافروں کو مار بھگایا اور داؤدؑ کے ہاتھ سے جالوت مارا گیا پھر اللہ نے داؤدؑ کو بادشاہی اور حکمت سے سرفراز کیا اور جو کچھ سکھلانا تھا، سکھلا دیا۔ (اور حقیقت یہ ہے) کہ اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرتا تو اور زمین میں فساد پھیل جاتا لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر بڑا فضل و کرم کرنے والا ہے (اے پیغمبر) یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں اور ہمارا سنانا برحق ہے، یقیناً آپ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں ہم نے اپنی پیغمبری کے لیے چن لیا ہے۔

﴿وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾

اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں سے مقابلے کے لیے نکلے۔

وَلَمَّا اور جب، وقت کو ظاہر کرتا ہے، بَرَزُوْا، لفظ بَراز، کھلے میدان کو کہتے ہیں اور (بَرَزَ، یَبْرِزُ، بُرُوْزًا) مقابلے کے لیے باہر آنا، یعنی طالوت اور اس کے مسلمان ساتھی مقابلے کے لیے نکلے، لِجَالُوْتَ (لِ. جَالُوْتَ) واسطے، جالوت کے یعنی جالوت کے سامنے، وَجُنُوْدِهٖ (وَجُنُوْدِ. ہٖ) اور لشکروں، اس

کے۔یعنی جب طالوت اپنے ساتھیوں کو لے کر میدان جنگ میں آئے اور جالوت اور اس کے لشکروں کو دیکھا،تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوئے:

﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾

(انہوں نے کہا) اے ہمارے رب! ڈال دے ہمارے اوپر صبر اور ثابت رکھ ہمارے قدم اور مدد عطا فرما ہمیں کافروں پر۔

قَالُوْا، کہا انہوں نے ماضی جمع مذکر غائب (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، رَبَّنَآ (رَبَّ.نَا) رب۔ ہمارے، رب. مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، اَفْرِغْ ڈال دے، انڈیل دے، فعل امر واحد مذکر (اَفْرَغَ، يُفْرِغُ، اِفْرَاغًا) انڈیلنا، نازل فرمانا (باب افعال) عَلَيْنَا (عَلٰى.نَا) اوپر۔ ہمارے، صَبْرًا، صبر، قوت برداشت، جفاکشی، ہمت و دلیری، تکلیف سہنے کا جذبہ یا طاقت، وَّثَبِّتْ اور ثابت رکھ، فعل امر واحد مذکر (ثَبَّتَ، يُثَبِّتُ، تَثْبِيْتًا) مضبوط کرنا، ثابت رکھنا، اَقْدَامَنَا (اَقْدَامَ.نَا) قدموں (کو) ہمارے، اَقْدَامٌ کا مفرد قَدَمٌ ہے، وَانْصُرْنَا (وَانْصُرْ.نَا) اور مدد فرما۔ ہماری، اُنْصُرْ اور مدد فرما، فعل امر واحد مذکر (نَصَرَ، يَنْصُرُ، نَصْرًا) مدد کرنا، عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ، کافر قوم پر كَافِرٌ کا مفرد كَافِرٌ ہے، حق بات کا انکار کرنے والا۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''جالوت اس دشمن قوم کا کمانڈر اور سربراہ تھا جس سے طالوت اور ان کے رفقاء کا مقابلہ تھا، یہ قوم عمالقہ تھی جو اپنے وقت کی بڑی جنگجو اور بہادر قوم سمجھی جاتی تھی، ان کی اس شہرت کے پیش نظر عین معرکہ آرائی کے وقت اہل ایمان نے بارگاہ الٰہی میں صبر و ثبات اور کفر کے مقابلے میں ایمان کی فتح و کامیابی کی دعا مانگی، گویا مادی اسباب کے ساتھ ساتھ اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نصرت الٰہی کے ایسے موقعوں پر بطور خاص طلبگار رہیں جیسے جنگ بدر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت الحاح و زاری سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا اور مسلمانوں کی ایک نہایت قلیل تعداد کافروں کی بڑی تعداد پر غالب آئی۔'' (احسن البیان)

﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ، وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ﴾

پس انہوں نے شکست دی ان کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے، اور قتل کیا داؤدؑ نے جالوت کو۔

فَهَزَمُوْهُمْ (فَ.هَزَمُوْا.هُمْ) پس، انہوں نے شکست دی۔ ان کو، یعنی طالوت اور ان کے ساتھیوں نے جالوت اور اس کے لشکر کو، وَقَتَلَ اور قتل کیا فعل ماضی واحد مذکر غائب، دَاوٗدُ (داؤد نے) جَالُوْتَ، (جالوت کو)، دَاوٗدَ، سیدنا داؤد علیہ السلام مشہور پیغمبر، قرآن مجید میں آپ کا ذکر سولہ (۱۶) مقامات پر آیا ہے، پورا نام داؤد بن یُسیٰ بن عوبید ہے، آپ کا زمانہ ۱۰۲۴ تا ۹۶۳ ق م ہے، طالوت کی فوج میں ایک نوجوان سپاہی کی حیثیت سے شامل ہوئے، اس وقت تک نہ نبوت سے سرفراز ہوئے تھے نہ ملک و سلطنت سے۔ (تفسیر ماجدی)

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ کے بارے میں سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''یہ آیت' اللہ کے اذن پر زور دیتی ہے تا کہ اہل ایمان اس حقیقت کو جان لیں یا وہ جانتے ہوں تو ان کے علم میں اضافہ ہو اور اس کائنات میں جو واقعات رونما ہیں اور جو قوت ان واقعات کا باعث ہے، اس کی فطرت کے سلسلے میں کامل تصور واضح ہو، حقیقت یہ ہے کہ اہل ایمان قدرت الٰہی کے لیے پردے کی حیثیت رکھتے ہیں، اللہ ان کے واسطے سے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس بات کو پسند کرتا ہے ان کے ذریعہ سے اس کا نفاذ کرتا ہے اور یہ سب کچھ اس کے اذن سے ہوتا ہے، اس معاملے میں انہیں کوئی اختیار حاصل نہیں، نہ اُن کے پاس کوئی قوت ہے اور نہ کوئی تدبیر کارگر، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ..... اللہ انہیں اپنی مشیت کے نفاذ کے لیے منتخب فرماتا ہے تو اس کے اِذن سے ان سے ان اعمال کا صدور ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے شعور کے نتیجہ میں مومن کا دِل سلامتی، طمانیت اور یقین سے بھر جاتا ہے۔ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اللہ نے اسے اپنے رول کے ادا کرنے کے لیے چنا ہے، یہ اس پر اللہ کا فضل و کرم ہے وہ اس رول کو، جو اس کے لیے چنا گیا ہے، ادا کرتا ہے، اِس طرح اللہ کا نافذ ہونے والا فیصلہ اس کے ہاتھوں نافذ ہوتا ہے، انتخاب کے اعزاز کے بعد اللہ اسے ایک اور اعزاز اور ایک اور فضل سے نوازتا ہے، اجر و ثواب کا فضل، اگر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو وہ یہ رَوْل ادا نہ کر پاتا اور اس کا فضل و کروم نہ ہوتا تو اسے ثواب حاصل نہ ہوتا، اِسی کے ساتھ مومن کو غایت کے حصول، مقصد کی پاکیزگی اور راستے کی صحت و نظافت کا یقین ہوتا ہے، اس سب کے سلسلے میں اس کی کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی، وہ تو اللہ کی بہترین حیثیت کا نافذ کرنے والا اور جو کچھ وہ چاہتا ہے، اسے قائم اور برپا کرنے والا ہے۔ اور اس کا مستحق وہ نیت کی پاکیزگی، اطاعت الٰہی کے عزم اور خلوص کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہونے سے ہوتا ہے۔

﴿وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ﴾ اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا۔

داؤد بنی اسرائیل کے ایک کم سن نوجوان تھے اور جالوت ایک طاقتور فرماں روا اور خوف ناک کمانڈر تھا، اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اسرائیلی قوم اس بات کا مشاہدہ کرے کہ امور و معاملات ظاہری حالات کے نہیں حقائق کے مطابق رونما ہوتے ہیں اور حقائق کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور ان کے اندازے اور پیمانے صرف اسی کے ہاتھ میں ہیں، اہل ایمان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں اور اللہ سے کیے ہوئے اپنے عہد کو پورا کریں، پھر وہی ہوگا جو اللہ چاہے گا، اس شکل میں ہوگا جو اللہ چاہے گا، اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ جالوت جیسا خطرناک جبار ایک کمسن نوجوان کے ہاتھوں مارا جائے تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ جن جبابرہ سے وہ تھر تھر لرزتے اور بے حد و حساب خوف کھاتے ہیں جب اللہ تعالیٰ ان کے قتل کئے جانے کا فیصلہ کرتا ہے تو کم سن نوجوان ان پر غالب آجاتے ہیں۔ داؤدؑ کے ہاتھوں جالوت کے مارے جانے میں اللہ تعالیٰ کی ایک اور حکمت پوشیدہ تھی اور وہ یہ کہ..... جیسا کہ اللہ نے مقدر کر رکھا تھا..... طالوت کے بعد حکومت حضرت داؤدؑ کو ملے، اور ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کو، اور ان کا دورِ حکومت بنی اسرائیل کی طویل تاریخ میں زریں دور قرار پائے اور یہ سب نتیجہ اور بدلہ تھا عقیدے کی بیداری کا، جو بنی اسرائیل کے دلوں میں ان کی گمراہی اور حق سے ان کی روگردانی کے بعد رونما ہوئی تھی۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ﴾

اور اللہ نے انہیں (داؤدؑ کو) حکومت اور حکمت عطا فرمائی اور انہیں سکھلایا جو کچھ انہیں سکھانا چاہا۔

وَاٰتٰىهُ (وَاٰتٰى۔ہُ) اور، عطا کیا، اُس کو (اٰتٰى، يُؤْتِيْ) عطا کرنا، وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ، اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کی بادشاہی (حکومت) اور حکمت (دانشوری) وَالْحِكْمَةَ کے معنی علم و عقل کے ذریعہ حق بات دریافت کر لینے کے ہیں۔ (مفردات القرآن)، قرآن حکیم سے پتہ چلتا ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ یہ عطا فرما دے وہ بہت بڑی نعمت سے نوازا جاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے: يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ، وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ:۲/۲۶۹) ''وہ جسے چاہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا ہوگئی وہ یقیناً خیر کثیر سے بہرہ ور کیا گیا۔''

ہر بندۂ مومن کو رب تعالیٰ کے حضور اسی دانائی کی بھیک مانگنی چاہیے، عاجز ان سطور کے لکھتے ہوئے رب کریم سے اسی نعمت کی آرزو کرتا ہے، یقیناً وہ دلوں کی فریاد سننے والا اور جاننے والا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''سیدنا داؤد علیہ السلام نسل اسرائیلی کے دوسرے بادشاہ ہیں، تاجدار اول طالوت تھے، آپ انہی کے داماد تھے، طالوت جب مع اپنے بڑے فرزند کے میدان جنگ میں جام شہادت سے سرفراز ہوئے تو قبیلہ یہودا نے آپؑ کو اپنا بادشاہ منتخب کیا اور دو سال کی کشمکش کے بعد باقی قبیلوں نے بھی آپ ہی پر اتفاق کیا، سات سال تک آپ نے پایۂ تخت جبرون (یعنی الخلیل) کو رکھا، اس کے بعد یروشلم کو دشمنوں کے قبضہ سے نکال کر اسے دارالسلطنت بنایا، آپ نے گرد و پیش کے حکمرانوں کو مسخر و مغلوب کیا اور اپنے حدود سلطنت کو خوب وسیع کیا، آپ کا عہد حکومت تاریخ اسرائیل میں فتوحات ملکی اور حسن انتظام دونوں کے لیے یادگار ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾

''اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو (روئے) زمین پر فساد برپا ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ تو جہان والوں پر بڑا فضل و کرم کرنے والا ہے۔''

وَلَوْ لَا اور اگر نہ (ہوتا)، **دَفْعُ**، دفع کرنا، **دَفْعُ اللّٰهِ**، اللہ تعالیٰ کا دفع کرنا، **النَّاسَ** لوگوں کو، **بَعْضَهُمْ (بَعْضُ.هُمْ)** بعض ان کے (کو) **بِبَعْضٍ (بِ.بَعْضٍ)** ساتھ بعض کے، **لَّفَسَدَتِ (لَّ.فَسَدَت)** البتہ، بگڑ جاتی، **الْاَرْضُ** زمین عین زمین میں ضرور بضرور فساد پھیل جاتا، **وَلٰكِنَّ** اور لیکن، **وَلٰكِنَّ اللّٰهَ** اور لیکن اللہ تعالیٰ، **ذُوْ فَضْلٍ** صاحب فضل ہے، **عَلَى الْعٰلَمِيْنَ**، جہان والوں پر۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اس (آیہ مبارکہ میں) اللہ کی ایک سنت (طریق) کا بیان ہے کہ وہ انسانوں کے ہی ایک گروہ کے ذریعے سے، دوسرے انسانی گروہ کے ظلم اور اقتدار کا خاتمہ فرماتا رہتا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرتا اور کسی ایک ہی گروہ کو ہمیشہ قوت و اختیار سے بہرہ ور کیے رکھتا تو یہ زمین ظلم و فساد سے بھر جاتی، اس لیے یہ قانون الٰہی، اہل دنیا کے لیے فضل الٰہی کا خاص مظہر ہے۔ (احسن البیان)

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾

یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم انہیں آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک اور آپؐ یقیناً مرسلین میں سے ہیں۔

تِلْکَ، یہ اسم اشارہ، اٰیٰتُ نشانیاں، اس کا مفرد، آیت ہے، نَتْلُوْهَا (نَتْلُوْ.هَا) ہم پڑھتے ہیں۔ ان کو یعنی ان آیات کو ہم پڑھ کر آپ کو سناتے ہیں، (تَلَا، یَتْلُوْا، تِلَاوَةٌ) پڑھنا، تلاوت کرنا، وَاِنَّکَ (وَاِنَّ.کَ) اور بلاشبہ، آپؐ، لَمِنَ (لَ.مِنَ) ضرور بضرور۔ سے، الْمُرْسَلِیْنَ بھیجے ہوؤں سے (مرسلین میں سے ہیں) یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ بھی ان رسولوں میں سے ہیں جنہیں ہم نے اپنا پیغام دے کر دنیا میں بھیجا ہے (آپ خاتم النبیّین ہیں)۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''یہ گزشتہ واقعات، جو آپ ﷺ پر نازل کردہ کتاب کے ذریعے سے دنیا کو معلوم ہو رہے ہیں، اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یقیناً آپ کی رسالت وصداقت کی دلیل ہیں کیونکہ آپ ﷺ نے یہ نہ کسی کتاب میں پڑھے ہیں، نہ کسی سے سنے ہیں جس سے یہ واضح ہے کہ یہ غیب کی خبریں ہیں جو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر نازل فرما رہا ہے۔'' (احسن البیان)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) طالوت (مسلمانوں کے جرنیل) اور جالوت (کفار کے جرنیل) اور ان کے درمیان جنگ، پھر مسلمانوں کا فتح یاب ہونا (باوجود قلیل تعداد کے)، اس واقعہ کو بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا جا رہا ہے کہ آپ کو بھی مخالفین ومعاندین اسلام سے جنگ کرنی پڑے گی، انجام کار آپ غالب رہیں گے اور پھر آپ کو امت مسلمہ کے بقاو قیام کے لیے سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی، اس کے لیے علم وبصیرت اور حکمت ودانش اور ان تمام سیاسی امور سے مکمل آگہی ضروری ہے جن سے سلطنت مستحکم اور مضبوط ہوتی ہے، سیدنا داؤد علیہ السلام کو زبور ایسی روشن کتاب عطا کی گئی اور انہیں تمام باتوں کا سلیقہ اور قرینہ بھی عطا کیا گیا، آپ ﷺ کو رب کریم کامل دین وشریعت سے نواز رہا ہے اور جیسا کہ آپ کی نبوت ہمیشہ کے لیے ہے اس لیے جو کتاب ہدایت اور نسخہ شفا آپ کو عطا کیا جا رہا ہے وہ نسل انسانیت کے لیے تا قیامت ان کے امراض کا ازالہ کرتا رہے گا اور ان کی مکمل رہنمائی اور رہبری کا سروسامان ہوگا۔

۲) مسلمان کو اپنی قوت وطاقت پر نہیں بلکہ اللہ کی نصرت وحمایت پر بھروسہ ہوتا ہے، وہ ہر ممکن جنگی تیاری

کرتا ہے اس لیے کہ اسے ایسا کرنے کا حکم ہے مگر توپوں اور ٹینکوں کی گھن گرج میں بھی اپنے خالق و مالک کو نہیں بھولتا ہے، اسے عزم وثبات کا حوصلہ بھی وہیں سے ملتا ہے۔

۳) قرآن حکیم نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ آخری فتح مادی قوت کی نہیں، محکم عقیدے کی ہوتی اور عددی اکثریت کی نہیں مضبوط اور برتر قوت ارادی کی ہوتی ہے اور پھر حق و باطل کی قوتوں کے ٹکراؤ کی غرض وغایت، مال غنیمت اور ساز وسامان کا حصول نہیں ہے، اس تصادم کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ ہے زمین کی اصلاح، شر کو مغلوب کر کے اس جگہ زمین میں خیر کا غلبہ، ظلم وستم کی بجائے عدل وانصاف کی حکمرانی اور لوگوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ کی غلامی میں لانا انبیا کرام اور صالحین نے صرف اسی مقصد کے لیے جہاد کیا۔

۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء ورسل کے مبارک سلسلے کی آخری کڑی ہیں، یہ تمام انسانیت کے گل سرسبد ہیں جن کا پیغام حق یکساں رہا اور انہوں نے بلا کم وکاست اسے لوگوں تک پہنچایا اور اس راہ میں ہر قسم کے مصائب ومشکلات برداشت کیں، دکھ اور تکلیفیں اٹھائیں، وطن سے بے وطن ہوئے اور کبھی راہ حق میں جہاد کرنا پڑا تو وہ کیا، مگر کبھی بھی صداقت کو نہ چھوڑا اور نہ سچائی سے منہ موڑا۔

۵) زندگی کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اس لیے صرف اسے ہی دستور حیات دینے کا حق ہے، یہ حق اس کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے اللہ کے سوا جو کوئی اس کے بندوں کے لیے کوئی نظام مرتب کرتا ہے، وہ اللہ کے حق پر ڈاکہ ڈالتا ہے، وہ اللہ کے بندوں پر اور خود اپنے اوپر ظلم ڈھاتا ہے، وہ اس چیز کا مدعی ہے جس کا وہ مالک نہیں وہ سراسر باطل پر ہے اور باطل کبھی راہ نہیں پا سکتا ہے۔ وہ دنیا اور آخرت میں نقصان اٹھانے والا ہے۔ تِلْکَ اٰیَاتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ''یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہیں حق کے ساتھ سنا رہے۔'' لہٰذا اس حق کی نشر واشاعت کے لیے مصروف ہو جاؤ اور یہی تمہاری امت کا فریضہ ہے۔

[الحمدللہ دوسرا پارہ ۷ رجب ۱۴۲۴ ھجری
بروز جمعۃ المبارک بعد عصر مکمل ہوا۔]

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا	(اے رسولؐ) ان انبیاء و مرسلین میں ہم نے
بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (۲۵۳)	بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، ان میں سے کچھ ایسے تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور کچھ وہ ہیں جن کے درجات بلند کیے اور عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روح القدس (جبرئیل امین) سے انہیں مدد دی، اور اگر اللہ چاہتا تو ان رسولوں کے بعد لوگ آپس میں جھگڑا نہ کرتے جبکہ ان کے پاس واضح احکام بھی آ چکے تھے، لیکن انہوں نے اختلاف کیا پھر کوئی ان احکام پر ایمان لایا اور کسی نے انکار کیا، اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔

﴿تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾

ان رسولوں میں فضیلت دی ہم نے بعض اُن (کے) کو بعض پر۔

تِلْکَ، (وہ) اسم اشارہ بعید، بعض اوقات اس کا ترجمہ بطور عزت (یہ) سے ہوتا ہے تِلْک، رسولوں کی جماعت کے لیے اشارہ استعمال ہوا ہے، الرُّسُلُ اس کا مفرد رسول ہے، پیغمبر وہ مبارک شخصیت جو اللہ کی جانب سے شریعت (احکام و تعلیمات) لے کر آئے اور خود اس پر عمل پیرا ہو کر دوسروں کو اس کی تبلیغ و تلقین کرے (القاموس الوحید) فَضَّلْنَا فضیلت دی ہم نے، فعل ماضی جمع متکلم (فَضَّلَ، یُفَضِّلُ تَفْضِیْلاً) فضیلت دینا، بَعْضَهُمْ (بَعْضَ. هُمْ) بعض، ان کے (کو) عَلٰی بَعْضٍ (اوپر، بعض کے)۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

”یہ فضیلت و افضلیت جو کچھ ہے محض عنداللہ ہے، خالق کے ہاں درجات و مراتب قربت کے لحاظ

سے ہے، خَلقُ کے لیے بہ حیثیت مطاع سب یکساں ہیں، عام خلقت کے لیے رسول سب برابر ہیں، اطاعت وتعظیم سب کی یکساں واجب ہے اور اسی معنی میں قرآن مجید کی سورۃ البقرہ:۱۳۶ ''لَانفرّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ ''یعنی رسولوں کے درمیان باہم کوئی فرق نہیں کرتے ہیں (ان کی صداقت کے لحاظ سے، کہ بعض کو مانیں اور بعض کو جھٹلائیں جیسا کہ یہود، نصاریٰ وغیرہ مقہور اور معتوب امتوں کا شیوہ ہے)۔''

(تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿مِنْھُمْ مَّنْ کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعْضَھُمْ دَرَجٰتٍ﴾

کچھ ایسے تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور کچھ وہ ہیں جن کے درجات بلند کیے۔

مِنْھُمْ (مِنْ.ھُمْ) سے، ان، یعنی ان میں سے ھُمْ کی ضمیر رسولوں کی طرف جاتی ہے، مَّنْ، جو، جن (سے)، اسم موصول، کَلَّمَ اللّٰہُ، کلام کیا اللہ نے (کَلَّمَ، یُکَلِّمُ، تَکْلِیمًا) کلام کرنا، وَرَفَعَ اور بلند کیا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (رَفَعَ، یَرْفَعُ، رَفْعًا) بلند کرنا، بَعْضَھُمْ (بَعْضَ.ھُمْ) بعض، ان (کے کو) دَرَجٰتٍ درجات (کو)، اس کا مفرد دَرَجَۃٌ ہے، بلند مرتبہ۔

انبیاء علیہم السلام میں سے کچھ ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور بعض کو نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی عطا کی جیسا کہ سیدنا داؤد علیہ السلام اور سیدنا یوسف علیہ السلام کو یہ منصب ملا، اور بعض کے درجات مِن حیث المجموع بلند کیے جیسے خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم امام الانبیاء ہیں۔

﴿وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾

اور ہم نے عطا کیں عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں اور مدد کی ان کی روح القدس کے ذریعے۔

وَاٰتَیْنَا اور ہم نے عطا کیں، فعل ماضی جمع متکلم، اللہ تعالیٰ کے لیے جمع کا صیغہ بطور عزت کے آتا ہے، وہ تنہا و یکتا ہے، عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ مریم کے بیٹے عیسیٰ کو، الْبَیِّنٰتِ واضح نشانیاں اس کا مفرد بَیِّنَۃٌ، معجزہ، نشانی، جیسا کہ وہ اللہ کے حکم سے اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو صحت یاب فرما دیتے، وَاَیَّدْنٰہُ (وَ.اَیَّدْ.نا.ہُ) اور۔ تائید کی۔ ہم نے۔ اس کی، (اَیَّدَ، یُؤَیِّدُ، تَاْیِیدٌ) تائید کرنا، بِرُوْحِ الْقُدُسِ ساتھ روح القدس کے، روح القدس سے مراد، جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ قرآن حکیم میں انبیاء کے اسماء گرامی کے

ساتھ ان کے والدین کا ذکر نہیں ملتا ہے عیسیٰ علیہ السلام کے نام کے ساتھ ہر مقام پر عیسیٰ ابن مریم کا ذکر ہے، اور اس سے مقصود عیسائیوں کے اس غلط عقیدہ کی تردید ہے کہ عیسیٰ ابن اللہ نہیں بلکہ وہ ابن مریم ہیں جو خود ایک پاکدامن، ذاکرہ شاکرہ خاتون تھیں، عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کے بطن سے پیدا ہوئے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾

اور اگر اللہ چاہتا تو ان رسولوں کے بعد لوگ آپس میں جھگڑا نہ کرتے جبکہ ان کے پاس واضح احکام بھی آ چکے تھے۔

وَلَوْ اور اگر، لَوْ، کلمۂ شرط، شَآءَ چاہتا، ماضی واحد مذکر غائب (شَاءَ، يَشَاءَ، مَشِيْئَةً) چاہنا، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ اور اگر اللہ چاہتا، مَا اقْتَتَلَ، نہ لڑتے (اِقْتَتَلَ، يَقْتَتِلُ، اِقْتِتَالٌ) لڑنا، جھگڑنا، اَلَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ، وہ لوگ جو ان کے بعد تھے (یعنی رسولوں کے بعد)، مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ اس کے بعد کہ آئے ان کے پاس روشن دلائل (احکام) بَيِّنٰتٌ کے معنی ہیں واضح دلائل، معجزات، یعنی اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ جو ان رسولوں کے بعد آئے ہیں آپس میں نہ لڑتے جھگڑتے جبکہ ان کے پاس کھلے دلائل پہنچ چکے تھے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سے جنگ وجدل کی قوت سلب کر لیتا، مگر انسان کو اختیار وارادہ کی قوت عطا کر کے خالق کائنات نے اسے امتحان وآزمائش میں ڈال دیا ہے اور اس امتحان میں کامیاب ہونے پر بے حساب وکتاب اجر وثواب کو رکھا ہے اور آخرت میں حیاتِ جاوداں کی خوشخبری دی ہے۔

﴿وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ﴾

مگر انہوں نے اختلاف کیا، پھر کوئی ان احکام پر ایمان لایا اور کسی نے انکار کیا۔

وَلٰكِنِ اور لیکن، اخْتَلَفُوْا، انہوں نے اختلاف کیا (اِخْتَلَفَ، يَخْتَلِفُ، اِخْتِلَافًا) اختلاف کرنا، فَمِنْهُمْ (فَ.مِنْ.هُمْ) پس۔ سے، اُن، پس ان میں سے مَنْ (وہ ہے) جو، اٰمَنَ ایمان لایا (احکام کی پیروی کرنے لگا) وَ مِنْهُمْ اور ان میں سے، مَّنْ (وہ ہے) جو، كَفَرَ، کفر کیا (احکام سے سرتابی کرنے لگا)۔ اور احکام کی پیروی کرنے والے مومن اور احکام سے سرتابی کرنے والے کافر کہلائے۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''اختلاف اور باہمی لڑائی جھگڑے کی اصل بنیاد انسان میں قوت ارادہ واختیار ہے، اگر انسان اس

قوت واختیار کواللہ کی مرضی کے تابع بنادے تو یہ ایمان ہے اور یہی اسلام ہے اور اگر اس کا آزادانہ استعمال کرنا شروع کردے اور اللہ کے احکام کی پروانہ کرے تو یہی کفر ہے۔'' (تیسیر القرآن، جلد اول)

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ﴾

اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں لڑائی جھگڑے نہ کرتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

وَلَوْ اور اگر، لَوْ کلمۂ شرط، شَآءَ اللّٰهُ چاہتا اللہ تعالیٰ، مَا اقْتَتَلُوْا، نہ لڑتے وہ، مَا نافیہ، اِقْتَتَلُوْا لڑتے وہ ماضی جمع مذکر غائب (اِقْتَتَلَ، يَقْتَتِلُ، اِقْتِتَالٌ) لڑنا جھگڑنا، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اور لیکن اللہ تعالیٰ، يَفْعَلُ کرتا ہے مضارع واحد مذکر غائب، مَا جو، يُرِيْدُ وہ چاہتا ہے، مضارع واحد مذکر غائب (اَرَادَ، يُرِيْدُ، اِرَادَةً) چاہنا۔ (اور تم اس کے کاموں کی حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے)۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''اللّٰهُ يَفْعَلُ، اللہ وہی کرتا ہے بہ مقتضائے قدرت کاملہ مَا يُرِيْدُ، جو کچھ وہ چاہتا ہے۔ بہ مقتضائے حکمت بالغہ یعنی نہ اس کی قدرت وقوت فاعلہ پر کوئی قیدیں اور حد بندیاں عائد ہیں اور نہ اس کی تجویزوں، ارادوں میں کسی غلطی یا سہو وخطا کا امکان ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اللہ تعالیٰ کے تمام رسول پیکرِ صدق وصفا ہیں اور یہ ہمارا ایمان ہے کہ انہوں نے پیغام حق نہ صرف خود قبول کیا اور اپنی زندگیوں کو اس سانچے میں ڈھالا بلکہ بلاکم وکاست لوگوں تک اسے پہنچایا۔

۲) ان نفوس قدسیہ میں بعض کو بعض پر منصب اور ذمہ داری کے لحاظ سے فضیلت اور برتری ہے مثلاً موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا، یہ ان کی فضیلت کا ایک خاص پہلو ہے اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو کھلے کھلے معجزات دیے اور روح القدس کی خاص تائید سے انہیں نوازا، داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو نبوت کے علاوہ بادشاہت بھی عطا کی گئی ہے اور سلیمان علیہ السلام کو نہ صرف جانوروں کی بولیاں سمجھا دی گئیں بلکہ ہوا بھی ان کے لیے مسخر کر دی گئی، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سالار انبیاء اور خاتم النبیین کی خصوصیت سے سرفراز کیا گیا اور ان کی نبوت ابدی، نسل انسانیت کے لیے ہدایت اور روشنی کا سامان بنی، انبیاء ورسل کے فضائل میں یہی نقطہ نظر حقیقت کے مطابق ہے۔

۳) فطرت انسانی تو محض خیر اور نیکی پر پیدا کی گئی تھی مگر خارجی اثرات، ضلالت، خواہشات نفسانی اور نت نئے شیطانی حربوں سے انسان کا آئینہ فطرت گرد آلود ہو گیا اور لوگوں نے حقائق سے دور ہو کر، صداقت وعدالت کی راہ چھوڑ کر محض نفس پرستی سے اختلافات پیدا کر کے اپنے آپ کو تباہ و برباد کر ڈالا اور جن انسانوں نے بھی ہدایت الٰہی سے منہ موڑا شقاوت وبدبختی ان کے حصے میں آئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۵۴)	مسلمانو! ہم نے مال ومتاع سے جو کچھ تمہیں دے رکھا ہے، اسے خرچ کیا کرو قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے جس دن نہ تو خرید وفروخت ہو سکے گی اور نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سعی وسفارش ہی سے کام چلے گا اور یاد رکھو جو لوگ (اس حقیقت سے) منکر ہیں یقیناً یہی لوگ ہیں جو ظالم ہیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾

اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ، اے لوگو! جو، الَّذِيْنَ، اسم موصول، اٰمَنُوْٓا، ایمان لائے ہو (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا) ایمان لانا، اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کو ماننا، اَنْفِقُوْا خرچ کرو فعل امر جمع مذکر (اَنْفَقَ، يُنْفِقُ، اِنْفَاقٌ) خرچ کرنا، مِمَّا (مِن مَّا) سے، جو یعنی اس میں سے جو، رَزَقْنٰكُمْ (رَزَقْنَا. كُمْ) ہم نے رزق دیا، تمہیں (رَزَقَ، يَرْزُقُ، رِزْقًا) رزق دینا، كُمْ ضمیر جمع مخاطب، لوگوں کی طرف جاتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''رَزَقْنٰكُمْ، ضمیر متکلم لا کر اور رزق کو اپنی جانب منسوب کر کے صاف بتا دیا کہ مالی دولت جو کچھ بھی بندوں کے پاس ہے، خود بخود سے نہیں، اللہ تعالیٰ کا بخشا ہوا عطیہ ہے، اسی کی دین ہے اور اسی کو حق حاصل ہے کہ جن کاموں میں چاہے ان کے صرف کرنے کا حکم دے، دے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ﴾

اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے، کہ نہ خرید وفروخت ہوگی اس میں، اور نہ دوستی اور سفارش ہی کام آئے گی۔

مِّنۡ قَبۡلِ اس سے قبل، اَنۡ یہ کہ، یَّاۡتِیَ آئے، فعل مضارع واحد مذکر غائب (اَتٰی، یَاۡتِیۡ، اِتۡیَانٌ) آنا، یَوۡمٌ، دن (روز قیامت) لَا بَیۡعٌ نہ خرید وفروخت ہوگی (بَاعَ، یَبِیۡعُ، بَیۡعٌ) خرید وفروخت کرنا، فِیۡهِ (فِیۡ.ہِ) اس میں (یعنی اس دن میں) وَلَا خُلَّةٌ اور نہ دوستی، خلیل کے معنی دوست، وَ لَا شَفَاعَةٌ اور نہ سفارش (شَفَعَ، یَشۡفَعُ، شَفَاعَةٌ) سفارش کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ مصارف خیر میں صرف کرنے اور نیکیاں جمع کرنے کا موقع جو کچھ ہے اس دنیا میں ہے، وقت کی قدر کرو اور فرصتِ عمر کو غنیمت جانو اور موت سے پہلے اپنے کھاتے میں اعمال خیر جمع کرلو مرنے کے بعد قیامت میں نہ تو لین دین ہو سکے گا اور نہ کسی کی دوستی اور سفارش ہی کام آئے گی۔

﴿وَالۡکٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴾

جو لوگ (اس حقیقت سے) منکر ہیں تو وہی ظالم ہیں۔

وَالۡکٰفِرُوۡنَ اور کافر (انکار حق کرنے والے) کٰفِرُوۡنَ کا مفرد کَافِرٌ ہے، هُمُ وہی ہیں، ضمیر جمع مذکر کٰفِرُوۡن کی طرف جاتی ہے، الظّٰلِمُوۡنَ ظلم کرنے والے، قرآن حکیم کی روشنی میں ظالم وہ لوگ ہیں جو حدود الٰہی کو توڑتے ہیں۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اہل ایمان کو مخاطب کر کے یہ حقیقت ان کے ذہن نشین کی گئی ہے کہ یہ مال ودولتِ دنیا جو تمھیں حاصل ہے، یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے، لہٰذا تم اس کی راہ میں اس مال سے کچھ خرچ کرو۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واشگاف کر دی کہ یہی وہ وقت ہے، جب تم اس مال کو خرچ کر کے اپنے لیے نیک اعمال کا اندوختہ کر سکتے ہو، ورنہ کل ایک ایسا دن آنے والا ہے جب یہ مال ودولت تمہارے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَ لَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (۲۵۵)	اللہ، وہ زندہ جاوید ہستی، جو کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے، کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے، اس سے بھی واقف ہے (بلکہ کائنات کے ذرے، ذرے کا اسے علم ہے) اور (بندے) اس کے علم میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر اتنا ہی جتنا وہ چاہے، اس کی کرسیٔ علم وقدرت کی وسعتیں آسمانوں کی رفعتوں اور زمین کی گہرائیوں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں وہ ان کی حفاظت اور نگہبانی سے تھکتا نہیں اور وہ بلند و برتر اور صاحب عظمت وجلال ہے۔

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اللہ، نہیں کوئی معبود، مگر وہ۔

اَللّٰهُ کائنات کے خالق و مالک کا اسم مبارک جو واحد و یکتا ہے کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا، نہ اس کی جمع آتی ہے، نہ یہ کسی لفظ سے مشتق ہے اور نہ ہی اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن ہے، کوہ طور پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو اسی نام مبارک سے عرفانِ تام نصیب ہوا، ارشاد ہوا: اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنَا ''(اے موسیٰ) بلاشبہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔''

اگر آنکھ بینا ہو تو اس کی قدرت کے نشان ہر جگہ اور ہر وقت ہویدا ہیں یہ وسیع وعریض کائنات جو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی ہے، یہ سقفِ نیلگوں جو ہمارے سروں پر بغیر ستونوں کے کھڑا ہے، یہ آفتاب و ماہتاب جو وقت پر طلوع وغروب ہوتے ہیں، یہ تاروں بھرا آسمان جو شب کو دلکش منظر پیش کرتا ہے، یہ بلند و

بالا پہاڑ جس میں سرسبز وشاداب درخت اگے ہوئے ہیں، یہ طرح طرح کے شیریں میوہ جات جو بدل بدل کے ہر موسم میں چلے آتے ہیں، یہ موسموں کا تغیر وتبدل اور ہواؤں کی گردش اور ان کے دوش پر بادلوں کا تیرنا اور برسنا، یہ وسیع سمندر جو دنیا کے ایک تہائی حصے کو گھیرے ہوئے ہے، یہ بہتے دریا اور ندی نالے، خود ہمارا جسم اور اس کے اندر پھیلی ہوئی عجیب وغریب مشینری ہمیں پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اس کا کوئی خالق ومالک ضرور ہے، قرآن اعلان کرتا ہے کہ اس ذات کا نام اللہ ہے، اب ذرا ان چند آیات پر غور کر لیجیے:

● اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ، وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ، فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ، وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (البقرہ۲:۱۶۴) ''آسمانوں اور زمین کی ساخت میں لیل ونہار کی آمد ورفت میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے تو اس سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، نیز ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو ارض وسما کے درمیان تابع فرمان ہیں، اہل عقل کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں۔''

● وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰۤی اَرْبَعٍ ۚ یَخْلُقُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (النور۲۴:۴۵) ''اور اللہ ہی نے ہر چلنے پھرنے والے جاندار کو پانی سے پیدا کیا، تو ان میں سے بعضے ایسے ہیں کہ پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں، اللہ جو چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

● وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ (الروم۳۰:۲۳) ''اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے تمہارا رات اور دن (کے بعض حصے) میں سونا، پھر (دن کو) اس کا فضل (رزق) تلاش کرنا، جو لوگ سنتے ہیں ان کے لیے اس بات میں (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔''

● وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً، نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ ''اور تمہارے لیے چار پایوں میں (اللہ تعالیٰ کی) قدرت کے نشان ہیں اور قابل غور

(بات یہ ہے) کہ ان کے پیٹوں میں جو گوبر اور لہو ہے اس کے درمیان سے ہم تمہیں خالص دودھ پلاتے ہیں، جو پینے والوں کے لیے لذیذ اور خوشگوار ہے۔''

● رب کریم کا ارشاد ہے: وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیا۲۱:۳۰) ''اور ہم نے پانی سے ہر چیز کے لیے زیست کا سروسامان کیا (بھلا اس حقیقت کو، کون فراموش کرسکتا ہے؟)''

اور انسان کو تو اس نے عقل وفہم اور دل ودماغ اور شکل وصورت ہر لحاظ سے دوسری مخلوقات پر برتری اور فضیلت عطا فرمائی ہے۔ محسن حقیقی کا فرمان ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل ۱۷:۷۰) ''یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی ہے۔''

اس بات کو نہ سمجھنا تو سراسر دھوکہ ہے، قرآن حکیم دل ودماغ پر پھر دستک دیتا ہے:

● يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ، فَعَدَلَكَ، فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (الانفطار ۸۲:۶ تا ۸) ''اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اس رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نِک سُک سے درست کیا تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔''

دنیا میں اربوں انسان ہیں اور ہر انسان رب کائنات کی کاریگری کا شاہکار ہے، انسانوں کی شکل و صورت میں تھوڑا بہت فرق تو الگ رہا، ان کی آوازوں یہاں تک کہ انگوٹھے کے نشان میں نمایاں فرق نظر آئے گا، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ''برکتوں والا ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔''

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾

نہیں کوئی معبود مگر وہ، زندہ ہے، وہ سب کو سنبھالنے والا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''اَلْحَيُّ، وہ مستقلاً زندہ ہے، وہ ازلی اور ابدی ہے، صفت حیات اس کی جزو ذات ہے، موت یا عدم حیات اس پر نہ پہلے کبھی طاری ہوئی اور نہ آئندہ کبھی طاری ہوسکتی ہیں، تو کیا کوئی قوم ایسی بھی ہوئی ہے جس نے اپنے معبود کی اس کھلی ہوئی اور موٹی صفت میں بھی شبہ کیا ہو۔

.....ایک نہیں متعدد قوموں نے شک واشتباہ کیا، یعنی انکار تک اس صفت کا کیا ہے، بحر روم کے ساحل پر متعدد قومیں اس عقیدہ کی گزری ہیں کہ ہر سال فلاں تاریخ پر ان کا خدا وفات پاجاتا ہے اور دوسرے دن از سر نو

وجود میں آجاتا ہے، چنانچہ ہر سال اس تاریخ کو خدا یا بعل کا پتلا بنا کر جلایا جاتا تھا اور دوسری صبح اس کے جنم کی خوشی میں رنگ رلیاں شروع ہو جاتی تھیں ہندوؤں کے ہاں اوتاروں کا مرنا اور پھر جنم لینا اسی عقیدہ کی مثالیں ہیں.....اور خود مسیحیوں کا عقیدہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ خدا پہلے تو انسانی شکل اختیار کر کے دنیا میں آتا ہے اور پھر صلیب پر جا کر موت قبول کر لیتا ہے، مسلمان کے گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے شروع ہی سے ایک ازلی ابدی، باقی وغیر فانی خدا کے عقیدہ سے چونکہ مانوس ہو جاتے ہیں، بڑے ہو کر ان کے خیال ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ خدا کبھی اور کسی حال میں کسی معنی میں اور کسی لحاظ سے حادث وفنا پذیر بھی ہو سکتا ہے۔

"اَلْقَیُّوْمُ" مسیحیوں نے جس طرح حضرت حق سبحان وتعالیٰ کی صفت حیات کے باب میں سخت ٹھوکر کھائی ہے، اسی طرح صفتِ قیومیت سے متعلق بھی عجیب گمراہی میں پڑ گیے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ جس طرح بیٹا بغیر باپ کی شرکت وآمیزش کے خدا نہیں، اسی طرح باپ پر بھی بغیر بیٹے کو شریک کیے خدا کا اطلاق نہیں ہو سکتا، گویا جس طرح نعوذ باللہ مسیح ابن اللہ خدا کے محتاج ہیں، اسی طرح خدا بھی اپنی خدائی کے اثبات کے لیے مسیح کا محتاج ہے.....صفت قیومیت کا اثبات کر کے قرآن نے اسی مسیحی عقیدہ پر ضرب لگائی ہے.....

قیوم وہ ہے جو نہ صرف اپنی ذات سے قائم ہے بلکہ دوسروں کے بھی قیام کا سبب وباعث ہے اور سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اُسی کے سب محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔" (تفسیر ماجدی، جلد اول)

اگر اللہ تعالیٰ حَیٌّ وقَیُّوْم نہ ہوتا تو یہ زمین وآسمان کبھی کے زیروزبر ہو جاتے، اور اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور بھی اِلٰہ ہوتا، تو بھی ہر طرف فساد وبگاڑ پیدا ہو جاتا، اور زمین وآسمان تہہ وبالا ہو جاتے، قرآن اعلان کرتا ہے: لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء ۲۱:۲۲) "اگر آسمان وزمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے اِلٰہ بھی ہوتے (تو زمین وآسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔" اس لیے قرآن حکیم نے اس خالق کائنات کی مزید صفت یہ بیان کی ہے:

﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ نہیں پکڑتی اس کو اونگھ اور نہ نیند۔

لَا تَاْخُذُهٗ نہیں پکڑتی ہے اسے فعل مضارع منفی صیغہ واحد مؤنث غائب، سِنَةٌ (اونگھ) کے لیے صیغہ واحد مؤنث غائب استعمال ہوا ہے (اَخَذَ، یَأْخُذُ، اَخْذًا) پکڑنا، غلبہ پانا، نَوْمٌ، نیند، مصدر (نَامَ، یَنَامُ، نَوْمًا) نیند، فجر کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، نماز نیند سے بہتر ہے، روزانہ آپ سنتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''جاہلی مذہبوں کے دیوتا نیند سے جھوم بھی جاتے ہیں اور سونے بھی لگتے ہیں اور اسی غفلت کی حالت میں ان سے طرح طرح کی فروگذاشتیں ہو جاتی ہیں، مسیحیوں اور یہود کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب چھ روز میں آسمانوں اور زمین کو بنا ڈالا تو ساتویں دن اسے ستانے اور آرام لینے کی ضرورت پڑ گئی، اسلام کا خدا، دائم، بیدار، ہمہ خبردار، غفلت، سستی اور تھکن سب سے ماوراء خدا ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ﴾

اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

لَهٗ میں لام تملیک یعنی ملکیت کو ظاہر کرتا ہے اور لَهٗ کو جملے کے شروع میں لانے سے حصر (زورِ بیان) کے معنی پیدا ہوتے ہیں یعنی زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، وہ صرف اور صرف اللہ رب العزت کی ملکیت ہے، کسی اور کا کوئی حق نہیں ہے۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾

کون ہے جو اس کی جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟

مَنْ، استفہام کے لیے، (کون ہے؟) ذَا اسم اشارہ، الَّذِیْ (وہ جو) اسم موصول، یَشْفَعُ سفارش کر سکے، (شَفَعَ، یَشْفَعُ، شَفْعًا) سفارش کرنا، امام راغب کہتے ہیں: ''کسی کے شریک حال ہو کر اس کی مدد کرنا۔'' (مفردات القرآن) عِنْدَهٗ (عِنْدَ.هٗ) پاس۔ اس کے، اس کی جناب میں هٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے، اِلَّا مگر، بِاِذْنِهٖ (بِ.اِذْنِ.هٖ) ساتھ، اذن (اجازت)۔ اس کے هٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد لقمان السلفی لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر، کوئی کسی کے لیے اللہ کے حضور شفاعت کرنے کی جرأت نہیں کرے گا، جب انبیاء اور فرشتے اللہ کی اجازت کے بغیر شفاعت نہ کریں گے تو بھلا وہ اصنام جن کی کفار پرستش کرتے ہیں اور جن کے بارے میں ان کے سفارشی بنیں گے، کیسے شفاعت کر سکیں گے؟ حدیثِ شفاعت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں عرش کے نیچے آؤں گا اور سجدے میں گر جاؤں گا تو اللہ مجھے اسی حال میں چھوڑ دے گا، جتنی دیر چاہے گا پھر مجھ سے کہے گا کہ اپنا سر اٹھاؤ اور کہو، سنا جائے گا اور شفاعت کرو، قبول کی جائے گی۔ (بخاری، مسلم)

اور یہ شفاعت اہل توحید کے لیے ہوگی، مشرکین کے لیے نہیں۔ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ وہ کون خوش بخت ہوگا جس کو آپ کی شفاعت نصیب ہوگی؟ تو آپ نے فرمایا جس نے ''لا الہ الا اللہ'' پورے خلوصِ قلب کے ساتھ کہا ہوگا۔(بخاری)

معلوم ہوا کہ یہ شفاعت اہل توحید کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہوگا۔(تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن)

﴿یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ﴾

''وہ جانتا ہے جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے۔''

یَعۡلَمُ وہ جانتا ہے، مضارع واحد مذکر غائب (عَلِمَ، یَعۡلَمُ، عِلۡمًا) جاننا، مَا جو کچھ، اسم موصول، بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ ان کے ہاتھوں کے درمیان، یَدٌ، مفرد (ہاتھ) اور اس کی جمع ایدی، ھِمۡ کی ضمیر لوگوں کی طرف جاتی ہے، ہاتھوں کے درمیان محاورہ ہے مراد جو بندوں کے سامنے ہے، وَ مَا اور جو، خَلۡفَھُمۡ (خَلۡفَ.ھُمۡ) پیچھے۔ان کے یعنی حاضر و غائب، دنیا اور آخرت، ماضی، حال اور مستقبل، ہر جہت اور ہر طرف پر اس کا علم محیط ہے، یہاں پر آگے اور پیچھے صرف دو ہی سمتوں کا نام لیا گیا ہے لیکن مراد اس سے تمام اطراف ہیں اور تمام احوال ہیں اور یہ کنایہ عربی زبان میں عام ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''صفات باری تعالیٰ میں حیات کا، قیومیت کا، مالکیت کا اثبات اوپر ہو چکا ہے، اب یہاں اس حقیقت کا ہو رہا ہے کہ حق تعالیٰ کی صفتِ علم بھی کامل ہے۔سعی و سفارش کا ایک موقع دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے کہ بس حاکم یا مالک کے سامنے مقدمہ پیش ہو، اس کا علم محیط اور کامل نہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ خارجی ذرائع سے اس کی معلومات میں اضافہ کیا جائے اور اس کے علم کو کامل کر دیا جائے یہاں یہ بتلا کر کہ اللہ کا علم خود ہر خفی و جلی پر حاوی ہے گویا یہ بتا دیا کہ اس کے علم پر کسی اضافہ کرنے، اس کے آگے کسی کی خوبیاں بتلانے، اسے کسی نامعلوم شے پر آگاہ کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں۔اور اس طرح مسیحی عقیدہ شفاعت پر ایک اور ضرب لگی۔''

(تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾

''اور (بندے) اُس کے علم میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر اتنا ہی جتنا وہ چاہے۔''

وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ، اور وہ نہیں احاطہ کر سکتے فعل نہی جمع مذکر غائب (اَحَاطَ، یُحِیۡطُ، اِحَاطَۃً) احاطہ کرنا، بِشَیۡءٍ (بِ.شَیۡءٍ) ساتھ کسی بات کے، مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ (مِّنۡ.عِلۡمِ.ہٖ) اس کے علم سے ہٖ کی ضمیر اللہ

تعالیٰ کی طرف جاتی ہے۔ اِلَّا مگر بِمَا (بِ.مَا) ساتھ اس کے۔ جو، شَآءَ، وہ چاہے یعنی اللہ تعالیٰ کی معلومات میں سے وہ کسی بات کو جان نہیں سکتے مگر صرف اتنا ہی جتنا کہ وہ خود علم عطا کرے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کو اس نے اپنی مصلحت اور حکمت کے مطابق وحی کے ذریعے علم کیا۔

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾

اس کی کرسی علم وقدرت حاوی ہے آسمانوں اور زمین کو۔

وَسِعَ حاوی ہے (وَسِعَ، يَسَعُ، وُسْعًا) حاوی ہونا، گھیرے ہوئے ہونا، كُرْسِيُّهُ (كُرْسِيُّ.هُ) کرسی، اس کی، السَّمٰوٰتِ آسمانوں، اس کا مفرد سماء ہے وَالْاَرْضَ اور زمین۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"اس کی کرسی علم وقدرت تو خود ساری کائنات پر محیط ہے وہ اس کو اپنے دائرہ اختیار میں لیے ہوئے ہے، تو آسمان پر، عرش پر، کسی وسیع سے وسیع چیز کے بھی اندر کیسے سما سکتا ہے؟ وہ سب کو گھیرے ہوئے ہے، اسے کون گھیر سکتا ہے، اس صفت کے اثبات سے ان مشرکوں کے عقیدہ کی بھی تردید ہوگئی جو اللہ تعالیٰ کے مجسم ہونے اور کسی مکان میں اس کے محدود ومقید ہونے کے قائل ہیں۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا، وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾

اور نہیں تھکاتی اسے ان دونوں کی نگرانی اور وہ بلند مرتبہ اور عظمت والا ہے۔

وَلَا يَئُوْدُهٗ اور نہیں تھکاتی اسے (يَئُوْدُ.هُ) تھکاتی۔ اسے۔ هُ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے، يَئُوْدُهٗ، کا لفظ اَوْد سے ہے جس کے معنی جہد ومشقت کو پہنچنا ہیں یعنی آسمانوں اور زمین کی نگرانی اس کے لیے قطعی طور پر باعث مشقت نہیں ہے۔ سونا، جاگنا، محنت ومشقت یہ سب مادی چیزیں ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات ان سب باتوں سے ماورا ہے۔ وَ هُوَ اور وہ ہے۔ الْعَلِيُّ بلند مرتبہ، الْعَظِيْمُ عظمت والا۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

"یہ اس آیت میں بیان کردہ صفات میں سے آخری صفات ہیں ان الفاظ سے صرف یہ واضح نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ بلند وبرتر اور عظیم ہے بلکہ یہ بھی کہ بلندی وعظمت اسی کے لیے مخصوص ہیں اس طرح کا اندازِ بیان حصر اور قصر کے لیے ہوتا ہے، قرآن نے یہ نہیں کہا "هُوَ عَلِيٌّ عَظِيْمٌ" وہ بلند اور عظیم ہے۔ بلکہ اس کے الفاظ یہ ہیں: "هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ" وہی بلند اور عظیم ہے۔ تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ بلندی و

عظمت بلاشرکت غیرے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ہیں۔

بلندی اور عظمت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مختص ہیں بندوں میں سے جو کوئی اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے پستی وخواری اور آخرت میں رسوا کن عذاب میں دھکیل دے گا، وہ خود فرماتا ہے:

تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ نَجْعَلُھَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا (قصص ۲۸:۸۳)

''یہ دار آخرت ہے، اسے ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کریں گے جو زمین میں (اپنے لیے) بلندی نہیں چاہتے اور نہ فساد پھیلانا چاہتے ہیں۔''

اور فرعون کی ہلاکت وبربادی کے اسباب ووجوہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: **اِنَّہٗ کَانَ عَالِیًا مِّنَ الْمُسْرِفِیْنَ** (الدخان ۴۴:۳۱) ''یقیناً وہ تھا بلندی اختیار کرنے والا، حد سے گزرنے والا۔''

(فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اس آیہ مبارکہ (آیۃ الکرسی) کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ یہ قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہے اس لیے کہ اس میں باری تعالیٰ کی توحید، اس کی عظمت اور اس کی صفات کا بیان ہے، شیاطین اور جنات کے برے اثرات سے بچنے کے لیے اس کا پڑھنا مجرب ہے، صبح وشام، ہر نماز کے بعد اور خصوصاً رات سونے سے پہلے آیۃ الکرسی، قرآن حکیم کی آخری سورتیں جو قل سے شروع ہوتی ہیں اور سونے سے قبل مسنون دعا (**اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی**) پڑھنا اپنے آپ کو شیطانی دجل وفریب سے بچانے کا موثر نسخہ ہے۔

۲) اس تمام کائنات کا خالق ومالک اور زندہ وپائیدار ہستی صرف اور صرف ایک ہے، اس کا اسم گرامی اللہ ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل وکریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔

۳) ''**الحَیُّ**'' وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اور کائنات میں جو زندگی نظر آ رہی ہے، وہ اُسی کا عطیہ وفیضان ہے، القیّوم وہ صرف خالق ہی نہیں، صرف زندگی عطا کرنے والا نہیں، بلکہ تربیت وتقویم بھی اسی کا کام ہے، وہ پیدا کرتا ہے، زندگی بخشتا ہے اور اس کے بعد وہ اس کی تربیت واصلاح کا خیال بھی رکھتا ہے، پھر زندہ رکھنے اور موت دینے کی قوت بھی صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔

۴) اونگھ اور نیند تو کمزوری کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام کمزوریوں سے مبرا ہے، وہ ہمہ دان

اور ہمہ آن بیدار ہے۔

۵) زمین وآسمان کی ہر چیز کا مالک ہے، وہی ہر ذی روح کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، سب کے سب اس کے در کے محتاج ہیں۔

۶) اگر تم نے ایسے بااختیار بادشاہ کی مخالفت کی، تو یاد رہے کہ اس کے دربار میں کسی کو شفاعت کرنے کی جرأت نہ ہوگی، مگر ہاں جس کو وہ خود نجات دینے کا آرزومند ہو اور اس کے لیے کسی کو شفاعت کرنے کی اجازت دے دے، اس دن زور وزر کی بھی ساری قوتیں سلب ہو جائیں گی۔

''اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں مدد مل سکے گی۔'' (البقرہ ۲:۴۸)

۷) وہ اپنے علم کے بحر ناپیدا کنار میں سے کسی کو جتنا چاہے عطا کرتا ہے انبیاء کرام کو اس نے جبرائیل کے ذریعہ وحی سے نوازا۔

۸) اس کی حکومت اور اس کا علم کائنات کے ذرہ ذرہ کو محیط ہے، کسی کو اس کے حکم سے سرتابی کی ادنیٰ مجال بھی نہیں ہے۔

۹) وہی ''العلی العظیم'' (بلند اور عظیم) ہے انسان خواہ کتنا ہی بلند اور کتنا ہی عظیم ہو جائے، وہ اس بلند و برتر رب عظیم کے سامنے عبودیت کے مقام سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہی بات انسان میں عجز و خاکساری پیدا کرتی ہے اور وہ کبر و غرور سے باز رہتا ہے اور اللہ کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۵۶)	دین اسلام کے قبول کرنے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں بالکل واضح ہو چکی ہے اب جو شخص طاغوت کی راہ کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے،

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۵۷)	جولوگ ایمان لاتے ہیں، ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ انہیں (کفر وشرک) کے اندھیروں سے نکال کر (اسلام کی) روشنی کی طرف لے آتا ہے، اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں جو انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں، ایسے ہی لوگ اہل جہنم ہیں اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ، قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾

نہیں ہے زبردستی دین (اسلام) قبول کرنے میں، تحقیق ظاہر ہوگئی ہدایت گمراہی سے۔

لَآ اِكْرَاهَ، نہیں زبردستی، فِي الدِّيْنِ، دین میں (دین اسلام قبول کرنے میں)، قَدْ تَّبَيَّنَ تحقیق، ظاہر ہوگئی ہے، قَدْ کلمۂ تحقیق کلام، تَبَيَّنَ، ماضی واحد مذکر غائب (تَبَيُّنٌ، يَتَبَيَّنُ، تَبَيُّنًا) باب تفعل، ظاہر ہونا، الرُّشْدُ ہدایت، مصدر (رَشَدَ، يَرْشُدُ، رُشْدًا) راہ یاب ہونا، ہدایت پانا، الرُّشْدُ (ہدایت) یہ غَيٌّ (گمراہی) کی ضد ہے، مِنَ الْغَيِّ، گمراہی سے، یعنی ہدایت اور گمراہی الگ الگ ہوچکی ہیں یا اسلام کی راہ (ہدایت) اور کفر کی راہ (گمراہی) دو الگ الگ راستے ہیں اور لوگوں کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ اس میں سے کوئی سی راہ اختیار کرلیں۔

حافظ عماد الدین ابوالفداء ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

''یہاں یہ بیان ہورہا ہے کہ کسی کو جبراً اسلام میں داخل نہ کرو، اسلام کی حقانیت واضح اور روشن ہوچکی، اس کے دلائل و براہین بیان ہوچکے ہیں، پھر کسی پر جبر اور زبردستی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جسے اللہ رب العزت ہدایت دے گا، جس کا سینہ کھلا ہوا، دل روشن اور آنکھیں بینا ہوں گی، وہ تو خود بخود اس کا والہ وشیدا ہو جائے گا ہاں اندھے دل والے، بہرے کانوں والے، پھوٹی آنکھوں والے اس سے دور رہیں گے، پھر انہیں اگر جبراً اسلام میں داخل بھی کیا تو کیا فائدہ؟ کسی پر اسلام کے قبول کرانے کے لیے جبر اور زبردستی نہ کرو۔''

(تفسیر ابن کثیر، جلد اول)

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾

اب جو شخص طاغوت کی راہ کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ پس جو کوئی کفر کرے فَمَنْ (فَ. مَنْ) پس، جو کوئی، يَّكْفُرْ، کفر کرے یا (کرتا ہے) فعل مضارع واحد مذکر غائب كَفَرَ، يَكْفُرُ، كُفْرًا، کفر کرنا انکار کرنا، بِالطَّاغُوْتِ (بِ. الطَّاغُوْتِ) ساتھ، طاغوت کے، وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ اور ایمان لائے، ساتھ اللہ کے (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا) ایمان لانا، بِاللّٰهِ (بِ. اللّٰهِ) ساتھ۔ اللہ کے فَقَدِ اسْتَمْسَكَ پس تحقیق تھام رکھا اس نے۔ ماضی واحد مذکر غائب (اسْتَمْسَكَ، يَسْتَمْسِكُ، اِسْتِمْسَاكٌ) مضبوطی سے تھامنا، باب استفعال، بِالْعُرْوَةِ (بِ. الْعُرْوَةِ) ساتھ۔ حلقہ، کڑا، سہارا، الْوُثْقٰى اس کا مادہ (وث ق)، وَثُقَ الشَّيْءُ کسی چیز کا پائیدار ہونا، مضبوط ہونا، توثیق، تصدیق، اطمینان، اعتماد، منظوری، یہ اردو میں استعمال ہوتا ہے، الثِّقه، اعتماد و بھروسہ، اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى، مضبوط حلقہ، یہاں مراد ہے مضبوط سہارا یعنی جس نے طاغوت (شیاطین اور سرکش چیزوں) کا انکار کیا اور ایمان لے آیا تو اسے ایک ایسا سہارا مل گیا، لَا انْفِصَامَ لَهَا نہیں ہے ٹوٹنا، واسطے اس کے، لَا، کلمہ نفی، انْفِصَامَ (ٹوٹنا) مصدر (اِنْفَصَمَ، يَنْفَصِمُ، اِنْفِصَامًا) ٹوٹنا، دراڑ آنا، هَا کی ضمیر الْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى کی طرف جاتی ہے یعنی وہ ایسا مضبوط کڑا ہے جس میں کبھی دراڑ نہیں آسکتی ہے یا ایسا مضبوط راستہ ہے جو قطعی طور پر نجات اور کامیابی کی طرف لے جانے والا ہے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''طاغوت' طغیان، سے بنا ہے، ہر وہ چیز جو حق کے خلاف ہو، جو اِن حدود سے تجاوز کرے جو اللہ نے بندوں کے لیے مقرر کی ہیں جسے اللہ پر ایمان اور اس کی مقرر کردہ شریعت کنٹرول نہ کرے، وہ 'طاغوت' ہے، اسی طرح ہر وہ نظام جو اللہ کا وضع کردہ نہ ہو، طاغوت ہے، ہر وہ تصور، ضابطہ، طریقہ، رسم جو اللہ کی طرف سے نہ آیا ہو، طاغوت ہے، جس شخص نے ایسی تمام چیزوں کا، ان کی تمام شکلوں میں انکار کیا، صرف اللہ پر ایمان لایا اور زندگی کا ہر اصول اور ضابطہ، اللہ سے حاصل کیا، اُس نے نجات پالی، نجات پانے کی حقیقت کو یہاں اس تمثیل کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک مضبوط کڑے کو تھامے ہوئے ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔''

(فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

وہ زبانوں سے نکلی ہوئی ہر بات کو سنتا ہے اور دلوں میں مخفی نیتوں اور ارادوں کو جانتا ہے، جس مومن کا اس ہستی سے ربط و تعلق ہوگا اسے نہ خسارہ ہوگا، نہ اس پر ظلم ہوگا اور نہ وہ ناکام ہوگا۔

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾

اللہ، حامی اور مددگار ہے، اُن کا جو ایمان لائے، وہ انہیں نکالتا ہے (کفر کے) اندھیروں سے اور نور (اسلام) کی روشنی میں لے آتا ہے۔

اَللّٰهُ، کائنات کے خالق و مالک کے لیے اسم ذات، کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا، وَلِيُّ حامی، مددگار، دوست، کارساز، الَّذِيْنَ وہ لوگ جو (ان کا) اسم موصول، اس کا مفرد الّذی ہے، اٰمَنُوْا ایمان لائے فعل ماضی جمع مذکر غائب (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا) ایمان لانا۔ يُخْرِجُهُمْ (يُخْرِجُ. هُمْ) نکالتا ہے، انہیں (یعنی ایمان لانے والوں کو) مِنَ الظُّلُمٰتِ اندھیروں سے اس کا مفرد ظُلْمَةٌ ہے، اِلَى النُّوْرِ۔ طرف روشنی (النور) کے، کفر و ظلمات کی قسمیں بے شمار ہیں، اس لیے ظلمات کو صیغہ جمع میں لایا گیا ہے، راہِ راست ایک ہی ہے اس لیے النّور قرآن حکیم میں جہاں جہاں بھی آیا صیغہ واحد ہی میں آیا ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ﴾

اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ان کے دوست طاغوت ہیں۔ وہ نکالتے ہیں انہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف۔

وَالَّذِيْنَ اور وہ لوگ جو، اسم موصول، كَفَرُوْٓا جنہوں نے کفر کیا فعل ماضی جمع مذکر غائب (كَفَرَ، يَكْفُرُ، كُفْرًا) کفر کرنا، راہ حق کا انکار کرنا، اَوْلِيٰٓئُهُمُ (اَوْلِيَآءُ. هُمْ) دوست (مددگار)۔ ان کے الطَّاغُوْتُ، طاغوت (شیاطین) ہیں، يُخْرِجُوْنَهُمْ (يُخْرِجُوْنَ. هُمْ) وہ نکالتے ہیں۔ انہیں، هُمْ کی ضمیر منکرین حق کی طرف جاتی ہے، مِّنَ النُّوْرِ روشنی سے، اِلَى الظُّلُمٰتِ طرف اندھیروں کے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''ایمان نور ہے، اپنی فطرت اور حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی نور، کفر بہت سی تاریکیوں کا نام ہے جو متعدد اور متنوع ہونے کے باوجود ہیں تاریکیاں ہی!

ایمان نور ہے، جب یہ نور مومن کے دل سے پھوٹتا ہے، تو اس سے مومن کا پورا وجود منور ہو جاتا ہے..... اس کی روح منور اور صاف شفاف ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اردگرد روشنی بکھیرتی ہے، اس نور سے

اشیاء، اقدار، پیمانوں اور تصورات کے حقائق منکشف ہوتے ہیں اور مومن کا دل کسی پردے اور کسی اشتباہ کے بغیر انہیں واضح طور پر دیکھتا ہے، اِن میں سے جس حقیقت کا، جو مقام ہوتا ہے وہ کسی فرق کے بغیر اسے وہی مقام دیتا ہے، وہ ان میں سے جن حقائق کو چاہتا ہے، سہولت، طمانیت، اعتماد اور سکون وقرار کے ساتھ لے لیتا ہے اور جنہیں چاہتا ہے، چھوڑ دیتا ہے، یہ نور کائنات میں جاری قانون کی طرف مومن کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں مومن کی حرکات واعمال اور اس کے گردوپیش اور خود اس میں نافذ کائناتی قوانین کے عمل میں پوری مطابقت ہوجاتی ہے اور وہ اللہ کی راہ پر بہت سہولت اور نرم روی کے ساتھ گامزن ہوجاتا ہے، نہ وہ راہ سے بھٹکتا ہے، نہ اس کا راہ کی رکاوٹوں سے تصادم ہوتا ہے اور نہ وہ ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے..... کیونکہ اس کا راستہ اسے معلوم اور اس کے لیے واضح اور روشن ہے۔

نور ایمان ایک ہی ہے اور وہ ایک ہی راستے کی طرف انسان کی رہنمائی کرتا ہے، اس کے برعکس کفر کی ضلالت کی تاریکیاں مختلف ومتنوع ہیں..... شہوات وخواہشات کی ظلمت، راہ حق سے بھٹکتے پھرنے کی ظلمت، تکبر اور طغیان کی ظلمت، ضعف اور ذلت کی ظلمت، ریا اور نفاق کی ظلمت، حرص اور طمع کی ظلمت، شک اور اضطراب کی ظلمت..... اور اس طرح کی دوسری ظلمتیں جن کا استقصا نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان ظلمتوں کی وجہ جامع ہے، اللہ تعالیٰ سے انحراف، غیر اللہ سے احکام واقدار کی تحصیل اور اللہ کا نظام چھوڑ کر کسی اور نظام کی طرف رجوع..... انسان جب اللہ کے نور کو، جو ایک ہے، ترک کر دیتا ہے تو وہ انواع واقسام کی تاریکیوں کے جنگل میں..... جو سب کے سب ظلمات ہیں..... گم ہوجاتا ہے۔

آخر میں اس انجام کا ذکر کیا گیا ہے جس کے مستحق تاریکیوں میں بھٹکنے والے ہیں:

﴿اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ، ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ﴾

یہ دوزخی ہیں اور اس (دوزخ) میں ہمیشہ رہیں گے۔

جب انہوں نے خود کو نور ہدایت سے محروم کرلیا تو ان کا انجام اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ انہیں نار جہنم کا ابدی عذاب دیا جائے۔

حق ایک ہی ہے، متعدد نہیں، گمراہی کی انواع واقسام مختلف ہیں، مگر حق کے سوا جو کچھ ہے وہ گمراہی ہی گمراہی ہے، فَمَاذَا بَعۡدَ الۡحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ (یونس:۳۲) حق کے علاوہ گمراہی کے سوا اور کیا ہے۔''

(فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) عقیدہ اور ایمان کا تعلق فہم وادراک کے بعد اطمینان قلب اور انشراح صدر سے ہے، جبر واکراہ کا نہیں، قرآن حکیم بار بار کہتا ہے: ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ﴾ ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ گویا کہ وہ فطری شعور کو بیدار کرتا ہے جو انسان کے اندر موجود ہے، مخلوقات میں سے انسان کو اللہ تعالیٰ نے شکل وصورت اور عقل وخرد کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا ہے اور اسے ہر طرح سے مکلّف بنایا ہے، اس لیے کہ وہ اسے بروئے کار لاکر خیر اور شر کو پہچانے، برے اور بھلے میں تمیز کرے، اچھائی اور برائی میں فرق محسوس کرے اور پھر اس میں اچھی بات کو اپنائے اور بری بات کو چھوڑ دے، اسی میں اس کا شرف مضمر ہے، اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس لیے اس نے کہا ہے: **لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ، قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ** دین میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے، ہدایت اور گمراہی واضح طور پر ایک دوسرے سے ممتاز ہو چکی ہیں۔'' جس طرح کہ دن اور رات کے فرق کو پہچانا جاسکتا ہے اسی طرح کفر اور اسلام کے فرق کی بھی شناخت ہو سکتی ہے، بصارت سے زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے، ظاہری آنکھوں سے بڑھ کر دل کی آنکھیں درکار ہیں اور ایمان ویقین ہمیشہ دعوت وموعظت سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ جبر واکراہ سے۔

۲) وہ لوگ جو اسلام پر تلوار کے زور سے پھیلنے کا الزام لگاتے ہیں وہ اس آیت پر غور کریں، مسلمانوں نے یا تو دفاعی جنگیں لڑی ہیں کیونکہ اپنے دفاع کا ہر شخص اور ہر قوم کو حق حاصل ہے یا پھر فتنہ وفساد کو مٹانے کے لیے کیونکہ لوگوں کو امن وعافیت کا پیغام دینا اس کی ذمہ داری ہے ''جہاد'' صرف اور صرف کلمۃ الحق کو بلند کرنا اور لوگوں کو مژدہ عافیت دینا ہے اس میں ظلم وستم یا سطوت وشہرت کا نام ونشان نہیں ہے۔
باقی رہا، اسلام کیونکر پھیلا؟ تو صاف ظاہر ہے کہ اس کی بلند اور پاکیزہ تعلیمات اور اچھے مسلمانوں کے اخلاق حسنہ نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے، خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پر قرآن شہادت دیتا ہے: **وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ** اور بلاشبہ آپ اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہیں۔

۳) ''ایمان باللہ'' ایسا مضبوط سہارا ہے، جو دنیا وآخرت میں بندہ مومن کے لیے فوز وفلاح کا ضامن ہے۔

۴) اہل ایمان کے لیے زندگی کی تاریکیوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور پھیلتا ہے، حق وصداقت کی راہیں ان کے لیے روشن ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح سے ان کا مددگار ہوتا ہے جبکہ کفر وضلالت شیاطین کی راہ ہے جس میں ندامت اور پشیمانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۵) قرآن حکیم میں نور کو مفرد استعمال کیا گیا ہے کیونکہ نور، روشنی، حق یا صداقت کی راہ ایک ہی ہے، ظلمات

(اندھیرے) جمع استعمال ہوا ہے کہ گمراہی کے راستے بہت سے ہیں قرآن حکیم میں آتا ہے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُستَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا السُّبُلَ (الانعام:۱۵۳) بلاشبہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو (شیطانی راستے بہت سے ہیں)۔''

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ، اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۲۵۸)	(اے پیغمبرؐ) کیا آپ نے اس شخص (یعنی نمرود) کے حال پر غور نہیں کیا، جو سلطنت پا کر ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑ رہا تھا، جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے وہ کہنے لگا ''میں بھی زندہ کرسکتا ہوں اور مار بھی سکتا ہوں'' پھر ابراہیمؑ نے کہا ''اللہ تعالیٰ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم ذرا مغرب سے نکال کے دکھاؤ'' اب وہ کافر ہکا بکا رہ گیا اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ﴾

کیا نہیں دیکھا (غور کیا) آپ نے طرف اس کے جھگڑا کیا (جس نے) ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں (جبکہ) اللہ تعالیٰ نے دی اس کو بادشاہت۔

أ، کلمہ استفہام تعجب کے لیے، لَمْ تَرَ، نہیں دیکھا آپ نے (نہیں غور کیا، آپ نے)، الَّذِیْ، جو، جس نے اسم موصول حَآجَّ، جھگڑا کیا (حَاجَّ، یُحَاجُّ، مُحَاجَّةٌ) باب مفاعلۃ (مناظرہ کرنا، جھگڑا کرنا)، اِبْرٰهٖمَ ابراہیم علیہ السلام سے، فِیْ رَبِّهٖۤ اس کے رب کے بارے میں، رَبِّهٖ (ربّ.ہٖ) رب۔ اس کا (یعنی

ابراہیمؑ کا)، اَنْ کہ (اس سبب سے کہ)، اٰتٰہُ اللّٰہُ دی، اس کو، اللہ تعالیٰ نے، اَلْمُلْکَ بادشاہت۔

اَلَمْ تَرَ ،عربی ادب میں یہ اسلوبِ بیان حیرت واستعجاب کے موقع کے لیے ہے اور وہ بھی پہلوئے ذم لیے ہوئے، جب کبھی کسی کے کسی حیرت انگیز نقص یا عیب کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو تو اسے شروع اس طریقہ پر کرتے ہیں جیسے اردو میں کہتے ہیں'' کہیے کہ تم نے فلاں کی حرکت دیکھی'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

''(یہ جھگڑا کرنے والا شخص) بابل کا بادشاہ نمرود بن کنعان تھا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ کون ہے تمہارا رب جس کی طرف ہمیں بلاتے ہو؟ اور وہ اس کفر وسرکشی پر اس لیے تُل گیا تھا کہ ایک مدت مدید تک بادشاہت کرنے کی وجہ سے کبر وغرور میں مبتلا ہو گیا تھا، اور شیطان نے اس کے دماغ میں یہ احمقانہ خیال بٹھا دیا تھا کہ وہی رب العالمین ہے، اسی لیے ابراہیم علیہ السلام نے جب اس کے جواب میں کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے تو اس دل کے اندھے نے کہا کہ میں بھی تو زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس نے اسی مجلس میں دو قیدی منگائے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا، حالانکہ ابراہیم علیہ السلام کا مقصد واضح تھا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو عدم سے وجود میں لاتا ہے اور پھر انہیں وجود سے عدم کی طرف لے جاتا ہے، لیکن جب یہ بات اسے سمجھ میں نہ آئی تو ابراہیم نے کہا کہ اچھا تو اللہ تعالیٰ آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا، تو وہ مبہوت اور عاجز ہو گیا اور ظالموں کے پاس کبھی حجت وبرہان نہیں ہوتا۔'' (تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن)

﴿اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ﴾

جب کہا ابراہیم نے، میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔

اِذْ، جب، اور یاد کرو، وقت کو ظاہر کرتا ہے، قَالَ کہا (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، رَبِّیَ (رَبّ.یَ) رب، میرا، اَلَّذِیْ جو، اسم موصول، یُحْیٖ، زندہ کرتا ہے، فعل مضارع واحد مذکر غائب (اَحْیٰ، یُحْیِیْ، اِحْیَاءٌ) زندہ کرنا وَ یُمِیْتُ اور وہ مارتا ہے، مضارع واحد مذکر غائب (اَمَاتَ، یُمِیْتُ، اِمَاتَۃً) مارنا۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''احیاء (زندگی بخشنا) اور اماتت (موت دینا) کائنات کے دو ایسے مظاہر ہیں، جو ہر لحہ پیش آتے ہیں

اور انسانی حواس اس کا احساس کرتے اور عقل ان کا ادراک کرتی ہے۔ اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب کا تعارف اس صفت سے کرایا جس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہوسکتا، نہ کوئی اس کا دعویٰ کرسکتا ہے۔''

(فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿قَالَ اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ﴾ نمرود نے کہا میں بھی زندہ کرسکتا اور مارسکتا ہوں۔

قَالَ اس نے کہا (یعنی نمرود نے) اَنَا اُحۡیٖ میں زندہ کرسکتا ہوں، فعل مضارع، واحد متکلم (اَحۡیٰ، یُحۡیِیۡ، اِحۡیَاءٌ) زندہ کرنا، وَ اُمِیۡتُ میں مارسکتا ہوں، فعل مضارع، واحد متکلم (اَمَاتَ، یُمِیۡتُ، اِمَاتَۃً) مارنا، یعنی قیدیوں میں سے کسی کو پکڑ کر یونہی مار ڈالا اور کسی کو آزاد کردیا، وہ حواس باختہ تھا، اس کے تحت الشعور میں یقیناً یہ بات ہوگی کہ کسی کو مار کر دوبارہ زندہ کرنا اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ پھر زندگی اور موت صرف انسان ہی کی نہیں ہے، کائنات میں ان گنت مخلوق ہے جس کا خالق رب واحد ہے، وہ نہ صرف ان کی بقا اور نشوونما کا ضامن ہے بلکہ ان سب کی موت وحیات بھی اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، انسان اگر غور کرے تو مچھر ایسی کمزور مخلوق کا پر بنانے کی قدرت بھی نہیں رکھتا ہے۔

اس کوڑھ مغز کی احمقانہ حرکت کے بعد سیدنا ابراہیمؑ نے اندازِ سوال بدل دیا:

﴿قَالَ اِبۡرٰہٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِہَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ﴾

ابراہیمؑ نے کہا، پس بلاشبہ اللہ تعالیٰ لاتا ہے سورج کو مشرق سے، پس تو لے آ، اسے مغرب سے۔

قَالَ اِبۡرٰہٖمُ کہا ابراہیم علیہ السلام نے، فَاِنَّ اللّٰہَ پس بے شک اللہ تعالیٰ، یَاۡتِیۡ لاتا ہے، مضارع واحد مذکر غائب (اَتٰی، یَأۡتِیۡ، اِتۡیَانًا) لانا، بِالشَّمۡسِ (بِ.الشَّمۡسِ) سورج، کو، ب کا معنی کبھی ساتھ، اور کبھی کو، فَاۡتِ، پس لے آ، تو، بِہَا (بِ.ھَا) اس کو، ھَا کی ضمیر الشّمس (سورج) کی طرف آتی ہے، عربی میں سورج کا لفظ مؤنث اور القمر (چاند) مذکر استعمال ہوتا ہے جیسا کہ طَلَعَ الۡقَمَرُ چاند طلوع ہوا اور طَلَعَتِ الشَّمۡسُ، سورج طلوع ہوا۔ مِنَ الۡمَغۡرِبِ مغرب سے، یعنی میرا رب سورج مشرق سے طلوع کرتا ہے تُو اسے مغرب سے طلوع کرکے دکھلا۔

﴿فَبُہِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ﴾ تو وہ ہکا بکا رہ گیا (لاجواب ہوگیا)۔

فَبُہِتَ (ف.بُھِتَ) پس، وہ مبہوت رہ گیا (بَھِتَ، یَبۡھَتُ، بَھۡتًا) حیران رہنا، ہکا بکا ہونا، الَّذِیۡ

اسم موصول، کَفَرَ جس نے کفر کیا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (کَفَرَ، یَکْفُرُ، کُفْرًا) کفر کرنا، انکار کرنا۔ یعنی نمرود سے کوئی جواب نہ بن سکا وہ عاجز اور لاچار ہو گیا۔

﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ظالموں کی قوم کو۔

وَاللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ، لَا يَهْدِى نہیں ہدایت دیتا، فعل مضارع منفی واحد مذکر غائب (هَدَى، يَهْدِى، هِدَايَةً) ہدایت دینا، اَلْقَوْمَ، قوم، جماعت، الظّٰلِمِيْنَ ظلم کرنے والے، اس کا مفرد ظَالِمٌ ہے، اسم فاعل۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''حضرت ابراہیمؑ نمرود کے اس کام کا یہ جواب دے سکتے تھے کہ جس شخص کو تو نے مروا ڈالا ہے، اسے زندہ کر کے دکھا تو جانیں مگر حضرت ابراہیم نے اس میدان کو چھوڑ دیا اور ربوبیت کے میدان میں آ گئے اور کہا کہ میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال کے دکھا، اب چونکہ نمرود یہ سمجھتا تھا کہ کائنات کے نظام میں میرا کوئی دخل اور اختیار نہیں، لہٰذا وہ فوراً لاجواب ہو گیا۔ حالانکہ اگر وہ سوچتا تو کہہ سکتا تھا کہ اگر میں سورج کو مغرب سے نہیں نکال سکتا تو تم اپنے رب سے کہو کہ مغرب سے نکال کے دکھائے اور اس صورت میں عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا معجزہ دکھلا بھی دیتے، مگر چونکہ نمرود کا پختہ عقیدہ تھا کہ کائنات کا نظام اللہ ہی چلاتا ہے اور وہ چاہے تو ایسا بھی کر سکتا ہے، لہٰذا سوائے خاموشی اور حیرانگی کے اس سے کچھ بھی بن نہ پڑا، اس طرح ابراہیم علیہ السلام نے بھرے دربار میں نمرود پر یہ بات واضح کر دی کہ میرا خدا یا معبود تُو نہیں ہے، بلکہ وہ معبود حقیقی (اللہ) ہے جس کا پوری کائنات میں تصرف و اختیار چلتا ہے، اس مباحثہ میں لاجواب ہونے کے باوجود، نمرود کو کسی قیمت پر بھی اپنے خدائی کے دعویٰ سے دستبردار ہونا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہدایت پر توجہ کرنا گوارا نہ ہوا اور جو لوگ گمراہی میں اس حد تک آگے بڑھ چکے ہوں، انہیں ہدایت کی راہ نصیب بھی نہیں ہوتی۔ (تیسیر القرآن)

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) ''اَلَمْ تَرَ'' یہ اندازِ بیان قباحت و شناعت کے لیے ہے، یہ بات انتہائی قابل مذمت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لاتعداد اور ان گنت احسانات پانے کے باوجود کوئی بندہ سرکشی اور بغاوت پر اتر کر خدائی کا دعوے دار بن بیٹھے۔

۲) موت وحیات کا صرف اور صرف اللہ مالک ہے، فرعون ونمرود ایسے خدائی کے دعوے دار بھی موت کے پنجے سے نہ بچ سکے، بلکہ انہیں بڑے المناک طریقے سے موت آئی اور لوگوں کے لیے باعث عبرت بنی، اس کے علاوہ دنیا میں بڑے بڑے دانا اور اطباء گزرے ہیں مگر آج تک کوئی بھی موت کا تریاق تلاش نہ کر سکا، دورِ حاضر میں سرجری اپنے کمال پر ہے، اس کے باوجود کسی کے پاس موت سے بچنے کا کوئی حل نہیں ہے، قرآن کا یہ دعویٰ سچا ہے اور ہمیشہ سچا رہے گا: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن ۵۵:۲۶،۲۷) روئے زمین پر جو کچھ بھی ہے فانی ہے، بقا ہے تو صرف تیرے پروردگار کی ذاتِ لافانی کو ہے جو صاحب جلال اور صاحب اکرام ہے۔

۳) نمرود کا یہ مباحثہ جسے اللہ نے وحی کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بتلایا ہے، گمراہی اور ہٹ دھرمی کی ایک واضح مثال ہے، نئے داعیان حق کے لیے اس میں منکرین کے مقابلے میں تجربے کا زادِ راہ ہے اور منکرین کی ہٹ دھرمی اور سرکشی کے مقابلہ میں ان کے نفوس کی تربیت کا سروسامان ہے۔

۴) قرآن حکیم انفس وآفاق کے حقائق ہمارے سامنے رکھ کر ہماری عقل وفکر کو جھنجھوڑتا ہے اور اس سے رب کائنات کی عظیم قدرت کا مشاہدہ کراتا ہے، آیہ مبارکہ موت وحیات رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ حقیقت النفس کا مطالعہ ہے تو آفتاب کا طلوع ہونا فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ آفاقی حقیقت کا مشاہدہ ہے، جو ہر عام وخاص کی نظر سے گزرتا ہے، عقلمند اسے جان پہچان کر رب عظیم پر اپنے ایمان کو مضبوط کر لیتے ہیں اور کوڑھ دماغ اور عقل کے اندھے ریب وتشکیک کی وادیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں۔

۵) اللہ تعالیٰ کا کلیہ اور قانون ہے کہ ظالم افراد ہوں یا ظالم اقوام وہ انہیں ہدایت سے بہرہ ور نہیں فرماتا ہے، قرآن حکیم کی اصطلاح میں ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے باوجود غرور اور تکبر کا شکار ہو جاتے ہیں، بندگی اور فرمانبرداری کی روش اختیار کرنے کی بجائے نافرمانی اور سرکشی کی راہ اختیار کرتے ہیں اور پھر ان کا پندار اور غرور آگے بڑھتا ہے تو خدائی کے دعوے دار بن بیٹھتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے عبرتناک انجام ان کا مقدر ٹھہرتا ہے۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۲۵۹)

اور پھر اسی طرح (اس شخص کی حالت پر بھی غور کرو) جو ایک ایسی بستی پر سے گزرا تھا جس کے مکانوں کی چھتیں گر چکی تھیں اور گری ہوئی چھتوں پر در و دیوار کا ڈھیر تھا (یہ حال دیکھ کر) وہ بول اٹھا ''جس بستی کی ویرانی کا یہ حال ہے، کیونکر ہو سکتا ہے کہ اللہ اسے موت کے بعد دوبارہ زندہ کر دے؟'' اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا، پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا ''بتاؤ، کتنی مدت پڑے رہے ہو؟'' اس نے عرض کیا ''ایک دن تک یا ایک دن کا کچھ حصہ'' ارشاد ہوا نہیں، بلکہ تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں، اب ذرا اپنے کھانے اور پانی پر نظر ڈالو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے، اور (اپنی سواری کے) گدھے پر بھی نظر ڈالو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے، کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں، پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔ اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو وہ بول اٹھا ''بلاشبہ اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''

﴿اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا﴾

یا مانند اس شخص کے جو گزرا اوپر ایک بستی کے اور (اس کے مکانات) گرے ہوئے تھے اپنی چھتوں کے اوپر۔

اَوْ، کلمہ تخییر بمعنی یا (or)، كَالَّذِیْ (كَ.الَّذِیْ) مانند، اس شخص کے (جو) مَرَّ گزرا (مَرَّ، یَمُرُّ، مَرًّا) گزرنا، آگے بڑھنا، مرور زمانہ، وقت کا گزرنا اردو میں استعمال ہوتا ہے، عَلٰی قَرْیَةٍ ایک بستی پر، وَّهِیَ اور وہ (بستی)، هِیَ کی ضمیر بستی کی طرف جاتی ہے، خَاوِیَةٌ گری ہوئی اسم فاعل (خ وی) اس کا مادہ ہے (خَوٰی. یَخْوِی) کسی عمارت کا ویران ہو کر گر پڑنا، عَلٰی عُرُوْشِهَا، اوپر اپنی چھتوں کے، یعنی گری ہوئی چھتوں پر در و دیوار کا ڈھیر تھا، عُروش کا مفرد عَرْشٌ ہے جس سے مراد چھت دار جگہ، چھت، شامیانہ، سائبان وغیرہ اردو زبان میں عرش بمعنی آسمان کے ہیں جیسا کہ عرش سے فرش تک پورے نظام کا اللہ ہی بادشاہ ہے، اَوْ كَالَّذِی، (یا مانند اس شخص کے) اس کا عطف پہلے واقعہ پر ہے جس کا ذکر آیت ۲۵۸ میں ہو چکا ہے اور مطلب یہ ہے کہ آپ نے (پہلے واقعہ کی طرح) اس شخص کے قصے پر نظر نہیں ڈالی جو ایک بستی سے گزرا..... یہ کون تھا؟

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''یہ کون شخص تھا جو بستی کے پاس سے گزرا تھا؟ وہ بستی کونسی تھی جو چھتوں پر ڈھی ہوئی تھی؟ قرآن نے ان میں سے کسی بات کی صراحت نہیں کی، اگر وہ چاہتا تو یقیناً وہ اس کی صراحت کر دیتا، اگر حکمت الٰہی کا تقاضا ہوتا کہ ان امور کو واضح کیا جائے تو قرآن انہیں غیر واضح نہ چھوڑتا اس لیے ہم اس بحث کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک اور پہلو کو واضح کرتے ہیں، آیت میں جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ حواس پر قوی اور گہرے اثرات ڈالتا ہے، یہ منظر بوسیدگی، گھروں کے گرنے اور فنا و موت کا ہے! منظر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وَ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا، وہ اپنی چھتوں پر ڈھئی ہوئی تھی اور جو شخص اس بستی کے پاس سے گزرا تھا، اس کے احساسات کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾

''وہ شخص کہنے لگا اللہ تعالیٰ کس طرح اس بستی کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرے گا۔''

قَالَ، کہا (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، اَنّٰی کیسے؟ کیونکر؟ تعجب کے لیے استعمال ہوتا ہے، یُحْیٖ وہ زندہ کرے گا، فعل مضارع واحد مذکر غائب (اَحْیٰ، یُحْیِیْ، اِحْیَاءٌ) زندہ کرنا، هٰذِهِ اس (بستی) کو، اسم اشارہ واحد مؤنث بستی کی طرف ہے، یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ، زندہ کرے گا اس بستی کو اللہ تعالیٰ، بَعْدَ مَوْتِهَا، اس کی موت کے بعد (یعنی اس کی بربادی کے بعد) هَا کی ضمیر پھر بستی کی طرف جاتی ہے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''یہ شخص جانتا ہے کہ اللہ ہے، لیکن بستی کی بربادی اور گھروں کے، چھتوں سمیت گرنے کے منظر سے اس کے احساسات پر اتنے قوی اور عمیق اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ وہ حیران رہ جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ اللہ اس بستی کو اس کے، اس طرح مردہ ہونے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا! یہ ہے تاثر کی زیادہ سے زیادہ شدت اور گہرائی، جو کسی منظر کو دیکھ کر پیدا ہو سکتی ہے، قرآن اس طرح کسی مفہوم کو انتہائی زوردار انداز میں بیان کرتا ہے، وہ کسی منظر کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے گویا وہ اس وقت ہماری نظروں کے سامنے موجود اور عیاں ہے۔

اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا. اللہ اس بستی کو اس کے مردہ ہونے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا! یعنی بستی کے مردہ لوگوں میں زندگی کس طرح رواں دواں ہوگی۔'' (فی ظلال القرآن)

﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ﴾

تو اللہ نے اسے سو سال کے لیے موت دے دی، پھر اسے (زندہ) کھڑا کیا۔

فَاَمَاتَهُ (فَ. اَمَاتَ. هُ) پس۔ موت دے دی (اللہ نے) اسے، هُ کی ضمیر اس شخص کی طرف جاتی ہے جسے تعجب ہوا تھا (اَمَاتَ، یُمِیْتُ، اِمَاتَةٌ) موت دینا، موت و حیات صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، مِائَةَ عَامٍ سو سال ثُمَّ۔ پھر بَعَثَهٗ (بَعَثَ. هُ) اٹھایا (زندہ کیا) اسے هُ کی ضمیر پھر اسی شخص کی طرف جاتی ہے۔

اس پر سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''اللہ نے اس شخص سے یہ نہیں کہا کہ یہ کیسے ہوگا، بلکہ عالم واقعہ میں کر کے دکھا دیا کہ ایسے ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات انسان کے احساسات و تاثرات اتنے شدید اور اتنے عمیق ہوتے ہیں کہ کسی

عقلی دلیل بلکہ کسی وجدانی گفتگو سے بھی ان کا علاج نہیں کیا جاسکتا، ان کا علاج کسی ایسے واقعہ سے بھی نہیں ہوسکتا جو عام طور پر لوگوں کے مشاہدے میں آتا ہے، ان کا علاج اس شخص کے اپنے شخصی وذاتی تجربے ہی سے ہوسکتا ہے، یہ تجربہ ایسا ہونا چاہیے کہ کسی گفتگو کے بغیر اس سے انسانی احساسات متاثر اور قلب مطمئن ہوجائے۔ (حوالہ ایضاً)

﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾

اللہ نے پوچھا، تم (اس حالت میں) کتنی مدت رہے؟ کہا ''ایک دن یا دن کا کچھ حصہ!''

قَالَ، یہاں کہنے والا، اللہ تعالیٰ ہے، صیغہ واحد مذکر غائب اللہ تعالیٰ نے اس شخص سے پوچھا، كَمْ لَبِثْتَ کتنی دیر تم رہے ہو؟ یعنی کتنی دیر تم اس حالت میں رہے ہو؟ كَمْ استفہام کے لیے استعمال ہوتا ہے (لَبِثَ، يَلْبَثُ، لَبْثًا) رہنا، قیام کرنا، قَالَ، اس شخص نے جواب دیا لَبِثْتُ میں رہا ہوں، يَوْمًا، ایک دن، اَوْ یا (or) بَعْضَ يَوْمٍ دن کا کچھ حصہ۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''یہ جواب اس بندہ نے اپنے علم وشعور اور اپنے احساس واندازے کے مطابق دیا اور بشری اندازہ و تخمین کی یہ غلطی ذرا بھی حیرت انگیز نہیں، جب دل ودماغ وشعور واندازکی مشینوں کی حرکت ہی سرے سے باطل ہوگئی تھی، تو کوئی بشر اندازہ کر ہی کیونکر سکتا تھا اور یوں بھی گھنٹوں اور دنوں بلکہ مہینوں اور برسوں کی مدت کو خواب اور بے ہوشی کی حالت میں ہم روزمرہ منٹوں اور سیکنڈوں کے اندر سمٹے اور سمٹائے ہوئے آخر دیکھتے ہی ہیں۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾

ارشاد ہوا، نہیں بلکہ تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں، اب ذرا اپنے کھانے اور پانی پر نظر ڈالو کہ وہ ذرا بھی سڑا (اور خراب) نہ ہوا۔

قَالَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، بَلْ، بلکہ لَّبِثْتَ تو رہا، قائم رہا (اس حال میں) (لَبِثَ، يَلْبَثُ، لَبْثًا) ٹھہرنا، قائم رہنا مِائَةَ عَامٍ، ایک سو سال، یعنی اس حالت میں (موت کی حالت میں) تم ایک سو سال رہے ہو۔

فَانْظُرْ (فَ. انْظُرْ) پس۔ دیکھو، اُنْظُرْ، فعل امر واحد مذکر (نَظَرَ، یَنْظُرُ، نَظْرًا) دیکھنا، غور سے کسی بات کا جائزہ لینا، اِلٰی طَعَامِکَ طرف اپنے کھانے کے، (طَعَامِ. کَ) کھانا، اپنا، لَمْ، کہ نہیں، یَتَسَنَّہْ سڑا وہ۔ خراب ہوا وہ (س ن ہ) اس کا مادہ ہے (تَسَنَّہَ، یَتَسَنَّہُ، تَسَنُّھًا) باسی ہونا، خراب ہونا، دراصل سَنَۃٌ کے معنی سال کے ہیں اسی مناسبت سے اس کے معنی یوں ہوئے کہ سالہا سال گزرنے کے باوجود نہ تو یہ باسی ہوا اور نہ ہی خراب بلکہ اسی حالت میں رہا گویا کہ ابھی ابھی لایا گیا اور تیار ہوا ہے۔

﴿وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِکَ وَلِنَجْعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ﴾

اور (اپنی سواری کے) گدھے پر نظر ڈالو، تاکہ ہم بنائیں تجھے نشانی لوگوں کے لیے۔

وَانْظُرْ اور نظر ڈالو، فعل امر واحد مذکر، اِلٰی طرف، حِمَارِکَ (حِمَارِ. کَ) گدھے، اپنے (کی طرف کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے)، وَلِنَجْعَلَکَ (وَ. لِ. نَجْعَلَ. کَ) اور۔ تاکہ۔ ہم بنائیں۔ تجھ کو، اٰیَۃً نشانی، لِّلنَّاسِ (لِ. النَّاسِ) لیے، لوگوں کے، لوگوں کے لیے تمہیں علامت اور معجزہ بنائیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت کا مشاہدہ کریں۔

﴿وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ نُنْشِزُھَا ثُمَّ نَکْسُوْھَا لَحْمًا﴾

''اور پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔''

وَانْظُرْ اور دیکھو تم، فعل امر واحد مذکر، اِلَی طرف، الْعِظَامِ ہڈیوں (کے) اس کا مفرد عَظْمٌ ہے، کَیْفَ کیسے، کس طرح نُنْشِزُھَا (نُنْشِزُ. ھَا) اکٹھا کرتے ہیں، بناتے ہیں۔ ان کو (ن ش ز) اس کا مادہ ہے (اَنْشَزَ، یُنْشِزُ، اِنْشَازًا) ترتیب سے اکٹھا کرنا، بنانا، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرو کہ اس میں کتنا نظم و ضبط، سلیقہ اور قرینہ ہے، ثُمَّ پھر، نَکْسُوْھَا لَحْمًا (نَکْسُوْ. ھَا) پہناتے ہیں، اسے گوشت۔ (ک س و) اس کا مادہ ہے (کَسَا، یَکْسُوْ، کَسْوًا) پہنانا، یعنی تم اپنے گدھے کے پنجر کا مشاہدہ کرو کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو ہم کس طرح ترتیب دیتے ہیں اور پھر ان پر گوشت پوست کا پہناوا دیتے ہیں۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''کس کی ہڈیاں؟ کن ہڈیوں پر گوشت چڑھایا گیا؟ کیا خود اس شخص کی ہڈیوں پر اگر یہ بات ہوتی.....

جیسا کہ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خود اس شخص کی ہڈیوں پر گوشت نہ رہا تھا.....تو بیدار ہوتے ہی اس کی نظر اپنی ہڈیوں پر پڑتی اور اس منظر سے اس کے حواس بھی متاثر ہوتے اور وہ یہ نہ کہتا لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ (مرا) پڑا رہا۔

اس لیے ہم اس رائے کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس شخص کی نہیں، گدھے کی ہڈیاں گوشت سے خالی ہو کر گل سڑ گئی تھیں اور اللہ کی قدرت کا کرشمہ یہ تھا کہ اس نے ان ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا، ان پر گوشت چڑھایا اور پھر ان کو زندہ کر دیا اور یہ سب کچھ اس شخص کی نظروں کے سامنے ہوا جو گلا سڑا نہ تھا اور جس کے کھانے پینے کی چیزیں سڑی بسی نہ تھیں! مختلف چیزوں کے انجام کے مابین یہ اختلاف.....جبکہ سب چیزیں ایک ہی جگہ پر تھیں اور ایک ہی طرح کے فضائی اور موسمی اثرات ان پر پڑ رہے تھے.....اس بات کی ایک اور نشانی ہے کہ ایک قادر مطلق ہے جو کسی کام کے کرنے سے عاجز نہیں ہے اور جو اشیاء میں تصرف کرنے کے سلسلے میں کسی قید کا پابند نہیں ہے تا کہ وہ شخص دیکھ لے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مردہ بستی کو زندہ کرے گا۔ (فی ظلال القرآن)

﴿فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾

''پس جب حقیقت واضح ہوئی اس کے سامنے، کہنے لگا: میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

فَلَمَّا (فَ.لَمَّا) پس، جب، تَبَیَّنَ لَهٗ واضح ہونا، بَیِّنَاتِ، واضح نشانیوں کو کہتے ہیں۔ جب اس شخص نے اپنی آنکھوں سے گدھے کے پنجر کو جڑتے بنتے دیکھ لیا۔ قَالَ (کہا اس نے) وہ بول اٹھا، اَعْلَمُ میں جانتا ہوں، فعل مضارع واحد متکلم، (عَلِمَ، یَعْلَمُ، عِلمًا) جاننا، کسی حقیقت کو پانا، اَنَّ اللّٰهَ بلاشبہ اللہ تعالیٰ، عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، ہر بات پر قدرت رکھتا ہے، جملے کے شروع میں اَنَّ (کلمہ تحقیق کلام نے) اسے انتہائی زوردار بنا دیا ہے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ''اَوْ كَالَّذِیْ'' (یا اس شخص کی حالت پر بھی غور کرو) کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی دین ہے وہ جسے چاہے دے اور جس طریقے سے چاہے دے مگر اس کے ساتھ ساتھ جو لوگ انفس وآفاق پر غور وفکر کرتے ہیں

اور اپنے ذہن وفکر کے دریچوں کو کھول دیتے ہیں انہیں تو رب کریم کی طرف سے ہدایت مل جاتی ہے اور جو تمام دلائل پانے کے باوجود عقل وخرد کو پس پشت ڈال کر غرور وسرکشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔ جیسا کہ گزشتہ آیت میں نمرود واضح دلائل پانے کے باوجود ہدایت سے بہرہ ور نہ ہو سکا۔

۲) اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت ہر قید و بند سے آزاد ہے، کائنات اور اس کا ہر ذرہ اس کے حکم کے تابع ہے، آگ کا کام جلانا ہے مگر یہی آگ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے گلزار بن گئی، دریائے نیل کی طغیانی موجوں میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لیے راستہ کس نے بنایا؟ اور وہی دریا کس کے حکم سے فرعون اور اس کے لاؤلشکر کے لیے موت کا پیغام بنا؟ اور اس آیہ مبارکہ میں اس شخص اور اس کے کھانے پر لیل ونہار کی کتنی ساعتیں بیت گئیں مگر اس کے مردہ جسم اور کھانے میں ادنیٰ سا بھی تغیر پیدا نہ ہو سکا۔ جبکہ اس کے گدھے کی ہڈیاں راکھ کا ڈھیر بن گئیں، آخر یہ کس کی قدرت وطاقت کی کرشمہ سازیاں ہیں؟ ﴿فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ﴾

ہمارے روزمرہ کے مشاہدے میں یہ بات آتی ہے کہ ہوائی جہاز بلندیوں سے گرتا ہے اُس میں سب جانیں تلف اور ضائع ہو جاتی ہیں مگر ایک شخص اس میں صحیح وسالم رہتا ہے، تیز رفتار بس گہرے کھڈ میں جا گرتی ہے آناً فاناً لاشیں تڑپنے لگتی ہیں مگر ان میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں خراش تک نہیں آتی۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ چند ساعتوں میں ساری دنیا کو تباہ و برباد کر سکتا ہے اور پھر چند اگلی ساعتوں میں اسے دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ.

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰیؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًاؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ(۲۶۰)	اور (اس واقعہ کو بھی یاد کیجیے) جب ابراہیمؑ نے کہا کہ ''میرے رب! مجھے دکھا دے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟'' فرمایا: ''کیا تمہیں یقین نہیں ہے؟'' عرض کیا کیوں نہیں اور (میں تو اس لیے چاہ رہا ہوں) تا کہ میرے قلب کو اطمینان کامل ہو جائے فرمایا ''اچھا، تو چار پرندے لو اور انہیں اپنے سے مانوس کر لو، پھر (ان کو ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو) اور پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو، پھر انہیں (نام لے لے کر) پکارو، تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آ جائیں گے جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے، حکمت والا ہے۔

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی﴾

''اور جب کہا ابراہیمؑ نے اے میرے رب! دکھلا مجھے کیسے زندہ کرتا ہے تو مُردوں کو۔''

وَاِذْ اور جب اِذْ کلمہ شرط، ظرف زمانہ (Shows time) قَالَ اِبْرٰهٖمُ کہا ابراہیمؑ نے (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، رَبِّ، اے میرے رب! اَرِنِیْ (اَرِ.نِیْ) دکھلا، مجھے فعل امر واحد مذکر (اَرٰی، یُرِیْ) دکھانا، كَیْفَ، کیسے تُحْیِ تو زندہ کرتا ہے، فعل مضارع واحد مذکر حاضر (اَحْیٰ، یُحْیِ، اِحْیَاءٌ) زندہ کرنا، الْمَوْتٰی مردوں کو۔ یعنی کس خاص کیفیت کے ساتھ، کس متعیّن طریقہ پر (فِیْ اَیِّ حَالٍ اَوْ عَلٰی اَیِّ حالٍ) یہ وقوع تو سیدنا ابراہیم کے لیے پوری طرح واضح تھا آپ نے سوال اس کی کیفیت کے بارے میں کر رہا ہے، محققین نے کہا ہے کہ سوال کے الفاظ سے خود یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ سائل کو کوئی شبہ احیاءِ موتی (یعنی مُردوں کو زندہ کرنے) کے نفسِ وقوع میں نہیں ہے۔

﴿قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ﴾

''فرمایا' کیا تم یقین نہیں کرتے ؟' عرض کیا، کیوں نہیں مگر اس لیے تا کہ میرے دل کو اطمینان کامل ہو جائے۔''

قَالَ، یعنی قَالَ اللّٰہُ لِاِبْرٰھِمَ، اللہ تعالیٰ نے ابراہیم سے کہا، اَوَلَمْ کیا نہیں، اَوَ، کلمۂ استفہام (کیا) لَمْ تُؤْمِنْ نہیں ایمان رکھتے تم، فعل مضارع، واحد مذکر حاضر، (اٰمَنَ، یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا) ایمان لانا، یقین کرنا، قَالَ بَلٰی، کہا ابراہیمؑ نے (ہاں میں ایمان رکھتا ہوں) بَلٰی ہاں، حرفِ جواب، اس کے ذریعے بطور خاص نفی کا جواب دیا جاتا ہے، جیسا کہ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ پوچھے گا ''اَلَیْسَ ھٰذَا بِالْحَقِّ'' کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ منکرین آخرت پکار اٹھیں گے ''قَالُوْا بَلٰی وَ رَبِّنَا'' ہاں! اے ہمارے رب، یہ حقیقت ہی ہے۔ وَ لٰکِنْ اور لیکن لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ تا کہ مطمئن ہو جائے میرا دل، (لِ. یَطْمَئِنَّ) تا کہ، مطمئن ہو (اِطْمَئَنَّ، یَطْمَئِنُّ، اِطْمِئْنَانٌ) آرام کرنا، دل میں سکون آنا، اطمینانِ قلب، دل کا سکون، اردو میں استعمال ہوتا ہے، قَلْبِیْ (قلب. ی) دِل، میرا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''حضرت ابراہیمؑ عرض کرتے ہیں کہ ایمان کے درجہ تک تو یقین اب بھی حاصل ہے ہاں، صرف یہ چاہتا ہوں کہ مشاہدہ کے بعد اطمینان اور زیادہ حاصل ہو جائے اس مرتبہ کو اصطلاح میں عین الیقین کہتے ہیں ورنہ یقین مرتبہ تصدیق تک تو جسے اصطلاح میں علم الیقین کہتے ہیں ہر مومن کو حاصل ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جیسے مومنِ اعظم کو کیوں نہ حاصل ہوتا۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ﴾

''اچھا، تو چار پرندے لو، انہیں اپنے سے مانوس کر لو۔''

''قَالَ'' اللہ نے فرمایا فَخُذْ (فَ. خُذْ) پس۔ پکڑو (اَخَذَ، یَأْخُذُ، اَخْذًا) لینا، پکڑنا، اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ چار پرندے، فَصُرْھُنَّ (فَ. صُرْھُنَّ) پس، مانوس کر لیجیے انہیں، ھُنَّ کی ضمیر پرندوں کی طرف جاتی ہے، ضمیر جمع مؤنث غائب (صَارَ، یَصُوْرُ، صَوْرًا) مائل کرنا، مانوس کرنا اس سے امر صُرْ ہے۔ اس لفظ کے دوسرے معنی، قطع کرنا، ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بھی ہیں، گویا اس کے معنی یوں ہوئے کہ ان جانوروں کو اپنے سے مانوس کر کے ذبح کرو اور ہر پہاڑ پر کچھ کچھ حصہ ان کا رکھ دو۔ (انوار القرآن)

(صَارَ، یَصُوْرُ، صَوْرًا) سے فعل امر، صِرْ (ص کی زیر کے ساتھ) آئے تو اس کے معنی قطع کرنا اور اگر صُرْ (ص کی پیش کے ساتھ) آئے تو اس کے معنی مائل کرنے، مانوس کرنے کے ہوتے ہیں، حکم ہوا کہ ان پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کرنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو۔

﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا﴾

''پھر رکھ دو، ہر پہاڑ کے اوپر، ان میں سے، ایک ایک ٹکڑا۔''

ثُمَّ پھر، اِجْعَلْ، کر دو، رکھ دو، فعل امر واحد مذکر (جَعَلَ، یَجْعَلُ، جَعْلًا) کرنا، رکھنا، عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ ہر پہاڑ پر، جبل کی جمع جبال آتی ہے، بہت سے پہاڑ، مِّنْهُنَّ (مِّنْ.هُنَّ) سے، ان یعنی ان میں سے هُنّ کی ضمیر پرندوں کی طرف جاتی ہے، جُزْءًا، ایک ایک ٹکڑا (حصہ) یعنی ذبح کرنے کے بعد ان پرندوں کے مخلوط اجزاء میں سے مختلف ٹکڑے مختلف پہاڑوں پر رکھ دو۔

﴿ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا﴾

''پھر انہیں (نام لے لے کر) پکارو، تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے۔''

ثُمَّ پھر، ادْعُهُنَّ (ادْعُ.هُنَّ) بلاؤ۔ ان کو هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب، پرندوں کی طرف جاتی ہے (دَعَا، یَدْعُوْا، دَعْوَةً) پکارنا، یَاْتِيْنَكَ (یَاْتِيْنَ.كَ) وہ آئیں گے، تمہارے پاس، سَعْيًا، دوڑتے ہوئے۔ (اَتٰی، یَاْتِیْ، اِتْیَانًا) آنا، قریب ہونا، سَعْيًا، دوڑتے ہوئے یعنی ان کے متفرق اجزاء آپس میں مل جائیں گے اور جس پرندے کا جزو (حصہ) ہوگا اسی کے ساتھ ملے گا۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''سیدنا ابراہیمؑ نے اس راز کو اپنے سامنے واقع ہوتے دیکھا۔ پرندے زندگی سے محروم ہو گئے تھے اور ان کے ٹکڑے دور دراز مقامات پر بکھر گئے تھے، پھر ان میں زندگی دوبارہ رواں دواں ہو گئی اور وہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس دوڑے چلے آئے۔

کیسے؟ یہ ایک راز ہے جو انسانی فہم و ادراک سے ماورا ہے ہر انسان اسے دیکھتا ہے، جس طرح ابراہیمؑ نے اسے دیکھا اور وہ اس کی تصدیق کرتا ہے لیکن وہ رب کائنات اور اس کے طریق کار سے ناآشنا رہتا ہے، یہ امر الٰہی ہے، لوگ اللہ کے علم میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے، بجز اس کے جو اللہ چاہے اور اللہ کی

مشیت یہ نہ ہوئی کہ انسان اس کے علم کے اس گوشے کا احاطہ کرلیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ امر ان کی گرفت سے بالاتر ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ امر خالق کے لیے مخصوص ہے اور خلافت ارضی کے سلسلے میں انہیں اس امر کو جاننے کی ضرورت نہیں۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیہ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مُردوں کے زندہ ہونے پر کوئی شک وشبہ ظاہر نہیں کیا بلکہ صرف یہ پوچھا کہ وہ کس خاص کیفیت کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے اور ان کو دوبارہ زندگی بخشنے کا خاص طریقہ کیا ہوگا؟
اب کفار اس بات کو یوں پوچھتے ہیں: مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيْمٌ (یٰسین ۳۶:۷۸) ''ہڈیوں کے بوسیدہ ہونے پر بھلا کون انہیں دوبارہ زندہ کرے گا؟''
سیدنا ابراہیمؑ کا سوال استفسار کے انداز میں ہے اور اس میں یقین داخل ہے جبکہ کفار کے سوال کا انداز مضحکانہ ہے اور اس کا تعلق انکار سے ہے اور پھر بقول سید مودودیؒ: ''انبیا کو جو خدمت اللہ نے سپرد کی تھی، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے وہ حقیقتیں دیکھ لیتے جن پر ایمان لانے کی دعوت انہیں دنیا کو دینی تھی ان کو دنیا سے پورے زور کے ساتھ یہ کہنا تھا کہ تم لوگ تو قیاسات دوڑاتے ہو، مگر ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں، تمہارے پاس گمان ہے اور ہمارے پاس علم ہے، تم اندھے ہو اور ہم بینا ہیں اس لیے انبیاء کے سامنے فرشتے عیاناً آئے ہیں، ان کو آسمان وزمین کے نظام حکومت (ملکوت) کا مشاہدہ کرایا گیا ہے، ان کو جنت اور دوزخ آنکھوں سے دکھائی گئی ہے اور بعث بعد الموت کا ان کے سامنے مظاہرہ کر کے دکھایا گیا ہے، ایمان بالغیب کی منزل سے یہ حضرات منصب نبوت پر مامور ہونے سے پہلے گزر چکے ہوتے ہیں، نبی ہونے کے بعد ان کو ایمان بالشہادہ کی نعمت دی جاتی ہے اور یہ نعمت انہی کے ساتھ مخصوص ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

۲) ہمارے مشاہدہ میں یہ بات آتی ہے کہ کسی باغ باغیچہ میں گھاس مرجھا چکی ہوتی ہے اور اس میں تروتازگی کے قطعاً کوئی آثار نہیں ہوتے، آسمان سے بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے تو تھوڑے ہی عرصے میں اس کی شادابی اور ہریالی لوٹ آتی ہے اور باغ لہلہانے لگتا ہے، یہ کس کی قدرت کی نشانی ہے؟
قرآن کہتا ہے:

''اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سونی پڑی ہوئی ہے، پھر جونہی ہم نے اس پر پانی برسایا، یکا یک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ اس مری ہوئی زمین کو جلا اٹھاتا ہے، وہ مُردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے اور یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔'' (حٰم السجدہ ۴۱:۳۹)

پھر ہم غور کریں تو دن بھر کام کاج کے بعد ہر شخص نیند لینے پر مجبور ہوتا ہے اور صرف رب کائنات کی رحمت سے دوبارہ اٹھنا نصیب ہوتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ اسی حالت میں اس دنیا سے چل بستے ہیں، اور انہیں اٹھنے کی قدرت ہی نہیں ہوتی اور ہماری زبانوں پر یہ جملہ ہوتا ہے ''وہ سوتے ہی چل بسا'' یہ وہ مشاہدات ہیں جن کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۶۱) اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲۶۲)	جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس بیج کے دانے کی سی ہے (جو زمین میں بویا جاتا ہے تو) ایک دانہ سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے نکل آئے اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے، اس سے بھی دوگنا کر دیتا ہے، وہ بڑی ہی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اس طرح خرچ کرتے ہیں کہ اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ لینے والے کو (اپنے قول و فعل سے) دکھ پہنچاتے ہیں، تو ان کے رب کے پاس ان کے عمل کا اجر ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔''

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾

مثال ان لوگوں کی (جو) خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں۔

مَثَلُ، مثال، الَّذِيْنَ ان لوگوں کی اسم موصول اس کا مفرد، الَّذی ہے، يُنْفِقُوْنَ (جو) خرچ کرتے ہیں فعل مضارع جمع مذکر غائب (اَنْفَقَ، يُنْفِقُ، اِنْفَاقٌ) خرچ کرنا، اَمْوَالَهُمْ (اَمْوَالَ.هُمْ) مال، اپنے۔ فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ، اللہ کی راہ میں یعنی احکام شریعت کے مطابق نیک کاموں میں مال خرچ کرتے ہیں۔

﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾

جیسے مثال ایک دانہ (کی) کہ اگائے سات خوشے (کہ ظاہر ہوں) ہر خوشے کے سو دانے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کار خیر میں صرف کرنے والوں کو ان کے حسن عمل کا اجر سات سو گنا دیتا ہے، انفاق فی سبیل اللہ کی، شاید اس سے عمدہ مثال نہیں ہوسکتی کہ کسان نے اپنے وسیع وعریض کھیت میں بطور بیج کے ایک چھوٹا سا تھیلہ بکھیر دیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی محنت کو بار آور کیا، بارانِ رحمت کا نزول ہوا، اس کی رحمت سے کسان کا کھیت پھلا پھولا اور گندم کے بہت سے تھیلے بھر گئے۔

﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾

اور اللہ دگنا کرتا ہے واسطے جس کے چاہے اور اللہ وسعت والا، جاننے والا ہے۔

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ اور دگنا کرتا ہے (ضَاعَفَ، يُضَاعِفُ، مُضَاعَفَةٌ) دگنا کرنا، لِمَنْ (لِ.مَنْ) واسطے جس کے، یعنی جس کے لیے چاہے وہ اس سے زیادہ اجر وثواب کا اضافہ کردے، جس قدر خلوص بڑھتا ہے اسی قدر اجر میں اضافہ بڑھتا ہے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ بے شمار اور بے حساب دیتا ہے، وہ اپنے رزق سے، جس کی حدود کوئی نہیں جانتا اور اپنی رحمت سے جس کی انتہا کسی کے علم میں نہیں، جسے چاہتا ہے، خوب خوب دیتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ فراخ دست، سب کچھ جاننے والا ہے۔

وہ ''وَاسِعٌ'' فراخ دست ہے، وہ دلوں کی نیتوں اور ارادوں کو جانتا ہے، اس سے کوئی شے پوشیدہ نہیں وہ اپنے علم کے مطابق لوگوں کو اجر و ثواب دیتا ہے۔ لیکن وہ کونسا انفاق ہے جو نشو و نما پا کر بڑھتا چلا جاتا ہے، وہ کون سی بخشش ہے جسے اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں بے شمار گنا بڑھاتا ہے؟ یہ وہ انفاق ہے جو انسانی احساسات کو رفعت بخشتا ہے اور ان میں کسی خرابی کا موجب نہیں ہوتا، یہ وہ انفاق ہے جو شرافتِ نفس اور انسانی جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچاتا، یہ وہ انفاق ہے جو پاکیزگی قلب اور دل کی رضا سے ظہور میں آتا ہے۔ یہ وہ انفاق ہے جس کا رخ اللہ کی رضا جوئی کے لیے اسی کی طرف ہوتا ہے۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى﴾

وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں پھر وہ نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ تکلیف دیتے ہیں (اپنے قول و عمل سے)۔

اَلَّذِيْنَ وہ لوگ (جو) اسم موصول (Relative Pronoun) اس کا مفرد الَّذی ہے، يُنْفِقُوْنَ خرچ کرتے ہیں، فعل مضارع جمع مذکر غائب (اَنْفَقَ، يُنْفِقُ، اِنْفَاقٌ) خرچ کرنا، اَمْوَالَهُمْ (اَمْوَالَ. هُمْ) مال، اپنے، هُم کی ضمیر لوگوں کی طرف جاتی ہے، فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اللہ کی راہ میں، ثُمَّ پھر، لَا يُتْبِعُوْنَ فعل مضارع جمع مذکر غائب، نہیں لاتے پیچھے یعنی خرچ کرنے کے بعد اس کے پیچھے ایسا نہیں کرتے (کہ زبان و بیان سے کسی کی دل آزاری کریں)، اَتبَعَ، يُتبِعُ، اِتْبَاعًا، کسی کام کے بعد کوئی عمل کرنا، مَآ اَنْفَقُوْا جو خرچ کیا انہوں نے، مَنًّا، احسان (جتا کر) وَّ لَآ اور نہ، اَذًى تکلیف، دکھ ہی (دے کر) یعنی جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کا خرچ کرنا محض لوجہ اللہ ہوتا ہے اور اس کے بعد نہ تو (لینے والے کو) احسان جتاتے ہیں اور نہ اسے اپنے قول و فعل سے کسی طرح بھی دکھ اور تکلیف ہی دیتے ہیں بلکہ ان کے عمل سے ''نیکی کر دریا میں ڈال'' کی عکاسی ہوتی ہے۔ جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے بارے میں قرآن شہادت دیتا ہے: وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا، اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (الدھر ۷۶: ۸، ۹) ''اور اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان کے دلوں کی آواز یہ ہوتی ہے) ہم تمہیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں ہم تم سے نہ

کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ کسی شکریہ کے طالب ہیں۔"

﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ان کے لیے، ان کا اجر ہے، ان کے رب کے پاس۔

لَهُمْ (لَ.هُمْ) لیے، ان کے، اَجْرُهُمْ (اَجْرُ.هُمْ) اجر، ان کا، عِنْدَ، نزدیک، پاس (رَبِّ.هِم) رب۔ ان کے، یعنی وہ لوگ جو اپنے رب کی رضا کے لیے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اِن کا اجر اِن کے رب کے پاس محفوظ ہو جاتا ہے اور وہاں تو ذرہ برابر نیکی بھی ضائع نہیں جاتی ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزلزال ۹۹:۷-۸)

"پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔"

﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾

اور نہیں خوف اُوپر اُن کے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

وَلَا اور نہیں، خَوْفٌ خوف ہے، عَلَيْهِمْ (عَلٰى.هِمْ) اوپر، ان کے وَلَا اور نہ، هُمْ وہ، يَحْزَنُوْنَ، غمگین ہوں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا دنیا میں کسی رنج و ملال کا باعث ہوگا اور نہ ہی آخرت میں کوئی غم اور پریشان ہوگی بلکہ یہ ایسی راہ ہے جہاں طمانیتِ قلب اور راحتِ جان میسر آتی ہے۔ قرآنِ حکیم متعدد مقامات پر اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے، ایک جگہ اس طرح آتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ، وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ ۲:۲۷۴) "جو لوگ اپنا مال رات اور دن، پوشیدہ اور ظاہر (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں، ان کا صلہ ان کے رب کے پاس ہے اور ان کو (قیامت کے دن) نہ کسی کا خوف ہوگا اور نہ ہی غم۔"

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) قرآن و سنت میں انفاق فی سبیل اللہ کی بڑی ترغیب دلائی گئی ہے اور اس پر اجرِ عظیم کی بشارت بھی سنائی گئی ہے، جو لوگ اللہ تعالیٰ کے بندوں کی خدمت و مروّت کو زندگی کا شعار ٹھہراتے ہیں وہ اللہ کے

یہاں قدر و منزلت پاتے ہیں۔

۲) اسلام کی بلند تعلیمات میں سے خرچ کے سلسلہ میں یہ بات بھی بتلائی گئی ہے کہ اس وقت تک نیکی کو نہ پہنچو گے جب تک کہ اللہ کی راہ میں وہ چیزیں نہ خرچ کرو جو تمہیں خود پسندیدہ ہوں (دیکھیے سورۂ آل عمران ۳:۹۲) اور اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف حق حلال کی روزی میں سے صاف ستھرا مال ہی قبول کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''اے ایمان والو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے، اس میں سے بہتر اللہ کی راہ میں خرچ کرو، ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لیے بُری سے بُری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے، تو تم ہرگز اسے لینا گوارا نہ کرو گے اِلّا یہ کہ اسے قبول کرنے میں تم چشم پوشی کر جاؤ۔'' (البقرہ ۲:۲۶۷)

پھر خرچ کرنے کی ترتیب کو کتنا خوبصورت رکھا گیا ہے اس کا آغاز گھر سے ہوتا ہے، مالی امداد کے اولین مستحق والدین ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ''جو مال بھی تم خرچ کرو، اپنے والدین، رشتے داروں، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں پر خرچ کرو، اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ، اس سے باخبر ہوگا۔'' (البقرہ ۲:۲۱۵)

اور انفاق فی سبیل اللہ کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے اپنی وسعت کے مطابق جتنا کوئی خرچ کرنا چاہے کرسکتا ہے اگرچہ زکوٰۃ کا نصاب صاحب حیثیت پر مقرر (Fixed) رکھا گیا ہے مگر صدقات و خیرات کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے، قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت کا اعجاز ہے کہ مختصر جملوں میں تمام مسائل سمیٹ دیتا ہے، ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ رب العالمین کا کلام ہے۔

پھر انفاق فی سبیل اللہ اور غربا و مساکین کی خدمت کو دشوار گزار چوٹی عبور کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ شیطانی ترغیبات اور نفس کی خواہشات کے برعکس اخلاقی بلندیوں پر لے جانے والا راستہ ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''اور آپ کیا جانیں کہ وہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے؟ وہ ہے کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا، یا فاقہ کے دنوں میں کسی قرابتدار یتیم کو، یا کسی خاکسار مسکین کو کھانا کھلانا۔'' (البلد ۹۰:۱۲ تا ۱۶)

قرآن حکیم نے ان لوگوں کو جو سونے چاندی (مال و متاع) کے انبار جمع کر لیتے ہیں، پھر انہیں بنکوں اور تجوریوں میں بند رکھتے ہیں، دردناک عذاب کی خبر دی ہے:

''دردناک سزا کی خوشخبری دو اُن کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں

خرچ نہیں کرتے، ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا..... یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔" (التوبہ ۹:۳۴، ۳۵)

یہ ہیں اسلام کی وہ بلند تعلیمات جن سے معاشرے میں غربت و افلاس کا خاتمہ ہوتا ہے اور امن و سلامتی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں، لوگوں کے درمیان حسد و رقابت کی کیفیت ختم ہو کر مہر و محبت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ (۲۶۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶۴)	(کسی سائل کو) نرمی سے جواب دینا اور درگزر کرنا اس خیرات سے کہیں بہتر ہے جس کے بعد دِل آزاری ہو اور اللہ تعالیٰ بے نیاز بڑا ہی بردبار ہے، مؤمنو! اپنے صدقات و خیرات احسان جتلانے اور (کسی کی) دل آزاری سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کو دکھانے کے لیے مال خرچ کرتا ہے، اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، تو اُس (کے مال خرچ کرنے) کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے، اسی طرح یہ ریاکار لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے اور اللہ ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى﴾

(کسی سائل کو) نرمی سے جواب دینا اور درگزر کرنا بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ اچھی گفتگو، "اَیْ کَلَامٌ حَسَنٌ وَ رَدٌّ جَمِیْلٌ عَلَی السَّائِلِ کَاَنْ یَقُوْلَ لَهٗ رَزَقَكَ اللّٰهُ اَوْ عُدْ اِلَیَّ مَرَّةً اُخْرٰی اَوْ نَحْوَ ذٰلِكَ"۔ "یعنی سائل کے ساتھ حسن کلام سے پیش آنا اور خوبصورت انداز سے جواب دینا مثلاً اسے یہ کہنا کہ اللہ تمہیں رزق عطا کرے یا پھر کبھی آ کر لے جانا وغیرہ۔"

وَ مَغْفِرَةٌ اور بخش دینا، "أی سَتْرَ لِمَا وَقَعَ مِنْهُ مِنَ الْاِلْحَافِ فِی السُّؤَالِ وَ غَیْرِہٖ مِمَّا یَثْقُلُ عَلَی النُّفُوْسِ اِحْتِمَالُهٗ" یعنی سائل برابر پیچھے پڑا رہے اور اس کی باتیں نفس پر گراں گزریں تو اس وقت اس سے درگزر کرنا اور اسے معاف کر دینا ہی خوبی کی بات ہے۔ (المراغی)

خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ اس صدقہ سے بہتر ہے، **يَّتْبَعُهَا** (يَتْبَعُ.هَا) پیچھے، اس کے، **اَذًى**، ایذا، تکلیف (ہو) یہ لفظ عام ہے، ہر قسم کے آزار اور تکلیف پر بولا جاتا ہے، زبان سے یا عمل سے احسان جتانا بھی اس میں آ جاتا ہے۔ مثلاً زبان سے برا بھلا کہنا یا ہاتھ سے دھکا وغیرہ دینا، لفظ خیر پر غور کیجیے کہ اگر جیب اجازت نہ دے تو نرمی سے جواب دے دینا اور سائل کی سختی کو پی جانا، رضائے الٰہی کو پانا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ﴾ اور اللہ تو بڑا ہی بے نیاز اور بردبار ہے۔

غَنِیٌّ (بے نیاز) اللہ تعالیٰ بندوں کے صدقات و خیرات سے بے نیاز ہے، وہ تو تمہارے ہی فائدے کے لیے تم سے خرچ کرواتا ہے تاکہ تمہارا تزکیۂ نفس ہو اور تمہارے درمیان الفت و محبت پیدا ہو اور اس کے صلے میں تمہیں وہ اپنی رحمتوں اور نوازشوں سے بہرہ ور فرمائے اور یاد رکھو وہ پاکیزہ دل سے پاکیزہ چیزوں کو قبول کرتا ہے کسی پر احسان جتانے اور اس کی دل آزاری کرنے سے تمہارا اجر و ثواب ضائع ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اُس کی صفت حلیمی پر بھی غور کر لو، کہ وہ سائل کی بدتہذیبی ہو یا امیر آدمی کی بددماغی ہو، سب کو ایک حد تک معاف کرتا رہتا ہے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى﴾

''اے ایمان والو! مت برباد کرو اپنے صدقات کو احسان اور ایذا رسانی سے۔''

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، قرآن حکیم میں جہاں بھی اہل ایمان سے خطاب ہوتا ہے انہیں یا تو کوئی حکم دیا جاتا ہے یا پھر کسی بات سے منع کیا جاتا ہے، لہٰذا انہیں توجہ سے سننا چاہیے، اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو حرز جان بنانا چاہیے۔ لَا تُبْطِلُوْا، نہ ضائع کرو فعل نہی جمع مذکر حاضر (اَبْطَلَ، یُبْطِلُ، اِبْطَالٌ) باطل کرنا، ضائع کرنا باب افعال، صَدَقٰتِكُمْ (صَدَقٰتٌ. كُمْ) صدقات (خیرات)، اپنے (کو) بِالْمَنِّ (بِ. الْمَنِّ) ساتھ احسان کے (جتا کر)، وَالْاَذٰى اور (ساتھ) ایذا کے (تکلیف دے کر)۔

صدقہ مثل ایک بیج کے ہے جسے زمین میں بویا جاتا ہے تو اللہ کی رحمت سے اس سے کونپل پھوٹتی ہے، وہ پھلتی پھولتی ہے تو اس سے شاخیں نکلتی اور پھیلتی ہیں جن پر پھل ظاہر ہوتے ہیں، مگر اَذًی ایسی آفات ہیں جو ان پھلوں کو تباہ کر دیتی ہیں، بعینہ صدقہ وخیرات کر کے احسان جتانے یا دل آزاری کرنے سے وہ عظیم الشان نتائج جو ان سے مرتب ہونے تھے ان سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔

﴿كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾

''اس شخص کی مانند کہ جو خرچ کرتا ہے، اپنا مال، لوگوں کو دکھلانے کے لیے۔''

كَالَّذِیْ (كَ. الَّذِی) مانند اس شخص کے ''ک'' کے معنی مثل، مانند یہ حرف تشبیہ ہے۔ یُنْفِقُ خرچ کرتا ہے، فعل مضارع واحد مذکر غائب (اَنْفَقَ، یُنْفِقُ، اِنْفَاقٌ) خرچ کرنا، مَالَهٗ (مَالَ. هٗ) مال، اپنا، رِئَآءَ ریاکاری (دکھلاوے) کے لیے، دراصل یہ لفظ (رَأَی، یَرٰی) دیکھنے سے ہے، رُؤیت ہلال نئے چاند کو دیکھنا، الْمِرْآةُ، آئینہ، الرِّیَاءُ، دکھاوا، ریاکاری، نفاق، تصنع، الَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ یعنی جو شخص خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے، وَلَا یُؤْمِنُ اور وہ نہیں ایمان لاتا، بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''(یعنی جس شخص کا اللہ اور آخرت پر ایمان ہی نہیں ہے) یہ شخص صدقہ کے نفسِ اجر وثواب ہی کو ضائع کر کے رہتا ہے۔ دو صورتیں الگ الگ بیان ہوئی ہیں، دونوں کا فرق ملحوظ رہے، پہلی صورت میں خطاب

اہل ایمان سے ہے، نفس صدقہ تو ان لوگوں کا قبول ہو جائے گا لیکن احسان جتلانے یا اذیت پہنچانے سے ترقی درجات اور اضافہ اجر سب سلب ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں ذکر اہل کفر کا ہے، یہ جب اللہ اور آخرت پر ایمان ہی سے محروم ہیں تو ان کے صدقہ وخیرات سے بظاہر جو کچھ بھی مقصود ہو، سب کا حاصل دنیا ہی ہوگا، ایسوں کو اجر کس چیز کا؟ رضائے الٰہی کی طلب تو کسی درجہ میں بھی ان کے عمل کا جز نہیں۔''

(تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا﴾

(تو ایمان سے خالی شخص) کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سے مٹی پڑی ہو، اور اس پر زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے۔

فَمَثَلُهٗ (فَ.مَثَلُ.ہٗ) پس اس کی مثال، كَمَثَلِ (كَ.مَثَلِ) جیسے مثال (کسی)، صَفْوَانٍ، صاف پتھر کی، صَفَا یا صَفْوان، صاف اور چکنا پتھر، عَلَيْهِ (عَلٰى.ہِ) اوپر، اس (کے) یعنی اس چکنے پتھر پر، تُرَابٌ مٹی (پڑی ہو) فَاَصَابَهٗ (فَ.اَصَابَ.ہٗ) پس، پہنچے، اس کو، ہٗ کی ضمیر واحد مذکر غائب، چٹان یا پتھر کی طرف جاتی ہے (اَصَابَ، يُصِيْبُ، اِصَابَةً) پہنچنا، اَلْمُصِيبَةُ، آفت، مصیبت اردو میں استعمال ہوتا ہے، وَابِلٌ، زور کی بارش، بڑے قطروں والی بارش رَجُلٌ وَابِلٌ سخی اور فیاض آدمی، جو بہت زیادہ مال لٹائے۔ اس سے لفظ وبال ہے جس کے معنی خرابی، فساد، سختی، مصیبت، بوجھ، برا انجام جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے:

فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا (الطلاق ۶۵:۹) ''(نافرمانوں نے) اپنے کیے کا مزہ چکھ لیا۔''

اَخْذًا وَّبِيْلًا کا مطلب ہے سخت پکڑ، جیسا کہ قرآن میں آتا ہے: فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا (المزمل ۷۳:۱۶) ''(فرعون نے رسول کی بات نہ مانی) تو ہم نے اس کو بڑی سختی سے پکڑ لیا۔''

اس تشبیہ کا حاصل یہ ہے کہ کافر اسی طرح اپنے آپ کو قیامت کے دن ہر خیر وخیرات کے اجر سے محروم پائیں گے۔ ان کا انفاق مال حقیقۃً کسی صدقہ وخیرات کے ضمن میں آتا ہی نہیں، یہ بات بتلا کر درحقیقت مسلمانوں کو ریا (دکھلاوے) سے روکنا ہے کہ ریا کاری کفار کا عمل ہے مسلمانوں کا نہیں، ان کا تو ہر ہر عمل اخلاص پر مبنی ہونا چاہیے اور ان کے دل سے یہ صدا نکلنی چاہیے:

اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام ۶:۱۶۲) ''بلاشبہ میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیّت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔''

﴿لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا، وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾

''یہ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کرسکیں گے اور اللہ ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔''

لَا يَقْدِرُوْنَ نہیں وہ قدرت رکھتے (صلہ اور بدلہ حاصل کرنے کی) فعل مضارع جمع مذکر غائب (قَدَرَ، يَقْدِرُ، قُدْرَةً) کسی کام کے کرنے کی طاقت واستطاعت رکھنا، قدر کرنا، رتبہ دینا، تعظیم کرنا، فیصلہ کرنا، رزق تنگ کرنا کے معنی قرآن حکیم میں آتے ہیں، لَيْلَةُ الْقَدْرِ، شب قدر، القادر اور القدیر، اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں، اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ عاجز نہیں ہے اور اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی معنوی طور پر قدرتِ کاملہ کے ساتھ متصف نہیں ہوسکتی، انسان کو اس نے کسی بات پر تھوڑی بہت قدرت عطا کی ہے، اور جب چاہے وہ اُس قدرت اور طاقت کو سلب کر لیتا ہے، القدیر بھی اسی کی صفت ہے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ اقتضائے حکمت کے مطابق جو چاہے کر سکے اور اس میں کمی بیشی نہ ہونے دے، اور یہ صرف اور صرف اُسی کی شان ہے۔

﴿لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ﴾ وہ (کفار) قدرت نہیں رکھتے کسی بات پر۔

مِّمَّا (مِنْ.مَا) اس چیز سے۔ جو، كَسَبُوْا، انہوں نے کمائی فعل ماضی جمع مذکر غائب (كَسَبَ، يَكْسِبُ، كَسْبًا) کمانا، اکٹھا کرنا، گناہ، بوجھ اٹھانا، (دنیا میں اعمال جمع کرنا)، یعنی ان کا خرچ کرنا محض ریا کاری ہے، ان کا انہیں کچھ فائدہ نہ ہوگا، ان کا یہ سب کیا کرایا اس طرح تباہ ہو جائے گا جس طرح صاف اور چمکدار پتھر پر سے بارش مٹی کو صاف کر دے۔ (نعوذ باللہ)

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ اور اللہ نہیں ہدایت دیتا، کافر لوگوں کو۔

وَاللّٰهُ اور اللہ، لَا يَهْدِى نہیں ہدایت دیتا (هَدَى يَهْدِى هِدَايَةً) ہدایت دینا، راہنمائی کرنا، ہدایت پر ثبات اور دوام عطا کرنا، نماز کی ہر رکعت میں ہم آقا و مولا سے فریاد کرتے ہیں: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، اے اللہ ہمیں صراط مستقیم پر قائم ودائم رکھ، الْقَوْمَ قوم، لوگ، الْكٰفِرِيْنَ کافر کی جمع کافرون اور مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے کافرین ہوا، راہ حق کو چھوڑنے والے، ناشکرے۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) اگر خیرات وصدقات سے غرباء ومساکین کی مدد نہ ہو سکے تو خوش اسلوبی سے معذرت کر دی جائے۔

۲) صدقہ و خیرات کرنے کے بعد دل آزاری اور ایذا رسانی سراسر اجر وثواب سے محرومی ہے، ضرورت مند پر احسان دھرنے یا اسے زبان یا ہاتھ سے تکلیف پہنچانے سے دیا دلایا سب اکارت جاتا ہے۔

۳) دکھلاوا اور ریاکاری اللہ تعالیٰ کے یہاں قطعی طور پر نامقبول ہے یہ صرف صدقات وزکوٰۃ کے بارے میں نہیں بلکہ جملہ عبادات میں انتہائی ناپسندیدہ بات ہے۔

۴) پتھر پر بیج بونے کی یہ مثال ریاکاری کے بالکل مناسب حال ہے۔ جس طرح پتھر میں بویا ہوا اچھے سے اچھا بیج بھی ناکارہ ہو جاتا ہے اسی طرح ریاکار خواہ مال ودولت کے انبار ہی لٹا ڈالے، اسے اس کے ثمرات و برکات اللہ کے یہاں ہرگز نہیں مل سکتے، وہاں اگر خلوص نیت سے چند سکے بھی دے ڈالے جائیں تو لامحدود اجر وانعام کا باعث بنتے ہیں ایسے ہی جس طرح ہلکی سی پھوار بھی کسی باغ کو شاداب کر سکتی ہے۔

۵) ریاکاری مؤمن کی نہیں کافر کی پہچان ہے، افسوس کہ ہمارے یہاں شادی غمی کے مواقع پر ریاکاری اور دکھلاوے سے بہت کچھ ہوتا ہے، رسم ورواج پر بہت سارو پیہ ریاکاری سے ضائع وبرباد ہو جاتا ہے، امیروں پر تو دولت نچھاور کی جاتی ہے جبکہ غرباء ومساکین کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، لوگوں کے پیش نظر یہ بات ہوتی ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو لوگوں میں ناک کٹے گی، لوگوں کو خوش کرنے کے لیے اللہ کی ناراضی حاصل کی جاتی ہے، یہ آیات مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ مہیا کرتی ہیں۔

.....

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲۶۵)

(بخلاف اس کے) جولوگ اپنا مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دل کے پورے ثبات وقرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک بلند (قطعہ) زمین پر اُگایا ہوا باغ ہو، اگر (اس پر) زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے، اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس (کی شادابی) کے لیے کافی ہو جائے، اور (یاد رکھو) تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں، کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس لہلہاتا باغ ہو، وہ نہروں سے سیراب، کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھل پھول سے لدا ہو، پھر ایسا ہو کہ جب بڑھاپا آ جائے اور اس کے کمسن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں، تو اچانک ایک جھلستی ہوئی آندھی چلے اور (آن کی آن میں) باغ جل کر ویران ہو جائے، اللہ ایسی ہی مثالوں کے پیرایہ میں تم پر (حقیقت کی) نشانیاں واضح کرتا ہے تاکہ غور وفکر سے کام لو۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۪ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (۲۶۶)

﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾

اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں مال اپنے اللہ کی رضامندی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار (سے)۔

وَمَثَلُ، اور مثال، اَلَّذِیْنَ، ان لوگوں کی، اسم موصول ہے، یُنْفِقُوْنَ (جو) خرچ کرتے ہیں، فعل مضارع جمع مذکر غائب (اَنْفَقَ، یُنْفِقُ، اِنْفَاقٌ) خرچ کرنا، انفاق فی سبیل اللّٰہ، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ اَمْوَالَھُمُ (اَمْوَالَ. ھُمُ) مال، اپنے، اِبْتِغَآءَ، مصدر، کسی بات کا چاہنا، طلب کرنا، (اِبْتَغٰی، یَبْتَغِی، اِبْتِغَاءً) چاہنا، باب افتعال، مَرْضَاتِ اللّٰہِ، رضامندی اللہ تعالیٰ (کے لیے) Who spend their properties to seek Allah's pleasure. (رَضِیَ، یَرْضٰی، رِضًی) چاہنا، طلب کرنا، وَتَثْبِیْتًا اور پختگی (پیدا کرنے کے لیے) اس کا مادہ (ث ب ت) ہے (ثَبَتَ، یَثْبُتُ، ثَبَاتًا) جمنا، ٹھہرنا، ثابت قدم رہنا، مضبوط و مستحکم ہونا، ثابت قدمی (استقلال) اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ اور اپنے نفوس میں پختگی (ایمان) پیدا کرنے کے لیے۔

گویا کہ بندہ مومن کا ہر نیک عمل حصول اجر اور تقویت ایمان کا باعث ہوتا ہے، اس سے دل میں ٹھہراؤ اور مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یہ معنی تو ظاہر ہی ہیں کہ وہ خرچ اس لیے کرتے ہیں کہ کمالِ ایمان، ثابت قدمی اور اطمینان حاصل ہو، ایک دوسرے معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ ان کے دل اللہ کے کرم اور ثواب پر مطمئن ہیں اور وہ صرفِ مال کو نہ نقصان سمجھتے ہیں نہ باعث گرانی۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

جیسا کہ اہل ایمان کا ذکر اس آیہ مبارکہ میں آیا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات ۴۹:۱۵) ''حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں مالوں سے جہاد کیا وہی سچے لوگ ہیں۔''

﴿کَمَثَلِ جَنَّۃٍ م بِرَبْوَۃٍ اَصَابَھَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُکُلَھَا ضِعْفَیْنِ﴾

(اہل ایمان کا مال خرچ کرنا ایسا ہے) جیسا کہ ایک باغ ہو جو (زمین کی) بلندی پر ہے، اسے زوردار

مینہ پہنچے تو وہ اپنا دوگنا پھل لائے۔

كَمَثَلِ (كَ.مَثَلِ) جیسے۔ مثال، جَنَّةٌ ایک باغ کی، اس کی جمع جنات آتی ہے، بِرَبْوَةٍ (بِ.رَبْوَةٍ) اوپر، بلندی کے، سطح زمین سے بلند جگہ کو کہتے ہیں، اس کا مادہ (ر ب و) ہے، (رَبَا، يَرْبُوْ، رَبْوًا اور رِبَاءً) بڑھنا، اضافہ ہونا، قرآن حکیم میں آتا ہے: وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ''تم زمین کو مردہ پاؤ گے، لیکن جب ہم اس پر پانی برسا دیں گے تو اس میں جان پڑے گی اور وہ بڑھ جائے گی (پھل پھول جائے گی)۔''

الرِّبَا، زیادتی، اضافہ، ناجائز نفع، بیاج، سود جسے اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ اَصَابَهَا۔ (اَصَابَ.هَا) پہنچا۔ اس (باغ کو) اَصَابَ، ماضی واحد مذکر غائب (اَصَابَ، يُصِيْبُ، اِصَابَةً) پہنچنا، مصیبت، وہ تکلیف جس میں کوئی انسان مبتلا ہوتا ہے۔ وَابِلٌ، أَشَدُّ المَطر (غریب القرآن، ابن قتیبہ) شدید بارش، فَآتَتْ (فَ.آتَتْ) پس۔ لایا (باغ) (اَتٰى، يَأْتِيْ، اِتْيَانٌ) لانا، اُكُلَهَا (اُكُلَ.هَا) پھل، اپنا (اَكَلَ، يَأْكُلُ، اَكْلًا) کھانا، اَكَلَ الطَّعَامَ اس نے کھانا کھایا، اُكُلٌ، پھل، قرآن حکیم میں آتا ہے: اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَظِلُّهَا (الرعد ۱۳:۳۵) یعنی (جنت) کے پھل دائمی ہیں اور اس کا سایہ لازوال ہے۔ ضِعْفَيْنِ، دوگنا، تثنیہ ہے اس کا مفرد ضِعْفٌ، گنا۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''بارش باغ کو زندگی بخشتی ہے جس طرح کہ صدقہ مومن کے قلب کو زندگی بخشتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ صدقے سے قلب کا ارتقا ہوتا ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بڑھتا ہے، مومن کے مال کی بڑھوتری ہوتی ہے اور اللہ جتنا چاہتا ہے، اُسے بڑھاتا چلا جاتا ہے، نیز انفاق سے مسلم جماعت کی زندگی میں ارتقا و نشو و نما ہوتا ہے اور وہ درست اور صالح ہو جاتی ہے۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿فَإِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ﴾

اگر زور کی بارش نہ ہو تو پھوار (ہی کافی ہوتی ہے)۔

فَإِنْ (فَ.اِنْ) پس، اگر، لَّمْ يُصِبْهَا نہ پہنچے۔ اس کو (يُصِبْ.هَا) پہنچے۔ اس (باغ کو) هَا کی ضمیر

جنّة (باغ) کی طرف جاتی ہے، وَابِلٌ تیز بارش، فَطَلٌّ (فَ.طَلٌّ) تو، پھوار (کفایت کرتی ہے) الطَّلُّ (اَضعَفُ المَطر) پھوار، ہلکی بارش۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

''رَبْوَۃٌ، (ربو) سے مشتق ہے جس کا معنیٰ بڑھنا اور پھلنا پھولنا ہے اور ربوہ سے مراد ایسی زمین ہے جس کی سطح عام زمین سے قدرے بلند ہو اور قدرے نرم ہو، ایسی زمین عموماً سرسبز اور شاداب ہوتی ہے، پنجابی زبان میں اِسے ''مَیرا'' زمین کہتے ہیں اور وابل یا زوردار بارش سے مراد انتہائی خلوص نیت سے اللہ کی رضا کے لیے اور اپنے دل کی پوری پوری خوشی سے مال خرچ کرنا ہے اور پھوار سے مراد ایسی خیرات ہے جس میں یہ دونوں باتیں موجود تو ہوں، مگر اتنے اعلیٰ درجہ کی نہ ہوں، دونوں صورتوں میں اجر وثواب تو ضرور ملے گا، مگر پہلی صورت میں جو اجر وثواب ملے گا وہ پچھلی صورت سے بہرحال کئی گنا زیادہ ہوگا۔'' (تیسیر القرآن، جلد اول)

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ اور (یاد رکھو) تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

وَاللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ، بِمَا (بِ.مَا) ساتھ اس بات کے۔ جو، تَعْمَلُوْنَ، تم کرتے ہو (عَمِلَ، يَعْمَلُ، عَمَلًا) کام کرنا، بنانا، تیار کرنا، مصروف ہونا، بَصِيْرٌ، اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، دیکھنے والا، باخبر، وہ انسان کے ظاہر و باطن سے باخبر ہے، اسے ہر ایک کے درجۂ اخلاص کا بھی پورا پورا علم ہے۔

﴿اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ﴾

''کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا ہو، جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں اور وہ ہر قسم کے پھل پھول سے لدا ہو۔''

أَيَوَدُّ (أَ.يَوَدُّ) کیا، چاہتا ہے، أَ کلمہ استفہام يَوَدُّ، چاہتا ہے فعل مضارع واحد مذکر غائب (وَدَّ، يَوَدُّ مَوَدَّةً) چاہنا، پسند کرنا، اَلْوَدُوْدُ، اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے، اپنے بندوں سے بے حد محبت رکھنے

والا، لفظ مودّت اور مروّت اردو زبان میں استعمال ہوتے ہیں، اَحَدُکُمْ (اَحَدُ. کُمْ) کوئی ایک۔تم میں سے، اَنْ یہ کہ، تَکُوْنَ ہو فعل مضارع واحد مؤنث غائب (کَانَ، یَکُوْنَ، کَوْنًا) ہونا، لَہٗ اس کے لیے، جَنَّۃٌ لہلہاتا گھنا باغ۔

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''جَنَّۃٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں اتنی کثرت سے درخت ہوں جو زمین کو ڈھانپ لیں، یا وہ باغ جس کے چاروں طرف باڑھ ہو، اور باڑھ کی وجہ سے باغ نظروں سے مستور ہو، جن اس مخلوق کا نام ہے جو نظر نہیں آتی، پیٹ کے بچے کو جنین کہا جاتا ہے کہ وہ بھی نظر نہیں آتا، دیوانگی کو جنون سے تعبیر کرتے ہیں کہ اس میں بھی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور جنت کو بھی اسی لیے جنت کہتے ہیں کہ وہ نظروں سے مستور ہے۔''

(احسن البیان)

مِّنْ نَّخِیْلٍ کھجوروں سے اس کا مفرد نَخْلَۃٌ ہے، اردو زبان میں نخلستان وہ جگہ ہوتی ہے جہاں کھجوروں کے جھنڈ ہوں۔ وَّاَعْنَابٍ اور انگوروں (کے درخت) اس کا مفرد عِنَبٌ ہے، تَجْرِیْ کہ جاری ہوں، فعل مضارع واحد مؤنث غائب (جَرَی، یَجْرِیْ، جَرَیَانٌ) جاری ہونا، جریان اردو میں مستعمل ہے کسی مائع چیز کا بہنا، مثلاً حادثے کی صورت میں مریض کے جریان خون کو پہلے روکنا چاہیے، مِنْ تَحْتِھَا، اس کے نیچے سے (تَحْتِ. ھَا) نیچے۔ اس کے۔ ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب جنۃ کی طرف جاتی ہے، اَلْاَنْھٰرُ، نہریں اس کا مفرد نَھْرٌ ہے، لَہٗ (لَ. ہٗ) واسطے۔ اس کے یعنی اس کے لیے فِیْھَا (فِیْ. ھَا) بیچ۔ اس کے یعنی اس باغ کے اندر، مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ، ہر قسم کے پھل ہوں، ثَمَرَۃٌ اس کا مفرد ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ پھول پھلواڑی اور باغ باغیچے کا یہ کتنا عمدہ تصور ہے۔

﴿وَاَصَابَہُ الْکِبَرُ وَلَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ﴾

پھر ایسا ہو کہ اسے بڑھاپا آ جائے اور اس کی کمزور اور ناتواں اولاد ہو۔

وَاَصَابَہُ اور پہنچ چکا ہو اس کو (اَصَابَ. ہٗ) پہنچے۔ اس کو، ہٗ کی ضمیر اس شخص کی طرف جاتی ہے جس کا باغ باغیچہ تھا، اَلْکِبَرُ بڑھاپا، وَلَہٗ (لَ. ہٗ) اور، واسطے، اس کے ہو، ذُرِّیَّۃٌ اولاد چھوٹے بچے، ضُعَفَآءُ کمزور،

ناتواں ضعف اور ضعیف، کمزور اور بوڑھا اردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں، یہاں پر اس شخص کی انتہائی بے بسی کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اس پر بڑھاپا ہے اور اس کے بچے بھی ناتواں ہیں۔

﴿فَاَصَابَهَآ اِعۡصَارٌ فِيۡهِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ﴾

اس شخص کے (باغ) پر ایک جھلستی ہوئی آندھی آئے، پس جل جائے (وہ باغ)۔

فَاَصَابَهَآ (فَ. اَصَابَ. هَآ) پس، پہنچا، اس کو'ھا' کی ضمیر باغ کی طرف جاتی ہے، اِعۡصَارٌ بگولہ، سخت گرم ہوا، اس کا مادہ (ع ص ر) ہے، عَصَر، یَعۡصِرُ، عَصۡرًا، عرق یا رس یا تیل وغیرہ نکالنا جیسے عَصَرَ الفاکھۃَ اس نے پھلوں کا رس نکالا، عَصَرَ الثَّوبَ، کپڑے کو نچوڑنا، عَصَرَ الحَرُّ العُوۡدَ، گرمی کا شاخ کو سکھا دینا، اِلۡاِعۡصَارُ، بگولا (انتہائی تیز ہوا جو گرد اڑاتی ہوئی عمود کی شکل میں آسمان کی طرف اٹھتی ہے)، ہوا کا سخت جھونکا طوفان، آندھی۔ (القاموس الوحید) فِيۡهِ (فِيۡ. هِ) بیچ۔ اس کے (عین اس اندھی کے اندر) نَارٌ، آگ تھی، فَاحۡتَرَقَتۡ (فَ. احۡتَرَقَتۡ) پس، وہ جل گیا (باغ)۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ﴾

اسی طرح اللہ بیان کرتا ہے تمہارے لیے نشانیاں تاکہ تم غور و فکر کرو۔

كَذٰلِكَ (كَ. ذٰلِكَ) اسی۔ طرح، يُبَيِّنُ اللّٰهُ بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ، مضارع واحد مذکر غائب (بَيَّنَ، يُبَيِّنُ، تِبۡيَانًا) بیان کرنا، لَكُمُ (لَ. كُمُ) واسطے۔ تمہارے، الۡاٰيٰتِ نشانیاں، اس کا مفرد آيَةٌ ہے، قرآن کی ہر آیت اس کی نشانی ہے، اور انفس و آفاق میں اس کی ان گنت نشانیاں ہیں، لَعَلَّكُمۡ (لَعَلَّ. كُمۡ) تاکہ۔ تم، تَتَفَكَّرُوۡنَ غور و فکر کرو فعل مضارع جمع مذکر حاضر (تَفَكَّرَ، يَتَفَكَّرُ، تَفَكُّرًا) غور و فکر سے کام لینا۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) اخلاص، اعمال کو وزنی اور قیمتی بنا دیتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہمارا ہر ہر عمل صرف اور صرف مولا و مالک کی رضا کے لیے ہو، اس مثال میں صدقہ و خیرات کو بارش سے اور زمین کو دل سے تشبیہ دی گئی ہے، اگر

زمین ٹھیک ہے یعنی دل میں اخلاص ہے تو جس قدر بھی عمل خیر کیا جائے گا خیر و برکت کا باعث بنے گا اور اس کا صلہ اجر عظیم ہوگا، اگر زمین درست نہیں ہے یعنی اخلاص نہیں ہے، تو پھر کتنی ہی دکھاوے کی خیر خیرات کی جائے، سب رائیگاں جائے گی اور اس کا نتیجہ نقصان اور محرومی ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ اخلاص چھوٹی سی نیکی کو اجر میں بڑا بنا دیتا ہے جبکہ ریا کاری میں بڑی سے بڑی نیکی بھی ضائع و برباد ہو جاتی ہے، بعینہ کہ زمین زرخیز ہو تو اس میں شبنم یا ہلکی پھوار ہی اس کی شادابی کا باعث بن جاتی ہے جبکہ بنجر اور ویران زمین کے لیے تیز بارش بھی بے سود رہتی ہے۔

۲) بھلا کون اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنی ساری عمر کسی باغ کو لگانے میں صرف کر ڈالے اور وہ سمجھے کہ اس کی پیداوار بڑھاپے میں کام آئے گی، لیکن جب بڑھاپا آئے تو دیکھے کہ سارا باغ جل کر ویران ہو گیا ہے، یہی حال اس انسان کا ہے جو زندگی بھر نمود و نمائش، دکھاوے اور ریا کاری سے نیکیاں کرتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ عاقبت میں کام آئیں گی، لیکن جب عاقبت کا دن آئے گا تو یہ بات دیکھ کر پریشان ہو جائے گا کہ اس کی ساری محنت اکارت اور رائیگاں گئی، مگر اس دن کا پچھتاوا کسی کام نہ آ سکے گا، قرآن نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے: وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (الفرقان ۲۵:۲۳) ''اور جو کچھ انہوں نے کیا دھرا ہوگا، ہم ادھر توجہ کریں گے، تو اسے اڑتا ہوا غبار بنا دیں گے۔''

ایک اور مقام پر اس طرح فرمایا: اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (الکھف ۱۸:۱۰۴،۱۰۵) ''وہ لوگ، جنہوں نے اپنی کوششیں دنیا کی زندگی کے لیے کھپا دیں، پھر سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کے حضور (جوابدہی) کا انکار کیا، لہٰذا ان کے اعمال برباد ہو جائیں گے۔ روز جزا ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (۲۶۷) اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۶۸)	اے ایمان والو! جو کچھ تم نے حق حلال کی روزی حاصل کی ہے، یا جو کچھ ہم تمہارے لیے زمین میں پیدا کر دیتے ہیں اس میں سے (ہماری راہ میں) عمدہ عمدہ چیزیں خرچ کیا کرو، اور خراب خراب چیزیں خرچ کرنے کا ارادہ نہ کیا کرو حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمھیں دے، تو تم ہرگز اسے لینا گوارا نہ کرو گے اِلّا یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ، تمھیں جان لینا چاہیے کہ اللہ بے نیاز ہے اور وہی حمد کے لائق ہے، شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور برائیوں اور بے حیائیوں کی ترغیب دیتا ہے مگر اللہ تمھیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے، اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو خرچ کرو عمدہ عمدہ چیزیں جو تم نے کمائیں اور اس میں سے جو نکالا ہم نے تمہارے لیے زمین میں سے۔

يٰٓاَيُّهَا حرف ندا (اے) الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا، وہ لوگ جو ایمان لائے منادی (یعنی جسے آواز دی جائے) کہلاتا ہے، اَنْفِقُوْا، خرچ کرو، مِنْ طَيِّبٰتِ پاکیزہ (اچھی اچھی) چیزوں میں سے، طیّب اس چیز کو کہا جاتا ہے جو حق حلال، محنت مزدوری سے حاصل کی جائے اور فی نفسہٖ وہ جائز اور حلال بھی ہو۔ كَسَبْتُمْ ماضی جمع مذکر حاضر (كَسَبَ، يَكْسِبُ، كَسْبًا) کمانا، وَ مِمَّآ (مِن.مَا) اور، اس میں سے جو، اَخْرَجْنَا ہم نے

نکالا ماضی جمع متکلم، (یعنی اللہ تعالیٰ نے) اللہ کے لیے جمع کا صیغہ بطور عزت آتا ہے، یہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ مفرد کے لیے جمع کا صیغہ عزت وتکریم کو ظاہر کرتا ہے، وہ تنہا اس کائنات کا خالق و مالک ہے، **لَكُمْ، ای لِمَنافِعِكُم**، تمہارے نفع اور فائدے کے لیے **مِّنَ الْاَرْضِ** زمین سے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''یعنی نباتات، معدنیات وغیرہ، **مِنَ الْاَرْضِ**، اس کے تحت زراعت، باغبانی، کان کنی (نیز سمندروں اور دریاؤں سے فشنگ) وغیرہ کی تمام شاخیں آ گئیں، جس طرح **مَا كَسَبْتُمْ** کے تحت تجارت، کاروبار، (محنت مزدوری، ملازمت) کے اقسام آ گئے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

اَلطَّعَامُ الطَّيِّبُ اس کھانے کو کہا جائے گا جو جائز طریقے سے حاصل کیا جائے اور جائز جگہ سے جائز اندازہ کے مطابق لیا جائے، کیونکہ جو غذا اس طرح حاصل کی جائے، وہ دنیا اور آخرت دونوں میں خوشگوار ثابت ہوگی ورنہ دنیا کی خوشگوار چیزیں آخرت میں نقصان دہ ثابت ہوں گی اِسی بنا پر قرآن طیب چیزوں کے کھانے (اور خرچ کرنے کا) حکم دیتا ہے۔'' (مفردات القرآن)

اسلام نے کسب حلال کے ساتھ ساتھ رزق حلال کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور اسی سے اعمال صالحہ کی توفیق ملتی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: **كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا** (المومنون ۲۳:۵۱) ''کھاؤ پاکیزہ چیزیں اور عمل کرو صالح۔''

اب اس آیہ مبارکہ میں حکم ہو رہا ہے کسب حلال اور رزق حلال میں سے بھی عمدہ عمدہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کیا کرو۔

﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ﴾

اور نہ قصد کرو خراب چیز کا (باسی اور ردی کا) اس میں سے کہ خرچ کرو گے تم (دراں حالیکہ) تم خود نہیں لینے والے اس (چیز) کو اِلّا یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔

وَلَا تَيَمَّمُوا اور نہ قصد کرو، اس کا مادہ (ی م م) (تَيَمَّمَ، يَتَيَمَّمُ، تَيَمُّمًا) ارادہ کرنا جیسا کہ نماز کے لیے کہتے ہیں، **تَيَمَّمَ لِلصَّلٰوةِ**، نماز کے لیے تیمّم کرنا، پاکیزہ اور صاف مٹی سے منہ اور ہاتھوں پر مسح کرنا،

اَلْخَبِیْثُ ردی اور ناکارہ چیز کو کہتے ہیں۔(مفردات القرآن) اس میں اشیاء کے علاوہ جھوٹی باتیں اور برے کام سب آجاتے ہیں (اور بری چیز کا ارادہ نہ کرو)۔

مِنْهُ (مِنْ.هُ) کہ اس میں سے تُنْفِقُوْنَ، تم خرچ کرنے لگو فعل مضارع جمع مذکر حاضر (اَنْفَقَ، یُنْفِقُ، اِنْفَاقٌ) خرچ کرنا، وَلَسْتُمْ اور نہیں ہو تم فعل ماضی جمع مذکر حاضر، اس کا واحد مذکر غائب لَیْسَ ہے، یہ غیر منصرف فعل ہے جس سے مضارع کے صیغے نہیں بنتے۔

بِاٰخِذِیْهِ (بِ.اٰخِذِیْهِ) لینے والے، اس کے، اٰخِذٌ اسم فاعل واحد مذکر، لینے والا (اَخَذَ، یَأْخُذُ، اَخْذًا) پکڑنا، لینا، اٰخِذِیْهِ میں ہٖ کی ضمیر اس ردّی کی طرف جاتی ہے جسے محض خانہ پوری کے لیے صدقہ وخیرات میں دے دیا گیا ہو، اِلَّا مگر، اَنْ یہ کہ، تُغْمِضُوْا آنکھیں بند کرلو (چشم پوشی کرو) فعل مضارع جمع مذکر حاضر (اَغْمَضَ، یُغْمِضُ اِغْمَاضٌ) باب افعال ہے آنکھ بند کرنا، تساہل برتنا، دیکھ کر ٹال جانا، نظرانداز کردینا، تُغْمِضُوْنَ تھا، اَنْ کی وجہ سے نون جمع کا گر گیا، یعنی ایسی ردّی اور ناکارہ چیز صدقہ وخیرات کر رہے ہو کہ اگر ایسی ہی چیز تمھیں کوئی اور شخص پیش کرے تو ناک بھوں چڑھا کر اسے دیکھو بھی نہیں۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ﴾ اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز اور حمد کے لائق ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''اس آیہ مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں پاکیزہ چیزیں دو، گری پڑی (ردی) اشیاء کا تصدق کسی طرح موزوں نہیں اس لیے کہ جب تک اللہ کی راہ میں دینے سے دل تکلیف محسوس نہ کرے نفس اور ضمیر میں ایک جنگ بپا نہ ہو، نفس کی اصلاح نہیں ہوسکتی اور نہ بخل دور ہوسکتا ہے، یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ربّ السّمٰوٰت والارض ہے، جس کے خزانے معمور ہیں، ہمارے صدقات کا قطعاً محتاج نہیں، وہ تو غنی ہے، بے نیاز ہے، اس لیے دیکھنا یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں دے کر ہمیں کیا ملتا ہے؟ کیا طبیعت کا بخل دور ہو گیا ہے؟ کیا دل میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے آمادگی کا احساس بڑھ گیا ہے یا کم ہوا ہے؟

پھر فرمایا کہ تم بھی دنیا میں تحائف وصول کرتے ہو، تمھیں بھی چیزیں دی جاتی ہیں، ناقص اور نکمی چیز کو تم اپنے لیے ہرگز پسند نہیں کرتے، پھر اللہ تعالیٰ کے لیے تم معمولی اور غیر ضروری اشیاء کیوں پسند کرتے ہو؟

جس چیز کی تمھیں ضرورت نہیں، اس کی اللہ تعالیٰ کو کیا حاجت ہے؟

﴿اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَیَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَ فَضۡلًا﴾

شیطان تمھیں ڈراتا ہے فقر سے اور حکم دیتا ہے بے حیائی کا۔ اور اللہ امید دلاتا ہے اپنی بخشش اور فضل کی، اور اللہ بڑا ہی وسعت والا اور جاننے والا ہے۔

اَلشَّیۡطٰنُ، گمراہ کن، شریر اور خبیث روح، ہر مفسد و سرکش انسان ہو یا جن۔ (القاموس الوحید)

قرآن حکیم کی آخری سورت الناس میں ان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی گئی ہے اور اس میں جنات اور انسانوں دونوں کا ذکر آیا ہے: اَلَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ، مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ. جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے (خواہ وہ) جنات سے ہو یا انسانوں سے۔ (اللہ تعالیٰ ان دونوں سے بچا کر اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھے)۔

مولانا محمد حنیف ندویؒ لکھتے ہیں:

''جب اللہ کی راہ میں خرچ کیجیے، شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے اور کہتا ہے کیوں مال ضائع کرتے ہو، اس طرح تم غریب ہو جاؤ گے، البتہ اگر فضول خرچی اور اِسراف کا سوال ہو یا برائی کی اعانت کا موقع ہو تو اس وقت شیطان کہتا ہے کہ دل کھول کر کیوں خرچ نہیں کرتے، کیا چند روپے عزت و ناموس کے لیے خرچ کر دینے سے تم مفلس و قلاش ہو جاؤ گے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت و فضل کا وعدہ ہے، وہ کہتا ہے کہ تم میری راہ میں خرچ کرو، میں تمہارے مال و دولت میں برکت دوں گا میں تمہارے لیے رزق کے مواقع پیدا کروں گا، جس قدر تم مجھے دو گے، میں اس سے کہیں زیادہ تمھیں دوں گا۔ (حالانکہ سب کچھ اُس کی دین ہے) غرضیکہ شیطان افلاس پر آمادہ کرتا ہے اور اللہ فضل و رحمت پر، دیکھ لو، وہ لوگ جو اللہ کی سیدھی سادی شریعت پر چلتے ہیں، عیش و کامرانی کے لطف اٹھاتے ہیں (اس کے برعکس) جو رسوم و رواج کے پیچھے دوڑتے ہیں، تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔'' (سراج البیان، جلد اول)

آیات مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) انفاق فی سبیل اللہ کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مال دو جو جائز طریق سے کمایا گیا ہو، اور اس میں

سے بھی وہ جو بہترین اور تمہارا پسندیدہ ہو، قرآن حکیم نے کتنی بلند بات کی ہے: لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (ال عمران ۳:۹۲) ''مؤمنو! تم نیکی کو (ہرگز) نہیں پہنچ سکتے، جب تک اپنی وہ چیزیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔''

ایسا خرچ کیا ہوا مال یقیناً حیات قومی کے لیے زندگی بخش ہوگا، غرباء و مساکین میں عزتِ نفس کا شعور بلند ہوگا۔ امراء و اغنیاء کے خلاف ان کے جذبات نفرت اور بغض کے نہیں بلکہ محبت اور مودّت کے پیدا ہوں گے۔ اس طرح ایک فلاحی معاشرے کی داغ بیل پڑے گی جہاں ہر طرف مہر و محبت کے پھول کھلتے رہیں گے اور پوری قوم بنیان مرصوص کی طرح جڑی رہے گی۔ سب سے بڑھ کر ان کا مولا و مالک ان سے خوش ہو کر انہیں آخرت میں لازوال اجر سے نوازے گا۔

۲) مال و دولت سے محبت، اس کے جمع کرنے کی طرف رغبت، اسے بچا بچا کر صرف کرنے کی طرف رجحان انسان کی کمزوری ہے، اِس لیے انسان کے دل میں شیطان وسوسے ڈالتا رہتا ہے کہ دیکھو اتنا مال اگر تم نے غرباء و مساکین کو دے ڈالا تو تمہارا بنک بیلنس کم ہو جائے گا پھر نہ معلوم آئندہ یہ واپس بھی ملے گا یا نہیں، اس سے تم فلاں ماڈل کی نئی گاڑی خرید سکتے ہو، فلاں پلاٹ اور مکان خرید سکتے ہو وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان خیالات اور وسوسوں کو ختم کرنے کے لیے یہ بتایا کہ یہ تعلیم شیطان کی ہے، اللہ تعالیٰ بے نیاز اور فضل و رحمت والا ہے، جو کچھ تمہارے پاس ہے، وہ بھی اسی نے دے رکھا ہے اور آئندہ بھی وہی عطا کرے گا بلکہ دنیا میں بھی خیر و برکت سے نوازے گا اور آخرت میں لازوال اجر سے بہرہ ور فرمائے گا۔

۳) افسوس کہ مسلمانوں نے ان قیمتی نصائح کو فراموش کر دیا۔ مہربان خالق و مالک کے احکام کو تو پس پشت ڈال دیا، اور باغی اور سرکش شیطان کی راہ کو اختیار کر لیا، نمود و نمائش کے لیے شادی بیاہ کے مواقع پر دریا دل بن گئے مگر غرباء اور مساکین کو دینے کا وقت آیا تو خراب اور بچا کھچا کھانا دے ڈالا، اپنے بچوں کی شادی بیاہ پر صرف چراغاں اور آتش بازی پر ہزاروں روپے خرچ کر ڈالے مگر کسی غریب کی بیٹی کے لیے چند روپے بھی نکالنے مشکل ہو گئے۔

۴) امت مسلمہ نے مجموعی طور ان قیمتی نصائح کو نظر انداز کر رکھا ہے، عربوں نے اپنی دولت سے عیار و مکار امریکہ کو تو فائدہ پہنچایا مگر اپنی غریب مسلمان ریاستوں کو نظر انداز کر دیا اور اس شاطر نے اسی دولت

سے خوفناک اسلحہ کے انبار لگا دیے اور اسے ان ہی پر بے دریغ استعمال کیا، فاعتبروا یا اولی الابصار۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲۶۹) وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْنَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۲۷۰) اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲۷۱)	(اللہ تعالیٰ) جسے چاہتا ہے ''حکمت'' عطا فرماتا ہے اور جسے ''حکمت'' سے نواز دیا گیا اسے بہت بڑی خیر سے نواز دیا گیا اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں، جو کچھ بھی تم (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو یا کوئی نذر مانو اللہ اسے خوب جانتا ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں، اگر تم صدقات و خیرات ظاہراً دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی ضرورتمندوں کو تو وہ خوب تر ہے اور (اس کے نتیجے میں) اللہ تمہارے گناہوں کو دور کر دے گا.....اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ﴾ وہ دیتا ہے ''حکمت'' جسے چاہتا ہے۔

يُؤْتِيْ وہ عطا کرتا ہے فعل مضارع واحد مذکر غائب (اٰتَی، يُؤْتِي، اِيْتَاءٌ) عطا کرنا، دینا، اَلْحِكْمَةَ، دانائی، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: ''حِکْمَت'' کے معنی علم و عقل کے ذریعہ حق بات دریافت کر لینے کے ہیں۔'' (مفردات القرآن) اور یہ بہت بڑی نعمت ہے جسے قرآن حکیم میں خیر کثیر سے یاد کیا گیا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ یہ عطا فرما دے وہ بہت بڑی نعمت سے نوازا گیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''الحکمۃ، جس کے مقابل دنیا کی کوئی اور نعمت نہیں، حکمت کی تشریحیں بہت سی کی گئی ہیں، لیکن بہترین اور جامع ترین تشریح یہ ہے کہ وہ امورِ دین میں فہم صحیح کا نام ہے اور اس فہم صحیح میں بخل سے بیزاری اور معارف میں توازن بھی شامل ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾

اور جو کوئی نوازا گیا حکمت سے پس وہ نوازا گیا خیر کثیر سے۔

وَمَنْ اور جو کوئی، **يُّؤْتَ** دیا گیا۔ فعل مضارع مجہول واحد مذکر غائب، **الْحِكْمَةَ** دانائی، دینی بصیرت، **فَقَدْ** (فَ. قَدْ) پس تحقیق، **اُوْتِيَ** دیا گیا، ماضی مجہول واحد مذکر غائب، **خَيْرًا كَثِيْرًا**، خیر کثیر، بہت بڑی بھلائی۔

﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ اور نہیں نصیحت پکڑتے مگر اہل دانش ہی۔

وَمَا اور نہیں، **يَذَّكَّرُ** نصیحت حاصل کرتے، **اِلَّا** مگر، **اُولُوا الْاَلْبَابِ** اس کا مفرد لُبٌّ، مغز و جوہر عقل اور بادام واخروٹ کی گری کو بھی کہتے ہیں۔ (القاموس الوحید) اُولُوا کسی صلاحیت اور اختیار کا مالک ہونے پر بولا جاتا ہے جیسے: **اُولُوا الْعِلْم**، اہل علم، اولوا الامر، اہل امر، یعنی حکمران، عام زبان میں اس کا معنی ''والے''، ''اہل علم'' کے بجائے ''علم والے'' اور ''اہل امر'' کی بجائے ''اختیار والے'' کیا جائے۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''اِسراف وامساک میں فرق محسوس کرنا، بخل وسخاوت میں تفاوت جاننا اور ہر برائی کے نقصانات اور ہر نیکی کے فوائد کا علم رکھنا حکمت ہے۔ عقلمند وہ لوگ ہیں جو دنیا کی بے ثباتی و بے وقعتی اور آخرت کی اہمیت و حرمت (عزت) کو جانتے ہیں، حکیم ہیں اور سمجھ دار ہیں، اور وہ جو اپنی تگ و دو صرف دنیا تک محدود رکھتے ہیں، بے وقوف ہیں۔ قرآن حکیم حکمت کو پسند کرتا ہے، اُس کے مخاطب بھی سمجھدار لوگ ہیں جو نفع نقصان پر گہری نظر رکھتے ہیں، بے پروا اور بے خوف انسان اپنے متعلق کچھ نہیں سوچ سکتا۔ اس لیے اس سے کوئی توقع ہی نہیں رکھنی چاہیے، قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ جسے دانش عطا ہو، وہ گویا دنیا کی بہترین نعمتوں سے بہرہ ور ہے اور جو حکیمانہ مزاج نہیں رکھتا، وہ اگر دنیا جہان کی چیزیں بھی رکھتا ہو تو حقیقی مسرت سے محروم

ہے۔'' (سراج البیان، جلد اول)

﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْنَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾

''جو کچھ بھی تم (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو یا کوئی نذر مانو تو اللہ اسے خوب جانتا ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔''

وَمَآ، اور جو ما موصولہ اَنْفَقْتُمْ، تم خرچ کرو، فعل ماضی جمع مذکر حاضر (اَنْفَقَ، يُنْفِقُ، اِنْفَاقٌ) خرچ کرنا مِنْ نَّفَقَةٍ وہ مال جو ضروریات زندگی پر خرچ کیا جائے اَوْ، یا نَذَرْتُمْ تم منت مانو، فعل ماضی جمع مذکر حاضر (نَذَرَ، يَنْذُرُ، نَذْرًا) کوئی چیز اپنے اوپر لازم کر لینا، نذر ماننا، منت ماننا (یہ کہ اس کا فلاں کام ہو گیا تو وہ اتنا مال غریبوں کو دے گا وغیرہ) [القاموس الوحید] یہ نذر عبادتِ بدنی کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے مثلاً نماز یا روزہ اور عبادت مالی کی صورت میں بھی۔ (تفسیر ماجدی)

اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ یا تم نے کوئی نذر مانی۔ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ پس بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلمًا) جاننا، اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر چھوٹی بڑی بات ہے یہاں تک کہ وہ سینوں کے راز سے بھی باخبر ہے اور اُس کے مطابق تمہیں جزا دیتا ہے، وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ اور نہیں ہے ظالموں کو کوئی مدد دینے والا، وَمَا اور نہیں ہے، مَا نافیہ ہے، لِلظّٰلِمِيْنَ، ظالموں کے لیے، اس کا مفرد ظالم ہے، ظَالِمُوْنَ تھا لام زیر والا آنے کی وجہ سے ظٰلِمین ہو گیا، حدود الٰہی کو توڑنے والے کو ظالم کہتے ہیں، اَنْصَار، مدد دینے والا اس کا مفرد ناصر ہے۔ جیسا کہ شاہد کی جمع اشہاد ہے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''نَفَقَةٍ (خرچ) میں وہ سب کچھ داخل ہے جو صاحب سرمایہ اپنے مال سے نکال کر اللہ کی راہ میں خرچ کرے، خواہ وہ زکوٰۃ ہو، صدقہ ہو یا جہاد کے سلسلے کا مالی انفاق ہو، نذر بھی نفقہ ہی کی ایک قسم ہے جسے خرچ کرنے والا متعین مقدار میں اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے، (یاد رکھو) نذر صرف اللہ کے لیے، اُس کی رضا کے لیے اور اُس کی راہ میں ہوتی ہے، غیر اللہ کے لیے نہیں ہوتی، اللہ کے بندوں میں سے کسی بندے کے لیے نذر شرک ہے، جس طرح کہ ایام جاہلیت کے مختلف ادوار میں مشرکین اپنے خداؤں اور بتوں کے لیے ذبیح کرتے تھے۔

مؤمن کو اس بات کا شعور ہوتا ہے کہ اس کی نیت، اس کے دل، اس کی حرکت اور اس کے عمل پر اللہ تعالیٰ کی نظر ہے..... اسے جزائے الٰہی کے ملنے کا پورا یقین واطمینان اور اس کے وعدے کے ایفاء پر پورا بھروسہ ہوتا ہے، وہ اللہ کے بخشے ہوئے مال کو اس کی راہ میں خرچ کر کے اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے اور اس سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرنے پر راضی وخوش ہوتا ہے۔

﴿وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

''جو شخص اللہ کی نعمتوں کا حق اور اُن پر اس کا شکر ادا نہیں کرتا، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق نہیں پہچانتا اور اللہ کی بخشی ہوئی دولت کو اس کی راہ میں خرچ نہیں کرتا، وہ ظالم ہے، وہ اللہ سے کیے ہوئے عہد پر ظلم کرنے والا ہے، وہ انسانوں پر ظلم کرنے والا ہے، وہ خود اپنے اوپر ظلم کرنے والا ہے۔

ایفائے عہد اور ادائیگی حقوق، عدل وانصاف ہے اور دولت کو روک کر رکھنا ظلم وجور۔ اس پہلو سے انسانوں کی دو قسمیں ہیں (۱) عادل ومنصف، اللہ سے کیے ہوئے عہد پر قائم، اللہ نعمت بخشے تو وہ وفا کرے، اس کی راہ میں اُسے خرچ کرے اور شکر بجالائے (۲) اللہ کے عہد کو توڑنے والے، حق ادا کرتے ہیں اور نہ شکر بجالاتے ہیں۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ، وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾

اگر تم صدقات وخیرات ظاہر اً دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی ضرورت مندوں کو تو وہ خوب تر ہے۔

اِنْ اگر، شرطیہ کہلاتا ہے، تُبْدُوا ظاہر کرو تم فعل مضارع جمع مذکر حاضر (ب دو) اس کا مادہ ہے (اَبْدَا، يُبْدِي، اِبْداءٌ) ظاہر کرنا، اعلان کرنا، باب افعال ہے، تُبْدُوْن تھا، اِنْ کی وجہ سے نُ جمع کا ساقط ہو گیا ہے، اِنْ تُبْدُوا اگر تم ظاہر کرو۔ الصَّدَقٰتِ اس کا مفرد صَدَقَةٌ، یعنی صدقہ وخیرات، فَنِعِمَّا (فَ.نِعِمَّا) پس۔ اچھا ہے، خوب ہے، اصل میں نِعْمَ الشَّيْءُ هُوَ (اچھی بات ہے وہ) نِعْمَ، فعل مدح ہے (عمدگی کو ظاہر کرتا ہے) ''فَنِعِمَّا هِيَ'' هِيَ کی ضمیر صدقات کی طرف جاتی ہے۔ وَ اِنْ اور اگر، تُخْفُوْهَا (تُخْفُوْ.هَا) تم چھپاؤ۔ اسے (اَخْفٰى، يُخْفِيْ، اِخْفَاءٌ) چھپانا، هَا کی ضمیر واحد مؤنث غائب صدقات کی طرف جاتی ہے، وَتُؤْتُوْهَا (وَتُؤْتُوْ.هَا) اور دو۔ اسے (صدقات کو)، الْفُقَرَآءَ اس کا مفرد فقیر ہے، اس کا مادہ فقر ہے۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

اَلْفَقْرُ کا لفظ چار طرح استعمال ہوتا ہے:

۱- زندگی کی بنیادی ضروریات کا نہ پایا جانا، اس اعتبار سے انسان کیا، کائنات کی ہر شے فقیر ومحتاج ہے، چنانچہ اس معنی میں فرمایا: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ (فاطر ۳۵:۱۵) ''لوگو! تم سب کے سب اللہ کے محتاج ہو۔''

۲- محتاجی اور مفلسی کے معنی میں جیسا کہ حکم ہوتا ہے: اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنَ..... اِلى الآخر (التوبہ ۹:۶۰) ''یہ صدقات تو فقراء ومساکین کا حق ہے (زکوٰۃ وخیرات کے یہ حقدار ہیں)۔''

۳- فَقْرُ النَّفْسِ یعنی مال کی ہوس، اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا ''کچھ تعجب نہیں کہ فقر کفر کی حد تک پہنچا دے۔'' اس کے بالمقابل غنی کے معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اَلْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ ''کہ غِنا (تونگری) تو نفس کی بے نیازی کا نام ہے۔'' اور اسی معنی میں حکماء نے کہا ہے: مَنْ عَدِمَ الْقَنَاعَةَ لَمْ يُفِدْهُ الْمَالُ غِنًى ''جو شخص قناعت کی دولت سے محروم ہوا اُسے مالداری کچھ فائدہ نہیں دیتی۔''

۴- اللہ تعالیٰ کی طرف احتیاج جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کرتے ہوئے فرمایا: اَللّٰهُمَّ أَغْنِنِيْ بِالْاِفْتِقَارِ اِلَيْكَ وَلَا تُفْقِرْنِيْ بِالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْكَ. ''اے اللہ! مجھے اپنا محتاج بنا کر غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کر کے فقیر نہ بنا۔''

اسی معنی کا مفہوم سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعا میں ملتا ہے جو انہوں نے مدین پہنچنے پر اللہ تعالیٰ کے حضور فرمائی تھی: رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (القصص ۲۸:۲۴) ''اے میرے رب! جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں۔'' (مفردات القرآن)

﴿وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾

وہ دور کر دے گا تم سے تمہاری برائیاں، اور اللہ تعالیٰ باخبر ہے اس بات سے جو تم کرتے ہو۔

وَيُكَفِّرُ اور وہ دور کر دے گا فعل مضارع واحد مذکر غائب (كَفَّرَ، يُكَفِّرُ، تَكْفِيْرٌ) ڈھانپنا، چھپانا (دور کرنا) عَنْكُمْ (عَنْ. كُمْ) سے۔ تم یعنی تم سے، سَيِّاٰتِكُمْ، (سَيِّاٰتِ. كُمْ) برائیاں، تمہاری، سَيِّئَةٌ اس کا مفرد ہے، یعنی یہ صدقات وخیرات تمہاری برائیوں کا کفارہ بنیں گے، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ اور اللہ

تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی خبر ہے، جو بھی تم عمل کرتے ہو، جس ارادے اور نیت سے کرتے ہو، اُسے وہ اچھی طرح جانتا ہے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''نفل صدقے کا چھپا کر دینا زیادہ بہتر اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے اور اس صورت میں ریا اور مظاہرے کے شائبے سے اس کے پاک ہونے کی زیادہ توقع ہے، رہا فرض صدقہ (زکوٰۃ) تو اس کے اعلان و اظہار ہی سے اللہ کی اطاعت ہے اور اس اطاعت کا ظاہراً اور علانیہ ہونا بہتر ہے۔'' (فی ظلال القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) دانش و حکمت شرفِ انسانیت کی سب سے بڑی متاع اور رب کریم کا احسان عظیم ہے کہ اس کے ذریعہ کسی شخص میں خیر و شر، کھرے کھوٹے، نیکی اور بدی، حق اور باطل نیز سخاوت اور بخل میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور وہ راہ سعادت اختیار کر لیتا ہے۔

۲) حق حلال کی روزی کو قرآن کی نظر میں کہیں فضل اور کہیں خیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس خیر اور فضل کا وہی لوگ بہتر استعمال کر سکتے ہیں جنہیں عقل و دانش کی دولت سے بہرہ ور کیا گیا ہے عقل و دانش کا یہ خزانہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور انہیں عطا فرماتا ہے جو اس خزانے کے پانے کا استحقاق پیدا کرتے ہیں، اس کی سنت یہ ہے کہ جو اس دنیائے فانی کی لذتوں پر فریفتہ ہونے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کے فضل کے حصول کے لیے اپنا مال لٹاتے ہیں وہ اس کے صلے میں اپنے دل کے خزانے حکمت کے لعل و گہر سے بھرتے ہیں۔

۳) صدقات و خیرات بسا اوقات دوسروں کو ترغیب دلانے کے لیے علانیہ دیے جاتے ہیں، اس میں بھی خیر اور بھلائی ہے اور بعض اوقات پوشیدہ دیے جاتے ہیں کہ دایاں ہاتھ صدقہ کرے تو بائیں ہاتھ کو خبر تک نہ ہو، یہ زیادہ اچھی بات ہے، اصل چیز ''نیت'' ہے۔ نیت میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی رہے تو سب خیر ہی خیر ہے۔

۴) اگر کہیں شیطان اس نیت میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کرے تو بندہ مؤمن اپنے رب تعالیٰ سے فوراً توبہ و استغفار کرے، اس کی رحمت اور مدد کو تلاش کرے، وہ یقیناً اپنے بندوں کا ہر وقت معین اور مددگار ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۲۷۲) لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى الْاَرْضِ ز يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ج تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ج لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲۷۳) اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲۷۴)

(اے نبیؐ) لوگوں کو راہ راست پر لانا آپ کی ذمہ داری نہیں بلکہ اللہ ہی جسے چاہے ہدایت دیتا ہے، اور جو تم خیرات کرو گے اس میں تمہارا اپنا بھلا ہے (اور وہ بھی اس صورت میں کہ) اس انفاق سے رضائے الٰہی مقصود ہو، خیرات میں جو خرچ کرو گے تمھیں اس کا پورا پورا اجر ملے گا اور تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں ایسے گھر گئے ہیں کہ (اپنے ذاتی کسب معاش کے لیے) زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے، ان کی خود داری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں، آپ ان کے چہروں سے ان کی کیفیت پہچان سکتے ہیں، مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں، ان کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے، وہ اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہ رہے گا، جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ﴾

نہیں ہے اوپر آپ کے ان کی ہدایت لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔

لَيْسَ نہیں، عَلَيْكَ (عَلٰى. كَ) اوپر آپ کے، هُدٰهُمْ (هُدٰى. هُمْ) ہدایت، ان کی (لوگوں کی)، يَهْدِىْ ہدایت دیتا ہے (هَدٰى، يَهْدِى، هِدَايَةٌ) ہدایت دینا، مَنْ يَّشَآءُ جس کو وہ چاہتا ہے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''قلوب اور ان کی ہدایت وضلالت کسی بھی مخلوق کے.....خواہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں..... ہاتھ میں نہیں ہے، یہ صرف اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، دِل اُسی کے بنائے ہوئے ہیں، اُن پر اُسی کا حکم چلتا ہے، وہ اُسی کے تصرف میں ہیں اُن پر اُس کے سوا کسی کا اقتدار نہیں ہے، رسول ﷺ پر صرف تبلیغ کی ذمہ داری ہے، رہی ہدایت تو وہ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے، ہدایت بخشتا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ جانتا ہے کہ وہ ہدایت کے مستحق ہیں اور وہ اس کے حصول کے لیے تگ ودو کر رہے ہیں.....اس معاملے کو انسان کے قبضۂ قدرت سے خارج کر دینے سے مقصود اِس حقیقت کو واضح اور مسلمانوں کے احساسات میں جاگزیں کرنا ہے تاکہ وہ ہدایت کی طلب میں صرف اللہ کی طرف متوجہ رہیں اور ہدایت کے دلائل وشواہد صرف اللہ سے حاصل کریں.....پھر اس حقیقت کے واضح ہونے سے داعی کو گمراہوں کی مخالفت وعناد کے برداشت کرنے میں مدد ملتی ہے، وہ انہیں دعوت دیتا ہے، ان کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آتا ہے اور ان کے ہدایت پانے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے اذن اور اللہ کی معرفت کے حصول کے سلسلہ میں صرف اُس کی توفیق کا منتظر رہتا ہے، اس کے باوجود گمراہ لوگ اس کی مخالفت اور اس سے دشمنی کرتے ہیں.....اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد کہ ہدایت وضلالت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، داعی ان کی مخالفت سے ملول اور اس کا دل تنگ نہیں ہوتا۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ﴾ اور جو تم خیرات کرو گے اس میں تمہارا اپنا بھلا ہے۔

وَمَا اور جو، تُنْفِقُوْا تم خرچ کرو گے فعل مضارع جمع مذکر حاضر (اَنْفَقَ، يُنْفِقُ، اِنْفَاقٌ) خرچ کرنا، مِنْ خَيْرٍ خیر میں سے، مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''خَیرٌ'' نیکی، خوبی، فضیلت وکرم، مرغوب وپسند جس کے لیے دل میں رغبت وطلب پیدا ہو، اور ہر وہ حسن وجمال کا پہلو جو جسم سے لے کر روح وقلب کی تابانیوں تک کا احاطہ کیے ہوئے ہو، پھر خیر کا لفظ مال و دولت پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے: اِنۡ تَرَکَ خیرَ (البقرہ۲:۱۸۰) ''اور جب کوئی مال بھی چھوڑ رہا ہو۔'' یہاں لفظ خیر مال ودولت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے کیونکہ مال ودولت کی فراوانیوں سے ہی کوئی قوم اپنی ملی وانفرادی ضرورتوں کو پورا کرسکتی ہے۔ (لسان القرآن، جلد دوم)

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''اس آیت سے ہم اسلام کے اس بلند، فراخ اور روشن افق سے آگاہ ہوتے ہیں اسلام مسلمانوں کے قلوب کو بلند کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے ان کی تربیت کرتا ہے..... اسلام صرف مذہبی آزادی کا اصول بیان نہیں کرتا، وہ دین کے معاملے میں جبر واکراہ کی ممانعت پر اکتفا نہیں کرتا، وہ اس سے بہت دور آگے جاتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے ماخوذ انسانیت سے فیاضی اور حسن سلوک کا اصول ہے، وہ تلقین کرتا ہے کہ سب ضرورت مند امداد اور حسنِ سلوک کے مستحق ہیں..... بشرطیکہ وہ مسلم جماعت سے برسرپیکار نہ ہوں..... انفاق کرتے وقت ضرورتمندوں کے عقیدہ ومسلک کو نہ دیکھا جائے گا۔ اسلام واضح کرتا ہے کہ انفاق کرنے والے کا اجر ہر حال میں اللہ کے یہاں محفوظ ہے، بس شرط یہ ہے کہ انفاق صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو..... یہ بہت بڑی چھلانگ ہے جو انسانیت کے سلسلے میں اسلام نے لگائی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ اقدام صرف اسلام نے کیا ہے اور اس کی معنویت اور حقیقت سے اہل اسلام کے سوا اور کوئی آشنا بھی نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے:

''آپ کا سینہ ان کے لیے فراخ رہنا چاہیے، آپ کے ابر کرم کو اُن پر برسنا چاہیے اور جب وہ آپ کے حضور ضرورتمند بن کر آئیں تو آپ انہیں اپنی اعانت اور جود وکرم سے نوازیں، رہا ان کا معاملہ تو وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انفاق کرنے والے کی جزا اللہ کے یہاں ہے۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ﴾

اور نہیں خرچ کرو گے تم مگر اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے۔

وَمَا اورنہیں، مَا نافیہ کہلاتا ہے، تُنْفِقُوْنَ خرچ کرو گے تم، فعل مضارع جمع مذکر حاضر، اِلَّا مگر کلمۂ استثناء، ابْتِغَآءَ مصدر، چاہنا (اِبتَغٰی، یَبْتَغِیْ، اِبْتِغَاءً) چاہنا، وَجْهِ اللّٰهِ، اللہ کی رضامندی کو، مال خرچ کرنے کا مقصد نمود ونمائش نہیں بلکہ صرف اور صرف رضائے الٰہی ہو۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

"یہ مؤمن کی شان ہے، اس کے سوا کسی کی نہیں، وہ صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتا ہے، وہ اپنی کسی خواہش اور کسی غرض کے لیے انفاق نہیں کرتا، وہ خرچ کرتے وقت یہ نہیں دیکھتا کہ لوگ اُس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں، وہ اس لیے انفاق نہیں کرتا کہ لوگ کوچہ و بازار میں اس کے چرچے کریں اور وہ اُن پر اپنی برتری کا مظاہرہ اور فخر و مباہات کرے، وہ اس لیے بھی انفاق نہیں کرتا کہ کوئی صاحب اقتدار اس سے راضی وخوش ہو یا اسے کوئی تمغہ یا سند عطا کرے، وہ پورے خلوص اور کامل یکسوئی کے ساتھ صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتا ہے، اُسے اطمینان رہتا ہے کہ اللہ اس کے صدقے کو قبول فرمائے گا اور اس کے مال میں برکت دے گا، وہ اللہ کی جزا اور اس کی بخشش وعطا کے بارے میں بھی مطمئن رہتا ہے، اللہ کے بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور نیکی کی روش اختیار کرنے کی جزا کے طور پر اللہ سے اسے خیر اور حسنِ سلوک کا یقین واطمینان ہوتا ہے، وہ اپنے انفاق کے نتیجہ میں دنیا میں رہتے ہوئے بلند، پاکیزہ اور مزکّٰی ہو جاتا ہے.....اس کے بعد آخرت میں اللہ کی بخشش صرف اس کا فضل ہے۔" (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾

اور (خیرات) میں جو خرچ کرو گے، تمھیں اس کا پورا پورا اجر ملے گا اور تم پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

وَمَا اور جو کچھ، تُنْفِقُوْا خرچ کرو گے تم، فعل مضارع جمع مذکر حاضر، مِنْ خَيْرٍ مال میں سے، يُّوَفَّ تمھیں پورا پورا (بدلہ) دیا جائے گا، مضارع مجہول واحد مذکر غائب (وَفّٰی، یُوَفِّیْ، تَوْفِیَةٌ) پورا، پورا دینا (بدلہ، انعام)، وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ اور تم پر ظلم وزیادتی نہ ہوگی، وَ اَنْتُمْ اور تم پر، ضمیر جمع مذکر حاضر، لَا تُظْلَمُوْنَ نہ ظلم ہوگا، فعل مضارع مجہول جمع مذکر حاضر (ظَلَمَ، یَظْلِمُ، ظُلْمًا) ظلم کرنا، مضارع یَظْلِمُ اور اس سے جمع یَظْلِمُوْن اور مجہول کا صیغہ یُظْلَمُوْنَ، ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ لَا تُظْلَمُوْنَ تم پر ظلم

نہیں کیا جائے گا۔

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ﴾

(یہ صدقات) ان تنگدست لوگوں کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہیں اور زمین میں چلنے پھرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

لِلْفُقَرَآءِ (لِ. الْفُقَرَآءِ) واسطے، ان فقیروں (تنگ دست لوگوں) کے لیے خیرات وصدقات ہیں، الَّذِيْنَ، جو اُحْصِرُوْا، بند کیے گئے ہیں، روکے گئے ہیں (اَحْصَرَ، يُحْصِرُ، اِحْصَارٌ) باب افعال، روکنا، بند کرنا اُحْصِرُوْا، فعل ماضی مجہول جمع مذکر غائب، روک لیے گئے ہیں، اس لفظ میں بڑی گنجائش ہے یعنی گھر جانا، خواہ وقت کے لحاظ سے ہو یا جسم کے لحاظ سے، مراد وہ لوگ ہیں جو دین کے کسی کام میں گھر گئے ہیں اور اب آزادی سے روزی نہیں کما سکتے مثلاً اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے۔ بعض مفسرین نے وہ لوگ مراد لیے ہیں جو علوم دین کی تحصیل میں مشغول ہیں اور علم حاصل کرنے میں اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ روزی کا سامان نہیں کر سکتے۔ (درس قرآن)

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نہیں استطاعت رکھتے (طاقت رکھتے) فعل منفی مضارع جمع مذکر غائب (اِسْتَطَاعَ، يَسْتَطِيْعُ، اِسْتِطَاعَةً) طاقت رکھنا، استطاعت، ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ، زمین میں حرکت کرنے کی (چلنے کی)۔ ضَرْبٌ کا لفظ عربی زبان میں بڑی وسعت رکھتا ہے، جیسا کہ ضَرَبُ الْقَلْب، دِل دھڑکنا، ضَرْبُ الْعِرقْ، رگ پھڑکنا، رگ میں خون کا جوش مارنا، ضَرْبُ الدِّرْهَم، سکہ ڈھالنا، ضَرَبَ الرَّجُلُ فِي الْاَرْضِ، زمین میں گھومنا پھرنا، سفر کرنا وغیرہ۔

﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾

ان کی خودداری کو دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ دولتمند ہیں۔

يَحْسَبُهُمُ (يَحْسَبُ. هُمُ) خیال کرتا ہو۔ ان کو فعل مضارع واحد مذکر غائب (حَسِبَ، يَحْسِبُ، حُسْبَانٌ) خیال کرنا، گمان کرنا، هُمُ ضمیر جمع مذکر، ان لوگوں کی طرف جاتی ہے جو گھرے ہوئے ہیں روکے

گئے ہیں، اَلْجَاهِلُ اسم فاعل اس کا فعل ہے (جَهِلَ، يَجْهَلُ، جَهْلًا) ناواقف ہونا، بے خبر ہونا، اَغْنِيَآءَ دولت مند، اس کا مفرد غنی ہے مِنَ التَّعَفُّفِ ان کے سوال نہ کرنے سے (ان کی خودداری سے) اس کا مادہ (ع ف ف) عَفَّ يَعِفُّ، عِفَّةً وعَفَافًا ناپسندیدہ قول وفعل سے بچنا، عربی محاورہ ہے هُمْ اَعِفَّةُ الْفَقْرِ، یعنی وہ غربت کے باوجود سوال سے بچتے ہیں، اَلْعِفَّةُ، پاکدامنی، پارسائی، نیک اور پارسا خاتون کو اَلْعَفِيْفَةُ کہتے ہیں۔ (القاموس الوحید)

﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ، لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾

آپ انہیں پہچان سکتے ہیں ان کے چہروں سے، وہ نہیں مانگتے ہیں لوگوں سے لپٹ کر (اصرار سے)۔

تَعْرِفُهُمْ (تَعْرِفُ. هُمْ) پہچانتے ہیں آپ، انہیں، بِسِيْمٰهُمْ (بِ. سِيْمَا. هُمْ) ساتھ، علامت (چہروں)۔ ان کے السّیما، علامت خاص نشان، چہرے بشرے سے کسی کو جاننا، یعنی ان کے چہروں کی کیفیت سے آپ انہیں پہچان سکتے ہیں (کہ یہ غریب اور مسکین ہیں) لَا يَسْئَلُوْنَ نہیں مانگتے، نہیں سوال کرتے (سَاَلَ، يَسْأَلُ، سُؤَالًا) سوال کرنا، النَّاسَ لوگوں سے، اِلْحَافًا، لپٹ کر (اصرار سے) اس کا مادہ (ل ح ف) ہے (اَلْحَفَ، يُلْحِفُ، اِلْحَافًا) اصرار کے ساتھ مانگنا، ضد کر کے مانگنا، اور یہ دلیل ہے ان کے کمالِ غیرت کی، کہ وہ ضد کر کے نہیں مانگتے۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾

اور اُن کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے، وہ اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہ رہے گا۔

وَمَا اور جو کچھ، تُنْفِقُوْا فعل مضارع جمع مذکر حاضر (اَنْفَقَ، يُنْفِقُ، اِنْفَاقٌ) خرچ کرنا، مِنْ خَيْرٍ مال سے، فَاِنَّ اللّٰهَ، پس بلاشبہ اللہ تعالیٰ، بِهٖ (بِ. ہٖ) ساتھ، اس کے یعنی اس بات کو، عَلِيْمٌ، جاننے والا ہے (عَلِمَ، يَعْلَمُ، عِلْمًا) سے اسم صفت عَلِيْمٌ، اللہ تعالیٰ کا علم کائنات کی ہر چیز پر محیط ہے، تم جس ارادے اور نیت سے مال خرچ کرتے ہو سب اس کے علم میں ہے، وہ تمہیں پورے پورے اجر سے نوازے گا۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''یہ آیہ مبارکہ مہاجرین کے ایک گروہ پر منطبق ہوتی ہے، یہ لوگ اپنے اموال اور اہل وعیال کو چھوڑ آئے تھے اور مدینہ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے، انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے خود کو وقف کر رکھا تھا، یہ ''اصحابِ صفّہ'' تھے جو مسجد نبوی میں رہتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کی حفاظت کرتے تھے، ان کی موجودگی کے باعث آپ کے گھروں تک کسی دشمن کی رسائی نہ ہو سکتی تھی، یہ لوگ جہاد فی سبیل اللہ میں گھر کر رہ گئے تھے (اس کے علاوہ دین کے فہم وادراک میں بھی پوری طرح دلچسپی لیتے تھے) اور کاروبار اور کمانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، اس کے باوجود وہ دست سوال دراز نہ کرتے اور نہ کسی سے اپنی ضرورت کا اظہار کرتے۔ جو لوگ ان کے حالات سے ناواقف ہوتے، انہیں غنی (مالدار) خیال کرتے، صرف غیر معمولی فہم وفراست کے لوگ ان کی حقیقی حالت کو جان سکتے تھے۔ (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ، وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾

جو لوگ اپنے مال شب وروز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔

اَلَّذِيْنَ جو لوگ، اسم موصول، يُنْفِقُوْنَ خرچ کرتے ہیں فعل مضارع جمع مذکر غائب، اَمْوَالَهُمْ (اَمْوَالَ.هُمْ) مال، اپنے، بِالَّيْلِ (بِ.الَّيْلِ) ساتھ، رات کے، وَالنَّهَارِ اور دن کو، یعنی شب وروز خرچ کرتے ہیں، سِرًّا چھپے ہوئے، وَ عَلَانِيَةً اور علانیہ (ظاہر طور پر)، فَلَهُمْ (فَ.لَهُمْ) پس۔ ان کے لیے (ہے)، اَجْرُهُمْ (اَجْرُ.هُمْ) اجر، ان کا، عِنْدَ پاس، نزدیک، رَبِّهِمْ (رَبِّ.هِمْ) رب، ان کا یعنی ان کا اجر اِن کے رب کے پاس ہے، وَلَا خَوْفٌ اور نہیں خوف، عَلَيْهِمْ (عَلٰى.هِمْ) اوپر ان کے، وَلَا هُمْ اور نہ ہی وہ، يَحْزَنُوْنَ، غمگین ہوں گے، یعنی جس وقت اور جس گھڑی بھی ضرورت ومصلحت ہو، اللہ کے نیک بندے انفاق فی سبیل اللہ سے گریز نہیں کرتے، کبھی بخل سے کام نہیں لیتے، ان کا جان ومال اللہ تعالیٰ کے لیے حاضر رہتا ہے، یہی وہ خوش بخت ہیں جنہیں روزِ قیامت کسی طرح بھی حزن وملال کا سامنا نہ ہوگا۔

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) دین اسلام میں انفاق فی سبیل اللہ کا میدان بڑا وسیع ہے، دعوت وتبلیغ کا سلسلہ جاری وساری رہنا چاہیے، ہدایت دینا اور مسلمان بنانا، ہماری ذمہ داری نہیں ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم دولت صرف ایسے لوگوں پر خرچ کریں جو ہمارے روپے پیسے کی وجہ سے دین قبول کرلیں بلکہ صدقہ وخیرات سے ہمارا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشی ہونا چاہیے اور جو بھی ضرورتمند ہو، اس کی ضرورت پوری کرنی چاہیے، اس میں اپنے پرائے کا فرق نہیں یہ عام صدقات کی بات ہے۔ البتہ زکوٰۃ کے مصارف وہی ہیں جن کا قرآن نے ذکر کردیا ہے اور علماء نے لکھا ہے کہ یہ مسلمانوں کا حق ہے۔

۲) جو لوگ ہمہ وقت حصول دین اور اشاعت دین میں مصروف ہوں، ان کی ضروریات زندگی کو پورا کرنا اہل ثروت کے ذمہ ہے، اسی طرح وہ لوگ جو مسلسل جہادی سرگرمیوں میں مصروف ہوں، ان کی کفالت بھی اغنیاء کے سپرد ہے۔

۳) صدقہ وخیرات کے سلسلہ میں ان لوگوں کو تلاش کرنا جو عزت نفس کی خاطر لوگوں کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے اور ان کی مدد کرنا بہت بڑا اجر ہے مثلاً یتامیٰ، بیوگان وغیرہ۔

۴) صدقہ وخیرات کے لیے کوئی خاص وقت اور موسم نہیں ہے۔ جب اور جسے ضرورت ہو، مالدار لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ضرورت مندوں محتاجوں، یتیموں اور مسکینوں کی مدد کریں، کبھی علانیہ کہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو اور کبھی خفیہ کہ دایاں ہاتھ خرچ کرے تو بائیں کو خبر تک نہ ہو، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی پیش نظر رہے۔

۵) صدقہ وخیرات دنیا میں اطمینان اور طہارت نفس کا باعث ہوتا ہے اور آخرت میں خوف وحزن کے زائل ہونے کا ذریعہ بنے گا۔

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَهٗ مَوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ فَانۡتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمۡرُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ (۲۷۵) یَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ (۲۷۶)	(جولوگ حاجت مندوں کی مدد کرنے کی جگہ الٹا ان سے) سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح اٹھیں گے، جیسے شیطان نے کسی شخص کو چھو کر حواس باختہ کر دیا ہو، اور یہ اس لیے ہوگا کہ انہوں نے (سود کے ناجائز ہونے سے انکار کیا، اور کہا) کہ سوداگری بھی سود خوری کی طرح ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت کو حلال ٹھہرایا ہے اور سود کو حرام۔ اب جس شخص کو اس کے پروردگار سے یہ نصیحت پہنچ گئی اور وہ سود خوری سے باز آ گیا تو پہلے جو سود کھا چکا سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، مگر جو پھر بھی سود کھائے تو یہی لوگ اہل دوزخ ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ سود کو مٹاتا اور خیرات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔

﴿اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ﴾

''جولوگ سود کھاتے ہیں، وہ (قبروں سے) اس طرح اٹھیں گے جیسے شیطان نے کسی شخص کو چھو کر حواس باختہ کر دیا ہو۔''

اَلَّذِیۡنَ جولوگ، اسم موصول، یَاۡکُلُوۡنَ کھاتے ہیں فعل مضارع جمع مذکر غائب (اَکَلَ، یَاۡکُلُ، اَکْلًا) کھانا، ماکولات، اشیائے خوردنی، مشروبات، پینے کی چیزیں اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ الرِّبٰوا، سود

''الزِّيَادَةُ فِيْ رَأسِ المال'' اصل مال میں زیادتی کا نام رِبوٰا ہے۔(مفردات القرآن) اصطلاحِ شریعت میں وہ زیادتی جو قرض دینے والا مقروض سے بطور معاوضہ وصول کرتا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''رَبَا، یَرْبُوْ، رِبَاءٌ، کے معنی بڑھنے اور زیادہ ہونے کے ہیں، اسی سے ''رِبوٰ'' ہے جس سے مراد وہ معیّن اضافہ ہوتا ہے جو ایک قرض دینے والا قرضدار سے ایک معین شرح پر صرف اس حق کی بنا پر اپنے دیے ہوئے روپے کا منافع وصول کرے کہ اس نے ایک خاص مدت کے لیے اس کو روپے کے استعمال کی اجازت دی ہے، اس امر کو اس حقیقت کے تعین میں کوئی دخل نہیں ہے کہ قرض کسی غریب و نادار کو دیا گیا ہے یا کسی امیر و تاجدار کو اور نہ اس بات سے اس میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے کہ قرض کسی میت کی تجہیز و تکفین کے لیے دیا گیا ہے یا کسی رفاہی اسکیم کے لیے دیا گیا ہے، یا تجارت و زراعت اور صناعت کے کسی انفرادی یا اجتماعی منصوبے کے لیے دیا گیا ہے، جاہلیت اور اسلام دونوں میں ربوٰ کی اصطلاح کا مفہوم مسلّم رہا ہے۔ اس میں ان ظاہری اختلافات سے سرمو فرق نہیں ہوتا، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مقصد قرض یا قرضدار کی نوعیت و حیثیت کی تبدیلی ربوٰ کی عرفی حیثیت کو بدل دیتی ہے، ان کا خیال بالکل غلط ہے، آگے آپ دیکھیں گے کہ خود قرآن کے الفاظ میں اس خیال کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد اول)

لَا یَقُوْمُوْنَ (سود خور) نہیں کھڑے ہوں گے مضارع جمع مذکر غائب (قَامَ، یَقُوْمُ، قِیَامًا) کھڑا ہونا، قیام و سجود اردو میں استعمال ہوتا ہے، اِلَّا مگر کلمہ استثنا، کَمَا کلمۂ تشبیہ جیسے کہ یَتَخَبَّطُهُ (یَتَخَبَّطُ.هُ) مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ اُسے (خ ب ط) اس کا مادہ ہے (تَخَبَّطَ، یَتَخَبَّطُ، تَخَبُّطًا) دیوانہ کرنا، باب تفعل، الشَّیْطٰنُ شیطان، مِنَ الْمَسِّ چھونے سے، مسّ شیطانی سے مراد عربی محاورہ میں جنونی کیفیت ہوتی ہے۔(مفردات القرآن)

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''اصل منظر تو یہ قیامت کے دن کا ہے کہ آخرت میں اپنی قبروں سے اٹھنے پر یہ سود خور سیدھے کھڑے تک نہ ہو سکیں گے، کھڑے ہوں گے بھی تو متوالوں، خبطیوں، دیوانوں کی طرح گرتے پڑتے لڑکھڑاتے ہوئے، لیکن اس کا ایک ہلکا سا رنگ اسی دنیا ہی میں نظر آ جاتا ہے مہاجن، ساہوکار جو روپیہ کے پیچھے دیوانہ باؤلا بنا رہتا ہے، واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو جن یا بھوت چمٹ گیا ہے اور اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے،

سوتے جاگتے اس پر سود یا بیاج ہی سوار رہتا ہے اور جس کے حرص وطمع کی پیاس دنیا میں اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے، لازم ہے کہ اس کا حشر بھی اسی مخبوط، جنون زدہ حالت کے ساتھ ہو، محققین کا بیان ہے کہ حشر میں انسان اسی صورت کے ساتھ اٹھے گا، جس قسم کی سیرت اور خصلتیں دنیا میں اس پر غالب رہی ہوں گی۔''

(تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾

یہ سزا اس لیے ہوگی کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع (خرید وفروخت) بھی سود ہی کی طرح ہے۔

ذٰلِکَ اسم اشارہ بعید، وہ بمعنی یہ (بات) کبھی زور بیان کے لیے ''ذٰلِکَ'' اسم اشارہ بعید کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔ بِاَنَّھُمْ (بِ. اَنَّ. ھُمْ) اس وجہ سے کہ انہوں نے ''ب'' سبب اور وجہ کے بیان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، قَالُوْٓا کہا انہوں نے، فعل ماضی جمع مذکر غائب (قَالَ، یَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، اِنَّمَا (اِنَّ. مَا) سوائے اس کے (کہ) نہیں، اِنَّمَا حصر یعنی زور بیان کے لیے استعمال ہوتا ہے الْبَیْعُ خرید وفروخت کرنا، بَیْعٌ کا لفظ عربی زبان میں خرید وفروخت، دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اَلْبَیْعَۃُ (بیعت) خلیفہ وقت سے (جہاد کے لیے) عہد و پیمان کرنا، یا مرشد سے منہیات ومنکرات سے بچنے اور نیکیوں کو اختیار کرنے کا عہد و پیمان کرنا۔

مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''عہد جاہلیت میں عرب بیع اور سود میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ دونوں میں باہمی معاملات کی ایسی شکلیں ہیں جو بہر حال نفع آور ہیں، قرآن حکیم نے بتایا کہ ان دونوں میں مزاج، کردار اور نتائج کا بیّن فرق پایا جاتا ہے، بیع میں محنت، تدبیر اور صرف وقت کا عنصر شامل ہے، اس کے علاوہ اس میں استحصال اور مفت خوری کے اجزا کا کلّی فقدان ہے جبکہ سود بغیر کسی محنت اور فکری کاوش کے آپ سے آپ حاصل ہوتا ہے اور صراحۃً استحصال کا بدترین نتیجہ ہے، بیع میں ایک اہم پہلو خسارہ کا احتمال ہے اور سود میں نقصان اور خسارہ کا سرے سے کوئی تصور پایا ہی نہیں جاتا، دونوں اپنے رول اور نتائج کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں، سود اکتناز دولت، استحصال اور طمع وحرص کے ایسے گھٹیا جذبات کی پرورش کرتا ہے، ایسے معاشرے کی تخلیق کا سبب قرار پاتا ہے جس میں انسانی ہمدردی یکسر ختم ہو جاتی ہے، باہمی تعاون کا جذبہ پوری طرح مرجھا جاتا ہے اور اس کی جگہ قساوتِ قلبی اور ظلم کی خو لے لیتی ہے۔'' (لسان القرآن، جلد اول)

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾

اور حلال کیا اللہ نے بیع (خرید وفروخت) کو اور حرام کیا سود کو۔

وَاَحَلَّ اور حلال کیا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (اَحَلَّ، یُحِلُّ، اِحْلَالًا) حلال کرنا، جائز ٹھہرانا، اَلْبَیْعَ خرید وفروخت (کو) وَ حَرَّمَ اور حرام کیا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (حَرَّمَ، یُحَرِّمُ، تَحْرِیمٌ) حرام کرنا نا جائز ٹھہرانا، الرِّبٰوا سود۔

جب حلال اور حرام میں فرق واضح ہو گیا تو بندہ مسلم کے لیے احکام الٰہی کی پیروی ضروری ہے اور مسلمان وہی ہوتا ہے جو بلا چون و چرا مالک کے حکم کو سن کر سر تسلیم خم کر دے، خواہ بات اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، وہ قادر مطلق تو ایسا حاکم ہے کہ جس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے اور اسے ماننے ہی میں انسانوں کے لیے فوز وفلاح ہے۔

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ﴾

اب جس شخص کو اس کے پروردگار سے یہ نصیحت پہنچی اور وہ (سود خوری) سے باز آ گیا، تو پہلے جو سود کھا چکا سو کھا چکا۔ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

فَمَنْ (ف.مَنْ) پس، جو کوئی، جَآءَهٗ (جَآءَ.هٗ) (کہ) آئی، اس کے پاس، مَوْعِظَةٌ نصیحت، اس کا مادہ (وَعَظ) وَعظ و نصیحت کرنا اردو میں استعمال ہوتا ہے، وعظ ایسی نصیحت کو کہتے ہیں جس میں ڈر اور خوف شامل ہو، مِّنْ رَّبِّهٖ (اس کے رب کی طرف سے)، فَانْتَهٰى (ف.انْتَهٰى) پس، وہ رک گیا (سود خوری سے اور دوسری بری باتوں سے) (اِنْتَهٰى، یَنْتَهِیْ، اِنْتِهَاء) رک جانا، باز آ جانا اردو زبان میں ابتدا کی ضد انتہا ہے، فَلَهٗ (ف.لَهٗ) پس، اس کے لیے (ہے)، مَاسَلَفَ (مَا.سَلَفَ) جو۔ کچھ ہو چکا ہے (سَلَفَ، یَسْلُفُ، سَلْفًا) گزر جانا، ختم ہو جانا یعنی جو کچھ ماضی میں ہو چکا سو ہو چکا (اب اسے قطعی طور پر باز آنا چاہیے)، وَاَمْرُهٗ (وَاَمْرُ.هٗ) (اور) معاملہ، اس کا، اِلَى اللّٰهِ اللہ کے پاس ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"مقصود یہ ہے کہ یہاں بیان بندوں کے سامنے معاملے کے صرف ظاہری اور قانونی پہلوؤں کا ہو رہا

ہے، باقی قلب کے تقویٰ وطہارت اور نفس کی اصلاح کا معاملہ اللہ پر چھوڑنا چاہیے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ، هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

مگر جو پھر بھی سود کھائے تو یہی لوگ اہل دوزخ ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

وَمَنْ اور جو کوئی، عَادَ لوٹے (یعنی پھر سود کھائے) فعل ماضی واحد مذکر غائب (عَاد، يَعُوْدُ، عَوْدًا) عود کے معنی کسی چیز کو چھوڑ دینے کے بعد پھر اُس کی طرف لوٹ آنے کے ہیں، اِعَادَةٌ دہرانا، کسی کام کو بار بار کرنا اردو میں استعمال ہوتا ہے، فَاُولٰٓئِکَ (فَ.اُولٰٓئِکَ) پس، وہی لوگ ہیں، اسم اشارہ (جمع کے لیے)، اَصْحٰبُ النَّارِ، دوزخ والے، صاحب ساتھی اور اس کی جمع اصحاب ہے یعنی سود خور آگ کے ساتھی (یعنی آگ والے ہیں)، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب (وہ سب) فِيْهَا (فِيْ.هَا) بیچ، اس کے (بیچ دوزخ کے) هَا کی ضمیر النّار یعنی دوزخ کی طرف جاتی ہے، خٰلِدُوْنَ ہمیشہ رہنے والے ہیں، اسم فاعل اس کا مفرد خَالِدٌ ہے اس سے فعل (خَلَدَ، يَخْلُدُ، خُلُوْدٌ) ہے، ہمیشہ رہنا، یعنی سود کے حرام ہونے کے بعد بھی اگر کوئی شخص سود خوری پر قائم رہے تو اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ یعنی سود کی حرمت جاننے کے بعد بھی اگر کوئی شخص سود خوری پر قائم رہے اور اللہ تعالیٰ کا واضح حکم سننے کے بعد بھی خواہشات نفس کا پیروکار رہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دنیا عارضی اور فانی ہے اور چند روزہ عیش وعشرت کے مزے لینے کے بعد بالآخر ایسے نفس پرست کا ابدی ٹھکانہ دوزخ ہے، اور یہ کتنا حسرتناک انجام ہے!

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ﴾

مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ سود کو اور بڑھاتا ہے صدقات (خیرات) کو۔

يَمْحَقُ وہ مٹاتا ہے فعل مضارع واحد مذکر غائب (مَحَقَ، يَمْحَقُ، مَحْقًا) کمی کرنا گھٹانا، برباد کرنا، ضائع کرنا، وَيُرْبِى اور بڑھاتا ہے (اَرْبٰى، يُرْبِىْ، اِرْبَاءٌ) بڑھانا، نشوونما دینا، الصَّدَقٰتِ صدقات (خیرات) اس کا مفرد صَدَقَةٌ ہے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''اللہ کی وعید اور اس کا وعدہ، دونوں سچے ہیں، ہم خود دیکھ رہے ہیں کہ جس سماج میں سودی کاروبار کا

چلن ہوتا ہے، اس میں برکت، آسودگی، سعادت اور امن واطمینان کا نام ونشان نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ سود کو گھٹاتا ہے۔ اس لیے کہ جو سماج سودی کاروبار کی گندگی میں لت پت ہو، وہ لازماً قحط اور شقاوت وبدبختی سے دوچار ہوتا ہے، ان سماجوں (معاشروں) میں بظاہر آسودگی، پیداوار اور ذرائع ووسائل کی کثرت مشاہدے میں آتی ہے لیکن برکت ذرائع ووسائل کی کثرت میں نہیں بلکہ ذرائع ووسائل کے پرامن اور پاکیزہ استعمال وانتفاع میں ہے، جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے، جو ممالک سرمایہ دار اور کثیر ذرائع ووسائل کے مالک ہیں، وہاں کے باشندوں کے دلوں پر شقاوت وبدبختی چھائی رہتی ہے اور وہ قلبی ونفسیاتی بے چینی واضطراب میں مبتلا رہتے ہیں، جسے دولت وثروت کی بہتات گھٹاتی نہیں، بڑھاتی ہے۔ پھر انہی میں سے کچھ ممالک ہیں جو آج پوری دنیا میں بے چینی، خوف اور بدامنی واضطراب پھیلا رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نوع انسانی مہلک (ایٹمی) جنگ کے دائمی خطرے کے زیر سایہ زندگی گزار رہی ہے، جس طرح کہ وہ سوتے، جاگتے، ہر وقت سرد جنگ کا شکار ہیں، زندگی انسانی اعصاب پر روز بروز زیادہ سے زیادہ بوجھل ہوتی جارہی ہے..... خواہ لوگوں کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو..... اور انسانوں کی دولت، رزق، صحت اور قلبی سکون واطمینان میں کوئی برکت نہیں رہ گئی ہے۔

نوع انسانی کے واقعاتی حالات وکیفیت میں جو لوگ اس حقیقت کو نہیں دیکھ رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقت کو دیکھنا نہیں چاہتے کیونکہ نہ دیکھنے ہی میں ان کی خواہشات کی تکمیل ہے یا ان کی آنکھوں پر گمراہ کن پروپیگنڈوں کے پردے پڑے ہوئے ہیں جو ان لوگوں نے قصداً اور دانستہ دنیا بھر میں کر رکھے ہیں جن کے مفادات اس منحوس سودی نظام سے وابستہ ہیں، اس لیے ان کی آنکھیں اس عریاں حقیقت کو دیکھ نہیں پاتیں۔ (یہ حقیقت امریکہ اور اس کے حواریوں پر ٹھیک ٹھیک چسپاں ہوتی ہے) (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾

اور اللہ کسی کفر کرنے والے (ناشکرے) اور گنہگار کو پسند نہیں کرتا ہے۔

وَاللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ، لَا يُحِبُّ نہیں پسند کرتا ہے، لَا کلمہ نہی، يُحِبُّ مضارع واحد مذکر غائب (اَحَبَّ، يُحِبُّ، اِحْبَابٌ) پسند کرنا، كُلَّ كَفَّارٍ ہر کفر کرنے والے (کو) اَثِيْمٍ، گنہگار (کو)، كُفْرٌ حقیقت میں کسی چیز کو چھپانے، ایمان نہ لانے، اور ناشکری کے معنی میں ہے، کافر وہ شخص ہوتا ہے جو اللہ

تعالیٰ کے انعامات واحسانات کوفراموش کر دیتا ہےاوراس پرایمان نہیں لاتا ہے،کفران نعمت،نعمتوں کا انکار، اردوزبان میں استعمال ہوتا ہے،''کافر'' کسان کوبھی کہتے ہیں کیونکہ وہ بیج کوزمین میں چھپا دیتا ہے،اس کی جمع کُفّار آتی ہے،جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے: كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ (الحدید۵۷:۲۰) ''جیسے کہ بارش کی پیداوار کسانوں کواچھی معلوم ہوتی ہے۔''

اَثِيْمٌ اس کا مادہ (اثْمٌ) ہے،اثِیْمٌ، بہت زیادہ گنہگار مبالغہ کا صیغہ ہےاور یہ کُفَّارٍ کی صفت ہے،یعنی سودخوری ایسی بری لعنت کے مرتکب وہی لوگ ہو سکتے ہیں جوسخت ناشکرے اور بدترین گنہگار ہیں۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''یہ جملہ اس مفہوم میں قطعی ہے کہ جولوگ سود کی تحریم کے بعد سودی کاروبار پراصرار کرتے ہیں،ان کا شمار کفاراوراللہ کے نافرمانوں میں ہے،یااس لیے کہ جولوگ اللہ کی حرام کی ہوئی کسی شے کوحلال قرار دیتے ہیں،وہ کافرونافرمان ہیں،خواہ وہ زبان سے ہزار بار لآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا ورد کریں۔ اسلام زبان سے ادا کیے جانے والے کسی کلمہ کا نام نہیں ہے وہ زندگی کا نظام اورایک طریق عمل ہے،اس کے کسی جزء کا انکار کل کے انکار کی طرح ہے،جہاں تک سود کا تعلق ہے اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اسے حلال سمجھنااوراس کی بنیاد پرزندگی کا نظام قائم کرنا یقیناً کفروا ثم (گناہ) ہے۔''(فی ظلال القرآن،جلداول)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت:

۱) تجارت اورسودخوری میں نمایاں فرق ہے،تجارت کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان کومحنت و مشقت کی عادت پڑے،وہ حق حلال کی روزی کما کرگزربسر کرے اِسلام دست وبازو سے روپیہ پیسہ کمانے کا حامی ہےاوران پیشوں کا مخالف ہے جن سے کاہلی اور سستی پیدا ہواور جوانسان کواخلاقِ فاضلہ اورکمالاتِ انسانیہ سے محروم کردیں۔

۲) سودخور جب روپیہ دیتا ہے تو صرف نفع کا مالک ہوتا ہے مگر تجارت میں سودوزیاں اورنفع نقصان کے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔

۳) سودخوری قساوت قلبی،بخل،حرص،ظلم،فخروغرور،خودبینی اورخودنمائی ایسے رذائل جبکہ صدقات وخیرات سے نرم دلی،احسان ومروت،تواضع وانکساراورعفت وپاکبازی کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور

یہی وہ خوبیاں ہیں جو کسی فلاحی معاشرے کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔

۴) سود خور استحصالی نظام کے علمبردار ہوتے ہیں، ان کی آرزو ہوتی ہے کہ لوگ اپنی ضروریات پوری کرنے پر قادر نہ ہوں، وہ کاسۂ گدائی اٹھائے ان کے در پر حاضر رہیں اور وہ سود در سود پر انہیں قرضے دے کر انہیں مفلوک الحال بنا ڈالیں، اس طرح نہ صرف ان کے معاشی ڈھانچے کو تباہ و برباد کر ڈالیں بلکہ ان کے سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور تعلیمی نظام پر بھی اثر انداز ہوں، پاکستان ایسے ہی سودی شکنجے کی گرفت میں ہے۔

۵) اسلام سودی نظام کو ختم کر کے لوگوں کو خوددار اور عزتِ نفس کا محافظ بناتا ہے، وہ لوگوں کو محنت و مشقت کا عادی بنا کر انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرتا ہے اور وہ ہر کسی کی غیر مشروط مدد اور مروت کا عادی بناتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَھُمۡ اَجۡرُھُمۡ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ وَلَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (۲۷۷)	ہاں، جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل (تواتر) سے کرتے رہے اور (جنہوں نے) نماز قائم کی اور زکوٰۃ بھی دی، اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے، انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل کیے انہوں نے نیک۔

اِنَّ بلاشبہ، بے شک، تاکیدِ کلام کے لیے آتا ہے، اَلَّذِیۡنَ اسم موصول وہ لوگ، اس کا مفرد الّذیْ ہے، اٰمَنُوۡا ایمان لائے فعل ماضی جمع مذکر غائب (اٰمَنَ، یُؤمِنُ، اِیۡمَانًا) ایمان لانا، وَ عَمِلُوا اور عمل کیے فعل ماضی جمع مذکر غائب (عَمِلَ، یَعۡمَلُ، عَمَلًا) عمل کرنا الصّٰلِحٰتِ نیک، اچھے (کام) اس کا مفرد صَالِحَۃٌ، نیک (امر) اسم فاعل۔

﴿وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ﴾ اور (انہوں نے) قائم رکھا نماز کو اور دی زکوٰۃ۔

وَ اَقَامُوا اور انہوں نے قائم کیا، فعل ماضی جمع مذکر غائب (اَقَامَ، یُقِیْمُ، اِقَامَۃٌ) قائم کرنا، الصَّلٰوۃَ نماز، اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ نماز کو تمام ظاہری ارکان کے ساتھ جو سنت نبویؐ کے مطابق ہوں، خشوع وخضوع سے ادا کیا جائے، وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ اور دی زکوٰۃ، (اٰتٰی، یُؤْتِی، اِیتَاءٌ) عطا کرنا، دینا۔ الزَّکٰوۃَ، زکوٰۃ، یہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ہے اور یہ ان لوگوں پر فرض ہے جن کا مال نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے۔ زکوٰۃ ان پر ایسے ہی فرض ہے جس طرح کہ ان پر نماز فرض ہے، یہ امیروں سے لے کر غریبوں کو لوٹا دی جاتی ہے۔ اس طرح معاشرتی زندگی کا معاشی توازن برقرار رہتا ہے۔

﴿لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ، وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾

ان کے لیے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس اور نہیں ہے خوف ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

لَھُمْ (لَ.ھُمْ) لیے، ان کے، اَجْرُھُمْ (اَجْرُ.ھُمْ) اجر، ان کا، عِنْدَ پاس، رَبِّھِمْ (رَبِّ.ھِمْ) رب، ان کے (جو نیک اعمال کرنے والے اور نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرنے والے ہیں) ایسے لوگوں کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، وَ لَا خَوْفٌ اور نہیں ہے خوف، عَلَیْھِمْ (عَلٰی.ھِمْ) اوپر، ان کے، وَلَا ھُمْ اور نہ ہی وہ، یَحْزَنُوْنَ وہ غمگین ہوں گے فعل مضارع جمع مذکر غائب (حَزِنَ، یَحْزَنُ، حَزَنًا) غم کھانا۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''سودی نظام کے صفحہ کے بالمقابل اس صفحہ میں ابھرا ہوا پہلو زکوٰۃ کا ہے، خرچ کرنے کا پہلو جس میں نہ مال کی واپسی کا کوئی سوال ہے اور نہ (اس دنیا میں) کوئی معاوضہ ملنا ہے، آیت اہل ایمان کی صفات اور مؤمن سماج (معاشرہ) کی بنیادوں کو بیان کرتی ہے اور پھر یہ واضح کرتی ہے کہ اس مؤمن سماج پر امن، طمانیت اور رضائے الٰہی کی بارش ہوگی۔

زکوٰۃ باہمی تعاون و کفالت پر قائم سماج کی بنیاد ہے، اس سماج میں افراد کی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت ہوتی ہے، یہ سماج اپنی زندگی کے کسی پہلو میں سودی ضمانتوں کا محتاج نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زکوٰۃ کی شکل ہمارے اور امت مسلمہ کے ان گروہوں اور نسلوں کے ذہن و دماغ میں دھندلا گئی ہے جنہوں نے اسلامی نظام کو واقعات کی دنیا میں عمل پیرا نہیں دیکھا، جنہوں نے ایمانی فکر، ایمانی تربیت اور ایمانی

اخلاقیات کی اساس پر اس نظام کو قائم ہوتے نہیں دیکھا، حقیقت یہ ہے کہ ان امور کے نتیجے میں انسانی نفوس ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتے ہیں، پھر ان کے لیے ایک ایسا نظام قائم ہوتا ہے جس میں صحیح افکار و تصورات، پاکیزہ اخلاق اور اعلیٰ فضائلِ اعمال کا دور دورہ ہوتا ہے۔ زکوٰۃ اس نظام کی بنیاد ہے یہ نظام، جاہلیت کے اس نظام کے بالمقابل ہے جو سود کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، اس نظام میں زندگی کی نشوونما اور اقتصادیات کا ارتقاء فرد کی محنت اور افراد کے باہمی تعاون سے ہوتا ہے، یہ تعاون سود کی آلائش سے پاک ہوتا ہے۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اس رکوع میں دو قسم کے کردار ہمارے سامنے آتے ہیں.....ایک قسم کے وہ لوگ ہیں جو حرص و ہوس کے بندے، پیٹ کے پجاری، دھن دولت اکٹھی کرنا اور لوگوں کو تڑپا تڑپا کر ان سے دولت چھیننا ان کی زندگی کا مقصد ٹھہرتا ہے، یہ لوگ سود خور، سنگدل، بے مروت، احسان اور رحم دلی سے نا آشنا، خود غرض، زر پرست اور قارونی ذہن وفکر کے مالک ہیں جن کا انجام نہ صرف دنیا میں ذلت اور بدنامی ہے بلکہ آخرت میں بھی رسوائی اور پریشانی ہے.....دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن کی زندگیاں ایمان اور اعمال صالحہ کے سانچے میں ڈھلی ہیں ایک طرف ان پاکبازوں کی پیشانیاں اپنے خالق و مالک کے سامنے جھکی رہتی ہیں تو دوسری طرف حق حلال اور محنت و مشقت سے کمائی ہوئی دولت سے غرباء و مساکین، بیوگان اور یتامیٰ کی خدمت ان کی زندگیوں کا مقصد ٹھہرتا ہے، یہ لوگ صدیقی اور عثمانی ذہن وفکر کے مالک ہیں، ان کی نیک نامی اور عزت نہ صرف رہتی دنیا تک قائم رہتی ہے بلکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں دائمی مسرت اور حیات جاوداں ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔

۲) آپ خود فیصلہ کیجیے کہ ایک فلاحی معاشرہ قائم کرنے میں کس کردار کے لوگ معاون اور مددگار ہو سکتے ہیں؟ سود خور یا صدقہ وخیرات کرنے والے؟ آخرت میں تو ایسے نیک کردار، متقی، خاشع، خادم خلق انسانوں کی خوش انجامی اور ابدی راحت ظاہر ہی ہے لیکن دنیا میں جو سکونِ قلب، یکسوئی، طمانیت خاطر اور قناعت کی مسرتیں ایسے لوگوں کو حاصل رہتی ہیں ان کا اندازہ وہ بدنصیب کر ہی نہیں سکتے جو چوبیس گھنٹے روپے پیسے کا میزان لگاتے رہتے ہیں اور ہر لحہ بینک بیلنس کے چکر میں رہتے ہیں جن

کے دماغوں پر سوتے اور جاگتے دھن دولت کا بھوت سوار رہتا ہے، اور وہ اسی کرب کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ(۲۷۸) فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ(۲۷۹) وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ(۲۸۰) وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ(۲۸۱)	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے اور اگر توبہ کر لو تو تم اپنے اصل سرمایہ (لینے) کے حقدار ہو، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے اور اگر مقروض تنگ دست ہے تو اسے اس کی آسودہ حالی تک مہلت دو اور اگر تم سمجھ رکھتے ہو، تو تمہارے لیے بہتری کی بات تو یہ ہے کہ (ایسے تنگدست بھائی کو) اس کا قرض بطور خیرات بخش دو اُس دن کی رسوائی اور مصیبت سے بچو جبکہ تم اللہ کی طرف واپس ہو گے، وہاں ہر شخص کو اس کی کمائی ہوئی نیکی اور بدی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم ہرگز نہ ہوگا۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور چھوڑ دو جو باقی رہا سود سے اگر (واقعی) تم ایمان لانے والے ہو۔

یٰٓاَیُّھَا اے لوگو! خطاب کے لیے استعمال ہوتا ہے، اَلَّذِیْنَ جو، اسم موصول جمع کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کا مفرد الّذی ہے، اٰمَنُوا ایمان لائے ہو (اٰمَنَ، یُؤْمِنُ، اِیْمَانًا) ایمان لانا، اِتَّقُوا اللّٰہَ ڈرتے رہو، اللہ تعالیٰ سے، اِتَّقُوْا صیغہ جمع مذکر غائب (اِتَّقٰی، یَتَّقِیْ، اِتِّقَاءٌ) ڈرنا، خوف کھانا ہر وقت اور ہر لحہ اللہ سے ڈرنا اور کوئی کام ایسا نہ کرنا جو اس کی ناراضی کا سبب ہو، تقویٰ ہی تمام نیکیوں کی اصل اور بنیاد ہے۔ وَ ذَرُوْا اور چھوڑ دو، فعل امر جمع مذکر حاضر (وَذَرَ، یَذَرُ، وَذْرًا) چھوڑنا، مَا موصول (جو)، بَقِیَ باقی رہا فعل ماضی واحد مذکر غائب (بَقِیَ، یَبْقٰی، بَقَاءً) باقی رہنا، مِنَ الرِّبٰوٓا سود میں سے، اِنْ کُنْتُمْ اگر ہو تم فعل ماضی جمع مذکر حاضر (کَانَ، یَکُوْنُ، کَوْنًا) ہونا، مُّؤْمِنِیْنَ مومن ایمان لانے والے، یعنی ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو حرز جاں بناؤ اور یہ حکم سننے کے بعد مقروض سے بقیہ سود چھوڑ دو، ہاں اپنی اصل رقم لینے کے حقدار ہو۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''کہ ایمان کا مقتضیٰ سارے ہی احکام قرآن پر عمل کرنا ہے محققین نے اس ٹکڑے سے یہ استدلال کیا ہے کہ شریعت کے کسی ایک جزء سے بھی انکار کرنا ساری شریعت سے انکار ہے۔ (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾

اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا پس اگر نہ کیا تم نے (ایسا، یعنی سود لینے سے باز نہ آؤ) (فَ. اِنْ) پس۔ اگر، اِنْ (شرطیہ ہے)، لَّمْ تَفْعَلُوْا نہ کیا تم نے ایسا، لَمْ فعل مضارع کے شروع میں آئے تو ماضی منفی کا معنی دیتا ہے اور اگر نون جمع کا ہو تو وہ گر جاتا ہے، فَاْذَنُوْا (فَ. اْذَنُوْا) پس، خبردار، ہو جاؤ (آگاہ رہو) اَذِنَ، یَاْذَنُ، اَذَنًا، جاننا، آگاہ ہونا، درحقیقت یہ لفظ اُذُنٌ سے ہے جس کے معنی ''کان'' کے ہیں، بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ گویا کہ اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے جنگ کا اعلان ہے۔

سید قطب شہید لکھتے ہیں:

''امن وسکون اور مسرت وکامرانی کے زیر سایہ جس کا وعدہ اللہ نے امت مسلمہ سے کیا ہے..... جو سود کو

اور اس کے ساتھ کفر و اثم کو اپنی زندگی سے نکال باہر کرتی ہے اور ایمان، عمل صالح، عبادت اور زکوٰۃ پر اپنی زندگی کو قائم و استوار کرتی ہے..... اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو آخری الٹی میٹم دیتا ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو مبغوض اور ناپاک سودی نظام سے بالکلیہ الگ کر لیں بصورت دیگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے کھلی جنگ کے لیے تیار ہو جائیں جس کے سلسلے میں کوئی رواداری نہ برتی جائے گی اور نہ ڈھیل یا مہلت دی جائے گی۔

آیت کی رو سے اہل ایمان کا ایمان بقیہ سود کے ترک کر دینے پر معلق ہے، آیت سے واضح ہوتا ہے کہ لوگ مؤمن نہیں ہیں اِلّا یہ کہ وہ تقویٰ اختیار کریں اور لوگوں پر جو سود رہ گیا ہے اسے چھوڑ دیں، ہاں! ہاں! وہ مؤمن نہیں ہیں، خواہ اس بات کا اعلان کرتے رہیں کہ وہ مؤمن ہیں، احکام الٰہی کی پیروی اور اطاعت وانقیاد کے بغیر کوئی ایمان نہیں، آیت اس سلسلے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنے دیتی، وہ کسی شخص کو اس بات کا موقع نہیں دیتی کہ وہ کلمہ کے پردے میں چھپ جائے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا پیرو نہ ہو، نہ اُن پر راضی و مطمئن ہو، نہ انہیں اپنی زندگی میں نافذ کرتا ہو، نہ اپنے معاملات میں اُن کے مطابق فیصلے کرتا ہو، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دین میں، عقائد اور معاملات کے مابین تفریق کرتے ہیں، وہ مؤمن نہیں ہیں خواہ وہ ایمان کے مدعی ہوں، اپنی زبان سے اس کا اعلان کریں، حتیٰ کہ وہ اپنی عبادات کے ذریعہ اس بات کا اظہار کریں کہ وہ مؤمن ہیں۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ. ''اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان جنگ ہے۔''

''اُف! کس قدر ہولناک ہے یہ ترہیب! اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان جنگ! جنگ، جس سے انسانی نفوس دوچار ہوں گے! مہیب جنگ، جس کا انجام معلوم اور نتیجہ متعین ہے! کہاں ناتواں اور فانی انسان اور کہاں اللہ کی زبردست، بے پناہ اور فنا کرنے اور مٹا دینے والی عظیم قوت!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کے نزول کے بعد..... اور یہ آیات بعد میں نازل ہوئی تھیں..... مکہ میں اپنے عامل کو حکم دیا کہ وہ آل مغیرہ سے..... اگر وہ سودی کاروبار سے باز نہ آئیں..... جنگ کریں، اسی طرح آپ ﷺ نے فتح مکہ کے دن اپنے خطبے میں دور جاہلیت کے ہر سود سے مقروضوں کو سبکدوش کرنے کا حکم دیا جو اسلام کے آنے کے بعد بھی طویل مدت تک سود کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے، یہاں تک کہ مسلم سماج پختہ ہو گیا، اُس کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں اور وہ وقت آ گیا کہ اسلام کے اقتصادی نظام کو

سود کے زہریلے اثرات سے بالکلیہ پاک کر دیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطبہ میں ارشا فرمایا تھا:

كُلُّ رِبًا فِي الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ وَ اَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَا الْعَبَّاس جاہلیت کا ہر سود ساقط اور میرے ان دو قدموں کے نیچے ہے اور جس سود کو میں سب سے پہلے ساقط کرتا ہوں وہ (اپنے چچا) عباسؓ کا سود ہے، لیکن آپ نے اس زائد مال کے واپس کرنے کا حکم نہیں دیا جو لوگ جاہلیت کی حالت میں سود کی صورت میں لے چکے تھے۔

اس لیے اسلامی فرماں روا کی..... جب اسلامی معاشرے کی داغ بیل ڈال دی جائے۔ یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان لوگوں سے جنگ کرے جو سودی نظام کے لیے مُصِر اور احکامات الٰہی سے سرتابی کے مرتکب ہوں، خواہ وہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کریں، جس طرح کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے جنگ کی تھی حالانکہ وہ کلمہ طیبہ **لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ** کی شہادت دیتے اور نماز ادا کرتے تھے، کیونکہ جو شخص شریعت الٰہی کی پیروی اور اسے اپنی زندگی میں نافذ کرنے کو تیار نہ ہو، وہ مسلمان نہیں ہے۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

﴿وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾

اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے لیے تمہارا اصل سرمایہ ہے نہ تم کسی کا حق مارو گے نہ تمہارا حق مارا جائے گا۔

وَ اِنْ اور اگر، اِنْ شرطیہ ہے، تُبْتُمْ توبہ کرو تم، فعل ماضی جمع مذکر حاضر (تَابَ، يَتُوْبُ، تَوْبَةً) توبہ کرنا، التّوبہ، گناہ پر نادم و پشیمان ہونا اور اس کے نتیجے میں اللہ کی جانب رجوع کرنا، تَابَ، گناہ سے باز آیا اور نیکیوں کی طرف لپکا، توبہ کا صلہ اگر حرف اِلٰی ہو تو اُس کے معنی انابت یا اللہ کی طرف لوٹنے کے ہوتے ہیں، قرآن حکیم میں ہے: **وَتُوْبُوا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا** (النور ۲۴:۳۱) اور اگر لفظ تَابَ کا فاعل اللہ ہو تو اس کے معنی اللہ تعالیٰ کے کرم و بخشش کی ارزانیاں ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: **لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ** (التوبہ ۹:۱۱۷) بے شک اللہ تعالیٰ نے نبیؐ پر اور مہاجرین و انصار پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی۔

پھر اسلام میں سچے دل سے توبہ کرنے کا اجر یہ ہے، رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: اَلتَّائِبُ مِنْ ذَنْبِهٖ

كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ (الحدیث) اپنے گناہوں سے (اللہ تعالیٰ کے حضور) توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس سے کبھی گناہ سرزد ہوا ہی نہ تھا۔

وَ اِنْ تُبْتُمْ اور اگر تم نے توبہ کرلی (سود لینے سے باز آ گئے) فَلَكُمْ (فَ.لَكُمْ) پس، تمہارے لیے ہے، رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ تمہارے اصل مال، رُءُوْسُ کا مفرد رَأْسٌ ہے اس کا لفظی معنی ہر چیز کا بالائی حصہ، چوٹی، سر، دل، دماغ، اسی سے رَأْسُ مَالٍ، سرمایہ، اصل رقم (جو کسی مقروض کو دی جائے) اَمْوَالِكُمْ (اَمْوَالِ.كُمْ) مال، تمہارے، یعنی سود خوری سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ مقروض سے صرف اپنی اصل رقم تو لینے کے حقدار ہو مگر اس سے اوپر تمہارے لیے قطعی حرام ہے، لَا تَظْلِمُوْنَ نہ ظلم کرو تم فعل مضارع جمع مذکر حاضر (ظَلَمَ يَظْلِمُ، ظُلْمًا) ظلم کرنا، زیادتی کرنا، وَلَا تُظْلَمُوْنَ مضارع مجہول جمع مذکر حاضر نہ تم پر ظلم کیا جائے گا یعنی نہ تم کسی کا حق مارو گے، نہ تمہارا حق مارا جائے گا، اگر تم نے مصیبت کے وقت کسی سے دست تعاون بڑھایا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا اجر ثبت ہو گیا ہے، شرف انسانیت کا تقاضا ہے کہ تم اپنی اصلی رقم ہی واپس لو اور اپنے اجر کو ضائع نہ ہونے دو۔

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾

اور اگر ہو (قرضدار) تنگ دست، پس ڈھیل دینا (چاہیے) اس کی آسانی تک۔

وَاِنْ اور اگر، كَانَ ہو (یعنی قرض اٹھانے والا) ذُوْعُسْرَةٍ (ذُوْ.عُسْرَةٍ) والا، تنگ ہاتھ، ذو کے معنی، والا، عُسْرَةٍ کے معنی تنگدست، مفلسی، اگر مقروض مال نہ ہونے کی وجہ سے تنگ دست ہو، فَنَظِرَةٌ (فَ.نَظِرَةٌ) پس، ڈھیل دینا (مہلت دینا) ہے، اس کا مادہ (ن ظ ر) نَظَرَ، يَنْظُرُ، نَظْرًا، کسی چیز پر نگاہ ڈالنا، غور سے دیکھنا جیسا کہ نَظَرَ فِي الْكِتَاب، کتاب کو غور سے پڑھنا، نَظَرَ لِفُلَانٍ، کسی پر ترس کھا کر مدد کرنا، یہاں پر مہلت دینا، انتظار کرنا کے معنی ہیں، اِلٰى مَيْسَرَةٍ سہولت تک، آسانی تک، مَيْسَرہ کا مادہ يُسْرٌ ہے اس کے معنی آسانی کے ہیں یہ عُسْر (تنگی) کی ضد ہے۔

یعنی مقروض اگر تنگدست ہو تو اس پر ادائے قرض کے لیے سختی نہ کی جائے بلکہ اسے مہلت دی جائے کہ وہ آسانی سے قرض اتار سکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کو سامنے رکھا جائے وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ أَخِيْهِ۔ ''کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کا معین و مددگار رہتا ہے جب

تک بندہ اپنے بھائی کا معین و مددگار رہے۔''

﴿وَ اَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾

اور اگر (اس کا قرض بطور خیرات) بخش دو، تو یہ تمہارے لیے بہتری کی بات ہے اگر تم کو جانو تو۔

وَ اَنۡ اور یہ کہ، اَنۡ حروف ناصبہ میں سے ہے یعنی اپنے بعد والے اسم کو (نصب) زبر دیتا ہے اور اگر نون جمع کا ہو تو وہ گر جاتا ہے جیسا کہ تَصَدَّقُوۡنَ تھا مگر اَنۡ کی وجہ سے تَصَدَّقُوۡا رہ گیا، یہ کہ اگر تم خیرات کر دو یعنی تنگدست مقروض کو جو روپیہ پیسہ ادھار دیا تھا بخش دو، تَصَدَّقُوۡا (تَصَدَّقَ، یَتَصَدَّقُ، صَدَقَۃٌ) اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے صدقِ دل کے ساتھ خیرات کرنا، صدقہ کرنا، خَیۡرٌ لَّکُمۡ بہتر ہے وہ تمہارے لیے، اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ اگر تم جانتے ہو (عَلِمَ، یَعۡلَمُ، عِلۡمًا) جاننا، کسی حقیقت کو پہچاننا علاوہ ازیں دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ تنگ دست مقروض کا زکوٰۃ کے مصارف میں بھی حصہ ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَالۡعٰمِلِیۡنَ عَلَیۡهَا وَالۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَ فِی الرِّقَابِ وَالۡغٰرِمِیۡنَ وَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ، فَرِیۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ (التوبہ۹:۶۰)

''صدقات (زکوٰۃ) غریبوں، مسکینوں، زکوٰۃ (کی وصولی) کا کام کرنے والوں، ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، غلاموں کو آزاد کرانے، مقروضوں کی امداد اور اللہ کی راہ میں کام کرنے والوں اور مسافروں کی مدد کے لیے ہیں، یہ اللہ کا مقرر کردہ ضابطہ ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے۔''

لفظ ''وَالۡغٰرِمِیۡنَ'' پر غور کر لیا جائے کہ انہوں نے ذاتی ضروریات کے لیے قرض اٹھایا مگر حالات سے مجبور ہو گئے اور قرض واپس کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، تو ایسے لوگوں کی مالِ زکوٰۃ سے امداد کی جا سکتی ہے۔

﴿وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡهِ اِلَی اللّٰهِ ۟ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَ هُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ﴾

اور اس دن سے ڈرو، جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر اس شخص کو جو کچھ اس نے کمایا تھا (اچھا یا برا عمل) پورا پورا ادا کر دیا جائے گا اور لوگوں پر (ذرا بھی) ظلم نہ ہوگا۔

وَاتَّقُوْا اورڈرو،فعل امرجمع مذکر(اِتَّقٰی، یَتَّقِیْ، اِتِّقَاءٌ)ڈرنا، بچنا، باب افتعال اس کا مادہ(وق ی)، تُرْجَعُوْنَ (کہ)تم لوٹائے جاؤ گے،مضارع مجہول جمع مذکر حاضر(رَجَعَ، یَرْجِعُ، رِجَاعًا وَ رُجُوْعًا) لوٹنا، واپس آنا،یَرْجِعُ سے جمع مذکر حاضر کاتَرْجِعُوْنَ ہےاوراس سے مجہول کا صیغہ تُرْجَعُوْنَ تم لوٹائے جاؤ گے۔فِیْهِ (فِیْ.هِ) میں۔اُس،یعنی دن میں(روزِ قیامت)،اِلَی اللّٰهِ طرف اللہ تعالیٰ کے، ثُمَّ پھر، تُوَفّٰی پورابدلہ دیا جائے گا،مضارع مجہول واحد مؤنث(وف ی)اس کا مادہ ہے(وَفّٰی، یُوَفِّیْ)پوراپورا بدلہ دیناتُوَفّٰی واحد مؤنث مجہول کا صیغہ نفس کی طرف جاتا ہے، کُلُّ نَفْسٍ ہرنفس کویعنی ہرجان کواس کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دیا جائے گا، مَا كَسَبَتْ جوکمایا(اس نفس نے)فعل ماضی واحد مؤنث غائب،نفس چونکہ عربی میں مؤنث استعمال ہوتا ہےاس لیےاس کے لیےفعل مؤنث استعمال ہوا ہے (كَسَبَ، یَكْسِبُ، كَسْبًا) کمانا،عمل کرنا یعنی عمل کی پونجی جوکسی نفس نے اکٹھی کی وہ روز قیامت اس کا بدلہ پالے گا،وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ اوران پر(لوگوں پر)ظلم نہیں کیا جائے گا،مضارع مجہول جمع مذکر غائب (ظَلَمَ، یَظْلِمُ، ظُلْمًا)ظلم کرنا،یَظْلِمُ، سےجمع کا صیغہ یَظْلِمُوْنَ اور مجہول کا صیغہ یُظْلَمُوْنَ وہ ظلم کیے جائیں گے،لَا یُظْلَمُوْنَ اُن پر ہرگز ظلم نہیں کیا جائے گا(کہ کسی کا نیک عمل بلا معاوضہ رہ جائے یا کسی کے نامۂ اعمال میں کوئی بدی خواہ مخواہ لکھ دی جائے)۔ذرہ کی کیا حقیقت ہے، یہ وہ باریک جز ہے جسے ظاہری آنکھ دیکھنے سے قاصر ہے البتہ کسی سوراخ سے آفتاب کی کرن کمرے میں آرہی ہوتو ہوا میں موجود ذرے دیکھے جاسکتے ہیں،قرآن حکیم کی بلاغت وفصاحت پرغور کیجیے کہ روز جزا ذرہ بھر نیکی یا ذرہ بھر بدی دونوں سامنے آجائیں گےاوراللہ تعالیٰ کے یہاں چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ریکارڈ ہوجاتی ہے:

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ○ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ (الزلزال۹۹:۷،۸)

''پھرجس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گااورجس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اسے پالے گا۔''

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) اہل ایمان اسی وقت مؤمن شمار ہوں گے جب وہ اسلام کے قوانین کے محافظ بنیں اوران کی جھلک ان کی زندگیوں میں نظر آئے،اس کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم ان کے دلوں کوتقویٰ سے بھی آراستہ کرتا

ہے، درحقیقت یہی وہ پاکیزہ احساس ہے جس پر اسلام اپنے قوانین کے نفاذ کا دارومدار رکھتا ہے۔ یہ جذبہ انسانی قلوب میں چھپا ہوتا ہے اور یہی اسلامی قوانین کے نفاذ کا حقیقی ضامن ہے، انسانی قوانین کے نفاذ کا دارومدار تمام تر خارجی نگرانی پر ہوتا ہے، لیکن دل کے اندر تقویٰ اس کا پاسبان نہ ہو تو خارجی نگرانی کے مقابلے میں حیلہ جوئی اور بہانہ بازی بہت آسان ہے، اس لیے قرآن حکیم نے بار بار اہل ایمان کو تقویٰ اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے، ان آیات میں بھی یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں اور سود ایسی برائی سے باز رہیں، یہ ترغیب کا پہلو ہے، ایسا نہ کریں گے تو یہ گویا کہ اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان جنگ ہے۔

۲) قانون وجود میں آنے کے بعد ہی نافذ ہوتا ہے اور اس کے آثار و نتائج اس کے نافذ ہونے کے بعد رونما ہوتے ہیں، رہا وہ سود جو لیا جا چکا تو اس کا معاملہ قانون کا نہیں، اللہ کے حوالے ہے، اگر اسلام قانون کا نفاذ گزشتہ دور سے کرتا تو ایک عظیم اقتصادی اور اجتماعی ہلچل مچ جاتی، جس سے اسلام نے اجتناب کیا۔

۳) صدق دل سے توبہ کے ساتھ سابقہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اسلام ہی اس خوبی میں مذاہب عالم میں ممتاز نظر آتا ہے۔

۴) نرمی اور نرم دلی بھی اسلام کی نمایاں خصوصیات میں سے ہے وہ بشارتوں اور محبتوں کا پیغام ہے، وہ کمزوروں اور دبے ہوئے لوگوں کو مزید نہیں دباتا، وہ گرے پڑے لوگوں کو اٹھاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اگر مقروض تنگ دست ہو تو اسے آسانی پیدا ہونے تک مہلت دو، اگر معاف کر دو تو اس پر تمہیں بھی معافی کا مژدہ سنایا جاتا ہے اور روزِ جزا انعام عظیم کے حقدار ٹھہرو گے۔

۵) وہ تمھیں آخرت کے لازوال اور اللہ تعالیٰ کے ان گنت انعامات کی خوشخبریاں دیتا ہے، اس عارضی زندگی میں تھوڑے سے احسان و مروت کے صلہ میں ابدی زندگی کی نوید سناتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ

اے ایمان والو! جب کبھی ایسا ہو کہ تم خاص مدت کے لیے آپس میں قرض کا لین دین کرو، تو اسے لکھ لیا کرو۔ اور فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو، اسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے لکھنے والا لکھے اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے اور اُسے اللہ، اپنے پالنہار سے ڈرنا چاہیے کہ (فریقین) میں جو معاملہ طے ہوا ہے، اُس میں کمی بیشی نہ کرے، لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو یا املا نہ کرا سکتا ہو، تو اس کی جانب سے اس کا ولی (سرپرست) انصاف سے املا کرائے، پھر اپنے مَردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کراؤ، اگر دو مرد نہ ہوں، تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے، یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہییں، جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو، گواہوں کو جب گواہ بننے کے لیے کہا جائے تو انہیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا مدت کے تعین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوا لینے میں سستی نہ کرو

ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَاللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۸۲)	اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمہارے لیے زیادہ مبنی بر انصاف ہے، اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت رہتی ہے اور تمہارے شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم ہو جاتا ہے، ہاں جو تجارتی لین دین تم لوگ دست بدست کرتے ہو اُسے نہ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں، مگر تجارتی معاملے طے کرتے وقت گواہ کر لیا کرو، (یاد رکھو) کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے، ایسا کرو گے تو گناہ کا ارتکاب کرو گے، اللہ کے غضب سے بچو، وہ تم کو صحیح طریق عمل کی تعلیم دیتا ہے اور وہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا، اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ﴾

اے ایمان والو! جب کبھی ایسا ہو کہ تم خاص مدت کے لیے آپس میں قرض کا لین دین کرو، تو اسے لکھ لیا کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اے ایمان والو!، يٰٓاَيُّهَا اے، خطاب کے لیے آتا ہے، اَلَّذِيْنَ لوگ جو اسم موصول، اٰمَنُوْا فعل ماضی جمع مذکر غائب (اَمَن، يُؤمِنُ اِيْمَانًا) ایمان لانا، اِذَا جب، تَدَايَنْتُمْ تم معاملہ کرو (لین دین کرو) فعل ماضی جمع مذکر حاضر (تَدَايَنَ، يَتَدَايَنُ، تَدَايُنٌ) باب تفاعل، آپس میں لینے دینے کا معاملہ کرنا اس کا مادہ (د ی ن) ہے جس کے معنی قرض کے ہیں بِدَيْنٍ (بِ. دَيْنٍ) ساتھ۔ قرض یعنی قرض کے بارے میں (کوئی معاملہ ہو)، اِلٰٓى اَجَلٍ طرف (تک) مدت کے، مُّسَمًّى مقرر، یہ اجل کی صفت ہے، صفت اور موصوف مل کر مرکب توصیفی بنتا ہے، فَاكْتُبُوْهُ (فَ. اكْتُبُوْ. هُ) پس، لکھ لو، اس کو (لین دین

کو) (کَتَبَ، یَکْتُبُ، کِتَابَۃً) لکھنا، کاتب لکھنے والا، خط و کتابت اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے یعنی اہل ایمان آپس کے لین دین کو تحریر میں لے آئیں تا کہ ان کے درمیان کسی جھگڑے اور فساد کا امکان نہ رہے۔

﴿وَ لْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ﴾

اور چاہیے کہ لکھے تمہارے درمیان کاتب (لکھنے والا) ساتھ انصاف کے۔

وَ لْیَکْتُبْ (وَ.لْ.یَکْتُبْ) اور چاہیے، کہ لکھے لَامُ امر، تاکید کے لیے آتا ہے اور یَکْتُبْ کی ''ب'' پر جزم اِس لام کی وجہ سے ہے، کَاتِبٌ لکھنے والا، اسم فاعل ہے، بِالْعَدْلِ (بِ.الْعَدْلِ) ساتھ، عدل کے (انصاف کے) کاتب کو بہر حال انصاف سامنے رکھتے ہوئے کمی بیشی سے ڈرنا چاہیے، ہر بات کو ٹھیک ٹھیک لکھے اور اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے رکھے۔

﴿وَلَا یَاْبَ کَاتِبٌ اَنْ یَّکْتُبَ کَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَکْتُبْ﴾

اور نہ انکار کرے کاتب (لکھنے سے) جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہے۔

وَلَا یَاْبَ اور نہ انکار کرے فعل نہی (اَبٰی، یَاْبٰی، اِبَاءٌ) انکار کرنا، کَاتِبٌ کاتب (لکھنے والا) اَنْ یَّکْتُبَ کہ وہ لکھے، کَمَا جیسا کہ کلمۂ تشبیہ، عَلَّمَهُ اللّٰهُ سکھلایا اس کو اللہ نے (عَلَّمَ، یُعَلِّمُ، تَعْلِیْمٌ) سکھلانا، ''ہٗ'' کی ضمیر کاتب کی طرف جاتی ہے، فَلْیَکْتُبْ (فَ.لْ.یَکْتُبْ) پس، چاہیے، (کہ) وہ لکھے، یہاں لام امر وجوب (تاکید) کے لیے ہے اور اس نے مضارع کو حالت جزم میں کر دیا ہے، یَکْتُبُ کی بجائے یَکْتُبْ ہو گیا ہے، لکھنا پڑھنا اللہ تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی ہے، اس قلم کے ذریعے دوسروں کو فیض یاب کرنا مؤمن کے لیے لازمی امر ہے۔

﴿وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْئًا﴾

اور چاہیے کہ اِملا کرائے (لکھوائے) وہ شخص جس کے اوپر ہے حق اور چاہیے کہ وہ ڈرے اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پالنہار ہے اور نہ کم کرے اس سے کچھ بھی۔

وَلْیُمْلِلِ (وَ.لْ.یُمْلِلِ) اور چاہیے (کہ) اِملا کرائے (لکھوائے) لام امر، تاکید کے لیے ہے،

(م ل ل) اس کا مادہ ہے (اَمَلَّ، یُمِلُّ، اِمْلَالٌ) بابِ افعال، لام امر کی وجہ سے حالت جزم میں ہے اور حالت جزم میں فکِّ ادغام کی صورت جائز ہے اس وجہ سے وَلْیُمِلَّ کی بجائے وَلْیُمْلِلِ پڑھا گیا (ایک شخص کا بولنا اور دوسرے کا لکھتے جانا، املا کروانا) وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ اور چاہیے کہ ڈرے اللہ اپنے پروردگار سے پھر لام امر تاکید کے لیے آیا ہے (اِتَّقٰی، یَتَّقِیْ، اِتِّقَاءٌ) تقویٰ اختیار کرنا وَلْیَتَّقِیْ کی بجائے وَلْیَتَّقِ لام امر کی وجہ سے حرف علّت گر گیا، اور چاہیے کہ لکھنے والا (کاتب) اپنے پروردگار اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے، اُس کے رب نے اسے زندگی بخشی اور طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے اور لکھنا پڑھنا بھی اس کی عطا اور دین ہے:

اِقْرَأْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ، الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (العلق ۹۶:۳-۴)

"پڑھیے، آپ کا رب تو بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔"

وَلَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْئًا اور نہ کم کرے اس میں سے کچھ بھی۔ وَلَا یَبْخَسْ اور نہ کم کرے، فعل نہی واحد مذکر غائب (بَخَسَ، یَبْخَسُ بَخْسًا) کم کرنا، لکھنے میں کمی بیشی سے کام لینا، وَلَا یَبْخَسْ مِنْهُ (مِنْ.هُ) اس سے، اس لکھائی میں سے جو مقروض کے لیے لکھی جا رہی ہے، شَیْئًا (کچھ بھی) یعنی تھوڑی سی بھی ہیر پھیر والی بات نہ ہونی چاہیے۔

﴿فَاِنْ کَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ﴾

اور اگر وہ (شخص) جس کے اوپر حق ہے کم عقل یا ضعیف ہو یا املا کرانے کی استطاعت نہیں رکھتا تو چاہیے کہ لکھوائے (املا) کرائے اس کی جانب سے اس کا سرپرست عدل وانصاف کے ساتھ۔

فَاِنْ پس اگر، اِنْ شرطیہ کہلاتا ہے، کَانَ ہو فعل ماضی واحد مذکر غائب (کَانَ، یَکُوْنُ، کَوْنًا) ہونا، الَّذِیْ وہ (شخص) اسم موصول، عَلَیْهِ (عَلٰی.هِ) اوپر، اس کے، الْحَقُّ حق (یعنی قرض اٹھانے والا)، سَفِیْهًا کم عقل، ناواقف (unwise or having a little knowledge)، اَوْ یا، ضَعِیْفًا کمزور، بہت بوڑھا آدمی یا بچہ (very old man or child)، اَوْ یا، لَا یَسْتَطِیْعُ نہ استطاعت (طاقت) رکھتا ہو، اَنْ یُّمِلَّ هُوَ یہ کہ املا کرائے وہ، فَلْیُمْلِلْ پس املا کرائے (اس کی جگہ)، وَلِیُّهٗ

(وَلِیُّ.ہٗ) ولی (سرپرست) اس کا، بِالْعَدْلِ (بِ.الْعَدْلِ) ساتھ، انصاف کے، عدل وانصاف کے دامن کو کسی حال میں بھی نہ چھوڑنا چاہیے کہ یہی فلاحی معاشرے کی اساس ہے۔

﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰىؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا﴾

اور (قرض اٹھاتے وقت) دو گواہ بنالو اپنے مردوں میں سے پس اگر نہ ہوں دو مرد تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہییں جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو، اور گواہوں کو جب گواہ بننے کے لیے کہا جائے تو انہیں انکار نہ کرنا چاہیے۔

وَاسْتَشْهِدُوْا اور گواہ بناؤ فعل امر جمع مذکر (ش ھ د) اس کا مادہ ہے (اِسْتَشْهَدَ، يَسْتَشْهِدُ، اِسْتِشْهَادٌ) باب استفعال، گواہی طلب کرنا، اس باب کی خصوصیت میں طلب اور چاہت پائی جاتی ہے، شَهِيْدَيْنِ تثنیہ اس کا مفرد شہید ہے، گواہ، مِنْ رِّجَالِكُمْ تمہارے مردوں میں سے، رَجُلٌ مفرد اس کی جمع رِجَالٌ ہے، فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ پس، اگر نہ ہوں، دو مرد (یعنی دو مرد قابل اعتماد نہ مل سکیں) فَرَجُلٌ (فَ.رَجُلٌ) پس۔ ایک آدمی، وَامْرَاَتٰنِ اور دو عورتیں، اس کا مفرد اِمْرَاَةٌ ہے، مِمَّنْ (مِنْ.مَنْ) سے، اس، یعنی ان میں سے، تَرْضَوْنَ (کہ) پسند کرتے ہو تم مضارع جمع مذکر حاضر (رَضِیَ، یَرْضٰی، رِضًا) پسند کرنا راضی ہونا، یعنی یہ لوگ تمہارے نزدیک قابل اعتماد اور پسندیدہ ہونے چاہییں، مِنَ الشُّهَدَآءِ گواہوں میں سے اس کا مفرد شَهِيْدٌ ہے، یعنی اگر دو مرد (قابل اعتماد) گواہ نہ مل سکیں، تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے منتخب کر سکتے ہو، اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا یہ کہ بھول جائے، ایک ان میں سے، تَضِلَّ، مضارع واحد مؤنث غائب (ضَلَّ، یَضِلُّ، ضَلَالًا) صراط مستقیم سے بھٹک جانا، یہاں پر معنی بھول جانا ہے۔ فَتُذَكِّرَ پس یاد دلائے مضارع واحد مؤنث غائب (ذَكَّرَ، یُذَكِّرُ، تَذْكِيْرٌ) یاد دلانا، کسی بات کے ذکر کا اعادہ کرنا، اِحْدٰىهُمَا ایک ان دو میں سے (عورت)، الْاُخْرٰی دوسری عورت کو، آخر، مذکر کے لیے اور اُخریٰ مؤنث کے لیے استعمال ہوتا ہے، وَلَا يَاْبَ اور نہ انکار کریں، الشُّهَدَآءُ گواہ، اس

کا مفرد شہید ہے، اِذَا جب، مَا دُعُوْا وہ بلائے جائیں فعل ماضی مجہول جمع مذکر غائب (دَعَا، یَدْعُوْ، دَعْوَۃٌ) بلانا، دعوت دینا اس لیے کہ معاشرتی زندگی دستِ تعاون بڑھانے کا نام ہے۔

﴿وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ﴾

اور نہ کاہلی (سستی کرو) یہ کہ لکھواس کو (معاملہ) چھوٹا ہو یا بڑا، ایک مقررہ وقت تک۔

وَلَا تَسْئَمُوْٓا اور نہ کاہلی کرو، فعل نہی جمع مذکر حاضر (س ء م) اس کا مادہ ہے (سَئِمَ، یَسْأَمُ، سَئَامَۃٌ) سستی کرنا، کاہلی کرنا، اَنْ تَكْتُبُوْهُ کہ لکھو، اسے (معاہدہ یا قرض وغیرہ کو)، صَغِيْرًا چھوٹا، اَوْ یا، كَبِيْرًا بڑا، اِلٰٓى اَجَلِهٖ ایک مقررہ مدت تک (اَجل.ہ) وقت، اس کے تک، یعنی چھوٹا بڑا معاہدہ، یا ہر چھوٹا بڑا قرض تاریخ کے ساتھ اس کا اندراج کرو، تاکہ کسی بھی پشیمانی کا اندیشہ نہ رہے۔

﴿ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا﴾

یہ (بات) زیادہ انصاف والی ہے اللہ کے نزدیک اور بہت زیادہ درست رکھنے والی ہے شہادت کو اور تمہارے شکوک وشبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

ذٰلِكُمْ، ذَا، یہ، اسم اشارہ كُمْ ضمیر جمع حاضر اَیْ ذٰلِک امْرُ الْكِتَابَةِ، یعنی یہ کتابت اور تحریر میں لانے کا معاملہ یعنی تمہارا یہ لکھنا، اَقْسَطُ عِنْدَاللّٰهِ مبنی بر انصاف ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یعنی یہ کتابت (آپس کے لین دین میں) زیادہ قرین عدل ہے قِسطٌ کے معنی عدل وانصاف اور اَقسَطُ زیادہ قرین عدل، اسم تفضیل کا صیغہ ہے، وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ اور شہادت کو درست تر رکھنے والی بات ہے اَقْوَمُ بھی اسم تفضیل کا صیغہ ہے (قَامَ، یَقُوْمُ، قِیَامًا) کھڑا ہونا، سیدھا ہونا، قَامَ الْاَمْرُ، اعتدال پر آنا متوازن ہونا، سدھرنا، درست ہونا، وَ اَدْنٰٓى یہ بھی اسم تفضیل ہے اور (وہ تحریر) بہت قریب ہے (اَدْنٰی، یُدْنِیُ، اِدْنَاءٌ) زیادہ قریب ہونا، اَلَّا تَرْتَابُوْا کہ تم شبہ میں نہ پڑو، فعل مضارع جمع مذکر حاضر (اِرْتَابَ، یَرْتَابُ، اِرْتِیَابٌ) شک میں پڑنا۔ یعنی آپس میں لین دین، قرض اور ادھار کے سلسلہ کی تحریری دستاویز تیار کرنا اور اس پر شہادت ڈلوانا، تمہیں بہت سے نقصانات سے محفوظ کر دیتا ہے، معاشرتی زندگی کا تانا بانا درست رہتا ہے اور تم جھگڑے فسادات سے محفوظ ہو جاتے ہو۔

﴿اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيۡرُوۡنَهَا بَيۡنَكُمۡ فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَلَّا تَكۡتُبُوۡهَا﴾

مگر یہ کہ ہو تجارت دست بدست تو کوئی حرج نہیں اگر اسے نہ لکھو۔

اِلَّآ مگر کلمہ استثناء، اَنۡ تَكُوۡنَ یہ کہ ہو اَنۡ حروف ناصبہ میں سے ہے جو اپنے بعد والے اسم کو نصب (زبر) دیتے ہیں، تَكُوۡنَ، مضارع واحد مؤنث غائب (كَانَ، يَكُوۡنُ، كَوۡنًا) ہونا، تِجَارَةً حَاضِرَةً تجارت، جو سامنے ہو (دست بدست)، تُدِيۡرُوۡنَهَا بَيۡنَكُمۡ کہ وہ جاری وساری رہتی ہے تمہارے درمیان (اَدَارَ، يُدِيۡرُ، اِدَارَةً) چلانا، پھیرنا، گردش میں رکھنا، اس کا مادہ (دور) ہے، دائرہ، گول چکر اردو میں استعمال ہوتا ہے، دَائِرَةُ السُّوۡءِ، برے حالات، تُدِيۡرُوۡنَهَا، یعنی ایسی تجارت جو گردش میں رہے "هَا" کی ضمیر تجارت کی طرف جاتی ہے بَيۡنَكُمۡ (بَيۡنَ. كُمۡ) درمیان، تمہارے، فَلَيۡسَ (فَ. لَيۡسَ) پس۔نہیں (ہے)، عَلَيۡكُمۡ (عَلَىٰ. كُمۡ) اوپر۔تمہارے، جُنَاحٌ گناہ، اَلَّا (کہ) نہ، تَكۡتُبُوۡهَا تم لکھو، اس کو "ھا" کی ضمیر تجارت کی طرف جاتی ہے اگر ایسا کر دیا جاتا کہ ہر لین دین پر کتابت ہوتی تو اس کی لکھائی میں بڑی مشکلات پیش آتیں، دن میں کئی بار پھل، سبزی، دودھ، مرچ مسالہ اور چھوٹی موٹی اشیاء خریدنے کی ضرورت پڑتی ہے، اس لیے حکیم مطلق نے اسے آزاد چھوڑ دیا کہ ان اشیاء کا دست بدست تبادلہ ہوتا رہے ادھر جیب سے پیسے دیے ادھر چیز لے لی۔

﴿وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيۡدٌ﴾

(ہاں) گواہ بنالو، جب لین دین کرو اور نہ ضرر پہنچایا جائے، کاتب کو اور نہ ہی گواہ کو۔

وَاَشۡهِدُوۡۤا فعل امر جمع مذکر (اَشۡهَدَ، يُشۡهِدُ، اِشۡهَادٌ) گواہ ٹھہرانا، اِذَا جب کلمہ شرط، ظرف زمان (وقت کو ظاہر کرتا ہے) تَبَايَعۡتُمۡ لین دین کرو تم، فعل ماضی جمع مذکر حاضر (تَبَايَعَ، يَتَبَايَعُ، تَبَايُعٌ) جب خرید وفروخت کرو (ایک معینہ مدت کے لیے یا قرض اور ادھار کا معاملہ کرو) اس کا مادہ (ب ی ع) بیع وشریٰ، خرید وفروخت، اردو میں استعمال ہوتا ہے (مثلاً میں نے یہ گھر بیع کر دیا ہے یعنی فروخت کر دیا ہے)، وَلَا يُضَآرَّ اور نہ ضرر پہنچایا جائے، فعل نہی واحد مذکر غائب (ضَارَّ، يُضَارُّ، ضِرَارًا) نقصان

پہنچانا، اس کا مادہ (ض ر ر) ہے۔ ضَرَرٌ تکلیف، نقصان، اردو میں استعمال ہوتا ہے، کَاتِبٌ دستاویز لکھنے والے (کو) وَّلَا شَهِيْدٌ اور نہ گواہ (کو) کاتبٌ اور شَهِيْدٌ اسم فاعل ہیں، اس سے پہلے کاتب اور گواہوں کو حکم مل چکا ہے کہ وہ کتابت اور گواہی سے پہلوتہی نہ کریں اور اب فریقین کو حکم مل رہا ہے کہ وہ بھی کاتب اور گواہوں کو تکلیف اور نقصان نہ پہنچائیں مثلاً کاتب کو غلط عبارت لکھنے پر مجبور کریں یا اس کا لکھنے لکھانے کا معاوضہ دبائیں یا گواہوں کو غلط بیان دینے پر مجبور کیا جائے اور دور دراز علاقے میں بلا کر سفر خرچ سے محروم رکھا جائے وغیرہ۔

﴿وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ﴾ اگر تم ایسا کرو گے تو گناہ کا ارتکاب کرو گے۔

وَ اِنْ تَفْعَلُوْا اور اگر تم ایسا کرو گے، وَاِنْ اور اگر، تَفْعَلُوْا تم کرو گے (ایسا) یعنی احکام الٰہی سے روگردانی کرو گے (فَعَلَ، يَفْعَلُ، فِعْلًا) کرنا، فَاِنَّهٗ (فَ. اِنَّ. هٗ) پس، بے شک، وہ (ہے) یعنی وہ عمل جس سے احکام الٰہی کو توڑا جائے، فُسُوْقٌ فسق اور گناہ (فَسَقَ، يَفْسُقُ، فُسُوْقٌ) عہد کا توڑنا، حدود الٰہی سے تجاوز کرنا یعنی جو باتیں تمہیں سمجھائی جا رہی ہیں ان کی خلاف ورزی نہ کرو ورنہ گنہگار ہو گے اور تمہاری معاشرتی زندگی میں فساد پیدا ہوگا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾

اور اللہ سے ڈرتے رہو وہ تمہیں تعلیم دیتا ہے، اور وہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور ڈرتے رہو اللہ سے (اِتَّقٰى، يَتَّقِيْ، اِتِّقَاءٌ) ڈرنا، خوف کھانا، ہر لمحہ اور ہر لحظہ کھلے اور چھپے ہوئے اس کا خوف دل میں رکھنا اور کوئی کام ایسا نہ کرنا جو اس کی ناراضی کا سبب ہو، وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ اللہ تمہیں تعلیم دیتا ہے (عَلَّم، يُعَلِّمُ، تَعْلِيْمًا) تعلیم دینا، سکھلانا كُم کی ضمیر انسانوں کی طرف جاتی ہے، وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اور اللہ تعالیٰ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے، اس کا ہر حکم تمہاری بھلائی اور بہتری کے لیے ہے اور اس کے علم میں ہے کہ کون تم میں سے اطاعت گزار اور کون نافرمان ہے اور وہ روزِ جزا و سزا تمہیں اس کا ٹھیک ٹھیک بدلہ عطا کرے گا۔

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) معاشرتی زندگی باہمی حسنِ سلوک اور تعاون کا نام ہے، آپ کسی بھائی کو قرض حسنہ دیتے ہیں اور کبھی کسی سے قرض حسنہ لینے کی ضرورت پیش آتی ہے، کبھی تجارت کے سلسلے میں مال قرض پر اٹھانا پڑتا ہے اور کبھی کسی کو قرض پر دینا پڑتا ہے، اس میں بھول چوک کا امکان رہتا ہے اس لیے ایسے معاملے کو تاریخ معینہ کے ساتھ لکھ لینا چاہیے تاکہ معاشرتی زندگی میں کسی جھگڑے اور فساد کا امکان نہ رہے۔

۲) اگر کوئی شخص خود لکھ سکتا ہو تو اپنے ہاتھ سے لکھے وگرنہ کسی کاتب کی خدمات حاصل کی جائیں اور اسے انصاف سے لکھوایا جائے کاتب یا وثیقہ نویس انصاف کے ساتھ لکھے، کسی کی رورعایت کے خیال سے کمی بیشی نہ کرے، لفظ ''عدل'' اور ''تقویٰ'' پر بار بار غور کیجیے کہ ان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے، عدل سے لوگوں کو ان کا جائز حق ملتا ہے اور تقویٰ سے کسی کا حق مارنے سے انسان بچ جاتا ہے۔

۳) جو لوگ اپنے اموال کو ٹھیک طرح سے خرچ کرنا یا اپنے حقوق کی حفاظت کرنا نہیں جانتے ان کی جگہ ان کے سرپرست یا ولی یہ خدمات سرانجام دیں۔

۴) باہمی معاملات، لکھنے کے ساتھ ساتھ شہادت اسے مزید مضبوط بنا دیتی ہے، جھوٹ کی ملاوٹ کا احتمال جاتا رہتا ہے۔ بسا اوقات دو مردوں کی شہادت نہیں ملتی، تو اس وقت ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کو قابل قبول بنا دیا گیا ہے۔ عورتوں کو چونکہ معاملات لین دین اور تجارتی معاہدات سے واسطہ کم پڑتا ہے اس لیے ایسی باتوں کو وہ اچھی طرح یاد نہ رکھ سکیں تو ایک عورت کی کمی کو دوسری پوری کر دے۔

۵) کاتب (وثیقہ نویس) سے جو اجرت لکھانے کی طے ہوتی ہے، اسے ادا کر دیا جائے، اسی طرح گواہوں کو شہادت کے لیے خواہ مخواہ پریشان نہ کیا جائے کہ ان کی محنت مزدوری یا کاروبار میں خلل پڑے مقصود یہ ہے کہ معاشرتی امن وسکون کو ہر حال میں تہہ وبالا ہونے سے بچایا جائے۔

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ ؕ فَاِنۡ اَمِنَ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا فَلۡيُؤَدِّ الَّذِى اؤۡتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكۡتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنۡ يَّكۡتُمۡهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلۡبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ (۲۸۳)	اور اگر تم سفر میں ہو اور کاتب نہ پاؤ تو رہن کے طور پر کوئی شے (قرض دینے والے کے) قبضہ میں دے دو، اور اگر ایک شخص دوسرے شخص کا اعتبار کرے تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے، اُسے چاہیے کہ وہ امانت کو ٹھیک ٹھیک ادا کرے اور اللہ تعالیٰ، اپنے پروردگار کا تقویٰ اختیار کرے، اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو کوئی گواہی کو چھپائے گا، بلا شبہ وہ اپنے دل میں گنہگار ہوگا اور جو کام بھی تم کرتے ہو، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

﴿وَاِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ﴾

اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ تم لکھنے والا تو رہن کے طور پر کوئی شے (قرض دینے والے کے) قبضہ میں دے دو۔

وَاِنۡ اور اگر، كُنۡتُمۡ تم ہو (كَانَ يَكُوۡنُ، كَوۡنًا) ہونا، عَلٰى سَفَرٍ سفر پر، وَ لَمۡ تَجِدُوۡا اور نہ پاؤ (وَجَدَ، يَجِدُ، وِجْدَانٌ) پانا، اس کے شروع میں لَمۡ آنے سے ماضی منفی کے معنی پیدا ہوئے اور مضارع والا جمع مذکر مخاطب کا نون گر گیا، تَجِدُوۡنَ سے تَجِدُوۡا رہ گیا، كَاتِبًا کاتب، اسم فاعل (كَتَبَ، يَكۡتُبُ، كِتَابَةً) لکھنا، فَرِهٰنٌ (فَ. رِهٰنٌ) پس، رہن ہے، رِهٰنٌ جمع، اس کا مفرد رَهۡنٌ ہے یعنی وہ چیز ہے جو بطور ضمانت قرض کے لیے رکھی جائے (مفردات القرآن)، مَّقۡبُوۡضَةٌ (باقبضہ) اسم مفعول (قَبَضَ، يَقۡبِضُ، قَبۡضًا) قبضہ کرنا، یعنی رہن اس چیز کو کہا جائے گا جس کا قبضہ (قرض دینے والے کو) دیا جائے۔ ''اَلرَّهۡنُ'' شرعاً کسی ایسے حق کی ضمانت کے طور پر کوئی چیز اپنے پاس رکھ لینا کہ اگر وہ حق وصول ہونا ممکن نہ رہے تو (قبضہ شدہ) چیز کے ذریعے وصول کیا جا سکے۔'' (القاموس الوحید)

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ مطلب نہیں ہے کہ رہن کا معاملہ صرف سفر ہی میں ہوسکتا ہے بلکہ ایسی صورت چونکہ زیادہ تر سفر میں پیش آتی ہے، اس لیے خاص طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا ہے، نیز معاملہ رہن کے لیے یہ شرط بھی نہیں ہے کہ جب دستاویز لکھنا ممکن نہ ہو، صرف اسی صورت میں رہن کا معاملہ کیا جائے، اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب محض دستاویز لکھنے پر کوئی قرض دینے کے لیے آمادہ نہ ہو، تو قرض کا طالب اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر روپیہ لے لے، لیکن قرآن مجید چونکہ اپنے پیروؤں کو فیاضی کی تعلیم دینا چاہتا ہے اور یہ بات بلند اخلاق سے فروتر ہے کہ ایک شخص مال رکھتا ہو اور وہ ایک ضرورت مند آدمی کو اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر قرض نہ دے، اس لیے قرآن نے قصداً اس دوسری صورت کا ذکر نہیں کیا۔ اس سلسلے میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رہن بالقبض کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی واپسی کا اطمینان ہو جائے، اسے اپنے دیے ہوئے مال کے معاوضے میں (اس چیز سے جو رہن رکھی گئی ہے) فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے، اگر کوئی شخص رہن لیے مکان میں خود رہتا ہے یا اس کا کرایہ کھاتا ہے، تو دراصل سود کھاتا ہے، قرض پر براہ راست سود لینے اور رہن لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانے میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے، البتہ اگر کوئی جانور رہن لیا گیا ہو، تو اس کا دودھ استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس سے سواری و بار برداری کی خدمت لی جاسکتی ہے جو دراصل اس چارے کا معاوضہ ہے جو قرضہ اٹھانے والا، اس جانور کو کھلاتا ہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿فَاِنۡ اَمِنَ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا فَلۡيُؤَدِّ الَّذِى اؤۡتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾

اور اگر ایک شخص دوسرے شخص کا اعتبار کرے تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ امانت کو ٹھیک ٹھیک ادا کرے اور اللہ تعالیٰ، اپنے پروردگار کا تقویٰ اختیار کرے۔

فَاِنۡ (فَ.اِنۡ) پس، اگر، اَمِنَ مطمئن ہو جائے (اعتبار کرے) (أَمِنَ، يَأمَنُ، اَمَانًا وَ اَمَانَةً) مطمئن ہونا، بے خوف ہونا، اِسی سے اَمین وہ شخص ہوتا ہے جو دیانتدار اور قابل اعتماد ہو، بَعۡضُكُمۡ (بَعۡضُ. كُمۡ) بعض، تمہارا، بَعۡضًا بعض کو یعنی ایک دوسرے پر اعتماد کرنے لگو، فَلۡيُؤَدِّ (فَ.لۡ.يُؤَدِّ) پس چاہیے، کہ ادا کرے، اس میں ل لامِ امر کہلاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں ''کہ اسے ایسا ضرور کرنا چاہیے۔'' يُؤَدِّ، ادا کرے (امانت واپس کرے) مضارع واحد مذکر غائب (اَدّٰى، يُؤَدِّىْ، تَأدِيَةٌ) انجام دینا، ادا

کرنا، جیسا کہ اَدَّی الصَّلَاۃَ، نماز ادا کرنا، اَدَّی التَحِیَّۃَ سلامی دینا، اَدَّی الْیَمِیْنَ، حلف اٹھانا، اَدَّی الدَّیْنَ قرض چکانا، اردو زبان میں کسی چیز یا رقم کی ''ادائیگی'' عام فہم لفظ ہے، یُؤَدِّ اصل میں یُؤَدِّیْ تھا، لام امر کی وجہ سے آخر میں حرف علت ''ی'' گر گیا اور یُؤَدِّ رہ گیا۔ اَلَّذِیْ وہ شخص، اسم موصول، اؤْتُمِنَ کہ امین جانا گیا ہے (اس پر اعتبار کر کے اسے قرض حسنہ دیا گیا ہے) فعل ماضی مجہول واحد مذکر غائب، اِئْتَمَنَ فَلَانَ، کسی شخص پر اعتماد کرنا (اِئْتَمَنَ، یَأْتَمِنُ) اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ، جس سے مشورہ لیا جائے وہ قابل اعتبار ہوتا ہے (اور اسے چاہیے کہ وہ ٹھیک ٹھیک مشورہ دے) فَلْیُؤَدِّ الَّذِیْ اؤْتُمِنَ اَمَانَتَہٗ پس ادا کرنی چاہیے اس شخص کو امانت (جس سے اس نے لی ہے) کہ اُس پر اعتبار کیا گیا ہے، وَلْیَتَّقِ اللّٰہَ رَبَّہٗ اور چاہیے کہ وہ ڈرے اللہ سے جو اس کا پالنہار ہے، وَلْیَتَّقِ (وَ.لْ.یَتَّقِ) اور چاہیے، کہ وہ ڈرے، وَ اور لِ لام امر (تاکید کے لیے)، یَتَّقِ، ڈرے فعل مضارع واحد مذکر غائب (وق ی) اس کا مادہ ہے (اِتَّقٰی، یَتَّقِیْ، اِتِّقَاءٌ) ڈرنا، خوف کھانا، تقویٰ ہی وہ بنیادی بات ہے جس سے بندۂ مومن راہ راست پر قائم رہتا ہے اور کوئی کام ایسا نہیں کرتا جو اس کے پروردگار کی مرضی کے خلاف ہو اور یہی وہ راستہ ہے جو اسے دنیا اور آخرت میں کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾

اور نہ چھپاؤ، گواہی کو، اور جو کوئی اسے چھپائے گا، اس کا قلب گنہگار ہوگا۔

وَلَا تَكْتُمُوا اور نہ چھپاؤ فعل نہی جمع مذکر حاضر (کَتَمَ، یَکْتُمُ، کِتْمَانٌ) چھپانا، کتمانِ حق، حق بات کو چھپانا، اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ اَلشَّهَادَةَ گواہی، وَمَنْ اور جو کوئی، یَّكْتُمْهَا (یَکْتُمُ.هَا) چھپاتا ہے۔ اسے هَا کی ضمیر، شہادت (گواہی) کی طرف جاتی ہے۔ فَاِنَّهٗٓ (فَ.اِنَّ.هٗ) پس، بے شک وہ (ہے)، اٰثِمٌ (گنہگار)، اسم فاعل، واحد مذکر، قَلْبُهٗ (قَلْب.هٗ) دل اس کا یعنی گواہی چھپانے والا، دل سے گنہگار ہے، ایمان اور کفر، نیکی اور بدی، کا تعلق دل سے ہے کتمانِ حق اور کتمانِ شہادت کا واسطہ بھی دل ہی سے ہے، اس لیے جب تمہیں کسی شہادت (گواہی) کے لیے طلب کیا جائے اور تم اسے اچھی طرح جانتے بھی ہو، تو اسے کسی طرح بھی نہ چھپاؤ اس لیے کہ کتمانِ شہادت بہت بڑا گناہ ہے اور قلب کو گنہگار بناتا ہے، اور جس کا دل گنہگار ہو جائے تو باقی کیا رہ گیا، ایسا شخص شرف انسانیت کو کھو بیٹھتا ہے، دل ہی وہ مرکز ہے کہ

اس کی اصلاح سے سارا بدن درست رہتا ہے اور اس کے بگاڑ سے سارا بدن، بگڑ جاتا ہے اسی حقیقت کی جانب ہادی اعظم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ (الحدیث)

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ اور جو کام بھی تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

وَاللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ، بِمَا (بِ.مَا) ساتھ (اس چیز کے)، جو، تَعْمَلُوْنَ تم کرتے ہو، مضارع جمع مذکر حاضر (عَمِلَ، يَعْمَلُ، عَمَلاً) کوئی عمل سرانجام دینا، عَلِيْمٌ جاننے والا، علم رکھنے والا، اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور یہ اس کے صفاتی ناموں میں سے ہے، عَلِيْمٌ بروزنِ فعیل ہے، مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی اس کا علم کائنات کی ہر چیز پر محیط ہے، وہ تمہارے ہر ہر عمل سے آگاہ ہے اور ہر بات تمہارے فائدے اور تمہاری بھلائی کے لیے تمہیں کہتا ہے۔

آیہ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) عرب کے لوگ پڑھے لکھے نہ تھے، ان کا حافظہ بلا کا تھا، سیکڑوں کی تعداد میں اشعار اور نسب نامے انہیں یاد تھے، انہیں بتایا جا رہا ہے کہ عنقریب تم دنیا کی عظیم الشان قوم بن جاؤ گے، کامیابی وکامرانی تمہارے ہم رکاب ہوگی، تمہارے باہمی معاملات اس قدر وسیع ہو جائیں گے کہ تمہیں پڑھنا لکھنا، کتابت وتحریر کی ضرورت محسوس ہوگی۔

۲) قرض کا معاملہ تحریر سے دو صورتوں میں مستثنیٰ ہے۔ اول رہن با قبضہ کی صورت میں، دوم فریقین کا آپس میں اعتماد ہو اور یہ دونوں صورتیں سفر اور حضر میں جائز ہیں اور جو اشیاء رہن رکھی جائیں ان سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں سوائے ان جانوروں کے جنہیں چارہ، گھاس قیمتاً لے کر کھلانا پڑتا ہے۔

۳) گواہی (اگر حالات سے آگاہی ہو) تو قطعاً نہ چھپاؤ اور جو شخص چھپاتا ہے وہ دل سے گنہگار ہوتا ہے، دل سے گنہگار کہنے کا منشا یہ ہے کہ جو انسان معاشرتی زندگی میں رہتے ہوئے لین دین کے معاملات میں سچائی اور صداقت سے کام نہیں لیتے ہیں، وہ زندگی کے سفر میں بڑے بڑے معاملات میں بھی کھرے ثابت ہو سکتے ہیں۔ صداقت اور راست بازی زندگی گزارنے کے وہ اچھے اور عمدہ اصول ہیں جن سے قومیں تعمیر وترقی کے مدارج تیزی سے طے کرتی ہیں۔

۴) شہادت کو چھپانے والا دل سے گنہگار اس لیے بھی ہو جاتا ہے کہ دل ہی تمام نیکیوں کا مرکز ہے، اس پر اثر پڑنے سے دوسری نیکیوں کی توفیق بھی چھن جاتی ہے، دل کا معاملہ بالکل اس سفید لباس کا سا ہے کہ جس پر معمولی معمولی داغ دھبے بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

۵) اس آیہ مبارکہ میں صرف کتمانِ شہادت کو اس قدر برا بتایا گیا ہے یعنی یہ وعید اور تنبیہ کھری اور سچی شہادت چھپانے پر ہے تو جھوٹی شہادت دینا کتنا بڑا گناہ ہے، اگر سچی شہادت کا چھپانا بھی انسان کے دل کو گنہگار بنا دیتا ہے تو اس شخص کا حال کیسا ہوگا جو جھوٹی گواہی دیتا ہے، آج ہماری عدالتوں میں جھوٹے مقدمات اور جھوٹی گواہیوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں اس کا خمیازہ نہ معلوم کون کون لوگ بھگت رہے ہیں، روز قیامت ان جھوٹے مقدمات اور گواہوں کا حشر کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے اور محفوظ رکھے۔ آمین!

۶) 'تقویٰ' پرہیزگاری ہی پاکیزہ زندگی کا حقیقی سرمایہ ہے اگر یہ سرمایہ نہ رہے تو اعمال کا دامن خالی ہو جاتا ہے اور انسان کی قسمت میں سوائے خسارے کے اور کوئی چیز نہیں رہ جاتی۔

۷) امانت کی پاسداری ہی تقویٰ کی علامت ہے۔ جو شخص بغیر 'رھن' رکھے اعتماد پر ہمیں روپیہ پیسہ دے دیتا ہے اور گواہ صرف اللہ تعالیٰ کو بناتا ہے، اس کے اس اعتماد کو ٹھیس لگانا ہماری کمزوری اور بددیانتی کی علامت ہے اور یہ کہ ہم میں تقویٰ نام کا بھی نہیں ہے اور محض نام کے مسلمان ہیں۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۸۴)	آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کے لیے ہے، تم اپنے دلوں کی باتوں کا برملا اظہار کرو یا انہیں چھپائے رکھو، سب کچھ اللہ تعالیٰ کے دائرہ احتساب میں ہے، وہ جسے چاہے، معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے، اللہ ہر بات پر قدرتِ کاملہ رکھتا ہے۔

﴿لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کے لیے ہے۔

لِلّٰهِ (لِ.اللّٰهِ) لیے اللہ تعالیٰ کے ہے، مَا جو کچھ ہے، فِی السَّمٰوٰتِ بیچ آسمانوں کے، وَمَا اور جو کچھ ہے، فِی الْاَرْضِ بیچ زمین کے، یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کا مالک صرف اور صرف تنہا اللہ تعالیٰ ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''جس طرح اس سورت کا آغاز دین کی بنیادی تعلیمات سے کیا گیا تھا اسی طرح سورت کو ختم کرتے ہوئے بھی ان تمام اصولی امور کو بیان کر دیا گیا ہے جن پر دین اسلام کی اساس قائم ہے، اللہ تعالیٰ کا مالکِ زمین و آسمان ہونا اور ان تمام چیزوں کا جو آسمان و زمین میں ہیں اللہ ہی کی ملک ہونا، دراصل یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی بنا پر انسان کے لیے کوئی دوسرا طرزِ عمل اس کے سوا جائز اور صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾

تم اپنے دلوں کی باتوں کا برملا اظہار کرو یا انہیں چھپائے رکھو، سب کچھ اللہ تعالیٰ کے دائرہ احتساب میں ہے۔

وَاِنْ اور اگر، خواہ تُبْدُوْا تم ظاہر کرو، مضارع جمع مذکر حاضر (أَبْدَی، یُبْدِی، اِبْدَاءٌ) ظاہر کرنا، مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ جو کچھ بیچ تمہارے نفسوں کے ہے، نَفْسٌ کی جمع اَنْفُسٌ ہے، كُمْ کی ضمیر تمام انسانوں کی طرف جاتی ہے، اَوْ یا، تُخْفُوْهُ (تُخْفُوْ.هُ) تم چھپاؤ، اسے (اپنے دل کی بات کو)، يُحَاسِبْكُمْ (يُحَاسِبُ.كُمْ) وہ حساب لے گا، بِهِ (بِ.ہٖ) ساتھ، اُس کے یعنی اس بات کا يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ، اللہ تعالیٰ اس بات کا تم سے حساب لے گا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اس فقرے میں مزید دو باتیں ارشاد ہوئیں، ایک یہ کہ ہر انسان فرداً فرداً، اللہ کے سامنے ذمہ دار اور

جوابدہ ہے، دوسرے یہ کہ جس بادشاہِ زمین و آسمان کے سامنے انسان جوابدہ ہے، وہ غیب و شہادت کا علم رکھنے والا ہے، حتیٰ کہ دلوں کے چھپے ہوئے ارادے اور خیالات تک اس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔''

(تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ، وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

پس جسے چاہے، معاف کردے اور جسے چاہے سزا دے اللہ ہر بات پر قدرت کاملہ رکھتا ہے۔

فَيَغْفِرُ (فَ.يَغْفِرُ) پس، وہ معاف کردے گا، مضارع واحد مذکر غائب (غَفَرَ، يَغْفِرُ، غُفْرَانٌ) بخشنا، معاف کرنا، لِمَنْ (لِ.مَنْ) واسطے۔ جس کے، يَّشَآءُ وہ چاہے، واحد مذکر غائب (شَاءَ، يَشَاءُ، مَشِيْئَةٌ) چاہنا، مشیت، چاہت، مرضی اردو زبان میں استعمال ہوتا ہے، وَ يُعَذِّبُ اور وہ عذاب دے گا، مضارع واحد مذکر غائب (عَذَّبَ، يُعَذِّبُ، تَعْذِيْبٌ) عذاب دینا، مَنْ يَّشَآءُ، جسے، وہ چاہتا ہے، وَ اللّٰهُ اور اللہ تعالیٰ، عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہر بات پر قادر ہے، قَادِرٌ اور قَدِيْرٌ دونوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں، قَادِرٌ پوری طرح بااختیار، صاحب قدرت اور قَدِيْرٌ صاحب قدرت ہونے کے علاوہ اس کا ہر کام صحیح اندازے اور حکمت پر مبنی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کو عذاب دینے اور بخش دینے کی پوری پوری قدرت ہے مگر اس میں اس کا عدل اور اس کی رحمت بھی شامل ہے، وہ اگر اپنے فرمانبردار اور مطیع بندوں کو معاف فرما دیتا ہے تو یہ اُس کی رحمت اور اس کے فضل کا معاملہ ہے اور اگر وہ نافرمان اور سرکش بندوں کو سزا دیتا ہے تو یہ اس کا انصاف اور عدل ہے، اس کا ہر کام اس کی مشیت اور حکمت پر مبنی ہے اور کسی کو بھی اس کے معاملے میں مداخلت کی گنجائش نہیں ہے، وہ کلی طور پر بااختیار ہے۔

لَا يُسْاَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْاَلُوْنَ (الانبیا ۲۱:۲۳)

''اللہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی سوال نہیں کرسکتا، مگر ان (لوگوں) سے ضرور باز پرس ہوگی۔''

آیات مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) یہ کائنات اور کائنات میں پھیلی ہوئی ہر چیز کا خالق و مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے، عرش سے فرش تک اسی کی حکمرانی ہے، ہر چیز اس کی حمد و ثناء میں مصروف ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (بنی اسرائیل ۱۷:۴۴) ''کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے

ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔''

انسان کو رب کریم نے اشرف المخلوقات کے اعزاز سے نوازا ہے اور اسے ان گنت نعمتیں عطا کی ہیں علمی اور مادی، دنیاوی اور اُخروی۔ لازم ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کا شکر گزار بندہ بن کر اعمال حسنہ سے اپنی زندگی کو مزین کرے اور اپنے مالک کی بندگی کا حق ادا کرے۔

۲) وہ خالق و مالک سب کچھ جانتا ہے، اُسے کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا ہر وقت علم ہے، اُسے ظاہر و باطن کی ہر وقت خبر ہے یہاں تک کہ انسان کے دل میں جو وسواس آتے ہیں ان کو بھی وہ خوب جانتا ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (قٓ ۵۰:۱۶) ''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔''

لیکن اس کی رحمت کا صدقہ ہے کہ صرف ان وساوس اور ارادوں پر وہ مؤاخذہ کرتا ہے جن کو دل میں پختہ کر لیا جائے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (البقرہ ۲:۲۲۵) ''جو بے معنی قسمیں تم بلا ارادہ کھا لیا کرتے ہو، ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو، ان کی باز پرس وہ ضرور کرے گا۔''

۳) وہ اللہ کریم اتنا مہربان اور اتنا رحیم ہے کہ خطا کاروں اور گنہگاروں کو اپنے بے پایاں فضل اور بے کراں رحمت سے معاف کرتا رہتا ہے۔ اس کا یہ اعلان عام ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا، اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (الزمر ۳۹:۵۳) ''اے (نبیؐ) کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفورٌ رحیم ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ق ز غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (۲۸۵)	اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس (کلام) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے اور جو لوگ (دعوتِ حق پر) ایمان لائے ہیں، وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں، یہ سب اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر، اُس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں ہم اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے مابین کسی ایک میں بھی کوئی تفریق نہیں پیدا کرتے اور کہتے ہیں، ہم نے احکام الٰہی کو سنا اور اس کی پیروی کی، اے ہمارے رب! ہم تجھ سے مغفرت کے طالب ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾

اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس (کلام) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے اور جو لوگ (دعوتِ حق پر) ایمان لائے ہیں، وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ ایمان رکھتا ہے، رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اٰمَنَ یُؤمِنُ، اِیْمَانًا، ایمان لانا، رکھنا، بِمَآ (بِ.مَا) ساتھ اس کے۔ جو، اُنْزِلَ نازل کی گئی اُنْزِل ماضی مجہول واحد مذکر غائب (اَنْزَلَ، یُنْزِل، اِنْزَالًا) نازل کرنا، اِلَيْهِ (اِلَیْ.ہِ) طرف، اس کے، مِنْ رَّبِّهٖ اس کے رب کی جانب سے ہٖ کی ضمیر رسول ﷺ کی طرف جاتی ہے، وَالْمُؤْمِنُوْنَ اور اہل ایمان اس کا مفرد مؤمن ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ'' اپنی رسالت یعنی پیام حق کی حقانیت کامل پر ایمان لانے والے سب سے پہلے خود پیغمبر ہی ہوتے ہیں، ایمان تو سب کا برابر ہے، لیکن بہ اعتبار ظرف و بہ لحاظ کیفیت پیغمبر کے ایمان اور عام افراد امّت کے ایمان کے درمیان آسمان اور زمین کا فرق ہے، ہر ایک کے ایمان کا مرتبہ بھی اس کی حیثیت اور مرتبہ کے متناسب ہوتا ہے۔'' (تفسیر ماجدی، جلد اول)

﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ﴾

یہ سب اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر، اُس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔

كُلٌّ ان میں سے ہر ایک، اٰمَنَ ایمان لایا، فعل ماضی واحد مذکر غائب (اٰمَنَ، يُؤْمِنُ، اِيْمَانًا) ایمان لانا، بِاللّٰهِ (بِ. اللّٰهِ) ساتھ (پر)، اللہ کے، وَمَلٰٓئِكَتِهٖ (وَ. مَلٰٓئِكَةِ. هٖ) اور، فرشتوں، اس کے، یعنی اس کے فرشتوں پر، هٖ کی ضمیر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف جاتی ہے، مَلَائِكَة کا مفرد مَلَکٌ ہے، وَكُتُبِهٖ (وَ. كُتُبِ. هٖ) اور کتابوں، اس کی پر۔ اس کا مفرد كِتَابٌ ہے، وَ رُسُلِهٖ (وَ. رُسُلِ. هٖ) اور رسولوں، اس کے پر، اس کا مفرد رَسُوْلٌ ہے، ان سب میں هٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے۔

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾

ہم اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے مابین کسی ایک میں بھی کوئی تفریق نہیں پیدا کرتے۔

لَا نُفَرِّقُ نہیں فرق کرتے ہم فعل مضارع منفی جمع متکلم (فَرَّقَ، يُفَرِّقُ، تَفْرِيْقٌ) فرق کرنا، تفریق ڈالنا، ہم اس کے رسولوں میں باہم تفریق نہیں کرتے، بَيْنَ درمیان، اَحَدٍ کسی کے، مِّنْ رُّسُلِهٖ اس کے رسولوں میں سے، ہم سب کو برحق اور اللہ کے سچے رسول سمجھتے ہیں۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیّین اور امام الانبیاء ہیں۔

﴿وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا، غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾

اور وہ کہتے ہیں، ہم نے احکام الٰہی کو سنا اور اس کی پیروی کی، اے ہمارے رب! ہم تجھ سے مغفرت کے طالب ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

وَقَالُوْا اور انہوں نے کہا، فعل ماضی جمع مذکر غائب (قَالَ، يَقُوْلُ، قَوْلًا) کہنا، قول و فعل اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، سَمِعْنَا ہم نے سنا، فعل ماضی جمع متکلم (سَمِعَ، يَسْمَعُ، سَمَاعَةً) سننا، وَ اَطَعْنَا، اور ہم نے اطاعت کی فعل ماضی جمع متکلم (اَطَاعَ، يُطِيْعُ، اِطَاعَةً) اطاعت کرنا، سمع و طاعت اردو میں استعمال ہوتا ہے، غُفْرَانَكَ (غُفْرَانَ. كَ) بخشش مانگتے ہیں۔ تیری "ک" ضمیر واحد مذکر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف جاتی ہے، وَ اِلَيْكَ (اِلَىٰ. كَ) طرف، تیرے، ک کی ضمیر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف ہے یعنی تیرے حضور (ہم نے) اَلْمَصِيْرُ لوٹنا ہے، ظرفِ مکان، لوٹنے کی جگہ، ٹھکانہ یعنی تیرے حضور ہی بالآخر

ہمارے لیے لوٹنے کی جگہ ہے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''یہ ہے وہ جامع اور کامل ایمان جو اس دین سے ہمیں ملتا ہے یہ ایمان اس امت کو سزاوار ہے جو اللہ کے دین کی وارث ہے جو تا قیامت زمین میں اس کی دعوت کو لے کر اٹھنے والی ہے جس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پیوست ہیں اور جو دعوت رسول اور ایمان کے اس کارواں میں شامل اور رواں دواں ہے جو انسانیت کی پوری تاریخ میں پھیلا ہوا ہے، وہ ایمان جو اپنی ابتدا سے اپنی انتہا تک پوری انسانیت کو دو صفوں میں منقسم کر دیتا ہے (۱) اہل ایمان کی صف، (۲) اہل کفر کی صف، (۱) حزبُ اللہ اور (۲) حزبُ الشیطان، زمانے کی ہزار گردش کے باوجود تیسرا گروہ وجود میں نہیں آیا۔'' (فی ظلال القرآن، جلد اول)

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اس آیت میں تفصیلات سے قطع نظر کر کے اسلام کے عقائد اور اسلامی طرز عمل کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے: اللہ کو، اُس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو ماننا، اس کے تمام رسولوں کو تسلیم کرنا بغیر اس کے کہ ان کے درمیان فرق کیا جائے (یعنی کسی کو مانا جائے اور کسی کو نہ مانا جائے) اور اس امر کو تسلیم کرنا کہ آخر کار ہمیں اس کے حضور حاضر ہونا ہے، یہ پانچ امور اسلام کے بنیادی عقائد ہیں، ان عقائد کو قبول کرنے کے بعد ایک مسلمان کے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم پہنچے، اسے وہ بسر و چشم قبول کرے اس کی اطاعت کرے اور اپنے حسنِ عمل پر غرّہ نہ کرے، بلکہ اللہ سے عفو و درگزر کی درخواست کرتا رہے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت و بصیرت

۱) ایمان باللہ اسلامی فکر کی بنیاد ہے، اس نظام کی بنیاد ہے جو زندگی پر حکمران ہے، اخلاق اور اقتصادیات کی بنیاد ہے اور ہر حرکت و عمل کی بنیاد ہے جس میں بندہ مومن کے شب و روز بسر ہوتے ہیں اور یہ وہ مضبوط سہارا ہے جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں:

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى، لَا انْفِصَامَ لَهَا

(البقرہ ۲:۲۵۶) ''اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔''

''ایمان باللہ'' اوراس کے حکم کی پہچان اللہ کے رسول کراتے رہے ہیں اوران کی پاکیزہ زندگیاں اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں۔ان کا اتباع اوران پرایمان کامیابی کا راستہ ہے اللہ کے رسولوں تک یہ پیغام جبریل امین کے ذریعہ پہنچتا رہا اس لیے وہ کتابیں جوانبیاءعلیہم السلام پرنازل ہوئیں وہ بھی سچی تھیں، ان نبیوں اوران کتابوں کوسچا جاننا ایمان کا حصہ ہے۔ ساتھ ہی فرشتوں پربھی ایمان لانا ضروری ہے۔

پھرآخرت کے دن پرایمان، انسان کوایسا یقین عطا کرتا ہے جس سے وہ راہ راست پرقائم رہتا ہے اسے یہ یقین ہروقت مستحضر رہتا ہے کہ اسے اپنے رب کے حضوراپنی زندگی کا حساب کتاب دینا ہے چنانچہ وہ نافرمانی کی راہ سے بچ کراطاعت کی راہ اختیار کرلیتا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲۸۶)	اللہ کسی جان پراُس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا، ہرشخص نے جونیکی کمائی ہے، اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے (مؤمنو! تم اللہ تعالیٰ کے حضوریوں دعا کیا کرو) اے ہمارے رب! ہم سے جو بھول چوک ہو جائے ان پر گرفت نہ کر، اے ہمارے رب! ہم پر بوجھ نہ ڈال، جس طرح تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا، اے ہمارے رب! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے، وہ ہم پر نہ رکھ، درگزر فرما ہمیں بخش دے، ہم پر رحم وکرم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، (تمام) اہل کفر کے مقابلے میں ہمیں فتح ونصرت عطا فرما!

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾

نہیں تکلیف دیتا، اللہ تعالیٰ کسی نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا نہیں تکلیف دیتا ہے اللہ تعالیٰ کسی نفس کو، فعل مضارع منفی واحد مذکر غائب (كَلَّفَ، يُكَلِّفُ، تَكْلِيْفٌ) تکلیف دینا، نَفْسًا کسی جان کو اس کی جمع اَنْفُسٌ اور نفوس آتی ہے، اِلَّا مگر کلمہ استثناء، وُسْعَهَا (وُسْعَ.هَا) وسعت اس کی هَا کی ضمیر نفس کی طرف جاتی ہے، نفس عربی میں مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی وسعت اور طاقت کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو لوگوں کے لیے سہل، آسان، پاکیزہ اور قابل عمل بنا دیا ہے، پھر ہمہ وقت اس کی رحمت اور بخشش بندوں پر جاری وساری رہتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرہ ۲:۱۸۵) ''اللہ تمہارے ساتھ نرمی کا برتاؤ چاہتا ہے، سختی کا برتاؤ نہیں چاہتا۔''

(دیکھو) مہربان آقا کہتا ہے کہ اگر تم بیمار ہو اور رمضان کے روزے نہیں رکھ سکتے ہو تو اس کی گنتی دوسرے دنوں میں پوری کرلو، وہ تمہارے اجر میں کمی نہیں کرے گا، تم بیمار ہو اور نماز کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر ادا کرلو، اگر بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے ہو تو اپنے بستر پر لیٹے ہوئے اشارے سے ادا کرلو، حالت سفر میں نماز قصر پڑھو اور حالت جنگ میں سواری پر ادا کر سکتے ہو۔ غرضیکہ اس دین میں تمام امور کا مطالعہ کر جایئے اس میں ہر طرف آسانیاں اور سہولتیں نظر آئیں گی۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾

ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا بدلہ (پھل) اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے، اس کا وبال اسی پر ہے۔

لَهَا (لَ.هَا) واسطے، اس کے (نفس کے)، مَا كَسَبَتْ جو کمایا اس نے، فعل ماضی واحد مؤنث غائب، ''ھا'' ضمیر کا مرجع نفس (جان) ہے (كَسَبَ، يَكْسِبُ، كَسْبًا) نیکی یا بدی کمانا اور کبھی (اِكْتَسَبَ، يَكْتَسِبُ، اِكْتِسَابًا) باب افتعال سے بھی آتا ہے، دونوں کا استعمال بھلائی اور برائی (کمانے) کے لیے آتا ہے، اِكْتَسَبَ میں اہتمام پایا جاتا ہے گویا کہ ہر جان اور ہر نفس کے لیے وہی جزا ہو گی جو اس نے نیکی کا کام کیا اور ہر جان اور نفس کے لیے وہی سزا ہو گی جو اس نے برائی کمائی ہو گی۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو ایک اور مقام پر اس طرح واشگاف کیا ہے:

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا، وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام ۶:۱۶۴) ''ہر شخص جو

کچھ کماتا ہے (اچھا یا برا عمل) اس کا ذمہ دار وہ خود ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔''

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾

اے ہمارے رب! اگر ہم بھول گئے یا ہم نے خطا کی تو ہماری گرفت نہ فرما!

رَبَّنَا اے ہمارے رب! لَا تُؤَاخِذْنَآ نہ گرفت فرما ہماری، فعل نہی واحد مذکر حاضر (اَخَذَ، یُؤْاخِذُ، مُؤَاخَذَۃٌ) باب مفاعلۃ، مؤاخدہ کرنا، گرفت کرنا، اِنْ نَّسِيْنَآ اگر بھول گئے ہم فعل ماضی جمع متکلم (نَسِیَ، یَنْسٰی، نِسْیَانٌ) بھولنا، مرض نسیان، بھول جانے کا مرض اردو میں استعمال ہوتا ہے، اَوْ اَخْطَاْنَا یا خطا کی ہم نے ماضی جمع متکلم (اَخْطَأَ، یُخْطِئُ، اِخْطَاءٌ) خطا کرنا، یہ اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے، خطا کار، غلطی کرنے والا، جیسا کہ کہتے ہیں انسان خطا کار ہے، اللہ بخشنہار ہے۔ بھول چوک انسانی فطرت ہے، اس لیے عاجز بندے انتہائی خاکساری سے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ سچے دل سے اقرار ہی اللہ تعالیٰ کے یہاں بخشش کا سامان بن جاتا ہے۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾

اے ہمارے رب! ہم پر بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ڈالا تھا ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے تھے۔

رَبَّنَا اے ہمارے رب، وَلَا تَحْمِلْ اور نہ رکھ، فعل نہی واحد مذکر حاضر (حَمَلَ، یَحْمِلُ، حَمْلاً) رکھنا، ذمہ داری ڈالنا، عَلَيْنَآ (عَلٰی.نَا) اوپر ہمارے، اِصْرًا بوجھ، (سخت احکام جن کی تعمیل میں مشقت اٹھانا پڑے)، كَمَا جیسا کہ، حَمَلْتَهٗ (حَمَلْتَ.ہٗ) رکھا تو نے، اسے یعنی اس بوجھ کو (اس ذمہ داری کو)، عَلَى الَّذِيْنَ اوپر ان لوگوں کے، مِنْ قَبْلِنَا (جو) ہم سے قبل تھے۔ (قَبْلِ.نَا) قبل (پہلے) ہم سے، قبل کا لفظ اردو میں بڑا معروف ہے۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یعنی ہمارے پیش رووں کو تیری راہ میں جو آزمائشیں پیش آئیں، جن زبردست ابتلاؤں سے وہ گزرے، جن مشکلات سے انہیں سابقہ پڑا، ان سے ہمیں بچا، اگرچہ اللہ کی سنت یہی رہی ہے کہ جس نے بھی حق وصداقت کی پیروی کا عزم کیا ہے، اسے سخت آزمائشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اور جب آزمائشیں پیش آئیں تو مومن کا کام یہی ہے کہ پورے استقلال سے ان کا مقابلہ کرے لیکن بہرحال مؤمن کو اللہ سے دعا یہی کرنی چاہیے کہ وہ اس کے لیے حق پرستی کی راہ کو آسان کر دے۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾

اے ہمارے رب! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ۔

رَبَّنَا اے ہمارے رب! وَ لَا تُحَمِّلْنَا (تُحَمِّلُ.نَا) اور نہ اٹھوا، ہم سے فعل نہی واحد مذکر حاضر (حَمَّلَ، یُحَمِّلُ، تَحْمِیْلٌ) باب تفعیل بوجھ اٹھوانا، ذمہ داری عائد کرنا، مَا لَا وہ چیز (کہ) نہیں مَا موصولہ، لَا کلمہ نہی، طَاقَةَ قدرت، طاقت، لَنَا (لَ.نَا) لیے، ہمارے، بِهٖ (بِ.ہٖ) ساتھ اس کے یعنی جس بوجھ کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے وہ ہم پر نہ رکھ۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یعنی مشکلات کا اتنا ہی بار (بوجھ) ہم پر ڈال، جسے ہم سہار سکیں، آزمائشیں بس اتنی ہی بھیج کہ ان میں ہم پورے اُتر جائیں، ایسا نہ ہو کہ ہماری قوت برداشت سے بڑھ کر سختیاں ہم پر نازل ہوں اور ہمارے قدم راہ حق سے ڈگمگا جائیں۔'' (تفہیم القرآن، جلد اول)

﴿وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا، اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾

ہم سے درگزر فرما، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور کفار کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔

وَاعْفُ اور درگزر فرما فعل امر واحد مذکر حاضر (عَفَا، یَعْفُوْ، عَفْوًا) درگزر کرنا، معاف کرنا، گناہ کو اعمال نامہ سے مٹانا، عَنَّا (عَنْ.نَا) ہم سے، اے اللہ! ہم سے درگزر فرما، ہمارے گناہ مٹا ڈال، وَاغْفِرْ اور بخش دے، فعل امر واحد مذکر حاضر (غَفَرَ، یَغْفِرُ، غُفْرَانٌ)، لَنَا (لَ.نَا) لیے۔ ہمارے، اے اللہ! ہمارے لیے بخشش کا سامان پیدا فرما، وَارْحَمْنَا، اور ہم پر رحم فرما، فعل امر واحد مذکر حاضر (رَحِمَ، یَرْحَمُ، رَحْمًا) رحم کرنا، اے اللہ! ہمیں اپنے سایۂ رحمت میں ڈھانپ لے، اَنْتَ مَوْلٰنَا تو ہمارا، آقا ہے، مولیٰ..... آقا، دوست، ناصر، مددگار اور کارساز کے معنوں میں آتا ہے۔ اے اللہ! زندگی کے ہر معاملے میں تو ہی ہمارا معین اور مددگار ہے، فَانْصُرْنَا پس ہماری مدد فرما، فعل امر واحد مذکر حاضر (نَصَرَ، یَنْصُرُ، نَصْرًا) مدد کرنا، عَلٰی اوپر، الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ کافر قوم، اے اللہ! کفار کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ آمین!

سید مودودی لکھتے ہیں:

''اس دعا کی پوری روح کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ آیات ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج کے موقع پر نازل ہوئی تھیں جبکہ مکے میں کفر و اسلام کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی،

مسلمانوں پر مصائب ومشکلات کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور صرف مکہ ہی نہیں بلکہ سرزمین عرب پر کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کسی اللہ کے بندے نے دین حق کی پیروی اختیار کی ہو اور اس کے لیے اللہ کی اس زمین پر سانس لینا دشوار نہ کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ اپنے مالک سے اس طرح دعا مانگا کرو، ظاہر ہے کہ دینے والا خود ہی جب مانگنے کا ڈھنگ بتائے تو ملنے کا یقین آپ سے آپ پیدا ہوتا ہے، اس لیے یہ دعا اس وقت مسلمانوں کے لیے غیر معمولی تسکین قلب کا موجب ہوئی، علاوہ بریں اس دعا میں ضمناً مسلمانوں کو یہ بھی تلقین کر دی گئی کہ وہ اپنے جذبات کو کسی نامناسب رخ پر نہ بہنے دیں بلکہ انہیں اس دعا کے سانچے میں ڈھال لیں، ایک طرف ان روح فرسا مظالم کو دیکھیے جو محض حق پرستی کے جرم میں ان لوگوں پر توڑے جا رہے تھے اور دوسری طرف اس دعا کو دیکھیے جس میں دشمنوں کے خلاف کسی تلخی کا شائبہ تک نہیں ہے، ایک طرف ان جسمانی تکلیفوں اور مالی نقصانات کو دیکھیے جن میں یہ لوگ مبتلا تھے اور دوسری طرف اس دعا کو دیکھیے جس میں کسی دنیوی مفاد کی طلب کا ادنیٰ نشان تک نہیں ہے، ایک طرف ان حق پرستوں کی انتہائی خستہ حالی کو دیکھیے اور دوسری طرف ان بلند اور پاکیزہ جذبات کو دیکھیے، جن سے یہ دعا لبریز ہے، اس تقابل ہی سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت اہل ایمان کو کس طرز کی اخلاقی و روحانی تربیت دی جا رہی تھی۔''

(تفہیم القرآن، جلد اول)

آیۂ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) انسان خطا اور نسیان کا پتلا ہے، کہیں شیاطین کی نت نئی چالیں اور کہیں نفس امارہ کی ترغیبات اسے راہ حق سے بھٹکانے میں لگی رہتی ہیں، اچھے انسان وہ ہیں جو اپنی خطاؤں اور گناہوں پر نادم اور شرمسار ہو جاتے ہیں اور اپنے رب کے حضور بخشش اور معافی کے خواستگار رہتے ہیں، احساس ندامت کے آنسوؤں سے ان کے گناہ کریم ورحیم آقا دھو ڈالتا ہے اور انہیں شیاطین اور کفار کے مقابلے میں فتح نصیب فرماتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ سورۃ البقرہ کی تشریح وتوضیح کا سلسلہ الفرقان تکمیل کو پہنچا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ أَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُo

وَ تُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ!!